آثرِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

# تفسیرِ نمونہ

جلد ۳

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مِصباحُ القرآن ٹرسٹ

نام کتاب ________ تفسیر نمونہ

جلد نمبر ________ ۴

زیرنظر ________ آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ________ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی

نظر ثانی ________ ثاقب اکبر نقوی

ناشر ________ مصباح القرآن ٹرسٹ

مطبع ________ بلو بٹ پریس

تاریخ اشاعت ________ اگست 2011ء

ہدیہ ________

اس جلد کے اخراجات سید تسلیم حیدر زیدی صاحب نے ادا کئے۔

ہماری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ صدقہ محمدؐ و آل محمدؐ ان کی توفیقات میں

اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے

ادارہ

قرآن سنٹر

۲۴/ الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ فون نمبر: ۳۷۳۱۴۳۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عرضِ ناشر

قارئین محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ــــ کلام حکیم اور عہد حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشرو اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرۂ آفاق تفسیر ــــ تفسیر نمونہ ــــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیام قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآن پاک عہد حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیر طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں بالغ نظر، روشن فکر اور جید عالم دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سُقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سُورتوں کا کچھ حصّہ ایک جلد میں اور بقایا حصّہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سُورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سُورت دو حصّوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سُورت کی کامل تفسیر پر ختم ہوگئی۔ اس طرح پُوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد سوم اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد چہارم میں سے صفحہ ۱۸۹ تا ۳۴۰، پوری جلد پنجم اور جلد ششم میں سے صفحہ ۱۷ تا ۴۷، شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سُورہ مائدہ و سُورہ انعام کی تفسیر پر محیط ہے۔

ہم نے زیرِ نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیّر مردِ مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہارِ تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعاگو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسّلام

اراکین
مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

# اِھداء

"مرکزِ مطالعاتِ اسلامی و نمایاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

# یہ تفسیر

## حسبِ ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے داؤد الہامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے اسد اللہ ایمانی
- حجۃ الاسلام و[illegible] [illegible]ر الرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

# چند تفاسیر

## جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

| | | |
|---|---|---|
| ۱- تفسیر مجمع البیان | از | مشہور مفسر علامہ طبرسی |
| ۲- تفسیر تبیان | از | دانشمند فقیہ بزرگ شیخ طوسی |
| ۳- تفسیر المیزان | از | علامہ طباطبائی |
| ۴- تفسیر صافی | از | علامہ محسن فیض کاشانی |
| ۵- تفسیر نور الثقلین | از | مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی |
| ۶- تفسیر برہان | از | مرحوم سید ہاشم بحرینی |
| ۷- تفسیر روح المعانی | از | علامہ شہاب الدین محمود آلوسی |
| ۸- تفسیر المنار | از | محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ |
| ۹- تفسیر فی ظلال القرآن | از | سید قطب مصری |
| ۱۰- تفسیر قرطبی | از | محمد بن احمد انصاری قرطبی |
| ۱۱- اسباب النزول | از | واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری) |
| ۱۲- تفسیر مراغی | از | احمد مصطفیٰ مراغی |
| ۱۳- تفسیر مفاتیح الغیب | از | فخر رازی |
| ۱۴- تفسیر روح الجنان | از | ابو الفتوح رازی |

# گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملّت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحُوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

# اس تفسیر کو لکھنے کا بنیادی مقصد

تمام (ہر) سطح فکر کے لوگوں میں بیداری اور آگاہی کی لہر دوڑ جانے اور ان میں جستجو اور مسائل اسلامی کو سمجھنے کا جذبہ بیدار ہونے اور تعلیمات اسلامی کے حقائق پر دسترس کی شدید طلب جو آج مختلف وجوہات کی بناء پر پیدا ہو چکی ہے، پیدا ہونے کے نتیجے میں تمام لوگوں اور بالخصوص نوجوان نسل کے درمیان یہ سوال پیدا ہو چکا ہے کہ اگر ہم اسلام کو بہتر اور مدلل انداز میں سمجھنا چاہتے ہیں اور اس کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

اس سوال کے جواب میں اُن لوگوں سے یہ کہا جائے گا کہ تعلیمات اسلامی کا سب سے بنیادی منبع قرآن ہے جو تمام حوادث زمانہ سے محفوظ اور بغیر کسی قسم کی تحریف کے حضور سے ہم تک پہنچا ہے اور زبان وحی الٰہی میں گفتگو کرتا ہے اس لیے ہمیں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اسے پڑھنا اور اس میں غور وفکر کرنا چاہیے۔

پس فوراً سوال ہوتا ہے۔ کہ فارسی زبان بولنے والے حضرات کے لیے کونسی تفسیر کا مطالعہ کرنا بہتر ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان فارسی میں بڑے اعلیٰ پائے کی قدیم وجدید تفاسیر موجود ہیں۔ مگر اُن کی عبارت سے عدم آشنائی کی بناء پر یا اُن کے مطالب انتہائی مشکل ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں کے لیے اُن تفاسیر کو سمجھنا مشکل ہوگیا۔ (مگر یہ کہ چند تفاسیر میں ان مسائل کو حل کیا گیا ہے)۔

یہ چیز اس بات کا سبب ہوئی کہ علماء عظام کی ایک جماعت کی معاونت سے اس کام کا بیڑا اٹھایا جائے اور پیچیدہ علمی اصطلاحات اور مفسرین کرام کے باہمی اختلافات کی وضاحتوں سے خالی ہو مگر آسان فہم مطالب سے بھرپور اور دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ایک تفسیر عوام الناس کے سامنے پیش کی جائے۔

ایک دوسرے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ خواص اور اہل علم حضرات بھی اُس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ مختلف علمی مباحث (کبھی متن میں اور کبھی حاشیہ میں) بیان کرنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے تاکہ یہ تفسیر دونوں طرح کے افراد کے لیے مفید ثابت ہو۔

اس کے علاوہ چونکہ قرآن اور اُس کی مطالب ومعانی سے بھرپور آیات تمام مسلمانوں کی حیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ ان تمام سوالات کا جو تعلیمات اسلام کے پیش کردہ دورِ حاضر کے طرز زندگی کے بارے میں کیے جاتے ہیں، جواب دیا جائے اور اُس کے مباحث کو بطور کلی ذہنی مسائل کو آشکار کرتے ہوئے اور دورِ حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بیان کیے جائیں۔

الحمدللہ ان تمام مسائل کا پیش کردہ حل کافی مؤثر ثابت ہوا اور ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر ہر مقام پر اس تفسیر کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہاں تک کہ دینی دروس میں اسے ایک درسی کتاب کے طور پر استعمال کیا گیا۔

اس تفسیر کی یہ پذیرائی اس قدر شاندار تھی کہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس وقت جب یہ سطور لکھی جا رہی ہیں اس کی جلد اوّل دس مرتبہ چھپ چکی ہے (اسی انداز میں دوسری جلدیں بھی)۔

اس لیے ہم نے اپنی کوششوں اور زحمتوں کو تیز تر کر دیا اور اس کی بحثوں کو مزید ہم آہنگ بنانے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ تمام عبارت کی تحریر میرے قلم سے ہو اور دوسرے علماء کرام مطالب کے جمع کرنے میں معاونت فرمائیں اور اس چیز کا اعتراف کرنا انتہائی ضروری ہے کہ علماء عظام نے مطالب کو جمع کرنے میں بہت زحمت کی اور اس کے بہت اچھے نتائج مرتب ہوئے۔

اس تفسیر کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر مقامات پر سابقہ اور دورِ حاضر کے مفسرین کے افکار سے استفادہ کرنے کے علاوہ نئے اور تازہ مطالب پیش کیے گئے ہیں۔

خاص طور پر اس جلد کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ پوری جلد مہر آباد اور انارک میں جلاوطنی کے دوران لکھی گئی اور دوستوں نے اِن مقامات پر معاونت فرمائی اور یہ زیادہ فرصت، حوصلہ و فکری یکسوئی سے لکھی گئی۔

بہرحال میں امید رکھتا ہوں کہ اس طریق سے ہم اس قابل ہیں کہ اپنا اور اپنے معاشرے کا خاص طور پر نوجوان نسل کا قرآن سے رابطہ مضبوط اور محکم بنائیں۔ اور قرآن و اسلام کی شناخت کے راستے میں مکمل آگاہی اور انتہائی فہم و فراست سے قدم بڑھائیں۔

قم ——— ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ جلد ۳

# فہرست

## سُورہ مائدہ

٭ ٭ ٭

اللهم صل علی محمد و آل محمد و عجل فرجهم

# تفسیر نمونہ جلد ۳

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

۱۔ سورہ مائدہ    ۲۔ سورہ انعام



**سورۂ مائدہ :** مدنی سورت ہے اور اس کی ۱۲۰ آیات ہیں ۔

پارہ ۶ ــــ ۱ تا ۸۲    پارہ ۷ ــــ ۸۳ تا ۱۲۰

**سورہ انعام :** مکی سورت ہے اور اس کی ۱۶۵ آیات ہیں ۔

پارہ ۷ ــــ ۱ تا ۱۱۰    پارہ ۸ ــــ ۱۱۱ تا ۱۶۵

# سورۂ مائدہ

★— مدنی ہے

★— اس کی ۱۲۰ آیات ہیں

# سُورۂ مائدہ کے مضامین

یہ سُورت مدنی سُورتوں میں سے ہے ۔ اس کی ۱۲۰ آیتیں ہیں ۔ کہتے ہیں کہ یہ سُورت سورۂ فتح کے بعد نازل ہوئی ۔ ایک روایت کے مطابق یہ ساری سُورت حجۃ الوداع میں اور مکہ و مدینہ کے درمیان نازل ہوئی[1]

یہ سورت معارف ، عقائد اسلامی اور احکام دینی پر مشتمل ہے ۔

پہلے حصے میں پیغمبر اکرمؐ کے بعد کے لیے مسئلہ ولایت و رہبری ، عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث ، قیامت و معاد کے کچھ مسائل اور انبیاء سے ان کی امتوں کے بارے میں پرسش کے معاملات ہیں ۔

دوسرے حصے میں ایفائے عہد کا مسئلہ ، عدالت اجتماعی کا معاملہ ، عادلانہ شہادت اور قتل نفس کی حرمت کا حکم ہے ۔ (اسی مناسبت سے آدمؑ کے بیٹوں کا واقعہ ہے جبکہ قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تھا ) اسی طرح کچھ حلال و حرام غذاؤں کی وضاحت ہے کچھ وضو اور تیمم کے احکام ہیں ۔

اس کا نام " مائدہ "[2] اس لیے ہے کیونکہ حضرت عیسٰیؑ کے انصار کے لیے مائدہ کے نزول کی داستان اسی سُورت کی آیت ۱۱۴ میں بیان کی گئی ہے ۔

---

[1] المنار ج ۶ ص ۱۱۶ ۔ توجہ رہے کہ کسی سُورت کے مدنی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ مکہ سے ہجرت پیغمبرؐ کے بعد نازل ہوئی ہو اگرچہ سُورت کا نزول شہر مدینہ میں نہ ہوا ہو ۔

[2] مائدہ دراصل اس برتن ( ٹرے ) کو کہتے ہیں جس میں کھانا رکھا جائے ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ○

## ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ اپنے عہد و پیمان اور قول و قرار پورے کرو، چوپائے (اور چوپایوں کے جنین) تمھارے لیے حلال کر دیئے گئے ہیں مگر وہ جو تم سے بیان کیے جائیں گے (ان کے سوا جن کی استثناء کی جائے گی) اور احرام کے وقت شکار کو حلال نہ سمجھو اور خدا جو چاہتا ہے (اور مصلحت دیکھتا ہے) حکم کرتا ہے۔

## تفسیر

### ایفائے عہد ضروری ہے

جیسا کہ اسلامی روایات اور بڑے بڑے مفسرین کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے، سورۂ پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والی آخری سُورت ہے (یا آخری سورتوں میں سے ہے)۔ تفسیر عیاشی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے فرمایا:

"سورۂ مائدہ رحلتِ پیغمبرؐ سے دو یا تین ماہ پہلے نازل ہوئی"[1]

---

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۴۳۰

توجہ رہے کہ اس سُورہ میں وضو، تیمم وغیرہ کے احکام اس کے آخری ہونے کے منافی نہیں ہیں بہت سے احکام تکرار و تاکید کا پہلو رکھتے ہیں۔ لہٰذا ایسے بعض احکام سُورۂ نساء میں بھی ہیں۔

یہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ سورہ ناسخ ہے منسوخ نہیں، یہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔

یہ بات اس بات کے منافی نہیں جو اس تفسیر کی پہلی جلد میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۱ کے ذیل میں کی گئی ہے۔ وہاں اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ روایات کے مطابق مذکورہ آیت پیغمبرؐ پر نازل ہونے والی آخری آیت ہے۔ یہاں گفتگو سورہ کے بارے میں ہے اور وہاں بات ایک آیت کے متعلق تھی۔

اس سورہ میں اس کے خاص موقع کے وجہ سے مفاہیم اسلامی بیان کیے گئے ہیں دین سے متعلق آخری پروگراموں کا تذکرہ ہے۔ اس میں اُمّت کی رہبری اور پیغمبر اسلامؐ کی جانشینی کا ذکر ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس سورہ کا آغاز عہد و پیمان کے لازمی ایفا کے حکم سے ہوتا ہے۔

پہلے جملے میں فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان کے ساتھ وفا کرو (یایھا الذین امنوا اوفوا بالعقود) یہ اس لیے ہے تاکہ اہلِ ایمان کے لیے ان پیمانوں اور وعدوں کا ایفا ضروری قرار دیا جائے جو وہ خدا سے پہلے باندھ چکے ہیں یا جن کے متعلق اس سورہ میں اشارہ ہوا ہے یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی مسافر اپنے رشتہ داروں اور پیروکاروں سے وداع ہوتے ہوئے آخری لمحوں میں تاکید کرتا ہے کہ میری وصیتوں اور نصیحتوں کو بھول نہ جانا اور جو قول و قرار تم نے میرے ساتھ باندھے ہیں ان کے وفادار رہنا۔

توجہ رہے کہ "عقود"، "عقد" کی جمع ہے۔ "عقد" دراصل ایک محکم چیز کے اطراف کو جمع کرنے کے معنی میں ہے اسی مناسبت سے رسی کے دو سروں کو یا دو رسیوں کو ایک دوسرے سے گرہ لگانے کو "عقد" کہتے ہیں بعد ازاں اسی معنی سے معنوی مفہوم پیدا ہو گیا اور ہر قسم کے عہد و پیمان کو "عقد" کہا جانے لگا۔ البتہ بعض فقہا نے تصریح کی ہے کہ عہد کی نسبت عقد کا مفہوم محدود ہے کیونکہ عقد ایسے پیمان کو کہتے ہیں جو بہت مستحکم ہو نہ کہ ہر عہد و پیمان کو۔ لہٰذا اگر بعض روایات میں اور مفسرین کی بعض تحریروں میں عقد اور عہد ایک ہی مفہوم میں آئے ہیں تو یہ ہماری بیان کردہ بات کے منافی نہیں ہے کیونکہ مقصد ان دو الفاظ کی اجمالی تفسیر کا بیان کرنا تھا نہ کہ اس کی جزئیات کا تذکرہ منظور تھا۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اصطلاح کے مطابق "العقود" "جمع محلی بالف لام" ہے جو عمومیت کے لیے ہوتی ہے اور جملہ بھی بالکل مطلق ہے لہٰذا مندرجہ بالا آیت ہر طرح کے عہد و پیمان سے وفا کرنے کے واجب ہونے کی دلیل ہے۔ چاہے یہ محکم عہد و پیمان انسان کا انسان کے ساتھ ہو یا انسان کا خدا کے ساتھ ہو۔ اس طرح یہ تمام خدائی اور انسانی اور سیاسی، اقتصادی، اجتماعی، تجارتی، ازدواجی وغیرہ عہد و پیمان پر محیط ہے اور اس کا ایک مکمل وسیع مفہوم ہے اس کی نظر تمام انسانی پہلوؤں پر ہے، چاہے ان کا تعلق عقیدے سے ہو یا عمل سے، وہ فطری عہد و پیمان ہوں یا توحیدی، اور چاہے ان کا تعلق ان معاہدوں سے ہو جو لوگ زندگی کے [illegible] ئل میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔

تفسیر روح المعانی میں ر[illegible] لے سے منقول ہے کہ وضع و کیفیت کے لحاظ سے طرفین میں ہونے والے عقد کی تین قسمیں ہیں۔ کبھی عقد خدا اور بندے [illegible] درمیان ہوتا ہے کبھی انسان اور اس کے نفس کے مابین ہوتا ہے اور کبھی عقد انسان دوسرے انسانوں سے باندھتا ہے[1] (البتہ عقد کی یہ تینوں قسمیں طرفین کے مابین میں زیادہ سے زیادہ ہو کہا جا سکتا ہے کہ جہاں

---

[1] تفسیر روح المعانی، زیر بحث آیت کے ذیل میں

انسان خود اپنے ساتھ عہد و پیمان باندھتا ہے وہاں وہ اپنے آپ کو دو اشخاص کی طرح فرض کرتا ہے)۔
بہرحال آیت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اس میں وہ عہد و پیمان بھی آجاتے ہیں جو مسلمان غیر مسلموں سے باندھتے ہیں۔

## چند اہم نکات

۱۔ ایک فقہی قاعدہ: یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو حقوقِ اسلامی سے بحث کرتی ہیں۔ فقہی مباحث میں اوّل سے آخر تک اس سے استدلال کیا جاتا ہے اس سے ایک اہم فقہی قاعدہ معلوم ہوتا ہے جسے "اصالۃ اللزوم فی العقود" کہتے ہیں۔ یعنی ہر قسم کا عہد و پیمان جو کچھ چیزوں کے بارے میں ہو یا دو افراد کے درمیان کچھ کاموں کے متعلق ہو، اس کا اجراء اور اس پر عمل کرنا ضروری اور لازمی ہے۔

یہاں تک کہ جیسے بعض محققین کہتے ہیں کہ مختلف قسم کے معاملات، شراکتیں، کاروبار اور قرار دادیں جو ہمارے زمانے میں موجود ہیں اور سابقہ دور میں نہیں تھیں یا آنے والے دور میں عقلاء میں معرضِ وجود میں آئیں گی اور صحیح اصولوں کی بنیاد پر ہوں گی، یہ قاعدہ سب پر محیط ہے اور یہ آیت سب کے بارے میں ہے (البتہ ان کلی ضوابط کو مدنظر رکھتے ہوئے جن کا اسلام معاہدوں کے بارے میں حکم دیتا ہے)۔

اس آیت میں ایک فقہی قاعدہ کے طور پر استدلال کرنا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ پیمانِ الٰہی جو خدا اور بندوں کے درمیان باندھے گئے ہیں یا وہ مسائل جو رہبری اور اُمّت کی قیادت سے مربوط ہیں کہ جن کا پیمان پیغمبرؐ کے ذریعے لوگوں سے لیا گیا ہے اس میں شامل نہیں بلکہ آیت ایک وسیع مفہوم کی حامل ہے جس میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ دو طرفہ عہد و پیمان کی وفا اور تکمیل اس وقت تک ضروری ہے جب تک کوئی ایک طرف اسے توڑ نہ دے لیکن اگر ایک طرف سے اسے توڑ دیا جائے تو پھر دوسری طرف پر یہ لازم نہیں ہوگا کہ وہ اسے وفا کرے، اور ایسا معاملہ عقد و پیمان کے مفہوم سے ساقط ہو جاتا ہے۔

۲۔ ایفائے عہد کی اہمیّت: عہد و پیمان کی وفا کا مسئلہ جو زیر بحث آیت میں بیان ہوا ہے، اجتماعی زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے اور اس کے بغیر کوئی اجتماعی ہم کاری اور تعلق ممکن نہیں ہے اور اگر انسان اسے ہاتھ سے دے بیٹھے تو اجتماعی زندگی اور اس کے ثمرات کو عملی طور پر کھو بیٹھتا ہے۔ اسی بنا پر اسلامی مصادر اور کتب میں اس کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ شاید بہت کم کوئی اور چیز ہو جسے اس قدر وسعت سے بیان کیا گیا ہو کیونکہ اس کے بغیر تو معاشرہ ہرج مرج اور عدمِ اطمینان کا شکار ہو جائے گا، جو نوعِ انسانی کے لیے سب سے بڑی اجتماعی مصیبت ہے۔

نہج البلاغہ میں مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں:

فانہ لیس من فرائض اللّٰہ شیء الناس اشد علیہ اجتماعا مع تفرق اھوائھم وتشتت ارائھم من تعظیم الوفاء بالعھود، وقد لزم ذلک المشرکون فیما بینھم دون المسلمین لما استوبلوا

من عواقب الغدر۔

دنیا بھر کے لوگوں میں تمام تر اختلافات کے باوجود ایفائے عہد کی طرح کسی اور امر پر اتفاق نہیں ہے۔ اسی لیے تو زمانہ جاہلیت کے بت پرست بھی اپنے عہد و پیمان کا احترام کرتے تھے۔ کیونکہ وہ عہد شکنی کے دردناک انجام کو جان چکے تھے[1]

امیر المومنینؑ ہی سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

ان اللہ لا یقبل الا العمل الصالح ولا یقبل اللہ الا الوفاء بالشروط والعھود۔

خدا اپنے بندوں سے عمل صالح کے علاوہ کسی چیز کو قبول نہیں کرتا اور (اسی طرح) خدا شرائط اور عہد و پیمان کے (بارے میں بھی) ایفاء کے علاوہ کچھ قبول نہیں کرتا[2]

پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

لا دین لمن لا عھد لہ[3]

جو شخص اپنے عہد و پیمان کا وفادار نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔

لہٰذا ایفائے عہد ایک ایسی بات ہے جس میں افرادِ انسانی کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے چاہے طرف مقابل مسلمان ہو یا کوئی غیر مسلم۔ اصطلاح کے مطابق یہ انسانی حقوق میں سے ہے نہ کہ برادرانِ دینی کے حقوق میں سے۔

ایک حدیث میں حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

ثلاث لم یجعل اللہ عزوجل لاحد فیھن رخصۃ، اداء الامانۃ الی البر والفاجر، والوفاء بالعھد للبر والفاجر، و بر الوالدین برین کانا او فاجرین۔

تین چیزیں ایسی ہیں جن کی مخالفت کی خدا نے کسی شخص کو اجازت نہیں دی ۱۔ امانت کی ادائگی ہر شخص کو چاہے وہ نیک ہو یا بد ۲۔ ایفائے عہد ہر کسی سے چاہے وہ اچھا ہو یا برا اور ماں باپ سے حسنِ سلوک، چاہے وہ اچھے ہوں یا برے[4]

یہاں تک کہ ایک روایت میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے:

اگر کوئی شخص اشارے سے بھی کوئی عہد اپنے ذمے لے تو اسے وفا کرنا چاہیے۔

---

[1] نہج البلاغہ، حضرت علیؑ کے خطوط میں سے خط نمبر ۵۳

[2] سفینۃ البحار، ج ۲ صفحہ ۲۹۴

[3] بحار جلد ۱۶ صفحہ ۱۴۴

[4] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۱۶۲

اس روایت کا متن یہ ہے :

اذا اومی احد من المسلمین او اشار الی احد من المشرکین فنزل علی ذٰلک فھو فی امان[1] ۔

عہد وپیمان کے بارے میں حکم پر گفتگو ہو چکی جو کہ تمام احکام اور خدائی پیمانوں پر محیط ہے اس کے بعد احکام اسلام کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے ان میں سے پہلا حکم کچھ جانوروں کے گوشت کے حلال ہونے کے بارے میں ہے، فرمایا گیا ہے :
چوپائے (اور ان کے جنین) تمہارے لیے حلال کیے گئے ہیں ( احلت لکم بھیمۃ الانعام ) ۔ "انعام" جمع ہے "نعم" کی، جس کا معنی ہے اونٹ، گائے اور گوسفند[2]

"بھیمۃ" کا مادہ "بھمۃ" (بروزن "تھمۃ") ہے۔ اس کا معنی ہے "محکم اور سخت پتھر" اور ہر چیز جس کا ادراک مشکل ہو اسے "مبہم" کہتے ہیں اور وہ تمام جانور جو بول چال نہیں سکتے انھیں بھیمۃ کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی آواز میں ابہام ہوتا ہے ۔ لیکن عام طور پر یہ لفظ چوپایوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے اور اس میں درندے اور پرندے شامل نہیں ہوتے چونکہ حیوانات کے جنین (جو مادہ جانور کے پیٹ میں ہوتے ہیں) بھی ایک قسم کا ابہام رکھتے ہیں ۔ اسی لیے انھیں بھی "بھیمۃ" کہا جاتا ہے ۔

اس بنا پر "بھیمۃ الانعام" کا حلال ہونا یا تو تمام چوپایوں کے لیے ہے (البتہ وہ جانور مستثنیٰ ہیں جن کا ذکر بعد کی آیت میں آئے گا) یا ان بچوں کے حلال ہونے کے معنی میں ہے جو حلال گوشت جانوروں کے شکم میں ہوں (وہ بچے کہ جن کی خلقت پوری ہو گئی ہے اور کھال اور بال ان پر اگ آئے ہیں)[3]

کچھ جانوروں کے حلال ہونے کے بارے میں پہلے سے مشخص تھا مثلاً اونٹ، گائے اور گوسفند، لہٰذا ممکن ہے کہ اس آیت میں ان کی جنین کی حلیت کی طرف اشارہ ہو لیکن جو بات آیت کے معنی سے زیادہ قریب نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے یعنی ایسے جانوروں کے حلال ہونے کے بارے میں بھی ہے اور ان کی جنین کے حلال ہونے سے متعلق بھی ہے اور اگر ایسے جانوروں کا حکم پہلے سے بھی معلوم تھا تب بھی یہاں مستثنیٰ قرار دیئے جانے والے جانوروں کے حکم سے پہلے مقدمے کے طور پر اس حکم کا تکرار کیا گیا ہے ۔ اس جملے کی تفسیر کے بارے میں جو کچھ ہم کہہ چکے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس حکم کا ربط ایفائے عہد کے لازمی ہونے سے اس بنا پر تھا کہ ایفائے عہد ایک کلی بنیاد ہے ۔ یہ کلی بنیاد

---

[1] مستدرک الوسائل ج ۲ ص ۲۵۰ ۔

[2] "نعم" اگر مفرد کی صورت میں استعمال ہو تو "اونٹ" کا معنی دیتا ہے لیکن جمع کی شکل میں ہو تو اونٹ، گائے اور گوسفند بھی اس کے مفہوم میں آجاتے ہیں (مفردات راغب، مادہ "نعم") ۔

[3] اگر "بھیمۃ" کا معنی آیت میں "حیوانات" ہو تو "انعام" کے ساتھ اس کی اضافت، اضافت بیانیہ کہلائے گی اور اگر "جنین" کے معنی میں ہو تو اس کی اضافت، اضافت لامیہ ہو گی ۔

احکامِ الٰہی پر اس لحاظ سے ایک تاکید ہے کہ احکام الٰہی بھی خدا کے بندوں سے عہد و پیمان کی ایک قسم ہے اس کے بعد پھر کچھ احکام بیان کیے گئے ہیں جن میں بعض جانوروں کے گوشت کے حلال ہونے کا ذکر ہے اور بعض جانوروں کے گوشت کے حرام ہونے کا ذکر ہے۔

پھر آیت میں چوپایوں کے گوشت کی حرمت کے بارے میں دو استثنائی حکم ہیں؛ ان جانوروں کے گوشت کا استثناء ہے جن کی تحریم عنقریب تمھارے لیے بیان کی جائے گی (الا ما یتلیٰ علیکم) اور حالتِ احرام میں بھی شکار کرنا حرام ہے (یعنی ... حج کے مناسک یا عمرہ کے مناسک انجام دینے کے لیے باندھے گئے احرام کی حالت میں شکار کرنا حرام ہے) (غیر محلی الصید و انتم حرم)[1]

آیت کے آخر میں فرماتا ہے، خدا جو حکم چاہتا ہے، صادر کرتا ہے ——— یعنی۔ خدا چونکہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور ہر چیز کا مالک ہے لہٰذا جو حکم بندوں کی مصلحت میں ہو اور حکمت اس کی متقاضی ہو اسے جاری کر دیتا ہے (ان اللہ یحکم ما یرید)

۲۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۚ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُوا ۘ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ○

## ترجمہ

۲۔ اے ایمان والو! شعائرِ خداوندی (اور مراسمِ حج کو محترم سمجھو اور ان کی مخالفت) کو حلال قرار نہ دو اور نہ ہی حرام مہینہ کو اور نہ بغیر نشانی والی قربانیوں کو اور نہ نشانیوں والی کو اور نہ وہ کہ جنھیں خانۂ خدا کے قصد سے پروردگار کے فضل اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے لاتے ہو اور جب تم حالتِ احرام سے نکل جاؤ تو پھر شکار کرنا تمھارے لیے کوئی منع نہیں ہے اور وہ گروہ جو مسجد الحرام کی طرف (حدیبیہ کے سال) تمھارے آنے میں حائل ہوا تھا۔

---

[1] البتہ "الا ما یتلیٰ علیکم" جملہ استثنائیہ ہے اور "غیر محلی الصید" کم کی ضمیر سے حال ہے جو معنی کے لحاظ سے استثناء کا نتیجہ دیتا ہے۔

اس کی دشمنی تمھیں تجاوز پر نہ اُبھارے اور (ہمیشہ) نیکی اور پرہیزگاری کی راہ میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور (ہرگز) گناہ اور تجاوز کی راہ میں ساتھ نہ دو اور خدا سے ڈرو، جس کی سزا سخت ہے۔

# تفسیر

## ایک آیت میں آٹھ احکام

اس آیت میں چند اہم اسلامی احکام بیان ہوئے ہیں یہ پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہونے والے آخری احکامات میں سے ہیں یہ سب کے سب یا ان میں سے زیادہ تر حج اور خانہ خدا کی زیارت سے مربوط ہیں احکام یہ ہیں:

۱۔ سب سے پہلے اہلِ ایمان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ شعائر خداوندی کو نہ توڑو اور ان کی حرمت کا خیال رکھو (یٰایھا الذین اٰمنوا لا تحلوا شعائر اللّٰہ)۔

اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے کہ شعائر اللہ سے کیا مراد ہے لیکن اس آیت کے دوسرے حصوں سے اس کی مناسبت سے اور اس کے سالِ نزول (دس ہجری) جو پیغمبر اکرمؐ کے حجۃ الوداع کا سال تھا، کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعائر سے مراد مناسک حج اور حج کا پروگرام ہے، مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان سب کا احترام کریں اس تفسیر کا شاہد یہ ہے کہ قرآن میں لفظ شعائر عام طور پر مراسم حج کے بارے میں استعمال ہوا ہے[1]

۲۔ حرام مہینوں کا احترام کرو اور ان مہینوں میں جنگ و جدال سے احتراز کرو (و لا الشھر الحرام)۔

۳۔ وہ قربانیاں جو حج کے لیے لاتے ہو چاہے وہ نشانی کے بغیر (ھدی[2]) ہوں یا نشانی والی (قلائد[3]) ہوں، انھیں حلال نہ سمجھو اور انھیں رہنے دو کہ وہ قربان گاہ تک پہنچ جائیں اور وہاں قربان ہوں (و لا الھدی و لا القلائد)۔

۴۔ خانہ خدا کے تمام زائرین کو ان عظیم اسلامی مراسم کے لیے پوری آزادی ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں افراد، قبائل، خاندانوں اور زبانوں کا کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے اس لیے جو لوگ خدا کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں، حتیٰ کہ جو تجارتی فائدے کے لیے زیارتِ بیت اللہ کے قصد سے آتے ہیں ان سے بھی کوئی مزاحمت نہ کی جائے چاہے وہ تمھارے دوست ہوں یا دشمن، بس اتنا کافی ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور خانہ خدا کے زائر ہیں، یہی ان کے مامون و محفوظ

---

[1] بقرہ ۱۵۸ اور حج ۳۲، ۳۶

[2] "ھدی" جو "ھدیۃ" کی جمع ہے، اس کا مطلب ہے وہ چوپائے جو قربانی کے طور پر خانہ خدا کے لیے "اھدا" کیے جاتے ہیں۔

[3] "قلائد" جو "قلادۃ" کی جمع ہے، اس کا معنی ہے وہ چیز جو انسان یا کسی جانور کے گلے میں ڈالی جائے یہاں اس سے مراد وہ چوپائے ہیں جو مراسم حج میں قربانی کے لیے لائے جاتے ہیں اور ان پر کوئی علامت اور نشانی لگا دی جاتی ہے۔

ہونے کے لیے کافی ہے (ولا آمین البیت الحرام یبتغون فضلا من ربھم و رضوانا)۔

بعض مفسرین اور فقہا کا نظریہ ہے کہ یہ جملہ عام ہے یہاں تک کہ غیر مسلموں پر بھی محیط ہے یعنی اگر مشرکین بھی خانہ خدا کی زیارت کے قصد سے آئیں تو ان کی بھی مزاحمت نہ کی جائے۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ سورۂ توبہ جس کے متعلق مشہور ہے کہ نو ہجری میں نازل ہوئی اس کی آیۃ ۲۸ میں مشرکین کے مسجد الحرام کی طرف آنے سے منع کیا گیا ہے اور سورۂ مائدہ پیغمبر اکرم کی آخری عمر دس ہجری میں نازل ہوئی اور شیعہ سنی روایات کے مطابق اس کا کوئی حکم بھی منسوخ نہیں ہوا لہٰذا یہ تفسیر صحیح نہیں ہے اور حق یہی ہے کہ یہ حکم مسلمانوں سے مخصوص ہے۔

۵۔ شکار کی حرمت زمانہ احرام کے لیے ہے اس لیے فرمایا گیا ہے: جب حج یا عمرہ کے احرام سے نکل جاؤ تو پھر شکار کرنا تمہارے لیے جائز ہے (و اذا حللتم فاصطادوا)۔

۶۔ زمانہ جاہلیت کے بت پرست (حدیبیہ کے موقع پر) خانہ خدا کی زیارت میں تم سے مزاحم ہوئے اور انھوں نے تمھیں خانہ خدا کی زیارت کے مناسک انجام نہیں دینے دیئے۔ اس واقعہ کو اس بات کا سبب نہیں بننا چاہیے کہ ان کے اسلام لے آنے کے بعد پرانی دشمنی کو زندہ کرو اور خانہ خدا کی زیارت میں ان کے لیے رکاوٹ بنو (ولا یجرمنکم شنان قوم ان صدوکم عن المسجد الحرام ان تعتدوا)[1]

یہ حکم اگرچہ خانہ خدا کی زیارت کے بارے میں نازل ہوا ہے لیکن حقیقت میں اس سے ایک عمومی قانون معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو کینہ پرور نہیں ہونا چاہیے اور جو حوادث گذشتہ دور میں گزر چکے ہوں انھیں اپنے ذہن پر سوار نہیں کر لینا چاہیے اور ان کے انتقام کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔

دیکھا جائے تو ہر معاشرے کے نفاق اور تفرقہ بازی کے علل و اسباب میں سے ایک یہی وجہ ہے یہ اسلامی حکم جو کہ اس وقت نازل ہوا جبکہ پیغمبر اسلام کی حیات کا آفتاب آستانہ غروب پر تھا مسلمانوں کے درمیان نفاق کی آگ کو بھڑکنے سے روکنے کے لیے نازل ہوا۔ اس سے اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

۷۔ اس کے بعد بحث کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے: بجائے اس کے کہ تم اپنے پرانے دشمن اور موجودہ دوستوں سے انتقام کے لیے ایک ہو جاؤ، تمھیں چاہیے کہ نیکی اور تقویٰ کی راہ میں ایک دوسرے سے دست تعاون بڑھاؤ۔ نہ یہ کہ گناہ اور تجاوز میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے لگو (وتعاونوا علی البر و التقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان)۔

۸۔ آیت کے آخر میں گذشتہ احکام کو محکم کرنے کے لیے اور ان کی تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: پرہیزگاری اختیار کرو اور حکم خدا کی نافرمانی سے بچو، کیونکہ خدا کا عذاب اور اس کی سزائیں بڑی سخت ہیں (و اتقوا اللہ ان اللہ

---

[1] اہل لغت اور مفسرین کے کلمات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "جرم" (بروزن "جرم") اصل میں درخت سے غیر مناسب پھل توڑنے کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ لفظ ہر اس کام کے لیے استعمال ہونے لگا جو ناخوش آیند ہو نیز ناپسندیدہ کام کے لیے کسی کو اکسانے کے مفہوم میں بھی بولا جانے لگا۔ اس لیے یہاں "لا یجرمنکم" "لا یحملنکم" کے معنی میں ہے یعنی "تمہیں غلط کام پر نہ اکسائے"۔

شدید العقاب ) ۔

## نیکی میں ساتھ دینا ضروری ہے

زیرِ نظر آیت میں تعاون کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ اسلامی احکام کی ایک عمومی بنیاد ہے جو تمام اجتماعی اور سیاسی مسائل کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس کے مطابق تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ نیک اور اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور ایک دوسرے کا ساتھ دیں لیکن باطل مقاصد، غلط اعمال اور ظلم و ستم میں تعاون اور ہم کاری بالکل ممنوع ہے، چاہے ان کا مرتکب قریبی دوست یا سگا بھائی کیوں نہ ہو۔

یہ اسلامی قانون بالکل اس قانون کے برعکس ہے جو زمانہ جاہلیت کے عرب میں بلکہ آج کے دور جاہلیت میں بھی رائج و حاکم ہے ——— جاہلیت کا قانون یہ ہے کہ ——— انصر اخاک ظالماً او مظلوماً ———

یعنی اپنے بھائی (یا دوست اور ہم پیمان) کی حمایت اور مدد کرو، چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

اس زمانے میں اگر ایک قبیلے کے کچھ لوگ کسی دوسرے قبیلے کے بعض افراد پر حملہ کرتے تھے تو قبیلے کے باقی افراد ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے اور اس تحقیق کی زحمت نہ کرتے کہ حملہ عادلانہ تھا یا ظالمانہ۔ یہ قانون بین الاقوامی سطح پر آج بھی حکم فرما ہے اور اکثر ایک معاہدے میں منسلک ممالک یا جن کے مفادات مشترک ہیں اہم عالمی معاملات میں ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں اور قانون عدالت کا بالکل پاس نہیں کرتے اور ظالم و مظلوم کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ اسلام نے اس قانون جاہلیت پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے تعاون اور ہمکاری صرف نیک، اچھے اور اسلامی کاموں میں کرنا چاہیے نہ کہ گناہ، تعدی اور ظلم میں۔

یہ بات جالبِ نظر ہے کہ "بر" اور "تقویٰ" دونوں الفاظ مندرجہ بالا آیت میں ایک ساتھ آئے ہیں ان میں سے ایک لفظ اثباتی پہلو رکھتا ہے جو کہ مفید افعال و اعمال کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا لفظ نفی کا پہلو رکھتا ہے جو کہ غلط کاموں سے رک جانے کی طرف اشارہ ہے۔ گویا تعاون و ہم کاری نیکیوں کی طرف دعوت دینے میں بھی ہونا چاہیے اور برائیوں کا مقابلہ کرنے میں بھی۔

فقہ اسلامی میں اس قانون سے حقوق سے متعلق مسائل معلوم کیے جاتے ہیں۔ اسی کی رو سے چند ایک ایسے معاملات اور تجارتی معاہدوں کو حرام قرار دیا گیا ہے کہ جو گناہ کی کمک اور مدد کا پہلو رکھتے ہیں۔ مثلاً شراب سازی کے کارخانے کے لیے انگور بیچنا یا حق و عدالت کے دشمنوں کے ہاتھ ہتھیار بیچنا یا کام کی کسی جگہ کو غیر شرعی اور خلافِ شریعت معاملات اور کاروبار کے لیے کرایے پر دینا (البتہ ان احکام کے بارے میں کچھ شرائط ہیں جو فقہی کتب میں بیان کی گئی ہیں)۔

اگر یہ اسلامی بنیاد تمام معاشروں میں فراہم ہو جائے اور لوگ شخصی، نسلی اور قرابتی تعلق کو پیش نظر رکھے بغیر ان لوگوں کا ساتھ دیں جو مثبت اور اصلاحی کاموں کے لیے قدم بڑھاتے ہیں اور ظالم اور تجاوز کرنے والے لوگ چاہے کسی طبقے سے ہوں ان کا ساتھ نہ دیں تو بہت سی اجتماعی خرابیاں اور مشکلیں دور ہو جائیں۔ اسی طرح اگر دنیا کی حکومتیں بین الاقوامی سطح پر ظالم اور تجاوز کرنے والے

شخص یا حکومت سے تعاون نہ کریں تو تعدی، تجاوز، زیادتی، استعمار و استثمار دنیا سے ختم ہو جائیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بعض حکومتیں تجاوز کرنے والوں اور ستمگروں کی حمایت کرنے لگی ہیں اور ان سے مفادات رکھنے والے کئی بندوں اغیروں حمایت کا یقین دلاتے ہیں لہٰذا موجودہ حالات میں بہتری کی توقع نہیں کی جانا چاہیے۔

اسلامی روایات میں اس سلسلے میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ نمونے کے طور پر ہم چند ایک روایات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۱۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

اذا کان یوم القیامۃ نادی مناد این الظلمۃ و اعوان الظلمۃ و اشباہ الظلمۃ حتی من بریٰ لھم قلما او لاق لھم دواۃ، قال فیجتمعون فی تابوت من حدید ثم یرمی بھم فی جہنم۔

جب قیامت بپا ہوگی تو منادی ندا کرے گا:

کہاں ہیں ظالم؟

کہاں ہیں ظالموں کے مددگار؟

کہاں ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنے آپ کو ظالموں سے مشابہ بنایا تھا؟

حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی پکارا جائے گا جنھوں نے ان ظالموں کے لیے قلم تراشا یا ان کی دوات میں صوف ڈالا ——— ان سب کو لوہے کے ایک صندوق میں ڈال کر اکٹھا جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔[1]

۲۔ صفوان جمال، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ وہ کہتے ہیں: میں آپؑ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؑ نے فرمایا: تمھارے تمام کام اچھے ہیں سوائے ایک کام کے۔

میں نے عرض کیا: آپ پر قربان جاؤں وہ کون سا کام ہے؟

امامؑ نے فرمایا: تو اپنے اونٹ اس شخص (یعنی ... ہارون) کو کرایہ پر دیتا ہے۔

میں نے عرض کیا: بخدا عیاشی، ہوس بازی اور حرام شکار کے لیے تو کرایہ پر نہیں دیتا، صرف اس (مکہ کے) سفر کے لیے دیتا ہوں، پھر میں خود بھی اونٹوں کے ساتھ نہیں جاتا اپنے کسی بیٹے یا کسی اور شخص کو ان کے ساتھ بھیجتا ہوں۔

امامؑ نے فرمایا: صفوان! کیا ان سے کرایہ لیتے ہو؟

میں نے عرض کیا: جی ہاں۔

آپؑ نے فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ وہ اس وقت تک زندہ رہیں اور اپنے منصب پر باقی رہیں جب تک تمھارا کرایہ ادا نہ کریں۔

---

[1] "لیقہ" عربی زبان میں کپڑے کے اس ٹکڑے یا ریشم کی روئی کو کہتے ہیں، جو دوات میں ڈالی جاتی ہے، تاکہ وہ اپنے اندر سیاہی کو جذب کرلے اور اسے بہہ جانے سے روکے۔

[2] وسائل الشیعہ، جلد ۱۲ صفحہ ۱۳۱

میں نے کہا: جی ہاں۔

آپ نے فرمایا: جو ان کی بقا کی خواہش رکھے وہ انہی میں سے ہے اور جو ان میں سے ہو وہ جہنم کی آگ میں جائے گا۔

صفوان کہتے ہیں: میں فوراً گیا اور اپنے تمام اونٹ بیچ ڈالے۔ یہ خبر ہارون کو ہوئی تو اس نے مجھے بلا بھیجا اور مجھ سے کہنے لگا: صفوان! میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنے اونٹ بیچ ڈالے ہیں۔

میں نے کہا: میں بوڑھا ہو گیا ہوں، میرے بیٹے اور دوسرے لوگ ان کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔

ہارون بولا: یہ بات نہیں، میں جانتا ہوں تمہیں کس شخص نے اس کا حکم دیا ہے، ہاں موسیٰؑ بن جعفرؑ نے تمہیں یہ حکم دیا ہے۔

میں نے کہا: میرا موسیٰؑ بن جعفرؑ سے کیا واسطہ؟

ہارون بولا: چھوڑو اس بات کو، واللہ تمہاری گذشتہ نیکیاں نہ ہوتیں تو میں تمہاری گردن اڑانے کا حکم دیتا۔[1]

۲۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

یا علی کفر باللہ العلی العظیم من ھذہ الامۃ عشرۃ ......... و بایع السلاح من اھل الحرب۔

اے علی! اس امت کے دس گروہ خدا کے منکر ہو گئے ہیں ......... اور ایک وہ ہے جو اسلام کے دشمنوں کے ہاتھ ہتھیار بیچتا ہے جبکہ وہ مسلمانوں سے حالتِ جنگ میں ہوں۔[2]

۳۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ۚ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۚ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۲ صفحہ ۱۲۱، صفحہ ۱۲۲

[2] وسائل الشیعہ ج ۱۲ صفحہ ۱،

فِیْ مَخْمَصَةٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

## ترجمہ

۳۔ مُردار کا گوشت، خون، سؤر کا گوشت، وہ جانور جو غیر خدا کے نام پر ذبح ہوں، وہ جانور جن کا گلا گھونٹ دیا جائے اور تشدد کر کے انھیں مار دیا جائے، وہ جانور جو بلندی سے گر کر مر جائیں، وہ جانور جو دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے مر جائیں اور درندہ جانور کے شکار کا باقی ماندہ مگر یہ کہ (بر موقع اس جانور کے پاس جا پہنچیں اور) اسے ذبح کر لیں اور وہ جانور جو کسی بُت کے اوپر (یا اس کے سامنے) ذبح کیے جائیں (سب کے سب) تم پر حرام ہیں اور (اسی طرح) قسمت آزمائی کے لیے مخصوص تیر کی لکڑیوں سے جانور کا گوشت تقسیم کرنا۔ یہ تمام اعمال فسق اور گناہ ہیں۔ آج کے دن کفار تمھارے دین (کے زوال) سے مایوس ہو گئے ہیں لہٰذا ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے (میری مخالفت سے) ڈرو۔ آج کے روز میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمھارے لیے (ہمیشہ رہنے والے) دین کے طور پر قبول کر لیا لیکن وہ لوگ کہ بھوک کی حالت میں جن کا ہاتھ کسی اور کھانے تک نہ پہنچے اور وہ گناہ کی طرف مائل بھی نہ ہوں (تو ان کے لیے کوئی حرج نہیں کہ وہ ممنوع گوشت میں سے کھالیں) خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

## تفسیر

اس سورہ کی ابتداء میں چوپایوں کا گوشت حلال ہونے کا تذکرہ ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا تھا کہ اس سلسلے میں جن کے بارے میں استثناء ہے ان کا ذکر بعد میں آئے گا۔ زیر بحث آیت میں دراصل وہی استثنائی حکم ہے جس کے بارے میں وعدہ کیا گیا تھا۔ اس میں گیارہ چیزوں کے حرام ہونے کا ذکر ہے ان میں سے بعض کے حرام ہونے کا حکم قرآن کی بعض دیگر آیات میں بھی آیا ہے یہاں ان کا تکرار تاکید کے طور پر ہے۔

۱۔ پہلے فرماتا ہے: مردار تم پر حرام کیا گیا ہے (حرمت علیکم المیتة)۔

۲۔ اسی طرح خون بھی حرام ہے (والدم)۔

۳۔ سؤر کا گوشت بھی حرام ہے (ولحم الخنزیر)۔

۴۔ اور وہ جانور جو زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق بتوں کے نام پر اور اصولی طور پر غیر خدا کے نام پر ذبح کیے جائیں،

ان کا گوشت بھی حرام ہے (وما اھل لغیر اللہ بہ)۔

ان چار چیزوں کی تحریم اور اس کے فلسفہ کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اول میں ہم کافی بحث کر چکے ہیں (اردو ترجمہ ص ۱۰۴)۔

۵۔ نیز وہ جانور بھی کہ جن کا گلا گھونٹ دیا جائے، حرام ہیں۔ چاہے خود بخود ایسا ہو یا پھندے کے سبب ہو یا کوئی انسان ایسا کام انجام دے (جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں رواج تھا کہ بعض اوقات کسی جانور کو دو لکڑیوں یا درخت کی دو شاخوں میں سختی سے دبائے تھے یہاں تک کہ وہ مر جاتا تھا اور پھر اس کا گوشت استعمال کرتے تھے) (والمنخنقۃ)۔

بعض روایات میں ہے کہ خاص طور پر مجوسی ایسا کرتے تھے کہ جانور کا گلا گھونٹ کر مارتے اس کے بعد اس کا گوشت کھاتے لہٰذا ممکن ہے کہ آیت کا ان کے اس طریقے کی طرف بھی اشارہ ہو۔[1]

۶۔ اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو تشدد اور مار پیٹ سے مر جائیں یا بیماری کی وجہ سے مر جائیں (والموقوذۃ)۔[2]

تفسیر قرطبی میں ہے کہ عربوں میں رواج تھا کہ وہ بعض جانوروں کو بتوں کی خاطر اس قدر مارتے کہ وہ مر جاتے اور وہ اسے ایک طرح کی عبادت سمجھتے تھے۔[3]

۷۔ اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو بلندی سے گر کر مر جائیں (والمتردیۃ)۔

۸۔ نیز وہ جانور جو سینگ مارنے سے مر جائیں ان کا گوشت بھی حرام ہے (والنطیحۃ)۔

۹۔ اور وہ جانور بھی حرام ہیں جو درندوں کے حملے کی وجہ سے مر جائیں (وما اکل السبع)۔

ان آخر والے پانچ قسم کے جانوروں کے گوشت کی حرمت کا ایک فلسفہ ممکن ہے یہ ہو کہ ان سے کافی مقدار میں خون نہیں نکلتا۔ کیونکہ جب تک گردن کی اصلی رگیں نہ کاٹی جائیں اس وقت تک خون کی کافی مقدار نہیں نکلتی اور ہم جانتے ہیں کہ خون طرح طرح کے جراثیم کا مرکز ہوتا ہے اور جانور کے مرتے ہی سب سے پہلے خون میں بدبو پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے گوشت میں ایک طرح کا زہریلا پن زیادہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ذبح کرنے میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور قبلہ رُو ہو کر ذبح کیا جاتا ہے اس طرح سے جو معنوی پہلو پیدا ہوتا ہے وہ مذکورہ بالا صورتوں میں نہیں ہے۔

لیکن اگر جانور کے مرنے سے پہلے ان تک پہنچ جائیں اور آداب اسلامی کے مطابق اسے ذبح کر لیں اور اس کا خون کافی مقدار میں نکل آئے تو وہ حلال ہو جائے گا۔ اسی لیے مندرجہ بالا مواقع کی حرمت کے بعد فرمایا گیا ہے: (الا ما ذکیتم)۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ استثناء صرف آخری قسم یعنی "وما اکل السبع" کے بارے میں ہے، لیکن اکثر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہ تمام قسموں کے بارے میں ہے اور یہی بات زیادہ قرین حقیقت ہے۔

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۶ صفحہ ۲۷۲

[2] "موقوذۃ" کا مادہ ہے "وقذ" (بر وزن "نقض") یا ایسی سخت مار پیٹ کے معنی میں ہے جو موت تک پہنچا دے یا سخت بیماری جو جانور کو موت کے کنارے لے جائے بعض اوقات ایسا تشدد اور ایسی بیماری کو بھی "وقذ" کہتے ہیں جو موت تک نہ پہنچائے بہرحال اس آیت میں پہلا معنی ہی مراد ہے۔

[3] تفسیر قرطبی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ممکن ہے سوال کیا جائے کہ جب آیت کی ابتداء میں " میتۃ " کہہ دیا گیا ہے تو پھر ان مواقع کا ذکر کیوں کیا گیا ہے اور کیا یہ سب " میتۃ " کے مفہوم میں داخل نہیں ہیں ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فقہی اور شرعی لحاظ سے " میتۃ " کا ایک وسیع مفہوم ہے اس لحاظ سے جو بھی حیوان شرعی طریقے سے ذبح نہ ہو وہ اس کے مفہوم میں داخل ہے لیکن لغت میں عموماً " میتۃ " اس جانور کو کہتے ہیں جو خود بخود مر جائے اس لیے مندرجہ بالا مواقع " میتۃ " کے لغوی معنی میں داخل نہیں ہیں اور نہیں تو کم از کم اس کا احتمال ہے کہ داخل نہ ہوں۔ لہٰذا ان کی صراحت کی ضرورت تھی۔

۱۰۔ زمانہ جاہلیت میں بت پرستوں نے کچھ پتھر خانہ کعبہ کے گرد نصب کر رکھے تھے ان کی کوئی خاص شکل و صورت نہ تھی۔ انہیں " نصب " کہتے تھے۔ ان کے سامنے قربانی کرتے تھے اور قربانی کا خون ان پر مل دیتے تھے ان کے اور دیگر بتوں کے درمیان فرق یہ تھا کہ دیگر بتوں کی کوئی مخصوص شکل ہوتی تھی لیکن " نصب " کی کوئی خاص صورت نہ ہوتی تھی۔ اسلام نے زیر نظر آیت میں ایسی قربانی کے گوشت کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے ( وما ذبح علی النصب ) واضح ہے کہ ایسے گوشت کی حرمت اخلاقی اور معنوی پہلو رکھتی ہے نہ کہ مادی اور جسمانی۔ درحقیقت یہ " وما اھل لغیر اللہ بہ " کی اقسام میں سے ہے۔

۱۱۔ جانوروں کی ایک اور طرح کی حرمت بھی زیر نظر آیت میں آئی ہے اور وہ ہے قسمت آزمائی کے طور پر ذبح ہونے والے جانور۔ ہوتا یہ تھا کہ دس آدمی آپس میں شرط لگاتے تھے اور ایک جانور خرید کر اسے ذبح کر دیتے تھے پھر تیر کی دس لکڑیاں جن میں سے سات پر " کامیاب " اور تین پر " ناکام " لکھا ہوتا تھا ایک مخصوص تھیلے میں رکھ دیتے تھے پھر قرعہ اندازی کی صورت میں ان دس آدمیوں میں سے ایک ایک کے نام پر ایک تیر باہر نکالتے جن سات لکڑیوں پر " کامیاب " لکھا ہوتا وہ جس جس کے نام نکلتیں اسے دے دیتے اور وہ گوشت کا ایک حصہ اٹھا لیتا اور اسے اس کے بدلے کچھ نہ دینا پڑتا۔ دوسری طرف وہ تین افراد جن کے نام " ناکام " والی لکڑیاں نکلتیں ان میں سے ہر ایک کے لیے لازمی ہوتا کہ وہ اس جانور کی ایک تہائی قیمت ادا کرے، جبکہ گوشت کا بھی اسے کوئی حصہ نہ ملتا۔ ان لکڑیوں کو " ازلام " کہتے ہیں۔ " ازلام " " زلم " (بروزن " قلم ") کی جمع ہے۔ اسلام نے ایسے گوشت کا کھانا حرام قرار دے دیا۔ یہ حرمت اس بنا پر نہیں کہ اصل گوشت حرام ہے بلکہ اس لیے کہ یہ کام قماربازی اور قسمت آزمائی (لاٹری وغیرہ) کا پہلو لیے ہوئے ہے قرآن فرماتا ہے: وان تستقسموا بالازلام۔

واضح ہے کہ قماربازی وغیرہ کی حرمت جانوروں کے گوشت سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر جگہ اور ہر صورت میں قماربازی ممنوع ہے اور اس کے مفہوم میں تمام نقصان دہ امور، بے مقصد کام اور بیہودہ پروگرام شامل ہیں۔ آخر میں ان احکام حرمت کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے : یہ تمام احکام فسق ہیں اور اطاعت پروردگار کی حدود سے خارج ہیں ( ذلکم فسق )[1]

---

[1] ذلکم اگرچہ اسم اشارہ مفرد ہے کہ جس میں خطاب جمع کے صیغے سے کیا گیا ہے اور قاعدتاً اسے مفرد کی طرف لوٹنا چاہیے لیکن ہم جانتے ہیں کہ مفرد اشارہ اس مجموعے کے لیے جو مفرد فرض کیا گیا ہو، کوئی اشکال نہیں رکھتا۔

# گوشت کے استعمال میں اعتدال

مندرجہ بالا تمام بحث سے اور دیگر اسلامی مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ گوشت سے استفادہ کے بارے میں اسلام کی روش اس کے دیگر احکام کی طرح اعتدال پر مبنی ہے۔ نہ زمانہ جاہلیت کی طرح ہے کہ وہ لوگ گوہ، مردار، خون وغیرہ سب کھا جاتے تھے، نہ آج کے بہت سے مغربی ممالک کی طرح ہے جہاں کے لوگ کیکڑا اور کیڑے مکوڑے تک کھانے سے نہیں کتراتے اور نہ ہی اسلام کا طریقہ ہندوؤں کا سا ہے جنھوں نے گوشت کھانا مطلقاً ممنوع قرار دے رکھا ہے بلکہ ان جانوروں کا گوشت کھانا حلال قرار دیا ہے جن کی غذا پاک ہے اور جو باعث تنفر نہیں ہیں اور افراط و تفریط کے راستے پر خط بطلان کھینچ دیا ہے اور مختلف قسم کا گوشت کھانے کے لیے شرائط معین کر دی ہیں جو اس طرح ہیں:

۱۔ جن جانوروں کا گوشت استعمال کیا جا سکتا ہے انھیں گھاس خور ہونا چاہیے کیونکہ گوشت خور جانوروں کا گوشت مردار اور گندگی سے آلودہ گوشت کھانے کے نتیجے میں عموماً صحیح سالم نہیں رہتا اور طرح طرح کی بیماریوں کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس گھاس کھانے والے جانور عام طور پر صحیح اور پاک چیزوں سے استفادہ کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں جیسا کہ سورۂ بقرہ آیہ ۲۰، کی تفسیر میں کہا جا چکا ہے کہ ہر جانور کی صفات اس کے گوشت کے ذریعے اسے کھانے والے تک منتقل ہو جاتی ہیں۔

اس لیے درندوں کا گوشت کھانے سے انسان میں قساوت اور درندگی کی صفت کو تقویت پہنچے گی اسی لیے اسلام نے گوشت خور جانوروں کو بھی حرام قرار دیا ہے۔

۲۔ وہ جانور جن کے گوشت سے استفادہ کیا جائے وہ قابل نفرت نہ ہوں۔

۳۔ ایسے جانور بھی نہ ہوں جو انسانی روح یا جسم کے لیے نقصان اور ضرر کا باعث ہوں۔

۴۔ ایسے جانور جو شرک اور بت پرستی وغیرہ کی راہ میں قربان کیے جائیں چونکہ وہ روحانی اور معنوی لحاظ سے ناپاک ہیں اس لیے انھیں حرام قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ اسلام میں کچھ احکام جانوروں کو ذبح کرنے کے طریقے کے بارے میں بھی ہیں۔ ان میں سے ہر حکم کے اپنے فوائد یا اخلاقی اثرات ہیں۔

مندرجہ بالا احکام کے بعد زیر بحث آیت میں دو معنی خیز جملے نظر آتے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے: آج کے دن کافر تمھارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں لہٰذا اب ان سے نہ ڈرو اور صرف میری مخالفت سے ڈرو (الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون)۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: آج کے دن میں نے تمھارے دین اور آئین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمھارے دین کے طور پر قبول کر لیا (الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا)۔

## دین کس روز اپنے کمال کو پہنچا

یہاں ایک اہم بحث سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ "الیوم" (یعنی... آج کا دن) جس کا مندرجہ بالا آیت کے دو جملوں میں ذکر ہے، کون سا دن ہے؟ یعنی وہ کون سا دن ہے جس میں یہ چار پہلو جمع ہو گئے۔

۱۔ کفار اس روز مایوس ہو گئے
۲۔ دین اس دن مکمل ہو گیا۔
۳۔ نعمت الٰہی تمام ہو گئی اور
۴۔ خداوند عالم نے دین اسلام کو پورے عالم کے لوگوں کے لیے آخری دین کے طور پر قبول کر لیا۔

مفسرین میں اس سلسلے میں بہت اختلاف ہے لیکن جس بات میں کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے کہ ایسا دن پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں بہت اہم ہونا چاہیے اور یہ کہ یہ کوئی عام سا اور معمولی دن نہیں ہو سکتا کیونکہ اتنی اہمیت کسی عام دن کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ کتنی ایک روایات میں آیا ہے کہ بعض یہودیوں اور عیسائیوں نے یہ آیت سن کر کہا کہ ایسی آیت اگر ہماری آسمانی کتب میں ہوتی تو ہم اس دن کو عید کا دن قرار دیتے۔[1]

ہمیں چاہیے کہ ہم قرائن، نشانیوں، آیت اور سورت کے نزول کی تاریخ، پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کی تاریخ اور مختلف اسلامی منابع کی روایات سے اس اہم دن کو تلاش کریں۔ کیا اس سے مراد وہ دن ہے جس دن حلال و حرام گوشت کے بارے میں مندرجہ بالا احکام نازل ہوئے تھے، قطعاً ایسا نہیں ہے۔ ان احکام کا نزول اتنی اہمیت کا حامل نہیں ہے اور نہ ہی یہ تکمیل دین کا باعث ہے۔ یہ پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہونے والے آخری احکام بھی نہ تھے کیونکہ اس سورت کے آخر میں کچھ اور احکام بھی دکھائی دیتے ہیں اور پھر ان احکام کا نزول کفار کی ناامیدی کا سبب بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ بات جو کفار کی مایوسی کا سبب بن سکتی ہے، وہ اسلام کے مستقبل کے لیے کوئی محکم بنیاد اور سہارا ہونا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے احکام کا نزول کفار کے جذبات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا کہ ایک طرح کا گوشت حرام ہو اور دوسری طرح کا حلال۔ اس سے ان میں کوئی خاص حساسیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

کیا اس سے مراد پیغمبر اکرمؐ کے حجۃ الوداع کے عرفہ کا دن ہے (جیسا کہ مفسرین کے ایک گروہ نے احتمال بھی ظاہر کیا ہے)؟

اس سوال کا جواب بھی نفی میں ہے کیونکہ مذکورہ بالا نشانیاں اس دن پر بھی منطبق نہیں ہو سکتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دن کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا کہ جو کفار کی مایوسی کا باعث ہو سکے۔ اگر اس سے مراد مسلمانوں کا عظیم اجتماع ہے تو وہ روز عرفہ سے پہلے بھی مکہ میں خدمت پیغمبرؐ میں تھا اور اگر اس دن مذکورہ بالا احکام کا نزول مراد ہے تو بھی جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، کفار کے لیے کوئی گھبرانے والی بات نہ تھی۔

---

[1] تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۱۵۵

یا پھر اس سے فتح مکہ کا دن مراد ہے (جیسا کہ بعض کا خیال ہے)، جب کہ اس سورہ کے نزول کا زمانہ فتح مکہ سے بہت ہی بعد کا ہے۔

یا کیا سورۂ برأت کی آیات کے نزول کا دن ہے؟ تو وہ بھی اس سورہ کے نزول سے کافی مدت پہلے تھا۔

سب سے زیادہ عجیب احتمال یہ ہے جو بعض نے ظاہر کیا ہے کہ اس دن سے مراد ظہور اسلام یا بعثت پیغمبر کا دن ہے، جبکہ ان دونوں کا اس آیہ کے نزول کے دن سے کوئی ربط نہیں ہے اور ان کے درمیان ایک طویل مدت حائل ہے۔

لہٰذا مذکورہ بالا چھ احتمالات میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو آیت سے آہنگ اور مفہوم سے مناسبت رکھتا ہو۔

اس آیت کے سلسلے میں ایک اور احتمال بھی ہے جو تمام شیعہ مفسرین نے اپنی کتب میں پیش کیا ہے، متعدد روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں، نیز آیت کے مضامین اور آہنگ بھی اس سے مناسبت رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اس سے مراد غدیر خم کا دن ہے، جس دن پیغمبر اسلام نے امیر المومنین حضرت علی کو باقاعدہ اپنی جانشینی کے لیے مقرر کیا تھا۔ یہی وہ روز تھا جب کفار مایوسیوں کے سمندر میں ڈوب گئے کیونکہ انہیں توقع تھی کہ دین اسلام کا قیام بس ایک شخص سے مربوط ہے اور پیغمبر اسلام کے بعد صورت حال پھر پرانی ڈگر پر لوٹ آئے گی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ایک ایسا شخص پیغمبر کی جانشینی کے لیے منتخب ہوا ہے جو علم و تقویٰ اور قدرت و عدالت کے لحاظ سے پیغمبر اسلام کے بعد بے نظیر ہے اور آنحضرتؐ نے لوگوں سے اس کی بیعت لے لی ہے تو وہ اسلام کے بارے میں یاس و ناامیدی کا شکار ہو گئے۔ وہ سمجھ گئے کہ اس دین کی جڑیں مضبوط اور پائیدار ہیں۔ یہ وہ دن تھا جب دین اپنی تکمیل کو پہنچ گیا کیونکہ جانشین پیغمبر کے تعین اور مسلمانوں کا مستقبل واضح ہوئے بغیر یہ آخری تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

یہ وہ دن تھا جب نعمت الٰہی علیؑ جیسے لائق رہبر کے تعین کے ذریعے لوگوں کے مستقبل کے لیے تمام ہو گئی۔ اسی دن اسلام اپنے پروگرام کی تکمیل کے ذریعے آخری دین کے طور پر خدا کی طرف سے پسندیدہ قرار پایا۔

لہٰذا اس میں چاروں مذکورہ پہلو موجود تھے۔

علاوہ ازیں ذیل کے قرائن بھی اس تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔

۱۔ تفسیر فخر الدین رازی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر المنار میں اس آیت کے ذیل میں منقول ہے، کہ اس آیت کے نزول کے بعد پیغمبر اکرمؐ اکیاسی دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ روایات اہلسنت کے مطابق اور حتیٰ کہ بعض شیعہ روایات کی بناء پر (جیسا کہ کلینی نے اپنی مشہور کتاب کافی میں نقل کیا ہے) رسول اکرمؐ کی وفات بارہ ربیع الاول کو ہوئی تھی ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ زیر نظر آیت کے نزول کا دن ٹھیک اٹھارہ ذی الحجہ ہے[1]

---

[1] البتہ یہ اس صورت میں ہے جب خود روز وفات پیغمبر اور روز غدیر کو شمار نہ کیا جائے۔ نیز تین مہینوں میں یکے بعد دیگرے ہر مہینہ ۲۹ دن کا ہو اور ایسا ہونا بالکل ممکن ہے نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ روز غدیر سے پہلے اور بعد تاریخ اسلام میں کوئی ایسا اہم واقعہ رونما نہیں ہوا جس پر مندرجہ بالا آیات منطبق ہو سکے۔ اس لیے حتماً غدیر کے علاوہ اس سے کوئی اور دن مراد نہیں۔

ب۔ بہت سی روایات جو مشہور شیعہ سنی طرق سے منقول ہیں صراحتاً یہ مطلب بیان ہوتا ہے کہ زیر بحث آیہ شریفہ غدیر خم کے روز اور ولایت حضرت علیؑ کے اعلان کے بعد نازل ہوئی ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔ مشہور سنی عالم ابن جریر طبری کتاب ولایت میں معروف صحابی زید بن ارقم کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت غدیر خم کے دن حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی۔

۲۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی اپنی کتاب " ما نزل من القرآن فی علیؑ " میں مشہور صحابی ابوسعید خدری سے نقل کرتے ہیں :۔

پیغمبر خداؐ نے غدیر خم کے دن لوگوں سے حضرت علیؑ کا تعارف ان کی ولایت کے حوالے سے کرایا اور لوگ ابھی منتشر نہیں ہوئے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی :

الیوم اکملت لکم دینکم ۔۔۔۔۔

اس موقع پر رسول اللہؐ نے فرمایا :

. اللہ اکبر علی اکمال الدین و اتمام النعمۃ و رضی الرب برسالتی و بالولایۃ لعلی (ع) من بعدی ، ثم قال : من کنت مولاہ فعلی مولاہ ، اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ ۔

یعنی ـــــ اللہ اکبر ـــــ دین کی تکمیل پر اور نعمت تمام ہونے پر اور پروردگار کے میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت پر راضی اور خوش ہونے پر۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا :

جس شخص کا میں مولا ہوں ، اس کا علیؑ مولا ہے ، خدایا ! اسے دوست رکھ ، جو علیؑ کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی کرے ۔ جو اس کی مدد کرے اس کی مدد کر اور جو اسے چھوڑ دے تو بھی اسے چھوڑ دے ۔

۳۔ خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں ابوہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں وہ پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں :

واقعہ غدیر خم ، ولایت علیؑ کے عہد و پیمان اور عمر کے " بخ بخ یا بن ابی طالب اصبحت مولای و مولا کل مسلم "[1] کہنے کے بعد آیۃ الیوم اکملت لکم دینکم نازل ہوئی[2]

---

[1] حضرت عمر کی اس بات کا مطلب ہے ، کیا کہنے اے فرزند ابوطالب ! آپ میرے اور ہر مسلمان کے مولا ہو گئے۔

[2] ان تین روایات کو علامہ امینی مرحوم نے تمام خصوصیات کے ساتھ " الغدیر " کی جلد اول میں ص ۲۳۰ تا ۲۳۲ میں نقل کیا ہے اور کتاب احقاق الحق ج ۶ ص ۳۵۳ میں اس آیت کا واقعہ غدیر میں نازل ہونا ابوہریرہ سے دو طرق کے ساتھ اور ابوسعید خدری سے کئی طرق سے نقل کیا گیا ہے۔

کتاب تلخیص الغدیر میں مذکورہ تین روایات کے علاوہ اس سلسلے میں مزید تیرہ روایات نقل کی گئی ہیں۔

کتاب احقاق الحق میں تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۱۴ اور مقتل خوارزمی صفحہ ۸۰ کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ یہ آیت واقعہ غدیر کے بارے میں نازل ہوئی۔

تفسیر برہان اور تفسیر نورالثقلین میں بھی مختلف طرق سے اس سلسلے میں دس روایات نقل ہوئی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں یا غدیر خم کے دن کے بارے میں نازل ہوئی۔

ان سب روایات کو نقل کرنے کے لیے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے[1]

علامہ سید شرف الدین مرحوم کتاب المراجعات میں لکھتے ہیں:

امام صادقؑ اور امام باقرؑ سے منقول صحیح روایات میں مذکور ہے کہ یہ آیت غدیر کے دن نازل ہوئی اہل سنت نے بھی رسول اللہؐ سے اس سلسلے میں مختلف اسناد سے جو روایات نقل کی ہیں وہ اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ یہ آیت اس واقعہ کے ضمن میں نازل ہوئی۔[2]

جو کچھ ہم نے مندرجہ بالا سطور میں کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زیر نظر آیت کے واقعہ غدیر کے سلسلے میں نازل ہونے کے بارے میں موجود روایات اتنی اہمیت کی حامل ہیں کہ انہیں خبر واحد کہا جا سکے اور ان کی بعض اسناد کو ضعیف قرار دے کر ان سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ اگر یہ روایات متواتر نہ ہوں تو کم از کم مستفیض ہیں اور مشہور اسلامی منابع اور کتب میں منقول ہیں۔ اگرچہ بعض متعصب سنی حضرات چونکہ ان روایات کو اپنے ذوق کے خلاف پاتے ہیں لہٰذا انہیں مجہول اور غلط قرار دیتے ہیں۔ مثلاً آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں صرف ایک سند کو ضعیف قرار دے کر کوشش کی ہے کہ باقی روایات کو بھی نظر انداز کر دے یا مثلاً تفسیر المنار کے مؤلف آیت کی ایک عام تفسیر کر کے آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے ان روایات کی طرف ذرا سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ شاید وہ اس مخمصے میں تھے کہ اگر روایات کا ذکر کر کے انہیں ضعیف قرار دیں تو خلاف انصاف ہوگا اور اگر قبول کر لیں تو خلاف ذوق ہوگا۔

ایک جالب نظر نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ قرآن حکیم سورۂ نور آیہ ۵۵ میں کہتا ہے۔

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم و لیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا۔

تم میں سے وہ لوگ جو ایمان لے آئے ہیں اور انھوں نے اعمال صالح انجام دیئے ہیں خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں روئے زمین پر خلیفہ بنا دے گا۔ جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو اس نے خلیفہ بنایا ہے (نیز یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ) جس دین کو ان کے لیے پسند کیا ہے اسے محکم و مستقر کریگا

---

[1] تفسیر برہان جلد اوّل اور تفسیر نورالثقلین جلد اوّل میں زیر بحث آیت کے ذیل میں رجوع کریں۔

[2] المراجعات جلد چہارم صفحہ ۳۰

اور خوف کے بعد انھیں امن دے گا۔

اس آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو دین ان کے لیے "پسند" کیا ہے اسے روئے زمین پر مستقر اور محکم کرے گا۔ یہ بات پیش نظر رکھتے ہوئے کہ سورۂ نور، سورۂ مائدہ سے پہلے نازل ہوئی ہے اور " رضیت لکم الاسلام دینا " کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو زیر بحث آیت میں ولایت علیؑ کے بارے میں نازل ہوا ہے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام اس صورت میں روئے زمین پر مستحکم ہو سکتا ہے جب " ولایت " کے ساتھ منسلک اور توام ہو کیونکہ یہ وہی اسلام ہے جسے خدا نے " پسند " کیا ہے اور اس کے استقرار و استحکام کا وعدہ کیا ہے۔ واضح تر الفاظ میں اسلام اسی صورت میں عالمگیر ہو سکتا ہے جب وہ ولایت اہل بیتؑ کے مسئلے سے جدا نہ ہو۔

سورۂ نور کی مذکورہ آیت اور زیر بحث آیت کو منضم کرنے سے جو دوسرا مطلب سامنے آتا ہے یہ ہے کہ سورۂ نور کی آیت میں با ایمان افراد سے تین وعدے کیے گئے ہیں۔

پہلا۔ روئے زمین پر خلافت

دوسرا۔ عبادت پروردگار کے لیے امن وامان اور

تیسرا۔ اس دین کا استحکام کہ جو خدا کا پسندیدہ ہے۔

یہ تین وعدے غدیر خم کے روز آیہ ـــــ الیوم اکملت لکم دینکم ـــــ کے نزول کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچے، کیونکہ ایمان و عمل صالح کا کامل نمونہ یعنی ـــــ علیؑ رسول اکرمؐ کی جانشینی کے لیے منصوب اور مقرر ہوئے اور " الیوم یئس الذین کفروا من دینکم " کے ذریعے مسلمانوں کو نسبتاً امن نصیب ہوا نیز " و رضیت لکم الاسلام دینا " کے ذریعے پروردگار کا پسندیدہ دین مسلمانوں میں مستحکم ہوا۔

البتہ یہ تفسیر ان روایات کے منافی نہیں جن میں کہا گیا ہے کہ سورۂ نور کی یہ آیت حضرت مہدیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے کیونکہ " امنوا منکم " کا ایک وسیع مفہوم ہے جس کا ایک نمونہ غدیر خم کے دن انجام پایا اور پھر ایک وسیع تر سطح پر حضرت مہدیؑ کے قیام کے وقت انجام پائے گا۔ اس بنا پر " الارض " آیت میں تمام کرۂ زمین کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا بھی ایک عمومی مفہوم ہے یعنی تمام زمین کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ایک حصے کے لیے بھی، جیسا کہ قرآن میں مختلف مواقع پر اس لفظ کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات یہ زمین کے ایک حصے کے لیے ہے اور بعض اوقات پورے کرۂ ارض کے لیے (غور کیجئے گا)۔

## ایک اہم سوال اور اس کا جواب

آیت کے سلسلے میں صرف ایک سوال اب باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اول تو مذکورہ بالا اسناد اور آیہ " یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک " کے ذیل میں پیش کی جانے والی اسناد کے مطابق دونوں آیات واقعہ غدیر سے مربوط ہیں تو پھر ان دونوں کے درمیان فاصلہ کیوں رکھا گیا ہے۔ ایک سورہ مائدہ کی تیسری آیت ہے اور دوسری آیت کا نمبر ۶۷ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آیت کا یہ حصّہ جو واقعہ غدیر سے مربوط ہے، ایسے مطالب سے منسلک کیا گیا ہے جو حلال و حرام گوشت کے بارے میں ہیں اور ان دونوں کے درمیان کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔[1]

اس کا جواب یہ ہے:

اوّلاً۔ ہم جانتے ہیں کہ قرآنی آیتیں اور اسی طرح سورتیں تاریخ نزول کے مطابق جمع نہیں کی گئیں بلکہ مدینہ میں نازل ہونے والی بہت سی سورتوں میں مکی آیات ہیں اور اس کے برعکس مکی سورتوں میں مدنی آیتیں موجود ہیں۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان روایات کا ایک دوسرے سے الگ ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے (البتہ ہر سورت کی آیات کو فرمان پیغمبر کے تحت رکھا گیا ہے) ہاں البتہ آیات اگر تاریخ نزول کے مطابق جمع کی گئی ہوتیں پھر یہ فاصلہ ہوتا تو اعتراض کیا جا سکتا تھا۔

ثانیاً۔ ممکن ہے کہ غدیر سے مربوط آیت کو حلال و حرام غذاؤں سے متعلق آیت میں تحریف، حذف اور تغییر سے محفوظ رکھنے کے لیے ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نفیس چیز کو محفوظ رکھنے کے لیے عام سی چیزوں میں ملا دیا جاتا ہے تاکہ اس کی طرف کم توجہ ہو (غور کیجیے گا)۔

وہ حوادث جو رسول اللہؐ کی زندگی کے آخری لمحات میں رونما ہوئے اور بعض افراد نے آپ کی طرف سے وصیت نامہ لکھے جانے کی صریح مخالفت کی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ (نعوذ باللہ) حتیٰ کہ رسولِ خداؐ کے بارے میں کہا گیا کہ انھیں ہذیان ہو گیا ہے اور وہ یہ سب باتیں بیماری کے عالم میں کر رہے ہیں۔ رسول اللہؐ کو ایسی ایسی ناموزوں تہمتیں لگائی گئیں۔ اس واقعے کی تفصیل اسلامی دنیا کی مشہور کتب میں موجود ہے اور سنی شیعہ دونوں کی اہم کتب میں یہ واقعہ مذکور ہے۔[2] یہ واقعہ اس سلسلے میں شاہد ناطق ہے کہ بعض لوگ مسئلہ خلافت اور رسول اللہؐ کی جانشینی کے معاملے میں بہت حساس تھے اور وہ اس کے انکار کے لیے ہر انتہائی قدم اٹھانے کو تیار تھے۔

تو کیا ایسے حالات میں ضروری نہیں تھا کہ خلافت سے مربوط اسناد کی حفاظت کی جاتی اور انھیں آنے والے لوگوں تک بحفاظت پہنچانے کا اہتمام کیا جاتا اور ایسے عام مطالب کے ساتھ ملا کر بیان کیا جاتا تاکہ زیادہ سخت مخالفین کی ان پر کم توجہ ہو۔

علاوہ ازیں جیسا کہ ہم جان چکے ہیں کہ اس بات سے متعلق کہ "الیوم اکملت لکم دینکم" کے غدیر اور پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی کے متعلق نزول سے مربوط اسناد صرف شیعہ کتب ہی میں موجود نہیں ہیں کہ ان پر کوئی اعتراض ہو بلکہ اہل سنت کی بہت سی کتب میں بھی یہ روایات موجود ہیں۔ ان میں یہ حدیث مختلف طرق سے تین مشہور صحابہ سے بھی منقول ہے۔

---

[1] یہ سوال تفسیر المنار میں اس آیت سے مربوط مباحث میں اشارتاً مذکور ہے (جلد ۶ صفحہ ۴۶۶)

[2] یہ حدیث اہل سنت کی مشہور ترین کتاب صحیح بخاری میں کئی مقامات پر نقل ہوئی ہے ان میں سے کتاب المرضیٰ جزء ۴ میں، کتاب [illegible] پر، کتاب الجہاد، باب جوائز وفد سے صفحہ ۱۱۸ جزء ۲ میں بھی موجود ہے۔

اسی طرح یہ روایت کتاب صحیح مسلم جزء ۲ میں آخری وصیتوں کے زیر عنوان صفحہ ۱۴ پر موجود ہے۔

علاوہ ازیں دیگر کتب میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ سید شرف الدین مرحوم نے المراجعات میں "رزیہ یوم الخمیس" کے زیر عنوان یہ روایات نقل کی ہیں۔

## اضطراری کیفیت میں حرام گوشت کا حکم

آیت کے آخر میں پھر حرام گوشت سے مربوط مسائل کا ذکر ہے یہاں اضطراری صورت کے لیے حکم بیان کیا گیا ہے، اور جو لوگ بھوک کی حالت میں حرام گوشت کھانے پر مجبور ہو جائیں جبکہ وہ گناہ کی طرف رغبت نہ رکھتے ہوں تو پھر وہ ان کے لیے حلال ہے کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے اور ضرورت کے وقت وہ اپنے بندوں کو مشقت میں نہیں ڈالتا اور انہیں اس پر سزا دیتا ہے (فمن اضطر فی مخمصة غیر متجانف لاثم فان الله غفور رحیم)۔

"مخمصة" کا مادہ "خمص" (بروزن "لمس") ہے جس کا معنی ہے دھنس جانا۔ یہ لفظ صرف بھوک کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے، جبکہ بھوک شکم کے دھنس جانے کا باعث ہو چاہے قحط کے زمانے میں ہو یا کوئی انفرادی طور پر اس مشکل صورتحال سے دوچار ہو جائے۔

"غیر متجانف لاثم" کا معنی ہے "گناہ کی طرف میلان یا رغبت نہ رکھتا ہو" یہ اضطرار کے مفہوم کی تاکید کے طور پر آیا ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ ضرورت کے وقت حرام گوشت کھانے میں تیزی نہ دکھائے اور اسے حلال نہ سمجھنے لگے یا یہ کہ اضطرار کی بنیاد اس نے خود فراہم نہ کی ہو اور یا یہ کہ کسی ایسے سفر میں اس مشکل سے دوچار نہ ہوا ہو، جو اس نے فعل حرام انجام دینے کے لیے اختیار کیا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ اس عبارت سے یہ تمام معانی مراد ہوں۔

اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول صفحہ ۴۰۹ و صفحہ ۴۱۰ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۴۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

## ترجمہ

۴۔ تم سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کون سی چیزیں حلال کی گئی ہیں، کہہ دو کہ پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال کی گئی ہیں، نیز ان شکاری جانوروں کا شکار (بھی تمھارے لیے حلال ہے) جنھیں تم نے وہ کچھ سکھایا جس کی خدا نے تمھیں تعلیم دی تھی۔ بس جو کچھ یہ جانور تمھارے لیے (شکار کرتے ہیں اور) روک سکتے ہیں وہ کھا لو اور (جب جانور کو شکار کے لیے چھوڑو تو) اس پر خدا کا نام لیا کرو اور خدا سے ڈرو کیونکہ خدا جلد حساب لینے والا ہے۔

## شانِ نزول

اس آیت کے بارے میں کئی ایک شانِ نزول ذکر کی گئی ہیں ان میں سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ زید الخیر اور عدی بن حاتم جو صحابیٔ رسولؐ تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ہم کچھ لوگ ہیں جو شکاری کتوں اور بازوں کی مدد سے شکار کرتے ہیں، اور ہمارے شکاری کتے حلال جنگلی جانوروں کو پکڑ لیتے ہیں ان میں سے بعض تو زندہ ہمارے ہاتھ لگ جاتے ہیں اور ہم انھیں ذبح کر لیتے ہیں لیکن ان میں سے بعض کتوں کی وجہ سے مارے جاتے ہیں اور ہمیں انھیں ذبح کرنے کا موقع نہیں ملتا ہم جانتے ہیں کہ خدا نے مردار کا گوشت حرام قرار دیا ہے اب ہماری کیا ذمہ داری ہے؟

اسی سلسلے میں زیرِ نظر آیت نازل ہوئی اور انھیں جواب دیا گیا۔[1]

## تفسیر

### حلال شکار

گذشتہ دو آیات میں حرام و حلال گوشت کے بارے میں احکام بیان ہو چکے ہیں یہاں ان میں سے کچھ مزید احکام کا تذکرہ ہے اس سلسلے میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے: وہ تم سے کھانے والی چیزوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں (یسئلونک ماذا احل لھم) پھر پیغمبر اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے: پہلے تو ان سے کہو کہ ہر پاکیزہ چیز تمھارے لیے حلال ہے (قل احل لکم الطیبات) یعنی اسلام نے جو کچھ حرام قرار دیا ہے وہ ناپاک ہے اور خبائث کے زمرے میں آتا ہے اور قوانینِ الٰہی کسی ایسی چیز کو کبھی حرام قرار نہیں دیتے جو پاکیزہ ہو اور فطری طور پر نوع البشر کے فائدے اور نفع کے لیے پیدا کی گئی ہو لہٰذا حقیقی شریعت قوانینِ تکوین سے ہمیشہ ہم آہنگ ہوتی ہے۔

پھر شکار کے بارے میں فرمایا گیا ہے: تمھارے سدھائے ہوئے ایسے جنھیں تم نے وہ کچھ سکھایا ہے جس کی خدا نے تعلیم دی ہے ان شکاری جانوروں کا شکار تمھارے لیے حلال ہے (وما علمتم من الجوارح مکلبین تعلمونھن مما علمکم اللّٰہ)۔[2]

"جوارح" اصل میں "جرح" سے لیا گیا ہے جو کبھی "کسب" اور "کام" کے معنی میں آتا ہے اور کبھی "زخم" کے معنی میں۔ اسی لیے شکاری جانوروں کو چاہے وہ پرندے ہوں یا کوئی اور جانور "جارحہ" کہتے ہیں "جارحہ" کی جمع "جوارح" ہے۔ یعنی وہ جانور جو اپنے شکار کو زخم لگاتے ہیں یا وہ جانور جو اپنے مالک کے لیے کسب کرتے ہیں۔

بدن کے اعضاء کو بھی جوارح اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان ان کے ذریعے کسی کام کو انجام دیتا ہے اور اکتساب کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر قرطبی ج ۲، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] اس جملے کی ابتداء میں حذف و تقدیر موجود ہے "فکلوا مما امسکن علیکم" سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں "وصید ما علمتم" ہے (غور کیجیے گا)۔

اس لیے "وما علمتم من الجوارح" ان تمام جانوروں کے لیے ہے جنھیں شکار کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ لیکن ساتھ "مکلبین" بھی ہے جو "کلب" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "کتا"۔ "مکلبین" شکاری کتوں کی تربیت کرنے والوں کو کہتے ہیں۔ اس طرح یہ تعبیر جملے کو شکاری کتوں سے مخصوص کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ آیت شکاری کتوں کے علاوہ باز وغیرہ سے کیے گئے شکار کے بارے میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ فقہ میں صرف شکاری کتوں سے کیا جانیوالا شکار جائز ہے، اگرچہ اہلِ سنت کے بعض مفسرین سب کو جائز سمجھتے ہیں اور "مکلبین" کا مفہوم وسیع قرار دیتے ہیں کہ جو کتوں سے شکار کرنے والوں کے لیے مخصوص نہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، اس لفظ کا اصلی مادہ اسے شکاری کتوں کی تربیت سے مخصوص کر دیتا ہے۔ البتہ اگر دوسرے شکاری جانور کسی شکار کو بے بس کر دیں لیکن اسے مرنے سے پہلے آدابِ شرعی کے مطابق ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہے۔

## تعلمونھن مما علمکم اللہ۔ میں چند نکات

۱۔ ایسے جانوروں کی تعلیم و تربیت مستقل اور مسلسل ہو۔ اگر وہ اپنی تعلیم بھول جائیں اور آوارہ کتوں کی طرح کسی جانور کو چیر پھاڑ دیں تو اس شکار کا گوشت حلال نہیں ہوگا کیونکہ "تعلمونھن" فعل مضارع ہے اور مضارع استمرار پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ کتے کی تعلیم و تربیت صحیح اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے یہ بات "مما علمکم اللہ" کے مفہوم سے مطابقت رکھتی ہے۔

۳۔ تمام علوم کا سرچشمہ خدا ہے چاہے وہ عام اور چھوٹے چھوٹے امور کا علم ہو یا اہم۔ اسکی تعلیم کے بغیر ہم کوئی علم نہیں رکھتے۔

ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ شکاری کتوں کی تعلیم سے مراد یہ ہے کہ ان کی تربیت اس طرح سے ہونی چاہیے کہ وہ مالکوں کے حکم سے چل پڑیں اور ان کے روکنے سے رک جائیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جس جانور کو کتے شکار کرتے ہیں اگر وہ زندہ ہاتھ آجائے تو اسے آدابِ اسلامی کے مطابق ذبح کیا جانا چاہیے، لیکن شکاری کے پہنچنے سے پہلے اس کی جان نکل جائے تو وہ حلال ہے اگرچہ اسے ذبح نہیں بھی کیا گیا۔

اس کے بعد ایسے شکار کی حلیت کی شرائط میں سے دو کا ذکر کیا گیا ہے، اس شکار کو جسے شکاری کتے تمھارے لیے روکے رکھیں، کھالو (فکلوا مما امسکن علیکم) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر شکاری کتے اس بات کے عادی ہوں کہ اپنے شکار کا کچھ حصہ کھا لیتے ہیں اور کچھ چھوڑ دیتے ہوں تو ایسا شکار حلال نہیں ہے اور وہ "وما اکل السبع" کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے جس کا گذشتہ آیت میں ذکر ہے۔ حقیقت میں ایسا کتا نہ تو تعلیم یافتہ ہے اور نہ اس سے جو کچھ بچا کھا ہے وہ "علیکم" (تمھارے لیے) کا مصداق ہے۔

بعض فقہا اس شرط کے قائل نہیں ہیں وہ اس سلسلے میں چند روایات سے استناد کرتے ہیں جو کتب احادیث میں موجود ہیں بہرحال اس پر تفصیلی بحث فقہی کتب میں موجود ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان کی ایسے تربیت ہونا چاہیے کہ وہ اپنا شکار کھائیں نہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ جب شکاری کتے کو چھوڑا جائے تو خدا کا نام لیا جائے (واذکروا اسم اللہ علیہ)
آخر میں ان تمام احکام کا احترام کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: خدا سے ڈرو کیونکہ وہ سریع الحساب ہے (واتقوا اللہ ان اللہ سریع الحساب)[1]

۵۔ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۪ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

## ترجمہ

۵۔ آج کے دن پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال ہو گئی ہیں اور (اسی طرح) اہل کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کے لیے حلال ہے نیز مسلمانوں میں پاکدامن عورتیں اور اہل کتاب میں سے پاکدامن عورتیں حلال ہیں جبکہ ان کا حق مہر ادا کر دو اور پاکدامن رہو نیز پوشیدہ طور پر اور غیر شرعی طریقے سے یاری نہ لگاؤ، اور جو شخص ان چیزوں سے کفر اختیار کرے کہ جن پر ایمان لانا چاہیے اس کے اعمال باطل اور بے اثر ہو جاتے ہیں اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگا۔

## تفسیر

### اہل کتاب کا کھانا کھانا اور ان میں شادی بیاہ کرنا

یہ آیت گذشتہ آیات کے مباحث کی تکمیل کرتی ہے، پہلے فرمایا: آج کے دن سے پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال ہو گئی

---

[1] سریع الحساب (جلدی حساب لینے والا) کی تشریح تفسیر نمونہ جلد اوّل ۲۸۵ (اردو ترجمہ) پر گذر چکی ہے۔

ہیں اور اہل کتاب کے کھانے تمہارے لیے اور تمہارے کھانے ان کے لیے حلال ہیں (الیوم احل لکم الطیبت وطعام الذین اوتوا الکتب حل لکم وطعامکم حل لهم)۔

یہاں چند مطالب توجہ طلب ہیں۔

۱۔ "الیوم" (آج کا دن) سے مراد بعض مفسرین کے مطابق عرفہ کا دن ہے اور بعض اسے فتح خیبر کا دن کہتے ہیں لیکن بعید نہیں کہ یہ یوم غدیر ہو کہ جب اسلام کو کفار پر مکمل کامیابی حاصل ہوئی تھی (اس بات کی وضاحت ہم عنقریب کریں گے)۔

۲۔ طیبات تو اس دن سے پہلے بھی حلال تھے یہاں ان کی حلت کا ذکر اہل کتاب کے کھانے کے بارے میں آنیوالے حکم کی تمہید کے طور پر ہے۔

۳۔ اہل کتاب کا طعام جسے آیت میں حلال قرار دیا گیا ہے اس سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں زیادہ تر مفسرین اور علماء اہل سنت کا نظریہ یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کا کھانا شامل ہے، چاہے ان جانوروں کا گوشت ہو جو ان کے ہاتھ سے ذبح ہوئے ہوں۔ یا اس کے علاوہ کچھ ہو۔ لیکن شیعہ فقہاء اور مفسرین کی قطعی اکثریت کا یہ نظریہ ہے کہ اس سے مراد ان کے ہاتھوں ذبح شدہ جانوروں کے گوشت کے علاوہ ہے چند شیعہ علماء پہلے نظریہ کے پیرو ہیں۔

ائمہ اہل بیتؑ سے منقول متعدد روایات بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہیں کہ آیت میں طعام سے مراد اہل کتاب کے ذبیحہ کے علاوہ ہے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں امام صادق علیہ السلام سے زیر نظر آیت کے بارے میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

"عنی بطعامهم ههنا الحبوب والفاکهة غیر الذبائح التی یذبحون فانهم لا یذکرون اسم الله علیها"

اہل کتاب کے طعام سے مراد دانے اور میوے ہیں نہ کہ ان کے ذبح کیے ہوئے جانور، کیونکہ وہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتے[1]

دوسری متعدد روایات جو وسائل الشیعہ جلد ۱۶ ابواب الاطعمہ والاشربہ کے باب ۵۱ صفحہ ۳۷۱ پر مذکور ہیں نیز گذشتہ آیات میں دقت نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے ذبح شدہ جانوروں کے علاوہ ان سے کھانا پینا حقیقت کے زیادہ نزدیک ہے، کیونکہ جیسا کہ امام صادق علیہ السلام نے مذکورہ روایت میں نشاندہی فرمائی ہے کہ اہل کتاب ذبح کرنے میں زیادہ تر اسلامی شرائط کو ملحوظ نہیں رکھتے نہ وہ خدا کا نام لیتے ہیں اور نہ جانور کو رو بقبلہ ذبح کرتے ہیں، اسی طرح باقی شرائط بھی پوری نہیں کرتے تو کیسے ممکن ہے کہ گذشتہ آیات میں تو ایسا جانور صریحاً حرام قرار دیا گیا ہو اور اس آیت میں اسے حلال شمار کر لیا گیا ہو۔

یہاں چند سوالات سامنے آتے ہیں:

<u>پہلا سوال</u>: اگر طعام سے مراد گوشت کے علاوہ دوسرے کھانے ہیں تو وہ تو پہلے بھی حلال تھے کیا اس آیت کے نزول سے

---

[1] وسائل الشیعہ، جلد ۱۶ صفحہ ۳۹۱

قبل گندم اور ایسی دیگر اجناس اہلِ کتاب سے خریدنا ممنوع تھا، حالانکہ مسلمانوں اور ان کے درمیان ہمیشہ کاروبار رہتا تھا۔

آیت کی تفسیر میں ایک بنیادی نقطے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب اسلام پورے جزیرۂ عرب پر غالب آچکا تھا۔ اور پورے جزیرۂ عرب میں اس کا وجود مسلّم ہو چکا تھا اب دشمنانِ اسلام مسلمانوں کو شکست دینے سے مایوس ہو چکے تھے اس موقع پر ان حد بندیوں کو برطرف کیا جانا چاہیے تھا جو پہلے کفار سے مسلمانوں کی معاشرت کے بارے میں تھیں، پہلے ان کے ہاں آنا جانا، انھیں مہمان بلانا، ان کے ہاں بطور مہمان جانا ممنوع تھا۔ لہٰذا اس آیت نے بتایا کہ اب کے بعد جبکہ تم اپنی حیثیت اور مقام منوا چکے ہو اور ان سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں رہا ان سے معاشرتی حد بندیوں میں کمی کر دی گئی ہے لہٰذا اب تم ان کے مہمان بن سکتے ہو اور انھیں بھی اپنے ہاں دعوت دے سکتے ہو اسی طرح ان میں شادی بھی کر سکتے ہو (لیکن ان سب امور کی اپنی اپنی شرائط ہیں جن کی طرف اشارہ کیا جائے گا)۔

یہ بات بغیر کہے نہ رہ جائے کہ جو لوگ اہل کتاب کو پاک نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ کھانا اس صورت میں کھایا جا سکتا ہے جب غذا وغیرہ مرطوب نہ ہو یا مرطوب ہو تو ان کا ہاتھ اسے نہ لگا ہو لیکن ایسے محققین جو اہلِ کتاب کی طہارت کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ اگر ان کا کھانا ان کے ذبیحے سے تیار نہ کیا گیا ہو اور نجاست عرضی کا یقین بھی نہ ہو (مثلاً شراب یا آب جو وغیرہ سے نجس نہ ہوا ہو) تو پھر ان کے ساتھ کھانا کھایا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ زیر بحث آیت کا مقصد دراصل اہلِ کتاب سے معاشرت کے سلسلے میں گذشتہ حد بندیوں کو برطرف کرنا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ تمہارا کھانا بھی ان کے لیے حلال ہے یعنی انھیں اپنے ہاں مہمان بلانے میں بھی کوئی حرج نہیں نیز اس کے فوراً بعد اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کے بارے میں بھی حکم بیان کیا گیا ہے۔

یہ امر واضح ہے کہ ایک حکومت اپنے پیروکاروں کو ایسا حکم دے سکتی ہے جب وہ اپنے ماحول پر پوری طرح سے کنٹرول حاصل کر لے اور اسے دشمن کا کوئی خوف نہ رہے ایسی صورتِ حال دراصل یوم غدیر پر پیدا ہو چکی تھی۔ بعض کے نزدیک یہ حجۃ الوداع کا روزِ عرفہ تھا یا فتح خیبر کے بعد کا موقع تھا اگرچہ غدیر خم کا دن اس بات کیلئے ہر لحاظ سے زیادہ سازگار معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا سوال: جو تفسیر المنار میں زیر بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں آیا ہے یہ ہے کہ صاحبِ تفسیر کے مطابق لفظ "طعام" بہت سی قرآنی آیات میں ہر قسم کی غذا کے لیے آیا ہے یہاں تک کہ گوشت بھی اس میں شامل ہے اب کیسے ممکن ہے کہ زیر بحث آیت میں اسے غلات اور میوہ جات وغیرہ میں محدود کر دیا جائے۔ موصوف اس کے بعد لکھتے ہیں کہ میں نے یہ اعتراض ایک ایسی مجلس میں پیش کیا جس میں کچھ شیعہ علماء بھی موجود تھے (اور کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا)۔

ہمارے نقطہ نظر کے مطابق اس اعتراض کا جواب بھی واضح ہے ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ لفظ "طعام" کا ایک وسیع مفہوم ہے لیکن گذشتہ آیات جن میں مختلف طرح کے گوشت کے بارے میں بحث ہے اور خصوصاً ان جانوروں کو حرام قرار دیا گیا ہے جنھیں ذبح کرتے وقت خدا کا نام نہیں لیا گیا، وہ اس وسیع مفہوم کی تخصیص کرتی ہیں اور اسے ایسے گوشت کے علاوہ میں محدود کر دیتی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر عام اور مطلق قابلِ تخصیص ہے اور اسے بعض شرائط کا پابند کیا جا سکتا ہے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اہل کتاب

ذبیحہ پر نام خدا لینے کے پابند نہیں ہیں اور اس کے علاوہ وہ دیگر شرائط کا بھی لحاظ نہیں رکھتے جو سنت سے ثابت ہیں۔

تیسرا سوال: کتاب کنز العرفان میں اس آیت کی تفسیر میں ایک اور اشکال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "طیبات" کا ایک وسیع مفہوم ہے اور اصطلاح کے مطابق عام ہے لیکن "طعام الذین اوتوا الکتٰب" خاص ہے اور عموماً عام کے بعد خاص کے ذکر میں کوئی نکتہ ہونا چاہیے مگر یہاں کوئی واضح نکتہ نہیں ہے اسکے بعد مصنف اس اُمید کا اظہار کرتا ہے کہ خدا اس کی اس علمی مشکل کو حل کر دے[1]

مندرجہ بالا سطور میں اس سلسلے میں جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب بھی معلوم ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ طیّبات کے حلال ہونے کا ذکر اہلِ کتاب سے میل جول پر عائد پابندی ختم کرنے کے لیے مقدمہ و تمہید کے طور پر آیا ہے حقیقت میں آیت کہتی ہے کہ ہر پاکیزہ چیز تمہارے لیے حلال ہے اسی وجہ سے اہلِ کتاب کا (پاکیزہ) کھانا بھی تمہارے لیے حلال ہے اور ان سے معاشرت کے بارے میں جو پابندیاں پہلے عائد تھیں آج تمہیں میسر کامیابیوں کے باعث کم کر دی گئی ہیں (غور کیجیے گا)۔

## غیر مُسلم عورتوں سے شادی

اہلِ کتاب کے کھانے کی حلیت کا حکم دینے کے بعد آیت میں پاکدامن مسلمان اور پاکدامن اہلِ کتاب عورتوں سے شادی بیاہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے: تمہارے لیے مسلمان اور اہلِ کتاب پاکدامن عورتیں حلال ہیں اور تم ان سے شادی کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کا حق مہر انہیں ادا کر دو (والمحصنات من المؤمنات والمحصنات من الذین اوتوا الکتٰب من قبلکم اذا اٰتیتموھن اجورھن) اور یہ بھی شرط ہے کہ شادی مشروع اور جائز طریقے سے ہو نہ کہ کھلے بندوں زنا ہو یا مخفی طور پر یاری لگاتے پھرو (محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان)۔[2]

درحقیقت آیت کا یہ حصہ بھی غیر مسلم عورتوں سے مسلمانوں کی شادی بیاہ کے سلسلے میں پابندیوں میں کمی کے لیے ہے۔ اس میں اہلِ کتاب عورتوں سے مسلمان مردوں کی شادی کو مشروط طور پر جائز قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اہلِ کتاب عورتوں سے ہر طرح کی دائمی و موقت شادی جائز ہے یا صرف ازدواج موقت یعنی متعہ جائز ہے فقہائے اسلام میں اس سلسلے میں اختلاف ہے علمائے اہلِ سنت ان دو طرح کی تزویج میں فرق کے قائل نہیں ان کا نظریہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت عمومیت کی حامل ہے لیکن بعض شیعہ فقہاء کے نزدیک یہ آیت صرف موقت ازدواج کی اجازت دیتی ہے۔ آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے منقول بعض روایات بھی اس نظریے کی تائید کرتی ہیں اور آیت میں بھی بعض ایسے قرائن موجود ہیں

---

[1] کنز العرفان، جلد ۲ صفحہ ۳۱۲

[2] جیسا کہ اس تفسیر کی جلد ۲ میں سورہ نساء کی آیت ۲۵ کے ذیل میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ "اخدان" "خدن" (بروزن "اذن") سے دوست اور رفیق کے معنی میں ہے لیکن عام طور پر جنس مخالف سے غیر شرعی طور پر پوشیدہ دوستی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

جنھیں اس نظریئے پر شاہد قرار دیا جا سکتا ہے۔

پہلا قرینہ یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے: اذا اٰتیتموھن اجورھن ــــ بشرطیکہ ان کی اُجرت انھیں ادا کرو.... یہ درست ہے کہ "اجر" عقد دائمی اور عقد موقت دونوں کے حق مہر کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن زیادہ تر ازدواج موقت کیلیے استعمال ہوتا ہے یعنی زیادہ تر اسی سے مناسبت رکھتا ہے۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے: غیر مسافحین ولا متخذی اخدان۔ زنا اور پوشیدہ طور پر غیر شرعی یاری دوستی کے طور پر نہ ہو.... یہ تعبیر بھی موقت ازدواج سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے کیونکہ دائمی شادی زنا اور پوشیدہ دوستی سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی کہ اس سے منع کیا جاتا لیکن بعض اوقات نادان اور بے خبر لوگ ازدواج موقت کو زنا یا پوشیدہ دوستی سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ان سب باتوں سے قطع نظر یہ تعبیرات سورۂ نساء کی آیت ۲۵ میں دکھائی دیتی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ وہ آیت ازدواج موقت کے بارے میں ہے۔

ان تمام امور کے باوجود بعض فقہا اہلِ کتب سے مطلق ازدواج کو جائز سمجھتے ہیں اور مذکورہ قرآن کو آیت کی تخصیص کے لیے کافی نہیں سمجھتے اور اس سلسلے میں بعض روایات سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں زیادہ تفصیل فقہی کتب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ بات بتا کہے نہ رہ جائے کہ آج جبکہ زمانہ جاہلیت کی بہت سی رسمیں زندہ ہو چکی ہیں یہ نظریہ بھی وجود میں آ چکا ہے کہ غیر شادی شدہ افراد کیلیے عورت یا مرد سے دوستانہ تعلقات میں نہ صرف مخفی صورت میں بلکہ کھلے بندوں بھی کوئی حرج نہیں۔

درحقیقت آج کی دنیا نے گناہ اور جنسی بے راہ روی میں زمانہ جاہلیت سے بھی قدم آگے بڑھا لیا ہے کیونکہ اس دور میں تو مخفی تعلقات کو جائز سمجھا جاتا تھا لیکن آج علی الاعلان ایسی دوستی کو جائز قرار دیا جاتا ہے یہاں تک کہ انتہائی بے شرمی سے اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے یہ رسوا کن رسم جو واضح اور شرمناک بدکاری ہے مغرب کی طرف سے مشرق کے لیے منحوس سوغات ہے یہ بہت سی بدبختیوں اور جرائم کا سرچشمہ ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اہلِ کتاب کے طعام کے بارے میں (مذکورہ شرائط کے ساتھ) اجازت دی گئی ہے کہ ان سے کھانا کھایا بھی جا سکتا ہے اور انھیں کھلایا بھی جا سکتا ہے، لیکن شادی بیاہ کے سلسلے میں صرف ان سے رشتہ لینا جائز ہے، مسلمان عورتوں کے لیے کسی طرح کوئی اجازت نہیں کہ وہ اہلِ کتاب کے مردوں سے شادی کریں، اس کا فلسفہ کچھ زیادہ واضح ہے کہ عورتیں نسبتاً نرم دل ہوتی ہیں اور ممکن ہے کہ برخلاف مرد کے عورت بہت جلد اپنے شوہر کا عقیدہ قبول کر لے۔

مندرجہ بالا سہولتیں جو کہ اہلِ کتاب سے معاشرت اور ان کی عورتوں سے ازدواج کرنے کے بارے میں ہیں جن سے ممکن ہے کہ بعض لوگ غلط فائدہ اٹھائیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی طرف کھنچے چلے جائیں، لہٰذا آیت کے آخر میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جو شخص ان چیزوں سے کفر اختیار کرے کہ جن پر ایمان لانا چاہیے اور مومنین کا راستہ چھوڑ کر کفار کی راہ اختیار کرے اس کے اعمال برباد ہو جائیں گے اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگا (ومن یکفر بالایمان فقد حبط عمله وهو فی الاٰخرة من الخاسرین)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مذکورہ سہولتیں تمام تمہاری زندگی کی کشائش و آرام کے علاوہ اس چیز کا باعث بننا چاہئیں کہ تم ان بے گانوں میں اثر و نفوذ پیدا کرو نہ یہ کہ تم ان کے زیر اثر ہو جاؤ اور اپنے دین سے دستبردار ہو جاؤ، کیونکہ اس صورت میں تمہاری سزا بہت سخت ہوگی[1]

آیت کے اس حصے کی تفسیر کے سلسلے میں چند روایات اور مذکورہ شانِ نزول کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیت کے نزول اور اہل کتاب کے ساتھ کھانے اور ان کی عورتوں کی حلیت کے بعد بھی بعض مسلمان اسے ناپسند کرتے تھے لہٰذا قرآن نے انھیں تنبیہ کی کہ اگر انھیں خدا کے نازل کردہ احکام پر اعتراض ہے اور وہ اس کا انکار کرتے ہیں تو ان کے اعمال برباد ہو جائیں گے اور وہ خسارے میں رہیں گے۔

۶۔ یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَیْدِیَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَیْنِ ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَیَمَّمُوا صَعِیدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَیْدِیكُمْ مِنْهُ ۚ مَا یُرِیدُ اللَّهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَٰكِنْ یُرِیدُ لِیُطَهِّرَكُمْ وَلِیُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ○

## ترجمہ

۶۔ اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہو تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو اور سر اور پاؤں کا مفصل (یا ابھری ہوئی جگہ تک) مسح کرو اور اگر حالتِ جنب میں ہو تو غسل کرو اور اگر بیمار ہو یا مسافر ہو یا تم میں سے کوئی (قضائے حاجت کی) پست جگہ سے آیا ہے یا عورتوں سے (مباشرت کیلیے) لمس کیا ہو اور (غسل یا وضو کیلیے) پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی سے تیمم کرو اور اس (مٹی) سے چہرے کے اوپر (پیشانی پر) اور ہاتھوں پر مسح کرو۔ خدا انہیں

---

[1] حبط اور احباط کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول سورۂ بقرہ آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں ص ۵۰۶ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

چاہتا کہ تمھارے لیے مشکل پیدا کرے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کرے شاید تم اس کا شکر ادا کرو۔

# تفسیر

## جسم اور رُوح کی پاکیزگی

گذشتہ آیات میں جسمانی پاکیزگی اور مادی نعمات کے بارے میں بحثیں تھیں۔ زیرِ نظر آیت میں روحانی پاکیزگی سے متعلق گفتگو ہے اس میں ان امور کا تذکرہ ہے جو روحانی طہارت کا باعث ہیں۔ اس میں وضو، غسل اور تیمم کے احکام ہیں اور روح کی صفائی کا باعث ہیں پہلے تو اہلِ ایمان سے خطاب کرتے ہوئے احکامِ وضو بیان کیے گئے ہیں: اے ایمان والو! جب نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ، تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور سر کے ایک حصے کا اور اسی طرح پاؤں کا مفصل (یا ابھری ہوئی جگہ) تک مسح کرو
(یایھا الذین اٰمنوا اذا قمتم الی الصلٰوۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برء وسکم وارجلکم الی الکعبین)۔

آیت میں وضو میں دھونے کے لیے چہرے کی حدود کا ذکر نہیں، لیکن روایاتِ اہل بیتؑ میں رسول اللہؐ کے وضو کرنے کا طریقہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

۱۔ لمبائی میں چہرے کی حد بالوں کے اگنے کی جگہ سے لے کر ٹھوڑی تک ہے اور چوڑائی میں وہ حصہ جو درمیانی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان آجائے۔

دراصل یہ "وجہ" (چہرے) کے اس معنی کی وضاحت ہے جو عرفِ عام میں اس سے سمجھا جاتا ہے کیونکہ وجہ (چہرہ) وہی حصہ ہے جس کا انسان سے ملتے ہی "مواجہ" (سامنا) ہوتا ہے۔

۲۔ ہاتھ کی حد جو وضو میں دھوئی جانی چاہیے کہنی تک بیان ہوئی ہے کیونکہ "مرافق" "مرفق" کی جمع ہے جس کا معنی ہے "کہنی"۔ جب کہا جائے کہ ہاتھ دھولو تو ممکن ہے ذہن میں یہ آئے کہ انھیں کلائی تک دھونا ہے کیونکہ عام طور پر یہی مقدار دھوئی جاتی ہے اس وہم کو دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے، کہنیوں تک دھوؤ (الی المرافق) اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ

---

ؔ آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول متعدد روایات میں ہے کہ قمتم (تم کھڑے ہو) سے مراد ہے نیند سے اٹھنا۔ آیت کے مشتملات اور تمام حصوں پر غور کرنے سے بھی اس معنی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ بعد میں تیمم کا حکم بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، اوجاء احد منکم من الغائط (یا کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے لوٹے)۔ اگر آیت کا خطاب اصطلاحاً بے وضو افراد سے ہوتا تو اس جملے کا عطف اور وہ بھی "اَوْ" کے ذریعے آیت کے ظاہری مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتا تاکید کرتا ہی ہے وضو کے عنوان میں داخل ہے لیکن اگر آیت کے آغاز میں خطاب نیند سے اٹھنے والے لوگوں سے ہے اور اصطلاح کے مطابق صرف نیند کا حدث بیان کیا گیا ہے تو پھر اس جملے کا مفہوم بھی مکمل ہوگا (غور کیجیے گا)۔

"الیٰ" اس آیت میں فقط دھونے کی حد بیان کرنے کے لیے ہے نہ کہ کیفیت بیان کرنے کے لیے جیسا کہ بعض کو اس سے بھی گمان ہوا ہے ان کا خیال ہے کہ آیت کہتی ہے کہ ہاتھ کو انگلیوں کے سروں سے لے کر کہنی تک دھونا چاہیے (جیسا کہ اہل سنت کے ایک طبقے میں رائج ہے)۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ بالکل اس طرح ہے کہ انسان کسی کاریگر سے کہے کہ کمرے کی دیوار کو نیچے سے لے کر ایک میٹر اوپر تک رنگ کر دو تو واضح ہے کہ مقصد یہ نہیں کہ دیوار کو نیچے سے اوپر کی طرف رنگ کرو بلکہ مراد یہ ہے کہ اتنی مقدار کو رنگ کرو اس سے زیادہ یا کم نہ ہو، اس لیے یہاں آیت میں بھی صرف ہاتھ کی وہ مقدار مقصود ہے جسے دھونا چاہیے۔ رہی اس کی کیفیت تو وہ سنت پیغمبر میں ہے جو ان کے اہل بیت کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہے اس کے مطابق کہنیوں سے لے کر انگلیوں کے سروں تک دھونا چاہیے۔

توجہ رہے کہ کہنی کو بھی وضو میں ساتھ دھونا چاہیے کیونکہ ایسے مواقع پر اصطلاح کے مطابق "غایت مغیا میں داخل ہے" یعنی حد بھی حکم محدود میں شامل ہے۔[1]

۳۔ کلمہ "ب" جو "برؤوسکم" میں ہے بعض روایات کے مطابق اور بعض اہل لغت کی تصریح کے مطابق تبعیض کے لیے ہے یعنی کچھ حصے کے مفہوم میں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سر کے کچھ حصے کا مسح کرو جسے ہماری اصطلاح میں سر کے اگلے حصے سے محدود کیا گیا ہے اور اس کے لیے سر کے چوتھائی یا کچھ کم حصے پر ہاتھ سے مسح کیا جاتا ہے اس لیے جو اہل سنت کے بعض گروہوں میں مروج ہے کہ وہ پورے سر کا یہاں تک کہ کانوں کا بھی مسح کرتے ہیں وہ آیت کے مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتا۔

۴۔ "ارجلکم" "برؤوسکم" کے ہم پہلو آیا ہے یہ اس بات پر شاہد ہے کہ پاؤں کا بھی مسح کیا جائے نہ کہ اسے دھویا جائے۔ "ارجلکم" کی لام پر زبر اس وجہ سے ہے کہ اس کا عطف "برؤوسکم" کے محل پر ہے نہ کہ "وجوھکم" پر عطف ہے۔[2]

۵۔ "کعب" لغت میں پاؤں کے اوپر کی ابھری ہوئی جگہ اور مفصل کے معنی میں آیا ہے یعنی وہ مقام جہاں پاؤں کی ہڈی سے پنڈلی کی ہڈی مل جاتی ہے۔[3]

---

[1] سیبویہ عربی لغت کا مشہور ماہر اور علم نحو کا عالم تھا وہ کہتا ہے کہ جہاں کہیں لفظ "الیٰ" کا مابعد اور ماقبل ایک جنس سے ہوں تو مابعد ماقبل کے حکم میں ہوتا ہے اور اگر دو جنسوں سے ہوں تو پھر خارج ہوتا ہے (مثلاً اگر کہا جائے کہ دن کی آخری گھڑی تک روزہ رکھو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آخری گھڑی میں بھی روزہ رکھو اور اگر کہا جائے کہ ابتدائے رات تک روزہ رکھو تو اس کا معنی یہ ہے کہ ابتدائے رات حکم میں داخل نہیں ہے)۔ (المنار ج ۶ ص ۲۲۳)۔

[2] اس میں شک نہیں کہ "وجوھکم" اور "ارجلکم" میں بہت فاصلہ ہے لہٰذا اس پر عطف کرنا بہت بعید نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے قاریوں نے "ارجلکم" کو لام کی زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔

[3] قاموس میں "کعب" کے تین معنی مذکور ہیں۔ ۱۔ پشت پا کی ابھری ہوئی جگہ، ۲۔ مفصل اور ۳۔ ٹخنے جو پاؤں کے دونوں طرف ہیں لیکن جو بات ہم نے کہی ہے اس میں یہ بات مسلم ہے کہ اس سے ٹخنے مراد نہیں، لیکن اس بات میں فقہا میں اتفاق نہیں کہ آیا یہ پاؤں پر کی ابھری ہوئی جگہ ہے یا پاؤں اور پنڈلی کا جوڑ (مفصل)، بہرحال احتیاط یہی ہے کہ جوڑ تک ہی مسح کیا جائے۔

اس کے بعد غسل کے بارے میں حکم ہے، فرمایا گیا ہے: اگر مجنب ہو تو غسل کرو (وان کنتم جنبًا فاطّھّروا)۔

واضح ہے کہ " فاطّھّروا " سے مراد پورے جسم کا دھونا ہے کیونکہ اگر کسی مخصوص حصے کا دھونا مطلوب ہوتا تو اس کا نام لیا جانا ضروری تھا اس لیے جب یہ فرماتا ہے کہ اپنے آپ کو دھو لو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ سارے بدن کو دھو لو۔ اس کی نظیر سورۂ نساء آیۃ ۴۳ میں بھی موجود ہے، جہاں فرمایا گیا ہے:

حتی تغتسلوا

جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد ۳ میں سورۂ نساء آیۃ ۴۳ کے ضمن میں نشاندہی کی جا چکی ہے کہ لفظ " جنب " مصدر ہے جو اسم فاعل کے معنی میں آیا ہے دراصل اس کا مطلب ہے " دور ہونے والا " اس کی وجہ یہ ہے کہ مجنب کو اس حالت میں نماز کی ادائیگی، مسجد میں توقف اور اس طرح کے دیگر کاموں سے دوری اختیار کرنا چاہیے۔ اور لفظ " جنب " مفرد، جمع، مذکر اور مونث سب کے لیے بولا جاتا ہے " جار جنب " کا اطلاق دور کے ہمسایوں پر بھی اسی مناسبت سے ہے۔

قرآن مندرجہ بالا آیت میں کہتا ہے: نماز کے وقت مجنب ہو جاؤ تو غسل کرو، ممکن ہے اس سے یہ بھی اخذ کیا جا سکے کہ غسلِ جنابت، وضو کا بھی جانشین ہے۔

اس کے بعد تیمم کا حکم بیان کیا گیا ہے: اگر نیند سے اُٹھے ہو اور نماز کا ارادہ رکھتے ہو اور بیمار یا مسافر ہو یا قضائے حاجت سے لوٹے ہو یا عورتوں سے جنسی ملاپ کر چکے ہو اور پانی تک تمھاری رسائی نہیں ہے تو پاک مٹی سے تیمم کر لو (وان کنتم مرضیٰ او علی سفر او جاء احد منکم من الغائط او لٰمستم النساء فلم تجدوا ماء فتیمموا صعیدًا طیبًا)۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ " او جاء احد منکم من الغائط " اور " او لٰمستم النساء " کا عطف جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے آیت کی ابتداء یعنی " اذا قمتم الی الصلوٰۃ " پر ہے حقیقت میں آیت کی ابتداء میں نیند کے مسئلے کی طرف اشارہ ہے اور آیت کے ذیل میں دو مزید چیزوں کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو وضو یا غسل کا سبب بنتی ہیں اگر ان دونوں جملوں کا عطف " علی سفر " پر کریں تو آیت میں کئی ایک اشکالات پیدا ہوں گے مثلاً قضائے حاجت سے لوٹنا، بیماری اور مسافرت کے مقابل پر نہیں ہو سکتا لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ " او " کو " واؤ " کے معنی میں لیں (جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے) اور یہ ظاہر کے بالکل خلاف ہے علاوہ ازیں یہ اشکال بھی ہے کہ وضو واجب کرنے والے امور میں سے صرف قضائے حاجت کا ذکر کرنا اس صورت میں بلاوجہ ہوگا، اگر اس طرح سے ہو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں تو ان دونوں میں سے کوئی اعتراض لاحق نہ ہوگا (غور کیجیے گا)۔

(بہت سے مفسرین کی طرح اگرچہ ہم بھی جلد ۳ میں نساء ۴۳ میں " او " کو واؤ کے معنی میں ذکر کر چکے ہیں لیکن جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ زیادہ قرینِ نظر ہے)۔

دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں مسئلہ جنابت کا دو مرتبہ ذکر آیا ہے ممکن ہے یہ تاکید کے لیے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ " جنب " جنابت در نیند میں احتلام کے معنی میں ہو اور " او لٰمستم النساء " سے جنسی ملاپ والی جنابت سے کنایہ ہو نیز اگر " قیام " سے مراد " نیند سے اٹھنا " لیا جائے جیسا کہ روایات اہلِ بیتؑ میں ہے اور خود آیت میں اس کا قرینہ موجود ہے تو یہ خود مسئلہ جنابت کے بارے میں کی گئی تفسیر پر شاہد ہوگا (غور کیجیے گا)۔

اس کے بعد تیمم کا طریقہ بیان کیا گیا ہے ؛ اس کے ذریعے اپنے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرو (فامسحوا بوجوھکم وایدیکم منہ)۔

واضح ہے کہ یہاں یہ مراد نہیں کہ کچھ مٹی اٹھالیں اور اسے اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لیں بلکہ مراد یہ ہے کہ پاک مٹی پر ہاتھ مارنے کے بعد چہرے اور ہاتھوں کا مسح کریں، لیکن بعض فقہاء نے لفظ "منہ" کی وجہ سے کہا ہے کہ چاہیے تھوڑا سا ہی کیوں نہ ہو غبار ہاتھ پر لگا ہونا چاہیے[1]

اب "صعیدًا طیبًا" کی تفسیر باقی رہ گئی ہے بہت سے علماء لغت نے "صعید" کے دو معانی ذکر کیے ہیں ایک مٹی اور دوسرا وہ چیزیں جنہوں نے کرۂ ارض کی سطح کو ڈھانپ رکھا ہے چاہے وہ مٹی ہو، ریت ہو یا پتھر وغیرہ۔ یہی بات فقہاء میں اس اختلاف نظر کا باعث بن گئی ہے کہ تیمم کس چیز پر جائز ہے، کیا صرف مٹی پر تیمم جائز ہے یا پتھر اور سنگریزوں پر بھی ہو جاتا ہے لیکن "صعید" کے اصل لغوی معنی کی طرف توجہ کرتے ہوئے یعنی "صعود اور اوپر ہونا" دوسرا مفہوم ہی زیادہ قرین ذہن ہے۔

"طیب" ایسی چیزوں کو کہا جاتا ہے جو انسان کی طبیعت اور مزاج کے موافق ہوں، قرآن میں یہ لفظ بہت سی چیزوں کے ساتھ استعمال ہوا ہے، مثلاً: البلد الطیب، مساکن طیبۃ، ریح طیب، حیاۃ طیبۃ، وغیرہ۔ ہر پاکیزہ چیز کو بھی طیب کہتے ہیں کیونکہ انسان کی طبیعت ذاتی طور پر ناپاک چیزوں سے نفرت کرتی ہے یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ تیمم کی مٹی پاک و پاکیزہ ہونا چاہیے۔

ہادیان اسلام سے منقول روایات میں خصوصاً اس بات کا تذکرہ ہے، ایک روایت میں ہے:

نھی امیر المؤمنین ان یتیمم الرجل بتراب من اثر الطریق۔

یعنی ——— حضرت امیر المومنینؑ نے گندی مٹی سے جو سڑکوں پر پڑی ہوتی ہے، تیمم کرنے سے منع فرمایا ہے[2]

توجہ رہے کہ قرآن و حدیث میں تو تیمم اسی مخصوص اسلامی ذمہ داری کے مفہوم میں آیا ہے جس کی وضاحت کی جا چکی ہے لیکن لغت میں اس کا معنی ہے "قصد کرنا" درحقیقت قرآن کہتا ہے کہ جب تیمم کرنا چاہو تو زمین کے کسی پاک حصے کا قصد کرو یعنی تیمم کے لیے زمین میں سے مختلف حصوں میں سے ایسا حصہ منتخب کرو جو "صعید" کے مفہوم سے ہم آہنگ ہو جو "صعود" کے مادہ سے ہے زمین کے اوپر والا حصہ جہاں بارش پڑتی ہو، سورج کی روشنی پڑتی ہو اور جس سے ہوائیں ٹکراتی ہوں۔ ایسی مٹی جو ہاتھوں اور پاؤں سے روندی نہیں جاتی، ایسی مٹی سے استفادہ نہ صرف صحت کے لیے مضر نہیں بلکہ جیسا کہ ہم تیسری جلد میں سورۂ نساء کی آیت ۴۳ کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں، سائنس دانوں کی گواہی کے مطابق جراثیم کش اثرات کا بھی حامل ہے۔

---

[1] احکام تیمم اور اس اسلامی حکم کا فلسفہ اور یہ کہ ایسا کرنا نہ صرف صحت کے منافی نہیں بلکہ صحت مندی کا پہلو رکھتا ہے اسی طرح لفظ "غائط" کا مفہوم اور اس طرح کے دیگر مسائل کی تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ سورۂ نساء کی آیت ۴۳ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

[2] وسائل الشیعہ ج ۲ صفحہ ۹۶۹۔

## وضو اور تیمّم کا فلسفہ

تیمم کے فلسفہ کے بارے میں تو تیسری جلد میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ باقی رہا وضو کا فلسفہ تو اس میں شک نہیں کہ وضو میں دو واضح فائدے ہیں:

ایک فائدہ صحت کے حوالے سے ہے اور دوسرا فائدہ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ہے۔

صحت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک دن میں پانچ مرتبہ یا کم از کم تین مرتبہ چہرے اور ہاتھوں کے دھونا، بدن کی نظافت اور پاکیزگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ سر اور پاؤں کے مسح کی شرط کہ جس میں ضروری ہے کہ پانی بالوں یا بدن کے چمڑے کو مَس کرے بھی اس چیز کا سبب بنتا ہے کہ یہ اعضاء بھی پاک صاف رکھے جائیں اور جیسا کہ غسل کے فلسفہ میں ہم واضح کریں گے، پانی کا بدن کے چمڑے کو مس کرنا سمپاتھیٹک (SYMPATHETIC) اور پیرا سمپاتھیٹک (PARASYMPATHETIC) اعصاب معتدل رکھنے میں بہت موثر ہے۔

اخلاقی و روحانی حوالے سے دیکھا جائے تو چونکہ یہ کام قصد قربت سے اور خدا کے لیے کیا جاتا ہے لہٰذا تربیتی اثرات کا حامل ہے خصوصاً جب کہ کنایۃً اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں سر سے لے کر پاؤں تک تیری اطاعت کے لیے حاضر ہوں۔ اس اخلاقی اور معنوی پہلو کی موید وہ روایت ہے جو امام علی بن موسیٰ رضا علیہما السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

انما امر بالوضوء وبدء به لان یکون العبد طاهرًا اذا قام بین یدی الجبار، عند مناجاته ایاه، مطیعًا له فیما امره، نقیًا من الادناس والنجاسة، مع ما فیه من ذهاب الکسل، وطرد النعاس وتزکیة الفؤاد للقیام بین یدی الجبار۔

وضو کا حکم اس لیے دیا گیا ہے اور عبادت کی ابتداء اس سے اس لیے کی گئی ہے تاکہ بندے جب بارگاہِ الٰہی میں کھڑے ہوں اور مناجات کریں تو پاک و پاکیزہ ہوں، اس کے احکام پر کاربند رہیں اور آلودگیوں اور نجاستوں سے دور رہیں۔ اس کے علاوہ وضو کے سبب سے نیند اور سستی کے اثرات انسان سے دور ہو جاتے ہیں نیز یہ اس لیے ہے تاکہ دل درگاہِ خداوندی میں کھڑے ہونے کے لیے روشنی اور پاکیزگی حاصل کرے۔[1]

## غسل کا فلسفہ

بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ حالتِ جنب کے لیے اسلام غسل کا حکم کیوں دیتا ہے جبکہ ایک خاص حصّہ آلودہ ہوتا ہے۔ پیشاب

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱ صفحہ ۲۵۷

کرنے اور منی خارج ہونے میں کیا فرق ہے؟ جب کہ ایک میں تو فقط اسی جگہ کو دھونے کا حکم ہے اور دوسرے میں سارے بدن کو دھونے کا۔

اس سوال کا ایک جواب اجمالی ہے اور دوسرا تفصیلی۔

اجمالی جواب یہ ہے کہ اخراج منی پیشاب اور دیگر فضلات کی طرح کسی ایک حصے کا عمل نہیں ہے کیونکہ اس کا اثر سارے بدن پر ہوتا ہے۔ بدن کے تمام خلیے اس کے اخراج کے بعد ایک خاص سستی میں ڈوب جاتے ہیں جو کہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ کام سارے بدن کے اعضاء پر اثرانداز ہوتا ہے اس کی وضاحت کچھ یوں ہے:

سائنس دانوں اور ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق انسانی جسم میں نباتی اعصاب کے دو سلسلے ہیں جو بدن کی تمام فعالیت کو کنٹرول کرتے ہیں ایک سمپاتھیٹک اور دوسرا پیرا سمپاتھیٹک

سارے انسانی بدن میں اور اس کی مشینریوں میں یہ سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ سمپاتھیٹک (SYMPATHETIC) اعصاب کی ذمہ داری ہے "تیز کرنا" اور بدن کی مختلف مشینریوں کو فعالیت پر ابھارنا اور پیرا سمپاتھیٹک (PARASYMPATHETIC) کا کام ہے ان کی فعالیت کو سست کرنا۔ درحقیقت ان میں ایک گاڑی کے لیے گیس یا پٹرول کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا بریک کا کام کرتا ہے ان دو طرح کے نباتی اعصاب کی فعالیت کے اعتدال سے جسم کا کارخانہ معتدل طور پر کام کرتا رہتا ہے۔

بعض اوقات انسانی بدن میں اس طرح کے حوادث رونما ہوتے ہیں جو اس اعتدال کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ جنسی لذت کا عروج پر پہنچنا (CLIMAX) بھی ایسے حوادث میں سے ہے جو عام طور پر منی کے اخراج کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے اس موقع پر پیرا سمپاتھیٹک (PARASYMPATHETIC) کا سلسلہ سمپاتھیٹک (SYMPATHETIC) اعصاب پر سبقت حاصل کر لیتا ہے اور اعتدال منفی شکل میں بدل جاتا ہے۔

یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ سمپاتھیٹک (SYMPATHETIC) اعصاب کو کام پر ابھارنے اور بدن کے اعتدال کو واپس لانے کے لیے بدن سے پانی کا مس کرنا بھی موثر ہے اور چونکہ جنسی لذت کا عروج (CLIMAX) تمام اعضائے بدن پر حسی طور پر اثرانداز ہوتا ہے اور اعصاب کے ان دونوں سلسلوں کا اعتدال سارے بدن میں ٹوٹ جاتا ہے لہٰذا حکم دیا گیا ہے کہ جنسی ملاپ یا اخراج منی کے بعد سارے بدن کو پانی سے دھویا جائے تاکہ اس کا حیات بخش اثر پورے جسم میں اعصاب کے اعتدال کی بحالی کی صورت میں ظاہر ہو۔[1]

---

[1] امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

ان الجنابة خارجة من كل جسده فلذلك وجب عليه تطهير جسده كله

جنابت سارے بدن سے خارج ہوتی ہے لہٰذا پورے بدن کو دھویا جائے۔

(وسائل الشیعہ ج ۱ ص ۴۶۶)

یہ روایت بھی گویا اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ غسل کا بس یہی فائدہ نہیں بلکہ یہ غسل ایک طرح کی عبادت بھی ہے جس کے اخلاقی اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا اسی لیے قصد قربت اور فرمانِ خدا کی اطاعت کی نیت بغیر ایسا غسل صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت جنسی ملاپ اور اخراج منی کے وقت روح بھی متاثر ہوتی ہے اور جسم بھی۔ روح مادی شہوات کی طرف کھنچتی ہے اور جسم سستی کا شکار ہوتا ہے۔ جسم کیونکہ قصد قربت سے دھویا جاتا ہے لہٰذا یہ ایک طرح سے غسل روح بھی ہے۔ اس طرح سے روح خدا اور معنویت کی طرف مائل ہوتی ہے اور جسم پاکیزگی، نشاط اور فعالیت کی طرف۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر، زندگی بھر غسل جنابت کا دستور بدن کی نگہداشت اور صحت کی حفاظت کے لیے ایک لازمی اور ضروری اسلامی حکم ہے۔ کیونکہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اپنی نظافت اور نگرانی سے غافل رہتے ہیں لیکن یہ اسلامی حکم مختلف وقتی فاصلوں پر انہیں نہانے اور بدن کو پاک رکھنے پر ابھارتا ہے۔ یہ امر گذشتہ زمانے کے لوگوں سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ خود ہمارے زمانے میں بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو جسم کی نظافت اور صفائی سے مختلف وجوہ کی بنا پر غافل رہتے ہیں (البتہ یہ حکم کلی اور عمومی ہے یہاں تک کہ اس شخص کے لیے بھی ہے جس نے ابھی تازہ غسل کیا ہے)

مذکورہ بالا تینوں وجوہ مجموعی طور پر واضح کرتی ہیں کہ نیند یا بیداری کی حالت میں اخراج منی اور جنسی ملاپ کی صورت میں اگرچہ منی خارج نہ ہو سارے بدن کو کیوں لازمی طور پر دھونا چاہیے۔

آیت کے آخر میں یہ بات واضح کرنے کے لیے کہ مذکورہ احکام میں کوئی سختی نہیں ہے بلکہ وہ سارے احکام مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر نافذ کیے گئے ہیں، فرمایا گیا ہے، خدا نہیں چاہتا کہ تمہیں مشقت اور زحمت میں ڈال دے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک و پاکیزہ رکھے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے تاکہ تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو (ما یرید اللہ لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطھرکم ولیتم نعمتہ علیکم لعلکم تشکرون)۔

دراصل اس جملے میں اس حقیقت کی تاکید کی گئی ہے کہ تمام خدائی احکام اور اسلامی پروگرام لوگوں کی خاطر اور انہی کے فائدے میں ہیں اور ان سے کچھ اور مقصود نہیں، خدا چاہتا ہے کہ ان احکام کے ذریعے لوگوں کو روحانی اور جسمانی طور پر پاکیزہ رکھے۔

ضمناً اس طرف بھی توجہ رہے کہ خدا نہیں چاہتا کہ تمہارے دوش پر کوئی طاقت فرسا اور مشکل ذمہ داری ڈال دے یہ بات اگرچہ غسل، وضو اور تیمم سے مربوط احکام کے ضمن میں آئی ہے لیکن یہ ایک عمومی قانون بھی بیان کر رہی ہے کہ احکام الٰہی کسی موقع پر بھی طاقت فرسا اور مشقت سے بھرے ہوئے نہیں ہیں۔

اس لیے جب کوئی حکم یا ذمہ داری کسی کے لیے سخت مشکل اور ناقابل برداشت ہو جائے تو اس کے پیش نظر وہ اس سے ساقط ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی بوڑھے مرد یا بوڑھی عورت کے لیے روزہ رکھنا باعثِ مشقت ہو جائے تو اسی آیت کی بنا پر ان پر واجب نہیں رہتا۔

یہ بات فراموش نہیں کی جانا چاہیے کہ بعض احکام ذاتی طور پر مشکل ہیں اور اہم مقاصد اور مصلحتوں کے پیش نظر ایسی مشکلات کو برداشت کرنا چاہیے۔ مثلاً دشمنانِ حق کے خلاف جہاد۔

اس آیت سے فقہ اسلامی میں ایک بنیادی اصول "قاعدہ لا حرج" حاصل کیا گیا ہے اور فقہا نے بہت سے

مواقع پر احکام کے استنباط میں اس سے استناد کرتے ہیں۔

۷۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ○

## ترجمہ

۷۔ اپنے اوپر خدا کی نعمت کو یاد کرو اور اس عہد و پیمان کو (بھی یاد کرو) جو اس نے تم سے لیا ہے۔ اس وقت جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور خدا (کی نافرمانی) سے ڈرو، کیونکہ خدا سینوں کے اندر کے حالات سے آگاہ ہے۔

## تفسیر

### خدا سے باندھے گئے پیمان

گذشتہ آیت میں چند احکام اسلامی اور نعمات الٰہی کی تکمیل کا ذکر تھا۔ اسی بحث کی مناسبت سے اس آیت میں مسلمانوں کو دوبارہ خدا کی لامتناہی نعمات کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان نعمات میں سب سے اہم ایمان، اسلام اور ہدایت کی نعمت ہے، ارشاد فرمایا گیا ہے، خدا کی نعمتوں کو یاد رکھو (واذکروا نعمة اللّٰه علیکم) یہاں لفظ "نعمت" مفرد صورت میں ہے لیکن یہ جنس کے معنی میں ہے اور جنس یہاں عمومیت کا مفہوم رکھتی ہے لہٰذا اس سے مراد تمام تر نعتیں ہیں۔

البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ خصوصیت سے یہاں نعمتِ اسلام مراد ہو جس کی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ کیا گیا ہے، جہاں فرمایا گیا ہے (ولیتم نعمته علیکم) ـــــ اور اس سے بڑھ کر کون سی نعمت ہو سکتی ہے۔ اسلام ہی کے زیر سایہ مسلمانوں کو تمام تر خوشیاں، افتخارات اور وسائل نصیب ہوئے۔ وہ لوگ جو پہلے بالکل منتشر، جاہل، گمراہ، خون خوار، فاسد اور مفسد تھے۔ اسلام نے انہیں اتحاد اور دانائی عطا کی اور وہ مادی و روحانی نعمتوں سے مالا مال ہو گئے۔

اس کے بعد وہ عہد و پیمان جو انہوں نے خدا سے باندھا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، اور میثاقِ الٰہی کو فراموش نہ کرو جبکہ اس وقت تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی (و میثاقه الذی واثقکم به اذ قلتم سمعنا و اطعنا)۔

اس بارے میں کہ اس پیمان سے کون سا پیمان مراد ہے دو احتمالات پیش کیے گئے ہیں۔

پہلا وہ پیمان کہ جو مسلمانوں نے آغازِ اسلام میں حدیبیہ کے موقع پر باندھا تھا یا حجۃ الوداع یا عقبہ میں باندھا تھا یا پھر وہ پیمان جو ہر مسلمان نے اسلام قبول کرتے ہی بالواسطہ طور پر خدا سے باندھا تھا۔

دوسرا وہ پیمان جو فطری طور پر ہر شخص اپنے خدا سے باندھ چکا ہے اسی کو بعض اوقات عالم ذر[1] کہتے ہیں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اس کی خلقت کے وقت قابلِ نظر صلاحیتیں اور بے شمار نعمتیں عطا کیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کو اسرارِ آفرینش اور اس کے ذریعے پروردگار کی معرفت کی استعداد بخشی ہے۔ اسی طرح اس نے عقل و شعور سے نوازا جس کے ذریعے انسان پیغمبروں کو پہچانتا ہے اور ان کے احکام پر عمل کرتا ہے۔

یہ صلاحیتیں عطا فرما کر خدا نے عملاً انسان سے یہ عہد لیا کہ وہ انھیں معطل اور باطل نہیں کر چھوڑے گا، بلکہ ان سے صحیح طور پر استفادہ کرے گا اور انسان بھی یہ صلاحیتیں حاصل کر کے بزبانِ حال پکار اٹھا کہ سمعنا و اطعنا۔ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

یہ عہد و پیمان زیادہ وسیع، زیادہ پائیدار اور زیادہ عمومی ہے جو خدا نے اپنے بندوں سے لیا ہے یہ وہی پیمان ہے جس کی طرف حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

لیستادوھم میثاق فطرتہ

انبیاء اس لیے بھیجے گئے کہ وہ لوگوں کو پیمانِ فطرت پورا کرنے کی دعوت دیں۔

واضح ہے کہ یہ وسیع پیمان تمام دینی مسائل پر بھی محیط ہے۔ کوئی مانع نہیں کہ یہ آیت تمام تکوینی اور تشریعی عہد و پیمان (جو خدا نے بحکم فطرت لیے ہیں یا رسول اللہؐ نے مسلمانوں سے مختلف موقعوں پر لیے ہیں) کی طرف اشارہ ہو۔

یہاں سے واضح ہو گیا کہ وہ حدیث جس میں ہے کہ میثاق سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع میں ولایت علیؑ کے سلسلے میں لیا تھا[2] وہ ہمارے مذکورہ بیان سے پوری مناسبت رکھتا ہے کیونکہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ مختلف آیات کے ذیل میں آنے والی احادیث کسی ایک روشن اور واضح مصداق کی طرف اشارہ کرتی ہیں نہ یہ کہ مفہوم آیات ان میں منحصر ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "میثاق" اصل میں "وثاقہ" یا "وثوق" کے مادہ سے ہے جو طناب وغیرہ سے کسی چیز کو باندھنے کے معنی میں ہے بعد ازاں ہر اس کام کو کہا جانے لگا جو اطمینانِ خاطر کا سبب بنے۔ عہد و پیمان چونکہ ایک گرہ کی مانند ہے جو دو افراد یا دو گروہوں کے درمیان بندھ جاتا ہے اور ان کے اطمینان کا باعث بنتا ہے اس لیے اسے میثاق کہتے ہیں۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: پرہیزگاری اختیار کرو کہ خدا سینوں کے اندر کے اسرار سے آگاہ ہے (واتقوا اللہ ان اللہ علیم بذات الصدور)۔

---

[1] اس بارے میں مزید تشریح اور یہ کہ اسے "عالم ذر" کیوں کہتے ہیں انشاء اللہ اعراف ۱۷۲ کے ذیل میں ملاحظہ کیجیے گا۔

[2] تفسیر برہان ج ۱ صفحہ ۴۵۴

"ذات الصدور" مرکب ہے۔ "ذات" "مالک اور صاحب" کے معنی میں ہے اور "صدور" "صدر" کی جمع ہے جس کا معنی سینہ ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ خدا ان باریک ترین اسرار سے باخبر ہے جو انسان کی روح کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں اور ظاہراً اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ عواطف، احساسات اور نیتوں کو دل اور سینہ سے کبھی نسبت دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جلد اول صفحہ ۹۹ (اردو ترجمہ) میں تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔

۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○

۹۔ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۙ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ○

۱۰۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ○

## ترجمہ

۸۔ اے ایمان والو! ہمیشہ خدا کے لیے قیام کرو اور عادلانہ گواہی دو اور کسی گروہ کی دشمنی تمہیں ترکِ عدالت کی طرف نہ لے جائے۔ عدل کرو کہ وہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

۹۔ خدا نے ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں سے بخشش اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

۱۰۔ اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں وہ اہل جہنم ہیں۔

## تفسیر

### قیام عدالت کا تاکیدی حکم

یہ آیت قیام عدالت کی دعوت دیتی ہے۔ ایسی ہی دعوت کچھ فرق کے ساتھ سورۂ نساء آیۃ ۱۳۵ میں گزر چکی ہے۔

پہلے تو صاحب ایمان افراد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! ہمیشہ خدا کے لیے قیام کرو اور عادلانہ گواہی دو (یاایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط)۔

اس کے بعد عدالت سے انحراف کے ایک عمومی سبب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ قومی عداوتیں اور شخصی معاملات کہیں تمہیں اجرائے عدالت سے روک نہ دیں اور کہیں دوسروں کے حقوق پر تجاوز کا سبب نہ بن جائیں کیونکہ عدالت ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے (ولا یجرمنکم شناٰن قوم علٰی الا تعدلوا)۔

مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر دوبارہ عدالت ہی کا حکم دیا گیا ہے: عدالت اختیار کرو کہ وہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے (اعدلوا ھو اقرب للتقوی)۔

عدالت چونکہ تقویٰ و پرہیزگاری کا بہترین رکن ہے لہٰذا تیسری مرتبہ بطور تاکید فرمایا گیا ہے: خدا سے ڈرو کیونکہ خدا تمہارے تمام اعمال سے آگاہ ہے (واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون)۔

اس آیت میں اور سورۂ نساء کی آیت ۱۳۵ میں چند پہلوؤں میں فرق ہے، جو یہ ہیں:

۱۔ سورہ نساء میں عدالت کے قیام اور خدا کے لیے گواہی دینے کی دعوت دی گئی ہے لیکن یہاں خدا کے لیے قیام اور حق و عدالت کی گواہی دینے کی دعوت دی گئی ہے یہ فرق شاید اس لیے ہو کہ سورۂ نساء میں ہدف یہ تھا کہ گواہیاں خدا کے لیے دی جائیں نہ کہ اقرباء، اعزا اور وابستگان کے لیے، لیکن یہاں چونکہ گفتگو دشمن کے متعلق ہے۔ لہٰذا عدل و قسط پر مبنی گواہی کی بات کی گئی ہے یعنی ظلم و ستم پر مبنی گواہی نہ ہو۔

۲۔ سورۂ نساء میں عدالت سے انحراف کا ایک سبب بیان کیا گیا ہے اور یہاں دوسرا سبب مذکور ہے وہاں بلاوجہ محبت میں افراط اور یہاں بلاوجہ بغض میں افراط کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن سورۂ نساء کی اس بات میں دونوں جمع ہیں کہ فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا ——— یعنی ترک عدالت سے ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو ——— بلکہ ہوا و ہوس کی پیروی ظلم و ستم کا وسیع منبع ہے کیونکہ ظلم و ستم بعض اوقات ہوا پرستی کی وجہ سے اور شخصی مفادات کے تحفظ کے لیے ہوتا ہے نہ کہ دوستی اور دشمنی کی بناپر، لہٰذا عدالت سے انحراف کی اصل بنیاد ہوا و ہوس کی پیروی ہے، جس کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ اور حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے:

اما اتباع الھوی فیصد عن الحق

ہوا پرستی تمہیں حق سے باز رکھے گی۔[1]

## عدالت ایک اہم اسلامی حکم ہے

اسلام میں بہت کم مسائل عدالت جیسی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ مسئلہ عدل، مسئلہ توحید کی طرح اسلام کے تمام

---

[1] یہ حدیث کتاب سفینۃ البحار میں مادہ "ہوی" کے ذیل میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے اور نہج البلاغہ کے خطبہ ۴۲ میں حضرت علیؑ سے نقل ہوئی ہے۔

اصول و فروع کی بنیاد ہے، جیسے اعتقادی، عملی، انفرادی، اجتماعی، اخلاقی اور حقوق کے بارے میں کوئی بھی مسئلہ حقیقت توحید سے جدا نہیں اسی طرح ان میں کوئی بھی روح عدل سے خالی نہیں ملے گا۔

یہی وجہ ہے کہ تعجب کا مقام نہیں کہ عدل اصولِ دین میں سے ہو اور مسلمانوں کی فکری عمارت کی ایک بنیاد کے طور پر پہچانا جائے۔ اگرچہ عدالت جو کہ اصولِ دین کا حصہ ہے صفات الٰہیہ میں سے ہے اور خدا شناسی جو کہ اصولِ دین میں سے ایک ہے میں عدالت بھی شامل ہے لیکن اسے ممتاز اور جدا رکھنا بہت معنی خیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے اجتماعی مباحث میں عدالت سے بڑھ کر کسی اصل سے کام نہیں لیا گیا۔ مندرجہ ذیل احادیث اس کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ایاکم والظلم فان الظلم عند الله هو الظلمات یوم القیٰمة

ظلم سے بچو کیونکہ ہر عمل روزِ قیامت اپنی مناسب شکل میں مجسم ہوگا اور ظلم ظلمت و تاریکی کی صورت میں مجسم ہوگا اور تاریکی کا پردہ ظالموں کو گھیرے ہوئے ہوگا[۱]

اور ہم جانتے ہیں کہ سر چشمہ و برکت نور میں ہے اور ظلمت ہر عدم اور فقدان کا سر چشمہ ہے۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے۔

بالعدل قامت السمٰوٰت و الارض

آسمان اور زمین عدل کی بنیاد پر قائم ہیں[۲]

عدالت کے بارے یہ بات واضح ترین ممکن تعبیر ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ نوعِ بشر کی یہ محدود زندگی اس کرۂ خاکی میں عدالت کے بغیر برپا نہیں ہو سکتی بلکہ تمام جہانِ ہستی اور آسمان و زمین سب کا قیام عدالت کی وجہ سے۔ توانائیوں کے اعتدال کے باعث اور ہر چیز کے اپنے مقام و محل پر ہونے کے سبب سے ہے اور اگر یہ لحظہ بھر کے لیے اور سوئی کی نوک کے برابر اس اصول سے منحرف ہو جائیں تو تباہ و برباد ہو جائیں۔ اس سے ملتی جلتی ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے:

الملك يبقى مع الكفر و لا يبقى مع الظلم

حکومتیں کفر سے تو ممکن ہے باقی رہ جائیں، لیکن ظالم ہوں تو انھیں دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ظلم ایک ایسی چیز ہے جس کا اثر اس دنیا میں جلدی ظاہر ہو جاتا ہے آج کی دنیا میں جنگیں، اضطراب، بے اطمینانی سیاسی افراتفری، نیز اجتماعی، اخلاقی اور اقتصادی بحران اس حقیقت کو اچھے طریقے سے ثابت کر رہے ہیں۔

جس چیز کی طرف پوری توجہ رہنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اسلام عدالت کی فقط نصیحت نہیں کرتا بلکہ اس کی نظر میں زیادہ اہم عدالت کا رائج ہونا ہے ان آیات و روایات کا فقط بر سرِ منبر پڑھنا، کتابوں میں لکھنا یا تقاریر میں سنانا معاشرے میں موجود

---

[۱] سفینۃ البحار ۔۔۔۔۔ مادہ "ظلم"

[۲] تفسیر صافی سورہ رحمٰن آیۃ ۷ کے ذیل میں۔

ہاتھ اٹھائے (اور تمھیں ختم کر دے) لیکن خدا نے ان کا ہاتھ تم سے روک دیا، خدا سے ڈرو اور مومنین کو چاہیے کہ وہ صرف خدا پر ہی توکل (اور بھروسہ) کریں۔

## تفسیر

گذشتہ چند آیات میں نعمات الٰہی کے ذکر کے بعد زیر بحث آیت میں پھر روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کچھ اور نعمتیں مسلمانوں کو یاد دلائی ہیں تاکہ ان کے شکرانے کے طور پر فرمانِ خدا کی اطاعت کریں اور عدالت کے قیام کی کوشش کریں۔ فرمایا گیا ہے: اے ایمان لے آنے والو! خدا کی اس وقت کی نعمت کو یاد کرو جب ایک گروہ مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ تمھاری طرف ہاتھ بڑھائے اور تمھیں ختم کر دے لیکن خدا نے ان کا شر تم سے دور کر دیا (یا ایھا الذین اٰمنوا اذکروا نعمت اللّٰہ علیکم اذ ھم قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم فکف ایدیھم عنکم)۔

خداوند عالم آیاتِ قرآنی میں مسلمانوں کو بار بار اپنی گوناگوں نعمات اور الطاف یاد دلاتا ہے تاکہ ان میں روحِ ایمان کو محکم کرے، ان میں شکر گذاری کا احساس ابھارے اور مشکلات کے مقابلے میں انھیں ثباتِ قدم پیدا ہو۔ ایسی آیات میں سے ایک زیر نظر آیت بھی ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ آیت کون سے واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض سمجھتے ہیں کہ یہ بنی نضیر کے یہودیوں کا خطرہ برطرف کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ انھوں نے مدینہ میں رسولِ خدا اور مسلمانوں کو ختم کرنے کی سازش کی تھی۔

بعض مفسرین اسے "بطن نخل" کے واقعہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جو حدیبیہ کے موقع پر ہجرت کے چھٹے برس واقع ہوا۔ ہوا یہ کہ خالد بن ولید کی سرکردگی میں مشرکین مکہ کی ایک جماعت نے پروگرام بنایا کہ نمازِ عصر کے دوران میں مسلمانوں پر حملہ کر دیں۔ پیغمبر اکرمؐ اس سازش سے آگاہ ہو گئے۔ آپؐ نے نماز کو مختصر کر کے نمازِ خوف میں تبدیل کر دیا۔ اس طرح ان کی سازش نقش بر آب ہو گئی۔

بعض اسے رسول اللہؐ اور مسلمانوں کی حادثات سے معمور زندگی کے دیگر حوادث کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ آیت ان تمام حوادث کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو پوری تاریخ اسلام میں وقوع پذیر ہوتے رہے۔ آیت میں لفظ "قوم" نکرہ ہے اور وحدت پر دلالت ہے، اگر اس سے صرف نظر کر لیں تو یہ تفسیر دیگر تفاسیر سے بہتر ہے۔

بہرحال آیت مسلمانوں کی توجہ ان خطرات کی طرف دلا رہی ہے جن میں ممکن تھا کہ ان کا نام ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ آیت تنبیہ کر رہی ہے کہ ان نعمتوں کی قدردانی کرتے ہوئے تقویٰ اختیار کرو، خدا پر بھروسہ رکھو اور جان لو کہ اگر تم پرہیزگار رہے تو زندگی میں اکیلے نہیں رہو گے اور وہ دستِ غیب جو ہمیشہ تمھارا محافظ رہا ہے آئندہ بھی حمایت کرتا رہے گا (و اتقوا اللّٰہ وعلی اللّٰہ فلیتوکل المؤمنون)۔

واضح ہے کہ توکل کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنے کام خدا پر چھوڑنے کے بہانے ذمہ داریوں سے صرف نظر کر لے یا حوادث کے سامنے سر جھکا لے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنی پوری صلاحیت اور توانائی کو بروئے کار لانے کے باوجود اس طرف متوجہ رہے کہ جو کچھ

اس کے پاس سب ہے وہ خود اس کی اپنی طرف سے نہیں ہے بلکہ کسی دوسری ذات کی طرف سے ہے۔ اس طرح غرور اور خود پرستی کا احساس اپنے دل سے نکال دے نیز اس بات سے نہ ڈرے کہ مشکلات و حوادث بہت زیادہ اور شدید ہیں مایوس نہ ہو اور رجان لے کہ اس کے پاس ایک ایسا سہارا ہے جس کی قدرت تمام قدرتوں سے بالاتر ہے۔

ضمناً یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ آیت میں پہلے تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے پھر توکّل کی طرف اشارہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی حمایت پرہیزگاروں کے شامل حال ہے۔

توجہ رہے کہ "تقویٰ"؛ "وقایہ" کے مادہ سے ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ اپنا بچاؤ اور فساد اور برائی سے اجتناب کرنا۔

۱۲۔ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ○

## ترجمہ

۱۲۔ خدا نے بنی اسرائیل سے پیمان لیا اور ان میں سے بارہ رہبر اور سرپرست ہم نے مبعوث کیے اور خدا نے (انھیں) کہا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، میرے رسولوں پر ایمان لے آؤ اور ان کی مدد کرو اور خدا کو قرض حسنہ دو (اس کی راہ میں ضرورت مندوں کی مدد کرو) تو تمھارے گناہوں کو چھپا دوں گا (بخش دوں گا) اور تمھیں باغات جنت میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں داخل کروں گا لیکن جو شخص اس کے بعد بھی کافر ہو جائے تو وہ راہ راست سے منحرف ہو گیا ہے۔

## تفسیر

اس سورہ کی ابتداء میں ایفائے عہد کے مسئلہ کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ مختلف طریقوں سے اس کی تکرار بھی کی گئی ہے مندرجہ بالا آیت بھی اسی مناسبت سے ہے شاید یہ پے در پے سب تاکیدیں جو ایفائے عہد کے بارے میں اور پیمان شکنی کی

مذمت کے سلسلے میں، پیمانِ غدیر کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ہوں جن کا ذکر آیہ ۷، ۹ میں آئے گا۔

زیر بحث آیت کی ابتداء میں ہے، ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ وہ ہمارے احکام پر عمل کریں اور اس پیمان کے بعد ہم نے ان کے لیے بارہ رہبر اور سرپرست بھیجے تاکہ ان میں سے ہر ایک بنی اسرائیل کے بارہ گروہوں میں سے ایک ایک کی سرپرستی کرے (ولقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل وبعثنا منہم اثنی عشر نقیبا)۔

"نقیب" کا مادہ ہے "نقب" (بروزن "نقد") جو بڑے سوراخوں اور خصوصاً زیرِ زمین راستوں کا معنی دیتا ہے۔ کسی گروہ کے سربراہ اور رہبر کو اس لیے نقیب کہتے ہیں کہ وہ اس گروہ کے اسرار سے آگاہ ہوتا ہے گویا اس نے بیچ میں ایک نقب لگائی ہے جس کی وجہ سے وہ اس گروہ کی وضع اور حالات سے آگاہ ہو گیا ہے بعض اوقات "نقیب" ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی گروہ کا سردار نہیں ہوتا اور صرف ان کی پہچان کا ذریعہ ہوتا ہے۔ فضائل کو بھی مناقب اسی لیے کہتے ہیں کہ ان سے آگاہی بھی جستجو اور تحقیق کرکے ہی حاصل کی جاتی ہے۔

بعض مفسرین نے زیر بحث آیت میں "نقیب" کا معنی آگاہ اور اسرار سے مطلع ہی کیا ہے لیکن یہ بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ تاریخ و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نقبائے بنی اسرائیل میں سے ہر ایک اپنے گروہ اور قبیلے کا سرپرست تھا تفسیر روح المعانی میں ابن عباس سے منقول ہے:

انہم کانوا وزراء وصاروا انبیاء بعد ذٰلک

یعنی ــــــ نقبائے بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وزیر تھے جو بعد میں منصب نبوت پر فائز ہوئے[1]

پیغمبر اسلامؐ کے حالات میں مرقوم ہے کہ آپؐ نے شبِ عقبہ کو حکم دیا کہ نقبائے بنی اسرائیل کی تعداد کے مطابق اپنے میں سے بارہ نقیب منتخب کرو مسلماً ان کی ذمہ داری بھی یہی تھی کہ اس گروہ کی رہبری کریں[2]

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ طرق اہل سنت سے بہت سی روایات ایسی وارد ہوئی ہیں جن میں پیغمبر اسلامؐ کے بارہ خلفاء اور جانشینوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ان کی تعداد کا تعارف نقبائے بنی اسرائیل کے تعداد کے حوالے سے کروایا گیا ہے۔ ان میں سے بعض روایات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ اہل سنت کے مشہور امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں مسروق سے نقل کرتے ہیں وہ کہتا ہے، میں نے عبداللہ بن مسعود سے سوال کیا کہ اس اُمت پر کتنے افراد حکومت کریں گے تو ابن مسعود نے جواب دیا:

لقد سئلنا رسول اللہ فقال اثنی عشر کعدۃ نقباء بنی اسرائیل

ہم نے پیغمبر خداؐ سے یہی مسئلہ پوچھا تھا، انھوں نے جواب میں فرمایا کہ بارہ افراد نقبائے بنی اسرائیل

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۶ صفحہ ۸۰

[2] سفینۃ البحار (نقب)

کی تعداد کے مطابق ہیں[1]

۲۔ تاریخ ابن عساکر میں ابن مسعود سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:

میں نے پیغمبر اسلام سے سوال کیا کہ اس اُمت پر کتنے خلفاء حکومت کریں گے، تو آپ نے فرمایا:

ان عدة الخلفاء بعدی عدة نقباء موسٰی

میرے بعد کے خلفاء کی تعداد نقبائے موسیٰ کی تعداد کے برابر ہے[2]

۳۔ منتخب کنز العمال میں جابر بن سمرہ سے منقول ہے:

نقبائے بنی اسرائیل کی تعداد کے برابر بارہ خلفاء اس امت پر حکومت کریں گے[3]

ایسی حدیث ینابیع المودۃ صفحہ ۴۴۵ اور البدایہ والنہایہ جلد ۶ صفحہ ۲۴۷ پر بھی منقول ہے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل سے خدا کے وعدے کی یوں وضاحت کرتا ہے، خدا نے ان سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا اور تمہاری حمایت کروں گا (و قال اللہ انی معکم) لیکن اس کے ساتھ چند شرائط ہیں:

۱۔ بشرطیکہ تم نماز قائم کرو (لئن اقمتم الصلوٰۃ)،

۲۔ اور اپنی زکوٰۃ ادا کرو (و اٰتیتم الزکوٰۃ)،

۳۔ میرے نبیوں پر ایمان لے آؤ اور ان کی مدد کرو (و اٰمنتم برسلی و عزرتموھم)[4]

۴۔ اور اس کے علاوہ مستحب مصارف اور انفاق جو خدا کو قرض حسنہ دینے کے مترادف ہیں سے احتراز نہ کرو (و اقرضتم اللہ قرضاً حسناً)

اگر اس عہد و پیمان پر عمل کرو تو میں تمہارے گزشتہ گناہ بخش دوں گا (لاکفرن عنکم سیاٰتکم) اور تمہیں ان باغات بہشت میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں (و لادخلنکم جنٰت تجری من تحتہا الانھار) لیکن جو لوگ کفر، انکار اور عصیان کی راہ اپنائیں مسلم ہے کہ وہ صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں (فمن کفر بعد ذلک منکم فقد ضل سواء السبیل)۔

---

[1] مسند احمد ج ۱ ص ۳۹۸ طبع مصر ۱۳۱۳

[2] فیض القدیر شرح جامع الصغیر ج ۲ ص ۴۵۹

[3] منتخب کنز العمال در حاشیہ مسند احمد ج ۵ ص ۳۱۲

[4] "عزرتموھم" کا مادہ "تعزیر" ہے جو منع کرنے اور مدد دینے کے معنی میں ہے بعض اسلامی سزاؤں کو اسی لیے تعزیر کہتے ہیں کہ حقیقت میں وہ گنہگار کی مدد ہے اور اسے گناہ سے باز رکھنے کی تدبیر ہے یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلامی سزائیں انتقامی پہلو نہیں رکھتیں بلکہ تربیتی پہلو رکھتی ہیں اسی بناء پر ان کا نام تعزیر رکھا گیا ہے۔

اس بات سے کہ قرآن مجید میں انفاق کے بجائے خدا کو قرض دینے کی تعبیر کیوں استعمال کی گئی ہے، ضروری وضاحت تفسیر نمونہ کی جلد اول صفحہ ۶۷۶ پر (اردو ترجمہ میں) کی جاچکی ہے۔

ایک سوال یہاں باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر حضرت موسیٰ پر ایمان لانے کے ذکر سے کیوں مقدم کیا گیا ہے جبکہ ان پر ایمان لانا عمل سے پہلے ضروری تھا۔

بعض مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ "رسل" سے مراد یہاں پر وہ انبیاء ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے تھے نہ کہ خود حضرت موسیٰ۔ لہٰذا یہ حکم آئندہ سے متعلق تھا اس لیے نماز و زکوٰۃ کے بعد ہو سکتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "رسل" سے مراد نقباء ہی بنی اسرائیل ہی ہوں جن کے متعلق بنی اسرائیل سے عہد لیا جا چکا تھا (تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ بعض قدیم مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ نقباء نے بنی اسرائیل خدا کے رسول تھے اور یہ احتمال ہماری مندرجہ بالا آیت کی تائید کرتا ہے)۔

۱۳۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○

## ترجمہ

۱۳۔ پس ہم نے ان کی پیمان شکنی کے باعث انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا (یہاں تک کہ) وہ (خدا کے) کلام میں تحریف کرتے تھے اور اس کے کچھ حصے کو جو ہم نے انھیں تعلیم دی تھی ، انھوں نے فراموش کر دیا اور تمھیں ہر وقت ان کی کسی (نئی) خیانت کی خبر ملے گی مگر ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ (ایسا نہیں ہے) پھر بھی ان سے درگذر کرو اور صرف نظر کرو کیونکہ خدا نیک لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

## تفسیر

گذشتہ آیت میں بنی اسرائیل سے خدا تعالیٰ کے پیمان لینے کا ذکر ہے۔ اب اس آیت میں ان کی پیمان شکنی اور اس کے انجام کا تذکرہ ہے، فرمایا گیا ہے: انھوں نے چونکہ اپنا عہد توڑ ڈالا لہٰذا ہم نے انھیں[1] دھکیل کر اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا (فبما نقضهم ميثاقهم لعنّاهم

---

[1] "لعن" لغت میں دھتکارنے اور دور کرنے کے معنی میں ہے اور جب یہ لفظ خدا کے حوالے سے ہو تو اس کا معنی ہے "رحمت سے محروم کرنا"۔

وجعلنا قلوبهم قاسية[1]۔

درحقیقت انھیں یہ دو سزائیں عہد شکنی کے جرم میں دی گئی ہیں وہ رحمتِ الٰہی سے بھی دور ہو گئے ہیں اور ان کے افکار و قلوب بھی پتھر ہو گئے ہیں اور میلان و انعطاف کے قابل نہیں رہے۔

اس کے بعد آثارِ قساوت کی اس طرح تشریح کی گئی ہے ، وہ کلمات کی تحریف کرتے ہیں اور انھیں ان کے اصلی مقام سے بدل دیتے ہیں (یحرفون الکلم عن مواضعه) اور جو کچھ ان سے کہا گیا تھا اس کا ایک حصہ فراموش کر دیتے ہیں (ونسوا حظا مما ذکروا به)۔

بعید نہیں کہ جو حصہ انھوں نے بھلا دیا وہ پیغمبرِ اسلامؐ کی نشانیاں اور آثار ہوں جن کی طرف قرآن کی دیگر آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ایک طویل عرصے تک تورات مفقود رہی پھر چند یہودی علماء نے جسے لکھا۔ ظاہری امر ہے کہ اس کا بہت سا حصہ تو نابود ہو گیا اور کچھ میں تحریف کر دی گئی یا فراموش ہو گیا۔ لہٰذا یہودیوں کے ہاتھ جو کچھ لگا وہ کتاب موسیٰؑ کا کچھ حصہ تھا جس میں بہت سے خرافات ملا دیئے گئے تھے اور انھوں نے یہ حصہ بھی بھلا ڈالا۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے : ہمیں ہر روز ان کی ایک نئی خیانت کا پتہ چلتا ہے ہاں البتہ ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو ان جرائم سے کنارہ کش ہے لیکن وہ اقلیت میں ہے (ولا تزال تطلع علی خائنة[2] منهم الا قليلا منهم)۔

آخر میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان سے صرف نظر کریں اور چشم پوشی کریں کیونکہ خدا نیک لوگوں کو پسند کرتا ہے (فاعف عنهم واصفح ان الله یحب المحسنين)۔ آیت کے اس حصّے سے کیا یہ مراد ہے کہ اس صالح اور نیک اقلیت کے گذشتہ گناہوں سے صرف نظر کریں یا غیر صالح اکثریت کے گناہوں سے۔ آیت کا ظاہر دوسرے مفہوم کو تقویت دیتا ہے کیونکہ صالح اقلیت نے تو کوئی خیانت نہیں کی کہ جس سے عفو و بخشش کی جائے۔ مسلّم ہے کہ یہاں درگذر اور عفو ان تکالیف سے متعلق ہے جو انھوں نے ذاتِ پیغمبرؐ کو پہنچائی تھیں اور یہ معافی اسلام کے اہداف و اصول سے متعلق نہیں ہے کیونکہ ان میں تو معافی کا کوئی معنی نہیں۔

## یہودیوں کی تحریفات

وہ تمام آیات جو قرآن مجید میں یہودیوں کی تحریفات کے بارے میں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی آسمانی کتاب میں

---

[1] لفظ "قاسية" "قساوت" کے مادہ سے ہے، اور سخت پتھروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی مناسبت سے جو لوگ حقائق سے رغبت اور میلان کا کوئی اظہار نہ کریں، ان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

[2] "خائنة" اگرچہ اسم فاعل ہے لیکن یہاں مصدری معنی میں استعمال ہوا ہے اور "خیانت" کا معنی دیتا ہے۔ عربی ادب میں اسم فاعل مصدری معنی میں آتا رہتا ہے۔ مثلاً عافیة و خاطیة اور یہ احتمال بھی ہے کہ "خائنة" "گروہ" کی صفت ہو جو مقدر ہے۔

کیسا کیسا تغیر و تبدل کرتے تھے۔

بعض اوقات وہ تحریفِ معنوی کا ارتکاب کرتے تھے یعنی اپنی آسمانی کتاب کی آیات کی حقیقی معانی کے خلاف تفسیر کرتے تھے الفاظ نہیں بدلتے تھے معانی بدل دیتے تھے۔

کبھی تحریفِ لفظی کا ارتکاب کرتے تھے۔ استہزاء و تمسخر کرتے ہوئے "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" (ہم نے سنا اور اطاعت کی) کہنے کی بجائے "سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا" (ہم نے سنا اور مخالفت کی) کہتے تھے۔

بعض اوقات وہ آیات کا کچھ حصہ چھپا دیتے۔ جو کچھ ان کے مزاج کے مطابق ہوتا اسے ظاہر کرتے اور جو مخالف ہوتا اسے مخفی رکھتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات آسمانی کتاب سامنے ہوتے ہوئے بھی اس کے ایک حصے پر ہاتھ رکھ لیتے تھے تاکہ دوسری طرف والا غافل رہے اور اسے پڑھ نہ سکے۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیہ ۴۱ کے ذیل میں ابن صوریا کے ذکر میں آئیگا۔

## کیا خدا کسی کو سنگدل بناتا ہے

زیر بحث آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ایک گروہ کی سنگدلی کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے ہم جانتے ہیں کہ یہ سنگدلی اور عدم انعطاف حق سے انحراف اور گناہوں کا سرچشمہ بن جاتا ہے یہاں سوال ابھرتا ہے کہ جب اس کام کا فاعل خدا ہے تو ایسے اشخاص اپنے اعمال کے جواب دہ کیسے ہو سکتے ہیں اور کیا یہ ایک طرح سے جبر و اکراہ نہیں ؟

قرآن کی مختلف آیات، یہاں تک کہ زیر نظر آیت میں بھی غور و فکر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بہت سے مواقع پر لوگ اپنے برے اعمال کے باعث خدا تعالیٰ کے لطف اور ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں اور حقیقت ان کا عمل ہی ان کے فکری و اخلاقی انحراف کی بنیاد بنتا ہے اور وہ اپنے ان اعمال کے نتائج سے کسی طور بھی کنارہ کش نہیں ہو سکتے لیکن ہر سبب کا اثر چونکہ خدا کی طرف سے ہے لہذا قرآن میں ایسے آثار کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے جیسے زیر نظر آیت میں ہے : انھوں نے چونکہ پیمان شکنی کی لہذا ہم نے ان کے دلوں کو سخت اور ناقابلِ انعطاف بنا دیا۔ سورۂ ابراہیم آیت ۲۷ میں ہے :

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ

اور خدا ظالموں کو گمراہ کرتا ہے۔

اسی طرح سورۂ توبہ آیت ۷۷ میں بعض عہد شکنی کرنے والوں کے بارے میں ہے :

فاعقبهم نفاقا فی قلوبهم الی یوم یلقونه بما اخلفوا الله ما وعدوه وبما کانوا یکذبون۔

ان کی پیمان شکنی اور جھوٹ کی وجہ سے خدا نے ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا۔

اس طرح کی تعبیرات قرآن میں بہت ہیں۔

واضح ہے کہ یہ برے آثار جن کا سرچشمہ خود انسان کا عمل ہے انسان کے اختیار و ارادہ کی آزادی کے منافی ہرگز نہیں ہیں کیونکہ اس کی بنیاد خود اس نے فراہم کی ہے اور اس نے جان بوجھ کر اس وادی میں قدم رکھا ہے اور یہ اسکے اعمال کا قہری نتیجہ ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جان بوجھ کر شراب پیئے اور جب وہ مست ہو جائے اور جرائم کرنے لگے تو ٹھیک ہے کہ نشے کی حالت میں وہ خود اختیاری نہیں رکھتا لیکن چونکہ اس نے اس کے اسباب خود پیدا کیے ہیں اور وہ جانتا ہے کہ نشے کی حالت میں اس سے ایسے افعال سرزد ہو سکتے ہیں لہٰذا وہ اپنے افعال کا جواب دہ ہے ...... اس طرح ایسے موقع پر اگر کہا جائے کہ چونکہ انھوں نے شراب پی ہے اور ہم نے ان کی عقل ختم کر دی ہے اور ان کے اعمال کی وجہ سے ہم نے جرائم میں مبتلا کر دیا ہے ... کیا اس بات میں کوئی اشکال اور جبر کا پہلو ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ تمام ہدایتیں اور گمراہیاں جنہیں قرآن میں خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے یقیناً یہ خود انسان کے خود کردہ افعال کی وجہ سے ہے اور انہی کے باعث وہ ہدایت یا گمراہی کا استحقاق پیدا کرتا ہے ورنہ خدا کی عدالت و حکمت اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ کسی کو بلا وجہ اور بلا واسطہ کی ہدایت کرے اور دوسرے کو گمراہ کر دے۔[1]

١٤۔ وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللَّهُ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ○

## ترجمہ

١٤۔ اور جو لوگ (مسیح کی دوستی اور) نصرانیت کا دعویٰ رکھتے ہیں، ان سے (بھی) ہم نے عہد و پیمان لیا لیکن ان لوگوں نے بھی اس چیز کا ایک حصہ فراموش کر دیا جو انھیں دی گئی تھی لہٰذا ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کے لیے عداوت ڈال دی اور جو کچھ انھوں نے انجام دیا عنقریب خدا انھیں اس کے (نتائج کے) بارے میں آگاہ کرے گا۔

## تفسیر

### دائمی دشمن

گزشتہ آیت میں بنی اسرائیل کی عہد شکنی سے متعلق گفتگو تھی اب اس آیت میں نصاریٰ کی پیمان شکنی کا تذکرہ ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے: دعوائے نصرانیت کرنے والوں کی ایک جماعت جس سے ہم نے عہد وفا لیا تھا پیمان شکنی کی مرتکب ہوئی

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اول ص۱۲۹ (اردو ترجمہ) میں اس بارے میں مزید توضیح کی جا چکی ہے۔

الٰہیہ اور احکام دیئے گئے تھے ان کا ایک حصہ انھوں نے فراموش کر دیا (ومن الذین قالوا انا نصاریٰ اخذنا میثاقہم فنسوا حظا مما ذکروا بہ)۔

ان انھوں نے بھی یہودیوں کی طرح جب ان بار معاہدہ کر رکھا تھا کہ توحید سے منحرف نہیں ہوں گے اور احکام الٰہی کو فراموش نہیں کریں گے اور آخری پیغمبر کی نشانیاں نہیں چھپائیں گے لیکن انھوں نے بھی یہودیوں کا سا طرز عمل اختیار کر لیا۔ قابل توجہ یہاں یہ ہے کہ قرآن یہودیوں کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کی قلیل تعداد پاک اور حق شناس تھی لیکن نصاریٰ کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ منحرف ہو گیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ عیسائیوں کی نسبت یہودیوں میں سے منحرف ہونے والے زیادہ تھے۔

موجودہ اناجیل کی تاریخ کہتی ہے کہ یہ ساری انجیلیں حضرت مسیح کے کئی سال بعد بعض عیسائیوں نے لکھی تھیں یہی وجہ ہے کہ ان میں واضح تناقضات موجود ہیں۔ یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ انجیل کی آیات کا ایک اہم حصہ بھول چکے۔ موجودہ اناجیل میں واضح طور پر خرافات موجود ہیں مثلاً حضرت مسیح کی شراب سازی کا ذکر ہے جو کہ عقل کے بھی خلاف ہے اور خود موجودہ تعلیمات اناجیل کی اصل آیات کے بھی خلاف ہے۔[1] اسی طرح مریم مجدلیہ کا قصہ بھی ہے۔[2]

قابل توجہ یہ ہے کہ "نصاریٰ" "نصران" کی جمع ہے۔ عیسائیوں کو اس نام سے کیوں موسوم کیا گیا ہے اس سلسلے میں مختلف احتمالات ذکر کیے جا سکتے ہیں:

پہلا: یہ کہ حضرت عیسیٰؑ نے بچپن ناصرہ شہر میں گزارا۔

دوسرا: یہ کہ لفظ نصران سے لیا گیا ہے جو ایک بستی کا نام ہے جس سے نصاریٰ خاص لگاؤ رکھتے تھے۔

تیسرا: یہ کہ جب حضرت مسیحؑ نے لوگوں میں سے مددگار اور انصار طلب کیے تو انھوں نے آپ کی دعوت قبول کر لی جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

كما قال عيسى ابن مريم للحواريين من انصاري الى الله قال الحواريون نحن انصار الله

جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کے لیے میری نصرت کرنے والا ہوگا، تو حواریوں نے کہا کہ ہم انصار خدا ہیں۔ (صف ۔۔۔۔ ۱۴)

چونکہ ان لوگوں نے اس نام پر فخر کیا تھا جبکہ اپنے کہے کے مطابق عمل نہیں کرتے تھے اور صرف دعوے کی حد تک حضرت عیسیٰ کے یار و انصار تھے لہٰذا قرآن زیر بحث آیت میں کہتا ہے: ومن الذین قالوا انا نصاریٰ (ان لوگوں میں سے جو کہتے تھے کہ ہم مسیح کے مددگار ہیں لیکن وہ اس دعویٰ میں سچے نہ تھے)۔

اس کے بعد قرآن عیسائیوں کے اعمال کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کے اعمال کے نتیجے میں ہم نے قیامت تک کے لیے

---

١۔ انجیل یوحنا، باب ٢، جملہ ۲۲ تا ۱۲

٢۔ انجیل لوقا، باب ٧، جملہ ۳۶ تا ۴۸

ان میں دشمنی ڈال دی (فاغرینا بینھم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیٰمۃ)۔

ان کے لیے دوسری سزا کہ جس کی طرف آیت کے آخری حصے میں اشارہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ، عنقریب خدا انہیں ان کے اعمال کے نتائج کی خبر دے گا اور وہ عملی طور پر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے (و سوف ینبئھم اللہ بما کانوا یصنعون)۔

## چند اہم نکات

۱۔ "اغرینا" کا مفہوم: یہ لفظ "اغراء" کے مادہ سے ہے اس کا معنی ہے کسی چیز سے چپٹا دینا اور جوڑ دینا۔ بعد ازاں کسی کام کا شوق دلانے اور اس پر اکسانے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا کیونکہ یہ بات لوگوں کے معین اسباب سے مربوط ہونے کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ نصاریٰ کی عہد شکنی اور غلط کاریاں اس بات کا سبب بنیں کہ ان میں عداوت، دشمنی اور نفاق واختلاف پیدا کر دیا جائے (کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اسباب تکوینی کے آثار کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے) آج بھی عیسائی حکومتوں کے درمیان بے شمار کشمکشیں موجود ہیں جن کی بنا پر اب تک دو عالمی جنگیں ہو چکی ہیں ان میں گروہ بندیاں اور عداوت و دشمنی آج بھی جاری و ساری ہے۔ علاوہ ازیں عیسائیوں کے مختلف مذاہب میں اختلافات اور عداوتیں اس قدر ہیں کہ آج بھی وہ ایک دوسرے کا کشت و خون جاری رکھے ہوئے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہاں مراد یہود و نصاریٰ کے درمیان دشمنی ہے جو رہتی دنیا تک جاری رہے گی لیکن آیت کا ظاہری مفہوم عیسائیوں کے مابین عداوت ہی کی تائید کرتا ہے[1]

شاید اس بات کی یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ یہ دردناک انجام عیسائیوں ہی میں منحصر نہیں اگر مسلمان ان کا طریقہ اپنائیں گے تو وہ بھی اس نتیجے سے دوچار ہوں گے۔

۲۔ "عداوت" اور "بغضاء" کا مفہوم: "عداوت" "عدو" کے مادہ سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے، اور "بغضاء" "بغض" کے مادہ سے کسی چیز سے نفرت کرنے کے معنی میں ہے۔ ممکن ہے ان دونوں الفاظ میں یہ فرق ہو کہ "بغض" زیادہ تر قلبی پہلو رکھتا ہے جب کہ "عداوت" عملی پہلو رکھتی ہے یا کم از کم عملی اور قلبی دونوں پہلو رکھتی ہے۔

۳۔ کیا یہودیت اور عیسائیت ہمیشہ موجود رہیں گی؟: زیر بحث آیت میں یوں لگتا ہے جیسے نصاریٰ ایک مذہب کے پیروکار ہونے کے حوالے سے (یا یہود و نصاریٰ دونوں) رہتی دنیا تک موجود رہیں گے۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی روایات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مہدیؑ کے ظہور کے بعد پورے عالم میں ایک سے زیادہ دین نہیں ہوگا اور وہ دین اسلام ہے تو ان دو باتوں کو کیسے جمع کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] اس بنا پر "بینھم" کی ضمیر نصاریٰ کی طرف ہی لوٹے گی کہ جن کا ذکر آیت کی ابتداء میں ہو چکا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ عیسائیت (یا عیسائیت اور یہودیت) ایک بہت ہی کمزور اقلیت کے طور پر حضرت مہدیؑ کے دور میں بھی باقی رہ جائے کیونکہ یہ بات تو واضح ہے کہ اس دور میں بھی انسانوں سے ارادہ کی آزادی نہیں چھینی جائے گی اگرچہ دنیا کی قطعی اکثریت دین حق کو پالے گی اور اسے قبول کرے گی۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ پوری دنیا پر ایک اسلامی حکومت ہی ہوگی۔

۱۵۔ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَـكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡـكِتٰبِ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ‌ؕ قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ ۙ‏ ○

۱۶۔ يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ‏ ○

## ترجمہ

۱۵۔ اے اہل کتاب، تمھارے پاس ہمارا رسول آیا ہے جو آسمانی کتاب کے ان بہت سے حقائق کو واضح کرے گا جنھیں تم چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں سے (جن کی عملاً ضرورت نہیں) صرفِ نظر کرے گا۔ خدا کی طرف سے تمھارے پاس نور اور واضح کتاب آئی ہے۔

۱۶۔ جو لوگ اس کی خوشنودی کی پیروی کرتے ہیں خدا انھیں سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرے گا اور اپنے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر انھیں روشنی میں لے جائے گا اور انھیں راہ راست کی ہدایت کرے گا۔

## تفسیر

گزشتہ آیات میں یہود و نصاریٰ اور ان کی عہد شکنیوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ اب ان آیات میں ان سے بلاواسطہ خطاب کے ذریعے انھیں اس اسلام کی طرف دعوت دی گئی ہے جس نے اُن کے آسمانی دین کو خرافات سے پاک کیا اور انھیں اس راہ راست کی ہدایت کی جاری ہے جو ہر قسم کے انحراف اور کجروی سے دُور ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اے اہل کتاب، ہمارا بھیجا ہوا تمھاری طرف آیا ہے تاکہ آسمانی کتب کے وہ بہت سے حقائق آشکار

علاوہ ازیں بعد والی آیت میں "بہٖ" کی ضمیر مفرد ہے اس سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ نور اور کتاب مبین ایک ہی حقیقت ہیں۔

البتہ متعدد روایات میں نور سے امیرالمومنینؑ یا تمام آئمہ اہل بیتؑ مراد لیے گئے ہیں لیکن واضح ہے کہ یہ آیات کے مختلف بطون کے حوالے سے ایک بطن کی تفسیر کی طرح ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے ظاہری معانی کے علاوہ کچھ باطنی مفاہیم بھی ہیں جنھیں "بطونِ قرآن" کہا جاتا ہے یہ جو ہم نے کہا ہے کہ واضح ہے کہ یہ تفسیر بطون قرآن سے مربوط ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت آئمہ موجود نہیں تھے کہ اہل کتاب کو ان پر ایمان لانے کی دعوت دی جاتی۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ دوسری آیت رضائے الٰہی کے حصول کے لیے قدم بڑھانے والوں کو نوید سناتی ہے کہ قرآن کے سائے میں انھیں تین عظیم نعمتیں دی جائیں گی۔

پہلی نعمت سلامتی کی شاہراہ کی ہدایت ہے ..... یہ سلامتی درحقیقت، فرد، معاشرے، روح، خاندان اور اخلاق کی سلامتی ہے (اور یہ سلامتی عملی پہلو رکھتی ہے)۔

دوسری نعمت کفر اور بے دینی کی ظلمتوں سے نکال کر نور ایمان کی طرف لے جانا ہے (یہ اعتقادی پہلو رکھتی ہے)۔

تیسری نعمت ان تمام چیزوں کو مختصر ترین اور نزدیک ترین راستے سے انجام دینا ہے، جسے "صراط مستقیم" کہتے ہیں۔

لیکن یہ سب نعمتیں ان لوگوں کو نصیب ہوں گی جو تسلیم اور حق گوئی کے دروازہ سے داخل ہوں گے اور "من اتبع رضوانہ" کے مصداق ہوں گے۔ منافقین اور ہٹ دھرم افراد جو حق سے دشمنی رکھتے ہیں انھیں اس سے کوئی فائدہ نصیب نہیں ہوگا، جیسا کہ قرآن کی دیگر آیات گواہی دیتی ہیں۔

نیز ان سب آثار کا سرچشمہ خدا کا حتمی ارادہ ہے جس کی طرف لفظ "باذنہ" سے اشارہ کیا گیا ہے۔

۱۷۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○

## ترجمہ

۱۷۔ یقیناً جنھوں نے کہا کہ مسیح بن مریم خدا ہے وہ کافر ہو گئے ہیں، کہہ دو اگر خدا چاہے کہ مسیح بن مریم، اس کی

ماں اور روئے زمین پر موجود تمام لوگوں کو ہلاک کردے تو اسے کون روک سکتا ہے (ہاں) آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان کی حکومت خدا ہی کے لیے ہے جو وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

# تفسیر

## کیسے ممکن ہے کہ مسیحؑ خدا ہو؟

گذشتہ مباحث کی تکمیل کے لیے اس آیت میں حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے دعویٰ پر شدید حملہ کیا گیا ہے اور اسے ایک واضح کفر قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، یہ امر مسلم ہے کہ جن لوگوں نے کہا ہے کہ مسیح بن مریم خدا ہے وہ کافر ہو گئے ہیں اور درحقیقت انھوں نے خدا کا انکار کیا ہے (لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم)۔

اس جملے کا مفہوم واضح ہونے کے لیے ہمیں جاننا چاہیے کہ عیسائی خدا کے بارے میں بے بنیاد دعوے کرتے ہیں۔

__پہلا__ وہ تین خداؤں کا عقیدہ رکھتے ہیں جسے سورۂ نساء کی آیہ ۱۷۰ میں باطل قرار دیا گیا ہے:

لا تقولوا ثلاثۃ انتھوا خیرا لکم انما اللہ الٰہ واحد

یعنی ــــــ یہ نہ کہو کہ تین خدا ہیں، اس عقیدے سے باز آجاؤ، یہی تمھارے حق میں بہتر ہے، معبود تو فقط تنہا خدا ہے[1]

__دوسرے__ وہ عالم ہستی پیدا کرنے والے کو ان تین میں سے ایک خدا شمار کرتے ہیں اور اسے "باپ خدا"[2] کہتے ہیں۔ سورہ مائدہ ۷۳ میں قرآن مجید نے اس عقیدے کو بھی باطل قرار دیا ہے:

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثۃ وما من الٰہ الا الٰہ واحد

---

[1] اس آیت کی تفسیر اس جلد کی ابتداء میں گذر چکی ہے۔

[2] عیسائی کتب میں ہے:

باپ خدا بیٹے کے واسطے سے پوری کائنات کا خالق ہے (قاموس کتاب مقدس ص۳۴۵)

نیز یہ بھی ہے:

خدا یعنی جو خود بخود وجود میں آیا تمام مخلوقات کے خالق اور ساری کائنات کے مالک کا نام ہے اور وہ ایک لامتناہی اور ازلی روح ہے جو اپنے وجود و حکمت، قدرت اور عدالت میں اوصاف مختلف کے ساتھ ایسا ہے جس میں تغیر و تبدل نہیں ہے۔

(قاموس کتاب مقدس صفحہ ۳۴۴)

یعنی ــــ کافر کہتے ہیں کہ خدا تین میں سے تیسرا ہے ، جب کہ ایک اکیلے معبود کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے[1]

تیسرا ــــ وہ کہتے ہیں کہ تینوں خدا تعدد حقیقی کے باوجود ایک ہیں اس عقیدے کو وہ "وحدت در تثلیث" بھی کہتے ہیں اس بات کی طرف زیر نظر آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا مسیح بن مریم ہے اور مسیح بن مریم خدا ہے اور دونوں روح القدس سے مل کر تین متعدد ذاتیں ہونے کے باوجود ایک ہیں۔

ہرگاہ تثلیث کے تمام پہلو جن میں سے ہر ایک عیسائیت کا عظیم ترین انحراف ہے، قرآن کی ایک ہی آیت میں باطل قرار دیے گئے ہیں۔

عقیدہ تثلیث کے بطلان کے بارے میں تفصیلی وضاحت اسی جلد میں سورۂ نساء کی آیہ ۱۷۱ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

ہم نے جو کچھ مندرجہ بالا سطور میں کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ فخر الدین رازی اور بعض دیگر مفسرین کو اس آیت کے سمجھنے میں یہ جو اشکال ہوا ہے کہ کوئی عیسائی بھی صراحت سے خدا اور مسیح کے اتحاد کے عقیدہ کا اظہار نہیں کرتا ، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں مسیحیت کی کتب پر کافی احاطہ نہیں ہے کیونکہ موجودہ عیسائی کتب میں "وحدت در تثلیث" کا مسئلہ بالوضاحت پیش کیا گیا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسی کتابیں اس زمانے میں ان مفسرین کے ہاتھ نہ لگی ہوں۔

اس کے بعد عقیدہ الوہیت کے بطلان کے لیے قرآن کہتا ہے ، اگر خدا چاہے کہ مسیح ، اس کی والدہ اور زمین میں بسنے والے تمام لوگوں کو ہلاک کر دے تو کون اسے روک سکتا ہے (قل فمن یملک من الله شیئا ان اراد ان یھلک المسیح ابن مریم وامه ومن فی الارض جمیعا)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ مریم دیگر انسانوں کی طرح انسان ہونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس بنا پر مخلوق ہونے کے لحاظ سے وہ دیگر مخلوقات کی طرح ہیں لہذا نابودی ان کے لیے بھی ہے اور وہ چیز جس کے لیے نیستی کا تصور ہو سکے کس طرح ممکن ہے کہ وہ ازلی و ابدی خدا ہو۔

دوسرے لفظوں میں اگر مسیحؑ خدا ہو تو خالق کائنات اسے ہلاک نہیں کر سکتا اور اس طرح اس کی قدرت محدود ہو جائے گی اور ایسی ہستی خدا نہیں ہو سکتی کیونکہ خدا کی قدرت اس کی ذات کی طرح غیر محدود ہے (غور کیجیے گا)۔

آیت میں "مسیح بن مریم" کے الفاظ کا تکرار ہے شاید یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ تم خود معترف ہو کہ مسیحؑ مریم کے فرزند تھے اور وہ ماں کے بطن سے پیدا ہوئے ان پر ایک مرحلہ حالت جنین کا گذرا ، پھر وہ نوزائیدہ بچے کی حالت میں رہے اور انھوں نے تدریجاً پرورش پائی اور بڑے ہوئے تو کیا یہ ممکن ہے کہ خدا ایک چھوٹے سے محیط مثلاً شکم مادر میں رہے اور اس میں یہ تمام تغیرات اور تحولات پیدا ہوں نیز جنین اور شیر خوارگی کے عالم میں وہ ماں کا محتاج ہو۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں حضرت عیسیٰؑ کے ذکر کے ساتھ خصوصیت سے ان کی والدہ کے نام کے ساتھ لفظ

---

۱۔ اس کی تفسیر انشاء اللہ عنقریب آئے گی۔

"وامہ" آیا ہے یوں مادرِ عیسیٰ کو دنیا کے دیگر لوگوں سے ممتاز کیا گیا ہے، ممکن ہے یہ تعبیر اس بنا پر ہو کہ عیسائی پوجا پاٹ کے وقت ان کی والدہ کی پرستش بھی کرتے ہیں اور اس وقت کے کلیساؤں میں دیگر مجسموں کے علاوہ جناب مریم کا مجسمہ بھی ہوتا ہے جس کی وہ تعظیم اور پرستش کرتے ہیں۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۶ میں بھی اس مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

واذقال اللہ یاعیسی بن مریم أ انت قلت للناس اتخذونی و امی الٰھین من دون اللہ

روزِ قیامت جب خدا کہے گا: اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر میری اور میری والدہ کی پرستش کرو۔

جو لوگ بغیر باپ کے پیدا ہونے کو مسیح کی الوہیت کی دلیل سمجھتے ہیں، آیت کے آخر میں انھیں جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ سب خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے وہ جیسی مخلوق چاہے پیدا کرتا ہے (وہ چاہے تو کسی کو بغیر ماں باپ کے پیدا کرے جیسے اس نے حضرت آدمؑ کو پیدا کیا، وہ چاہے تو ماں باپ کے توسط سے پیدا کرے جیسے عام انسانوں کو پیدا کرتا ہے اور وہ چاہے تو کسی کو صرف ماں کے توسط سے پیدا کرے جیسے اس نے حضرت مسیحؑ کو پیدا کیا ہے خلقت کا یہ تنوع کسی اور چیز کا نہیں بلکہ اس کی قدرت کی دلیل ہے) اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (و للہ ملک السمٰوٰت والارض و بینھما یخلق ما یشاء واللہ علی کل شیء قدیر)۔

۱۸۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؗ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○

## ترجمہ

۱۸۔ یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ ہم خدا کے بیٹے ہیں اور اس کے (خاص) دوست ہیں (ان سے) کہہ دو کہ پھر وہ تمھیں تمھارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے بلکہ تم اس کی مخلوقات میں سے انسان ہو وہ جسے چاہتا ہے (اور اہل پاتا ہے) اسے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے (اور مستحق سمجھتا ہے) اسے سزا دیتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب اس کے لیے ہے اور تمام موجودات کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

# تفسیر

اس آیت میں گزشتہ مباحث کی تکمیل کی گئی ہے، یہود و نصاریٰ کی بے بنیاد دعووں اور موہوم امتیازات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں (و قالت الیہود والنصٰرٰی نحن ابنٰٓؤا اللّٰہ و احبّٰٓؤہ)۔

وہ اپنے بارے میں صرف اسی امتیاز کے قائل نہیں بلکہ آیات قرآنی میں بارہا ان کے اس قسم کے دعووں کا ذکر کیا گیا ہے سورۂ بقرہ آیت ۱۱۱ میں ان کے دعوے کا بھی ذکر ہے کہ ان کے علاوہ کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا اور یہ کہ جنت یہود و نصاریٰ ہی سے مخصوص ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۸۰ میں یہودیوں کے اس دعویٰ کا ذکر کیا گیا ہے کہ جہنم کی آگ چند دن کے سوا ان تک نہیں پہنچے گی۔ اس دعویٰ کے ذکر کے بعد ان کی سرزنش کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ان کے اس موہوم دعویٰ کا تذکرہ ہے کہ وہ خدا کے بیٹے اور خاص دوست ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا حقیقی بیٹا نہیں سمجھتے تھے عیسائی صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا حقیقی بیٹا سمجھتے ہیں اور بالتصریح اپنے اس عقیدے کا اظہار کرتے ہیں[1]۔ وہ یہ بات اپنے لیے اس مفہوم میں استعمال کرتے تھے کہ وہ خدا سے خاص ربط رکھتے ہیں اور جو شخص بھی ان کی نسل میں سے ہے یا ان کے گروہ میں داخل ہو جاتا ہے وہ اعمال صالح کے بغیر خود بخود خدا کے دوستوں اور فرزندوں میں شمار ہو جاتا ہے[2]۔

ہم جانتے ہیں کہ قرآن ان تمام موہوم امتیازات سے جنگ کرتا ہے اور ہر شخص کا امتیاز صرف ایمان، عمل صالح اور اس کی پرہیزگاری میں سمجھتا ہے اسی لیے زیر نظر آیت میں اس دعویٰ کے بطلان کے لیے فرمایا گیا ہے، ان سے کہیے کہ اگر ایسا ہے تو پھر وہ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے (قل فلم یعذبکم بذنوبکم)۔

یعنی تم خود اعتراف کرتے ہو کہ تمہیں تھوڑی سی مدت کے لیے سزا دے گا گناہ گاروں والی جو یہ سزا تمہیں ملے گی اس بات کی دلیل ہے کہ تمہارا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ تم خدا سے کوئی خاص تعلق رکھتے ہو بلکہ اپنے آپ کو خدا کا بیٹا شمار کرتے ہو۔ علاوہ ازیں تمہاری تاریخ شاہد ہے کہ خود اسی دنیا میں تم کئی سزاؤں اور عذابوں میں مبتلا ہوئے ہو۔ یہ تمہارے دعویٰ کے بطلان پر

---

[1] کتب عیسائیت کہتی ہیں:

"خدا کا بیٹا"...... یہ لفظ ہمارے منجی (نجات دینے والے) اعفادی (فدیہ بننے والے) کا ایک لقب ہے جو کسی دوسرے پر نہیں بولا جاسکتا مگر ایسے مقام پر کہ قرآئن سے معلوم ہو کہ مقصد خدا کا حقیقی بیٹا نہیں۔

(قاموس کتاب مقدس صفحہ ۳۴۵)

[2] کچھ عرصہ ہوا ہمارے علاقے میں کچھ افراد نے لوگوں کو عیسائی بنانے کے لیے خاص تبلیغات شروع کر رکھی تھیں اور وہ اپنے آپ کو "خدا کے بیٹے" کہتے تھے

دوسری دلیل ہے۔

اس مفہوم کی تاکید کے لیے مزید ارشاد ہوتا ہے ، تم مخلوقاتِ خدا میں سے دیگر انسانوں جیسے انسان ہو ( بل انتم بشر ممن خلق ) یہ سب کے لیے قانونِ عام ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے ( اور اہل سمجھتا ہے ) بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ( اور مستحق پاتا ہے ) سزا دیتا ہے ( یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء )۔

• علاوہ ازیں سب خدا کی مخلوق ، اس کے بندے اور مملوک ہیں لہٰذا کسی کو خدا کا بیٹا کہنا منطقی اور اصولی بات نہیں ہے ( وللّٰه ملك السمٰوٰت والارض وما بینهما ) اور آخر کار ساری مخلوق نے اسی کی طرف لوٹ جانا ہے ( والیه المصیر )۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہود و نصاریٰ نے کہاں "خدا کے بیٹے" ہونے کا دعویٰ کیا ہے ( چاہے یہاں بیٹا حقیقی میں نہیں مجازی معنی میں ہی ہو ) ؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موجودہ اناجیل میں یہ بات بارہا دکھائی دیتی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ انجیل یوحنا باب ۸ جملہ ۴۱ کے بعد یہ بات درج کی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہودیوں سے کہا :

"تم اپنے باپ والے کام کرتے ہو"۔

یہودیوں نے جواب دیا :

ہم زنا سے پیدا نہیں ہوئے ، ہمارا ایک باپ ہے جو کہ خدا ہے۔

عیسیٰ نے ان سے کہا :

اگر خدا تمھارا باپ ہوتا تو تم مجھے دوست رکھتے۔

روایاتِ اسلامی میں بھی ابنِ عباس سے ایک حدیث مروی ہے :

پیغمبرِ اسلام نے یہودیوں کی ایک جماعت کو دینِ اسلام کی دعوت دی اور انھیں خدا کے عذاب سے ڈرایا تو وہ کہنے لگے تم ہمیں خدا کے عذاب سے کیسے ڈراتے ہو جب کہ ہم تو خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔[1]

تفسیر مجمع البیان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں اس حدیث سے ملتی جلتی ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ :

پیغمبر خدا نے خدا کے عذاب سے ڈرایا تو ایک گروہ کہنے لگا کہ ہمیں تہدید نہ کرو اور نہ ڈراؤ کیونکہ ہم تو خدا کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں اگر وہ ہم پر ناراض بھی ہو تو اس کی یہ ناراضگی ایسی ہے جیسے کوئی انسان اپنے بیٹے پر ناراض ہوتا ہے ( یعنی بہت جلد اس کا یہ غصّہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے )۔

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی جلد ۱۱ ص۱۹۲

۱۹۔ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ لَـكُمۡ عَلٰى فَتۡرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا جَآءَنَا مِنۡۢ بَشِيۡرٍ وَّلَا نَذِيۡرٍ‌ فَقَدۡ جَآءَكُمۡ بَشِيۡرٌ وَّنَذِيۡرٌ‌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ○

## ترجمہ

۱۹۔ اے اہل کتاب ! ہمارا رسول تمھاری طرف آگیا ہے اور وہ پیغمبروں کے درمیانی عرصے اور فاصلے کے بعد تمھارے لیے حقائق بیان کرتا ہے کہ مبادا (روز قیامت) کہو کہ ہمارے پاس نہ بشارت دینے والا آیا ہے نہ ڈرانے والا (لہٰذا اب) بشارت دینے والا اور ڈرانے والا (پیغمبر) تمھارے پاس آگیا ہے اور خدا ہر چیز پہ قدرت رکھتا ہے۔

## تفسیر

اس آیت میں پھر روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہے : اے اہلِ کتاب ! اے یہود و نصاریٰ ! ہمارا پیغمبر تمھاری طرف آیا ہے اور اس دور میں جب کہ انبیاء الٰہی کے درمیان فاصلہ اور وقفہ ہو چکا ہے اس نے تمھارے سامنے حقائق بیان کیے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم کہو کہ خدا کی طرف سے ہماری طرف کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا (یا اهل الکتب قد جاء کم رسولنا یبین لکم علی فترة من الرسل ان تقولوا ما جاء نا من بشیر ولا نذیر)۔

"بشیر" اور "نذیر" یعنی پیغمبر اسلام جنھوں نے صاحب ایمان اور نیک افراد کو خدا کی رحمت و جنا کی بشارت دی اور بے ایمان ، گنہ گار اور آلودہ افراد کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا ایسا پیغمبر تمھاری طرف آگیا ہے (فقد جاء کم بشیر ونذیر)۔

"فترت" دراصل سکون و اطمینان کے معنی میں ہے۔ دو حرکات ، دو کوششوں اور دو انقلابات کے درمیانی فاصلے کو بھی "فترت" کہتے ہیں۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ کے درمیان انبیاء مرسلین موجود تھے لیکن حضرت مسیحؑ اور پیغمبر اسلامؐ کے درمیان یہ صورت نہیں تھی قرآن نے اس دور کا نام "فترت رسل" رکھا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور بعثتِ پیغمبرؐ کے درمیان

تقریباً چھ سو سال کا فاصلہ تھا[1] لیکن جس طرف قرآن نے (سورۂ یٰسٓ آیہ ۱۴ میں) اشارہ کیا ہے اور مفسرین اسلام کے قول کے مطابق ان دو پیغمبروں کے درمیانی عرصے میں کم از کم تین رسول آئے ہیں اور بعض ان کی تعداد چار سمجھتے ہیں۔ پھر بھی ان سولوں کی وفات اور رسولِ اسلامؐ کے درمیان فاصلہ تھا اسی لیے قرآن نے اس عرصے کو "فترت" قرار دیا ہے۔

## ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے اس مقام پر کہا جائے کہ ہمارے عقیدے کے مطابق تو انسانی معاشرہ ایک لحظہ کے لیے بھی خدائی نمائندے اور اس کے بھیجے ہوئے افراد سے خالی نہیں ہو سکتا لہٰذا "فترت" کا ایسا دور کیونکر ہو سکتا ہے۔

توجہ رہے کہ قرآن کہتا ہے: "علی فترة من الرسل" ...... یعنی اس دور میں رسول نہیں تھا۔ یہ بات اس کے خلاف نہیں کہ اس دور میں اوصیاء موجود ہوں۔

بہتر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ "رسول" ان ہستیوں کو کہتے ہیں جو وسیع ذریعے تبلیغات پر مامور تھے۔ لوگوں کو بشارتیں اور تنذاریں دیتے تھے، معاشروں کا سکوت توڑتے تھے اور اپنی آواز تمام لوگوں کے کانوں تک پہنچاتے تھے۔ لیکن سب کے سب اوصیاء ایسی ماموریت اور ذمہ داری نہ رکھتے تھے یہاں تک کہ ممکن ہے وہ بعض اجتماعی عوامل کی وجہ سے پوشیدہ طور پر لوگوں میں زندگی گزارتے ہوں۔ حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں ایک بیان میں فرماتے ہیں۔

> اللهم بلی لا تخلوا الارض من قائم لله بحجة اما ظاهرًا مشهورًا او خائفا مغمورًا لئلا تبطل حجج الله وبيناته يحفظ الله بهم حججه و بيناته حتى يودعوها نظرائهم و يزرعوها في قلوب اشباههم
>
> ہاں روئے زمین ایسے شخص کے وجود سے ہرگز خالی نہیں ہوتی جو حجت خدا کے ساتھ قیام کرے، وہ آشکار اور مشہور ہو یا مخفی اور نہ پہچانا ہو تاکہ خدائی احکام، دلائل اور نشانیاں ختم نہ ہو جائیں (اور وہ انھیں تحریف اور دستبرد سے محفوظ رکھیں) خدا ان کے ذریعے اپنے دلائل اور نشانیوں کی حفاظت کرتا ہے تاکہ وہ انھیں اپنے جیسے افراد تک پہنچا دیں، آہستہ آہستہ خرافات، شیطانی وسوسے، تحریفات اور تعلیماتِ الٰہی سے بے خبری پھیلتی رہے گی ایسے میں ممکن ہے کچھ لوگ ذمہ داریوں سے فرار کیلئے ایسی صورت کو بہانہ بنائیں تو اس صورت میں خدا آسمانی جانشینوں کے ذریعے اس بہانے کو منقطع کر دیتا ہے[2]۔

---

[1] بعض لوگ ان دو عظیم پیغمبروں کے درمیانی عرصے کو چھ سو سال سے کم سمجھتے اور بعض زیادہ۔ کچھ کے بقول حضرت مسیحؑ کی ولادت اور پیغمبر اسلامؐ کی ہجرت کے درمیان رومی سالوں کے حساب سے چھ سو اکیس سال اور ایک سو بیانوے دن کا فاصلہ ہے
(تفسیر ابو الفتوح رازی ج ۴ ص ۱۵۱ کے حاشیہ پر مرحوم شعرانی کی تحریر)

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۱۴۷

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (و اللہ علی کل شیء قدیر) یعنی پیغمبروں کو بھیجنا اور ان کے جانشینوں کو دعوتِ حق کی نشرواشاعت کے لیے بھیجنا اس کی قدرت کے سامنے آسان سا کام ہے۔

۲۰۔ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○

۲۱۔ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ○

۲۲۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖۗ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ○

۲۳۔ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

۲۴۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ○

۲۵۔ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ○

۲۶۔ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ○

## ترجمہ

۲۰۔ وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا : اے قوم ! تم پر خدا نے جو نعمت کی ہے اسے یاد رکھو ، جب اس نے تمھارے درمیان انبیاء مقرر کیے (اور فرعونی استعمار کی زنجیر توڑ دی) اور تمھیں خود اپنا مختار بنا دیا اور تمھیں ایسی کئی چیزیں بخشیں جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دیں۔

۲۱۔ اے قوم ! سرزمین مقدس میں داخل ہو جاؤ جسے خدا نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے اور اپنے پچھلے پاؤں نہ لوٹ جاؤ (اور پیچھے نہ ہٹو) کہ خسارے میں رہو گے۔

۲۲۔ وہ کہنے لگے ، اے موسیٰ ! اس سرزمین میں ظالم رہتے ہیں جب تک وہ نہ نکل جائیں ہم اس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے ، وہ نکل جائیں تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔

۲۳۔ ان لوگوں میں سے دو شخص جو خدا سے ڈرتے تھے اور خدا نے (عقل ، ایمان اور شجاعت کی صورت میں) انھیں اپنی نعمت سے نوازا تھا کہنے لگے ، ان کے شہر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ ، جب تم داخل ہو گئے تو کامیاب ہو جاؤ گے اور خدا پر توکل کرو اگر ایمان رکھتے ہو۔

۲۴۔ بنی اسرائیل کہنے لگے ، اے موسیٰ ! جب تک وہ اس میں ہیں ہم ہرگز وہاں نہیں جائیں گے تو اور تیرا پروردگار جائے اور (ان سے) جنگ کرے ، ہم تو یہیں بیٹھیں گے۔

۲۵۔ موسیٰ نے کہا ، پروردگارا ! میرا تو بس اپنے پر اور اپنے بھائی پر بس چلتا ہے ، میرے اور اس گنہ گار جماعت کے درمیان جدائی ڈال دے۔

۲۶۔ خدا نے موسیٰ سے فرمایا : یہ سرزمین چالیس سال تک ان کیلئے ممنوع ہے (اور یہ اس تک نہیں پہنچ سکیں گے) اور ہمیشہ زمین میں سرگرداں رہیں گے اور اس گنہ گار جمعیت (کے انجام) کے بارے میں غمگین نہ ہو۔

## تفسیر

### بنی اسرائیل اور سرزمین مقدس

ان آیات میں یہودیوں میں روح حق شناسی بیدار کرنے گزشتہ خطاؤں کے بارے میں ان کے شعور کو دعوت دینے اور

انھیں ان خطاؤں کی تلافی پر ابھارنے کے لیے فرمایا گیا ہے: وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے پیروکاروں سے کہا کہ خدا نے تمھیں جو نعمتیں بخشی ہیں انھیں فراموش نہ کرو (و اذ قال موسی لقومه یقوم اذکروا نعمة الله علیکم) واضح ہے کہ "نعمة الله" کا مفہوم پروردگار کی تمام نعمات پر محیط ہے۔ لیکن یہاں ان کے تین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی نعمت یہ ہے کہ بہت سے انبیاء اور رہبران انہیں پیدا ہوئے یہ دراصل ان کے لیے سب سے بڑی نعمت تھی (اذ جعل فیکم انبیاء) یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ صرف حضرت موسیٰ بن عمران کے زمانے میں ستر سے زیادہ پیغمبر تھے۔ وہ تمام ستر افراد جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ کوہ طور پر گئے تھے، انبیاء کے زمرے میں آتے ہیں۔ اسی نعمت کی برکت سے وہ شرک، بت پرستی اور گوسالہ پرستی جیسی ہولناک مصیبتوں سے رہا ہوئے اور انھوں نے طرح طرح کے خرافات اور بیہودہ قباحتوں اور نجاستوں سے نجات حاصل کی۔ یہ ان کے لیے عظیم ترین نعمت تھی۔

ایک عظیم مادی نعمت تھی جو اپنے مقام پر روحانی نعمتوں کے لیے ایک مقدمہ بھی ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تمھاری جان و مال اور زندگی کا اختیار خود تمھارے ہاتھ میں دے دیا (و جعلکم ملوکا) بنی اسرائیل سالہا سال سے فرعون اور فرعونیوں کی قید و بند کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور ان کے اپنے ہاتھ میں کوئی اختیار نہ تھا۔ ان کے ساتھ قیدی جانوروں کا سا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ حضرت موسیٰ بن عمران نے حکم خدا سے قیام کیا اور ان کے پاؤں میں پڑی غلامی اور استعمار کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا اور انھیں ان کی زندگی کا مختار بنا دیا۔

بعض نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "ملوک" سے یہاں مراد وہ بادشاہ اور سلاطین ہیں جو بنی اسرائیل میں سے ہوئے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے پاس حکومت ایک مختصر سے دور کے لیے ہی رہی اور ان میں سے چند افراد ہی اس مقام تک پہنچے جب کہ آیت کہتی ہے، و جعلکم ملوکا ..... یعنی خدا نے تم سب کو یہ مقام عطا کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت سے مراد وہی کچھ ہے جو ہم نے سطور بالا میں کہا ہے۔ علاوہ ازیں "ملک" (بروزن "الف") لغت میں بادشاہ اور صاحب اقتدار کے معنی میں بھی آتا ہے۔[۱]

درمنثور میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

کانت بنو اسرائیل اذا کان لاحدهم خادم و دابة و امرأة کتب ملکا۔

---

[۱] کتب لغت میں ہے:

الملك من کان له الملك و الملك هو ما یملکه الانسان و یتصرف به ـــ او ـ العظمة و السلطنة

ملک وہ شخص ہے جو ملک رکھتا ہو اور ملک ان سب چیزوں کو کہتے ہیں جس کا انسان مالک ہو اور ان میں تصرف کرے۔

بنی اسرائیل میں سے جس شخص کے پاس غلام گھوڑا اور بیوی ہوتی اسے ملک کہتے تھے[1]

آیت کے آخر میں کلی طور پر ان اہم نعمتوں کا ذکر ہے جو اس زمانے میں کسی اور کو نہیں دی گئی تھی۔ تمہیں ایسی چیزیں دی گئیں جو عالمین میں سے کسی کو نہیں دی گئی تھیں ( و آتاکم مالم یؤت احداً من العالمین )۔

ایسی طرح طرح کی بہت زیادہ نعمتیں تھیں ان میں سے یہ بھی تھیں کہ انھیں معجزانہ طور پر فرعون سے نجات ملی، ان کیلیے دریا شق ہوا اور من وسلویٰ جیسی خاص غذا انھیں میسر آئی۔ اس کی تفصیل سورۂ بقرہ آیت ۵۰ کے ذیل میں جلد اول (ص۲۱۴، اردو ترجمہ) میں گزر چکی ہے۔

اس کے بعد سرزمین مقدس میں بنی اسرائیل کے حدود کے بارے میں یوں بیان کیا گیا ہے: موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم سرزمین مقدس میں جسے خدا نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے داخل ہو جاؤ، اس سلسلے میں مشکلات سے نہ ڈرو، فداکاری سے منہ نہ موڑو اور اگر تم نے اس حکم سے پیٹھ پھیری تو خسارے میں رہو گے (یقوم ادخلوا الارض المقدسة التی کتب الله لکم ولا ترتدوا علی ادبارکم فتنقلبوا خاسرین )۔

آیت میں ارضِ مقدسہ سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین نے بہت کچھ کہا ہے، بعض بیت المقدس کہتے ہیں کچھ اردن یا فلسطین کا نام لیتے ہیں اور بعض سرزمین طور سمجھتے ہیں، لیکن بعید نہیں کہ اس سے مراد منطقہ شامات ہو جس میں تمام مذکورہ علاقے شامل ہیں کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ یہ سارا علاقہ انبیاء الٰہی کا گہوارہ، عظیم ادیان کے ظہور کی سرزمین اور طویل تاریخ میں توحید، خدا پرستی اور تعلیمات انبیاء کی نشر واشاعت کا مرکز رہا ہے لہٰذا اسے سرزمین مقدس کہا گیا ہے اگرچہ بعض اوقات خاص بیت المقدس کو بھی ارضِ مقدس کہا جاتا ہے۔

" کتب الله علیکم " سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ بنی اسرائیل سرزمین مقدس میں امن و سکون اور خوشحالی کی زندگی بسر کریں (اس شرط کے ساتھ کہ اسے شرک اور بت پرستی سے پاک رکھیں اور خود بھی انبیاء کی تعلیم سے منحرف نہ ہوں) لیکن وہ اگر اس حکم پر کاربند نہ رہے تو انھیں بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ لہٰذا اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی مخاطب بنی اسرائیل کی ایک نسل اس سرزمین میں داخل نہ ہو سکی اور چالیس سال تک بیابان میں سرگرداں رہی اور ان کی اگلی نسل کو یہ توفیق ملی ....... تو یہ بات " کتب الله لکم " (خدا نے تمھارے لیے مقرر کیا ہے) کے مفہوم کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ بات چند شرائط سے مشروط تھی جنھیں انھوں نے پورا نہیں کیا۔ جیسا کہ بعد والی آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل نے اس حکم پر حضرت موسیٰؑ کو وہی جواب دیا جو ایسے موقع پر کمزور، بزدل اور جاہل لوگ دیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ تمام کامیابیاں انھیں اتفاقاً اور معجزانہ طور پر ہی حاصل ہو جائیں یعنی لقمہ بھی کوئی اٹھا کر ان کے منہ میں ڈال دے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے: آپ جانتے ہیں کہ اس علاقے میں ایک جابر اور جنگجو گروہ رہتا ہے

---

[1] المیزان جلد ۵ ص۳۱۹، تفسیر طبری ج ۶ ص۱۰۱ میں بھی یہ روایت نقل ہے۔

جب تک وہ اسے خالی کرکے باہر نہ چلا جائے ہم تو اس علاقے میں قدم تک نہیں رکھیں گے۔ اسی صورت میں ہم آپ کی اطاعت کریں گے اور سرزمین مقدم میں داخل ہوں گے (قالوا یٰموسٰی ان فیھا قوماً جبارین[1] وانا لن ندخلھا حتی یخرجوا منھا فان یخرجوا منھا فانا داخلون)۔

بنی اسرائیل کا یہ جواب اچھی طرح نشاندہی کرتا ہے کہ طویل فرعونی استعمار نے ان کی نسلوں پر کیسا منحوس اثر چھوڑا تھا۔ لفظ "لن" جو دائمی نفی پر دلالت کرتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ سرزمین مقدس کی آزادی کے لیے مقابلے سے کس قدر خوفزدہ تھے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل سعی و کوشش کرتے، جہاد و قربانی کے جذبے سے کام لیتے اور سرزمین مقدس پر قبضہ کر لیتے اگر فرض کریں کہ سنتِ الٰہی کے برخلاف بغیر کسی اقدام کے ان کے تمام دشمن معجزانہ طور پر نابود ہو جاتے اور بغیر کوئی تکلیف اٹھائے وہ وسیع علاقے کے وارث بن جاتے تو اس کا انتظام چلانے اور اس کی حفاظت میں بھی ناکام رہتے۔ بغیر زحمت سے حاصل کی ہوئی چیز کی حفاظت سے انھیں کیا سروکار ہو سکتا تھا وہ اس کے لیے تیار ہوتے اور نہ اہل۔

جیسا کہ تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے آیت میں قوم جبار سے مراد قوم عمالقہ[2] ہے یہ لوگ سخت جان اور بلند قامت تھے یہاں تک کہ ان کی بلند قامت کے بارے میں بہت مبالغے ہوئے اور افسانے تراشے گئے۔ اس سلسلے میں مضحکہ خیز باتیں گھڑی گئیں جن کے لیے کوئی عملی دلیل نہیں ہے۔

خصوصاً "عوج" کے بارے میں خرافات سے معمور ایسی کہانیاں تاریخوں میں ملتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے افسانے جن میں سے بعض اسلامی کتب میں بھی آ گئے ہیں، دراصل بنی اسرائیل کے گھڑے ہوئے ہیں انھیں عام طور پر "اسرائیلیات" کہا جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ خود موجودہ تورات کے متن میں ایسے افسانے دکھائی دیتے ہیں۔ سفر اعداد کی تیرھویں فصل کے آخر میں ہے:

> اس زمین کے بارے میں جس کے تجسس میں (بنی اسرائیل کے جاسوس) لگے ہوئے تھے انھوں نے آکر ایک بری خبر دی۔ وہ کہنے لگے کہ جس زمین کے بارے میں ہم تجسس کرنے گئے ہوئے تھے جب ہم اس کے نزدیک سے گزرے تو دیکھا کہ وہ ایسی زمین ہے جو اپنے رہنے والوں کو تلف کر

---

[1] توجہ رہے کہ لفظ "جبار" اصل میں مادہ "جبر" سے ہے اس کا معنی ہے کہ کسی چیز کی قوت سے اور زبردستی اصلاح کرنا۔ اسی لیے ٹوٹی ہوئی ہڈی باندھنے کو "جبر" کہتے ہیں۔ بعدازاں ایک طرف ہر طرح کی اصلاح اور دوسری طرف ہر طرح کے تسلط اور غلبہ کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا خدا کو بھی جبار اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ تمام چیزوں پر تسلط رکھتا ہے یا ہر محتاج کی اصلاح کرتا ہے۔

[2] عمالقہ، سام کی اولاد میں سے ایک قوم تھی یہ لوگ جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں صحرائے سینا کے نزدیک رہتے تھے وہ مصر پر حملہ آور ہوئے اور مدتوں اس پر قابض رہے ان کی حکومت کا عرصہ تقریباً ۵۰۰ سال تھا (۲۲۱۳ ق م سے لے کر ۱۷۰۲ ق م تک)۔

(دائرۃ المعارف فرید وجدی ج ۶ صفحہ ۲۲۲ طبع سوم)

دیتی ہے اور اس میں ہم نے جتنے لوگوں کو دیکھا سب بلند قامت تھے۔ وہاں ہم نے بلند قد والوں یعنی اولاد عناق جو بلند قامت ہیں کو دیکھا ہے ہمیں ایسا لگا جیسے ہم ٹڈی دل ہیں اور خود ان کی نگاہوں میں بھی ہم ایسے ہی تھے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے، اس وقت اہلِ ایمان میں سے دو افراد ایسے تھے جن کے دل میں خوفِ خدا تھا اور اس بنا پر انھیں عظیم نعمتیں میسر تھیں ان میں استقامت و شجاعت بھی تھی، وہ دور اندیش بھی تھے اور اجتماعی اور فوجی نقطۂ نظر سے بھی بصیرت رکھتے تھے انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دفاعی تجویز کی حمایت کی اور بنی اسرائیل سے کہنے لگے، تم شہر کے دروازے سے داخل ہو جاؤ اور اگر تم داخل ہو گئے تو کامیاب ہو جاؤ گے (قال رجلان من الذین یخافون انعم اللہ علیہما ادخلوا علیھم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غٰلبون) لیکن ہر صورت میں تمھیں روحِ ایمان سے مدد حاصل کرنا چاہیے خدا پر بھروسہ کرو تاکہ اس مقصد کو پالو (وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مؤمنین)۔

اس بارے میں کہ یہ دو آدمی کون تھے؟ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا (یفنہ بھی لکھتے ہیں) تھے جو بنی اسرائیل کے نقیبوں میں سے تھے کہ جن کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔[1]

من الذین یخافون ...... کی تفسیر میں بھی کئی احتمالات پیش کیے گئے ہیں لیکن واضح ہے کہ ظاہری مفہوم یہ ہے کہ وہ دونوں مرد ایسے تھے جو خدا سے ڈرتے تھے اسی لیے تو انھیں غیرِ خدا کا کوئی خوف نہ تھا۔

انعم اللہ علیہما ...... خدا نے ان پر فراواں نعمت کی ...... یہ جملہ بھی مندرجہ بالا مفہوم کا شاہد ہے کیونکہ اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی کہ انسان صرف اللہ سے ڈرے نہ کہ اس کے غیر سے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ دو شخص کیسے جانتے تھے کہ اگر بنی اسرائیل اچانک حملہ کرکے شہر میں داخل ہو جائیں تو عمالقہ شکست کھا جائیں گے۔

شاید یہ اس لیے ہو کہ وہ موسیٰ بن عمران کے وعدۂ فتح و نصرت پر اعتماد رکھتے تھے اور اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تمام جنگوں کا ایک یہ اصول ہے کہ اگر حملہ آور فوج اپنے دشمن کے اصلی مرکز پر جا پہنچے یعنی اس کے گھر میں جا کر لڑے، تو عام طور پر کامیاب ہو جاتی ہے۔[2]

علاوہ ازیں جیسا کہ یہ واضح ہو چکا ہے کہ عمالقہ ایک تنومند اور قوی ہیکل قوم تھی (البتہ ان کے بارے میں افسانوی پہلوؤں کا ہم نے انکار کیا ہے) اور ایسی قوم بیابانی جنگ میں اپنی مہارت کا بہتر مظاہرہ کر سکتی ہے لیکن شہر کے گلی کوچوں میں ویسا نہیں

---

[1] موجودہ تورات کے سفر تثنیہ باب اول سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دو افراد کے نام یوشع اور کالب تھے۔

[2] نہج البلاغہ میں بھی خطبہ جہاد میں اس جنگی حکمتِ عملی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔

فواللہ ما غزی قوم فی عقر دارھم الا ذلوا

بخدا جس قوم پر بھی اس کے گھر میں حملہ کیا گیا، وہ ذلیل ہوئی۔ (خطبہ ۲۷)

ڈر سکتی۔ ان سب باتوں سے قطع نظر جیسا کہ کہا جاتا ہے وہ لوگ تومند اور قوی ہیکل ہونے کے باوجود ڈرپوک تھے اور اچانک حملے سے جلدی مرعوب ہو جاتے۔ ان تمام امور کے باعث ان دو افراد نے بنی اسرائیل کی کامیابی کی ضمانت دی تھی۔ مگر بنی اسرائیل نے یہ تجویز قبول نہ کی اور ضعف و کمزوری جو ان کی روح پر قبضہ کر چکی تھی اس کے باعث انھوں نے صراحت سے حضرت موسیٰؑ سے کہا: جب تک وہ لوگ اس سرزمین میں ہیں ہم ہرگز داخل نہیں ہوں گے، تم اور تمھارا پروردگار جس نے تم سے کامیابی کا وعدہ کیا ہے، جاؤ اور عمالقہ سے جنگ کرو اور جب کامیاب ہو جاؤ تو ہمیں بتا دینا ہم یہیں بیٹھے ہیں (قالوا یموسی انا لن ندخلها ابدا ما داموا فیها فاذهب انت وربك فقاتلا انا ههنا قاعدون)۔

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر کے سامنے جسارت کی انتہا کر دی تھی، کیونکہ پہلے تو انھوں نے لفظ "لن" اور "ابدا" استعمال کر کے اپنی صریح مخالفت کا اظہار کیا اور پھر یہ کہا کہ تم اور تمھارا پروردگار جاؤ اور جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔۔ انھوں نے حضرت موسیٰؑ اور ان کے وعدوں کی تحقیر کی یہاں تک کہ خدا کے ان دو بندوں کی تجویز کی بھی پروا نہیں کی اور شاید انھیں تو کوئی مختصر سا جواب تک نہیں دیا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ موجودہ توراۃ میں بھی اس داستان کے بعض اہم حصے موجود ہیں۔ یہ واقعہ سفر اعداد باب ۱۴ میں ہے، جہاں مذکور ہے:

> تمام بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون پر معترض ہوئے اور سب انھیں کہنے لگے کہ کاش ہم سرزمین مصر ہی میں مر گئے ہوتے یا پھر کسی جنگل بیابان میں مر جاتے۔ خدا اس زمین میں ہمیں کیوں لے آیا ہے کہ جہاں ہم تلوار زنی کا شکار ہو جائیں اور ہماری عورتیں اور بچے لوٹ کا مال بن جائیں۔۔۔۔۔ پس موسیٰ اور ہارون بنی اسرائیلی عوام کے سامنے منہ کے بل گر پڑے اور یوشع بن نون اور کالیب بن یفنہ جو زمین کے متجسسین میں سے تھے انھوں نے اپنا گریبان چاک کر لیا۔

اگلی آیت میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں سے بالکل مایوس ہو گئے اور انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور ان سے علیحدگی کے لیے یوں تقاضا کیا: پروردگارا! میرا تو صرف اپنے آپ پر اور اپنے بھائی پر بس چلتا ہے، خدایا! ہمارے اور اس فاسق و سرکش گروہ میں جدائی ڈال دے تاکہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھ لیں اور ان کی اصلاح ہو جائے (قال رب انی لا املك الا نفسی واخی فافرق بیننا وبین القوم الفسقین)۔

البتہ بنی اسرائیل نے جو کام کیا تھا یعنی اپنے پیغمبر کے حکم صریح کی نافرمانی وہ کفر کی حد تک پہنچی ہوئی تھی اور اگر قرآن نے انھیں فاسق کا لقب دیا ہے تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ "فاسق" ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس میں ہر طرح کی عبودیت اور خدا کی بندگی سے خارج ہونے کا مفہوم شامل ہے اسی لیے شیطان کے بارے میں ہے:

ففسق عن امر ربه

وہ فرمان خدا کے مقابلے میں فاسق ہو گیا اور اس نے مخالفت کی۔

(کہف ۔۔۔۔۔۔ ۵۰)

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ گزشتہ آیات میں "مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ" سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں اقلیت میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جو خدا سے ڈرتے تھے۔ یوشع اور کالیب ایسے ہی افراد میں سے تھے لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ اپنا اور اپنے بھائی ہارونؑ ہی کا نام لیتے ہیں اور ان دونوں کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ شاید یہ اس لیے ہو کہ حضرت ہارونؑ ایک تو حضرت موسیٰؑ کے جانشین تھے اور دوسرا یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ افضل تھے لہٰذا خصوصیت سے ان کا نام لیا گیا ہے۔

آخرکار حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور بنی اسرائیل اپنے ان بُرے اعمال کے انجام سے دوچار ہوئے۔ خدا کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کو وحی ہوئی: یہ لوگ اس مقدس سرزمین سے چالیس سال تک محروم رہیں گے جو طرح طرح کی مادی اور روحانی نعمات سے مالامال ہے (قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً) علاوہ ازیں ان چالیس سالوں میں انھیں اس بیابان میں سرگرداں رہنا ہوگا (يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ)[1] اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا ہے، اس قوم کے سر پہ جو کچھ بھی آئے وہ صحیح ہے، ان کے اس انجام پر کبھی غمگین نہ ہونا (فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ)۔

آخری جملہ شاید اس لیے ہو کہ جب بنی اسرائیل کے لیے یہ فرمان صادر ہوا کہ وہ چالیس سال تک سزا کے طور پہ بیابان میں سرگرداں رہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں جذبۂ مہربانی پیدا ہوا ہو اور شاید انھوں نے درگاہِ خداوندی میں ان کے لیے عفو و درگذر کی درخواست بھی کی ہو جیسا کہ موجودہ توراۃ میں بھی ہے لیکن انھیں فوراً جواب دیا گیا کہ وہ اس سزا کے مستحق ہیں نہ کہ عفو و درگذر کے کیونکہ جیسا کہ قرآن میں ہے کہ وہ فاسق اور سرکش لوگ تھے اور جو ایسے ہوں ان کے لیے یہ انجام حتمی ہے۔

توجہ رہے کہ ان کے لیے چالیس سال کی یہ محرومیت انتقامی جذبے سے نہ تھی (جیسا کہ خدا کی طرف سے کوئی سزا بھی ایسی نہیں ہوتی بلکہ وہ یا اصلاح کے لیے ہوتی ہے اور یا عمل کا نتیجہ) درحقیقت اس کا ایک فلسفہ تھا اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل ایک طویل عرصے تک فرعونی استعمار کی ضربیں جھیل چکے تھے۔ اس عرصے میں حقارت آمیز رسومات، اپنے مقام کی عدم شناخت اور احساساتِ ذلت کا شکار ہو چکے تھے اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے عظیم رہبر کی سرپرستی میں اس تھوڑے سے عرصے میں اپنی روح کو ان خامیوں سے پاک نہیں کر سکے تھے اور وہ ایک ہی جست میں افتخار، قدرت اور سربلندی کی نئی زندگی کے لیے تیار نہیں ہو پائے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے انھیں مقدس سرزمین کے حصول کیلیے جہادِ آزادی کا جو حکم دیا تھا اس پر عمل نہ کرنے کے لیے انھوں نے جو کچھ کہا وہ اس حقیقت کی واضح دلیل ہے لہٰذا ضروری تھا کہ وہ ایک طویل مدت وسیع بیابانوں میں سرگرداں رہیں اور اس طرح ان کی ناتواں اور غلامانہ ذہنیت کی حامل موجودہ کمزور نسل آہستہ آہستہ ختم ہو جائے اور نئی نسل حریت و آزادی کے ماحول میں اور خدائی تعلیمات کی آغوش میں پروان چڑھے تاکہ وہ اس قسم کے جہاد کے لیے اقدام کر سکے اور اس طرح سے اس سرزمین پر حق کی حکمرانی قائم ہو سکے۔

---

[1] يَتِيْهُوْنَ کا مادہ "تیہ" ہے جس کا معنی ہے سرگردانی۔ بعد ازاں "تیہ" اس بیابان کا نام ہو گیا جس میں بنی اسرائیل سرگرداں رہے۔ جیسا کہ ہم تفسیر نمونہ جلد اوّل (ص ۲۴۹، اردو ترجمہ) میں بیان کر چکے ہیں یہ صحرا، صحرائے سینا کا ایک حصہ ہے۔

۲۷۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝

۲۸۔ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۲۹۔ اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝ۚ

## ترجمہ

۲۷۔ آدم کے دو بیٹوں کا قصہ حق کے ساتھ ان کے سامنے پڑھیے جبکہ ان میں سے ہر ایک نے (پروردگار کے) تقرب کیلیے ایک کام کیا مگر وہ ایک کا (عمل) تو قبول ہو گیا، لیکن دوسرے سے قبول نہ کیا گیا (وہ بھائی جس کا عمل قبول نہیں ہوا تھا دوسرے بھائی سے) کہنے لگا، خدا کی قسم میں تجھے قتل کر دوں گا۔ (دوسرے بھائی نے) کہا: (میں نے کونسا گناہ کیا ہے، کیونکہ) خدا تو صرف پرہیزگاروں سے قبول کرتا ہے۔

۲۸۔ اگر تو میرے قتل کے لیے ہاتھ بڑھائے تو میں تو تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، کیونکہ میں عالمین کے پروردگار سے ڈرتا ہوں۔

۲۹۔ میں تو چاہتا ہوں کہ (تو یہ عمل انجام دے کر) میرا اور اپنا بوجھ اٹھائے ہوئے لوٹے اور (دونوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے) تو جہنمیوں میں سے ہو جائے اور ستمگروں کی یہی سزا ہے۔

## تفسیر

### روئے زمین پر پہلا قتل

ان آیات میں حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک کے ہاتھوں دوسرے کے قتل کے

بارے میں داستان بیان کی گئی ہے۔ ان آیات کا گذشتہ آیات سے شاید یہ ربط ہو کہ بنی اسرائیل کے بہت سے غلط اعمال کا سبب حسد تھا ان آیات کے ذریعے خدا تعالیٰ انھیں متوجہ کر رہا ہے کہ حسد کا انجام کتنا ناگوار اور ہولناک ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی وجہ سے ایک بھائی اپنے بھائی کے خون سے بھی ہاتھ رنگین کر لیتا ہے پہلے فرمایا: اے پیغمبر! انھیں آدم کے دو بیٹوں کا حقیقی قصہ سنا دیجیے (واتل علیھم نبأ ابنی ادم بالحق)۔

"بالحق" ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ مذکورہ سرگذشت عہد قدیم (توراۃ) میں بڑی خرافات کی آمیزش کے ساتھ بیان کی گئی ہے لیکن قرآن میں اس کی حقیقت وواقعیت کو بیان کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہاں "آدم" سے مراد وہی مشہور آدم ہیں جو موجودہ نسل انسانی کے پہلے باپ ہیں اور یہ جو بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد آدم بنی اسرائیل میں سے ایک فرد تھا، بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ یہ لفظ قرآن مجید میں بارہا اس معنی میں استعمال ہوا ہے اور اگر یہاں کوئی اور معنی مراد ہوتا تو ضروری تھا کہ اس کے لیے کوئی قرینہ ہوتا باقی رہی آیت "من اجل ذٰلک ..." کہ جس کی تفسیر عنقریب آئے گی جیسا کہ ہم وضاحت کریں گے ہرگز اس معنی کے لیے قرینہ قرار نہیں پا سکتی۔

اس کے بعد واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب ہر ایک نے تقرب پروردگار کے لیے ایک کام انجام دیا تو ایک کا عمل تو قبول کر لیا گیا لیکن دوسرے کا قبول نہ ہوا (اذ قربا قربانا فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الاٰخر)

اسی وجہ سے جس کا عمل قبول نہ ہوا تھا اس نے دوسرے بھائی کو قتل کی دھمکی دی اور قسم کھا کر کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا (قال لاقتلنک)۔

لیکن دوسرے بھائی نے اسے نصیحت کی اور کہا کہ اگر یہ واقعہ پیش آیا ہے تو اس میں میرا کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ اعتراض تو تجھ پر ہونا چاہیے کیونکہ تیرے عمل میں تقویٰ شامل نہیں تھا اور خدا تو صرف پرہیزگاروں کا عمل قبول کرتا ہے (قال انما یتقبل اللہ من المتقین) مزید کہا کہ حتیٰ اگر تم اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناؤ اور میرے قتل کے لیے ہاتھ بڑھاؤ تو میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا اور تمھارے قتل کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا (لئن بسطت الی یدک لتقتلنی ما انا بباسط یدی الیک لاقتلک) کیونکہ میں تو خدا سے ڈرتا ہوں اور ایسے گناہ سے ہرگز اپنے ہاتھ آلودہ نہیں کروں گا (انی اخاف اللہ رب العٰلمین) علاوہ ازیں میں نہیں چاہتا کہ دوسرے کے گناہ کا بوجھ اپنی گردن پر لاد لوں بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ تم ہی میرے اپنے گناہ کا بار اپنے کندھے پر اٹھا لو (کیونکہ اگر واقعاً تم اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ پہناؤ تو میرے گذشتہ گناہوں کا بوجھ بھی تمھارے کندھوں پر آ پڑے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم مجھ سے حق حیات چھینو گے تو تاوان بھی تمھی کو دینا ہو گا اور چونکہ تمھارے پاس کوئی صالح عمل نہیں ہے لہٰذا میرے گناہ تمھیں اپنے کندھوں پر اٹھانا ہوں گے (انی ارید ان تبوء[1] باثمی و اثمک)۔

---

[1] "تبوء" مادہ "بواء" سے ہے اور اس کا معنی ہے "بازگشت"۔

اور مسلّم ہے کہ یہ بوجھ اٹھا کر تم جہنمیوں میں سے ہو جاؤ گے اور ستمگروں کی یہی سزا ہے (فتکون من اصحٰب النار وذٰلك جزاء الظٰلمین)۔

## چند اہم نکات

آدم کے بیٹوں کے نام: ۱۔ قرآن مجید میں حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا نام نہیں لیا گیا ہے، نہ اس جگہ اور نہ کسی اور مقام پر لیکن اسلامی روایات کے مطابق ایک کا نام ہابیل ہے اور دوسرے کا قابیل۔ موجودہ تورات کے سفر تکوین کے چوتھے باب میں ایک کا نام قائن مذکور ہے اور دوسرے کا ہابیل۔ جیسا کہ مشہور مفسر ابوالفتح رازی کہتے ہیں ہر ایک کے نام میں چند لغوی پہلو ہیں۔ پہلے کا نام "ہابیل"، "ہابل" یا "ہابن" تھا اور دوسرے کا نام "قابیل"، "قابن" یا "قبن" تھا۔ بہرحال اسلامی روایات اور تورات کے متن میں قابیل کے نام کے بارے میں اختلاف لغت کی طرف بازگشت ہے اور یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ ایک عیسائی عالم نے اس امر کو قرآن پر اعتراض کی بنیاد بنا لیا ہے کہ قرآن نے "قائن" کو "قابیل" کیوں کہا ہے حالانکہ اول تو یہ اختلاف لغت ہے اور لغت میں ناموں کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے مثلاً تورات "ابراہیم" کو "ابراہام" لکھتی ہے اور قرآن اسے "ابراہیم" لکھتا ہے۔ ثانیاً بنیادی طور پر "ہابیل" اور "قابیل" کے نام قرآن میں مذکور ہی نہیں یہ اسماء تو اسلامی روایات میں آئے ہیں[1]۔

۲۔ "قربان" کا مفہوم: ہم جانتے ہیں کہ "قربان" ایسی چیز کو کہتے ہیں جو تقرب الٰہی کا باعث بنے مگر جو کام ان دونوں بھائیوں نے انجام دیا اس کا قرآن میں تذکرہ موجود نہیں ہے بعض اسلامی روایات اور تورات کے سفر تکوین باب چہارم میں جو کچھ مذکور ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہابیل کے پاس چونکہ پالتو جانور تھے اس نے ان میں سے ایک بہترین پلا ہوا مینڈھا منتخب کیا قابیل کسان تھا اس نے گندم کا گھٹیا حصہ یا گھٹیا آٹا اس کے لیے منتخب کیا۔

۳۔ قبولیت کی دلیل کیا تھی: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرزندانِ آدمؑ کو کیسے پتہ چلا کہ ایک کا عمل بارگاہِ ایزدی میں قبول ہو گیا؟ اور دوسرے کا عمل رد کر دیا گیا ہے۔ قرآن میں اس کی بھی وضاحت نہیں ہے البتہ بعض اسلامی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں اپنی مہیا شدہ چیزیں پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے قبولیت کے اظہار کے طور پر بجلی نے ہابیل کی قربانی کھا لی اور اسے جلا دیا لیکن دوسری اپنی جگہ پر باقی رہی اور یہ نشانی پہلے سے مروج تھی۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ایک عمل کی قبولیت دوسرے کا رد حضرت آدمؑ کو وحی کے ذریعے بتایا گیا اور اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ ہابیل ایک باصفا، باکردار اور راہِ خدا میں سب کچھ کر گزرنے والا شخص تھا جبکہ قابیل تاریک دل، حاسد اور ہٹ دھرم تھا۔ قرآن نے دونوں بھائیوں کی جو گفتگو بیان کی ہے اس سے ان کی روحانی کیفیت اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے۔

---

[1] عالم شیخ محمد جواد بلاغی نے اس سلسلے میں ایک رسالہ "الاکاذیب الاعاجیب" (تعجب انگیز جھوٹ) کے نام سے لکھا ہے جس میں مذکور جھوٹ کی طرح کے کئی جھوٹ بتائے گئے ہیں اس رسالے کا فارسی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

۴۔ ظلم کا پہلا سرچشمہ حسد ہے، ان آیات سے یہ واضح طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ جہان انسانیت میں اختلاف، قتل تجاوز اور ظلم کا پہلا سرچشمہ حسد ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی رذالت کے حوالے سے حسد کا مقام کس قدر پست ہے۔ بہت سے اجتماعی اور معاشرتی امور پر اس کے گہرے منفی اثرات بھی اس سے ظاہر ہوتے ہیں۔

۳۰۔ فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهُ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○

۳۱۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِى الْاَرْضِ لِيُرِيَهُ كَيْفَ يُوَارِىْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۚ قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِىَ سَوْءَةَ اَخِىْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ○

## ترجمہ

۳۰۔ نفسِ سرکش نے آہستہ آہستہ اسے بھائی کے قتل کے لیے پختہ کر دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا، اور وہ زیاں کاروں میں سے ہوگیا۔

۳۱۔ اس کے بعد خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین میں کوشش کرتا (اور اسے کھودتا) تاکہ وہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کا جسم زمین میں کیسے دفنائے۔ تو وہ کہنے لگا وائے ہو مجھ پر کہ میں اس کوّے جیسا (بھی) نہیں ہو سکا کہ اپنے بھائی کو دفن کرتا اور آخرکار وہ (رسوائی کے خوف اور وجدان کے دباؤ سے اپنے کام پر) پشیمان ہوا۔

## تفسیر

### ظلم پر پردہ پوشی

ان آیات میں حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا واقعہ، ایک بھائی کا دوسرے کے ہاتھوں قتل اور قتل کے بعد کے حالات بیان کیے گئے ہیں، پہلے فرمایا: سرکش نفس نے بھائی کے قتل کے لیے اسے پختہ کر دیا اور اس نے اسے قتل کر دیا (فطوعت له نفسه قتل اخيه فقتله)۔

"طوع" کا معنی ہے کسی چیز کا رام اور مطیع ہونا۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہابیل کا عمل قبول ہو جانے کے بعد قابیل کے دل میں ایک طوفان پیدا ہوگیا ایک طرف دل میں ہر وقت حسد کی آگ بھڑکتی رہتی اور اسے انتقام پر ابھارتی اور دوسری طرف بھائی کا رشتہ، انسانی جذبہ اور گناہ، ظلم، بے انصافی اور قتل نفس سے ذاتی تنفر اسے اس جرم سے باز رکھنے کی کوشش کرتا۔ لیکن آخرکار سرکش نفس

آہستہ آہستہ روکنے والے عوامل پر غالب آگیا اور اس نے اس کے بیدار وجدان کو رام کرلیا اور اسے جکڑ دیا اور بھائی کو قتل کرنے پر آمادہ کرلیا "طوعت" ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن اس سارے مفہوم کی طرف بھرپور اشارہ کرتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کسی کو ایک ہی لمحے میں رام نہیں کیا جاسکتا بلکہ ایسا تدریجی طور پر کئی طرح کی کشمکش کے بعد عمل میں آتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے، اس کام کے نتیجے میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگیا (فاصبح من الخاسرین) اس سے بڑھ کر اور کیا خسارہ ہوگا کہ اسس نے وجدان کا عذاب، خدا کی طرف سے سزا اور قیامت تک کے لیے اپنے نام پر ننگ و عار خرید لی۔

"اصبح" سے بعض نے یہ استفادہ کیا ہے کہ یہ قتل رات کے وقت ہوا حالانکہ یہ لفظ لغت عرب میں رات یا دن کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ کسی چیز کے واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے، مثلاً سورۂ آلِ عمران آیہ ۱۰۳ میں ہے:

"فاصبحتم بنعمته اخوانا"

نعمتِ خدا کی وجہ سے تم ایک دوسرے کے بھائی بن گئے

امام صادق علیہ السلام سے منقول بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قابیل نے جب اپنے بھائی کو قتل کر دیا تو اس کی لاش اس نے صحرا میں ڈال رکھی تھی اور اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے زیادہ دیر نہ گذری کہ درندے ہابیل کے جسم کی طرف آنے لگے۔ قابیل ضمیر کے شدید دباؤ کا شکار تھا بھائی کے جسم کو بچانے کے لیے وہ لاش کو ایک مدت تک کندھے پر لیے پھرتا رہا، کچھ پرندوں نے پھر بھی اسے گھیر رکھا تھا اور وہ اس انتظار میں تھے کہ وہ کب اسے زمین پر پھینکتا ہے تاکہ وہ لاش پر جھپٹ پڑیں[1]

جیسا کہ قرآن کہتا ہے اس موقع پر خدا تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا، مقصد یہ تھا کہ وہ زمین کھودے اور اس میں دوسرے مردہ کوے کا جسم چھپا دے یا اپنے کھانے کی چیزوں کو زمین میں چھپا دے جیسا کہ کوے کی عادت ہے تاکہ قابیل سمجھ سکے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کس طرح سپردِ خاک کرے (فبعث الله غرابا یبحث فی الارض لیریه کیف یواری سوأة اخیه)[2]

البتہ اس بات میں کوئی تعجب نہیں کہ انسان کوئی چیز کسی پرندے سے سیکھے کیونکہ تاریخ اور تجربہ شاہد ہیں کہ بہت سے جانور طبعی طور پر بعض معلومات رکھتے ہیں اور انسان نے اپنی پوری تاریخ میں جانوروں سے بہت کچھ سیکھا ہے یہاں تک کہ میڈیکل کی

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] "یبحث" "بحث" کے مادہ سے ہے جیسا کہ مجمع البیان میں ہے دراصل یہ لفظ مٹی میں سے کسی چیز کو تلاش کرنے کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ لفظ ہر طرح کی جستجو حتیٰ کہ علمی و فکری مباحث کے لیے بھی استعمال ہونے لگا اور "سوأة" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو پسند نہ آئے اس لیے کبھی شرمگاہ تک کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے ضمناً توجہ رہے کہ "لیریه" کا فاعل ممکن ہے خدا ہو یعنی خدا چاہتا تھا کہ ہابیل کا احترام ملحوظ رہے اور اس کے لیے قابیل کو اسے دفن کرنے کا طریقہ سکھائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا فاعل وہی کوا ہو کہ جس نے حکمِ خدا سے یہ کام انجام دیا۔

بعض کتب میں ہے کہ انسان اپنی بعض طبعی معلومات میں حیوانات کا مرہون منت ہے ۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے : اس وقت قابیل اپنی غفلت اور جہالت سے پریشان ہو گیا اور چیخ اٹھا کہ وائے ہو مجھ پر، کیا میں اس کوے سے بھی زیادہ ناتواں اور عاجز ہوں، مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میں اس کی طرح اپنے بھائی کا جسم دفن کروں ( قال یا ویلتی اعجزت ان اکون مثل ھذا الغراب فاواری سوأۃ اخی) بہر حال وہ اپنے کیے پر نادم و پشیمان ہوا جیسا کہ قرآن کہتا ہے : (فاصبح من النادمین)

کیا اس کی پشیمانی اس بنا پر تھی کہ اس کا گھٹیا اور برا عمل آخر کار اس کے ماں باپ پر اور احتمالی طور پر جو دوسرے بھائی تھے ان پر آشکار ہو جائے گا اور وہ اسے بہت سرزنش کریں گے ——— یا کیا یہ پشیمانی اس بنا پر تھی کہ کئی برسوں میں ایک مدت تک بھائی کی لاش کندھے پر لیے پھرتا رہا اور اسے دفن نہ کیا اور یا پھر کیا یہ ندامت اس وجہ سے تھی کہ اصولی طور پر انسان ہر برا کام انجام دے لینے کے بعد اپنے دل میں ہر طرح کی پریشانی اور ندامت محسوس کرتا ہے لیکن واضح ہے کہ اس کی ندامت کی جو بھی وجہ ہو وہ اس کے گناہ سے توبہ کی دلیل نہیں ہے کیونکہ توبہ یہ ہے کہ ندامت خوف خدا کے باعث اور عمل کے برا ہونے کے احساس کی بنا پر ہو اور یہ احساس اسے اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ آئندہ ہرگز ایسا کام نہیں کرے گا۔ قرآن میں قابیل کی ایسی کسی توبہ کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ بلکہ شاید اگلی آیت میں ایسی توبہ کے نہ ہونے کی طرف ہی اشارہ ہے ۔

پیغمبر اسلام سے ایک حدیث منقول ہے، آپ نے فرمایا :

"لا تقتل نفس ظلماً الا کان علی ابن آدم الاول کفل من دمھا لانہ کان اول من سن القتل"[1]

جس کسی انسان کا بھی خون بہایا جاتا ہے اس کی جوابدہی کا ایک حصہ قابیل کے ذمہ ہوتا ہے کہ جس نے انسان کشی کی اس بری سنت کی دنیا میں بنیاد رکھی تھی ۔

اس حدیث سے ضمناً یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر بری اور منحوس سنت جو دنیا میں باقی ہے اس کی سزا کا ایک حصہ اس شخص کے کندھے پر ہے جو اس کی بنیاد رکھتا ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا یہ واقعہ ایک حقیقی واقعہ ہے اس کے علاوہ کہ آیات قرآن اور اسلامی روایات کا ظاہری مفہوم اس کی واقعیت کو ثابت کرتا ہے اس کے "بالحق" کی تعبیر بھی جو ان آیات میں آئی ہے اس بات پر شاہد ہے لہذا جو لوگ ان آیات میں بیان کیے گئے واقعہ کو تشبیہ، کنایہ یا علامتی (SYMBOLIC) داستان سمجھتے ہیں، بغیر دلیل کے ایسا کرتے ہیں ۔

اس کے باوجود اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ حقیقی واقعہ اس جنگ کے لیے نمونہ کے طور پر بیان کیا گیا ہو جو ہمیشہ سے مردان پاکباز، صالح و مقبول بارگاہ خدا انسانوں اور آلودہ، منحرف، کینہ پرور، حاسد اور ناجائز ہٹ دھرمی کرنے والوں کے درمیان

---

[1] تفسیر فی ظلال جلد ۲ صفحہ ۷۰۳ ۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں، بحوالہ مسند احمد بن حنبل

جاری رہی ہے۔ وہ لوگ کتنے پاکیزہ اور عظیم ہیں جنھوں نے ایسے بڑے لوگوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔

آخرکار یہ بڑے لوگ اپنے شرمناک اور بڑے اعمال کے انجام سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان پر پردہ ڈالنے اور انھیں دفن کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں اس موقع پر ان کی آرزوئیں ان کی مدد کو لپکتی ہیں۔ کوّا ان آرزوؤں کا مظہر ہے جو جلدی سے پہنچتا ہے اور انھیں ان کے جرائم پر پردہ پوشی کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن آخرکار انھیں خسارے، نقصان اور حسرت کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔

۳۲۔ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًاۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ○

## ترجمہ

۳۲۔ اس بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ قرار دیا کہ جو شخص کسی انسان کو بغیر اس کے کہ وہ ارتکاب قتل کرے اور روئے زمین پر فساد پھیلائے قتل کر دے تو یہ اس طرح ہے گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جو کسی ایک انسان کو قتل سے بچا لے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی ہے اور ہمارے رسول واضح دلائل کے ساتھ بنی اسرائیل کی طرف آئے پھر بھی ان میں سے بہت سے لوگوں نے روئے زمین پر ظلم اور تجاوز کیا۔

## تفسیر

### انسانی رشتہ

حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا ذکر کرنے کے بعد اس آیت میں ایک عمومی نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: اس بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ قرار دیا کہ جب کوئی انسان کسی شخص کو ارتکاب قتل اور زمین پر فساد پھیلانے کے جرم کے بغیر قتل کر دے تو ایسے ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جو کسی ایک انسان کو موت سے بچا لے، ایسے ہے گویا اس نے تمام انسانوں کو موت سے بچا لیا (من اجل ذٰلك[1] كتبنا على بنی اسرائيل انه من قتل نفسا بغير نفس

---

[1] "اجل" (بروزن "نخل") دراصل "جرم" کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں ہر اس کام کو اجل کہا جانے لگا جس کا انجام ناگوار ہو اور اب زیادہ تر تعلیل اور کسی چیز کی علت بیان کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً)

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ ایک انسان کا قتل سب انسانوں کے قتل کے برابر کیسے ہو سکتا ہے اور اسی طرح ایک انسان کو بچا لینا سب کی نجات کیسے قرار پا سکتا ہے۔

مفسرین نے بہت سے جوابات دیے ہیں تفسیر تبیان میں چھ جواب ہیں، مجمع البیان میں پانچ اور کنز العرفان میں چار جواب دیئے گئے ہیں ان میں سے بعض جوابات تو آیت کے معنی سے بہت دور ہو گئے ہیں۔

بہرحال مذکورہ سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن اس آیت میں ایک اجتماعی اور تربیتی حقیقت بیان کرتا ہے۔ درحقیقت جو شخص کسی بے گناہ کے خون میں ہاتھ رنگتا ہے وہ اس بات پر تیار ہوتا ہے کہ وہ اس مقتول جیسے دیگر بے گناہ انسانوں پر بھی حملہ کرکے انھیں قتل کر دے وہ حقیقت میں ایک درندہ ہے جس کی غذا بے گناہ انسان ہیں ہم جانتے ہیں کہ اس لحاظ سے بے گناہ انسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح جو شخص بھی انسانی جذبے اور انسان دوستی کی بنیاد پر ایک انسان کو موت سے نجات دیتا ہے وہ اس بات پر تیار ہوتا ہے کہ ایسا سلوک ہر انسان کے ساتھ کرے۔ وہ بے گناہ انسانوں کی نجات سے لگاؤ رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی نگاہ میں اس انسان میں اور اُس انسان میں کوئی فرق نہیں اور قرآن جو یہ کہتا ہے: فکانما...
.......) (یعنی..... یہ ایسے ہے گویا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی موت یا حیات اگرچہ پورے معاشرے کی موت یا حیات کے برابر نہیں لیکن اس سے شباہت ضرور رکھتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانی معاشرہ درحقیقت ایک ہی اکائی ہے اس کے افراد ایک جسم کے اعضاء کی طرح ہیں۔ جو تکلیف اس پیکر کے ایک عضو کو پہنچتی ہے اس کا اثر کم و بیش تمام اعضاء پر ظاہر ہوتا ہے، معاشرہ افراد سے بنتا ہے ایک فرد کی نابودی سے پورے معاشرہ کو نقصان پہنچتا ہے ایک فرد کا فقدان اس کے وجود کے اثرات کی مناسبت سے معاشرے کے ایک حصے کا فقدان ہے یوں یہ نقصان پورے معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح ایک نفس کی زندگی اس جسم کے باقی اعضاء کی زندگی کا سبب ہے کیونکہ ہر کوئی اپنے وجود کی حیثیت کے اعتبار سے انسانی معاشرے کی عظیم عمارت میں اس کی ضرورت و احتیاج کو پورا کرتا ہے، کوئی زیادہ کردار ادا کرتا ہے اور کوئی کم۔

یہ جو بعض روایات میں ہے کہ ایسے انسان کی سزا قیامت میں اس شخص کی سی ہے جس نے تمام انسانوں کو قتل کیا ہو، دراصل یہ بھی اسی مذکورہ مفہوم کی طرف اشارہ ہے نہ یہ کہ ایک انسان ہر لحاظ سے تمام بنی نوعِ انسان کے برابر ہے اسی لیے ان روایات میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی بہت سے افراد کو قتل کرے تو سزا بھی اسی نسبت سے بڑھ جائے گی۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کی نظر میں ایک انسان کی موت یا حیات کس قدر اہمیت رکھتی ہے اور اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ آیات ایسے ماحول میں نازل ہوئیں جس میں انسانی خون کی کوئی قیمت نہ تھی، اس کی عظمت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

یہ قابلِ توجہ ہے کہ متعدد روایات میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ آیت ظاہری طور پر اگرچہ مادی موت و حیات کے بارے میں ہے لیکن اس سے زیادہ اہم معنوی موت و حیات ہے یعنی کسی شخص کو گمراہ کرنا یا کسی شخص کو گمراہی سے نجات دلانا۔

کسی نے امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو آپ نے فرمایا:

"من حرق او غرق ـــــ ثم سکت ـــــ ثم قال تاویلھا الاعظم ان دعاھا فاستجاب لہ"

یعنی ـــــ قتل کرنے اور موت سے نجات دینے سے آیت میں مراد جلنے سے نجات یا غرق ہونے سے بچانا وغیرہ ہے۔

پھر امام کچھ خاموش ہو گئے، کچھ توقف کے بعد مزید فرمایا:

آیت کی سب سے بڑی تاویل اور سب سے بڑا مفہوم یہ ہے کہ دوسرے کو راہ حق کی طرف دعوت دی جائے یا باطل کی طرف اور وہ یہ دعوت قبول کرے[1]۔

دوسرا سوال جو آیت کے بارے میں باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں خصوصیت سے بنی اسرائیل کا نام کیوں لیا گیا ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ مذکورہ حکم انہی سے مخصوص نہیں ہے۔

اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کا ذکر اس لیے ہے کہ ان میں ایسے قتل بہت ہوئے جن کا محرک حسد اور جاہ طلبی تھا۔ دور حاضر میں بھی بہت سا قتل و خون انہی کے ہاتھوں ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ خدائی حکم سب سے پہلے ان کے بارے میں آیا۔

آیت کے آخر میں بنی اسرائیل کی قانون شکنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہمارے پیغمبر روشن دلائل کے ساتھ ان کی ہدایت کے لیے آئے لیکن ان میں سے بہت سوں نے قوانینِ الٰہی کو توڑ دیا اور تجاوز کا راستہ اختیار کیا (و لقد جاء تھم رسلنا بالبینات ثم ان کثیرا منھم بعد ذلک فی الارض لمسرفون)۔

توجہ رہے کہ "اسراف" لغت میں وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں حد سے ایسا تجاوز بھی شامل ہے اگرچہ اکثر اوقات مصارف و اخراجات میں تجاوز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۳۳۔ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

۳۴۔ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۱ صفحہ ۶۲۰۔ اسی مضمون کی اور روایات بھی موجود ہیں۔

غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝ ع

## ترجمہ

۳۳- جو لوگ خدا اور پیغمبر سے جنگ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور روئے زمین پر فساد برپا کرتے ہیں (اور ڈرا دھمکا کر لوگوں کی جان و مال اور ناموس پر حملہ کرتے ہیں) ان کی سزا یہ ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے یا سولی پر لٹکا دیا جائے یا ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں (کی چار انگلیوں) کو کاٹ دیا جائے اور یا انھیں انکی زمین سے جلاوطن کر دیا جائے یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کیلیے بہت بڑا عذاب ہے۔

۳۴- مگر وہ جو ان پر تمھارے ہاتھ ڈالنے سے پہلے توبہ کر لیں اور جان لو کہ (خدا ان کی توبہ قبول کرے گا کیونکہ) خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

## شانِ نزول

اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں منقول ہے کہ مشرکین کی ایک جماعت خدمتِ پیغمبرؐ میں پہنچی اور یہ لوگ مسلمان ہو گئے لیکن مدینہ کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی ان کے رنگ زرد ہو گئے اور وہ بیمار پڑ گئے۔ پیغمبرِ اسلام نے ان کی صحت کے پیش نظر حکم دیا کہ وہ مدینہ سے باہر ایک صحت افزا صحرائی علاقے میں چلے جائیں، جس میں زکوٰۃ کے اونٹوں کو چرایا جاتا تھا، تاکہ اونٹنیوں کا تازہ دودھ بھی انھیں میسر آسکے۔ وہ صحت مند ہو گئے لیکن پیغمبر اکرمؐ کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے انھوں نے مسلمان چرواہوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے، ان کی آنکھیں نکال لیں، انھیں قتل کرنا شروع کر دیا، زکوٰۃ کے اونٹ لوٹ لیے اور اسلام سے خارج ہو گئے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ انھیں گرفتار کر لیا جائے اور جو سلوک انھوں نے چرواہوں سے کیا ہے قصاص کے طور پر وہی ان سے کیا جائے۔ آنکھیں نکال لی گئیں ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے اور انھیں قتل کر دیا گیا تاکہ دوسرے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور ایسے انسانیت کش افعال کا ارتکاب نہ کریں زیرِ نظر آیت ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جس میں ان کے بارے میں حکمِ شریعت بیان کیا گیا[1]

---

[1] تفسیر المنار ج ۶ صفحہ ۳۵۳ اور تفسیر قرطبی ج ۳ صفحہ ۲۱۴۵۔

# تفسیر

## لوگوں کی جان و مال پر حملہ کرنے والوں کی سزا

یہ آیت حقیقت میں قتل نفس کے بارے میں جاری بحث کی تکمیل کرتی ہے اس میں مسلمانوں کے خلاف مسلح ہو کر دھمکیاں دیتے ہوئے بلکہ انھیں قتل کر کے ان کا مال و اسباب لوٹنے والوں کی نہایت سخت سزایاں کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ خدا اور پیغمبر کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں یہ ہے کہ ان چار سزاؤں میں سے کوئی ایک ان پر جاری کی جائے۔

پہلی یہ کہ وہ قتل کر دیئے جائیں۔

دوسری یہ کہ انھیں سُولی پر لٹکا دیا جائے۔

تیسری یہ کہ ان کے اُلٹے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔

اور چوتھی یہ کہ وہ جس علاقے میں رہتے ہوں انھیں اس سے جلاوطن کر دیا جائے (انما جزاء الذین یحاربون الله ورسوله ویسعون فی الارض فساداً ان یقتلوا او یصلبوا او تقطع ایدیهم وارجلهم من خلاف او ینفوا من الارض)۔

## چند اہم نکات

۱۔ خدا اور رسول سے جنگ کرنے سے کیا مراد ہے؟ جیسا کہ روایت اہل بیت علیہم السلام میں آیا ہے اور کم و بیش آیت کی شانِ نزول بھی اس کی گواہی دیتی ہے، خدا اور رسول سے جنگ کرنے سے مراد یہ ہے کہ کوئی ڈرا دھمکا کر مسلح ہو کر لوگوں کے جان و مال پر حملہ آور ہو چاہے تو چوروں ڈاکوؤں کی طرح شہروں سے باہر ایسا کرے یا شہر کے اندر۔ اس بنا پر وہ بدمعاش لٹیرے جو لوگوں کے جان و مال اور ناموس پر حملہ کرتے ہیں سب اس حکم میں شامل ہیں۔

ضمناً توجہ رہے کہ اس آیت میں بندگانِ خدا کے ساتھ جنگ کو خدا سے جنگ قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اسلام کی نظر میں انسانوں کے حقوق اور ان کے امن و سکون کی کس قدر اہمیت ہے۔

۲۔ ہاتھ پاؤں کاٹنے کا کیا مطلب ہے؟ جیسا کہ فقہی کتب میں نشاندہی کی گئی ہے کہ ہاتھ پاؤں کاٹنے سے مراد اتنی ہی مقدار ہے جو چوری کے بارے میں بیان ہوئی ہے یعنی ہاتھ یا پاؤں کی صرف چار انگلیاں کاٹنا[1]

۳۔ کیا چاروں سزائیں اختیاری ہیں: زیر نظر آیت میں چار سزائیں بیان ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں سوال پیدا ہوتا ہے

---

[1] کنز العرفان فی فقہ القرآن ج ۲ صفحہ ۳۵۲

کہ کیا یہ سزائیں اختیاری حیثیت رکھتی ہیں یعنی حکومت اسلامی ان میں سے جسے جس شخص کیلیے مناسب سمجھے جاری کرے یا جرم کی مناسبت سے ان میں سے سزا اختیار کی جائے گی یعنی اگر حملہ آوروں (ڈاکوؤں) نے بے گناہ لوگوں کو قتل کیا ہے تو ان کے لیے قتل والی سزا انتخاب ہوگی اور اگر مسلح ہو کر لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان کا مال لوٹا ہے تو ان کی انگلیاں کاٹی جائیں گی اور اگر انھوں نے قتل بھی کیا ہے اور مال بھی چرایا ہے تو انھیں قتل کیا جائے گا اور لوگوں کی عبرت کے لیے ان کی لاشیں کچھ عرصے کے لیے سُولی پر لٹکائی جائیں گی اور لوگوں کے خلاف ہتھیار لے کر نکلے ہیں لیکن انھوں نے خون نہیں بہایا اور چوری بھی نہیں کی تو انھیں دوسرے شہر کی طرف جلاوطن کیا جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ دوسرا معنی حقیقت سے زیادہ قریب ہے اور یہی مفہوم آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے منقول چند احادیث میں بھی آیا ہے[1]

یہ صحیح ہے کہ کچھ احادیث میں اس سلسلے میں حکومتِ اسلامی کو اختیار حاصل ہونے کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے لیکن جن احادیث کی پہلے بات کی گئی ہے ان کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اختیار سے مراد یہ نہیں کہ حکومت اسلامی ان چار میں سے خود ہی کوئی سزا منتخب کرے اور جرم کی کیفیت کو پیش نظر نہ رکھے کیونکہ یہ بہت بعید ہے کہ قتل اور سولی دیئے جانے کو جلاوطنی کا ہم پلہ قرار دیا جائے یہ سب ایک ہی سطح پر نہیں ہو سکتے۔

اتفاق کی بات ہے کہ آج کی دنیا میں جرائم اور سزا کے بہت سے قوانین میں بھی یہ بات صریح طور پر دیکھی جاتی ہے کہ ایک قسم کے جرم کے لیے متعدد سزائیں مقرر کی جاتی ہیں مثلاً بعض جرائم کے لیے قانون میں تین سے لے کر دس سال تک قید معین کی جاتی ہے اور قاضی کا ہاتھ اس سلسلے میں کھلا رکھا جاتا ہے اس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ جج اپنی مرضی سے قید کی مُدت کا تعین کرے بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ سزا کی مُدت جرم کے خفیف یا شدید ہونے کے حوالے سے معین کرے اور مناسب سزا کا انتخاب کرے۔

اس اہم اسلامی قانون میں بھی حملہ آوروں کے لیے سزا کی کیفیت مختلف بیان کی گئی ہے کیونکہ جرم کی کیفیت بھی اس سلسلے میں مختلف ہوتی ہے اور سب حملہ آور یقیناً ایک جیسے نہیں ہوتے۔

کہے بغیر واضح ہے کہ اسلام نے حملہ آوروں کے بارے میں اتنی شدید سزا اس لیے مقرر کی ہے تاکہ بے گناہوں کے خون، جان و مال اور ناموس کی ہٹ دھرم، منہ زور، اوباش اور فسادی لوگوں کے حملوں اور تجاوزات سے حفاظت کی جائے[2]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ رسوائی اور سزا تو ان کے لیے دنیا میں ہے لیکن صرف اسی سزا پر اکتفا نہیں کی جائے گی بلکہ آخرت میں بھی انھیں سخت سزا دی جائے گی (ذٰلك لهم خزي في الدنيا و لهم في الاٰخرة عذاب عظيم) اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی حدود اور سزائیں اگر دنیا میں جاری ہو جائیں تو وہ آخرت کی سزاؤں سے

---

[1] نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۶۲۲

[2] سطور بالا میں جو احکام بیان کیے گئے ہیں وہ اجمال اور خلاصے کے طور پر ہیں اس اسلامی قانون کی تفصیل اور شرائط کا مطالعہ فقہی کتب میں کیا جانا چاہیے۔

مانع نہیں ہیں۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ لوٹ آنے کا راستہ ایسے خطرناک مجرموں پر بھی بند نہ کیا جائے اور اگر وہ مائل بہ اصلاح ہو جائیں تو ان کے تلافی اور تجدید نظر کا راستہ کھلا رکھا جائے، ارشاد ہوتا ہے: مگر وہ لوگ کہ جو قابو آنے سے پہلے توبہ کر لیں تو عفو الٰہی ان کے شاملِ حال ہوگا اور جان لو کہ خدا غفور و رحیم ہے (الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا علیھم فاعلموا ان اللہ غفور رحیم)۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں انھیں صرف اس صورت میں سزا نہیں ملے گی کہ اگر وہ پکڑے جانے سے پہلے اپنے ارادے اور رغبت سے اس جرم سے صرف نظر کر لیں اور پشیمان ہو جائیں۔

یہاں شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ ان کی توبہ اس کا سبب نہیں بنے گی کہ اگر انھوں نے قتل کیا ہے یا چوری کی ہے تو اس کی سزا انھیں نہیں ملے گی بلکہ صرف اسلحہ اٹھا کر لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کی سزا برطرف ہو جائے گی۔ دوسرے لفظوں میں صرف حقوق اللہ میں ان کی سزا توبہ کی صورت میں ساقط ہو جائے گی، لیکن حقوق الناس میں صاحبانِ حق کی رضا کے بغیر ساقط نہیں ہوگی (غور کیجیے گا)۔

اس کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ محارب کی سزا عام قاتل یا چور سے زیادہ سخت اور شدید تر ہے لیکن توبہ کرنے سے محارب والی سزا اس سے برطرف ہو جائے گی۔ باقی رہی چور، غاصب یا عام قاتل والی سزا تو وہ اسے ملے گی۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال کیا جائے کہ توبہ تو ایک باطنی امر ہے اسے کس طرح ثابت کیا جائے گا اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ یہ بات ثابت کرنے کے بہت سے راستے ہیں مثلاً دو عادل گواہی دیں کہ فلاں مجلس میں انھوں نے اس کی توبہ سنی ہے اور اس نے بغیر کسی دباؤ کے اپنی رضا و رغبت سے توبہ کی ہے۔ یا مثلاً وہ اپنی زندگی کی روش اور طور طریقہ اس طرح سے بدل لے کہ اس سے توبہ کے آثار ظاہر ہوں۔

۳۵۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○

## ترجمہ

۳۵۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور قرب خدا کا وسیلہ تلاش کرو اور راہ خدا میں جہاد کرو تا کہ فلاح اور نجات پا جاؤ۔

## تفسیر

### توسل کی حقیقت

اس آیت میں روئے سخن اہلِ ایمان کی طرف ہے اور نجات کے لیے انھیں تین حکم دیئے گئے ہیں پہلے فرمایا گیا ہے

اے ایمان والو! تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرو (یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ) اس کے بعد حکم دیا گیا ہے تقرب الٰہی کا وسیلہ اختیار کرو (وابتغوا الیہ الوسیلۃ) آخر میں راہِ خدا میں جہاد کا حکم دیا گیا ہے (وجاھدوا فی سبیلہ) ان سب احکام پر عمل کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم نجات پا جاؤ گے (لعلکم تفلحون)۔

اس آیت میں جس موضوع کو زیرِ بحث لایا جانا چاہیے وہ اس میں اہلِ ایمان کو وسیلہ تلاش کرنے کے لیے دیا جانے والا حکم ہے۔

"وسیلہ" قرب حاصل کرنے کو کہتے ہیں یا اس چیز کو کہتے ہیں جو لگاؤ اور رضا و رغبت سے دوسرے کا قرب حاصل کرنے کا باعث بنے لہٰذا آیت میں لفظ "وسیلہ" ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے اس کے مفہوم میں ہر وہ کام اور چیز شامل ہے جو پروردگار کی بارگاہِ مقدس سے قریب ہونے کا باعث ہو اس میں اہم ترین خدا اور پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانا اور جہاد کرنا، نیز نماز، زکوٰۃ، روزہ اور خانہ خدا کا حج، اسی طرح صلہ رحمی، راہِ خدا میں پنہاں و آشکار خرچ کرنا اور ایسا ہر اچھا اور نیک کام اس کے مفہوم میں داخل ہے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے:

ان افضل ما توسل بہ المتوسلون الی اللہ سبحانہ و تعالیٰ الایمان بہ و برسولہ والجھاد فی سبیلہ فانہ ذروۃ الاسلام وکلمۃ الاخلاص فانھا الفطرۃ و اقام الصلوٰۃ فانھا الملۃ وایتاء الزکوٰۃ فانھا فریضۃ واجبۃ وصوم شھر رمضان فانہ جنۃ من العقاب وحج البیت واعتمارہ فانھما ینفیان الفقر ویرحضان الذنب، وصلۃ الرحم فانھا مثراۃ فی المال ومنساۃ فی الاجل، وصدقۃ السر فانھا تکفر الخطیئۃ وصدقۃ العلانیۃ فانھا تدفع میتۃ السوء وصنائع المعروف فانھا تقی مصارع الھوان۔

یعنی ...... بہترین چیز جس کے ذریعے اور وسیلے سے تقربِ الٰہی حاصل ہو سکتا ہے وہ خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لانا اور جہاد کرنا ہے کہ جو کوہسارِ اسلام کی چوٹی ہے اسی طرح جملۂ اخلاص (لا الٰہ الا اللہ) کہ جو وہی فطرتِ توحید ہے اور نماز قائم کرنا کہ جو آئینِ اسلام ہے اور زکوٰۃ کہ جو واجب فریضہ ہے اور ماہِ رمضان کے روزے کہ جو گناہ اور عذابِ خدا کے سامنے سپر ہیں اور حج و عمرہ کہ جو فقر و فاقہ اور پریشانی کو دور کرتے ہیں اور گناہوں کو دھو ڈالتے ہیں اور صلہ رحمی کہ جو مال و ثروت کو زیادہ اور زندگی کو طویل کرتا ہے اور مخفی طور پر خرچ کرنا کہ جو گناہوں کی تلافی کا باعث بنتا ہے اور ظاہری طور پر خرچ کرنا کہ جو ناگہانی اور بری موت کو دور کرتا ہے اور نیک کہ جو انسان کو ذلت و خواری کے گڑھے میں گرنے سے بچاتے ہیں (سب تقرب الٰہی کا وسیلہ ہیں)[1]

---

[1] یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ یہاں یہ مقصد ہرگز نہیں کہ کوئی چیز ذاتِ پیغمبر یا امام سے مستقل طور پر مانگی جائے بلکہ مراد اعمالِ صالح بجا لانا ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

انبیاء، آئمہ اور خدا کے نیک بندوں کی شفاعت بھی کہ جو صراحت قرآنی کے مطابق تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے وسیلہ کے وسیع مفہوم میں داخل ہے۔ اسی طرح پیغمبر اور امام کی پیروی بھی بارگاہ الٰہی کی قربت کا موجب ہیں یہاں تک کہ خدا کو انبیاء، آئمہ اور صالحین کے مرتبہ و مقام کا واسطہ دینا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے کیونکہ ان کا ذکر در اصل ان کے مقام اور مکتب کو اہمیت دینے کے مترادف ہے۔

جن لوگوں نے زیر نظر آیت کو ان مفاہیم میں سے کسی ایک کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے ان کے پاس درحقیقت اس تخصیص کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ جیسے ہم کہہ چکے ہیں لغوی مفہوم کے لحاظ سے ہر چیز جو تقرب الٰہی کا سبب بنے "وسیلہ" ہے۔

## قرآن اور توسّل

قرآن کی دیگر آیات سے بھی اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نیک انسان کے مقام کو بارگاہ خدا میں وسیلہ قرار دینا اور اس کی وجہ سے خدا سے کوئی چیز طلب کرنا کسی طرح بھی ممنوع نہیں ہے اور یہ توحید کے منافی نہیں ہے سورۂ نساء آیت ۶۴ میں ہے:

ولو انهم اذ ظلموا انفسهم جاءوك فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحيما

اور جب ان لوگوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا (اور گناہ کے مرتکب ہوئے) اگر تمہارے پاس آ جاتے اور خدا سے مغفرت طلب کرتے اور تم بھی ان کے لیے طلب مغفرت کرتے تو خدا کو توبہ قبول کرنیوالا اور رحیم و مہربان پاتے۔

نیز سورۂ یوسف آیہ ۹۷ میں ہے کہ برادران یوسف نے اپنے باپ سے درخواست کی کہ وہ بارگاہ خداوندی میں ان کے لیے استغفار کریں اور حضرت یعقوبؑ نے بھی ان کی اس درخواست کو منظور کر لیا۔

سورۂ توبہ آیت ۱۱۴ میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں ہے کہ انھوں نے اپنے باپ[1] کے لیے طلب مغفرت کی یہ امر بھی دوسرے لوگوں کے لیے انبیاء کی دعا کے مؤثر ہونے کی تائید کرتا ہے اسی طرح قرآن کی دیگر متعدد روایات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

---

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) پیغمبر و امام کی پیروی کرتا ہے، ان کی شفاعت کا حصول ہے یا پھر ان کے مقام و مکتب کا واسطہ دینا ہے (جو کہ خود ایک قسم کا احترام ہے اور اس سے واسطہ دینے والے کی نظر میں ان کی حیثیت و مقام کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی ایک قسم کی خدا کی عبادت ہے) اور اس ذریعے خدا سے کچھ مانگا جائے تو اس میں کوئی بوئے شرک نہیں اور نہ ہی یہ قرآن کی دوسری آیات کے خلاف ہے اور نہ ہی یہ زیر بحث آیت کے عمومی مفہوم سے متجاوز ہے (غور کیجیے گا)۔

[1] یہ حضرت ابراہیمؑ کے چچا کی طرف اشارہ ہے جنھیں وہ اپنے باپ کے بمنزلہ سمجھتے تھے (مترجم)۔

## روایاتِ اسلامی اور توسّل

بہت سی شیعہ سنی روایات سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ توسل کے مذکورہ مفہوم میں کوئی اشکال نہیں ہے بلکہ یہ ایک اچھا طریقہ شمار ہوتا ہے۔ ایسی روایات بہت زیادہ ہیں اور بہت سی کتب میں مذکور ہیں۔ ہم نمونہ کے طور پر اہلِ سنت کی کتب سے چند روایات نقل کرتے ہیں:

۱۔ کتاب " وفاء الوفا " اہل سنت کے ایک مشہور عالم سمہودی کی تالیف ہے اس کتاب میں ہے:

بارگاہ خدا میں رسول اللہؐ اور ان کے مقام و مرتبہ کے وسیلہ سے آپ کی ولادت سے پہلے، آپ کی ولادت کے بعد، آپ کی رحلت کے بعد، عالم برزخ کے دوران میں اور قیامت کے دن، شفاعت طلب کرنا جائز ہے۔

اس کے بعد وہ اس روایت کو نقل کرتے ہیں جس میں ہے کہ حضرت آدمؑ نے پیغمبر اسلامؐ کو وسیلہ قرار دیا چونکہ آپ پیغمبر اسلام کے آئندہ پیدا ہونے کے بارے میں جانتے تھے حضرت آدمؑ نے بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض کیا:

"یارب اسئلك بحق محمد لما غفرت لی"

خداوندا! بحق محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے بخش دے[1]

اس کے بعد صاحب " وفاء الوفاء " نے ایک اور حدیث، راویانِ حدیث کی ایک جماعت جس میں نسائی اور ترمذی جیسے مشاہیر علماء شامل ہیں کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے دوران میں توسل کے جواز کے بارے میں بطور شاہد نقل کی ہے حدیث کا خلاصہ یہ ہے:

ایک نابینا نے پیغمبر اکرمؐ سے اپنی بیماری سے شفا کے لیے دعا کی درخواست کی تو پیغمبر اکرمؐ نے اسے حکم دیا کہ اس طرح دعا کرو۔

"اللهم انی اسئلك واتوجه الیك بنبیك محمد نبی الرحمة یامحمد انی توجهت بك الی ربی فی حاجتی لتقضی لی اللهم شفعه فی"

یعنی ... خدایا! میں تجھ سے تیرے پیغمبر جو نبیؐ رحمت ہے کے صدقے میں سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں، اے محمدؐ! میں آپ کے وسیلے سے اپنی حاجت روائی کے لیے اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، خدایا! انھیں میرا شفیع قرار دے[2]

اس کے بعد صاحب وفاء الوفا نے آنحضرتؐ کے وفات کے بعد آپؐ سے توسل کے جواز میں یہ روایت نقل کی ہے:

---

[1] وفاء الوفاء جلد ۲ صفحہ ۱۳۷۱، کتاب "التوصل الی حقیقۃ التوسل" میں بھی بیہقی کی "دلائل النبوۃ" کے حوالے سے یہ روایت مذکور ہے۔

[2] وفاء الوفا، صفحہ ۱۳۷۲

حضرت عثمان کے زمانے میں ایک حاجت مند پیغمبر اکرمؐ کی قبر کے پاس آیا اور نماز پڑھ کر اس نے اس طرح دعا کی:

"اللّٰھم انی اسئلك واتوجه الیك بنبینا محمد (ص) نبی الرحمة، یا محمد انی اتوجه بك الی ربك ان تقضی حاجتی"

یعنی ..... خداوندا! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور اپنے پیغمبر جو نبیِ رحمت کے وسیلے سے تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اے محمدؐ! میں آپ کے وسیلے سے آپ کے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تاکہ میری مشکل آسان ہو جائے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ فوراً اس کی مشکل حل ہو گئی[1]

۲۔ کتاب "التوصل الی حقیقة التوسل" کا مؤلف نے جو توسل کے بارے میں بہت سخت گیر ہے، ۲۶ احادیث مختلف کتب اور مصادر سے نقل کی ہیں جن سے توسل کا جواز ظاہر ہوتا ہے اگرچہ موصوف نے ان احادیث کی اسناد میں کیڑے نکالنے کی کوشش کی ہے لیکن واضح ہے کہ روایات جب بہت زیادہ ہوں اور حد تواتر تک پہنچ جائیں تو پھر سند حدیث میں کوئی خدشہ اور رد و قدح کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور توسل و وسیلہ کے بارے میں منابع اسلامی میں مذکورہ روایات حد تواتر سے بھی زیادہ ہیں۔

ان میں سے ایک روایت صواعق میں اہلِ سنت کے مشہور امام شافعی سے نقل کی گئی ہے وہ اہلِ بیتِ رسولؐ سے متوسل ہونے کے بارے میں کہتے ہیں:

آل النبی ذریعتی وھم الیه وسیلتی
ارجو بھم اعطی غدًا بید الیمین صحیفتی

اہلِ بیتِ رسول میرا وسیلہ ہیں۔
وہ اس کی بارگاہ میں میرے تقرب کا ذریعہ ہیں
میں امید کرتا ہوں کہ ان کے ذریعے سے کل قیامت کے دن
میرا نامۂ اعمال میرے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا[2]

نیز بیہقی سے صاحب صواعق نے نقل کیا ہے کہ خلیفہ دوم کی خلافت کے زمانے میں ایک مرتبہ قحط پڑ گیا، حضرت بلال چند صحابہ کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ کی قبر انور کے پاس آئے اور یوں کہنے لگے:

"یا رسول الله استسق لامتك ...... فانھم قد ھلکوا ...."

---

[1] وفاء الوفاء صفحہ ۱۳۷۳

[2] التوصل صفحہ ۳۲۹

یعنی ـــــــ اے رسول خدا! اپنی امت کے لیے اپنے خدا سے باران رحمت طلب کیجیے
ـــــــ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ہلاک ہو جائے۔[1]

یہاں تک کہ ابن حجر سے کتاب "الخیرات الحسان" میں منقول ہے کہ امام شافعی جن دنوں بغداد میں تھے امام ابوحنیفہ کی زیارت کے لیے گئے اور اپنی حاجات کے لیے ان سے متوسل ہوتے۔[2]

نیز صحیح دارمی میں ابوالجوزاء سے منقول ہے:

ایک سال مدینہ میں سخت قحط پڑا تو بعض لوگوں نے حضرت عائشہ سے شکایت کی، انھوں نے کہا: قبر پیغمبر کے اوپر چھت میں ایک سوراخ کریں تاکہ قبر پیغمبر کی برکت سے خدا کی طرف سے بارش نازل ہو، ان لوگوں نے ایسا کیا تو بہت زیادہ بارش برسی۔

تفسیر آلوسی میں مندرجہ بالا احادیث میں سے متعدد نقل کی گئی ہیں اس کے بعد ان کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے حتی کہ ان احادیث کے بارے میں سخت رویہ اختیار کیا گیا ہے آخر میں مجبوراً صاحب تفسیر نے اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے:

ان تمام باتوں کے باوجود میں بارگاہ خدا میں مقام پیغمبرؐ سے متوسل ہونے سے مانع نہیں دیکھتا، خواہ حیات پیغمبر میں ہو یا آپ کی رحلت کے بعد۔

پھر مزید تفصیلی بحث کے بعد کہا ہے۔

خدا کی بارگاہ میں رسول اللہؐ کے علاوہ کسی اور سے متوسل ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ جسے وسیلہ بنایا جائے وہ بارگاہ الٰہی میں مقام و منزلت رکھتا ہو۔[3]

رہیں شیعہ کتب تو ان میں یہ بات اتنی واضح ہے کہ کوئی حدیث نقل کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

## چند قابل توجہ باتیں

۱۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ توسل سے مراد یہ نہیں کہ کوئی شخص پیغمبرؐ یا آئمہؑ سے حاجت طلب کرے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کے مقام و منزلت کو بارگاہ خدا میں رابطے کا وسیلہ قرار دے یہ در حقیقت خدا کی طرف ہی توجہ کرنا ہے کیونکہ پیغمبرؐ کا احترام بھی اس بنا پر ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے تھے اور انھوں نے اسی راہ میں قدم بڑھایا ہے ہمیں ایسے لوگوں پر تعجب ہوتا ہے جو اس قسم کے توسل کو شرک کی ایک قسم خیال کرتے ہیں حالانکہ شرک تو یہ ہے کہ خدا کی صفات اور افعال میں کسی کو خدا کا شریک سمجھا جائے لیکن ایسا توسل جس کا ہم نے ذکر کیا ہے کسی طرح سے بھی شرک سے مشابہ نہیں ہے۔

۲۔ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہؑ کی حیات اور وفات میں فرق کریں حالانکہ مذکورہ روایات جن میں سے اکثر وفات کے بعد کے زمانے سے مربوط ہیں سے قطع نظر بھی ایک مسلمان کی نظر میں انبیاء اور آئمہ علیہم السلام وفات کے بعد برزخ میں ایسی حیات رکھتے ہیں جیسی قرآن نے شہداء کے بارے میں بیان کی ہے اور کہا ہے:

---

[1] التوصل صفحہ ۲۵۳ [2] التوصل صفحہ ۳۳۱ [3] روح المعانی جلد ۳، ج ۶، صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵۔

انھیں مُردہ نہ سمجھو بلکہ وہ تو زندہ ہیں۔ (آل عمران ..... ۱۶۹)

۳۔ بعض پیغمبر اکرمؐ سے دعا کی درخواست کرنے اور خدا کو ان کے مقام کی قسم دینے میں بھی فرق پر اصرار کرتے ہیں وہ دعا کی درخواست کو جائز سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ کو ممنوع سمجھتے ہیں حالانکہ منطقی طور پر ان میں کوئی فرق نہیں۔

۴۔ اہلِ سنت کے بعض مؤلفین اور علماء خصوصاً وہابی حضرات بڑی ہٹ دھرمی سے توسّل کے سلسلے میں وارد ہونے والی روایات کو ضعیف ثابت کرنے کے درپے رہتے ہیں سو فضول اور بے بنیاد اعتراضات کے ذریعے انھیں طاقِ نسیاں کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی بحث اس طرح سے ہوتی ہے کہ ایک غیر جانبدار شخص محسوس کرتا ہے کہ عقیدہ انھوں نے پہلے بنا لیا ہے اور پھر اپنے عقیدے کو روایات اسلامی پر ٹھونسنا چاہتے ہیں اور جو کچھ ان کے عقیدے کے خلاف ہے اسے راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ایک محقق ایسی غیر منطقی اور تعصب آمیز بحث کو ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔

۵۔ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں توسل والی روایات حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں یعنی اس قدر زیادہ ہیں کہ ہمیں اسناد کی تحقیق سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان میں صحیح روایات بھی بہت سی ہیں لہٰذا بعض دیگر کی اسناد میں رد و قدح کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۶۔ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ روایات جو اس آیہ کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں اور ان میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ لوگوں سے فرماتے تھے کہ خدا سے میرے لیے وسیلہ کی دعا کرو۔ یا کتاب کافی میں حضرت علیؑ کا یہ فرمان کہ "وسیلہ" جنت میں بالاترین مقام ہے ———— ایسی روایات آیت کی مذکورہ بالا تفسیر کے منافی نہیں ہیں کیونکہ جیسے ہم نے بارہا نشاندہی کی ہے، وسیلہ میں تقربِ پروردگار کا ہر مفہوم شامل ہے اور خدا سے پیغمبر اکرمؐ کا تقرب اور جنت میں بلند ترین درجہ اس کا ایک مصداق ہے۔

۳۶۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

۳۷۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ○

## ترجمہ

۳۶۔ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں، اگر روئے زمین میں جو کچھ ہے اس کے برابر ان کے پاس ہو اور وہ روزِ قیامت

سزا سے نجات کے لیے فدیہ کے طور پر دے دیں تو بھی ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

۳۷۔ وہ ہمیشہ چاہیں گے کہ آگ سے نکل آئیں لیکن وہ اس سے نکل نہ پائیں گے، اور ان کے لیے پائیدار عذاب ہوگا۔

## تفسیر

گذشتہ آیت میں مومنین کو تقویٰ، راہِ جہاد اور وسیلہ تلاش کرنے کا حکم دیا گیا تھا اب ان دو آیات میں گذشتہ حکم کا سبب بیان کرنے کے حوالے سے بے ایمان اور آلودۂ گناہ افراد کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو لوگ کافر ہوگئے ہیں اگر جو کچھ روئے زمین میں ہے اس جتنا سرمایہ رکھتے ہوں اور اسے روزِ قیامت سے سزا سے نجات کے لیے دے دیں تو ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا (ان الذین کفروا لو ان لهم ما فی الارض جمیعًا و مثله معه لیفتدوا به من عذاب یوم القیٰمة ما تقبل منهم ولهم عذاب الیم)۔

یہی مضمون سورۂ رعد آیہ ۱۸ میں بھی ہے۔ اس سے خدائی سزا کے بارے میں انتہائی تاکید ظاہر ہوتی ہے اور یہ کہ کسی بھی سرمائے اور طاقت کے ذریعے اس سے رہائی حاصل نہیں کی جاسکتی چاہے وہ سرمایہ ساری زمین کے برابر یا اس سے بھی زیادہ کیوں نہ ہو، نجات فقط ایمان، تقویٰ، جہاد اور عمل ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔

اس کے بعد اس سزا کے دائمی ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، وہ ہمیشہ چاہیں گے کہ جہنم کی آگ سے باہر نکل آئیں لیکن نکل نہ سکیں گے اور ان کی سزا باقی اور برقرار رہے گی (یریدون ان یخرجوا من النار وما هم بخارجین منها ولهم عذاب مقیم)۔

دائمی سزا اور کفار کے دوزخ میں ہمیشہ رہنے کی بحث انشاء اللہ سورۂ ہود آیہ ۱۰۸ کے ذیل میں آئے گی۔

۳۸۔ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

۳۹۔ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

۴۰۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

# ترجمہ

۳۸۔ چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ اس کے انجام دیئے گئے عمل کی پاداش میں خدائی سزا کے طور پر کاٹ دو، خدا توانا اور حکیم ہے۔

۳۹۔ لیکن جو شخص ظلم کرنے کے بعد توبہ، اصلاح اور تلافی کرے تو خدا اس کی توبہ قبول کرے گا، کیونکہ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

۴۰۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ خدا آسمانوں اور زمین کا مالک اور حکمران ہے جسے چاہتا ہے (اور مستحق سمجھتا ہے) سزا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) بخش دیتا ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

# تفسیر

## چور کی سزا

قبل ازیں چند آیات میں "محارب" یعنی ڈرا دھمکا کر علی الاعلان مسلح ہو کر لوگوں کی جان و مال اور ناموس کے خلاف حملہ کرنے والے شخص کے بارے میں احکام بیان ہوئے ہیں۔ اسی مناسبت کی بنا پر ان آیات میں چور کہ جو مخفی طور پر لوگوں کا مال لے جاتا ہے، کے بارے میں حکم بیان ہوا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: چور مرد اور چور عورت کا ہاتھ کاٹ دو (والسارق والسارقة فاقطعوا ایدیهما)۔ یہاں چور مرد کو چور عورت پر مقدم رکھا گیا ہے چونکہ چوری کے سلسلے میں اصلی عامل زیادہ تر مرد ہوتے ہیں لیکن ارتکاب زنا کے موقع پر زیادہ اہم عامل اور محرک بے لگام عورتیں ہوتی ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: یہ سزا ان اعمال پر ہے جو انھوں نے انجام دیئے ہیں اور یہ خدا کی طرف سے عذاب ہے (جزاء بما کسبا نکالا من الله)۔ اس جملے میں درحقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ اول تو یہ سزا ان کے کام کا نتیجہ ہے اور ایسی چیز ہے جو انھوں نے خود اپنے لیے خریدی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ ایک طرح سے پیش بندی اور حق و عدالت کی طرف بازگشت ہے کیونکہ "نکال" کا معنی ہے ایسی سزا جو پیش بندی کے لیے اور ترک گناہ کے مقصد کے لیے ہو۔ دراصل اس لفظ کا معنی ہے "لگام" بعد ازاں ہر اس کام کے لیے استعمال ہونے لگا جو انحراف اور کج روی سے روکے۔

آیت کے آخر میں اس لیے کہ مبادہ یہ وہم ہو کہ مذکورہ سزا عادلانہ نہیں، فرمایا گیا ہے، خدا قادر و توانا ہے لہذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ کسی سے انتقام لے اور حکیم بھی ہے اس لیے وہ کسی کو بلاوجہ سزا نہیں دیگا (والله عزیز حکیم)۔

بعد والی آیت میں ان کے لیے لوٹ آنے کا راستہ کھولتے ہوئے فرماتا ہے : اس ظلم کے بعد جو شخص توبہ کرے اور اصلاح و تلافی کی راہ اپنائے خدا اسے بخش دے گا کیونکہ وہ بخشنے والا مہربان ہے ( فمن تاب من بعد ظلمه واصلح فان الله یتوب علیه ان الله غفور رحیم )

کیا توبہ کرنے سے صرف اس کا گناہ بخشا جائے گا یا چوری کی سزا ( ہاتھ کاٹنا ) بھی ساقط ہو جائے گی ۔ اس سلسلے میں ہمارے فقہاء میں یہی مشہور ہے کہ اگر وہ اسلامی عدالت میں چوری ثابت ہو جانے سے پہلے توبہ کرے تو چوری کی حد بھی برطرف ہو جائے گی لیکن جب دو عادل گواہوں کے ذریعے اس کا جرم ثابت ہو جائے تو پھر توبہ سے حد ساقط نہیں ہوگی ۔

دراصل حقیقی توبہ جس کی طرف آیت میں اشارہ کیا گیا ہے وہ ہے جو عدالت میں ثبوت جرم سے پہلے انجام پائے ورنہ تو ہر چور جب اپنے آپ کو سزا کے سامنے پائے گا اظہار توبہ کرے گا اور اس طرح تو کسی پر سزا جاری ہی نہ ہوگی ۔ دوسرے لفظوں میں " اختیاری توبہ " وہ ہے جو شرعی عدالت میں جرم ثابت ہونے سے پہلے انجام پائے ورنہ " اضطراری توبہ " ہوگی اور اضطراری توبہ تو ایسی ہے جیسے عذاب الٰہی یا آثار موت دیکھ کر کی جائے اور ایسی توبہ کی کوئی قیمت نہیں ۔

چوروں کے بارے میں توبہ کا حکم بیان کرنے کے بعد روئے سخن اسلام کے عظیم پیغمبرؐ کی طرف کیا گیا ہے ، فرمایا : کیا تمہیں معلوم نہیں کہ خدا آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور جس طرح مناسب سمجھتا ہے ان میں تصرف کرتا ہے ، جس شخص کو سزا کا مستحق سمجھتا ہے سزا دیتا ہے اور جسے بخشش کے لائق سمجھتا ہے بخش دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ( الم تعلم ان الله له ملك السمٰوٰت والارض یعذب من یشاء و یغفر لمن یشاء و الله علی کل شیء قدیر ) ۔

## چند اہم نکات

۱۔ چور کو سزا دینے کی شرائط : دیگر احکام کی طرح اس حکم میں قرآن نے بنیادی بات بیان کی ہے اس کی تفصیل سنت پیغمبرؐ پر چھوڑ دی ہے ۔ روایات اسلامی سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی اس اسلامی حد کے اجراء کے لیے بہت سی شرائط ہیں جن کے بغیر اسے جاری کرنا جائز نہیں ہے ان میں سے کچھ شرائط یہ ہیں :

(i) چوری کیا ہوا مال کم از کم ایک چوتھائی دینار کی مالیت کا ہونا چاہیے[1]

(ii) مال محفوظ جگہ سے مثلاً گھر ، دکان یا اندر کی جیب سے چوری کیا جائے ۔

(iii) چوری قحط سالی کے زمانے میں جبکہ لوگ بھوک زدہ ہوتے ہیں اور انہیں کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی ، نہ ہوئی ہو ۔

(iv) چور عاقل و بالغ ہو اور اس نے حالت اختیار میں یہ کام کیا ہو ۔

(v) باپ کا بیٹے کے مال سے چوری کرنا یا ایک شریک کا شرکت والے مال سے چوری کرنا اس حکم میں نہیں آتا ۔

(vi) باغ کے درختوں سے پھل کی چوری کو بھی اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے ۔

---

[1] دینار سے مراد ہے سکہ دار سونے کا ایک مثقال شرعی اور مثقال شرعی برابر ہے ۱۸ چنے کے دانوں کے یعنی عام مثقال کا ۳/۴ حصہ

(vii) ہر وہ موقع جہاں چور کے لیے اشتباہ کا احتمال ہو کہ اس نے دوسرے کے مال کو اشتباہ سے اپنا مال سمجھتے ہوئے لیا ہے بھی اس حکم سے مستثنیٰ ہوگا۔

کچھ اور شرائط بھی ہیں جن کی تفصیل فقہی کتب میں آئی ہے۔

اشتباہ نہ ہو کہ مذکورہ شرائط کی صورت ہی میں چوری حرام ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ مذکورہ حد کا اجراء ان شرائط سے مخصوص ہے ورنہ چوری تو ہر شکل وصورت، ہر مقدار، اور ہر کیفیت سے اسلام میں حرام ہے۔

۲۔ ہاتھ کاٹنے کی مقدار: روایات اہل بیت علیہم السلام سے استفادہ کرتے ہوئے ہمارے فقہا میں مشہور یہی ہے کہ دائیں ہاتھ کی صرف چار انگلیاں کاٹی جائیں نہ کہ اس سے زیادہ۔ اگرچہ فقہاء اہل سنت اس سے زیادہ کے قائل ہیں۔

۳۔ کیا یہ سخت سزا ہے؟: مخالفین اسلام اور کچھ ناواقف مسلمانوں کی طرف سے بارہا یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ اسلامی سزا بہت سخت ہے اور اگر آج کی دنیا میں یہ سزا نافذ ہو جائے تو بہت سے ہاتھ کٹ جائیں، علاوہ ازیں اس حکم کے اجراء سے ایک شخص نہ صرف اپنے بدن کے ایک اہم حصے سے محروم ہو جائے گا بلکہ ساری عمر کے لیے لوگوں کی انگشت نمائی کا شکار بھی ہو جائے گا۔

اس سوال کے جواب میں ان حقائق کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔

(i) جیسا کہ ہم نے اس حکم کی شرائط میں کہا ہے کہ یہ حکم ہر چور کے لیے نہیں ہے، بلکہ چوروں کے ایک خطرناک گروہ کے لیے ہے۔

(ii) اس جرم کے ثبوت کے لیے اسلام میں چونکہ خاص شرائط معین ہیں لہٰذا اس سے بہت کم لوگوں پر یہ سزا جاری ہوگی۔

(iii) کم معلومات رکھنے والے لوگ جو بہت سے اعتراضات اسلامی قوانین پر کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے وہ ایک حکم کو مستقل طور پر دوسرے تمام احکام سے الگ کرکے بحث کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اس حکم کو سو فی صد غیر اسلامی معاشرے میں فرض کرتے ہیں لیکن اگر ہم توجہ رکھیں کہ اسلام صرف اسی ایک حکم کا نام نہیں بلکہ وہ احکام کے ایک مجموعے کا نام ہے اور اگر یہ تمام احکام کسی معاشرے پر حکمران ہوں تو عدالت اجتماعی وجود میں آجائے، فقر و تنگدستی کے خلاف جنگ کی جائے، تعلیم وتربیت صحیح ہو اور آداب و اخلاق، آگاہی، بیداری اور تقویٰ کا دور دورہ ہو۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس حکم کے زیر اثر آنے والے لوگوں کی تعداد کس قدر کم ہوگی۔

کہیں اشتباہ نہ ہو، مقصد یہ نہیں کہ آج کے مختلف معاشروں میں یہ حکم جاری نہ ہو بلکہ مراد یہ ہے کہ فیصلہ اور قضاوت کرتے وقت ان تمام پہلوؤں کو نظر میں رکھنا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے تمام افراد کو بنیادی ضروریات مہیا کرے، انھیں ضروری تعلیم دلائے اور ان کی اخلاقی تربیت کرے واضح ہے کہ پھر ایسے ماحول میں غلط کار افراد بہت کم ہوں گے۔

(iv) اگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ چور زیادہ ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا حکم جاری نہیں ہوا لہٰذا جس علاقے میں یہ اسلامی حکم

جاری ہوتا ہے (مثلاً سعودی عرب میں گزشتہ سالوں میں یہ حکم جاری ہوتا تھا) وہاں بہت اچھا مالی امن امان ہوتا ہے۔ خانہ خدا کے بہت سے زائرین سوٹ کیس، بٹوے اور تھیلے حجاز کے گلی کوچوں میں پڑے دیکھتے ہیں انھیں کوئی شخص ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کرتا یہاں تک کہ گمشدہ چیزوں کے ادارے کے مامورین آتے ہیں اور انھیں اس ادارے میں لے جاتے ہیں اور مالک نشانی بتا کر لے جاتے ہیں اسی طرح رات کو بغیر دروازوں کے اکثر دکانیں کھلی پڑی رہتی ہیں اور کوئی ان میں چوری نہیں کرتا۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہ اسلامی حکم اگرچہ صدیوں تک جاری ہوتا رہا اور اس کی پناہ میں صدر اسلام کے مسلمان امن و امان کی زندگی بسر کرتے رہے لیکن صدیوں میں گنتی کے صرف چند افراد پر یہ حکم جاری ہوا۔

ایک ملت کی صدیوں کی زندگی کے لیے اگر چند غلط کار افراد کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں تو کیا یہ کوئی زیادہ قیمت ہے۔

۴۔ **ایک اعتراض کا جواب:** بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک چوتھائی دینار کی چوری پر حد کا اجراء کیا مسلمان کی جان کے بارے میں احترامات کے اسلامی احکام کے منافی نہیں کیونکہ اسلام تو مسلمان کے لیے ہر قسم کی گزند سے محفوظ رہنے کا قائل ہے اور ایک انسان کی چار انگلیاں کاٹنے کی دیت اسلام نے بہت زیادہ معین کی ہے۔

جیسا کہ بعض تواریخ سے معلوم ہوتا ہے، اتفاقاً یہی سوال اسلام کے ایک عظیم عالم مرحوم سید مرتضیٰ علم الہدیٰ سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ہوا تھا۔ سائل نے شعر کی صورت میں اپنا سوال یوں پیش کیا:

يد بخمس مئين عسجد وديت
ما بالها قطعت في ربع دينار

یعنی ــــــ وہ ہاتھ جس کی دیت پانچ سو دینار[1] ہے، ایک چوتھائی دینار کے بدلے کیوں کاٹا جاتا ہے۔

سید مرتضیٰ نے اس کے جواب میں یہ شعر ارشاد فرمایا:

عز الامانة اغلاها وارخصها
ذل الخيانة فافهم حكمة الباري

یعنی ــــــ امانت کی عزت نے اس ہاتھ کو گراں قیمت بنا دیا تھا لیکن خیانت کی ذلت نے اس کی قیمت گرا دی، تم ذرا حکمتِ الٰہی کو سمجھو[2]۔

۴۱۔ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا

---

[1] توجہ رہے کہ پانچسو دینار پانچ انگلیاں کاٹنے پر ہے لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں فقہائے اہل بیتؑ کے نزدیک چوری میں چار انگلیاں کاٹی جاتی ہیں۔

[2] تفسیر آلوسی جلد ۳ صفحہ ۶ پر بھی یہ واقعہ منقول ہے لیکن وہاں سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کی بجائے علم الدین سخاوی کا نام آیا ہے۔

بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ
لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ
بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ
فَاحْذَرُوْا ۭ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ
اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۙ
وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○

۴۲۔ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ فَاِنْ جَاۗءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ
اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـــًٔا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○

## ترجمہ

۴۱۔ اے (خدا کے) رسول! وہ لوگ جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کے دل ایمان نہیں لائے اور وہ راہِ کفر میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں، تم ان کے بارے میں غم نہ کرو اور یونہی یہودیوں کے بارے میں (جو اسی راہ پہ چلتے ہیں) وہ زیادہ آپ کی باتیں سنتے ہیں تاکہ انھیں تمھاری تکذیب کے لیے کوئی بات ہاتھ آجائے وہ دوسرے لوگوں کے جاسوس ہیں جو لوگ خود تمھارے پاس نہیں آئے۔ وہ باتوں کو ان کی جگہ سے بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ (جو ہم چاہتے ہیں) تمھیں دیں (اور محمد تمھاری خواہش کے مطابق فیصلہ کریں) تو اسے قبول کر لو، ورنہ دُوری اختیار کرو (اور اس پر عمل نہ کرو) اور جسے خُدا (اس کے پے در پے گناہوں کی وجہ سے) سزا دینا چاہے تو کوئی اسے بچا نہیں سکتا وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کی پاکی نہیں چاہتا۔ انھیں دنیا میں رسوائی نصیب ہو گی اور آخرت میں وہ عذابِ عظیم سے دوچار ہوں گے۔

۴۲۔ وہ تمھاری باتیں بہت غور سے سنتے ہیں تاکہ انھیں جھٹلائیں وہ مالِ حرام زیادہ کھاتے ہیں۔ اگر وہ تمھارے پاس آئیں تو ان کے درمیان قضاوت کرو یا (اگر مصلحت ہو) تو انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دو اور اگر ان سے صرف نظر کر لو تو وہ تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر ان کے درمیان فیصلہ کرو تو عدالت سے کام لو کہ خدا عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

## شانِ نزول

اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں متعدد روایات ہیں ان میں سے زیادہ واضح روایت وہ ہے جو امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:

خیبر کے یہودیوں کے ایک بڑے آدمی نے جو شادی شدہ تھا، ایک شوہر دار عورت سے خلاف عفت کام کیا وہ عورت بھی خیبر کے ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

تورات میں اس سلسلے میں سنگساری کا حکم تھا، یہودی اس کے اجراء میں پریشان تھے اور ایسے حل کی تلاش میں تھے، جس میں دونوں کی معافی ہو جائے اور اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو احکام الٰہی کا پابند بھی کہیں۔

انھوں نے اپنے ہم مذہب اہلِ مدینہ کو پیغام بھیجا کہ وہ اس حادثہ کے بارے میں پیغمبرِ اسلام سے حکم دریافت کریں (تاکہ اگر اسلام میں اس سے کوئی آسان حکم ہو تو اسے انتخاب کر لیا جائے ورنہ اس سے بھی صرف نظر کر لیا جائے اور شاید اس طرح سے وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ پیغمبرِ اسلام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائیں اور اپنے آپ کو مسلمانوں کا دوست ظاہر کریں)۔

اسی مقصد کے لیے مدینہ کے بڑے یہودی پیغمبرِ اسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا: میں جو حکم کروں گا کیا اسے قبول کرو گے؟

وہ کہنے لگے: ہم اسی لیے آپ کے پاس آئے ہیں۔

اس موقع پر زنائے محصنہ کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے سنگسار کیے جانے کا حکم نازل ہوا لیکن انھوں نے اسے قبول نہ کیا (اور عذر یہ پیش کیا کہ ہمارے مذہب میں تو ایسا حکم نہیں آیا)۔

پیغمبرِ اسلام نے مزید فرمایا: یہ وہی حکم ہے جو تمھاری تورات میں بھی آیا ہے کیا تم اس بات سے اتفاق کرتے ہو کہ میں تم میں سے ایک شخص کو فیصلے کے لیے بلاؤں اور جو کچھ وہ تورات سے بیان کرے اسے قبول کر لوں۔

وہ کہنے لگے: جی ہاں۔

پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا: ابن صوریا..... جو کہ فدک میں رہتا ہے، کیسا عالم ہے؟

وہ بولے: وہ تو تورات کا سب سے بڑا عالم ہے۔

کسی کو اسے لینے کے لیے بھیجا گیا جب وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پہنچا تو آپؐ نے اس سے فرمایا: تجھے اس خدائے یکتا کی قسم دیتا ہوں جس نے تورات کو موسیٰؑ پر نازل کیا، تمہارے لیے دریا شگاف کیا، تمہارے دشمن فرعون کو غرق کیا اور تمہیں بیابان میں اپنی نعمتوں سے نوازا..... کہو کیا ایسے موقع پر تورات میں تمہارے لیے سنگسار کرنے کا حکم نازل ہوا ہے یا نہیں؟

وہ کہنے لگا: آپ نے مجھے ایسی قسم دی ہے کہ میں مجبور ہو گیا ہوں کہ کہوں جی ہاں! ایسا ہی حکم تورات میں موجود ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا: پھر اس حکم کے اجراء کی مخالفت کیوں کرتے ہو؟

وہ بولا: حقیقت یہ ہے کہ ہم گذشتہ زمانے میں یہ حد عام افراد پر تو جاری کر دیتے تھے لیکن دولتمندوں اور بڑے لوگوں پر نہیں کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ ہمارے معاشرے کے خوش حال طبقوں میں یہ گناہ رائج ہو گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے ایک سردار کا چچا زاد بھائی اس قبیح عمل کا مرتکب ہوا اور حسبِ معمول اسے سزا نہ دی گئی۔ اسی اثنا میں ایک عام آدمی اس کا مرتکب ہوا۔ جب اسے سنگسار کرنے لگے تو اس کے رشتہ داروں نے اعتراض کیا اور کہنے لگے اگر یہ حکم جاری ہوتا ہے تو پھر دونوں پر ہو، اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم بیٹھ گئے اور سنگسار کے قانون کی جگہ ایک آسان قانون بنا لیا اور وہ یہ تھا کہ ہر ایک کو چالیس کوڑے لگائے جائیں اور ان کا منہ کالا کر کے اور سواری پر بٹھا کر انھیں گلی کوچوں میں پھرایا جائے۔

اس وقت پیغمبرِ اکرمؐ نے حکم دیا کہ اس مرد اور عورت کو مسجد کے سامنے سنگسار کیا جائے[1] پھر آپؐ نے فرمایا: خدایا! میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا، جبکہ یہودی اسے ختم کر چکے تھے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

# تفسیر

## دوست اور دشمن کے درمیان فیصلہ

زیرِ نظر آیات اور بعد کی چند آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے قاضی حق رکھتے ہیں کہ مخصوص شرائط کے ساتھ غیر مسلموں کے

---

[1] بیہقی نے اپنی سنن جلد ۸ صفحہ ۲۴۶ میں جو روایت نقل کی ہے۔ اس کے مطابق علماءِ یہود جب پیغمبرِ اسلامؐ کی خدمت میں آئے تھے تو اس عورت اور مرد کو بھی ساتھ لائے تھے۔

مقدمات کا بھی فیصلہ کریں، تفصیل آیات کے ذیل میں بیان کی جائے گی۔

زیر نظر آیات میں سے پہلی آیت یا ایھا الرسول (اے بھیجے ہوئے) سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں یہ تعبیر صرف دو جگہ پر نظر آتی ہے ایک اس مقام پر اور ایک اسی سورہ کی آیہ ۶۷ میں جہاں ولایت وخلافت کے مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے، معاملہ چونکہ اہم ہے اور دشمن کا خوف بھی ہے لہٰذا چاہتا ہے پیغمبر میں احساس مسئولیت کو اور متحرک کرے اور ان کے ارادے کو تقویت پہنچائے یہ کہتے ہوئے کہ تو صاحب رسالت ہے اور رسالت بھی ہماری ....... اس لیے حکم بیان کرنے میں استقامت اور پامردی سے کام لو۔

اس کے بعد پیغمبر کی دلجوئی اور تسلی کے لیے بعد والے حکم کی تمہید کے طور پر فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ زبان سے ایمان کے دعویدار ہیں اور ان کا دل ہرگز ایمان نہیں لایا اور کفر میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں وہ تمہارے غم واندوہ کا سبب نہ بنیں (کیونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے) (لا یحزنک الذین یسارعون فی الکفر من الذین قالوا اٰمنا بافواھھم ولم تؤمن قلوبھم)۔

بعض کا نظریہ ہے کہ "یسارعون فِی الکفر" اور "یسارعون الی الکفر" میں فرق ہے کیونکہ پہلا جملہ ایسے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے جو کافر ہیں اور کفر کے اندر غوطہ زن ہیں اور کفر کے آخری مرحلے تک پہنچنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں ہیں لیکن دوسرا جملہ ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو باہر سے کفر کی چار دیواری کی طرف حرکت میں ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت کر رہے ہیں۔[1]

منافقین اور داخلی دشمنوں کی کارستانیوں پر ان کی حوصلہ شکنی کے بعد خارجی دشمنوں اور یہودیوں کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، اسی طرح یہودیوں میں سے بھی جو لوگ اس راہ پر چل رہے ہیں وہ بھی تمہارے لیے حزن وملال کا باعث نہ ہوں (ومن الذین ھادوا)۔

اس کے بعد ان کے منافقانہ افعال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ تمہاری باتوں کو بڑے غور سے سنتے ہیں لیکن ان کی یہ توجہ اطاعت کے لیے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ انھیں تمہاری تکذیب کے لیے اور تم پر افترا باندھنے کے لیے کوئی عذر ہاتھ آجائے (سمّٰعون للکذب)۔

اس جملے کی ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ: وہ اپنے گذشتہ لوگوں کے جھوٹ اور افتراء کی طرف زیادہ کان دھرتے ہیں، لیکن حق بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔[2]

ان کی ایک اور صفت یہ ہے کہ یہ نہ صرف جھوٹ باندھنے کے لیے تمہاری مجلس میں آتے ہیں بلکہ جو لوگ تمہارے پاس نہیں آتے ان کے جاسوس کا کردار بھی ادا کرتے ہیں (سمّٰعون لقوم اٰخرین لم یأتوک)۔

---

[1] المنار ج ۶ صفحہ ۳۸۸

[2] پہلی صورت میں "للکذب" کی لام "لام تعلیل" ہے اور دوسری صورت میں "لام تعدیہ" ہے۔

دوسری تفسیر کے مطابق وہ اپنے گروہ کے حکم پر کان دھرتے ہیں ان کا طریقہ یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی حکم اپنی منشاء کے مطابق سُن لیں تو اسے قبول کر لیتے ہیں اور اگر کوئی حکم ان کے میلانِ طبع کے خلاف ہے تو اس کی مخالفت کرتے ہیں لہذا وہ اپنے بڑوں کا فرمان سنتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے ہیں نہ کہ تمہاری۔ ان حالات میں ان کی مخالفت تمہارے لیے باعثِ غم واندوہ نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ وہ ابتداء سے ہی تمہارے پاس قبولِ حق کی غرض سے نہیں آئے۔ ان کی صفات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ کلامِ الٰہی میں تحریف کرتے ہیں (چاہے تحریفِ لفظی ہو یا تحریفِ معنوی) جس حکم کو وہ اپنے مفاد اور ہوا و ہوس کے خلاف سمجھتے ہیں اس کی کوئی توجیہ کر لیتے ہیں یا اسے بالکل مسترد کر دیتے ہیں (یحرفون الکلم من بعد مواضعہ)۔[1]

زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ تمہارے پاس آنے سے پہلے ہی پختہ ارادہ کر لیتے ہیں، ان کے بڑوں نے انھیں حکم دیا ہے کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کوئی حکم ہماری خواہش کے مطابق دے تو اسے قبول کر لو اور اگر ہماری خواہش کے خلاف ہو تو اس سے دور رہو (یقولون ان اوتیتم ھٰذا فخذوہ وان لم تؤتوہ فاحذروا)۔

وہ اس طرح سے گمراہی میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اپنے ان افکار و نظریات میں اتنے پختہ ہیں کہ بغیر کسی سوچ بچار اور تحقیق و مطالعہ کے جو کچھ بھی ان کے تحریف شدہ مطالب کے خلاف ہو اسے رد کر دیتے ہیں اس طرح ان کی ہدایت کی کوئی امید نہیں اور خدا چاہتا ہے کہ اس ذریعے سے سزا دے کر انھیں رسوا کرے اور جس کی سزا اور رسوائی کا خدا ارادہ کر لے تو تم ہرگز اس کا دفاع نہیں کر سکتے (ومن یرد اللہ فتنتہ فلن تملک لہ من اللہ شیئا)۔

وہ اس قدر آلودہ ہیں کہ ان کی آلودگی دھلنے کے قابل نہیں ہے لہٰذا وہ ایسے لوگ ہیں کہ خدا ان کے دلوں کو پاک نہیں کرنا چاہتا (اولٰئک الذین لم یرد اللہ ان یطھر قلوبھم) کیونکہ خدا کا کام ہمیشہ حکمت آمیز ہوتا ہے اور وہ لوگ جو اپنے ارادے سے زندگی کا ایک حصہ کجروی میں گزار چکے ہیں اور نفاق، جھوٹ، مخالفتِ حق اور قوانینِ الٰہی میں تحریف کا جرم کر چکے ہیں ان کے لیے پلٹنا عادتاً ممکن نہیں ہے۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: وہ اس دنیا میں بھی رسوا ہوں گے اور آخرت میں بھی انھیں عذابِ عظیم ہوگا (لھم فی الدنیا خزی ولھم فی الاٰخرۃ عذاب عظیم)۔

دوسری آیت میں قرآن دوبارہ تاکید کرتا ہے کہ ان کے سننے والے کان تو تمہاری بات سن کر اس کی تکذیب کرنے کے لیے ہیں (یا پھر وہ اپنے بڑوں کے جھوٹ سننے کے لیے گوشِ شنوا رکھتے ہیں) (سمّٰعون للکذب) یہ جملہ تاکید کے طور پر ہے اور اس بری صفت کے اثبات کے لیے تکرار ہے۔

اس کے علاوہ وہ ناحق، حرام اور رشوت زیادہ کھاتے ہیں (اکّٰلون للسحت)۔[2]

---

[1] تحریف کی کیفیت اور اقسام کے بارے میں اسی سورہ کی آیت ۱۳ کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے۔

[2] "سحت" (بروزن "حفت") دراصل درخت کے چھلکا اتارنے اور شدید بھوک کے معنی میں ہے بعد ازاں ناجائز مال اور خصوصاً رشوت کے لیے بولا جانے لگا کیونکہ ایسا مال معاشرے سے تازگی، پاکیزگی اور برکت چھین لیتا ہے جیسے درخت سے چھلکے اتر دیئے جائیں تو اس پر پژمردگی چھا جاتی ہے اور وہ خشک ہو جاتا ہے اس بنا پر "سحت" کا ایک وسیع معنی ہے اگر بعض روایات میں اس کا کوئی خاص مصداق بیان کیا گیا ہے تو وہ انحصار کی دلیل نہیں ہے۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر ایسے لوگ فیصلہ حاصل کرنے کے لیے ان کی طرف رجوع کریں تو وہ احکام اسلام کے مطابق ان کے درمیان فیصلہ کر سکتے ہیں اور یہ بھی کہ ان سے منہ پھیر بھی سکتے ہیں (فان جاؤک فاحکم بینھم او اعرض عنھم)۔

البتہ یہاں یہ مراد نہیں کہ پیغمبر اکرم کسی ذاتی میلان کی بنیاد پر کوئی راستہ اپنائیں بلکہ مراد یہ ہے کہ حالات و اوضاع کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر مصلحت ہو تو حکم جاری کریں ورنہ صرف نظر کر لیں۔

روح پیغمبر کی تقویت کے لیے مزید فرمایا گیا ہے: اگر مصلحت اس میں ہو کہ ان سے منہ پھیر لو تو وہ تمہیں کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے (و ان تعرض عنھم فلن یضروک شیئا)۔

اور اگر ان کے درمیان فیصلہ کرنا چاہو تو یقیناً تمہیں اصولِ عدالت کو ملحوظ رکھنا چاہیے کیونکہ خدا، حق، انصاف اور عدالت کے مطابق فیصلہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (و ان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حکومتِ اسلامی کو آج بھی یہ اختیار ہے کہ وہ غیر مسلموں کے بارے میں احکامِ اسلام کے مطابق فیصلہ کرے یا فیصلہ کرنے سے اعراض کرے۔ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ اسلامی ماحول میں جو شخص بھی زندگی بسر کرتا ہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، حقوق اور جزا و سزا کے اسلامی قوانین سب کے بارے میں یکساں ہیں۔ اس بنا پر مندرجہ بالا آیت کا حکم یا تو منسوخ ہو چکا ہے یا غیر ذمی کفار سے مخصوص ہے (یعنی وہ کفار جو ایک اقلیت کے طور پر اسلامی ملک میں زندگی بسر نہیں کرتے لیکن مسلمانوں کے ساتھ معاہدوں میں شریک ہیں اور ان سے میل جول رکھتے ہیں)

بعض دیگر حضرات کا نظریہ ہے کہ اسلامی حکومت اس وقت بھی غیر مسلموں کے بارے میں یہ اختیار رکھتی ہے کہ وہ حالات و اوضاع کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصلحت سمجھے تو ان کے بارے میں احکامِ اسلام کے مطابق فیصلہ کرے اور یا انھیں ان کے اپنے قوانین کی طرف رجوع کرنے کی اجازت دے دے (تفصیلی مطالعہ اور تحقیق کے لیے فقہی کتب میں قضاوت کی بحث سے رجوع کریں)

۴۳- وَكَيْفَ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۟ؑ

## ترجمہ

۴۳- وہ کس طرح تجھے فیصلہ کے لیے بلاتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات ہے اور اس میں خدا کا حکم موجود ہے (اور پھر فیصلہ کے بعد انھوں نے چاہا کہ تجھ سے منہ پھیر لیں اور وہ مومن نہیں ہیں۔

# تفسیر

گذشتہ آیت میں پیغمبر اکرمؐ سے یہودیوں کے فیصلہ طلب کرنے کا ذکر تھا یہ آیت بھی اسی معاملے کے بارے میں ہے۔ یہاں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ کس طرح تجھے فیصلہ کے لیے بلاتے ہیں جب کہ تورات ان کے پاس ہے اور اس میں خدا کا حکم بھی آچکا ہے (وکیف یحکمونک وعندھم التورٰىة فیھا حکم اللّٰہ)۔

یاد رہے کہ زنائے محصنہ کے مرتکب مرد و عورت کو سنگسار کرنے کا مذکورہ حکم موجودہ تورات کے سفر تثنیہ فصل بائیس میں موجود ہے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ وہ تو تورات کو ایک منسوخ کتاب نہیں مانتے اور دین اسلام کو باطل سمجھتے ہیں اس کے باوجود وہ تورات کے ان احکام کو چھوڑ کر جو ان کی طبیعت کے مطابق نہیں ہیں ایسے حکم کی تلاش کرتے ہیں جو اصولی طور پر ان کے موافق نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ تجھے فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کر لینے کے بعد تیرا حکم قبول نہیں کرتے کہ جو حکم تورات کے مطابق ہے کیونکہ یہ حکم ان کے میلان اور رغبت کے خلاف ہے (ثم یتولون من بعد ذٰلک) حقیقت یہ ہے کہ وہ ایمان ہی نہیں رکھتے ورنہ احکام خدا کے ساتھ ایسا کھیل نہ کھیلتے (وما اولٰئک بالمؤمنین)۔

ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ مندرجہ بالا آیت یہ کیونکر کہتی ہے کہ حکم خدا تورات میں مذکور ہے حالانکہ قرآنی آیات اور تاریخی اسناد سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات تحریف شدہ کتاب ہے اور یہی تحریف شدہ کتاب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھی۔

اس سلسلے میں توجہ رہے کہ اول تو ہم تمام تورات کو تحریف شدہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کے کچھ حصے کو واقع کے مطابق جانتے ہیں اور اتفاق کی بات ہے کہ زیر بحث حکم غیر تحریف شدہ احکام میں سے ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تورات جو کچھ بھی تھی یہودیوں کے نزدیک تو ایک آسمانی کتاب تھی جو تحریف شدہ نہیں سمجھی جاتی تھی لہٰذا ان حالات میں کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ وہ اس پر عمل نہ کریں۔

۴۴۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○

# ترجمہ

۴۴۔ ہم نے تورات کو نازل کیا کہ جس میں ہدایت اور نور تھا اور انبیاء کو کہ جو حکم خدا کے سامنے تسلیم تھے اس کے مطابق یہودیوں میں فیصلہ کرتے تھے اور (اسی طرح) علماء بھی اس کتاب کے مطابق حکم کرتے تھے کہ جو ان کے سپرد تھی اور وہ اس پر گواہ تھے اس بنا پر (آیاتِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کرنے کے بارے میں) لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور میری آیات معمولی قیمت پر نہ بیچو اور جو لوگ خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکم نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

# تفسیر

زیر نظر اور آئندہ آیت گزشتہ بحث کی تکمیل کرتی ہے۔ حضرت موسٰیؑ کی آسمانی کتاب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے، ہدایت حق کی طرف راہنمائی کے لیے اور نور جہل و نادانی کی تاریکیوں کو دور کرنے کے لیے (انا انزلنا التوراة فیھا ھدی و نور)۔

اس بنا پر وہ پیغمبرانِ خدا جو حکم خدا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے تھے اور نزولِ تورات کے بعد مصروف کار تھے، سب یہودیوں کے لیے اس کے مطابق حکم کرتے تھے (یحکم بھا النبیون الذین اسلموا للذین ھادوا)

صرف یہی ایسا نہ کرتے تھے بلکہ یہودیوں کے بزرگ علماء اور صاحبِ ایمان پاکباز دانشور اس آسمانی کتاب کے ہی مطابق فیصلہ کرتے تھے جو ان کے سپرد کی گئی تھی اور وہ اس پر گواہ تھے (و الربانیون و الاحبار بما استحفظوا من کتاب الله و کانوا علیه شھداء)۔[1]

یہاں روئے سخن اہلِ کتاب کے ان علماء کی طرف ہے جو اس زمانے میں موجود تھے ارشاد ہوتا ہے: لوگوں سے نہ ڈرو اور خدا کے حقیقی احکام بیان کرو اور چاہیے تو یہ کہ میری مخالفت سے ڈرو کیونکہ اگر تم نے حق کو چھپایا تو تمہیں سزا دی جائے گی (فلا تخشوا الناس و اخشون) اور اسی طرح آیاتِ خدا کو کم قیمت پر نہ بیچو (و لا تشتروا

---

[1] "ربانی" کے معنی اور اس کے اصلی مادہ کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل ص۱۷۹ (اردو ترجمہ) میں بحث کی جا چکی ہے نیز "احبار" "حبر" (بروزن "فکر") کی جمع ہے اور اسی طرح بروزن "ابر" ہو تو اس کا معنی ہے "نیک اثر"۔ بعد ازاں یہ لفظ ایسے علماء کے بارے میں استعمال ہونے لگا جو معاشرے میں اچھا اور نیک اثر رکھتے ہوں۔ دوات کی سیاہی کو بھی "حبر" اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ نیک آثار رکھتی ہے۔

بآیاتی ثمنا قلیلا)۔

دراصل حق کو چھپانے کی وجہ یا لوگوں کا خوف ہے یا پھر ذاتی مفاد کا حصول بہرحال جو کچھ بھی ہو ضعفِ ایمان کی دلیل اور مقامِ انسانیت کی نفی ہے اور مندرجہ بالا جملوں میں دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ایسے اشخاص کے بارے میں آیت کے آخر میں قطعی فیصلہ صادر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

جو لوگ احکامِ خدا کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الکافرون)۔

واضح ہے کہ حکمِ خدا کے مطابق فیصلہ نہ کرنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ خاموش رہا جائے اور بالکل کوئی فیصلہ نہ کیا جائے اور اپنی خاموشی سے لوگوں کو گمراہی میں ڈال دیا جائے اور یہ بھی کہ بات کی جائے اور حکمِ خدا کے خلاف فیصلہ دیا جائے۔

یہ بھی واضح ہے کہ کفر کے کئی مراتب اور مختلف درجات ہیں اور یہ اصل وجودِ خدا کے انکار سے شروع ہوتا ہے اور اس کی نافرمانی اور معصیت تک جا پہنچتا ہے۔ کیونکہ ایمانِ کامل انسان کو حکمِ خدا کے مطابق عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور وہ جو عمل نہیں کرتے ان کا ایمان کامل نہیں ہے۔

یہ آیت ہر اُمت کے علماء اور دانشوروں پر عائد ہونے والی بھاری ذمہ داری اور جوابدہی کو واضح کرتی ہے۔ آیت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے گرد رونما ہونے والے معاشرتی طوفانوں اور حوادث کا مقابلہ کریں۔ کجرویوں کے خلاف فیصلہ کن انداز میں ڈٹ جائیں اور کسی سے خوف نہ کھائیں۔

۴۵۔ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ ۚ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

## ترجمہ

۴۵۔ اور ہم نے اس (تورات) میں ان (بنی اسرائیل) کے لیے مقرر کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت ہے اور ہر زخم کیلئے قصاص ہے، اور اگر کوئی (قصاص سے صرف نظر کرتے ہوئے) اسے بخش دے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ شمار ہوگا اور

جو شخص خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

# تفسیر

## قصاص اور درگذر

اس آیت میں ان حدود الٰہی کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے جو تورات میں ہیں، فرمایا گیا ہے: ہم نے تورات میں قانونِ قصاص مقرر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو قتل کر دے تو مقتول کے اولیاء قاتل کو اس کے بدلے قتل کر سکتے ہیں (وکتبنا علیہم فیہا ان النفس بالنفس)۔

اور اگر کوئی دوسرے کی آنکھ کو نقصان پہنچائے اور اسے ختم کر دے تو وہ اس کی آنکھ نکال سکتا ہے (والعین بالعین)

اسی طرح کسی کی ناک کاٹنے کے بدلے جائز ہے کہ مجرم کی ناک کاٹی جائے (والانف بالانف)۔

نیز کان کاٹنے کے بدلے مدمقابل کا کان کاٹا جا سکتا ہے (والاذن بالاذن)۔

اور اگر کوئی کسی کا دانت توڑ دے تو وہ بھی اس کا دانت توڑ سکتا ہے (والسن بالسن)۔

اسی طرح جو بھی کسی کو کوئی زخم لگائے تو وہ اس کے بدلے قصاص لے سکتا ہے (والجروح قصاص)

لہٰذا حکمِ قصاص بغیر کسی نسلی، طبقاتی، اجتماعی، قبائلی اور شخصی امتیاز کے جاری ہوگا اور اس سلسلے میں کسی کے لیے بھی کسی پہلو سے کوئی فرق اور تبعیض نہیں ہے (البتہ دیگر اسلامی احکام کی طرح اس حکم کی بھی کچھ شرائط ہیں جو فقہی کتب میں موجود ہیں کیونکہ یہ حکم بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں ہے اسلام میں بھی اس کی نظیر موجود ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۷۸ میں مذکور ہے کہ جو آیہ قصاص ہے)۔

ناروا امتیازات اور تفریقات جو اس زمانے میں مروج تھیں انھیں یہ آیت ختم کرتی ہے جیسا کہ بعض تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں یہود مدینہ کے دو گروہوں میں ایک عجیب عدم مساوات موجود تھی اور وہ یہ کہ بنی نضیر کا کوئی شخص بنی قریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو اس سے قصاص نہ لیا جاتا لیکن اس کے برعکس بنی قریظہ کا کوئی شخص بنی نضیر کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو وہ اس کے بدلے قتل کیا جاتا۔

جب مدینہ میں اسلام آیا تو بنی قریظہ نے اس بارے میں پیغمبر اسلام سے سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا:

خون کسی کا ہو کوئی فرق نہیں۔

اس پر بنی نضیر اعتراض کرنے لگے اور کہنے لگے:

آپ ہمارا مقام نیچے لے آئے ہیں اور اسے پست کر دیا ہے۔

زیر نظر آیت اسی ضمن میں نازل ہوئی اور انھیں بتایا گیا کہ نہ صرف اسلام میں بلکہ یہودیوں کے دین میں بھی مساوات کا

یہ قانون موجود ہے[1]

لیکن اس بنا پر کہیں یہ گمان نہ ہو کہ خدا نے قصاص کو لازمی قرار دیا ہے اور مقابلہ بمثل کی دعوت دی ہے، مزید فرمایا گیا ہے: اگر کوئی اپنے حق سے درگذر کرے اور عفو و بخشش سے کام لے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ شمار ہوگا اور جس طرح اس نے درگذر سے کام لیا ہے خدا اس سے درگذر کرے گا (فمن تصدق بہ فھو کفارۃ لہ)۔

گویا قصاص ایک صدقہ و عطیہ ہے جو مجرم کو بخش دیا گیا ہے یہاں "تصدق" کی تعبیر اور خدا کی طرف سے "تصدق" کرنے والے کو عفو کا وعدہ، یہ سب کچھ عفو و درگذر کا شوق پیدا کرنے کے لیے ہے۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ قصاص کے ذریعے کھوئی ہوئی چیز تو ہاتھ میں نہیں آسکتی یہ تو فقط وقتی سکون و اطمینان دیتا ہے لیکن خدا کی طرف سے عفو و بخشش کا وعدہ دراصل ایک دوسری صورت میں اس کی تلافی ہے جو وہ ہاتھ سے دے بیٹھا ہے اور اس طرح سے اس کی پریشانی ختم ہو جاتی ہے اور یہ ایسے لوگوں کے لیے عمدہ اور بہترین تشویق ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

جو شخص معاف کر دیتا ہے خدا بھی اسی طرح اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے[2]

یہ جملہ درحقیقت ان لوگوں کے لیے ایک دندان شکن جواب ہے جو قانون قصاص کو غیر عادلانہ سمجھتے ہیں اور اسے ایک آدم کش قانون قرار دیتے ہیں۔ پوری آیت پر غور و خوض سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاص کی اجازت مجرموں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہے تاکہ بے گناہ لوگ ان کے اقدام جرم سے مامون رہیں لیکن اس کے باوجود عفو و بازگشت کا راستہ بھی کھلا رکھا گیا ہے۔ خوف و امید کی یہ کیفیت پیدا کرتے ہوئے اسلام چاہتا ہے کہ ظلم و زیادتی کو بھی روکے اور جتنا ہو سکے اور مناسب ہو خون کو خون سے پاک کرنے کی پیش بندی بھی کرے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اور جو لوگ خدا کے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظلمون)۔

اس سے بڑھ کر کیا ظلم ہوگا کہ ہم جھوٹے احساسات اور جذبات سے مغلوب ہو کر قاتل سے اس بہانے سے صرف نظر کرلیں کہ خون کو خون سے نہ دھویا جائے اور قاتلوں کے ہاتھ دوسرے لوگوں کو قتل کرنے کے لیے کھلے چھوڑ دیں، اور اس طرح سے بے گناہوں پر ظلم و ستم کریں۔

توجہ رہے کہ موجودہ تورات میں بھی سفر خروج کی اکیسویں فصل میں ہے کہ:

اور اگر دوسرے کو اذیت پہنچائی گئی ہو تو اس وقت جان کے عوض جان دی جائے۔ آنکھ کے

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۳ صفحہ ۲۱۸۸

[2] بہت سے مفسرین نے آیت کے بارے میں ایک اور احتمال بھی پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ "لہ" کی ضمیر مجرم کے بارے میں ہے اس طرح آیت کا معنی یہ ہوگا: جو شخص اپنے حق سے درگذر کرے تو اس سے جان کا قصاص برطرف ہو جائے گا اور یہ اس کے عمل کا کفارہ شمار ہوگا لیکن آیت کا ظاہر وہی ہے جو ذکر ہو چکا ہے۔

[3] نور الثقلین ج ۱ ص ۶۲۷

عوض آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں اور جلانے کے بدلے جلایا جائے، زخم کے عوض زخم اور تھپڑ کے بدلے تھپڑ[1]

۴۶۔ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

## ترجمہ

۴۶۔ اور ان (گذشتہ انبیاء) کے بعد ہم نے عیسٰی کو مقرر کیا تاکہ اس سے پہلے جو تورات میں بھیجا گیا تھا اس کی تصدیق کرے اور ہم نے اسے انجیل دی کہ جس میں ہدایت اور نور تھا (اور اس کی یہ آسمانی کتاب بھی) تورات کی تصدیق کرتی تھی جو اس سے پہلے تھے اور متقیوں کے لیے ہدایت اور موعظہ ہے۔

## تفسیر

تورات سے مربوط آیات کے بعد یہ آیت انجیل کی کیفیت بیان کر رہی ہے ارشاد ہوتا ہے، گذشتہ رہبروں اور پیغمبروں کے بعد ہم نے مسیح کو مبعوث کیا جبکہ اس کی نشانیاں بالکل ان نشانیوں کے مطابق تھیں جو تورات نے بیان کی تھیں (وقفینا علی أثارھم بعیسی ابن مریم مصدقا لما بین یدیہ من التورٰۃ)۔

اس جملے کی ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ حضرت مسیح نے تورات کی حقانیت کا اعتراف کیا کہ جو حضرت موسیٰ بن عمران پر نازل ہوئی تھی جیسے تمام آسمانی پیغمبر اپنے سے پہلے انبیاء کی حقانیت کے معترف تھے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: ہم نے اسے انجیل سونپی کہ جس میں ہدایت اور نور تھا (و أتیناہ الانجیل فیہ ھدی و نور)

قرآن مجید میں تورات، انجیل اور قرآن تینوں کو نور کہا گیا ہے۔ تورات کے بارے میں ہے:

انا انزلنا التورٰۃ فیھا ھدی و نور (مائدہ - ۴۴)

---

[1] سفر خروج۔ جملہ ۲۳، ۲۴ اور ۲۵

انجیل کے بارے میں تو مندرجہ بالا آیت میں ہے اور قرآن کے بارے میں ہے:

"قد جاءکم من اللہ ... و کتاب مبین"

(مائدہ - ۱۵)

درحقیقت جیسے تمام موجودات عالم اپنی زندگی ... تسلسل کے لیے نور کے سخت محتاج ہیں۔ اسی طرح خدا کے دین اور آسمانی کتب کے احکام و قوانین انسانوں کے رشد و تکامل اور ارتقاء کے لیے ناگزیر ہیں۔ اصولی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ تمام توانائیوں اور حرکات اور زیبائیوں کا سرچشمہ نور ہے اور نور نہ ہو تو خاموشی اور موت تمام جگہوں پر چھا جائے۔ اسی طرح پیغمبروں کی تعلیمات نہ ہوں تو تمام انفرادی و اجتماعی انسانی قدریں موت کی نیند سو جائیں اور اس کے نمونے ہم مادی معاشروں میں واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

قرآن نے کئی ایک مقامات پر تورات اور انجیل کو آسمانی کتاب کے عنوان سے یاد کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ دونوں کتابیں اصل میں خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں لیکن یہ بھی مسلم ہے کہ اپنے پیغمبروں کے بعد یہ دونوں آسمانی کتابیں تحریف کی نذر ہو گئیں کچھ حقائق ان میں سے کم کر دیئے گئے اور کچھ بے ہودہ باتیں اور خرافات ان میں شامل کر دی گئیں اور یوں ان کی قدر و قیمت گرا دی گئی یا یہ کہ اصلی کتب تو بھلا دی گئیں اور کچھ اور کتب نے ان کی جگہ لے لی۔ جن میں کچھ حصہ اصلی کتب کا بھی تھا[1] لہٰذا نور کا اطلاق اصلی تورات اور انجیل پر ہوتا ہے۔ تحریف شدہ کتب پر نہیں۔

دوبارہ بطور تاکید فرمایا گیا ہے کہ: نہ صرف یہ کہ عیسیٰ بن مریم۔ تورات کی تصدیق کرتے تھے بلکہ ان کی آسمانی کتاب انجیل بھی تورات کی صداقت پر گواہ تھی (مصدقا لما بین یدیہ من التوراۃ)۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے: یہ آسمانی کتاب پرہیز گاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت کا سرمایہ ہے (وھدی وموعظۃ للمتقین)۔

یہ تعبیر بھی ویسی ہی ہے جیسی سورۂ بقرہ کی ابتداء میں قرآن کے بارے میں آئی ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے:

ھدی للمتقین

یعنی ...... قرآن پرہیز گاروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے۔

نہ صرف قرآن بلکہ تمام آسمانی کتب اسی طرح پرہیز گاروں کی ہدایت کا ذریعہ ہیں۔ پرہیز گاروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کی تلاش میں رہتے ہیں اور اسے قبول کرنے کے لیے آمادہ و تیار رہتے ہیں۔ واضح ہے کہ جو لوگ ہٹ دھرمی اور دشمنی کی بنا پر اپنے دل کا دریچہ حق کے سامنے بند کر لیتے ہیں وہ کسی بھی حقیقت سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے۔

---

[1] تورات اور انجیل میں تحریف اور اس کی تاریخی اسناد کے بارے میں زیادہ وضاحت کے لیے کتاب "الھدیٰ الی دین المصطفیٰ" اور "انیس الاعلام" کی طرف رجوع فرمائیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں پہلے انجیل کے بارے میں " فیہ ھدًی " کہا گیا ہے اور بعد میں بطور مطلق " ھدًی " کہا گیا ہے۔ تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ انجیل اور دوسری آسمانی کتب میں ہر شخص کے لیے بلا استثناء ہدایت کے دلائل موجود ہیں لیکن پرہیزگاروں کے لیے کہ جو اس میں دقت نظر کرتے ہیں وہ ہدایت تربیت، تکامل اور ارتقاء کا باعث ہے۔

۴۷۔ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

## ترجمہ

۴۷۔ ہم نے اہل انجیل (پیروان مسیح) سے کہا کہ جو کچھ خدا نے اس میں نازل کیا ہے وہ اس کے مطابق حکم کریں اور جو لوگ اس کے مطابق حکم نہیں کرتے جو خدا نے نازل کیا ہے، وہ فاسق ہیں۔

## تفسیر

### وہ جو قانونِ الٰہی کے مطابق حکم نہیں کرتے

گذشتہ آیات میں انجیل کے نازل ہونے کا ذکر ہے۔ اب اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے اہل انجیل کو حکم دیا کہ جو کچھ خدا نے اس میں نازل کیا ہے اس کے مطابق حکم اور فیصلہ کریں (و لیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ)۔

اس میں شک نہیں کہ اس جملے سے یہ مراد نہیں کہ قرآن عیسائیوں کو یہ حکم دے رہا ہے کہ انھیں اس وقت انجیل کے احکام پر عمل کرنا چاہیے کیونکہ یہ بات تو قرآن کی دیگر آیات اور خود وجود قرآن سے مناسبت نہیں رکھتی کہ جو نئے آئین اور دین کا اعلان کر رہا ہے، پرانے دین کو منسوخ کر رہا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم نے عیسٰی پر انجیل نازل کرنے کے بعد اس کے پیروکاروں کو حکم دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں اور اس کے مطابق فیصلے کریں[1]

آیت کے آخر میں پھر بطور تاکید فرماتا ہے: جو لوگ حکم خدا کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ فاسق ہیں (و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الفاسقون)۔

---

[1] درحقیقت اسی طرح جیسے بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ "قلنا" یہاں مقدر ہے اور آیت کا مفہوم ہے: وقلنا لیحکم اھل الانجیل.....

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ان آیات میں ایک مقام پر انھی افراد کو "کافر" کہا گیا ہے۔ دوسرے مقام پر "ظالم" قرار دیا گیا ہے اور تیسرے مقام پر "فاسق" کہا گیا ہے۔ تعبیر میں یہ فرق ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ ہر حکم تین پہلو رکھتا ہے۔ ایک طرف سے وہ قانون بنانے والے (خدا) پر منتہی ہوتا ہے دوسری طرف قانون جاری کرنے والے (حاکم و قاضی) تک پہنچتا ہے اور تیسری طرف اس شخص کہ جس پر قانون جاری ہو رہا ہے (محکوم) تک پہنچتا ہے۔ گویا ہر تعبیر تین میں سے ایک پہلو کیطرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ جو شخص خدا کے ایک حکم کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ ایک طرف سے قانونِ الٰہی کو پاؤں تلے روند کر "کفر" اختیار کرتا ہے۔ دوسری طرف ایک بے گناہ انسان پر "ظلم" کرتا ہے اور تیسری طرف وہ اپنی ذمہ داری اور مسئولیت کی سرحد سے انحراف کرکے "فاسق" بن جاتا ہے جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ فسق کا معنی بندگی اور مسئولیت کی سرحد سے تجاوز ہے۔

۴۸۔ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ‌ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ‌ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَـقِّ‌ؕ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا‌ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَـعَلَـكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰـكِنۡ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِىۡ مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ‌ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَـيۡـرٰتِ‌ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۙ‏

## ترجمہ

۴۸۔ اور اس کتاب کو ہم نے حق کے ساتھ تم پر نازل کیا جبکہ یہ گذشتہ کتب کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی محافظ و نگہبان ہے لہٰذا خدا نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کے مطابق حکم کرو اور ان کے ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو اور احکامِ الٰہی سے منہ نہ پھیرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے واضح آئین اور طریقہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمّت قرار دیتا لیکن خدا چاہتا ہے کہ اس نے جو کچھ تمھیں بخشا ہے اس میں تمھیں آزمائے (اور تمھاری صلاحیتوں کی نشو و نما کرے) اس لیے تم کوشش کرو اور نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ۔ تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور جس میں تم نے اختلاف کیا ہے وہ تمھیں اس کی

خبر دیتا ہے۔

## تفسیر

گذشتہ انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد یت میں قرآن کے مقام مرتبے کا تذکرہ ہے۔ "مہیمن" دراصل ایسی چیز کو
کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی محافظ، شاہد، امین اور نگہدار ہو۔ قرآن چونکہ گذشتہ آسمانی کتب کے اصولوں کی مکمل حفاظت و
نگہداری کرتا ہے اور ان کی تکمیل کرتا ہے لہٰذا اسے "مہیمن" قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے ہم نے اس آسمانی کتاب کو
حق کے ساتھ نازل کیا ہے، جبکہ یہ گذشتہ کتب کی تصدیق کرتا ہے (اور اس کی نشانیاں اور علامات اس کے مطابق ہیں جو
گذشتہ کتب نے بتائی ہیں) اور یہ ان کا محافظ و نگہبان ہے (وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما
بین یدیہ من الکتاب و مھیمنا علیہ)۔

بنیادی طور پر تمام آسمانی کتابیں اصولِ مسائل میں ہم آہنگ ہیں اور سب کا ہدف و مقصد ایک ہی ہے یعنی سب
انسانی تربیت، ارتقاء اور تکامل کے درپے ہیں اگرچہ فروعی مسائل میں تکامل و ارتقاء کے تدریجی قانون کے مطابق مختلف
ہیں اور ہر نیا دین بالاتر مرحلے کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور جامع تر پروگرام پیش کرتا ہے۔

"مصدقا لما بین یدیہ" کے بعد "مھیمنا علیہ" کا ذکر اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی
گذشتہ کتب کے اصول کی تصدیق کرتے ہوئے قرآن جامع ترین پروگرام پیش کرتا ہے۔

اس کے بعد حکم دیا گیا ہے کہ جب ایسا ہے تو ان احکام کے مطابق فیصلہ کرو جو تم پر نازل ہوئے ہیں (فاحکم
بینھم بما انزل اللہ) یہ جملہ فاء تفریع کے ساتھ آیا ہے جو گذشتہ ادیان کے احکام کی نسبت احکامِ اسلام کی جامعیت کا
نتیجہ ہے۔ یہ حکم گذشتہ آیات کے اس حکم کے منافی نہیں کہ جن میں پیغمبر کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ ان کے درمیان خود فیصلہ کریں
یا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ کیونکہ یہ آیت کہتی ہے کہ جب اہلِ کتاب کے درمیان فیصلہ کرنا چاہو تو قرآن کے احکام
کے مطابق فیصلہ کرو۔

پھر مزید فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ احکامِ الٰہی کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھال لیں، تم ان کے
ہوا و ہوس اور خواہشات کی اتباع نہ کرو۔ اور حق میں سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس سے منہ نہ پھیرو (ولا تتبع
اھوائھم عما جاءک من الحق)۔

بحث کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے: تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے دین، شریعت، طریقہ اور واضح راستے
کا تعین کر دیا ہے (لکل جعلنا منکم شرعۃ و منھاجا) "شرع" اور "شریعۃ" اس راستے
کو کہتے ہیں جو پانی کی طرف جاتا ہو اور وہاں جا کر ختم ہوتا ہو اور دین کو شریعت اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حقائق اور ایسی تعلیمات
تک پہنچاتا ہے جو پاکیزگی، طہارت اور انسانی زندگی کا سرمایہ ہیں "نہج" اور "منہاج" واضح راستے کو کہتے ہیں راغب
نے مفردات میں ابن عباس سے نقل کیا ہے۔

"شرعۃ" اور "منہاج" میں یہ فرق ہے کہ "شرعۃ" اسے کہا جاتا ہے جو قرآن میں وارد ہوا ہے اور منہاج سے مراد وہ امور ہیں جو سنت پیغمبرؐ میں وارد ہوئے ہیں۔

یہ فرق اگرچہ جاذب نظر ہے لیکن اس کے لیے کوئی قطعی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔[1]

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: خدا میں یہ طاقت تھی کہ وہ تمام لوگوں کو ایک ہی امت قرار دے دیتا اور سب کو ایک ہی دین کا پیرو بنا دیتا لیکن یہ بات تدریجی تکامل کے قانون اور مختلف تربیتی مراحل کے اصول سے مناسبت نہیں رکھتی تھی (ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولکن لیبلوکم فیما اتاکم)۔

لیبلوکم فیما اتاکم ــــ یعنی تاکہ تمھیں ان چیزوں کے متعلق آزمائے جو تمھیں دی گئی ہیں۔

یہ جملہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں اور وہ یہ کہ خدا نے وجود انسانی میں مختلف قسم کی استعدادیں اور صلاحیتیں پیدا کی ہیں اور وہ آزمائشوں کے ذریعے اور تعلیمات انبیاء کے ذریعے لوگوں کی تربیت اور پرورش کرتا ہے۔ اسی لیے ایک مرحلہ طے کرنے کے بعد انھیں بالاتر مرحلے میں لے جاتا ہے ایک دور کے ختم ہونے پر دوسرے پیغمبر کے ذریعے بالاتر دور میں لے جاتا ہے بالآخر تمام اقوام و ملل کو مخاطب کر کے دعوت دیتا ہے کہ بجائے اس کے کہ اپنی توانائیاں اختلافات و مشاجرات میں صرف کرو، نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو (فاستبقوا الخیرات) کیونکہ سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور وہی روز قیامت ان چیزوں سے آگاہ کرے گا، جن میں تم اختلاف کرتے ہو (الی اللہ مرجعکم جمیعًا فینبئکم بما کنتم فیہ تختلفون)۔

۴۹۔ وَ اَنِ احۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّصِيۡبَهُمۡ بِبَعۡضِ ذُنُوۡبِهِمۡ ؕ وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوۡنَ ○

۵۰۔ اَفَحُكۡمَ الۡجَاهِلِيَّةِ يَبۡغُوۡنَ ؕ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكۡمًا لِّقَوۡمٍ

---

[1] بعض بزرگ مفسرین کا نظریہ ہے کہ دین اور شریعت کے درمیان فرق یہ ہے کہ دین توحید اور دیگر اصول سے عبارت ہے جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں اسی لیے دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے لیکن شریعت ایسے قوانین و احکام کو کہا جاتا ہے جو ان مذاہب میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔
لیکن ہمارے پاس اس فرق کے لیے بھی کوئی واضح دلیل نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں الفاظ بہت سے مواقع پر ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

يُوْقِنُوْنَ ۝

## ترجمہ

۴۹۔ اور ان (اہل کتاب) کے درمیان تمھیں اس کے مطابق حکم کرنا چاہیے جو خدا نے نازل کیا ہے اور انکی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو اور اس سے بچو کہ کہیں تمھیں وہ بعض ایسے احکام سے منحرف کردیں جو تم پر نازل ہوئے ہیں اور اگر وہ (تمھارے کام اور فیصلے سے) روگردانی کریں تو جان لو کہ خدا چاہتا ہے کہ ان کے کچھ گناہوں کے بدلے انھیں سزا دے اور بہت سے لوگ فاسق ہیں۔

۵۰۔ کیا وہ (تم سے) زمانۂ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور اہلِ ایمان کے لیے خدا سے بہتر حکم کون کرسکتا ہے۔

## شانِ نزول

بعض مفسرین نے اس پہلی آیت کی شانِ نزول میں ابن عباس سے نقل کیا ہے،

یہودیوں کے بڑوں کی ایک جماعت نے آپس میں سازش کی اور کہا کہ محمد (ص) کے پاس جاتے ہیں۔ شاید اسے ہم اس کے دین سے منحرف کردیں۔ یہ طے کرکے وہ پیغمبر اسلام کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم یہودیوں کے علماء اور اشراف ہیں، اگر ہم آپ کی پیروی کرلیں تو مسلّم ہے کہ باقی یہودی ہماری اقتداء کریں گے لیکن ہمارے اور ایک اور گروہ کے درمیان ایک نزاع ہے (ایک شخص کے قتل یا کسی اور بات کے بارے میں) اگر اس جھگڑے میں آپ ہمارے فائدے میں فیصلہ کردیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

اس پر پیغمبر اسلامؐ نے ایسے (غیر عادلانہ) فیصلے سے منہ موڑ لیا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی[1]

## تفسیر

اس آیت میں خدا تعالیٰ دوبارہ اپنے پیغمبر کو تاکید کرتا ہے کہ اہلِ کتاب کے درمیان حکم خدا کے مطابق فیصلہ کریں، اور ان کی ہوا و ہوس کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کریں (وان احکم بینھم بما انزل الله ولا تتبع اھواءھم)۔

---

[1] تفسیر المنار ج ۶ ص ۴۲۱

اس حکم کی تکرار یا تو ان مطالب کی وجہ سے ہے جو آیت کے ذیل میں آئے ہیں یا اس بنا پر ہے کہ اس فیصلے کا موضوع گذشتہ آیات کے فیصلے کے موضوع سے مختلف ہے۔ گذشتہ آیات میں موضوع زنائے محصنہ تھا اور یہاں موضوع قتل یا کوئی اور جھگڑا تھا۔

اس کے بعد پیغمبر کو متوجہ کیا گیا ہے کہ انھوں نے سازش کی ہے کہ تمھیں آئین حق و عدالت سے روگرداں کر دیں تم ہوشیار اور آگاہ رہو( واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک )۔

اور اگر اہلِ کتاب تمھارے عادلانہ فیصلے کے سامنے سر نہیں جھکاتے تو جان لو کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان کے گناہوں نے ان کا دامن پکڑ رکھا ہے اور ان سے توفیق سلب ہو چکی ہے اور خدا چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کی وجہ سے انھیں سزا دے (فان تولوا فاعلم انما یرید اللہ ان یصیبھم ببعض ذنوبھم )۔

تمام گناہوں کی بجائے بعض گناہوں کا ذکر ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ تمام گناہوں کی سزا اس دنیا میں انجام نہیں پاتی صرف کچھ سزا انسان کو ملتی ہے اور باقی معاملہ دوسرے جہان کے سپرد ہو جاتا ہے۔

انھیں کون سی سزا دامن گیر ہوئی، اس کی آیت میں کوئی صراحت نہیں ہے لیکن احتمال ہے کہ یہ اسی انجام کی طرف اشارہ ہے، جس سے مدینہ میں یہودی دوچار ہوئے۔ وہ اپنی پے در پے خیانتوں کے باعث اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ سے باہر چلے جانے پر مجبور ہوئے یا یہ کہ سلبِ توفیق ان کے لیے ایک سزا شمار ہوئی ہو۔ دوسرے لفظوں میں پیہم گناہ اور ہٹ دھرمی کی سزا عادلانہ احکام سے محرومی اور بے راہ و سرگرداں زندگی کی صورت میں انھیں ملی ہو۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اگر یہ لوگ راہِ باطل میں ڈٹے ہوئے ہیں تو تم پریشان نہ ہونا کیونکہ بہت سے لوگ فاسق ہیں( وان کثیرا من الناس لفاسقون )۔

## ایک سوال اور اس کا جواب

ہو سکتا ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ زیرِ بحث آیت اس امر پر دلیل ہے کہ پیغمبر بھی حق سے انحراف کر سکتے ہیں لہٰذا خدا انھیں تنبیہ کر رہا ہے تو کیا یہ بات انبیاء کے معصوم ہونے کے مقام سے مناسبت رکھتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ معصوم ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ پیغمبر اور امام کے لیے گناہ محال ہے ورنہ ان کے لیے ایسی عصمت میں تو کوئی فضیلت نہ ہوگی بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ گناہ کی طاقت رکھنے کے باوجود گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اگرچہ یہ مرتکب نہ ہونا تذکراتِ الٰہی کی وجہ سے ہی ہو۔ دوسرے لفظوں میں خدائی توجہات گناہ سے پیغمبر کے محفوظ رہنے کا ایک عامل ہے۔

انبیاء اور آئمہ کے مقام عصمت کے بارے میں تفصیلی بحث انشاء اللہ آیت تطہیر (احزاب - ۳۳) کے ذیل میں آئے گی۔

بعد والی آیت میں استفہام انکاری کے طور پر فرمایا گیا ہے: کیا یہ لوگ آسمانی کتب کی پیروی کے مدعی ہیں،

توقع رکھتے ہیں کہ تم زمانہ جاہلیت کے احکام کی طرح اور تبعیض وامتیاز برتتے ہوئے ان کے درمیان قضاوت کرو (افحکم الجاھلیۃ یبغون) حالانکہ اہلِ ایمان کے لیے حکم خدا سے بہتر اور بالاتر کوئی فیصلہ نہیں ہے (ومن احسن من اللہ حکماً لقوم یوقنون)۔

جیسا کہ ہم گزشتہ آیات کے ذیل میں کہہ چکے ہیں کہ یہودیوں کے مختلف قبائل میں بھی عجیب وغریب امتیازات تھے۔ مثلاً اگر بنی قریظہ کا کوئی شخص بنی نضیر کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو قصاص لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس بنی نضیر کا کوئی شخص بنی قریظہ کے کسی شخص کو قتل کر دیتا تو قصاص نہ لیا جاتا یا یہ کہ دیت اور خون بہا عام دیت سے دوگنا لیتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسے امتیازات زمانہ جاہلیت کی نشانیاں ہیں۔ جبکہ خدائی احکام کی نظر میں بندگانِ خدا میں کوئی امتیاز نہیں۔

کافی میں امیرالمومنین علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

الحکم حکمان حکم اللہ وحکم الجاھلیۃ فمن اخطأ حکم اللہ حکم بحکم الجاھلیۃ

حکم صرف دو طرح کے ہیں۔ اللہ کا حکم یا جاہلیّت کا حکم۔ اور جو خدا کا حکم چھوڑ دے، اس نے جاہلیّت کا حکم اختیار کر لیا۔[1]

اس سے واضح ہوتا ہے آسمانی احکام کے حامل ہونے کے باوجود آج مسلمان دوسری اقوام وملل کے جعلی قوانین کے جو پیچھے پڑے ہوئے ہیں، درحقیقت جاہلیت کے راستے پر گامزن ہیں۔

۵۱۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

۵۲۔ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِىْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝ؕ

۵۳۔ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰٓؤُلَۤاءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ۝

---

[1] نور الثقلین جلد ۱ ص ۶۴۰

# ترجمہ

۵۱۔ اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا سہارا نہ بناؤ۔ وہ تو ایک دوسرے کے لیے سہارا ہیں اور جو ان پر بھروسہ کرتے ہیں وہ انہی میں سے ہیں اور خدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

۵۲۔ تم ایسے لوگوں کو دیکھتے ہو جن کے دلوں میں بیماری ہے جو (ایک دوسرے کی دوستی میں) ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہمیں کوئی حادثہ پیش نہ آئے (کہ جس میں ہمیں ان کی مدد کی ضرورت پڑے) شاید خدا کی طرف سے کوئی اور کامیابی یا واقعہ (مسلمانوں کے فائدے میں) رونما ہو جائے اور یہ لوگ اپنے دلوں میں جو کچھ چھپائے ہوئے ہیں اس پر پشیمان ہیں۔

۵۳۔ اور وہ جو ایمان لائے ہیں کہتے ہیں کیا یہ وہی (منافق) ہیں جو بڑی تاکید سے قسم کھاتے ہیں کہ وہ تمھارے ساتھ ہیں (ان کا معاملہ یہاں تک کیوں آپہنچا کہ) ان کے اعمال نابود ہو گئے اور وہ خسارے میں جا پڑے۔

## شانِ نزول

بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جنگ بدر کے بعد عبادہ بن صامت خزرجی پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: یہودیوں میں کچھ میرے ہم پیمان ہیں جو تعداد میں بہت ہیں اور طاقت ور ہیں، اب جبکہ وہ ہمیں جنگ کی دھمکی دے رہے ہیں اور مسلمانوں کا معاملہ غیر مسلموں سے الگ ہو گیا ہے تو میں ان کی دوستی اور عہد و پیمان سے برأت کا اظہار کرتا ہوں میرا ہم پیمان صرف خدا اور اس کا رسولؐ ہے۔

عبداللہ بن ابی کہنے لگا: میں تو یہودیوں کی ہم پیمانی سے براءت نہیں کرتا کیونکہ میں مشکل حوادث سے ڈرتا ہوں اور مجھے ان لوگوں کی ضرورت ہے۔

اس پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: یہودیوں کی دوستی کے سلسلہ میں مجھے جس بات کا ڈر عبادہ کے بارے تھا وہی تیرے متعلق بھی ہے (اور اس دوستی اور ہم پیمانی کا خطرہ اس کی نسبت تیرے لیے بہت زیادہ ہے)۔

عبداللہ کہنے لگا: اگر ایسی بات ہے تو میں بھی قبول کرتا ہوں اور ان سے رابطہ منقطع کر لیتا ہوں۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ سے دوستی کرنے سے ڈرایا گیا۔

# تفسیر

مندرجہ بالا آیات مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی دوستی اور ہم کاری سے شدت کے ساتھ ڈراتی ہیں، پہلی آیت میں

فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا سہارا اور ہم پیمان نہ بناؤ (یعنی خدا پر ایمان کا تقاضا ہے کہ مادی مفاد کے لیے ان سے ہم کاری اور دوستی نہ کرو) (یآیھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا الیھود و النصاریٰ اولیاء)۔

"اولیاء" "ولی" کی جمع ہے اور "ولایت" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے دو چیزوں کے درمیان بہت زیادہ قرب، نزدیکی اور دوستی۔ نیز اس میں ہم پیمان ہونے کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے لیکن آیت کی شانِ نزول اور باقی موجود قرائن کو مدنظر رکھا جائے تو پھر اس سے مراد یہاں یہ معنی نہیں کہ مسلمان یہود و نصاریٰ سے کوئی تجارتی اور سماجی رابطہ نہ رکھیں بلکہ مراد یہ ہے کہ ان سے عہد و پیمان نہ کریں اور دشمنوں کے مقابلے میں ان کی دوستی پر بھروسہ نہ کریں۔

عہد و پیمان کا مسئلہ اس زمانے میں عربوں میں بہت رائج تھا اور اسے "ولاء" سے تعبیر کرتے تھے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ یہاں "اہلِ کتاب" نہیں کہا گیا بلکہ یہود و نصاریٰ کہا گیا ہے۔ شاید یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر وہ اپنی آسمانی کتاب پر عمل کرتے تو پھر تمہارے اچھے ہم پیمان ہوتے لیکن ایک دوسرے سے ان کا اتحاد آسمانی کتاب کی رُو سے نہیں ہے بلکہ سیاسی اور نسلی اغراض پر مبنی ہے۔

اس کے بعد ایک مختصر سے جملے سے اس نہی کی دلیل بیان فرمائی گئی ہے،

ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک اپنے ہم مسلک لوگوں کے دوست اور ہم پیمان ہیں (بعضھم اولیاء بعض) یعنی جب تک ان کے اپنے اور ان کے دوستوں کے مفادات زد میں ہیں وہ تمہاری طرف ہرگز متوجہ نہیں ہوں گے۔ لہٰذا تم میں سے جو کوئی بھی ان سے دوستی کرے اور عہد و پیمان باندھے وہ اجتماعی اور مذہبی تقسیم کے لحاظ سے انہی کا جزو شمار ہوگا (ومن یتولھم منکم فانہ منھم)۔

اور اس میں شک نہیں کہ خدا ایسے ظالم افراد کو جو اپنے ساتھ اور اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ خیانت کریں اور دشمنوں پر بھروسہ کریں، ہدایت نہیں کرے گا (ان اللہ لا یھدی القوم الظٰلمین)۔

بعد والی آیت میں ان بہانہ تراشیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بیمار فکر افراد غیر سے اپنے غیر شرعی روابط کے لیے پیش کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: جن کے دلوں میں بیماری ہے وہ اصرار کرتے ہیں کہ انھیں اپنے لیے سہارا سمجھیں اور انھیں اپنا ہم پیمان بنائیں اور ان کا عذر یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ قدرت طاقت ان کے ہاتھ میں آجائے اور پھر ہم مصیبت میں گرفتار ہو جائیں (فتری الذین فی قلوبھم مرض یسارعون فیھم یقولون نخشٰی ان تصیبنا دائرۃ)[1]

---

[1] "دائرۃ" کا مادہ "دور" ہے اس کا معنی ہے ایسی چیز جو گردش میں ہو اور چونکہ تاریخ میں حکومت و سلطنت ہمیشہ گردش میں رہی ہے، اس لیے اسے دائرۃ کہتے ہیں۔ اسی طرح مختلف حوادث زندگی میں جو افراد کے گرد رہتے ہیں انھیں "دائرۃ" کہا جاتا ہے۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے : جیسے انھیں اس بات کا احتمال ہے کہ کسی دن طاقت یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھ آجائے گی اسی طرح انھیں یہ خیال بھی آنا چاہیے کہ آخرکار ہوسکتا ہے کہ خدا مسلمانوں کو کامیاب کرے اور قدرت وطاقت ان کے ہاتھ آجائے اور یہ منافق اپنے دلوں میں جو کچھ چھپائے ہوئے ہیں اس پر پشیمان ہیں ( فعسی اللہ ان یأتی بالفتح او امر من عندہ فیصبحوا علی ما اسروا فی انفسھم نادمین )۔

اس آیت میں درحقیقت انھیں دو طرح سے جواب دیا گیا ہے : پہلا یہ کہ ایسے خیالات بیمار دلوں سے اٹھتے ہیں اور ان لوگوں کے دلوں سے کہ جن کا ایمان متزلزل ہے اور وہ خدا کے بارے میں بدگمانی رکھتے ہیں ورنہ کوئی صاحب ایمان ایسے خیالات کو اپنے دل میں راہ نہیں دیتا اور دوسرا یہ کہ فرض کریں کہ ان کی کامیابی کا احتمال ہو بھی تو کیا مسلمانوں کی کامیابی کا احتمال نہیں ہے ؟

جو کچھ بیان کیا گیا ہے ، اس کی بنا پر " عسیٰ " کا مفہوم ہے " احتمال " اور " امید " اس سے اس لفظ کا ہر جگہ استعمال ہونے والا اصلی معنی برقرار رہتا ہے ۔ لیکن عام طور پر مفسرین نے یہاں خدا کی طرف سے مسلمانوں کے لیے ایک قطعی وعدہ مراد لیا ہے جو کہ لفظ "عسیٰ" کے ظاہری مفہوم سے مناسبت نہیں رکھتا ۔

لفظ " فتح " کے بعد " او امر من عندہ " کے جملے سے مراد یہ ہے کہ ممکن ہے مسلمان آئندہ زمانے میں اپنے دشمنوں پر جنگ اور اس میں کامیابی کی وجہ سے غالب آجائیں یا جنگ کے بغیر ان میں اتنی قدرت پیدا ہوجائے کہ دشمن جنگ کیے بغیر گھٹنے ٹیک دے دوسرے لفظوں میں لفظ " فتح " مسلمانوں کی فوجی کامیابیوں کی طرف اشارہ ہے اور امر من عندہ اجتماعی ، اقتصادی اور دیگر کامیابیوں کی طرف اشارہ ہے ۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ خدا یہ احتمال بیان کررہا ہے اور وہ آئندہ کی وضع وکیفیت سے آگاہ ہے لہٰذا یہ آیت مسلمانوں کی فوجی ، اجتماعی اور اقتصادی کامیابیوں کی طرف اشارہ ہی سمجھی جائے گی ۔

آخری آیت میں منافقین کے انجام کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : جب سچے مسلمانوں کو فتح وکامرانی نصیب ہوجائے اور منافقین کا معاملہ اَلَم نشرح ہوجائے تو " مومنین تعجب سے کہیں گے کہ کیا یہ منافق لوگ وہی نہیں ہیں کہ دعویٰ کرتے تھے اور قسمیں کھاتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ ہیں اب ان کا یہ انجام کیوں ہوا ہے " ( و یقول الذین اٰمنوا اھؤلاء الذین اقسموا باللہ جھد ایمانھم انھم لمعکم )[1] اور اسی نفاق کی وجہ سے ان کے تمام اعمال باطل اور نابود ہوگئے کیونکہ ان کا سرچشمہ پاک اور خالص نیک نہ تھی اور " اسی بنا پر وہ اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی خسارے میں ہیں " ( حبطت اعمالھم فاصبحوا خاسرین )۔

دراصل آخری جملہ سوال مقدر کے جواب کی طرح ہے گویا کوئی پوچھتا ہے کہ ان کا انجام کار کیا ہوگا تو ان کے جواب میں کہا گیا ہے کہ ان کے اعمال بالکل برباد ہوگئے ہیں اور انھیں خسارا اٹھانا پڑا ہے ۔ یعنی اگر انھوں نے نیک اعمال خلوص سے

---

[1] مذکورہ بالا آیت میں " ھؤلاء " مبتدا ہے اور " الذین اقسموا باللہ " اسکی خبر ہے اور " جھد ایمانھم " مفعول مطلق ہے ۔

بھی انجام دیئے ہوں لیکن آخرکار انھوں نے چونکہ نفاق اور شرک اختیار کیا ہے لہٰذا ان کے اعمال برباد ہوگئے ہیں جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد دوم (ص ۔۔ اردو ترجمہ) سورہ بقرہ آیہ ۲۱۷ کے ذیل میں بیان کیا جا چکا ہے۔

## غیروں پہ تکیہ

شانِ نزول میں تو عبادہ بن صامت اور عبداللہ بن ابی کی گفت گو آئی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ آیات صرف دو تاریخی شخصیتوں کے مابین ہونے والی گفتگو کے حوالے ہی سے نہیں دیکھی جا سکتیں بلکہ وہ دونوں دو معاشرتی مکاتبِ فکر کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ایک مکتب کہتا ہے کہ دشمن سے الگ رہنا چاہیے اور اپنی مہار اس کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہیے اور اس کی امداد پر اطمینان نہیں کرنا چاہیے۔ جبکہ دوسرا مکتبِ فکر کہتا ہے کہ اس ہنگامہ خیز دنیا میں ہر شخص اور ہر قوم کو ایک سہارے کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ غیروں میں سے کسی کو سہارا بنا لیا جائے اور غیروں کی دوستی بھی قدر و قیمت کی حامل ہے اور ایک دن وہ ثمر بخش ثابت ہوگی۔

قرآن دوسرے مکتب کی شدت سے سرکوبی کرتا ہے اور مسلمانوں کو اس طرزِ فکر سے تاکیداً ڈراتا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض مسلمان یہ عظیم خدائی حکم بھلا چکے ہیں اور غیروں میں سے بعض پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کی بہت سی بدبختیوں کا سرچشمہ یہی چیز ہے۔

اندلس اس کی زندہ نشانی ہے۔ کل کے اندلس اور آج کے اسپانیہ میں مسلمانوں نے کیسے اپنی قوت و طاقت کے بل پر ایک درخشاں تمدن کی بنیاد رکھی اور پھر غیروں پر بھروسہ کر کے کیسے اس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس کی دوسری دلیل عظیم عثمانی بادشاہت ہے جو تھوڑی ہی مدت میں گرمیوں میں پگھل جانے والی برف کی طرح بہہ گئی۔

دورِ حاضر میں اس مکتب سے منحرف ہونے سے مسلمانوں نے جو کاری ضربیں کھائی ہیں وہ بھی کم نہیں ہیں لیکن تعجب ہے کہ ہم اب بھی کیوں بیدار نہیں ہوتے۔

غیر بہرحال غیر ہی ہے۔ مشترک مفادات کی خاطر اگر کوئی غیر چند قدم ہمارے ساتھ چلے بھی تو آخرکار حساس لمحات میں نہ صرف یہ کہ وہ ساتھ چھوڑ دے گا بلکہ ہم پر کاری ضربیں بھی لگائے گا۔ چاہیے یہ کہ آج کا مسلمان اس قرآنی صدا پر سب سے زیادہ کان دھرے اور اپنی طاقت کے علاوہ کسی پر بھروسہ نہ کرے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جنگِ اُحد کے موقع پر جب بہت سے یہودی مشرکین کے خلاف جنگ کے لیے آپ سے آملے تو آپ نے دورانِ راہ ہی انھیں واپس کر دیا اور ان کی مدد قبول نہ فرمائی۔ حالانکہ یہ تعداد جنگِ اُحد میں ایک مؤثر کردار ادا کر سکتی تھی آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ کچھ بعید نہ تھا کہ وہ جنگ کے حساس لمحات میں دشمن سے مل جاتے اور بچے کھچے لشکرِ اسلام کو بھی ختم کر دیتے۔

۵۴۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۤئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○

## ترجمہ

۵۴۔ اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا (وہ خدا کا کوئی نقصان نہیں کرے گا) خدا آئندہ ایک ایسا گروہ لے آئے گا جسے وہ دوست رکھتا ہے اور وہ لوگ (بھی) اسے دوست رکھتے ہیں۔ جو مومنین کے سامنے متواضع اور کفّار کے مقابلے میں طاقت ور ہیں وہ راہِ خدا میں جہاد کرتے ہیں اور سرزنش کرنے والوں کی سرزنش سے نہیں ڈرتے۔ یہ خدا کا فضل و کرم ہے، وہ جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) عطا کرتا ہے اور (خدا کا فضل) وسیع ہے، اور خدا جاننے والا ہے۔

## تفسیر

منافقین کے بارے میں بحث کے بعد مرتدین کے سلسلے میں گفتگو ہے کہ جو قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق اس دین سے خارج ہو جائیں گے۔ لیکن خدا، اس کے دین نیز مسلمانوں اور اسلامی معاشرے کی تیز رفتار پیش رفت کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ کیونکہ خدا آئندہ اس دین کی حمایت کے لیے ایک اور گروہ کو مبعوث کرے گا (یا ایھا الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یأتی اللہ بقوم)۔

اس کے بعد ان لوگوں کی جو یہ عظیم کار رسالت انجام دیں گے، یہ صفات بیان فرمائی گئی ہیں،

پہلی یہ کہ وہ خدا کے عاشق ہوں گے اور اس کی خوشنودی کے سوا انھیں کوئی فکر دامن گیر نہ ہوگی "خدا انھیں پسند کرتا ہے اور وہ خدا سے محبت کرتے ہیں" (یحبھم و یحبونہ)

دوسری اور تیسری صفت ان لوگوں کی یہ ہے کہ وہ مومنین کے لیے منکسر المزاج اور مہربان ہیں جبکہ دشمنوں اور ستم گروں کے مقابلے میں مضبوط، سخت اور طاقت ور ہیں (اذلۃ علی المؤمنین اعزۃ علی الکافرین)۔

چوتھی صفت ان کی یہ ہے کہ راہِ خدا میں جہاد کرنا ان کے مسلسل پروگرام میں شامل ہے (یجاھدون فی سبیل اللہ)۔

پانچویں خصوصیت ان کی یہ ہے کہ وہ فرمانِ الٰہی کی انجام دہی اور دفاعِ حق کی راہ میں کسی ملامت کرنیوالے کی ملامت سے نہیں ڈرتے (ولا یخافون لومۃ لائم)۔

درحقیقت وہ جسمانی طاقت کے علاوہ ایسا عزم رکھتے ہیں کہ غلط رسومات کو توڑنے اور انحراف کرنے والی اکثریت کو خاطر میں نہیں لاتے کثرت کے زعم میں دوسروں کا مذاق اڑانے والوں کی پرواہ نہیں کرتے۔

ہم ایسے بہت سے افراد کو جانتے ہیں کہ جو ممتاز صفات کے حامل ہیں لیکن معاشرے کی غلاف، عوام کے افکار و نظریات اور منحرف اکثریت کے سامنے بہت محتاط ہو جاتے ہیں اور ان کے سامنے بزدلی اور کم ہمتی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان کے مقابلے میں بہت جلد میدان سے ہٹ جاتے ہیں حالانکہ ایک مصلح اور رہبر اور اس کے افکار کی تبلیغ و ترویج کے لیے میدان میں اترنے والوں کے لیے ہر چیز سے پہلے شہامت و جراءت کی ضرورت ہے۔ عوام اور ماحول سے ڈر جانے سے اصلاح نہیں ہو سکتی اور ان سے خوفزدہ ہونا بلند روحانی امتیاز کے منافی ہے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے: ان امتیازات و خصوصیات کا حصول (انسانی کوشش کے علاوہ) خدا کے فضل و کرم کا مرہونِ منت ہے وہ جسے چاہتا اور اہل پاتا ہے عطا کرتا ہے (ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشآء)۔

وہی ذات ہے جس کا دائرہ فضل و کرم بہت وسیع ہے اور جو اس کی لیاقت و اہلیت رکھتے ہیں، ان سے آگاہ ہے (واللہ واسع علیم)

اس سلسلے میں کہ مندرجہ بالا آیت کن یاورانِ اسلام کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور خدا تعالیٰ یہاں کن افراد کی خصوصیات بیان فرما رہا ہے روایاتِ اسلامی اور اقوالِ مفسرین میں اس سلسلے میں بڑی بحث کی گئی ہے۔ تاہم شیعہ سنی طرق سے وارد ہونے والی بہت سی روایات میں ہے کہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں فتح خیبر کے موقع پر یا ناکثین، قاسطین اور مارقین سے ان کی جنگ کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے[1]۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ لشکرِ اسلام کے بعض کمانڈر جب خیبر کو فتح نہ کر سکے تو اس کے بعد ایک رات پیغمبرِ اسلام نے مرکزِ فوج میں ان کی طرف رُخ کر کے فرمایا:

> لاعطین الرایۃ غدًا رجلا، یحب اللہ ورسولہ ویحبہ اللہ ورسولہ، کرارا غیر فرار، لایرجع حتی یفتح اللہ علی یدہ۔
>
> بخدا کل عَلَم ایسے مرد کو دوں گا جو خدا اور رسول سے محبت رکھتا ہے اور خدا اور رسول بھی اس سے محبت رکھتے ہیں۔ وہ بڑھ بڑھ کر دشمنوں پر حملہ کرنے والا ہے اور کبھی پشت نہیں دکھاتا اور وہ اس میدان سے اس وقت تک پلٹ کر نہیں آئے گا، جب تک خدا اس کے ہاتھ سے مسلمانوں کو فتح نصیب نہیں

---

[1] یاد رہے کہ ناکثین جنگ جمل کی آگ بھڑکانے والوں کو، قاسطین معاویہ کی فوج کو اور مارقین خوارج کو کہا جاتا ہے۔

کر دیتا ہے[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ سے لوگوں نے اس بارے میں سوال کیا تو آپ نے سلمان کے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا:

اس سے یہ، اس کے یار و انصار اور ہم وطن لوگ مراد ہیں۔

اس طرح آپؐ نے اہلِ ایران کے اسلام لانے اور اسلام کی پیش رفت کے لیے ان کی ثمر بخش کاوشوں اور جستجو کی پیش گوئی فرمائی ہے۔ اس کے بعد آپؐ نے مزید فرمایا:

"لو کان الدین معلقاً بالثریا لتناوله رجال من ابناء الفارس"

اگر دین ثریا پر جا ٹھہرتا اور آسمانوں میں جا پہنچتا تو بھی فارس کے لوگ اسے دستیاب کر لیتے[2]

ایک اور روایت میں "دین" کی جگہ "علم" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

بعض اور روایات میں ہے کہ آیت حضرت مہدی علیہ السلام کے یار و انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اپنی پوری طاقت سے ان لوگوں کے مقابلے میں قیام کریں گے جو دینِ حق و عدالت سے مرتد ہو جائیں گے اور وہ دنیا کو ایمان و عدل سے معمور کر دیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ روایات جو اس آیت کی تفسیر کے بارے میں مروی ہیں باہم کوئی تضاد نہیں رکھتیں کیونکہ یہ آیت قرآن کی سیرت کے مطابق ایک کلی اور جامع مفہوم بیان کرتی ہے اور اس کے اہم مصادیق میں حضرت علی علیہ السلام، سلمان فارسی اور وہ لوگ شامل ہیں جو اس پروگرام کے مطابق چلیں گے چاہے روایات میں ان کا ذکر نہ بھی ہو۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس آیت کے بارے میں بھی قومی تعصبات کے باعث جو لوگ اہلیت نہیں رکھتے تھے اور آیت میں مذکورہ صفات میں سے کوئی بھی ان میں نہ تھی انھیں بھی آیت کا مصداق ٹھہرایا گیا اور انھیں بھی شانِ نزول کا عنوان بنا لیا گیا یہاں تک کہ ابو موسیٰ اشعری کو بھی آیت کے مصادیق میں شمار کر لیا گیا جس نے اپنی بے مثال تاریخی حماقت سے اسلام کو ہلاکت کے گڑھے تک پہنچا دیا اور علمدارِ اسلام حضرت علی علیہ السلام کو[3]

---

[1] تفسیر برہان اور نور الثقلین میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے اس بارے میں کئی ایک روایات نقل کی گئی ہیں۔ اہل سنت کے علماء میں سے ثعلبی نے ان روایات کو نقل کیا ہے (کتاب احقاق الحق ج ۳، ص ۲۰۰ کی طرف رجوع فرمائیں)۔

[2] مجمع البیان جلد ۳ ص ۲۰۸، نور الثقلین جلد ۱ ص ۶۴۲۔ ابو نعیم اصفہانی نے حلیۃ المتقین جلد ۶ ص ۶۴ میں حدیث کی یہ عبارت نقل کی ہے:

"لو کان العلم منوطاً بالثریا لتناوله رجال من ابناء الفارس"

یعنی ابن عبد البر نے استیعاب جلد ۲ ص ۵۷۰ میں یہ عبارت نقل کی ہے:

"لو کان الدین عند الثریا لناله سلمان....."

[3] تفسیر طبری جلد ششم صفحہ ۱۸۴۔ لیکن بعض روایات میں صرف ابو موسیٰ کی قوم کا نام آیا ہے جو کہ اہل یمن کی طرف اشارہ ہے۔ جنھوں نے نہایت حساس موقع پر اسلام کی مدد کی اور ابو موسیٰ اس میں شامل نہیں ہے جبکہ حضرت سلمان کے بارے میں جو روایات ہیں ان کے مطابق وہ خود اور ان کی قوم اس آیت کی مصداق ہیں۔

ایک سخت تنگ موڑ پر پہنچا دیا۔

اس جلد کے آخری حصے کی اصلاح کا کام میں نے مکہ مکرمہ میں جوار خانۂ خدا میں انجام دیا جب کہ وہاں عمرہ کے پرشکوہ مراسم بھی انجام پا رہے تھے۔ اس وقت میرے ہاتھ میں درد تھا اور قلم تک پکڑنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ایسے میں میں نے محسوس کیا کہ وہی تعصبات جو علمی کتب میں دکھائی دیتے ہیں آج بھی شدید پیمانے پر یہاں عوام میں بلکہ ان علماء میں دکھائی دیتے ہیں اور ایسے لگتا ہے جیسے کوئی ہاتھ درمیان میں کام کر رہا ہے تاکہ مسلمان کبھی متحد نہ ہوں۔ یہاں تک کہ یہ تعصب تاریخ اسلام سے پہلے کے ایام تک بھی جا پہنچا ہے۔ خانہ کعبہ کے نزدیک جس شاہراہ کا نام اس وقت شارع ابوسفیان ہے وہ شارع ابراہیم الخلیل جو بانی مکہ کے نام پر ہے سے زیادہ شکوہ مند ہے۔

آج یہاں مسلمانوں کی طرف "شرک" کی نسبت دینا ایک متعصب گروہ کے لیے پانی کا گلاس پینے کے برابر ہے، ادھر آپ نے اپنے جسم کو حرکت دی اُدھر "مشرک" "مشرک" کی صدا بلند ہونے لگی۔ گویا اسلام ان کے گھر کی باندی ہے اور وہی قرآن کے متولی ہیں اور بس۔ اور دوسروں کا اسلام و کفران کی پسند اور ناپسند پر منحصر ہے کہ ایک لفظ کے ساتھ جسے چاہیں مشرک اور جسے چاہیں مسلمان کہہ دیں۔

حالانکہ مندرجہ بالا آیات کے ذیل میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ جب اسلام کی غربت کا دور ہوگا، خدا تعالیٰ سلمان جیسے بزرگ عظمت دین کے لیے بھیجے گا اور یہ پیغمبرؐ کی دی ہوئی بشارت ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ مسئلہ توحید جسے وحدت مسلمین کی بنیاد ہونا چاہیے۔ آج مسلمانوں کی صفوں میں انتشار اور انھیں مشرک و کافر قرار دینے کے لیے دستاویز بن چکا ہے۔ یہاں تک کہ ایک آگاہ شخص نے ان کے بعض متعصبین سے کہا تھا:

> ذرا دیکھو! ہمارا اور تمھارا معاملہ کہاں تک جا پہنچا ہے کہ اگر اسرائیل ہم پر مسلط ہو جائے تو تم میں سے کچھ لوگ خوش ہوں گے اور اگر تمھاری سرکوبی کرے تو ہم میں سے بعض لوگ خوشی منائیں گے۔ کیا یہی وہ (اسرائیل اور اس کے سرپرست) نہیں چاہتے؟

انصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ان کے بعض علماء سے جو میں نے متعدد بار ملاقات کی ہے اس سے یہ واضح ہوا ہے کہ اکثر با فہم اور سمجھدار حضرات اس کیفیت پر پریشان ہیں۔ ایک مرتبہ ایک سنی عالم حدود شرک کے بارے میں بحث کے سلسلے میں بہت سے بزرگ مدرسین حرم کے سامنے کہنے لگے:

> اہلِ قبلہ کو شرک کی نسبت دینا بہت بڑا گناہ ہے جسے گزشتہ لوگ زیادہ اہمیت دیتے رہے ہیں۔ یہ کیا ہے کہ نافہم لوگ ہر وقت لوگوں پر شرک کی تہمت لگاتے رہتے ہیں کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اس طرح اپنے اوپر کتنی بڑی ذمہ داری لے رہے ہیں۔

۵۵۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ

يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝

## ترجمہ

۵۵۔ تمھارا سرپرست اور رہبر صرف خدا، اس کا پیغمبر اور وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں، انھوں نے نماز قائم کی ہے اور حالت رکوع میں زکوٰۃ ادا کی ہے۔

## شانِ نزول

### آیۂ ولایت

تفسیر مجمع البیان اور دوسری کتُب میں عبداللہ ابن عباس سے منقول ہے:

ایک روز میں چاہِ زمزم کے پاس بیٹھا تھا اور لوگوں کو ارشاداتِ رسولؐ سنا رہا تھا کہ اچانک ایک شخص قریب آیا۔ اس کے سر پر عمامہ تھا۔ اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ جب میں پیغمبر اسلامؐ سے کوئی حدیث نقل کرتا تو وہ بھی "قال رسول اللہ" کہہ کر دوسری حدیثِ رسولؐ بیان کر دیتا۔

ابن عباس نے اس شخص کو قسم دی کہ وہ اپنا تعارف کروائے تو اس نے اپنے چہرے سے نقاب الٹ دی اور پکار کر کہا اے لوگو!

جو شخص مجھے نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں ابوذر غفاری ہوں۔ ان کانوں سے میں نے خود رسول اللہؐ سے سنا ہے اور اگر میں جھوٹ بولوں تو میرے دونوں کان بہرے ہو جائیں، رسول اللہؐ نے فرمایا:

"علی قائد البررة و قاتل الکفرة منصور من نصره مخذول من خذله"

یعنی ـــــ علی نیک اور پاک لوگوں کے قائد ہیں اور کفار کے قاتل ہیں جو ان کی نصرت و مدد کرے خدا اس کی مدد کرے گا اور جو شخص ان کی نصرت و مدد سے ہاتھ کھینچ لے خدا بھی اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لے گا۔

اس کے بعد ابوذر نے مزید کہا:

اے لوگو! ایک دن میں رسولِ خدا کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک سائل مسجد میں داخل ہوا اور لوگوں سے مدد طلب کی لیکن کسی نے اسے کچھ نہ دیا تو اس نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے کہا: خدایا! گواہ رہنا کہ میں نے تیرے رسولؐ کی مسجد میں مدد طلب کی ہے

لیکن کسی نے مجھے جواب تک نہیں دیا۔ ایسی حالت میں جبکہ حضرت علی رکوع میں تھے اپنے دائیں ہاتھ کی چھنگلی سے اشارہ کیا۔ سائل قریب آیا اور انگوٹھی آپ کے ہاتھ سے اتار لی پیغمبر خدا نے جو حالتِ نماز میں تھے اس واقعہ کو دیکھا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو سر آسمان کی طرف بلند کیا اور اس طرح کہا:

خدایا! میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے سوال کیا تھا کہ ان کی روح کو وسعت دے اور ان کے کام ان پر آسان کر دے اور ان کی زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ ان کی گفتار کو سمجھ سکیں۔ نیز موسیٰ نے سوال کیا کہ ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر اور یار و مددگار قرار دے اور ان کے ذریعے ان کی قوت میں اضافہ فرما اور انھیں ان کے کاموں میں شریک کر دے خداوندا! میں محمد تیرا رسول اور برگزیدہ ہوں میرے سینہ کو کھول دے، میرے کام مجھ پر آسان کر دے اور میرے خاندان میں سے علی کو میرا وزیر بنا دے تاکہ اس کی وجہ سے میری کمر مضبوط اور قوی ہو جائے۔

ابوذر کہتے ہیں:

ابھی پیغمبر خدا کی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ جبرئیل نازل ہوئے اور رسول اللہ سے کہا:

پڑھیے!

حضورؐ نے فرمایا:

کیا پڑھوں؟

تو جبرئیل نے کہا:

پڑھیے! انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین اٰمنوا.......

یہ شانِ نزول (جیسا کہ بیان کیا جائے گا) تفصیلات کے کچھ اختلاف کے ساتھ مختلف طرق سے نقل ہوئی ہے البتہ اصل اور بنیاد سب روایات کی ایک ہی ہے۔

## تفسیر

یہ آیت لفظ "انما" سے شروع ہوتی ہے۔ یہ لفظ لغتِ عرب میں حصر و انحصار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: تمہارے ولی، سرپرست اور تمہارے امور میں حق تصرف رکھنے والی تین ہستیاں ہیں، خدا، اس کا رسول اور وہ جو ایمان لائے، نماز قائم کی اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں (انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین اٰمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ و یؤتون الزکوٰۃ و ھم راکعون)۔

اس میں شک نہیں کہ لفظ "رکوع" اس آیت میں نماز کے رکوع کے معنی میں ہے نہ کہ خضوع و خشوع کے معنی میں

کیونکہ عرفِ شریعت اور اصطلاحِ قرآن میں جب رکوع کہا جائے تو اسی مشہور معنی میں یعنی نماز کے رکوع کے معنی میں ہوگا۔
نیز آیت کی شانِ نزول اور متعدد روایات جو حضرت علیؑ کے حالتِ رکوع میں انگوٹھی عطا فرمانے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں کہ جنھیں ہم تفصیل سے ذکر کریں گے کے علاوہ "یقیمون الصلٰوۃ" بھی اس بات پر شاہد ہے۔ قرآن میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ جس میں یہ ہو کہ زکوٰۃ خضوع سے ادا کرو بلکہ زکوٰۃ کو خلوصِ نیت سے اور احسان جتلائے بغیر ادا کرنا چاہیے۔

اسی طرح اس میں بھی شک نہیں کہ لفظ "ولی" اس آیت میں دوست یا مددگار کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ دوستی اور مدد کرنے کے معنی میں ولایت نماز پڑھنے والوں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کرنے والوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ وہ تو ایک عمومی حکم ہے جو تمام مسلمانوں پر محیط ہے۔ تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے سے دوستی رکھیں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ یہاں تک کہ وہ بھی جن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جن کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس پر زکوٰۃ ادا کریں چہ جائیکہ وہ حالتِ رکوع میں زکوٰۃ ادا کریں انھیں بھی چاہیے کہ ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہوں۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں "ولی" سے مراد ولایت بمعنی سرپرستی، تصرف اور مادی و روحانی رہبری اور قیادت ہے خصوصاً جبکہ یہ ولایت ولایتِ الٰہی اور ولایت پیغمبرؐ کے ہم پلہ قرار پائی ہے اور تینوں کو ایک ہی لفظ کے تحت بیان کیا گیا ہے۔

اس طرح سے یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو حضرت علیؑ کی امامت و ولایت پر نصِ قرآنی کی حیثیت سے دلالت کرتی ہیں۔

اس موقع سے متعلق کچھ اہم بحثیں ہیں جن پر ہم علیحدہ علیحدہ تحقیق کرتے ہیں۔

## احادیث، مفسرین اور مؤرخین کی شہادت

جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ بہت سی اسلامی کتب اور اہل سنت کے منابع میں اس ضمن میں متعدد روایات موجود ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے ان میں سے بعض روایات میں حالتِ رکوع میں انگوٹھی دینے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جب کہ بعض میں اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ بلکہ فقط اس آیت کے حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے کا ہی مذکور ہے۔

اس روایت کو ابن عباس، عمار ابن یاسر، عبداللہ بن سلام، سلمہ بن کہیل، انس بن مالک، عتبہ بن حکیم، عبداللہ ابی، عبداللہ بن غالب، جابر بن عبداللہ انصاری اور ابوذر غفاری نے بیان کیا ہے۔[1]

ان مذکورہ دس افراد کے علاوہ اہلِ سنت کی کتب میں یہ روایت خود حضرت علیؑ سے بھی نقل ہوئی ہے۔[2]

---

[1] احقاق الحق ج ۲ ص ۳۹۹ تا ۴۱۰ سے رجوع کریں۔

[2] المراجعات ص ۱۵۵

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ کتاب غایۃ المرام میں اس بارے میں ۲۴ احادیث کتبِ اہلِ سنت سے اور ۱۹ احادیث طرقِ شیعہ سے نقل کی گئی ہیں[1]

مشہور کتب کہ جن میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے تیس سے متجاوز ہیں جو کہ سب اہلِ سنت کے منابع و مصادر میں سے ہیں، ان میں سے یہ بھی ہیں:

۱۔ ذخائر العقبیٰ ص ۸۸ از محب الدین طبری
۲۔ تفسیر فتح القدیر ج ۲ ص ۵۰ از علامہ قاضی شوکانی
۳۔ جامع الاصول ج ۹ ص ۴۷۸
۴۔ اسباب النزول ص ۱۴۸ از واحدی
۵۔ لباب النقول ص ۹۰ از سیوطی
۶۔ تذکرۃ ص ۱۸ از سبط ابن جوزی
۷۔ نور الابصار ص ۱۰۵ از شبلنجی
۸۔ تفسیر طبری ص ۱۶۵
۹۔ الکافی الشاف ص ۵۶ از ابن حجر عسقلانی
۱۰۔ مفاتیح الغیب ج ۳ ص ۴۳۱ از رازی
۱۱۔ در المنثور ج ۲ ص ۲۹۳ از سیوطی
۱۲۔ کنز العمال ج ۶ ص ۳۹۱
۱۳۔ مسند ابن مردویہ
۱۴۔ مسند ابن الشیخ
۱۵۔ صحیح نسائی
۱۶۔ الجمع بین الصحاح الستہ

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتب میں اس ضمن میں احادیث موجود ہیں[2]

ان حالات میں کیسے ہو سکتا ہے کہ ان تمام احادیث کی پرواہ نہ کی جائے جبکہ دیگر آیات کی شانِ نزول کے لیے ایک یا دو روایات پر قناعت کر لی جاتی ہے لیکن شاید تعصب اجازت نہیں دیتا کہ اس آیت کی شان نزول کے لیے ان سب روایات اور ان سب علماء کی گواہیوں کی طرف توجہ دی جائے۔

---

[1] منہاج البراعۃ ج ۲ ص ۳۵۰
[2] مزید تفصیل کے لیے احقاق الحق ج ۲، الغدیر ج ۲ اور المراجعات کی طرف رجوع کریں۔

اگر بنا یہ ہو کہ کسی آیت کے سلسلے میں اس قدر روایات کی بھی پرواہ نہ کی جائے تو پھر ہمیں قرآنی آیات کی تفسیر میں کسی بھی روایت کی طرف توجہ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ بہت کم آیات ایسی ہیں جن کی شانِ نزول میں اسقدر روایات وارد ہوئی ہوں۔

یہ مسئلہ اس قدر واضح و آشکار تھا کہ زمانۂ پیغمبرؐ کے مشہور شاعر حسّان بن ثابت نے حضرت علیؑ کی شان میں روایت کے مضمون کو اپنے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

فانت الذی اعطیت اذ کنت راکعًا

زکاتًا فدتك النفس یاخیر راکع

فانزل فیك الله خیر ولایة

وبینها فی محکمات الشرائع

یعنی ـــــ آپ وہ ہیں کہ جنھوں نے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دی۔ آپ پر جان فدا ہو۔ اے بہترین رکوع کرنے والے۔

اور اس کے بعد خدا نے بہترین ولایت آپ کے بارے میں نازل کی اور قرآنِ مجید میں اسے ثبت کر دیا[1]

## اعتراضات کا جواب

بعض متعصب اہلِ سنت نے اس آیت کے حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے سے انکار کیا ہے اور اسی طرح "ولایت" کی تفسیر سرپرستی، تصرّف اور امامت کرنے پر بھی اعتراض کیا ہے۔ ان میں سے اہم اعتراضات پر ہم یہاں تحقیق کرتے ہیں۔

۱۔ "الّذین" جمع کا صیغہ ہے: ایک اعتراض یہ ہے کہ آیت میں "الذین" جمع کا صیغہ ہے لہٰذا اس آیت کو ایک شخص پر کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کہتی ہے کہ تمھارے "ولی" وہ اشخاص ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عربی ادبیات میں ایسا بارہا دکھائی دیتا ہے کہ مفرد کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

آیۂ مباہلہ میں لفظ "نسائنا" جمع کی صورت میں ہے جبکہ اس سے مراد جناب فاطمہ زہراؑ ہیں جیسا کہ اس ضمن میں مروی

---

[1] حسان بن ثابت کے اشعار تھوڑے بہت فرق کے ساتھ بہت سی کتب میں نقل ہوئے ہیں۔ ان میں تفسیر روح المعانی از شہاب الدین محمود آلوسی اور کفایۃ الطالب از گنجی شافعی وغیرہ شامل ہیں۔

متعدد شانِ نزول گواہی دیتی ہیں۔

● آیۂ مباہلہ ہی میں لفظ "انفسنا" جمع کی صورت میں ہے جبکہ مباہلہ کے لیے جانے والوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ صرف حضرت علیؑ تھے۔

● جنگ اُحد کے ایک واقعہ کے سلسلے میں سورہ آلِ عمران آیہ ۱۷۲ میں ہے:

"الذین قال لهم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوهم فزادهم ایمانا"

تیسری جلد میں اس آیہ کی تفسیر میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ بعض مفسرین نے اس کی شانِ نزول نقل کی ہے جس میں "الذین" سے ایک ہی شخص نعیم بن مسعود مراد لیا گیا ہے۔

● سورہ مائدہ کی آیہ ۵۲ میں ہے۔

"یقولون نخشی ان تصیبنا دائرة"

اس میں بھی جمع کے صیغے ہیں۔ حالانکہ یہ آیت عبداللہ بن ابی کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔ جس کی تفسیر گزر چکی ہے۔

● علاوہ ازیں، ممتحنہ۔ آیہ ۱

منافقون آیہ ۸

بقرہ آیہ ۲۱۵، ۲۷۴، وغیرہ

میں ایسی تعبیرات موجود ہیں جو جمع کی شکل میں ہیں، لیکن ان کی شانِ نزول کے مطابق ان سے ایک ہی شخص مراد تھا۔

ایسی تعبیرات یا تو اس شخص کی حیثیت اور مقام کی اہمیت اور اس کے کام کے نقش مؤثر واضح کرنے کے لیے ہوتی ہیں یا اس لیے کہ حکم کو کلّی صورت میں پیش کیا جائے اگرچہ اس کا مصداق ایک ہی فرد ہو۔

خدا کہ جو اکیلا ہے اس کے لیے قرآن مجید میں بہت سی آیات میں جمع کی ضمیر تعظیم کے طور پر ہی استعمال ہوئی ہے۔

البتہ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بغیر قرینہ کے خلاف ظاہر مفرد کے لیے جمع کا استعمال جائز نہیں ہے لیکن آیت کی شانِ نزول میں وارد ہونے والی تمام روایات ہمارے پاس واضح قرینہ کے طور پر موجود ہیں جبکہ دوسرے مواقع پر اس سے کم قرینہ پر بھی قناعت کر لی جاتی ہے۔

۲۔ حالتِ رکوع میں زکوٰۃ؟ : فخر الدین رازی اور بعض دوسرے متعصبین نے اعتراض کیا ہے کہ حضرت علیؑ تو نماز میں مخصوص توجہ رکھتے تھے اور پروردگار سے مناجات میں مستغرق رہتے تھے یہاں تک کہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ حالتِ نماز میں تیر کا پھل آپ کے پاؤں سے نکالا گیا اور آپ متوجہ نہیں ہوئے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ آپ نے سائل کی آواز سن لی اور اس کی طرف متوجہ ہو گئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اعتراض کرنے والے اس نکتہ سے غافل ہیں کہ سائل کی آواز سننا اور اس کی مدد کرنا اپنی طرف

متوجہ ہونا نہیں ہے بلکہ عین خدا کی طرف توجہ ہے۔ حضرت علیؑ حالت نماز میں اپنے آپ سے غافل تھے نہ کہ خدا سے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ مخلوقِ خدا سے غفلت اور بیگانگی دراصل خدا سے غفلت اور بے گانگی ہے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حالتِ نماز میں زکوٰۃ دینا عبادت کے اندر عبادت ہے نہ کہ عبادت کے دوران ایک عمل مباح کی انجام دہی۔ ایک اور عبارت میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ بات جو روح عبادت سے مناسبت نہیں رکھتی یہ ہے کہ کوئی شخص عبادت کے دوران مادی اور شخصی زندگی سے مربوط ہوجائے۔ لیکن ان امور کی طرف متوجہ ہونا جو رضائے الٰہی کا ذریعہ ہیں روح عبادت کیلیے سازگار ہیں بلکہ عبادت کے لیے بلند مرتبے کا باعث ہیں۔

اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ خدا کی طرف توجہ اور استغراق کا یہ مطلب نہیں کہ انسان بے اختیار ہوکر اپنا احساس کھو بیٹھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے قصد وارادے سے اپنی توجہ ایسی ہر چیز سے پھیر لیتا ہے جو راہ خدا میں اور خدا کے لیے نہیں ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ فخرالدین رازی کا تعصب یہاں تک آپہنچا ہے کہ اس نے سائل کو حضرت علیؑ کے اشارہ کرنے کو کہ وہ خود آکر انگشتری اتار لے "فعل کثیر" قرار دیا ہے جو ان کی نظر میں نماز میں درست نہیں۔ حالانکہ وہ نماز میں ایسے کام انجام دینا جائز سمجھتے ہیں جو اس اشارہ سے کئی درجہ زیادہ ہیں اور اس کے باوجود وہ نماز کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ حشرات الارض مثلاً سانپ یا بچھو کو مارنا، بچے کو اٹھانا اور بٹھانا یہاں تک کہ شیر خوار بچے کو دودھ پلانے کو تو وہ نماز میں فعل کثیر نہیں سمجھتے پھر صرف ایک اشارہ فعل کثیر کس طرح ہوگیا لیکن جب کسی کی دانش مندی طوفانِ تعصب میں پھنس جاتی ہے تو پھر ایسے تعصبات اس کے لیے باعثِ تعجب نہیں رہتے۔

۲۔ **لفظ "ولی" کا مفہوم:** آیت پر ایک اور اعتراض لفظ "ولی" کے معنی کے بارے کیا گیا ہے اور اس سے مراد "دوست اور مدد کرنے والا" لیا گیا ہے نہ کہ "متصرف، سرپرست اور صاحب اختیار"۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ ہم آیت کی تفسیر کے بارے میں اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ لفظ "ولی" سے یہاں دوست اور مدد کرنے والا مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ صفت تو تمام مومنین کے لیے ثابت ہے نہ کہ ان مخصوص مومنین کے لیے جو آیت کے مطابق نماز قائم کریں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیں۔ دوسرے لفظوں میں دوستی اور مدد ایک عام حکم ہے، جبکہ آیت ایک خصوصی حکم بیان کررہی ہے اسی لیے تو ایمان کا ذکر کرنے کے بعد خاص صفات بیان کی جارہی ہیں کہ جو ایک شخص کے ساتھ مخصوص ہیں۔

۴۔ **حضرت علیؑ پر واجب زکوٰۃ:** کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ پر کون سی زکوٰۃ واجب تھی جبکہ وہ مالِ دنیا میں سے اپنے لیے کچھ فراہم ہی نہ کرتے تھے اور اگر اس سے مراد مستحب صدقہ ہے تو اسے زکوٰۃ نہیں کہا جاسکتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ:

اول تو تواریخ گواہی دیتی ہیں کہ حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھ سے بہت سا مال کمایا تھا اور اسے راہِ خدا میں صرف کردیا تھا۔ یہاں تک کہ مرقوم ہے کہ آپ نے ایک ہزار غلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے آزاد کرایا۔ علاوہ ازیں آپ کو مختلف جنگوں کے

مال غنیمت میں سے بھی بہت کچھ ملا تھا۔ لہذا کچھ ایسا مال یا کوئی چھوٹا سا کھجوروں کا باغ جس کی زکوٰۃ ادا کرنا آپ پر واجب ہو اس وقت ہونا کوئی ایسی اہم بات نہیں ہے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ زکوٰۃ فوراً ادا کرنے کے وجوب کی فوریت " عرفی فوریت " ہے جو نماز پڑھتے ہوئے ادا کرنے کے منافی نہیں ہے۔

دوم یہ کہ مستحب زکوٰۃ کو قرآن مجید میں بہت مرتبہ زکوٰۃ کہا گیا ہے بہت سی مکی سورتوں میں یہ لفظ زکوٰۃ آیا ہے جس سے مراد مستحب زکوٰۃ ہی ہے کیونکہ یہ بات مسلم ہے کہ واجب زکوٰۃ کا حکم پیغمبرؐ اسلام کی ہجرت مدینہ کے بعد نازل ہوا (نمل ـ ۳، روم ـ ۳۹، لقمان ـ ۴، فصلت ـ ۷ وغیرہ)۔

۵۔ آیت میں " ولایت بالفعل " کا ذکر ہے: اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر ہم حضرت علیؑ کی خلافت بلا فصل پر ایمان بھی لے آئیں تب بھی یہ بات قبول کرنا پڑے گی کہ اس کا تعلق زمانۂ پیغمبرؐ کے بعد سے ہے لہذا حضرت علیؑ نزول آیت کے وقت ولی نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت ان کے لیے " ولایت بالقوۃ " تھی " ولایت بالفعل " نہ تھی جبکہ آیت ظاہراً " ولایت بالفعل " کا ذکر کر رہی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ روزمرہ کی گفتگو میں ایسی ادبی تعبیرات بہت دکھائی دیتی ہیں۔ لوگوں کے لیے ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں جو " بالقوۃ " ہیں مثلاً انسان اپنی زندگی میں وصیت کرتا ہے اور کسی شخص کو اپنے بچوں کے لیے وصی اور قیم معین کرتا ہے اور اسی وقت سے " وصی " اور " قیم " کے الفاظ اس شخص کے لیے بولے جانے لگتے ہیں جبکہ وصیت کرنے والا ابھی زندہ ہوتا ہے۔

شیعہ سنی طرق سے پیغمبر اکرمؐ سے جو روایات حضرت علیؑ کے بارے میں مروی ہیں ان میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے انہیں " میرے وصی " اور میرے خلیفہ " کہہ کر خطاب کیا جبکہ ایسا زمانۂ پیغمبرؐ میں نہ تھا۔

قرآن مجید میں بھی ایسی تعبیرات دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ کے بارے میں ہے کہ انھوں نے خدا سے یہ درخواست کی:

" ھب لی من لدنك ولیاً یرثنی ویرث من اٰل یعقوب " (مریم ـ ۵)

حالانکہ مسلم ہے کہ " ولی " سے یہاں مراد " سرپرست " ہے جو ان کی وفات کے بعد ہو گا۔

بہت سے لوگ اپنے جانشین اپنی زندگی میں معین کرتے ہیں اور اسی وقت سے اسے جانشین کہنے لگتے ہیں حالانکہ وہ " بالقوۃ " ہی ہوتے ہیں " بالفعل " نہیں۔

۶۔ حضرت علیؑ نے اس آیت سے خود استدلال کیوں نہیں کیا؟: کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؑ نے اس واضح دلیل سے خود استدلال کیوں نہیں کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ آیت کی شانِ نزول کے بارے میں وارد شدہ روایات کی بحث کے ضمن میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ یہ حدیث متعدد کتب میں خود حضرت علیؑ سے بھی نقل ہوئی ہے جیسا کہ مسند ابن مردویہ، مسند ابی الشیخ اور کنز العمال میں ہے یہ بات درحقیقت اس آیت سے آپ کا استدلال ہی ہے۔

کتاب نفیس " الغدیر " میں کتاب سلیم بن قیس ہلالی سے ایک مفصل حدیث نقل کی گئی ہے جس کے مطابق حضرت علیؑ نے

میدانِ صفین میں کچھ لوگوں کی موجودگی میں اپنی حقانیت پر دلائل پیش کیے ان میں سے ایک استدلال اسی آیت سے تھا۔[1]

غایۃ المرام میں ابوذر سے منقول ہے:

حضرت علیؑ نے شوریٰ کے دن بھی اس آیت سے استدلال کیا تھا۔[2]

۷۔ قبل اور بعد کی آیات سے آیۂ ولایت کا ربط: یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قبل اور بعد کی آیات سے ولایت و امامت والی تفسیر مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ ان میں ولایت دوستی کے معنی میں آئی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ قرآنی آیات چونکہ تدریجاً اور مختلف واقعات میں نازل ہوئی ہیں لہٰذا ان کا تعلق ان حوادث اور واقعات سے ہے جن کے سلسلے میں وہ نازل ہوئی ہیں نہ یہ کہ ایک سورت کی آیات یا پے بعد دیگرے آنے والی آیات ہمیشہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں یا مفہوم و معنی کے اعتبار سے ہمیشہ نزدیکی تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو آیات ایک دوسرے کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ لیکن ان کا تعلق دو مختلف واقعات سے ہے۔ مختلف واقعات سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دونوں معانی و مفہوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔

جیسا کہ شانِ نزول شاہد ہے آیت "انما ولیکم اللّٰہ" حضرت علی علیہ السلام کے حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس سے قبل اور بعد کی آیات جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں اور پڑھیں گے دوسرے واقعات کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں لہٰذا ان کے ایک دوسرے سے تعلق کی بات کا زیادہ سہارا نہیں لیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں اتفاق کی بات ہے کہ زیر بحث آیت گذشتہ اور پیوستہ آیات سے مناسبت بھی رکھتی ہے کیونکہ دوسری آیات میں ولایت بمعنی دوستی اور مدد کے گفتگو ہے جبکہ زیر بحث آیت میں ولایت رہبری اور سرپرستی کے مفہوم میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ ولی، سرپرست اور متصرف اپنے پیروکاروں کا دوست اور یار و مددگار بھی ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دوست اور مددگار ہونا ولایت مطلقہ کے کوائف اور اوصاف میں سے ہے۔

۸۔ ایسی قیمتی انگشتری کہاں سے آئی تھی؟: کہا جاتا ہے کہ ایسی گراں قیمت انگوٹھی جو تاریخ نے بیان کی ہے حضرت علیؑ کہاں سے لائے تھے؟ علاوہ ازیں ایسی غیر معمولی قیمت کی انگوٹھی پہننا اسراف بھی ہے، تو کیا یہ بات اس کی دلیل نہیں کہ مذکورہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس انگوٹھی کی قیمت کے بارے میں جو مبالغے کیے گئے ہیں وہ بالکل بے بنیاد ہیں اور اس کے بہت قیمتی ہونے کی ہمارے پاس کوئی قابلِ قبول دلیل نہیں ہے۔ یہ جو ایک ضعیف روایت[3] میں اس کی قیمت خراجِ شام کے

---

[1] الغدیر جلد ۱ ص ۱۹۶

[2] منقول از منہاج البراعۃ جلد ۲ ص ۳۶۴

[3] یہ ضعیف روایت بطور مرسل تفسیر برہان ج ۱ ص ۴۸۵ پر مذکور ہے۔

برابر بیان کی گئی ہے۔ حقیقت سے زیادہ ایک افسانے سے مشابہت رکھتی ہے اور شاید اس اہم واقعے کی اہمیت ختم کرنے کے لیے اسے گھڑا گیا ہے۔ صحیح اور معتبر روایات جو آیت کی شانِ نزول کے بارے میں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں ایسے کسی افسانے کا کوئی ذکر نہیں لہٰذا ایسی باتوں سے ایک تاریخی واقعے اور حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔

۵۶۔ وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○

## ترجمہ

۵۶۔ اور جو لوگ اللہ، اس کے پیغمبر اور صاحبانِ ایمان کی ولایت قبول کرلیں (وہ کامیاب ہیں کیونکہ) خدا کی حزب اور پارٹی ہی کامیاب ہے۔

## تفسیر

یہ آیت گذشتہ آیت کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے اور اسی کے ہدف کی تاکید و تعقیب کرتی ہے اور مسلمانوں کو بتاتی ہے کہ جنھوں نے خدا، اس کے رسولؐ اور ان صاحبانِ ایمان کی ولایت، سرپرستی اور رہبری کو قبول کرلیا ہے کہ جنکی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ کیا جاچکا ہے وہ کامیاب ہوں گے کیونکہ وہ حزبِ خدا میں داخل ہوجائیں گے اور حزبِ خدا کامیاب و کامران ہے (ومن یتول اللہ ورسولہ والذین اٰمنوا فان حزب اللہ ھم الغالبون)۔

اس آیت میں "ولایت" کے اس معنی پر ایک اور قرینہ موجود ہے جس کا ذکر گذشتہ آیت کے ذیل میں کیا گیا ہے یعنی "ولایت" بمعنی "سرپرستی، تصرف اور رہبری" کیونکہ "حزب اللہ" اور اس کا غلبہ حکومتِ اسلامی سے مربوط ہے نہ کہ ایک عام اور معمول کی دوستی سے اور یہ خود اس بات پر دلیل ہے کہ آیت میں "ولایت" سرپرستی، حکومت نیز اسلام اور مسلمانوں کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے معنی میں ہے کیونکہ "حزب" کے مفہوم میں ایک طرح کی تشکیل، وابستگی اور مشترک اہداف و مقاصد کی تکمیل کے لیے ایک اجتماع کا تصور پوشیدہ ہے۔

توجہ رہے کہ "الذین اٰمنوا" سے اس آیت میں تمام صاحبِ ایمان مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد وہی شخص ہے جس کی طرف معیّن اوصاف کے ساتھ گذشتہ آیت میں اشارہ ہوچکا ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آیت میں حزب اللہ کی کامیابی سے مراد صرف معنوی کامیابی ہے یا اس میں ہر طرح کی معنوی و مادی کامیابی شامل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آیت کا اطلاق حزب اللہ کی عام محاذوں پر مطلق کامیابی کی دلیل ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی جمعیت حزب اللہ میں شامل ہو یعنی ایمانِ محکم، تقویٰ، عمل صالح، اتحاد، کامل باہمی اعتماد، آگاہی اور علم رکھتا ہو

اور کافی تیاری کیے ہوئے ہو تو بلا تردید وہ تمام معاملات میں کامیاب ہوگا۔ آج اگر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایسی کامیابی میسر نہیں ہے تو اس کا سبب واضح ہے کیونکہ حزب اللہ کی مذکورہ شرائط میں سے زیادہ تر آج مسلمانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو توانائیاں اور صلاحیتیں دشمن کو شکست دینے کے لیے استعمال ہونا چاہئیں، زیادہ تر ایک دوسرے کو کمزور کرنے پر صرف ہو رہی ہیں۔

سورہ مجادلہ آیہ ۲۲ میں بھی حزب اللہ کی کچھ صفات بیان ہوئی ہیں جس کی تفسیر انشاء اللہ متعلقہ مقام پر آئے گی۔

۵۷۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○

۵۸۔ وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَلَعِبًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ○

## ترجمہ

۵۷۔ اے ایمان والو! اہل کتاب اور مشرکین میں سے ان لوگوں کو اپنا دوست اور سہارا نہ سمجھو جو تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھتے ہیں اور اگر ایمان دار ہو تو خدا سے ڈرو۔

۵۸۔ جب (تم اذان کہتے ہو اور لوگوں کو) نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل تماشہ سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسا گروہ ہیں جو عقل و ادراک نہیں رکھتے۔

## شان نزول

تفسیر مجمع البیان، تفسیر ابوالفتوح رازی اور تفسیر فخرالدین رازی میں منقول ہے:

رفاعہ اور سوید مشرکین میں سے تھے۔ انھوں نے اظہار اسلام کیا اور پھر وہ منافقین کے ہمکاروں میں داخل ہو گئے۔ بعض مسلمان ان دونوں سے میل جول رکھتے تھے اور اظہار دوستی کرتے تھے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انھیں اس راہ و رسم کے خطرے سے آگاہ کیا گیا تاکہ وہ اس عمل سے پرہیز کریں۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں ولایت بمعنی دوستی ہے نہ کہ ولایت بمعنی سرپرستی و تصرف جو کہ گذشتہ آیات

میں تھی، کیونکہ اس آیت کی شانِ نزول ان آیات سے مختلف ہے۔ لہٰذا انھیں ایک دوسرے کے لیے قرینہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

دوسری آیت جو پہلی کا ضمیمہ ہے، اس کی شانِ نزول یہ منقول ہے:

یہودیوں کا ایک گروہ اور کچھ عیسائی جب مؤذن کی اذان کی آواز سنتے اور نماز کے لیے مسلمانوں کا قیام دیکھتے تو تمسخر اور استہزاء شروع کر دیتے۔ لہٰذا قرآن مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے دوستی کرنے سے پرہیز کا حکم دیتا ہے۔

# تفسیر

اس آیت میں خداوند عالم دوبارہ مومنین کو حکم دے رہا ہے کہ منافقوں اور دشمنوں کی دوستی سے بچو، البتہ انکے جذبات و میلانات کو متحرک کرنے کے لیے یوں فرماتا ہے: اے ایمان والو! جو لوگ تمھارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھتے ہیں وہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکین و منافقین میں سے ان میں سے کسی کو بھی دوست نہ بناؤ (یا یھا الذین امنوا لا تتخذوا الذین اتخذوا دینکم ھزوًا ولعبًا من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم والکفار اولیاء)۔

آیت کے آخر میں "واتقوا اللہ ان کنتم مؤمنین" فرما کر تاکید کی گئی ہے کہ تقویٰ اور ایمان سے ایسے لوگوں کی دوستی مناسبت نہیں رکھتی۔

توجہ رہے کہ "ھزو" (بروزن "قفل") کا معنی ہے "تمسخر آمیز باتیں یا حرکات جو کسی چیز کو بے وقعت ظاہر کرنے کے لیے کی جائیں" جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے استہزاء ایسے مذاق کو کہتے ہیں جو کسی کی عدم موجودگی میں اور پس پشت کیا جائے اگرچہ کبھی کبھار کسی کے سامنے اس کا تمسخر اڑانے پر بھی یہ لفظ بطور نادر بولا جاتا ہے۔

"لعب" عام طور پر ایسے کاموں کو کہا جاتا ہے جن کے انجام دینے میں کوئی صحیح غرض کار فرما نہ ہو یا جو بالکل بغیر ہدف اور مقصد کے انجام پائیں۔ بچوں کے کھیل کود کو بھی "لعب" اسی بنا پر کہتے ہیں۔

گذشتہ آیت میں منافقین اور اہل کتاب کی ایک جماعت سے دوستی کرنے سے روکا گیا ہے کیونکہ وہ لوگ احکام اسلام کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب اگلی آیت میں شاہد کے طور پر ان کے ایک عمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ: جب تم مسلمانوں کو نماز کی دعوت دیتے ہو تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھتے ہیں (واذا نادیتم الی الصلوٰۃ اتخذوھا ھزوًا ولعبًا)[1]

---

[1] مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ "اتخذوھا" کی ضمیر نماز کی طرف لوٹتی ہے یا اذان کی طرف۔ جو شانِ نزول اس سلسلے میں ذکر کی گئی ہیں ان میں بھی یہ دونوں احتمالات موجود ہیں، کیونکہ منافقین اور کفار اذان کی روح پر در ندا کا مذاق بھی اڑاتے تھے اور نماز کا بھی۔ لیکن آیت کا ظاہر زیادہ تر اس احتمال کی تائید کرتا ہے کہ یہ ضمیر "صلوٰۃ" کی طرف لوٹتی ہے۔

اس کے بعد ان کے عمل کی علت بیان کی گئی ہے، ایسا اس لیے ہے کہ وہ ایک نادان گروہ ہے اور حقائق کا ادراک کرنے کی منزل سے دور ہے (ذٰلک بانھم قوم لا یعقلون)۔

## اذان اسلام کا عظیم شعار ہے

ہر دور میں ہر ملت کا کوئی ایسا شعار ہوتا ہے جو وہ اپنے لوگوں کے احساسات و جذبات کو ابھار کر انھیں ذمہ داریوں کی طرف دعوت دینے کے لیے استعمال کرتی ہے اور یہ بات دور حاضر میں زیادہ وسعت سے دکھائی دیتی ہے۔

گذشتہ اور موجودہ زمانے میں عیسائی ناقوس کی ناموزوں آواز کے ذریعے اپنے پیروکاروں کو کلیسا کی طرف دعوت دیتے ہیں، لیکن اسلام میں اس دعوت کے لیے اذان کو اپنایا گیا ہے جو صدائے ناقوس سے کئی درجے مؤثر اور دلآویز ہے۔ اس اسلامی شعار کی جاذبیت اور کشش اتنی زیادہ ہے کہ صاحب "المنار" کے بقول جب متعصب عیسائی بھی اسے سنتے ہیں تو سننے والوں پر اس کی گہری تاثیر کا اعتراف کرتے ہیں اس کے بعد موصوف نے نقل کیا ہے کہ مصر کے ایک شہر میں کچھ عیسائیوں کو لوگوں نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں کی اذان کے وقت اس سرودِ آسمانی کو سننے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔

اس سے بہتر شعار کون سا ہوگا، جس کی ابتداء خدائے بزرگ و برتر کے نام سے ہوتی ہے، جو خالقِ عالم کی وحدانیت اور اس کے پیغمبر کی رسالت کے اعلان کے ساتھ بلند ہوتا ہے اور کامیابی، فلاح، نیک عمل اور یادِ خدا پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ شعار اللہ کے نام سے شروع ہوتا اور اللہ ہی کے نام پر تمام ہوتا ہے۔ اس میں موزوں جملے، مختصر عبارات، واضح محتویات اور اصلاح کنندہ اور آگہی عطا کرنے والا مضمون ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں اذان کہنے کے لیے بہت تاکید کی گئی ہے اس سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ سے ایک مشہور حدیث منقول ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا:

روزِ قیامت اذان کہنے والے دوسروں سے سر اور گردن کی مقدار کے برابر بلند تر ہوں گے۔

یہ بلندی درحقیقت وہی مقامِ رہبری ہے اور دوسروں کو خدا کی طرف اور نماز جیسی عبادت کی طرف دعوت دینے کے سبب سے ہے۔

اسلامی شہروں میں وقتِ نماز جب اذان کے نغمے گلدستہ اذان سے گونجتے ہیں تو ان کی آواز سچے مسلمانوں کیلیے پیام آزادی اور استقلال و عظمت کی حیات بخش نسیم کی مانند ہوتی ہے۔ یہ آواز بدخواہوں کے تن بدن میں رعشہ اور اضطراب ڈال دیتی ہے۔ یہ صدا بقائے اسلام کی ایک رمز ہے انگستان کے ایک مشہور شخص کا ایک اعتراف اس پر گواہ ہے۔ وہ عیسائیوں کے ایک گروہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

> جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام گلدستہ ہائے اذان سے بلند ہو رہا ہے، خانہ کعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور قرآن مسلمانوں کا رہنما اور پیشوا ہے، اس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ اسلامی سرزمینوں پر ہماری سیاست کی

بنیادیں استوار ہوسکیں [1]

لیکن بعض سب بچارے اور بھولے مسلمانوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اس عظیم اسلامی شعار کو ترک کرکے اس کی جگہ فضول سے پروگرام رکھ دیئے ہیں جبکہ یہ اسلامی شعار ان کے دین اور ثقافت کے قیام کی صدیوں پر حاوی تاریخ کی سند ہے۔ خدا ایسے افراد کی ہدایت کرے اور انھیں مسلمانوں کی صفوں میں پلٹا دے۔

واضح ہے کہ جیسے اذان کا باطن اور اس کے مفاہیم خوبصورت ہیں اسی طرح اسے ادا بھی اچھی آواز میں کرنا چاہیے اور اس کے باطنی حسن کو نامرغوب طریقے سے ظاہر کرکے پامال نہیں کر دینا چاہیے۔

## اذان وحی کے ذریعے پہنچی

اہل سنت کے طرق سے منقول کئی ایک روایات میں اذان کی تشریع کے بارے میں عجیب و غریب باتیں منقول ہیں جو منطق اسلام سے بالکل مطابقت نہیں رکھتیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے :

> پیغمبر خدا (ص) سے اصحاب نے درخواست کی کہ وقت نماز بتانے کے لیے کوئی نشانی ہونا چاہیے۔ اس پر آپ (ص) نے اپنے صحابہ سے مشورہ کیا۔ ہر ایک نے کوئی نہ کوئی تجویز پیش کی۔ کسی نے کہا مخصوص علم لہرانا چاہیے، کسی نے کہا آگ روشن کرنا چاہیے اور کسی نے کہا ناقوس بجانا چاہیے۔ لیکن رسول اللہؐ نے ان میں سے کوئی بات قبول نہ کی۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن زید اور عمر بن خطاب نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص انھیں حکم دے رہا ہے کہ نماز کا وقت بتانے کے لیے اذان کہیں اور اس نے ان دونوں کو اذان سکھائی اور رسول اللہؐ نے اسے قبول کر لیا [2]

یہ جعلی روایت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین معلوم ہوتی ہے کہ جس کے مطابق آپ وحی پر انحصار کرنے کی بجائے کچھ افراد کے خوابوں کا سہارا لیتے تھے اور کچھ لوگوں کے خوابوں کی بنیاد پر اپنے دین کے احکام پیش کرتے تھے۔

در حقیقت ایسا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ روایات اہل بیتؑ میں ہے کہ اذان پیغمبر اسلام کو وحی کے ذریعے تعلیم دی گئی تھی امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ جب جبرئیل اذان لے کر آئے تو پیغمبر خداؐ کا سر حضرت علیؑ کی گود میں تھا اور جبرئیل نے آپ کو اذان و اقامت بتائیں۔ جب رسول اللہؐ نے اپنا سر اٹھایا تو حضرت علیؑ سے پوچھا :

> کیا تم نے جبرئیل کی اذان کی آواز سنی ہے۔

حضرت علیؑ نے کہا :

---

[1] یہ الفاظ گلاڈسٹون کے ہیں جو اپنے زمانے میں انگریزوں کا پہلے درجے کا سیاستدان تھا۔

[2] تفسیر قرطبی

جی ہاں

رسول اللہ نے پھر پوچھا:

کیا اسے یاد کر لیا ہے؟

حضرت علیؑ نے کہا:

جی ہاں

پیغمبر خداؐ نے فرمایا:

بلال (جن کی آواز اچھی تھی) کو بلاؤ اور اسے اذان و اقامت سکھا دو۔

حضرت علیؑ نے بلال کو بلا کر اسے اذان سکھا دی[1]

اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے کتاب "النص والاجتہاد" ص ۱۲۸ کی طرف رجوع کریں۔

۵۹۔ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ○

۶۰۔ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ○

## ترجمہ

۵۹۔ کہہ دو: اے اہل کتاب! کیا تم ہم پر اعتراض کرتے ہو (مگر ہم نے کیا کیا ہے) سوائے اس کے کہ ہم خدائے یکتا پر، جو کچھ اس نے ہم پر نازل کیا ہے اس پر اور جو کچھ اس سے پہلے نازل ہو چکا ہے اس پر ایمان لائے ہیں اور یہ اس بنا پر ہے کہ تم میں سے اکثر راہِ حق سے منحرف ہو گئے ہیں (لہٰذا حق تمھیں اچھا نہیں لگتا)۔

۶۰۔ کہہ دو: کیا میں تمھیں ایسے لوگوں کے بارے میں آگاہ کروں جن کا ٹھکانا اور جزا اس سے بدتر ہے وہ لوگ کہ جنھیں خدا نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان پر اپنا غضب نازل کیا ہے (اور انھیں مسخ کر دیا ہے) اور ان میں سے بندر اور خنزیر بنائے اور جنھوں نے بت پرستی کی ہے ان کا ٹھکانا بُرا ہے اور وہ راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

---

[1] وسائل، ج ۴ ص ۶۱۲

## شانِ نزول

عبداللہ بن عباس سے منقول ہے :

کچھ یہودی رسول اللہ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ اپنے عقائد انھیں بتائیں۔

رسول اللہ نے فرمایا : میں خدائے بزرگ و یگانہ پر ایمان رکھتا ہوں اور جو کچھ ابراہیم ، اسماعیل اسحاق ، یعقوب ، موسیٰ ، عیسیٰ اور دوسرے پیغمبران خدا پر نازل ہوا ہے اسے حق سمجھتا ہوں اور ان میں تفریق نہیں کرتا۔

وہ کہنے لگے : ہم عیسیٰ کو نہیں مانتے اور اس کی نبوّت کو قبول نہیں کرتے۔

انھوں نے مزید کہا : ہم کسی دین کو تمھارے دین سے بدتر نہیں سمجھتے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انھیں جواب دیا۔

## تفسیر

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ اہل کتاب سے پوچھیے اور کہیے کہ ہم سے کون سا کام سرزد ہوا ہے کہ تم ہم میں عیب نکالتے ہو اور ہم پر تنقید کرتے ہو ، سوائے اس کے کہ ہم خدائے یگانہ پر ایمان لائے ہیں اور جو ہم پر اور گذشتہ انبیاء پر نازل ہوا ہے اس کے سامنے ہم سرتسلیم خم کرتے ہیں ( قل یا اھل الکتاب ھل تنقمون منا الا ان اٰمنا باللہ وما انزل الینا وما انزل من قبل )[1]

یہ آیت یہودیوں کی بے محل ضد ، ہٹ دھرمی اور تعصبات کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وہ لوگ اپنے اور اپنے تحریف شدہ دین کے خلاف کسی کی کچھ وقعت کے قائل نہیں تھے اور اسی شدید تعصب کی بنا پر حق ان کی نظر میں باطل اور باطل ان کی نگاہ میں حق بن چکا ہے۔

آیت کے آخر میں ایک جملہ ہے جو درحقیقت پہلے جملے کی علت اور سبب ہے۔ اس میں کہا گیا ہے ، اگر تم توحید خالص اور تمام آسمانی کتب کے سامنے سرتسلیم خم کرنے پر ہم پر اعتراض کرتے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں سے اکثر فسق اور گناہ سے آلودہ ہو چکے ہیں اور اگر کچھ لوگ پاکیزگی اور حق کا راستہ اپناتے ہیں تو یہ تمھاری نظر میں عیب ہے ( وان اکثرکم فاسقون )۔

فسق و گناہ سے آلودہ انسانوں کی کثرت سے تشکیل پانے والے آلودہ ماحول میں اصولی طور پر حق و باطل کا معیار اسقدر دگرگوں ہو جاتا ہے کہ اس میں پاکیزہ عقیدہ اور صالح عمل کو برا سمجھا جانے لگتا ہے اور اسے ہدف تنقید بنایا جاتا ہے اور غلط

---

[1] "تنقمون" مادہ "نقمت" سے ہے۔ یہ دراصل کسی چیز کا انکار کرنے کے معنی میں ہے چاہے وہ انکار زبان سے ہو یا عمل سے اور سزا دینے کے ذریعے سے ہو۔

عقائد و اعمال کو اچھا سمجھا جاتا ہے اور انہیں بنظرِ تحسین دیکھا جاتا ہے۔ یہ مسخ شدہ فکر کی خاصیت ہے۔ جب کوئی گناہ میں ڈوب جاتا ہے اور اس کا عادی ہو جاتا ہے تو اُس کی یہی حالت ہو جاتی ہے۔

توجہ رہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ آیت تمام اہل کتاب پر تنقید نہیں کر رہی بلکہ صالح اور نیک اقلیت کا حساب لفظ "اکثر" استعمال کر کے الگ کر دیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں اہل کتاب کے تحریف شدہ عقائد، غلط اعمال اور جو سزائیں انہیں دامن گیر ہوئیں ان کا موازنہ سچے مومنین اور مسلمین کی حالت و کیفیت سے کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان دونوں گروہوں میں سے کون سا تنقید اور سرزنش کا مستحق ہے۔ یہ دراصل متعصب اور ہٹ دھرم افراد کو متوجہ کرنے کے لیے ایک منطقی جواب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے! اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کیا خدائے یکتا اور آسمانی کتب پر ایمان لانا باعثِ سرزنش اور وجہِ اعتراض ہے یا پھر خود ان کے بُرے اعمال جن کے سبب وہ خدائی سزاؤں میں گرفتار ہوئے ہیں۔ انہیں کہہ دو: کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں آگاہ کروں جن کا معاملہ بارگاہِ الٰہی میں اس سے بدتر ہے (قل ھل انبئکم بشر من ذٰلک مثوبۃ عند اللّٰہ)[1]

اس میں شک نہیں کہ خدا تعالیٰ اور آسمانی کتاب پر ایمان لانا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ یہ جو زیرِ نظر آیت میں اس کا موازنہ اہل کتاب کے اعمال و افکار سے کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "ان میں سے بدتر کون ہے" در حقیقت ایک کنایہ ہے۔ جیسے اگر کوئی ناپاک شخص کسی پاکیزہ انسان پر تنقید کرے تو وہ جواب میں کہتا ہے کہ پاکدامن بدتر ہیں یا گناہ سے آلودہ لوگ۔

اس کے بعد اس مطلب کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو اپنے اعمال کی وجہ سے پروردگار کی لعنت اور غضب کا شکار ہوئے ہیں انہیں بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا ہے اور وہ کہ جنہوں نے طاغوت اور بُت کی پرستش کی ہے یقیناً ایسے لوگوں کی دنیا میں حیثیت و مقام اور آخرت میں ٹھکانا بدتر ہوگا اور وہ راہِ راست اور جادۂ مستقیم سے بہت گمراہ ہیں (من لعنہ اللّٰہ وغضب علیہ وجعل منھم القردۃ والخنازیر وعبد الطاغوت اولٰئک شر مکانا واضل عن سواء السبیل)[2]

---

[1] "مثوبۃ" اور "ثواب" دراصل پہلی حالت کی طرف رجوع کرنے اور پلٹنے کے معنی میں ہے اور یہ لفظ ہر طرح کی جزا اور سرزنش کے لیے بھی بولا جاتا ہے لیکن زیادہ تر اچھی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے بعض اوقات سزا کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں یہ لفظ انجام یا جزا و سزا کے معنی میں ہے۔

[2] "سواء" لغت میں مساوات، اعتدال اور برابری کے معنی میں ہے اور یہ جو آیت بالا میں جادۂ مستقیم کو سواء السبیل کہا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہر طرف سے برابر، مساوی اور ہموار ہے۔ اور ہر معتدل، منظم اور انحراف سے خالی روش اور طریقے کو سیدھا راستہ کہا جاتا ہے۔ ضمناً توجہ رہے کہ "عبد الطاغوت" کا عطف "من لعنہ اللّٰہ" ہے اور "عبد" فعل ماضی ہے اور عبد کی جمع نہیں ہے جیسا کہ بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے۔ اور اہل کتاب کی طرف طاغوت کی پرستش کی نسبت یہودیوں کی گوسالہ پرستی کی طرف اشارہ ہے یا منحرف اور گمراہ پیشواؤں کے سامنے بے چون و چرا سر تسلیم خم کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

مسخ اور بعض انسانوں کے چہروں کے متغیر ہونے کے بارے میں اور یہ کہ مسخ سے مراد جسمانی چہرے کا تغیر ہے یا فکری و اخلاقی چہرے کی تبدیلی، اس سلسلے میں انشاء اللہ سورۂ اعراف آیہ ۱۶۶ کے ذیل میں تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

۶۱۔ وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ○

۶۲۔ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

۶۳۔ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○

## ترجمہ

۶۱۔ اور وہ جب تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں (لیکن) وہ کفر کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور کفر کے ساتھ ہی نکل جاتے ہیں اور جو کچھ وہ چھپائے ہوئے ہیں خدا اس سے آگاہ ہے۔

۶۲۔ تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ وہ گناہ، تجاوز اور مالِ حرام کھانے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں جو کام وہ انجام دیتے ہیں کس قدر برا ہے۔

۶۳۔ عیسائی اور یہودی علماء انھیں گناہ آمیز باتوں اور مالِ حرام کھانے سے کیوں منع نہیں کرتے۔ کس قدر برا ہے وہ عمل جو وہ انجام دیتے ہیں۔

## تفسیر

پہلی آیت میں اہل کتاب منافقین کے بارے میں بحث مکمل کرتے ہوئے اور ان کے چہروں سے نفاق کے پردے ہٹاتے ہوئے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے کہ، جس وقت وہ تمھارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں لیکن کفر سے معمور دل کے ساتھ آتے ہیں اور اسی حالت میں تمھارے پاس سے اٹھ جاتے ہیں اور منطقی استدلال اور تمھاری باتیں ان کے دل پر کچھ اثر نہیں کرتیں (و اذا جاءوکم قالوا اٰمنا وقد دخلوا بالکفر وھم قد خرجوا بہ)۔

لہٰذا وہ جو ظاہراً حمایت حق میں باتیں کرتے ہیں، اظہار ایمان کرتے ہیں اور تمہاری باتوں کی ریاکارانہ پذیرائی کرتے ہیں، اس سے تمہیں دھوکا نہ ہو۔

آیت کے آخر میں انھیں خطرے سے آگاہ کرتا ہے کہ ان تمام پردہ پوشیوں کے باوجود جو کچھ تم چھپاتے ہو خدا اس سے آگاہ اور باخبر ہے (واللہ اعلم بما کانوا یکتمون)۔

بعد والی آیت میں ان کے نفاق کی کچھ اور نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے، تم ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ گناہ، ظلم اور حرام خوری کی راہ میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں (وتری کثیرا منھم یسارعون فی الاثم والعدوان واکلھم السحت)[1]۔

یعنی گناہ اور ظلم کے راستے میں یوں قدم بڑھاتے ہیں گویا باعث فخر اہداف کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بغیر کسی شرم کے کوشش کرتے ہیں کہ ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔

توجہ رہے کہ لفظ "اثم" کفر کے معنی میں بھی آیا ہے اور ہر قسم کے گناہ کے مفہوم میں بھی آیا ہے۔ لیکن یہاں "عدوان" کے مقابلے میں آیا ہے۔ لہٰذا بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے: ایسے گناہ جن کا نقصان صرف کرنے والے ہی کو پہنچے بخلاف "عدوان" کے، جس کا نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے۔

یہ احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ "عدوان" کا ذکر "اثم" کے بعد اصطلاح کے مطابق خاص کے بعد عام کا ذکر ہے اور ان کے بعد حرام کھانے کا تذکرہ "ذکر اخص" کے طور پر ہے۔ اس طرح پہلے تو ان کی ہر قسم کے گناہ کی بناء پر مذمت کی گئی ہے اس کے بعد اہمیت کی وجہ سے دو عظیم گناہوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یعنی ایک ظلم و ستم اور دوسرا حرام خوری چاہے وہ رشوت کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں۔

مختصر یہ کہ قرآن اہل کتاب کے ان منافق افراد کو آشکار کرتا ہے اور ان کی مذمت کرتا ہے جو بڑی لاپرواہی سے ہر طرح کا گناہ سرانجام دیتے ہیں بخصوص ظلم و ستم کرتے ہیں اور بالخصوص ناجائز مال کھاتے ہیں مثلاً رشوت اور سود کھاتے ہیں۔

آیت کے آخر میں ان کے اعمال کی برائی تاکیداً ظاہر کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: یہ لوگ کیسا برا اور قبیح عمل انجام دیتے ہیں (لبئس ما کانوا یعملون)۔ "کانوا یعملون" سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اعمال کو وہ اتفاقیہ نہیں بجالاتے بلکہ وہ ان پر ڈٹے رہتے ہیں اور بار بار ان کا ارتکاب کرتے ہیں۔

تیسری آیت میں ان کے علماء پر حملہ کیا گیا ہے جو اپنی خاموشی کے ذریعے انھیں گناہ کا شوق دلاتے تھے، ارشاد ہوتا ہے: عیسائی اور یہودی علماء انھیں گناہ آلودہ باتوں اور حرام خوری سے کیوں نہیں روکتے (لولا ینھٰھم الربٰنیون و الاحبار عن قولھم الاثم و اکلھم السحت)۔

---

[1] "سحت" کے معنی کے بارے میں اس سورہ کی آیہ ۴۲ کے ذیل میں "یسارعون" کے بارے میں اسی سورہ کی آیہ ۴۱ کے ذیل میں اور "اثم" کے متعلق سورہ بقرہ آیہ ۲۱۹ کے ذیل میں جلد دوم میں بحث کی جا چکی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے "ربانیون" "ربانی" کی جمع ہے اور یہ لفظ "رب" سے لیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے ایسے علماء جو لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں، لیکن زیادہ تر یہ لفظ عیسائی مذہبی علماء کے لیے استعمال ہوتا ہے" احبار" "حبر" (بروزن "ابر") کی جمع ہے۔ اس کا مطلب ہے ایسے علماء جو معاشرے پر اچھا اثر مرتب کریں، لیکن زیادہ تر یہ لفظ یہودی مذہبی علماء کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ضمناً سوال پیدا ہوتا ہے کہ گذشتہ آیت میں لفظ "عدوان" تھا لیکن اس آیت میں نہیں ہے۔ بعض نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ "اثم" اسی وسیع مفہوم ہے جس میں "عدوان" بھی داخل ہے۔

اس آیت میں گذشتہ آیت کے برخلاف "قولہم الاثم" آیا ہے۔ یہ تعبیر ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو گناہ آلود باتوں سے بھی روکیں اور اعمال گناہ سے بھی۔ یا پھر قول یہاں اعتقاد کے معنی میں ہے یعنی علماء ایک فاسد معاشرے کی اصلاح کے لیے پہلے ان کے غلط افکار اور عقائد کی اصلاح کریں کیونکہ جب تک افکار و نظریات میں انقلاب نہیں آتا یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ ان کے عمل میں کوئی گہری اصلاح ہوسکے۔ اس طرح سے آیت فاسد اور بُرے معاشرے کی اصلاح کے لیے علماء کو نشاندہی کرتی ہے کہ کام فکری انقلاب سے شروع کیا جائے۔

جیسے اصلی گناہ گاروں کی مذمت کی گئی ہے آیت کے آخر میں خاموش رہنے والے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر ترک کر دینے والے علماء کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، کتنا بُرا ہے وہ کام جو یہ انجام دیتے ہیں (لبئس ما کانوا یصنعون) اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی عظیم ذمہ داری کو پورا نہیں کرتے خاص طور پر علماء اور دانشمند ان کا انجام بھی اصلی گناہ گاروں کا سا ہوگا۔ درحقیقت یہ لوگ ان کے جرم میں شریک شمار ہوں گے۔

مشہور مفسر ابن عباس سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں:

> اپنی ذمہ داریوں کی بجا آوری نہ کرنے والے اور خاموش رہنے والے علماء کی مذمت میں یہ سخت ترین آیت ہے۔

واضح ہے کہ یہ حکم خاموش رہنے والے یہودی اور عیسائی علماء سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان تمام صاحبانِ فکر ونظر، راہبروں اور علماء کے بارے میں ہے جو لوگوں کو گناہ سے آلودہ ہوتا دیکھیں اور انھیں ظلم وستم کی راہ پر تیز گام پائیں اور خاموش بیٹھے رہیں، کیونکہ خدا کا حکم تو سب کے لیے برابر ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا:

> گذشتہ قومیں اس بنا پر ہلاک اور نابود ہوگئیں کہ وہ گناہ کی مرتکب ہوتی تھیں اور ان کے علماء سکوت اختیار کر لیتے تھے اور نہی عن المنکر نہیں کرتے تھے۔ اس حالت میں ان پر خدا کا عذاب، سزائیں اور مصیبتیں نازل ہوتی تھیں۔ پس اے لوگو! تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرو تاکہ تمہارا بھی وہی انجام نہ ہو[1]

---

[1] نور الثقلین جلد ۱ ص ۶۴۹

یہی مضمون نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ (خطبہ ۱۹۲) میں بھی ہے، آپؑ نے فرمایا:

"فان الله سبحانه لم یلعن القرآن الماضی بین ایدیکم الا لترکهم الامر بالمعروف و النهی عن المنکر فلعن السفهاء لرکوب المعاصی والحکماء لترك التناهی"

گزشتہ زمانے کے لوگوں کو خدا تعالیٰ نے صرف اس لیے اپنی رحمت سے دور کر دیا کہ انھوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر دیا۔ اس نے عوام کو گناہ کے ارتکاب اور علماء کو نہی عن المنکر ترک کرنے پر اپنی لعنت کا حق دار قرار دیا اور انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ گزشتہ آیت میں عام لوگوں کے بارے میں لفظ "یعملون" آیا ہے اور زیرِ نظر آیت میں علماء کے لیے "یصنعون" استعمال ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ "یصنعون"، "صنع" کے مادہ سے ہے۔ اس کا مطلب ہے ایسے کام جو بڑی توجہ اور مہارت سے انجام دیئے جائیں جبکہ "یعملون"، "عمل" کے مادہ سے ہے اور ہر کام کے لیے بولا جاتا ہے اگر نادان لوگ اور عوام بُرے کام انجام دیتے ہیں تو ان میں سے کچھ نادانی اور بے خبری کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں لیکن علماءُ اور دانشور جو اپنی ذمہ داری پر عمل نہیں کرتے تو واضح ہے کہ وہ جانتے ہوئے اور ماہرانہ طور پر غلط کام انجام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے عالم کے لیے جاہل سے زیادہ سخت سزا ہے۔

۶۴۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللّٰهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝

## ترجمہ

۶۴۔ اور یہودی کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ تو زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ انھی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور وہ اس بات کی وجہ سے رحمتِ الٰہی سے دور ہیں جبکہ اس (کی قدرت) کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس طرح سے چاہے بخشتا اور

خرچ کرتا ہے اور یہ آیات جو تجھ پر تیرے پروردگار کی نازل ہوئی ہیں ان میں سے بہت سوں کے طغیان اور کفر کو بڑھا دیتی ہیں اور ان کے درمیان ہم نے قیامت تک کے لیے دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے اور جب بھی انھوں نے جنگ کی آگ روشن کی خدا نے اسے خاموش کر دیا اور وہ زمین میں فساد کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور خدا فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

## تفسیر

اس آیت میں یہودیوں کی ناروا اور گناہ آلود باتوں کی ایک مثال پیش کی گئی ہے جبکہ گذشتہ آیت میں کلی طور پر ان کی ایسی باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ تاریخ نشاندہی کرتی ہے کہ یہودی ایک زمانے میں اوج قدرت میں تھے۔ اس وقت کی اہم آباد دنیا کے ایک حصے پر ان کی حکومت تھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان بن داؤدؑ کے زمانے کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ بعد میں بھی زور و شور سے ان کی قدرت وطاقت موجود رہی لیکن ظہور اسلام کے ساتھ ہی خصوصاً حجاز میں ان کی قدرت کا آفتاب ڈوب گیا۔ بنی نضیر، بنی قریظہ اور خیبر کے یہودیوں سے پیغمبر اکرمؐ کی جنگوں کے باعث وہ انتہائی کمزور ہو گئے۔ اس موقع پر ان میں سے بعض نے اپنی گذشتہ قدرت وعظمت کو مد نظر رکھتے ہوئے استہزاء اور مذاق کے طور پر کہا کہ خدا کا ہاتھ تو زنجیر سے بندھا ہوا ہے اور وہ ہم پر بخشش ونوازش نہیں کرتا (بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ بات کہنے والا فنحاص بن عازورا تھا جو بنی قینقاع کا سردار تھا اور بعض نے نباش بن قیس کا نام لکھا ہے) چونکہ دوسرے بھی اس کی گفتگو سے راضی تھے لہٰذا قرآن نے اس بات کی ان سب کی طرف نسبت دی ہے اور فرمایا ہے یہودیوں نے کہا کہ خدا کا ہاتھ زنجیر سے بندھا ہوا ہے (وقالت الیھود ید اللہ مغلولۃ)۔

توجہ رہے کہ "ید" عربی میں کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا ایک معنی "ہاتھ" ہے۔ دوسرا "نعمت"، تیسرا "قدرت" چوتھا "سلطنت وحکومت" اور پانچواں "تسلط" ہے۔ البتہ اس کا حقیقی معنی "ہاتھ" ہی ہے اور چونکہ انسان اہم ترین کام ہاتھ سے انجام دیتا ہے لہٰذا یہ لفظ کنایہ کے طور پر دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فارسی میں "دست" بھی اسی طرح مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

طریق اہل بیتؑ سے مروی بعض روایات میں ہے کہ یہ بات یہودیوں کے مسئلہ قضا وقدر اور سرنوشت وتفویض کے بارے میں عقیدے کی طرف اشارہ ہے، ان کا نظریہ تھا کہ ابتدائے خلق میں خدا نے تمام امور کا تعین کر دیا ہے اور جسے انجام پانا چاہیے وہ گویا انجام پا چکا ہے اور خدا خود بھی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا[1] البتہ آیت کے ذیل میں "بل یداہ مبسوطتان" بھی ہے جیسا کہ آگے آئے گا، یہ عبارت پہلے معنی کی تائید کرتی ہے، البتہ دوسرا معنی بھی پہلے معنی کی طرف ہی

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۱ ص ۶۴۹، تفسیر برہان جلد ۱ ص ۴۸۹

ایک راستہ ہے کیونکہ جب ان کی زندگی درہم برہم ہوگئی اور ان کے اقبال کا ستارہ ڈوب گیا تو ان کا خیال تھا کہ یہ ان کی تقدیر میں تھا جسے بدلا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ انجام تو شروع سے معین ہو چکا ہے اور عملی طور پر خدا کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔

خدا تعالیٰ ان کے جواب میں پہلے تو اس عقیدے کی مذمت کرتا ہے، فرمایا گیا ہے: ان کے ہاتھ زنجیر سے بندھے ہوں اور اس ناروا بات کی وجہ سے وہ رحمت سے دُور ہوں (غلت ایدیھم ولعنوا بما قالوا)

اس کے بعد اس غلط عقیدے کے بطلان کے لیے ارشاد ہوتا ہے: خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے اور جس پر چاہتا ہے لطف و عنایت کرتا ہے (بل یداہ مبسوطتان ینفق کیف یشاء) اس کام میں کوئی مجبوری ہے نہ وہ عوامِل طبعی و فطری کے جبر کا محکوم ہے اور نہ وہ جبرِ تاریخی کا پابند ہے بلکہ اس کا ارادہ ہر چیز سے بالاتر اور ہر چیز میں نافذ ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ یہودیوں نے لفظ "ید" مفرد استعمال کیا ہے لیکن خدا نے "ید" کو تثنیہ کے طور پر استعمال کیا ہے، فرماتا ہے: اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ یہ دراصل تاکیدِ مطلب بھی ہے اور خدا تعالیٰ کے انتہائی جود و بخشش کے لیے لطیف کنایہ بھی۔ کیونکہ جو ذات زیادہ سخی ہو دونوں ہاتھ سے بخشش کرتی ہے۔ علاوہ ازیں دو ہاتھوں کا ذکر قدرتِ کاملہ کے لیے بھی کنایہ ہو سکتا ہے اور شاید یہ مادی و معنوی یا دنیوی و اُخروی نعمتوں کی طرف بھی اشارہ ہو۔

پھر ارشاد ہوتا ہے: یہاں تک کہ ان کی گفتار اور عقائد سے پردہ کشائی کرنے والی یہ آیات اُن پر مثبت اثر مرتب کرنے کی بجائے اور انہیں غلط راستے سے باز رکھنے کی بجائے ان میں سے بہت سوں کو ہٹ دھرمی کے چکر میں ڈال دیتی ہیں اور ان کا طغیان و کفر مزید بڑھ جاتا ہے (ولیزیدن کثیرًا منھم ما انزل الیک من ربک طغیانًا و کفرًا)۔

لیکن ان کی ان ناروا باتوں، عقائد اور طغیان و کفر میں ہٹ دھرمی کے بدلے خدا نے اس جہان میں ان کے لیے سخت سزا مقرر کی ہے اور وہ یہ کہ ان کے درمیان قیامت تک کے لیے دشمنی اور عداوت ڈال دی ہے (والقینا بینھم العداوۃ والبغضاء الیٰ یوم القیٰمۃ)۔

"عداوت" اور "بغضاء" سے یہاں کیا مُراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن اگر ہم یہودیوں کی موجودہ استثنائی اور ناپائیدار صورتِ حال سے قطع نظر کر لیں اور تاریخ میں ان کی دربدری اور پراگندگی کی زندگی کو ملحوظ نظر رکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس خاص تاریخی کیفیت کا ایک اہم عامل ان میں اتحاد، عزم اور ارادے کی پختگی کا فقدان تھا کیونکہ اگر ان میں اتحاد اور عزم صمیم ہوتا تو اتنی طویل تاریخ میں وہ اس طرح سے دربدر، منتشر اور بدبخت نہ رہتے۔

اسی سورہ کی آیہ ۱۴ کے ذیل میں اہلِ کتاب کے درمیان دائمی عداوت و دشمنی کے مسئلہ پر ہم نے مزید وضاحت کی ہے۔

آیت کے آخر میں آتشِ جنگ بھڑکانے کے لیے یہودیوں کی کوششوں اور خدا کی طرف سے مسلمانوں کو اس نابود کرنے والی آگ سے رہائی اور لطف و کرم کے بارے میں اشارہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب انھوں نے آتشِ جنگ بھڑکائی تو خدا نے اسے خاموش کر دیا اور تمہیں اس سے محفوظ رکھا (کلما اوقدوا نارًا للحرب اطفأھا اللہ) یہ حقیقت ہیں

پیغمبر اسلام کی پُر اعجاز زندگی کا ایک نکتہ ہے۔ کیونکہ یہودی حجاز کے تمام لوگوں کی نسبت زیادہ طاقتور اور جنگی امور سے زیادہ آشنا تھے۔ ان کے پاس نہایت محکم قلعے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے پاس مالی وسائل بھی بہت تھے جن سے وہ جنگوں میں کام لیتے تھے۔ یہاں تک کہ قریش ان کی مدد حاصل کرنے میں کوشش کرتے تھے۔ اوس و خزرج میں سے ہر قبیلہ ان سے پیمان دوستی اور جنگی معاہدے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے باوجود ان کی طاقت کا زعم اس طرح ٹوٹا کہ کوئی اس کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع کے یہودی خاص حالات کی وجہ سے جلاوطنی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ خیبر کے قلعوں میں رہنے والے اور فدک کے یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یہاں تک کہ حجاز کے بیابانوں میں رہنے والے یہودیوں نے بھی عظمتِ اسلام کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ نہ صرف یہ کہ وہ مشرکین کی مدد نہ کر سکے بلکہ خود بھی مقابلے سے کنارہ کش ہو گئے۔ قرآن مزید کہتا ہے: وہ ہمیشہ روئے زمین میں فتنہ فساد کے بیج بونے کی کوشش کرتے ہیں (ویسعون فی الارض فسادًا) جبکہ خدا فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ( واللہ لا یحب المفسدین )۔

اس بنا پر قرآن ان پر کبھی نسلی اور خاندانی حوالے سے کوئی اعتراض نہیں کرتا بلکہ قرآن کی تنقید اور سرزنش کا معیار اور نمونہ وہ اعمال ہیں جو ہر شخص اور گروہ انجام دیتا ہے۔ بعد کی آیات میں ہم دیکھیں گے کہ ان تمام چیزوں کے باوجود قرآن نے ان کے لیے راہِ حق کی طرف لوٹ آنے کی راہ کھلی رکھی ہے۔

۶۵۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○

۶۶۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۭ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۭ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَاۗءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ○

## ترجمہ

۶۵۔ اور اگر اہلِ کتاب ایمان لائے اور انھوں نے تقویٰ اختیار کیا تو ہم ان کے گناہ بخش دیں گے اور انھیں نعمات سے معمور باغاتِ بہشت میں داخل کر دیں گے۔

۶۶۔ اور اگر وہ تورات، انجیل اور جو کچھ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے (قرآن کی صورت میں) نازل ہوا ہے اسے قائم رکھیں تو آسمان اور زمین سے رزق کھائیں گے۔ ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر بُرے اعمال انجام دیتے ہیں۔

# تفسیر

گذشتہ آیات میں اہلِ کتاب کے طور طریقوں اور طرزِ عمل پر تنقید کی گئی ہے۔ اب ان دو آیات میں تربیتی اصول کے مطابق خدا تعالیٰ اہل کتاب میں سے منحرفین کو راہِ راست پر لانے، انھیں حقیقی راستے کی نشاندہی کرنے اور ان میں سے اقلیت جو ان کے غلط افعال میں ہم قدم نہ تھی کی تعریف کرنے کے لیے کہتا ہے، اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کرلیں تو ہم ان کے گذشتہ گناہوں پر پردہ ڈال دیں گے اور ان سے صرفِ نظر کریں گے (ولو ان اھل الکتاب اٰمنوا واتقوا لکفرنا عنھم سیئاتھم) نہ صرف ان کے گناہ بخش دیں گے بلکہ انھیں طرح طرح کی نعمتوں سے پُر باغاتِ جنت میں داخل کریں گے (ولادخلنا ھم جنات النعیم) یہ تو معنوی اور اخروی نعمتوں کے بارے میں ہے۔ اس کے بعد ایمان و تقویٰ کے گہرے اثر حتیٰ مادی زندگی میں اس کے اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھیں اور زندگی کے دستور العمل کے طور پر انھیں اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں اور جو کچھ پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے اس سب پر عمل کریں چاہے وہ گذشتہ آسمانی کتب ہوں یا قرآن اور ان میں تفرقہ و تعصب کو راہ نہ دیں تو آسمان و زمین کی نعمتیں انھیں گھیر لیں گی (ولو انھم اقاموا التوراة والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم)۔

اس میں شک نہیں کہ توارت اور انجیل کو قائم اور برپا رکھنے سے مراد ان کا وہ حقیقی حصہ ہے جو اس زمانے میں ان کے پاس موجود تھا نہ کہ ان کے تحریف شدہ حصے جو کم و بیش قرائن سے پہچانے جاتے تھے اور "ما انزل الیھم من ربھم" سے مراد تمام آسمانی کتب اور خدائی احکام ہیں کیونکہ یہ جملہ مطلق ہے اور در حقیقت اس طرف اشارہ ہے کہ قومی تعصبات کو دینی اور الٰہی مسائل کے ساتھ نہیں ملانا چاہیے۔ یہاں عربوں اور یہودیوں کی آسمانی کتب کی بات نہیں ہے۔ اصل بات تو خدائی احکام کی ہے۔ یہ کہہ کر قرآن چاہتا ہے کہ جس قدر ہو سکے ان کے تعصب کو کم کیا جائے اور ان کے قلب و روح کی گہرائیوں میں بات اثر کر سکے۔ اسی لیے تمام ضمیریں انھیں کی طرف لوٹتی ہیں (الیھم، من ربھم، من فوقھم، من تحت ارجلھم) یہ سب کچھ اس بنا پر ہے تاکہ وہ ہٹ دھرمی کی سواری سے اُتر پڑیں اور یہ تصور نہ کریں کہ قرآن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے عربوں کے سامنے سر جھکا دیا بلکہ اس کا مطلب تو خدائے عظیم کے سامنے سر جھکانا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ توارت و انجیل کے احکام کو قائم کرنے سے مراد ان کے اصول پر عمل کرنا ہے کیونکہ جیسے ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ تعلیماتِ انبیاء کے اصول تمام جگہ ایک جیسے ہیں اور ان کے درمیان صرف کامل و اکمل کا فرق ہے اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ گذشتہ دین کے بعض احکام بعد والے دین کے بعض احکام کے ذریعے منسوخ ہو جائیں۔

مختصر یہ کہ مندرجہ بالا آیت ایک مرتبہ پھر اس بات پر زور دے رہی ہے کہ آسمانی تعلیمات کی پیروی صرف بعد از موت کی زندگی کے اسباب مہیا کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ انسانوں کی تمام مادی زندگی کے لیے بھی مفید ہے۔ یہ پیروی جماعتوں اور گروہوں کی صفوں کو منظم کرتی ہے، توانائیوں کو مجتمع کرتی ہے، نعمتوں کو بابرکت کرتی ہے، وسائل کو وسعت دیتی ہے، زندگی کو

خوش حال بناتی ہے اور امن وامان پیدا کرتی ہے۔

ان عظیم مادی وسائل اور فراواں انسانی توانائیوں پر ایک نظر ڈالی جائے کہ جو آج کی دنیائے انسانیت میں تعلیماتِ انبیاء سے انحراف کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ سب تباہ کن ہتھیاروں، بے سبب کشمکشوں اور ویران کن مساعی پر صرف ہو رہی ہیں۔ آج دنیا کی جتنی دولت اور وسائل دنیا کی تباہی کے لیے استعمال ہو رہے ہیں وہ اصلاح وفلاح کے لیے استعمال ہونے والے وسائل سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ آج کس قدر دماغی صلاحیتیں جو جنگی ہتھیاروں کی تیاری اور استعماری وسامراجی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی ہیں، جو وسائل و ذرائع، صلاحیتیں اور توانائیاں فضول اور بے کار صرف ہو رہی ہیں ان کی نوعِ انسانی کس قدر ضرورت مند اور محتاج ہے۔ یہ سب نہ ہوتا تو دنیا آج خوب صورت، زیبا اور رہنے کے قابل ہوتی۔

ضمنی طور پر توجہ رہے کہ "من فوقہم" اور "من تحت ارجلہم" سے مراد یہ ہے کہ آسمان وزمین کی تمام نعمتیں انھیں گھیر لیں گی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس بات کے لیے کنایہ ہو کہ یہ نعمات عمومیت رکھتی ہیں۔ جیسا کہ عربی اور غیر عربی ادب میں کہا جاتا ہے کہ "فلاں شخص سرتاپا نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہے" یعنی ہر طرف سے نعمتیں اسے گھیرے ہوئے ہیں۔

یہ آیت یہودیوں کی اس گفتگو کا جواب بھی ہے جو گذشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ یعنی اگر تم دیکھتے ہو کہ خدا کی نعمتیں تم سے منقطع ہو چکی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ذات مقدس خدا میں بخل آگیا ہے یا اس کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، بلکہ یہ تو تمہارے اعمال ہی ہیں جو تمہاری مادی اور معنوی زندگی میں منعکس ہوئے ہیں اور تمہارے اعمال ہی نے تمہاری ہر طرح کی زندگی کو تاریک کر دیا ہے اور جب تک تم نہیں پلٹو گے یہ تاریکیاں بھی نہیں پلٹیں گی۔

آیت کے آخر میں ان میں سے ایک نیک اقلیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے، اگرچہ ان میں سے زیادہ تر تو بدکار ہی ہیں لیکن پھر بھی کچھ میانہ رو اور معتدل افراد ان میں موجود ہیں (جن کا معاملہ خدا کے نزدیک اور مخلوق خدا کے نزدیک دوسروں سے مختلف ہے) (منہم امۃ مقتصدۃ وکثیر منہم ساء ما یعملون)۔

اہلِ کتاب میں سے نیک اور صالح اقلیت کے بارے میں سورۂ اعراف آیہ ۱۵۹ اور ۱۸۱ اور سورۂ آلِ عمران آیہ ۷۵ میں بھی ایسی تعبیر دکھائی دیتی ہے۔

تفسیر نمونہ جلد چہارم ——————— کا ترجمہ

۸ رجب المرجب ۱۴۰۳ھ مطابق ۲۲ اپریل ۱۹۸۳ء جمعۃ المبارک، ساڑھے سات بجے صبح

سیٹھ نوازش علی کے مکان ۸۱ ای ماڈل ٹاؤن لاہور میں

از قلم حقیر پر تقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم

اختتام پذیر ہوا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۶۷۔ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○

## ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۶۷۔ اے پیغمبر جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا ہے اسے کامل طور سے (لوگوں تک) پہنچا دو اور اگر تم نے (ایسا) نہ کیا تو گویا تم نے اس کا (کوئی) کار رسالت سرانجام ہی نہیں دیا اور خداوند تعالیٰ تمہیں لوگوں کے (ان تمام خطرات) سے (جن کا احتمال ہے) محفوظ رکھے گا اور خداوند تعالےٰ (ہٹ دھرم) کفار کی ہدایت نہیں کرتا۔

## تفسیر

### انتخابِ جانشین پیغمبرہی آخری کار رسالت تھا

اس آیت کا ایک مخصوص لب و لہجہ ہے جو اسے اس سے پہلی آیات اور اس کے بعد کی آیات سے ممتاز کرتا ہے اس آیت میں روئے سخن صرف پیغمبرؐ کی طرف ہے اور یہ آیت صرف انہی کی ذمہ داری کو بیان کرتی ہے۔ (یاایہا الرسول) اے پیغمبرؐ! سے اس آیت کی ابتدا ہو رہی ہے اور یہ آیت صراحت اور تاکید کے ساتھ پیغمبرؐ کو حکم دے رہی ہے کہ جو کچھ ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے اُسے لوگوں تک پہنچا دیں (بلغ ما انزل الیک من ربک[1]) اس کے بعد (اس حکم کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے) تاکید مزید کے طور پر اس خطرے سے متنبہ کرتا ہے کہ اگر تم نے یہ کام نہ کیا (حالانکہ وہ ہرگز اس کام کی سرانجام دہی کو ترک نہ کرتے) تو یہ ایسا ہوگا گویا تم نے (کوئی) کار رسالت سرانجام ہی نہیں دیا (و ان لم تفعل فما بلغت رسالتہ)۔ اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ کے اضطراب اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے: اس رسالت اور پیغام کی ادائیگی کے بارے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت

---

[1] لفظ "بلغ" جیسا کہ راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے "ابلغ" کی نسبت زیادہ تاکید کو ظاہر کرتا ہے۔

نہیں ہے کیونکہ خدا انہیں اُن کے خطرات سے محفوظ رکھے گا (واللہ یعصمک من الناس)۔

اور آیت کے آخر میں اُن لوگوں سے جو اس مخصوص پیغام کا انکار کریں اور اس کے خلاف ہٹ دھرمی کرتے ہوئے کفر اختیار کرلیں ایک تہدید اور سزا کے عنوان سے یوں کہتا ہے: خدا ہٹ دھرمی کرنے والے کافروں کو ہدایت نہیں کرتا (ان اللہ لایھدی القوم الکافرین)۔

آیت کے جملوں کی بندش، اس کا مخصوص لب ولہجہ اور اس میں پے در پے تاکیدوں پر تاکیدیں اور آیت کا یاایھا الرسول سے شروع ہونا جو تمام قرآن مجید میں صرف دو مقام پر ہے اور اس حکم کی تعمیل اور اس رسالت کی تبلیغ نہ کرنے کی صورت میں پیغمبر کو یہ تہدید کہ اگر تم نے اس حکم کے پہنچانے میں کوتاہی کی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے کوئی کار رسالت سرانجام ہی نہیں دیا جو قرآن میں صرف اسی آیت میں ہے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گفتگو کسی ایسے اہم امر کے متعلق ہو رہی ہے کہ جس کی تبلیغ نہ کرنا کوئی بھی کار رسالت سرانجام نہ دینے کے برابر ہے۔

اس کے علاوہ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ یہ موضوع ایسا تھا جس پر شدت کے ساتھ مخالفت پیدا ہو چکی تھی اور اس موضوع کے مخالفین اتنے سخت تھے کہ اُن کی مخالفت کے پیش نظر پیغمبر بہت ہی پریشان تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس اعلان کو سن کر اسلام اور مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کردیں اسی لیے خداوند تعالیٰ انہیں تسلی دیتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسا ایسا اہم مقصد ومطلب تھا جس کے پہنچانے کے لیے خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبر کو اتنی تاکید کے ساتھ حکم دے رہا ہے؛ دراں حالیکہ جب ہم اس سورہ کے نزول کی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مسلماً پیغمبر کی عمر کے آخری دنوں میں نازل ہوئی ہے۔

کیا یہ توحید اور شرک وبت پرستی سے مربوط مسائل تھے جو برسوں پہلے پیغمبر اور مسلمانوں کے لیے حل ہو چکے تھے؛

یا یہ مسائل احکام شرع اور قوانین اسلام سے متعلق تھے؛ جبکہ اس وقت تک اُن کے اہم ترین مسائل بیان ہو چکے تھے۔

یا یہ مسائل اہل کتاب یہود ونصاریٰ سے مربوط تھے؛ حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ بنی النضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع نیز خیبر وفدک اور نصارائے نجران کے واقعے کے بعد اہل کتاب کا کوئی مسئلہ مسلمانوں کے لیے مشکل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

یا اس کا رابطہ منافقین کے ساتھ تھا؛ درانحالیکہ ہمیں معلوم ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب اسلام کا پورے جزیرہ نمائے عرب پر تسلط اور نفوذ ہو گیا تو منافقین کا معاشرے میں کوئی مقام ہی نہیں رہا تھا اور ان کی قوت بالکل ہی ٹوٹ چکی تھی اور ان کے پاس جو کچھ تھا وہ ان کے باطن میں تھا۔

حقیقتاً اب وہ کونسا اہم مسئلہ تھا جو پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کے آخری دنوں میں باقی رہ گیا تھا کہ مذکورہ بالا آیت جس کے بارے میں اس قسم کی تاکید کر رہی ہے۔

اس حقیقت میں بھی تردید کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ پیغمبر کا اضطراب اور پریشانی اپنی ذات اور اپنے نفس کے لیے نہیں تھی بلکہ مخالفین کی طرف سے ان احتمالی کارشکنیوں اور مخالفتوں کے بارے میں تھی جن کا نتیجہ مسلمانوں کے لیے

خطرات اور نقصانات کی صورت میں نکلتا۔

تو کیا پیغمبرؐ کے جانشین کے تعین اور اسلام و مسلمین کی آئندہ سرنوشت کے سوا کوئی اور مسئلہ ایسا ہو سکتا ہے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں۔

اب ہم اُن مختلف روایات کی طرف لوٹتے ہیں جو اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کی متعدد کتابوں میں آیتِ مذکورہ بالا کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ان روایات سے مذکورہ احتمال کے ثابت کرنے میں کہاں تک استفادہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم اُن اعتراضات اور سوالات پر بحث کریں گے جو اس تفسیر کے بارے میں اہلِ سنت کے بہت سے مفسرین کی طرف سے ظاہر کیے گئے ہیں۔

## آیہ تبلیغ کی شانِ نزول

اگرچہ انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس آیت سے مربوط حقائق کسی قسم کی پردہ پوشی کے بغیر تمام مسلمانوں کے ہاتھوں تک نہیں پہنچائے گئے اور پہلے سے کیے گئے فیصلے اور مذہبی تعصبات اس کے اظہار سے مانع ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود اہلِ سنت کے علماء کی تحریر کردہ مختلف کتابوں میں خواہ وہ تفسیر کی کتابیں ہوں یا حدیث و تاریخ کی، اُن میں بہت زیادہ روایات ایسی ملتی ہیں جو صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ آیت مذکورہ حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان روایات کو بہت سے اصحاب پیغمبرؐ نے نقل کیا ہے۔ مثلاً زید ابن ارقم، ابو سعید خدری، ابن عباس، جابر ابن عبداللہ انصاری، ابو ہریرہ، براّء ابن عازب، حذیفہ، عامر بن لیلی بن ضمرہ اور ابن مسعود۔ یہ سب کے سب اصحاب پیغمبرؐ اس بات پر متفق ہیں کہ آیت مذکورہ حضرت علی علیہ السلام اور واقعہ غدیر کے متعلق ہی نازل ہوئی ہے۔

یہ احادیث مذکورہ اصحاب پیغمبرؐ سے مختلف طرق سے بیان ہوئی ہیں مثلاً،

زید ابن ارقم کی بیان کردہ حدیث ایک طرق سے،

ابو سعید خدری کی بیان کردہ حدیث گیارہ طرق سے،

ابن عباس کی بیان کردہ حدیث گیارہ طرق سے اور

براّء بن عازب کی بیان کردہ حدیث تین طرق سے نقل کی گئی ہیں۔

جن علماء نے اپنی کتابوں میں ان احادیث کو تصریح کے ساتھ بیان کیا ہے وہ بہت زیادہ ہیں جن میں سے بعض کے نام ہم نمونہ کے طور پر ذکر کرتے ہیں،

۱ حافظ ابو نعیم اصفہانی نے اپنی کتاب "ما نزل من القرآن فی علی" میں بحوالہ خصائص صـ۲۹ یہ روایت درج کی ہے۔

۲ ابو الحسن واحدی نیشاپوری نے اسباب النزول صـ۱۵۰ میں۔

۳ حافظ ابو سعید سجستانی نے کتاب الولایۃ میں (کتاب طرائف کے حوالے سے)۔

۴ ابن عساکر شافعی نے (در منثور جلد ۲ صفحہ ۲۹۸ کے حوالے سے)۔
۵ فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۶۳۶ میں۔
۶ ابو اسحاق حموینی نے فرائد السمطین میں۔
۷ ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ صفحہ ۲۷ پر۔
۸ جلال الدین سیوطی نے در منثور جلد ۲ صفحہ ۲۹۸ میں۔
۹ قاضی شوکانی نے فتح القدیر جلد سوم صفحہ ۵۷ میں
۱۰ شہاب الدین آلوسی شافعی نے روح المعانی جلد ۶ صفحہ ۱۷۲ پر
۱۱ شیخ سلیمان قندوزی حنفی نے ینابیع المودۃ میں صفحہ ۱۲۰ پر
۱۲ بدر الدین حنفی نے عمدۃ القاری فی شرح صحیح البخاری جلد ۸ صفحہ ۵۸۶ پر
۱۳ شیخ محمد عبدہ مصری نے تفسیر المنار جلد ۶ صفحہ ۴۶۳ پر
۱۴ حافظ ابن مردویہ (متوفی ۴۱۶ھ) نے (سیوطی کی در منثور کے حوالے سے)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علماء اہل سنت نے آیت مذکورہ کی یہی شان نزول بیان کی ہے۔ اس سے یہ اشتباہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ مذکورہ علماء و مفسرین نے آیت کے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نزول کو قبول بھی کر لیا ہے بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ انہوں نے اس مطلب سے مربوط روایات کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

اگرچہ اپنے معاشرے کے مخصوص حالات کے خوف سے یا پہلے سے کیے ہوئے غلط فیصلے کی بنا پر انہوں نے اسی مشہور روایت کو نقل کرنے کے باوجود قبول نہیں کیا اور عموماً پہلے سے طے شدہ رائے ایسے موقع پر صحیح فیصلہ کرنے میں حائل ہوتی ہے بعض نے تو یہ کوشش کی ہے کہ جتنا بھی ہو سکے اس کی اہمیت کو گھٹا کر پیش کیا جائے۔ مثلاً فخر الدین رازی نے جس کا تعصب مخصوص مذہبی مسائل میں مشہور و معروف ہے، اس شان نزول کی اہمیت کم کرنے کے لیے اسے آیت کا دسواں احتمال قرار دیا ہے اور دوسرے نو (۹) احتمال جو انتہائی کمزور اور بہت ہی بے ہودہ اور بے وقعت ہیں انہیں پہلے بیان کیا ہے۔

فخر الدین رازی پر زیادہ تعجب نہیں کیونکہ اس کی تو ہر جگہ یہی روش ہے لیکن تعجب تو ان روشن فکر لکھنے والوں پر ہوتا ہے جنہوں نے اس آیت کی شان نزول کے بارے میں کہ جس سے مختلف قسم کی کتابیں بھری پڑی ہیں مطلقاً کوئی گفتگو ہی نہیں کی یا اس کو اتنی کم اہمیت دی ہے کہ کسی کی اس طرف توجہ ہی نہ جائے۔ جیسا کہ سید قطب نے فی ظلال میں اور محمد رشید رضا نے المنار میں اس کی شان نزول کو بالکل بیان ہی نہیں کیا۔

ہمیں نہیں معلوم کہ آیا ان کا ماحول اس حقیقت کو بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا یا تعصب آمیز فکری حجاب اتنے زیادہ تھے کہ روشن فکری کی بجلی کی چمک ان پردوں کو ہٹا کر اس حقیقت کی گہرائی تک نہ پہنچ سکی۔

البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس آیت کی شان نزول کو حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں برملا طور پر

تسلیم کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اس بات کی تردید کی ہے کہ یہ آیت مسئلہ ولایت وخلافت پر دلالت کرتی ہے ہم ان کے اعتراضات اور جوابات انشاء اللہ آگے چل کر بیان کریں گے۔

بہرحال جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ وہ روایات جو اس بارے میں شیعہ کتب ہی میں نہیں بلکہ اہل سنت کی معروف کتابوں میں بھی ہیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا انکار کیا ہی نہیں جاسکتا اور نہ ہی انہیں آسانی کے ساتھ نظر انداز کیا جا سکتا ہے

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن مجید کی دوسری آیات کی شان نزول میں تو ایک دو احادیث پر ہی اکتفا کر لیا جاتا ہے لیکن اس آیت کی شان نزول کے بارے میں اتنی کثیر روایات کو بھی کیوں کافی نہیں سمجھا جاتا؟ کیا یہ آیت ایسی خصوصیت رکھتی ہے جو دوسری آیات نہیں رکھتیں؟ اور کیا اس آیت کے سلسلے میں اس سخت رویے کے متعلق کوئی منطقی دلیل مل سکتی ہے؟

دوسری بات جس کی یاد دہانی اس مقام پر ضروری ہے یہ ہے کہ جو روایات ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ تو صرف وہ تھیں جو اس آیت کے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہونے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں (یعنی وہ روایات تھیں جو اس آیت کی شانِ نزول کے متعلق تھیں) ورنہ وہ روایات جو غدیر خم کے مقام پر پیغمبر اکرمؐ کے خطبہ پڑھنے اور حضرت علیؑ کا بطور وصی وولی کے تعارف کرانے کے بارے میں منقول ہیں وہ تو ان سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ چنانچہ علامہ امینی نے اپنی کتاب "الغدیر" میں حدیث غدیر کو ۱۱۰ اصحاب پیغمبرؐ سے اور ۸۴ تابعین سے اور ۳۶۰ علماء سے اور مشہور کتب اسلامی سے اسناد ومدارک کے ساتھ نقل کیا ہے۔ یہ صورت حال اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مذکورہ حدیث قطعی ترین متواتر احادیث میں سے ہے اور اگر کوئی شخص ایسی حدیث وروایت کے قطعی ویقینی ہونے میں بھی شک وشبہ کرے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ وہ کسی بھی متواتر حدیث کو قبول نہیں کرسکتا۔ ان تمام روایات کے متعلق بحث کرنا جو آیت کی شان نزول کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور اسی طرح اُن تمام روایات کے سلسلہ میں گفتگو کرنا جو حدیث غدیر کے متعلق نقل ہوئی ہیں ایک ضخیم کتاب کا محتاج ہے۔ ان کا تفصیلی بیان ہمیں تفسیر کے دائرے سے خارج کر دے گا لہٰذا ہم اسی مقدار پر قناعت کرتے ہیں اور ان اشخاص کو جو اس سلسلہ میں مزید مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یہ دعوت دیتے ہیں کہ وہ سیوطی کی "در منثور"، علامہ امینی کی "الغدیر"، قاضی نور اللہ شوستری کی "احقاق الحق"، شرف الدین کی "المراجعات" اور محمد حسن مظفر کی "دلائل الصدق" جیسی کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

## واقعہ غدیر کا خلاصہ

وہ بہت سی روایات جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں باوجودیکہ سب کی سب ایک ہی واقعہ کے گرد گھومتی ہیں پھر بھی طرح طرح کی تعبیرات کی حامل ہیں۔ بعض روایات بہت مفصل اور طویل ہیں، بعض مختصر لیکن جچی تلی ہیں، بعض روایات اس واقعہ کا ایک گوشہ بیان کرتی ہیں تو دوسری روایات اس واقعہ کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہوئی نظر آتی ہیں

لیکن ان تمام روایات کے مجموعے اور اسلامی تواریخ، قرائن و حالات اور ماحول و مقام واقعہ کے مطالعہ سے یہ واقعہ سامنے آتا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ کی زندگی کا آخری سال تھا۔ حجۃ الوداع کے مراسم جس قدر باوقار و پرشکوہ ہو سکتے اُس قدر پیغمبر اکرمؐ کی ہمراہی میں اختتام پذیر ہوئے۔ سب کے دل روحانیت سے سرشار تھے ابھی اُن کی روح اس عظیم عبادت کی معنوی لذت کا ذائقہ محسوس کر رہی تھی۔ اصحاب پیغمبرؐ جن کی تعداد بہت زیادہ تھی اس عظیم نعمت سے فیض یاب ہونے اور اس سعادت کے حاصل ہونے پر جامے میں پھولے نہیں سماتے تھے[1]۔

نہ صرف مدینے کے لوگ اس سفر میں پیغمبرؐ کے ساتھ تھے بلکہ جزیرہ نمائے عرب کے دیگر مختلف حصوں کے مسلمان بھی یہ عظیم تاریخی اعزاز و افتخار حاصل کرنے کے لیے آپؐ کے ہمراہ تھے۔

سرزمین حجاز کا سورج دروں اور پہاڑوں پر آگ برسا رہا تھا لیکن اس سفر کی بے نظیر روحانی مٹھاس تمام تکلیفوں کو آسان بنا رہی تھی۔ زوال کا وقت نزدیک تھا۔ آہستہ آہستہ جحفہ کی سرزمین اور اس کے بعد خشک اور جلانے والے "غدیر خم" کے بیابان نظر آنے لگے۔

دراصل یہاں پر ایک چوراہا ہے جو حجاز کے لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ شمالی راستہ مدینہ کی طرف دوسرا مشرقی راستہ عراق کی طرف، تیسرا راستہ مغربی ممالک اور مصر کی طرف اور چوتھا جنوبی راستہ سرزمین یمن کو جاتا ہے یہی وہ مقام ہے جہاں پر آخری مقصد اور اس عظیم سفر کا اہم ترین کام انجام پذیر ہونا تھا تاکہ مسلمان پیغمبرؐ کی اہم ذمہ داریوں میں سے اُن کا آخری حکم جان کر ایک دوسرے سے جدا ہوں۔

جمعرات کا دن تھا اور ہجرت کا دسواں سال۔ آٹھ دن عید قربان کو گزرے تھے کہ اچانک پیغمبرؐ کی طرف سے ان کے ہمراہیوں کو ٹھہر جانے کا حکم دیا گیا۔ مسلمانوں نے بلند آواز سے اُن لوگوں کو جو قافلے کے آگے آگے چل رہے تھے واپس لوٹنے کے لیے پکارا اور اتنی دیر کے لیے ٹھہر گئے کہ پیچھے آنے والے لوگ بھی پہنچ جائیں۔ آفتاب خط نصف النہار سے گزر گیا تو پیغمبرؐ کے مؤذن نے اللہ اکبر کی صدا کے ساتھ لوگوں کو نماز ظہر پڑھنے کی دعوت دی۔ مسلمان جلدی جلدی نماز پڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن فضا اتنی گرم تھی کہ بعض لوگ مجبور تھے کہ وہ اپنی عبا کا کچھ حصہ پاؤں کے نیچے اور باقی سر کے اوپر لے لیں۔ ورنہ بیابان کی گرم ریت اور سورج کی شعاعیں ان کے سر اور پاؤں کو تکلیف دے رہے تھے۔

اس صحرا میں کوئی سائبان نظر آتا تھا اور نہ ہی کوئی سبزہ یا گھاس صرف چند بے برگ و بار بیابانی درخت تھے جو گرمی کا سختی کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے کچھ لوگ انہی چند درختوں کا سہارا لیے ہوئے تھے اور انہوں نے اُن برہنہ درختوں پر ایک کپڑا ڈال رکھا تھا اور پیغمبرؐ کے لیے ایک سائبان سا بنا رکھا تھا لیکن گرم ہوا اس سائبان کے نیچے سے گزرتی ہوئی سورج کی جلانے والی گرمی کو اُس سائبان کے نیچے بھی پھیلا رہی تھی۔ بہرحال ظہر کی نماز پڑھ لی گئی۔

---

[1] پیغمبر اکرمؐ کے ہمراہ جانے والوں کی تعداد بعض نے ۹۰ ہزار، بعض نے ۱۱۴ ہزار، بعض نے ۱۲۰ ہزار اور بعض نے ۱۲۴ ہزار لکھی ہے۔

مسلمان ارادہ کر رہے تھے کہ فوراً اپنے چھوٹے چھوٹے خیموں میں جا کر پناہ لیں جو انہوں نے اپنے ساتھ اٹھا رکھے تھے لیکن رسول اللہؐ نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ سب کے سب خداوند تعالیٰ کا ایک نیا پیغام سننے کے لیے تیار ہوں جسے ایک مفصل خطبے کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

جو لوگ رسول اللہؐ سے دور تھے وہ پیغمبرؐ کا ملکوتی چہرہ اس عظیم اجتماع میں دور سے نہیں دیکھ پا رہے تھے لہٰذا اونٹوں کے پالانوں کا منبر بنایا گیا۔ پیغمبرؐ اس کے اوپر تشریف لے گئے۔ پہلے پروردگار عالم کی حمد و ثنا بجا لائے اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے یوں خطاب فرمایا: میں عنقریب خداوند تعالیٰ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تمہارے درمیان سے جا رہا ہوں میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو تم میرے بارے میں کیا گواہی دو گے لوگوں نے بلند آواز میں کہا نشهد انك قد بلغت ونصحت وجهدت فجزاك الله عنا خيرا یعنی ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے فریضہ رسالت انجام دیا اور خیر خواہی کی ذمہ داری کو انجام دیا اور ہماری ہدایت کی راہ میں سعی و کوشش کی، خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کیا تم لوگ خدا کی وحدانیت، میری رسالت اور روز قیامت کی حقانیت اور اس دن مردوں کے قبروں سے مبعوث ہونے کی گواہی نہیں دیتے؟

سب نے کہا: کیوں نہیں ہم سب گواہی دیتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا خداوندا گواہ رہنا۔

آپؐ نے مزید فرمایا لوگو! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟

انہوں نے کہا: جی ہاں۔

اس کے بعد سارے بیابان پر سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ سوائے ہوا کی سنسناہٹ کے کوئی چیز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: دیکھو! میں تمہارے درمیان دو گرانمایہ اور گرانقدر چیزیں بطور یادگار کے چھوڑے جا رہا ہوں تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟

حاضرین میں سے ایک شخص نے پکار کر کہا: یا رسول اللہؐ! وہ دو گرانمایہ چیزیں کونسی ہیں؟

تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: پہلی چیز تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو ثقل اکبر ہے۔ اس کا ایک سرا تو پروردگار عالم کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے، اس سے ہاتھ نہ ہٹانا ورنہ تم گمراہ ہو جاؤ گے اور دوسری گرانقدر یادگار میرے اہل بیت ہیں اور مجھے خدائے لطیف و خبیر نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ بہشت میں مجھ سے آملیں گے۔

ان دونوں سے آگے بڑھنے (اور ان سے تجاوز کرنے) کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی ان سے پیچھے رہنا کہ اس صورت میں بھی تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ رسول اللہؐ اپنے اردگرد نگاہیں دوڑا رہے ہیں گویا کسی کو تلاش کر رہے ہیں جونہی آپؐ کی نظر حضرت علی علیہ السلام پر پڑی فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغلوں کے نیچے کی سفیدی نظر آنے لگی اور سب لوگوں نے انہیں دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ تو اسلام کا وہی سپہ سالار ہے کہ جس نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا۔

اس موقع پر پیغمبرؐ کی آواز زیادہ نمایاں اور بلند ہوگئی اور آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ایھا الناس من اولی الناس بالمؤمنین من انفسھم

یعنی — اے لوگو! بتاؤ وہ کون ہے جو تمام لوگوں کی نسبت مومنین پر خود اُن سے زیادہ اولیت رکھتا ہے؟ اس پر سب حاضرین نے بہ یک آواز جواب دیا کہ خدا اور اس کا پیغمبرؐ بہتر جانتے ہیں۔

تو پیغمبرؐ نے فرمایا: خدا میرا مولا اور رہبر ہے اور میں مومنین کا مولا و رہبر ہوں اور ان کے اوپر ان کی نسبت خود اُن سے زیادہ حق رکھتا ہوں (اور میرا ارادہ ان کے ارادے سے مقدم ہے)۔

اس کے بعد فرمایا:

فمن کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ یعنی جس جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس اس کا مولا و رہبر ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے اس جملے کی تین مرتبہ تکرار کی اور بعض راویوں کے قول کے مطابق پیغمبرؐ نے یہ جملہ چار مرتبہ دہرایا اور اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کر کے بارگاہ خداوندی میں عرض کی:

اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ واحب من احبہ وابغض من ابغضہ و انصر من نصرہ واخذل من خذلہ وادر الحق معہ حیث دار۔

یعنی — بارالٰہا جو اس کو دوست رکھے تو اس کو دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی رکھ۔ جو اس سے محبت کرے تو اُس سے محبت کر اور جو اس سے بغض رکھے تو اس سے بغض رکھ۔ جو اس کی مدد کرے تو اُس کی مدد کر جو اس کی مدد سے کنارہ کشی کرے تو اسے اپنی مدد سے محروم رکھ اور حق کو ادھر پھیر دے جدھر وہ رُخ کرے۔

اس کے بعد فرمایا۔ الا فلیبلغ الشاھد الغائب یعنی تمام حاضرین آگاہ ہو جائیں اس بات پر کہ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو اُن لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں پر اور اس وقت موجود نہیں ہیں۔ پیغمبرؐ کا خطبہ ختم ہوگیا۔ پیغمبرؐ پسینے میں شرابور تھے حضرت علی علیہ السلام بھی پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ دوسرے تمام حاضرین کے بھی سر سے پاؤں تک پسینہ بہہ رہا تھا۔ ابھی اس جمعیت کی صفیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئی تھیں کہ جبرئیل امین وحی لے کر نازل ہوئے اور تکمیل دین کی پیغمبرؐ کو بایں الفاظ بشارت دی:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ۔ ۔ ۔ الخ

"آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین اور آئین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا۔"

اتمام نعمت کا پیغام سن کر پیغمبرؐ نے فرمایا:

اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر علی اکمال الدین واتمام النعمة ورضی الرب برسالتی والولایة لعلی من بعدی،

ہر طرح کی بزرگی و بڑائی خدا ہی کے لیے ہے کہ جس نے اپنے دین کو کامل فرمایا اور اپنی نعمت کو ہم پر تمام کیا اور میری نبوت و رسالت اور میرے بعد کے لیے علیؑ کی ولایت کے لیے خوش ہوا۔

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کا پیغمبرؐ کی زبان مبارک سے اعلان سن کر حاضرین میں مبارک باد کا شور برپا ہوا لوگ بڑھ چڑھ کر اس اعزاز و منصب پر حضرت علیؑ کو اپنی طرف سے مبارکباد پیش کر رہے تھے معروف شخصیتوں میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی طرف سے مبارک باد کے یہ الفاظ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں کہ انہوں نے کہا

بخ بخ لك یا ابن ابی طالب اصبحت واصبحت مولای و مولا کل مؤمن و مؤمنة

مبارک ہو! مبارک ہو! اے فرزند ابی طالب کہ آپ میرے اور تمام صاحبان ایمان مردوں اور عورتوں کے مولا اور رہبر ہو گئے۔

اس وقت ابن عباس نے کہا بخدا یہ عہد و پیمان سب کی گردنوں میں باقی رہے گا۔ عرب کے مشہور شاعر مداح رسولؐ حسان بن ثابت نے پیغمبرؐ سے اجازت لے کر اس موقع کی مناسبت سے ایک قصیدہ پڑھا جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:

ینادیھم یوم الغدیر نبیھم ـــــ • ـــــ بخم واسمع بالرسول منادیا

فقال فمن مولاکم و نبیکم ـــــ • ـــــ فقالوا ولم یبدوا ھناك التعامیا

الٰھك مولانا و انت نبینا ـــــ • ـــــ ولم تلق منا فی الولایة عاصیا

فقال له قم یا علی فاننی ـــــ • ـــــ رضیتك من بعدی اماما وھادیا

فمن کنت مولاه فھذا ولیه ـــــ • ـــــ فکونوا له اتباع صدق موالیا

ھناك دعا اللھم وال ولیه ـــــ • ـــــ وکن للذی عادا علیا معادیا

"یعنی پیغمبرؐ نے غدیر کے دن خم کے مقام پر انہیں ندا دی اور پکارا اور یہ پکارنے والا کس قدر گرامی قدر تھا۔"

"فرمایا، تمہارا مولا اور تمہارا نبی کون ہے؟ تو انہوں نے بلا تردد صراحت کے ساتھ جواب دیا۔"

"کہ آپ کا خدا ہمارا مولا اور آپ ہمارے پیغمبر ہیں اور ہم آپ کی ولایت کے قبول کرنے سے روگردانی نہیں کریں گے۔"

"اس پر پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے کہا کھڑے ہو جاؤ کیونکہ میں نے تمہیں اپنے بعد کے لیے امام اور رہبر منتخب کیا ہے۔"

"اس کے بعد فرمایا جس شخص کا میں مولا و رہبر ہوں یہ علیؑ اس کے مولا و رہبر ہیں پس تم سچے دل سے ان کی پیروی کرنا۔"

"اس وقت پیغمبرؐ نے عرض کیا: بارالہا! اس کے دوست کو دوست اور اس کے دشمن کو دشمن رکھنا۔"[1]

---

[1] یہ اشعار اہل سنت کے بہت سے علماء نے نقل کیے ہیں ان میں حافظ ابو نعیم اصفہانی، حافظ ابو سعید سجستانی، خوارزمی مالکی، حافظ ابو عبداللہ مرزبانی گنجی شافعی، جلال الدین سیوطی، سبط ابن جوزی اور صدرالدین حموی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

یہ تھا مشہور حدیث غدیر کا خلاصہ جو اہل سنت اور شیعہ کتب میں موجود ہے۔

## جرح و تنقید اور اعتراضات

اس میں شک نہیں کہ اگر یہ آیت خلافت علیؑ کے علاوہ کسی دوسرے موضوع سے متعلق ہوتی، تو جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان روایات اور خود آیت میں موجود قرائن سے کم مقدار پر بھی قناعت کر لی جاتی جیسا کہ دنیائے اسلام کے بڑے بڑے مفسرین نے قرآن کریم کی باقی تمام آیات کی تعبیر میں بعض اوقات زیر نظر آیت کے موجود مدارک کے دسویں حصہ بلکہ اس سے بھی کم تر پر قناعت کر لی ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس مقام پر تعصب کے پردے بہت سے حقائق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔

جن لوگوں نے اس آیت کی تفسیر اور اُن متعدد روایات کے متعلق جو اس آیت کی شان نزول کے بارے میں بیان ہوئی ہیں اختلاف کیا ہے اور حدِ تواتر سے بڑھی ہوئی اُن روایات کے مقابلے میں علم مخالفت بلند کیا ہے جو در اصل واقعہ غدیر کے متعلق ہیں دو قسم کے ہیں:

پہلی قسم ان لوگوں کی ہے کہ جو شروع ہی سے نہ صرف دشمنی اور ہٹ دھرمی سے اس پر بحث کرتے ہیں بلکہ انہوں نے شیعوں کی ہتک و توہین، بدگوئی اور دشنام طرازی کا راستہ اختیار کیا ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے روحِ تحقیق کی حفاظت کی ہے اور وہ کسی حد تک حقیقت کی تہ تک پہنچ گئے ہیں لہٰذا انہوں نے استدلال کی راہ اپنائی ہے اسی بنا پر انہوں نے حقائق کے ایک حصے کا اعتراف کر لیا ہے۔ لیکن انہوں نے اس آیت اور اس سے مربوط روایات بیان کرنے سے پہلے کچھ اشکالات بیان کیے ہیں اور وہ اشکالات جو شاید اُن خاص حالات کا نتیجہ تھے جو اُن کے فکری ماحول پر محیط تھا، بیان کرنے کے بعد اس آیت اور اس سے مربوط روایات ذکر کی ہیں۔

پہلے گروہ کا واضح نمونہ ابن تیمیہ ہے اس نے اپنا موقف کتاب منہاج السنۃ میں بیان کیا ہے اس میں اس کی حالت بالکل اس شخص کی طرح ہے جو روز روشن میں اپنی آنکھیں بند کرلے اور اپنی انگلیاں زور سے کانوں میں ٹھونس لے اور چلانا شروع کردے کہ سورج کہاں ہے۔ نہ تو وہ اپنی آنکھوں کو کھولنے کے لیے تیار ہوتا ہے کہ کچھ حقائق کو دیکھ لے نہ کانوں سے انگلیاں نکالنے پر آمادہ ہوتا ہے کہ کچھ اسلامی محدثین و مفسرین کی داد و فریاد سن سکے بس مسلسل اور پے در پے گالیاں دیئے چلے جارہا ہے اور ہتک حرمت پر کمربستہ ہے۔ ایسے افراد جہالت، بے خبری، ہٹ دھرمی اور خشونت آمیز تعصب کے ہاتھوں اتنے مجبور ہیں کہ ایسے واضح اور بدیہی مسائل کا بھی انکار کر دیتے ہیں جن کا ہر آدمی آسانی کے ساتھ ادراک کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کی باتیں نقل کرنے کی ہم اپنے آپ کو زحمت دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے جوابات پڑھنے کی تکلیف قارئین کو دیتے ہیں کیونکہ عظیم اسلامی علماء و مفسرین جن کی اکثریت علماء اہل سنت میں سے ہے جنہوں نے تصریح کی ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور جو شخص ان کے خلاف ڈھٹائی سے کہے کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی ایسی کوئی چیز اپنی کتاب میں نقل نہیں کی، ایسے شخص کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں اور ایسے آدمی کی بات کیا وزن رکھتی ہے کہ جس پر ہم بحث کریں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "ابن تیمیہ" نے اُن بہت سی معتبر کتابوں کے مقابلے میں کہ جن میں اس آیت کے حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اپنی برأت کے لیے اس مضحکہ خیز جملہ پر اکتفا کیا ہے۔

"اُن علماء میں سے جو یہ جانتے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں کوئی بھی اس آیت کو حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوتا نہیں جانتا"

گویا صرف وہ علماء جو ابن تیمیہ کے عناد آلود ہٹ دھرمی کے افراط زدہ میلانات کے ساتھ ہم آواز ہیں صرف وہی "سمجھتے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں" ورنہ جو شخص اس کا ہم آواز نہیں ہے وہ ایسا دانشمند ہے کہ جسے یہ پتہ ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ ایسے شخص کی منطق ہے کہ جس کی فکر پر خود خواہی اور ہٹ دھرمی سایہ فگن ہے۔ ہم اس گروہ کا ذکر یہیں پر چھوڑتے ہیں۔

البتہ ان اعتراضات میں سے جو دوسرے گروہ نے کیے ہیں اُن میں سے چند قابلِ بحث ہیں جنہیں ہم ذیل میں آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

## ۱۔ کیا مولیٰ کا معنی اولیٰ بالتصرف ہے؟

اہم ترین اعتراض جو حدیث غدیر کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے یہ ہے کہ "مولیٰ" کے معانی میں سے ایک معنی دوست اور یاور و مددگار بھی ہے اور یہ معلوم نہیں ہے کہ یہاں یہ معنی مراد نہ ہو!

اس بات کا جواب کوئی مشکل یا پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ ہر غیر جانبدار دیکھنے والا شخص جانتا ہے کہ علی کی دوستی کے ذکر اور یاد دہانی کے لیے ان مقدمات و تشکیلات، اور خشک جلا دینے والے بیابان کے وسط میں خطبہ پڑھنے، اور لوگوں کو وہاں ٹھہرانے اور اُن سے پے در پے اقرار لینے اور اعتراف کرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کا ایک دوسرے سے دوستی رکھنا مسائل اسلامی میں سے ایک بدیہی ترین مسئلہ تھا جو آغازِ اسلام سے ہی موجود تھا۔ علاوہ ازیں یہ کوئی ایسا مطلب نہیں تھا کہ جس کی پیغمبرؐ نے اس وقت تک تبلیغ نہ کی ہو بلکہ آپؐ تو بارہا اس کی تبلیغ کر چکے تھے۔

یہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی کہ جس کے اظہار سے آپؐ پریشان ہوں اور خدا کو اس کے لیے تسلی اور حفاظت کی ضمانت دینی پڑے۔

یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں تھا کہ خداوند عالم اس لب و لہجہ کے ساتھ اپنے پیغمبرؐ سے گفتگو کرتا "اگر اس کی تبلیغ نہ کی تو رسالت کی تبلیغ بھی نہ کی" یہ سب چیزیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ یہ مسئلہ ایک عام دوستی سے کہیں اونچا تھا۔ وہ دوستی جو اسلام کے پہلے ہی دن سے اخوت اسلامی کی الف کا حصّہ شمار ہوتی تھی۔

علاوہ ازیں اگر اس سے ایک عام اور سادہ دوستی کا بیان کرنا ہی منظور ہوتا تو پیغمبرؐ پہلے یہ اقرار لوگوں سے کیوں لیتے کہ "الست اولیٰ بکم من انفسکم" یعنی کیا میں تمہاری نسبت تمہارے نفوس پر خود تم سے زیادہ مقتدار اور صاحبِ اختیار نہیں ہوں[۱]

---

۱۔ یہ جملہ متعدد روایات میں وارد ہوا ہے۔

کیا یہ جملہ ایک عام دوستی کے بیان کے ساتھ کسی قسم کی مناسبت رکھتا ہے؟ نیز ایک عام دوستی تو یہ مقام نہیں رکھتی تھی کہ لوگ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ جیسی شخصیت بھی حضرت علیؑ کو اس طرح سے مبارک باد اور تہنیت پیش کریں:

"اصبحت مولای و مولا کل مؤمن و مؤمنة"

"اے علیؑ! آپ میرے اور ہر مومن مرد اور ہر مومن عورت کے مولا ہو گئے"

اور اسے ایک نیا منصب اور اعزاز شمار کریں [1]

کیا حضرت علیؑ اس دن تک ایک عام مسلمان کی حیثیت سے بھی پہچانے نہیں گئے تھے۔ کیونکہ ایک مسلمان کی دوستی تو تمام مسلمانوں پر لازم و ضروری ہے۔ کیا مسلمانوں کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے دوستی کرنا کوئی نئی بات تھی کہ جس کے لیے مبارک باد دینے کی ضرورت ہو اور وہ بھی رسول اللہؐ کی عمر کے آخری سال میں۔

علاوہ ازیں کیا حدیث ثقلین اور وداعِ پیغمبرؐ سے تعلق رکھنے والی تعبیرات کا حضرت علیؑ کی دوستی کے مسئلہ سے بھی کوئی ربط ہو سکتا ہے؟ حضرت علیؑ کی مومنین کے ساتھ ایک عام دوستی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اُسے قرآن کے ہم پلہ اور برابر قرار دے دیں [2]

کیا ہر غیر جانبدار دیکھنے والا شخص اس تعبیر سے یہ نہیں سمجھتا کہ یہاں پر مسئلہ رہبری و امامت سے متعلق گفتگو ہو رہی ہے کیونکہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد قرآن مسلمانوں کا پہلا رہبر ہے لہٰذا اسی بنیاد پر اہلِ بیت علیہم السلام مسلمانوں کے دوسرے رہبر ہیں۔

## ۳۔ آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے قبل و بعد کی آیات اہل کتاب اور ان کی غلط کاریوں کے بارے میں ہیں۔ خاص طور پر تفسیر المنار کے مؤلف نے جلد ۶ صفحہ ۴۶۶ پر اس مسئلہ پر زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم خود اس آیت کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیونکہ اوّل تو اس آیت کا لب و لہجہ اور اس کا قبل و بعد کی آیات سے فرق مکمل طور پر یہ نشاندہی کرتا ہے کہ اس آیت میں موضوعِ سخن کوئی ایسی چیز ہے جو قبل و بعد کی آیات سے مختلف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ قرآن ایک کلاسیکی کتاب نہیں ہے کہ جس کے مطالب کو خاص حصّوں اور ابواب میں ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔ بلکہ جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی اور مختلف حادثات و واقعات رونما ہوتے گئے اُن کے مطابق نازل ہوتا رہا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں قرآن ایک جنگ کے متعلق بحث کرتے کرتے یکایک ایک فروعی حکم کا ذکر چھیڑ دیتا ہے۔ یا جب وہ یہود و نصاریٰ کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوتا ہے تو اچانک ہی مسلمانوں کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے ایک اسلامی حکم اُن کے لیے بیان کر دیتا ہے۔

---

[1] اس واقعہ کے اس حصّہ کو کہ جو حدیث تہنیت کے نام سے مشہور ہے، اہل سنت کے بہت سے عظیم علماء حدیث و تفسیر و تاریخ نے متعدد طریقوں سے بہت سے صحابہ سے نقل کیا ہے مثلاً ابن عباس، ابوہریرہ، براء بن عازب اور زید بن ارقم۔ مرحوم علامہ امینی نے الغدیر کی پہلی جلد میں اس حدیث کو اہل سنت کے ساٹھ علماء سے نقل کیا ہے۔

[2] حدیث ثقلین ان متواتر احادیث میں سے ہے جسے اہلِ سنت کی بہت سی کتابوں میں متعدد صحابہ سے نقل کیا گیا ہے مثلاً ابوسعید خدری، زید ابن ارقم، زید بن ثابت، ابوہریرہ، حذیفہ بن اسید، جابر بن عبداللہ انصاری، عبداللہ بن حنطب، عبد بن حمید، جبیر بن مطعم، ضمرہ اسلمی، ابوذر غفاری، ابو رافع اور ام سلمہ نے پیغمبرؐ سے نقل کیا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے پھر ایک دفعہ اس بحث کی طرف رجوع فرمائیں جو ہم نے اس آیت کی تفسیر کے ابتدا میں کی ہے۔
تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض متعصب قسم کے لوگوں کو اس بات پر اصرار ہے کہ یہ آیت ابتدائے بعثت میں نازل ہوئی ہے حالانکہ سورۂ مائدہ پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری ایام میں نازل ہوئی ہے اور اگر وہ یہ کہیں کہ صرف یہ ایک آیت مکہ میں ابتدائے بعثت میں نازل ہوئی ہے اور اس کے بعد کسی مناسبت سے اس سورہ کی آیات کے درمیان آگئی ہے، تو ہم کہیں گے کہ یہ بات تو بالکل اس بات کے الٹ ہے جسے آپ منوانا چاہتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ابتدائے بعثت میں نہ تو پیغمبرؐ یہودیوں کے ساتھ برسرِ جنگ تھے اور نہ ہی عیسائیوں کے ساتھ، اس بنیاد پر تو اس آیت کا قبل و بعد کی آیات سے کوئی تعلق ہی نہ رہے گا (غور کیجئے)۔
یہ سب چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ آیت تعصب کے طوفان کی زد میں آگئی ہے اور اسی بنا پر اس میں کئی طرح کے احتمالات پیدا کیے جاتے ہیں۔ جبکہ اس جیسی دوسری آیات میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ ہر ایک اسی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ کسی حیلہ و بہانہ سے یا کسی بے بنیاد دستاویز کے ذریعہ اس کے مفہوم کو اس کے صحیح راستے سے منحرف کر دے۔

## ۳۔ کیا یہ حدیث تمام کتب صحاح میں نقل ہوئی ہے

بعض کہتے ہیں کہ ہم کس طرح اس حدیث کو قبول کر سکتے ہیں جبکہ بخاری اور مسلم نے اپنی اپنی کتاب میں اسے نقل نہیں کیا ہے۔
یہ اعتراض بھی عجائبات میں سے ہے کیونکہ اوّل تو بہت سی معتبر احادیث ایسی ہیں جنہیں علمائے اہلِ سنت نے قبول کیا ہے۔ حالانکہ وہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں نہیں ہیں اور یہ کوئی پہلی حدیث بھی نہیں کہ جس کی یہ وضع و کیفیت ہو۔
دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ کیا ان کے نزدیک صرف یہی دو کتابیں معتبر ہیں ؛ حالانکہ یہ حدیث ان کے قابلِ اعتماد منابع اور کتب میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ صحاح ستہ (اہل سنت کی چھ مشہور کتابیں جن پر وہ اعتماد کرتے ہیں) مثلاً سنن ابن ماجہؒ میں یہ حدیث موجود ہے اسی طرح مسند احمد حنبل[2] میں بھی یہ حدیث آئی ہے۔ اور حاکم، ذہبی اور ابن حجر جیسے علماء نے بھی اپنے شہرہ آفاق تعصب کے باوجود اس حدیث کے بہت سے طرق کے صحیح ہونے کا اعتراف کیا ہے۔
بنابریں بعید نہیں کہ بخاری و مسلم اس مخصوص فضا اور گھٹے ہوئے ماحول میں صریحاً اپنی کتاب میں ایسی چیز نہ لکھ سکے ہوں یا نہ لکھنا چاہتے ہوں جو اُن کے وقت کے صاحبانِ اقتدار کے مزاج کے خلاف تھی۔

## ۴۔ حضرت علی علیہ السلام نے اور اہلِ بیتؑ نے اس حدیث سے استدلال کیوں نہیں کیا

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر حدیث غدیر اس عظمت کے ساتھ موجود تھی تو خود حضرت علیؑ نے اور ان کے اہلِ بیتؑ اور یار و انصار اور ان سے تعلق رکھنے والوں نے ضروری مقامات پر اس سے استدلال کیوں نہ کیا۔ آیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ حضرت علیؑ کی حقانیت ثابت

---

[1] جلد اوّل صفحہ ۵۵ و صفحہ ۵۸۔

[2] مسند احمد حنبل جلد اوّل صفحہ ۸۴-۸۸-۱۱۸-۱۱۹-۱۵۲-۳۳۱-۲۸۱-۳۷۰۔

کرنے کے لیے اس قسم کے اہم مدرک کو سند کے طور پر پیش کرتے۔

یہ اعتراض بھی اسلامی کتابوں سے خواہ وہ حدیث سے متعلق ہوں یا تاریخ و تفسیر سے، عدم واقفیت کا نتیجہ ہے، کیونکہ اہل سنت کے علماء کی کتابوں میں ایسے بہت سے مواقع کا ذکر کیا گیا ہے کہ جہاں پر خود حضرت علیؑ نے یا آئمہ اہل بیتؑ نے یا اس مسلک سے تعلق رکھنے والوں نے حدیث غدیر سے استدلال کیا ہے ان میں سے ایک واقعہ خود حضرت علیؑ سے متعلق ہے جسے خطیب خوارزمی نے عامر بن واصلہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ عامر کہتا ہے:

میں شوریٰ کے روز حضرت علیؑ کے ساتھ اس گھر میں موجود تھا میں نے خود سنا کہ آپ ارکان شوریٰ سے اس طرح کہہ رہے تھے کہ میں ایک ایسی محکم دلیل تمہارے سامنے قائم کرتا ہوں جسے عرب و عجم مل کر بھی تبدیل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ تمہیں خدا کی قسم! بتلاؤ کیا تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص ہے کہ جس نے مجھ سے پہلے خدا کو اس کی توحید و یکتائی کے ساتھ پکارا ہو؟۔ اس کے بعد آپ نے خاندانِ رسالت کی معنوی عظمتیں بیان کیں یہاں تک کہ آپ نے فرمایا: تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں بتلاؤ کیا تمہارے درمیان میرے علاوہ اور کوئی شخص ایسا ہے جس کے حق میں پیغمبرؐ نے یہ کہا ہو:

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللّٰھم وال من والاہ وانصر من نصرہ ولیبلغ الشاھد الغائب

سب نے کہا: نہیں[1]

یہ روایت حموینی نے فرائد السمطین باب ۵۸ میں اور اسی طرح "ابن حاتم" نے "دار النظیم" میں، دارقطنی نے اپنی کتاب میں، ابن عقدہ نے اپنی کتاب میں اور ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے۔

فرائد السمطین کے باب ۵۸ میں منقول ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت عثمان کے زمانے میں مسجد کے اندر چند لوگوں کی موجودگی میں بھی واقعہ غدیر سے استدلال کیا تھا۔ اسی طرح کوفہ میں اُن لوگوں کے سامنے بھی جو پیغمبرؐ کی طرف سے ان کی خلافت بلافصل کے لیے نص ہونے کا انکار کر رہے تھے صراحت کے ساتھ اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ الغدیر کے مطابق اس حدیث (یعنی کوفہ میں واقعہ غدیر سے آپؑ کے استدلال) کو اہلِ سنت کی مشہور کتابوں اور معروف ماخذوں میں چار صحابہ اور چودہ تابعین سے روایت کیا گیا ہے۔

جنگِ "جمل" کے دن بھی "حاکم" کی کتاب مستدرک جلد سوم ص ۳۷۱ کی روایت کے مطابق طلحہ کے سامنے حدیث غدیر سے استدلال فرمایا۔

نیز جنگ "صفین" کے دن "سلیم بن قیس ہلالی" کی روایت کے مطابق حضرت علیؑ نے اپنی لشکر گاہ میں مہاجرین و انصار اور اطراف و جوانب سے آنے والے لوگوں کے سامنے اس حدیث سے استدلال کیا۔ اور بدریین (جو جنگ بدر میں پیغمبرؐ کے ساتھ تھے) میں سے بارہ افراد نے کھڑے ہو کر گواہی دی کہ انہوں نے یہ حدیث پیغمبرؐ سے سنی ہے۔

---

[1] مناقب صفحہ ۲۱۷۔

حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہراؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ، عبداللہ بن جعفر، عمار یاسر، قیس بن سعد عمر بن عبدالعزیز اور عباسی خلیفہ مامون نے بھی اس حدیث کو سند کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ عمرو بن عاص نے اس خط میں جو اس نے معاویہ کو اس لیے لکھا تھا تا کہ وہ اس پر اچھی طرح سے یہ بات ثابت کر دے کہ وہ حضرت علیؑ کے مرتبہ ومقام اور معاویہ کی وضع سے متعلق حقائق سے خوب آگاہ ہے، اس خط میں اس نے صراحت کے ساتھ مسئلہ غدیر کا ذکر کیا تھا اور اسے خطیب خوارزمی حنفی نے اپنی کتاب مناقب کے صفحہ ۱۲۴ پر نقل کیا ہے۔

وہ لوگ جو اس سے زیادہ توضیحات کے خواہاں ہیں اور حضرت علیؑ، اہل بیتؑ، صحابہ اور غیر صحابہ کی طرف سے حدیث غدیر سے استدلال کرنے کے بارے میں ان روایات کے مختلف ماخذوں میں بیان سے آگاہ ہونا چاہیں تو وہ کتاب الغدیر جلد اول صفحات ۱۵۹ تا ۲۱۳ کی طرف رجوع کریں۔ علامہ امینی مرحوم نے صحابہ وغیر صحابہ میں سے ۲۲ حضرات سے مختلف مواقع پر اس حدیث سے استدلال کرنے کی روایات پیش کی ہیں۔

## ۵۔ آیت کے آخری جملہ کا مفہوم کیا ہے؟

بعض کہتے ہیں کہ اگر یہ آیت حضرت علیؑ کو خلافت و ولایت کا منصب عطا کرنے اور واقعہ غدیر سے مربوط ہے تو پھر یہ آخری جملہ کہ: ان اللہ لا یھدی القوم الکافرین۔ یعنی "خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا" اس مسئلے سے کیا ربط رکھتا ہے۔

اس اعتراض کا جواب دینے کے لیے بس اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ لفظ کفر لغت میں بھی اور اسی طرح قرآن کی زبان میں بھی انکار، مخالفت اور ترک کے معنی میں ہے۔ کبھی انکارِ خدا یا انکار نبوت پیغمبرؐ کے لیے بولا جاتا ہے اور کبھی دوسرے احکام کے مقابلے میں انکار یا مخالفت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ سورہ آلِ عمران آیت ۹۷ میں حج کے بارے میں ہے ا

ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین

جو لوگ حج کے حکم کو پائمال کرتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں تو وہ خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے خدا تو تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں جادوگروں کے لیے بھی اور ان کے بارے میں بھی کہ جو جادو میں آلودہ نہیں لفظ کفر بولا گیا ہے:

وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ

سورہ ابراہیم آیت ۲۲ میں بھی ہے کہ شیطان اُن لوگوں کے مقابلے میں کہ جنہوں نے اس کی پیروی اور اطاعت کی، قیامت کے دن صریحاً اظہارِ نفرت کرتے ہوئے اُن سے کہے گا کہ تم نے احکام الٰہی کی اطاعت میں مجھے اس کا شریک قرار دیا تھا اور میں آج تمہارے اس کام سے کفر کرتا ہوں۔

"اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ" (ابراہیم - ۲۲)

اس بنا پر کفر کا اطلاق مسئلہ ولایت و رہبری کے مخالفین پر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

### ۶۔ ایک ہی زمانہ میں دو ولی ہو سکتے ہیں؟

ایک اور بہانہ جو اس متواتر حدیث اور اسی طرح زیر بحث آیت سے روگردانی کے لیے کیا گیا ہے یہ ہے کہ اگر پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کو غدیر خم میں ولایت و رہبری و خلافت کے لیے مقرر کر دیا ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ہی زمانے میں دو رہبر اور دو پیشوا ہو جائیں گے۔

لیکن اس آیت کے نزول اور حدیث کے ورود کے زمانے کے خاص اوضاع و شرائط اور مخصوص حالات و کوائف کو مد نظر رکھتے ہوئے اور اسی طرح اُن قرائن پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو پیغمبرؐ کی گفتگو میں پائے جاتے ہیں یہ بہانہ بھی کلی طور پر برطرف ہو جاتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعہ پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کے آخری مہینوں میں واقع ہوا ہے جبکہ آپؐ آخری احکام کو لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ خصوصاً جب کہ آپؐ نے صراحت کے ساتھ فرمایا کہ میں بہت جلدی تمہارے درمیان سے جا رہا ہوں اور دو گرانمایہ چیزیں تمہارے درمیان چھوڑے جا رہا ہوں۔

جو شخص یہ گفتگو کر رہا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے جانشین کے مقرر کرنے کے انتظام میں مصروف ہے اور وہ آئندہ کے لیے پروگرام دے رہا ہے، نہ کہ اپنے زمانے کے لیے۔ لہٰذا اس سے صاف واضح اور روشن ہے کہ اس سے دو امیروں اور دو پیشواؤں کا ایک ہی زمانے میں وجود مقصود نہیں ہے۔

وہ بات جو خاص طور پر لائق توجہ ہے یہ ہے کہ ایک طرف تو بعض علمائے اہلِ سنت یہ اعتراض پیش کر رہے ہیں تو بعض دوسرے ایسے ہیں جنہوں نے اس کے مقابلے میں ایک اور اعتراض پیش کر دیا ہے اور وہ یہ کہ پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کی ولایتؑ خلافت کے منصب پر تقرری تو کی ہے لیکن اس کی تاریخ صاف اور واضح طور پر بیان نہیں فرمائی، تو اس صورت میں کیا رکاوٹ ہے کہ یہ ولایت و خلافتِ علیؑ کا بیان دوسرے تین خلفاء کے بعد کے لیے ہو۔

حقیقتاً کتنی حیرت کی بات ہے کہ کوئی چھت کے اُس طرف گر رہا ہے اور کوئی اس طرف۔ لیکن متن واقعہ کو مان لینے میں تعصبات حائل ہو گئے ہیں۔ ذرا کوئی اُن سے یہ تو پوچھے کہ اگر پیغمبر اکرمؐ یہ چاہتے تھے کہ اپنے چوتھے خلیفہ کو معین کریں اور مسلمانوں کے آئندہ کی فکر تھی تو کیوں اپنے پہلے، دوسرے اور تیسرے خلیفہ کا ذکر جس کا تعین چوتھے خلیفہ پر مقدم و لازم تھا غدیر خم کے خطبہ میں نہ فرمایا۔

یہاں ہم اپنا سابقہ بیان دہراتے ہیں اور اس بحث کو ختم کرتے ہیں کہ اگر مخصوص نظریات درمیان میں نہ ہوتے تو یہ تمام اعتراضات اس آیت اور اس حدیث کے سلسلے میں نہ کیے جاتے جس طرح سے کہ دوسرے مواقع پر اس قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہوا ہے۔

۶۸۔ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ مَا

أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○

۶۹۔ إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

## ترجمہ

۶۸۔ اے اہل کتاب تم کچھ وقعت نہیں رکھتے جب تک کہ تم تورات و انجیل اور اس کو جو تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے قائم اور برپا نہ کرو لیکن جو کچھ تجھ پر تیرے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے (نہ صرف ان کی بیداری کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ) ان میں سے بہت سوں کے طغیان اور کفر کو زیادہ کرتا ہے۔ اس بنا پر اس کافر قوم (اور ان کی مخالفت) سے غمگین نہ ہو۔

۶۹۔ وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور یہودی، صابئین اور عیسائی جو بھی خدائے یگانہ اور روز قیامت پر ایمان لے آئے گا اور عمل صالح بجا لائے گا تو نہ ایسے لوگوں پر کوئی خوف طاری ہوگا اور نہ ہی وہ محزون و مغموم ہوں گے۔

## شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان ؁ اور تفسیر قرطبی میں ابن عباس سے اس طرح منقول ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت پیغمبرؐ کی خدمت میں آئی اور پہلا سوال یہ کیا کہ کیا آپ یہ اقرار کرتے ہیں کہ تورات خدا کی طرف سے ہے۔ پیغمبرؐ نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم بھی تورات کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ اور کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے (درحقیقت تورات ہمارے اور آپ کے درمیان قدر مشترک ہے لیکن قرآن ایسی کتاب ہے کہ جس پر صرف آپ ہی عقیدہ رکھتے ہیں، تو کیا ہی اچھا ہو کہ ہم تورات کو تو قبول کر لیں اور اس کے علاوہ کی نفی کر دیں)۔ اس پر پہلی آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔

## تفسیر

جیسا کہ ہم اس سورہ کی آیات کی تفسیر میں اب تک پڑھ چکے ہیں کہ ان میں قابلِ لحاظ حصہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کی وعدہ

شکنیوں، بحثوں، سوالات اور اعتراضات سے ہی متعلق تھا۔ یہ آیت بھی اُن بحثوں کے ایک اور رُخ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ان کی اس کمزور منطق کا جواب دے رہی کہ جو یہ چاہتے تھے کہ تورات کو تو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک متفق علیہ کتاب ہونے کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے اور قرآن کو ایسی کتاب ہونے کی حیثیت سے کہ جس میں اختلاف پایا جاتا ہے چھوڑ دیا جائے۔ یہ آیت انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہی ہے اہل کتاب تمہاری کوئی بھی وقعت نہیں ہوگی جب تک کہ تم تورات وانجیل اور تمام آسمانی کتابوں کو جو تم پر نازل ہوئی ہیں بلا استثنا اور بغیر کسی تفاوت کے تسلیم نہ کروگے۔

"قل یا اھل الکتب لستم علی شیء حتی تقیموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیکم من ربکم"

کیونکہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہ تمام کتابیں ایک ہی مبداء سے صادر ہوئی ہیں اور اِن سب کی اساس اور اصول بھی ایک سے ہیں اگرچہ اُن میں سے آخری کتاب کامل ترین اور جامع ترین ہے۔ اسی بنا پر لازم العمل ہے اس کے علاوہ پہلی کتابوں میں آخری کتاب یعنی قرآن کے بارے میں متعدد بشارتیں بھی آئی ہیں۔ وہ مدعی ہیں اس بات کے کہ وہ تورات وانجیل کو قبول کرتے ہیں پس اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ ان بشارتوں کو بھی قبول کریں اور جب کہ انہوں نے ان نشانیوں کو قرآن میں پالیا ہے تو اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔

مذکورہ بالا آیت یہ بھی کہتی ہے کہ صرف دعویٰ ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان آسمانی کتابوں پر عملاً قائم ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں "ہماری اور "تمہاری" کتاب کی بات نہیں ہے، معاملہ تو آسمانی کتابوں کا ہے اور جو کچھ خدا کی طرف سے آیا ہے، اُسی کا ہے۔ پس تم کس طرح اس کمزور منطق کے ذریعے آخری کتاب کو نظر انداز کر سکتے ہو۔ قرآن پھر ایک مرتبہ ان کی اکثریت کی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُن میں سے بہت سے لوگ نہ صرف ان آیات سے پند و نصیحت نہیں لیتے اور ہدایت حاصل نہیں کرتے بلکہ ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کا کفر و طغیان بڑھتا ہی جاتا ہے۔

"ولیزیدن کثیرًا منھم ما انزل الیک من ربک طغیانًا وکفرًا"

اور آیات حق اور صحیح باتوں کی بیمار افکار اور ہٹ دھرمی سے بھرے ہوئے دلوں پر ایسی ہی اُلٹی تاثیر پیدا ہوا کرتی ہے۔

آیت کے آخر میں اپنے پیغمبرؐ کو اس منحرف اکثریت کی انتہائی سختی کے مقابلہ میں تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے: اس کافر جمعیت کی مخالفتوں سے غمگین نہ ہو کیونکہ اس کا نقصان خود اُن ہی کی طرف لوٹ جائے گا اور تجھے اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا (فلا تأس[1] علی القوم الکافرین)۔

یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ اس آیت کے مفاہیم قوم یہود کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ مسلمان بھی اگر صرف اسلام کے دعویٰ پر ہی قناعت کریں اور تعلیمات انبیاءؑ کے اصول اور خاص طور پر اپنی آسمانی کتاب قرآن کو عملاً برپا نہ کریں تو ان کی کسی قسم کی کوئی حیثیت اور قدر و قیمت بارگاہ خدا میں ہوگی نہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں، اور وہ ہمیشہ زبوں حال، زیردست اور شکست خوردہ رہیں گے۔

---

۱۔ "تاس" کا مادہ "اس" ہے جس کا معنی ہے "غم و اندوہ"۔

بعد والی آیت میں پھر نئے سرے سے اس حقیقت کو محل تاکید قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تمام اقوام و ملل اور تمام مذاہب کے پیروکار بلا استثناء خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی، صابئین ہوں یا نصاریٰ صرف اسی صورت میں اہل نجات ہوں گے اور اپنے آئندہ سے خوف زدہ اور گذشتہ سے محزون و غمگین نہ ہوں گے جب کہ وہ خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہوں گے اور نیک اعمال انجام دیں گے۔

(ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والصابئون والنصریٰ من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر وعمل صالحًا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)۔

یہ آیت حقیقت میں ان لوگوں کے لیے دندان شکن جواب ہے جو نجات کو کسی خاص ملت اور قوم میں منحصر سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انبیاء کے کلام میں تبعیض (بعض کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا) کے قائل ہو جائیں اور مذہبی دعوتوں کو قومی تعصبات سے ملا دیں۔ آیت کہتی ہے کہ راہ نجات ایسی باتوں کو برکنار رکھنے میں منحصر ہے۔

جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۶۲ کے ذیل میں کہ جس کا مضمون مذکورہ بالا آیت کے ساتھ تقریباً یکساں ہے ہم واضح کر چکے ہیں کہ بعض لوگ ایک مغالطہ آمیز بیان کے ذریعہ چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت کو "صلح کل" کے مسلک پر دلیل قرار دیں اور تمام مذاہب کے پیروکاروں کو اہل نجات فرض کرلیں اور اسے نظر انداز کر دیں کہ درحقیقت آسمانی کتابوں کے یکے بعد دیگرے نازل ہونا جہان انسانیت کے بتدریج درجہ کمال تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ آیت "عمل صالحا" کی تعبیر کے ذریعے اس حقیقت کو مشخص و ممتاز کرتی ہے کہ مذاہب کے اختلاف کی صورت میں آخری قانون پر عمل کریں۔ کیونکہ منسوخ شدہ قوانین پر عمل کرنا عمل صالح نہیں ہے۔ بلکہ عمل صالح تو موجودہ قوانین اور آخری قانون پر عمل کرنا ہے[1]

علاوہ ازیں اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی قابل قبول ہے کہ (من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر وعمل صالحًا) کا جملہ صرف یہود و نصاریٰ اور صابئین کی طرف لوٹتا ہو کیونکہ "الذین اٰمنوا" جو آیت کی ابتداء میں ذکر ہوا ہے وہ اس قید کا محتاج نہیں ہے۔ تو اس طرح سے اس آیت کا معنی یوں ہوگا کہ صاحبان ایمان اور مسلمان افراد اور اسی طرح یہود و نصاریٰ اور صابئین بشرطیکہ وہ بھی ایمان لے آئیں اور اسلام قبول کرلیں اور عمل صالح بجالائیں تو سب کے سب اہل نجات اور رستگار ہوں گے اور کسی بھی قسم کے لوگوں کے سابقہ مذہبی اعتقادات کا اس صورت میں ان پر کوئی اثر نہ ہوگا اگر وہ ایمان لے آئیں اور راستہ سب کے سامنے کھلا ہوا ہے (غور کیجئے)۔

۷۰۔ لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا

---

[1] اس کی مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ اردو ترجمہ جلد اول ص۲۲۳ کی طرف رجوع فرمائیں۔

وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۝

۷۱۔ وَحَسِبُوٓا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِّنْهُمْ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝

## ترجمہ

۷۰۔ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف رسول بھیجے لیکن جب بھی کوئی پیغبران کی خواہشات نفسانی اور میلانات کے خلاف آتا تو بعض کی تو تکذیب کرتے اور بعض کو قتل کر دیتے۔

۷۱۔ اور انہوں نے یہ گمان کر لیا تھا کہ اس کا کوئی بدلہ اور سزا نہ ہوگی لہٰذا (وہ حقائق کو دیکھنے اور سچی باتوں کو سننے سے اندھے اور بہرے ہو گئے اس کے بعد پھر (وہ بیدار ہوئے اور) خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی اس کے بعد دوبارہ (خواب غفلت میں جا پڑے اور) ان میں سے بہت سے اندھے اور بہرے ہو گئے اور خدا ان کی کارگزاریوں پر خوب اچھی طرح مطلع ہے۔

## تفسیر

سورہ بقرہ میں جو آیات گزر چکی ہیں اُن میں اور اس سورہ کے شروع میں جو آیات گزری ہیں اُن میں اس تاکیدی عہد پیمان کی طرف جو خداوند تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے لیا تھا اشارہ ہو چکا ہے۔ اس آیت میں دوبارہ اس عہد پیمان کی یاد دہانی کراتے ہوئے فرماتا ہے ہم نے بنی اسرائیل سے پیمان لیا اور ان کی ہدایت اور اس پیمان کو وفا کرنے کا مطالبہ کرنے کے لیے ان کی طرف پیغمبر بھیجے (لقد اخذنا میثاق بنی اسرائیل وارسلنا الیہم رسلا)۔

جیسا کہ جلد اوّل میں بیان ہو چکا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیمان وہی ہے جس کی طرف سورہ بقرہ کی آیت ۹۳ میں اشارہ ہوا ہے یعنی اس پر عمل کرنے کا پیمان جو خدا نے ان پر نازل کیا تھا[1]

پھر مزید کہتا ہے، انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس پیمان پر عمل نہیں کیا بلکہ جب بھی کوئی پیغمبر ان کے میلانات اور ہوا وہوس

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اوّل سورہ بقرہ آیت ۹۳ کے ذیل میں۔

کے خلاف کوئی حکم لاتا تو وہ اس کی مخالفت میں سخت ترین مقابلے اور جھگڑے پر اتر آتے تھے۔ اُن میں سے کچھ انبیاء کی تو وہ تکذیب کرتے تھے اور انہیں جھٹلاتے تھے اور جن انبیاء کی تکذیب کرنے پر اور ان کے اثرات کو روکنے پر قادر نہ ہوتے تھے انہیں قتل کر دیتے تھے۔

(کلما جاء ھم رسول بما لا تھوی انفسھم فریقاً کذبوا و فریقاً یقتلون)۔

یہ ہیں طریقے منحرف اور خود خواہ افراد کے کہ بجائے اپنے رہبروں کی پیروی کرنے کے وہ اس بات پر مصر ہیں کہ رہبران کے میلانات اور خواہشات کے تابع ہوں اور اگر وہ ان کے میلانات اور خواہشات کے خلاف ہوں تو اس صورت میں نہ صرف ان کی رہبری قبول نہیں کرتے بلکہ انہیں زندہ رہنے کا حق دینے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔

مندرجہ بالا جملے میں "کذبوا" ماضی کی شکل میں اور "یقتلون" مضارع کی صورت میں آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب قبل و بعد کی آیات کی لفظی مناسبت کا لحاظ رکھنے کے علاوہ کہ جو سب کے سب مضارع کی صورت میں آئے ہیں یہ ہو کہ چونکہ فعل مضارع استمرار پر دلالت کرتا ہے لہٰذا خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ اس روح اور فکر کے اُن میں ہمیشہ جاری رہنے کو بیان کرے کہ پیغمبروں کو جھٹلانا اور انہیں قتل کرنا ان کی زندگی کا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ ان کا یہ عمل ایک مستقل پروگرام اور مکتب کی صورت اختیار کر گیا تھا۔[1]

بعد والی آیت میں ان سرکشیوں اور جرائم کے باوجود ان کی بے جا خود فریبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ان حالات کے باوصف وہ یہ گمان کرتے تھے کہ کوئی عذاب و سزا انہیں دامن گیر نہ ہوگی۔

جیسا کہ دوسری آیات میں تصریح ہو چکی ہے وہ خود کو ایک برتر قوم و قبیلہ سمجھتے تھے اور خود کو خدا کا بیٹا کہتے تھے (و حسبوا ان لا تکون فتنۃ)۔

آخر کار اس خطرناک فریب خوردگی نے اور اپنے آپ کو برتر سمجھنے نے ایک قسم کا پردہ ان کی آنکھوں اور کانوں پر ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے وہ آیاتِ خدا دیکھنے سے اندھے اور کلماتِ حق سننے سے بہرے ہو گئے (فعموا و صموا)۔

لیکن جب انہوں نے اللہ کے عذاب کے نمونے اور اپنے برے اعمال کے انجام کا مشاہدہ کیا تو پشیمان ہوئے اور توبہ کر لی اور اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوئے کہ خداوند تعالیٰ کی دھمکیاں یقینی اور سچ ہونے والی ہیں نیز وہ قطعاً کوئی برتر خاندان نہیں ہیں تو خدا نے بھی اُن کی توبہ کو قبول کر لیا (ثم تاب اللہ علیھم)۔

مگر یہ بیداری اور ندامت و پشیمانی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور انہوں نے دوبارہ طغیان و سرکشی اختیار کر لی اور حق و عدالت کو ٹھکرانا شروع کر دیا اور ایک دفعہ پھر غفلت کے پردے کہ جو گناہ کے اندر ڈوب جانے کے آثار ہیں اُن کی آنکھوں اور کانوں پر پڑ گئے اور پھر وہ آیاتِ حق دیکھنے سے اندھے اور حق کی باتیں سننے سے بہرے ہو گئے اور اُن میں سے بہت سوں کی یہ حالت ہو گئی (ثم عموا و صموا کثیر منھم)۔

---

[1] حقیقت میں "فریقاً کذبوا و فریقاً یقتلون" کا جملہ جیسا کہ مجمع البیان اور دیگر تفاسیر میں آیا ہے در اصل "کذبوا و قتلوا" اور "یکذبون و یقتلون" تھا۔

شاید "عموا" (اندھے ہوگئے) کو "صموا" (بہرے ہوگئے) پر مقدم رکھنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ پہلی دفعہ انہیں آیات خدا اور پیغمبر کے معجزات کو دیکھنا چاہیے اور پھر ان کے احکام کو سننا چاہیے "کثیر منھم" (ان میں سے بہت سے) کا ذکر عموا وصموا کے الفاظ کی تکرار کے بعد درحقیقت دونوں الفاظ کی توضیح کے طور پر ہے یعنی غفلت و بے خبری اور اندھے اور بہرے ہونے کی حالت حقائق کے مقابلے میں کوئی عمومی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ ہمیشہ ایک صالح اور نیک اقلیت بھی ان کے درمیان موجود رہی تھی اور یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کے یہودیوں پر حملے کسی طرح بھی نسلی اور قبائلی پہلو نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ صرف ان کے اعمال کی وجہ سے تھے۔

کیا "عموا وصموا" کے الفاظ کی تکرار کلیت اور تاکید کا پہلو رکھتی ہے یا یہ دو مختلف واقعات کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل میں ہوئے تھے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ دو مختلف واقعات کی طرف اشارہ ہیں ایک بابل کے لوگوں کے حملے کے وقت اور دوسرے ایرانیوں اور رومیوں کے حملے کے زمانے میں کہ جس کی طرف قرآن نے سورہ بنی اسرائیل کی ابتداء میں ایک مختصر سا اشارہ کیا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ وہ بارہا اس حالت میں گرفتار ہوتے رہے ہیں اور جب بھی وہ اپنے برے اعمال کے منحوس نتائج دیکھتے تو توبہ کر لیتے اور پھر توبہ کو توڑ دیتے نہ یہ کہ صرف دو ہی مرتبہ ایسا ہوا۔ آیت کے آخر میں ایک مختصر اور پرمعنی جملے کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ خدا کسی وقت بھی ان کے اعمال سے غافل نہیں تھا اور تمام کام جو وہ انجام دیتے ہیں انہیں وہ دیکھتا ہے۔
(واللہ بصیر بما یعملون)

۷۲۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ○

۷۳۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

۷۴۔ أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

---

# ترجمہ

۷۲۔ جنہوں نے یہ کہا کہ خدا مسیح ابن مریم ہی ہے وہ یقیناً کافر ہیں (جبکہ خود) مسیح نے یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم خدائے واحد و یگانہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی کیونکہ جو شخص کسی کو خدا کا شریک قرار دے گا خدا نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی یار و انصار نہیں ہے۔

۷۳۔ جنہوں نے یہ کہا کہ خدا تین میں سے ایک ہے وہ بھی یقیناً کافر ہو گئے ہیں کیونکہ معبود یگانہ کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے اور اگر وہ اپنے اس قول سے دستبردار نہ ہوئے تو اُن میں سے (اس عقیدہ پر قائم رہنے والے) کافروں کو دردناک عذاب پہنچے گا۔

۷۴۔ کیا وہ خدا کے حضور توبہ نہیں کرتے، اُس کی طرف نہیں پلٹتے اور اُس سے طلب بخشش نہیں کرتے جبکہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

# تفسیر

ان مباحث کے بعد کہ جو گذشتہ آیات میں یہودیوں کے انحرافات سے متعلق گذری ہیں، یہ آیات اور ان سے بعد والی آیات عیسائیوں کے انحرافات کے متعلق بحث کرتی ہیں سب سے پہلے تو خدا اس آیت میں مسیحیت کے اہم ترین انحراف یعنی مسئلہ الوہیت مسیح اور تثلیث معبود سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے: یقیناً جنہوں نے یہ کہا کہ خدا مسیح ابن مریم ہی ہے وہ کافر ہو گئے ہیں۔

(لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم)

اس سے بڑھ کر اور کیا کفر ہو گا کہ ہر جہت سے لامحدود خدا کو ایسی مخلوق کے ساتھ کہ جو ہر جہت سے محدود ہے ایک اور متحد سمجھ لیا جائے اور مخلوق کی صفات کو خالق میں قرار دے لیا جائے جبکہ خود مسیح نے صراحت کے ساتھ بنی اسرائیل سے کہا کہ تم خدا یگانہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔

(و قال المسیح یا بنی اسرائیل اعبدوا اللہ ربی و ربکم)

اور اس طرح سے اپنے متعلق ہر قسم کے غلو اور شرک سے نفی کرتے ہوئے اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور خود کو خدا تعالےٰ کی دوسری مخلوقات کی طرح ہی ایک مخلوق کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ ساتھ ہی اس مطلب کی تاکید مزید اور ہر قسم کا شک و شبہ دور کرنے کے لیے مسیح نے مزید کہا کہ "جو خدا کے لیے کوئی شریک قرار دے اس پر خدا نے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔"

(انہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ و ماوٰیہ النار)

پھر مزید تاکید اور اس حقیقت کے اثبات کے لیے کہ شرک وغلو ایک قسم کا کھلم کھلا ظلم ہے اُن سے کہتا ہے کہ ستمگروں اور ظالموں کے لیے کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔

(وما للظٰلمین من انصار)

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ تاریخ مسیحیت یہ کہتی ہے کہ تثلیث کا قرن اول میں اور خصوصاً حضرت مسیحؑ کے زمانے میں کوئی وجود نہ تھا۔ یہاں تک کہ موجودہ انجیلوں میں بھی اپنی تمام تر تحریفات کے باوجود تثلیث کے بارے میں ذرا سی بات بھی دکھائی نہیں دیتی اور خود مسیحی محققین بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں۔

بنا بریں مذکورہ بالا آیت میں حضرت مسیحؑ کی ثابت قدمی و پافشاری اور مسئلہ توحید کے بارے میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ مسیحیت کے موجودہ منابع اور کتب سے بھی ہم آہنگ ہے اور یہ بات قرآن کی عظمت کے دلائل میں سے شمار ہوتی ہے۔[1]

ضمنی طور پر اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ اس آیت میں جو موضوع زیر بحث ہے وہ مسئلہ غلو اور جناب مسیحؑ کی خدا کے ساتھ وحدت ہے دوسرے لفظوں میں "توحید در تثلیث" کا معاملہ زیر نظر ہے لیکن بعد کی آیت میں مسیحیوں کے نقطۂ نظر سے "خداؤں کے تعدد" یعنی تثلیث در توحید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "جنہوں نے یہ کہا کہ خدا تین اقانیم میں سے تیسرا اقنوم[2] ہے وہ مسلماً کافر ہیں (لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلٰثۃ)۔

بہت سے مفسرین نے مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں شیخ طوسی نے تبیان میں اور رازی و قرطبی نے اپنی اپنی تفسیروں میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پہلی آیت تو عیسائیوں کے یعقوبیہ نامی فرقے کے بارے میں ہے جو خدا کو حضرت مسیحؑ کے ساتھ متحد جانتے ہیں لیکن یہ آیت ملکانیہ اور نسطوریہ نامی فرقوں کے بارے میں ہے۔ یہ لوگ تین خداؤں کے قائل ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ اسے مسیحیوں کے بعض فرقوں سے مخصوص متعلق کہنا حقیقت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا چونکہ تثلیث کا عقیدہ تو تمام عیسائیوں میں عمومیت رکھتا ہے جیسا کہ خدا کی توحید اور یکتائی کا مسئلہ ہم مسلمانوں کے درمیان قطعی اور مسلم ہے۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ جہاں وہ خداؤں کو تین مانتے ہیں وہاں وہ اسے یگانۂ حقیقی بھی مانتے ہیں اور ان کے اعتقاد کے مطابق تین حقیقی واحد مل کر ایک حقیقی واحد کو تشکیل دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں آیات ظاہراً ان دونوں تعبیروں کے دو مختلف پہلوؤں کی طرف ہی اشارہ کرتی ہیں۔

پہلی آیت میں تین خداؤں کی وحدت کے عقیدے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری آیت میں اُن کے تعدد کے عقیدے

---

[1] اس موضوع کی مزید وضاحت اور مسئلہ تثلیث اور وحدت در تثلیث کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۴۵۳ کی طرف رجوع کریں (اُردو ترجمہ)۔

[2] "اقنوم" کا معنی ہے اصل اور ذات اور اس کی جمع "اقانیم" ہے۔

کی طرف اشارہ ہے اور ان دونوں بیانات کا ایک دوسرے کے ساتھ آگے پیچھے آنا درحقیقت اُن کے عقیدے کے بطلان کے روشن و واضح دلائل میں سے ہے کہ کس طرح ان کے زعم میں خداوند تعالیٰ کبھی مسیح اور روح القدس کے ساتھ مل کر حقیقتاً ایک ہو جاتا ہے اور کبھی حقیقتاً تین چیزیں بن جاتا ہے کیا تین کا ایک کے ساتھ مساوی ہو جانا کوئی معقول بات ہے۔

جو بات اس حقیقت کی تائید کرتی ہے یہ ہے کہ عیسائیوں میں ایک گروہ بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جو تین خداؤں کا قائل نہ ہو[1]

پھر قرآن قطعی طور پر ان کے جواب میں کہتا ہے، خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے ( و ما من الٰه الا الٰه واحد)۔ خصوصاً لفظ "من" کا لفظ "الٰه" سے پہلے آنا دوسرے معبودوں کی نفی کرتا ہے۔

دوسری مرتبہ پھر انتہائی سخت اور تاکیدی لب و لہجہ میں اُن کو اس خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے، اگر وہ اس عقیدے سے دستبردار نہ ہوں گے تو اُن لوگوں کو جو اس کفر پر باقی رہیں گے ضرور دردناک عذاب پہنچے گا (وان لم ینتھوا عما یقولون لیمسن الذین کفروا منھم عذاب الیم)۔

"منھم" میں کلمہ "من" "بعض" کی نظر میں بیانیہ ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ اسے "بعض" کے مفہوم میں ہونا چاہیے اور حقیقت میں یہ ایسے اشخاص کی طرف اشارہ ہے جو اپنے کفر و شرک پر اڑے رہے اور قرآن کی دعوت توحید کے بعد بھی صحیح عقیدے کی طرف نہیں پلٹے نہ کہ وہ لوگ جنہوں نے توبہ کر لی اور صحیح عقیدہ کی طرف پلٹ آئے۔

تفسیر المنار میں کتاب اظہار الحق سے ایک داستان نقل ہوئی ہے کہ جس کا یہاں پر ذکر کرنا غیر مناسب نہیں ہے۔ اس سے اس بات کی نشاندہی ہو جاتی ہے کہ عیسائیوں کی تثلیث و توحید کتنی ناقابلِ فہم ہے۔

اس کتاب کا مؤلف کہتا ہے، تین آدمی عیسائی ہو گئے۔ پادری نے عیسائیت کے ضروری عقائد کہ جن میں سے ایک عقیدہ تثلیث بھی تھا انہیں تعلیم کر دیا۔ ایک دن ایک کٹر عیسائی عقیدہ رکھنے والا اُس پادری کے پاس آیا اور اُس نے اُن لوگوں کے بارے میں جو نئے نئے عیسائی ہوئے تھے سوال کیا۔ پادری نے انتہائی خوشی کے عالم میں ان تین افراد کی طرف اشارہ کیا تو اس نے فوراً پوچھا کہ کیا انہوں نے ہمارے ضروری عقائد میں سے کچھ یاد کر لیا ہے۔ پادری نے بڑی دلیری اور تاکید کے ساتھ کہا، ہاں! ہاں!۔

اس کے بعد نمونے کے طور پر اُن میں سے ایک کو آواز دی تاکہ مہمان کے سامنے اس کی آزمائش کرے۔ پادری نے کہا، تم تثلیث کے بارے میں کیا جانتے ہو؟۔ اس نے جواب میں کہا آپ نے مجھے یہ بتلایا ہے کہ خدا تین ہیں۔ ایک آسمان میں ہے دوسرا زمین میں ہے کہ جو مریم کے شکم سے پیدا ہوا ہے۔ تیسرا خدا کبوتر کی شکل میں دوسرے خدا پر تیس سال کی عمر میں نازل ہوا۔ پادری کو غصہ آگیا اور اُس کو باہر نکال دیا۔ کہنے لگا، اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر دوسرے شخص کو آواز دی تو اُس نے اس سوال کے جواب میں تثلیث کے بارے میں یہ بتلایا کہ آپ نے مجھے اس طرح تعلیم دی ہے کہ خدا تین تھے۔ لیکن اُن میں سے ایک سولی پر چڑھا دیا گیا لہٰذا اب ہمارے

---

[1] بعض روایات و تواریخ میں نقل ہوا ہے کہ عیسائیوں میں ایک ایسی اقلیت بھی وجود رکھتی ہے جو تین خداؤں کے قائل نہیں ہیں بلکہ صرف عیسیٰ کی خدا سے وحدت کے قائل ہیں لیکن آج ایسے لوگ بہت کمیاب ہیں۔

پاس صرف دو خدا باقی رہ گئے ہیں۔ پادری کو اس پر اس سے بھی زیادہ غصہ آیا اور اسے بھی باہر نکال دیا۔ اس کے بعد تیسرے آدمی کو جو سب سے زیادہ سمجھدار اور دینی عقائد کو یاد کرنے میں زیادہ کوشش کرنے والا تھا، آواز دی اور وہی سوال اس سے پوچھا تو اس نے بڑے ادب اور احترام سے کہا: اے میرے پیشوا جو کچھ آپ نے مجھے تعلیم دی ہے میں نے اسے مکمل طور پر یاد کر لیا ہے اور حضرت مسیح کی برکت سے میں نے اسے اچھی طرح سے سمجھ لیا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ خدا یگانہ سہ گانہ ہے (ایک خدا تین ہیں) اور تین خدا ایک ہیں۔ ان میں سے ایک کو انہوں نے سولی پر لٹکا دیا اور وہ مر گیا اس بنا پر وہ سب کے سب مر گئے کیونکہ وہ باقیوں کے ساتھ متحد اور ایک ہی تھا لہٰذا اس طرح سے اب کوئی خدا باقی نہیں رہا۔

ان آیات میں سے تیسری آیت میں دعوت دی گئی ہے کہ اس کفر آمیز عقیدے سے توبہ کرو یہ دعوت اس لیے ہے تاکہ خدا اپنی عفو و بخشش ان کے شامل حال کر دے۔ لہٰذا کہا گیا ہے: کیا وہ ان تمام باتوں کے بعد خدائے یکتا کی طرف نہیں پلٹتے اور اس شرک اور کفر سے مغفرت نہیں چاہتے حالانکہ خدا غفور و رحیم ہے۔

۷۵۔ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ○

۷۶۔ قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○

۷۷۔ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ○ ع

## ترجمہ

۷۵۔ مسیح ابن مریم فقط فرستادۂ خدا تھے اُن سے پہلے اور دوسرے بھی فرستادگانِ الٰہی ہی تھے ان کی ماں بھی بہت سچی خاتون تھیں۔ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے (لہٰذا تم کس طرح سے مسیح کی الوہیت کا دعویٰ اور اس کی ماں کی عبادت کرتے ہو) غور کرو کہ ہم کس کس طرح سے نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ دیکھو کہ وہ حق سے

کس طرح باز رکھے جاتے ہیں۔

۷۶۔ کہہ دو کیا تم خدا کے سوا ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں نقصان ہی پہنچا سکتی ہے اور نہ ہی تمہارے نفع کی مالک ہے اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۷۷۔ کہہ دو اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں غلو (اور تجاوز) نہ کرو اور حق کے سوا کچھ نہ کہو اور ایسے لوگوں کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے خود بھی گمراہ ہو گئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا اور سیدھے راستے سے منحرف ہو گئے۔

## تفسیر

اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں حضرت مسیح کے بارے میں عیسائیوں کے غلو اور ان کی الوہیت کے اعتقاد سے متعلق گزری ہیں ان آیات میں واضح دلائل سے چند مختصر جملوں میں ان کے اس عقیدے کو باطل کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے کہ مسیح اور باقی انبیاء کے درمیان کیا فرق ہے کہ جس کی وجہ سے تم مسیح کی الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہو مسیح ابن مریم بھی خدا کے ایک رسول ہی تھے اور ان سے پہلے بھی خدا کی طرف سے رسول اور اس کے دیگر فرستادگان آتے رہے ہیں (ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل)۔

اگر خدا کی طرف سے رسول ہونا الوہیت اور شرک کی دلیل ہے تو پھر باقی انبیاء کے متعلق بھی اسی چیز کے قائل کیوں نہیں ہوتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ کبھی عیسائی ہرگز اس بات پر قانع نہیں ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ کو فقط ایک فرستادۂ خدا (رسول) جانیں بلکہ ان کا عام عقیدہ کہ جس پر وہ فعلاً قائم ہیں یہ ہے کہ وہ انہیں خدا کا بیٹا اور ایک معنی میں خود خدا سمجھتے ہیں کہ جو بشریت کے گناہوں کو خریدنے کے لیے (نہ کہ ان کی ہدایت و رہبری کے لیے) آیا ہے۔ اسی لیے وہ اس کو "فادی" (نوع بشر کے گناہوں کا فدیہ ہونے والا) کا لقب دیتے ہیں۔

اس کے بعد اس بات کی تائید کے لیے ارشاد ہوتا ہے، اس کی ماں بہت ہی سچی خاتون تھیں (و امہ صدیقۃ)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اولاً تو وہ شخص کہ جس کی کوئی ماں ہے اور وہ ایک عورت کے شکم میں پرورش پاتا ہے اور بہت سی حوائج و ضروریات رکھتا ہے وہ کس طرح خدا ہو سکتا ہے؟ اور دوسرے یہ کہ اگر اس کی ماں قابلِ احترام ہے تو وہاں بنا پر ہے کہ وہ بھی مسیح کی رسالت کے دوران ان سے ہم آہنگ تھیں اور کارِ رسالت میں ان کی مددگار تھیں تو اس طرح سے وہ بھی خدا کی ایک خاص بندہ ہی تھیں لہٰذا ان کی ایک معبود کی طرح سے عبادت و پرستش نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ عیسائیوں میں رائج ہے کہ وہ ان کے مجسمہ کے سامنے عبادت و پرستش کی حد تک خضوع کرتے ہیں۔

اس کے بعد عیسٰیؑ کی ربوبیت کی نفی کی ایک اور دلیل کی طرف اشارہ کرتے فرمایا، وہ اور ان کی ماں دونوں کھانا کھاتے

تھے (کانا یأکلان الطعام) تو جو شخص اتنا محتاج ہے کہ اگر چند دن اُسے کھانا نہ ملے تو اُس میں چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ رہے وہ کس طرح سے پروردگار یا خدا کے ہم پلہ ہو سکتا ہے۔

آیت کے آخر میں ایک طرف تو اُن دلائل کے واضح ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری طرف ان واضح و آشکار دلائل کے مقابلہ میں ان کی ہٹ دھرمی، سختی اور نادانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، ذرا دیکھو تو سہی کہ ہم کس طرح ان کے لیے دلائل کو وضاحت کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ دیکھو کہ وہ کس طرح حق قبول کرنے سے روگردانی کرتے ہیں (انظر کیف نبین لھم الأیات ثم انظر انی یؤفکون)۔[1]

بنا بریں ان دو جملوں میں "انظر" کی تکرار اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک طرف تو ان روشن و واضح دلائل پر غور کرو کہ جو ہر شخص کی توجہ کے لیے کافی ہیں اور دوسری طرف اُن کے حیرت انگیز اور منفی عکس العمل پر نظر کرو کہ جو ہر شخص کے لیے تعجب خیز ہے۔

بعد والی آیت میں گذشتہ استدلال کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے، انہیں معلوم ہے کہ مسیح خود سر تا پا احتیاجات بشری رکھتے تھے اور خود اپنے نفع و نقصان پر قادر نہیں تھے چہ جائیکہ وہ تمہارے نفع و نقصان پر قادر ہوں (قل اتعبدون من دون الله ما لا یملک لکم ضرًّا و لا نفعًا)۔

اسی بنا پر وہ بارہا دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوئے۔ یا ان کے دوست گرفتار ہوئے۔ اگر لطف خدا ان کے شامل حال نہ ہوتا تو وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔

آخر میں انہیں اس خطرے سے آگاہ کرتا ہے کہ خبردار کہیں یہ گمان نہ کر لینا کہ خدا تمہاری ناروا باتوں کو سنتا نہیں ہے یا وہ تمہارے باطن سے آگاہ نہیں ہے، خدا سننے والا بھی ہے اور عالم و دانا بھی (و الله هو السمیع العلیم)۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ مسیح کے بشر ہونے اور ان کی مادی اور جسمانی ضروریات اور احتیاجات کا مسئلہ جس کا قرآن نے ان آیات اور دوسری آیات میں تذکرہ کیا ہے حضرت عیسٰی کی خدائی کا دعوٰی کرنے والے عیسائیوں کے لیے بہت بڑی مشکلات میں سے ایک ہے کہ جس کی توجیہ کے لیے وہ بہت ہی ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور بعض اوقات وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ حضرت عیسٰی کے لیے جنبوں کے قائل ہوں جنبہ لاہوت اور دوسرے جنبہ ناسوت۔ جنبہ لاہوت کی نظر سے وہ خدا کے بیٹے ہیں اور خود خدا ہیں اور ناسوت کی نظر سے جسم اور مخلوقِ خدا ہیں اور اسی قسم کی دوسری توجیہات کہ جو ان کی منطق کے ضعف اور نادرستی کی بہترین مظہر ہیں۔

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ آیت میں لفظ "من" کے بجائے "ما" استعمال ہوا ہے جو عام طور پر غیر ذوی العقول موجودات کے لیے ذکر ہوتا ہے یہ تعبیر شاید اسی بنا پر ہو کہ باقی معبودوں اور بتوں کو بھی جو پتھر اور لکڑی سے بنے ہوئے

---

[1] "یؤفکون" کا مادہ "افک" ہے اور یہ دراصل کسی چیز سے منصرف کرنے کے معنی دیتا ہے اور "ماٴفوک" ایسے شخص کو کہا جاتا ہے کہ جسے حق سے روک دیا گیا ہو، اگرچہ خود اس کی کوتاہی کی بنا پر ایسا ہوا ہو۔ اور چونکہ جھوٹ انسان کو حق سے روک دیتا ہے اس لیے اس کو "افک" کہا جاتا ہے۔

ہوتے ہیں اس جملے کی عمومیت میں داخل کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ اگر مخلوق کی پرستش جائز ہو تو پھر بت پرستوں کی بت پرستی بھی جائز شمار کی جائے۔ کیونکہ مخلوق ہونے میں سب برابر ہیں اور مساوی ہیں اور حقیقت یہ ہے حضرت مسیح کی الوہیت پر ایمان ایک طرح کی بت پرستی ہی ہے نہ کہ خدا پرستی۔

انبیاء کے بارے میں غلو کے سلسلے میں روشن دلائل سے اہل کتاب کا اشتباہ واضح ہو جانے کے بعد پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں دعوت دو کہ وہ اس راستے سے عملی طور پر پلٹ آئیں۔ فرمایا گیا ہے: کہہ دو کہ اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور حد سے تجاوز نہ کرو اور حق کے علاوہ کوئی بات نہ کہو (قل یا اهل الکتاب لا تغلوا فی دینکم غیر الحق[1])۔

البتہ عیسائیوں کا غلو تو واضح ہے باقی رہا یہودیوں کا غلو کہ اہل کتاب کا خطاب ان کے بارے میں بھی ہے، تو بعید نہیں ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جو وہ عزیر کے بارے میں کہتے تھے اور اسے خدا کا بیٹا سمجھتے تھے۔ چونکہ غلو کا سرچشمہ عموماً گمراہ لوگوں کی ہوا و ہوس کی پیروی کرنا ہے اس لیے اس گفتگو کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے کہ اس قوم کی خواہشات کی پیروی نہ کرو کہ جو تم سے پہلے گمراہ ہوئی اور انہوں نے بہت سے لوگوں کو بھی گمراہ کیا اور جو راہ مستقیم سے منحرف ہو گئے (ولا تتبعوا اهواء قوم قد ضلوا من قبل واضلوا کثیرا وضلوا عن سواء السبیل)۔

یہ جملہ حقیقت میں ایک ایسی چیز کی طرف اشارہ ہے جو مسیحیت کی تاریخ میں بھی منعکس ہے کہ مسئلہ تثلیث اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلو مسیحیت کی ابتدائی صدیوں میں ان کے درمیان وجود نہیں رکھتا تھا بلکہ جب ہندوستان کے بت پرست اور ان کی مانند دوسرے لوگوں نے دین مسیحیت اختیار کیا تو انہوں نے اپنے سابقہ دین میں سے باقی ماندہ ایک چیز یعنی تثلیث شرک کو مسیحیت میں شامل کر دیا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ تثلیث ہندی (تین خداؤں، برہما، وشنو، سیفا پر ایمان) تاریخی لحاظ سے تثلیث مسیحیت سے پہلے تھا اور درحقیقت یہ اسی کی حکایت ہے۔ سورہ توبہ کی آیت ۳۰ میں بھی یہود و نصاریٰ کے عزیر و عیسیٰؑ کے بارے میں غلو کے ذکر کے بعد ہے کہ:

یُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ

ان کی باتیں گزشتہ کفار کی باتوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔

اس عبارت میں لفظ "ضلوا" ان کفار کے بارے میں ہے کہ جن سے اہل کتاب نے غلو کا اقتباس کیا تھا اور یہ لفظ دو مرتبہ آیا ہے۔

ممکن ہے کہ یہ تکرار تاکید کے لیے ہو یا اس بنا پر ہو کہ وہ پہلے سے تو گمراہ تھے ہی لیکن بعد میں اپنی تبلیغات کے ذریعہ انہوں نے

---

[1] "لا تغلوا" کا مادہ "غلو" ہے جس کے معنی ہیں حق سے تجاوز کرنا۔ فرق یہ ہے کہ جب یہ کسی کے مقام و منزلت سے متعلق تجاوز ہو تو غلو کہا جاتا ہے، اگر کسی چیز کے نرخ اور قیمت کے بارے میں ہو تو غلاء کہا جاتا ہے اور اگر تیر کے بارے میں ہو تو غلو بر وزن دلو کہتے ہیں جو جوش مارنے کو غلیان کہتے ہیں اور جو جانور بہت ہی سرکش ہو اسے غلواء کہتے ہیں، یہ سب اسی مادہ سے ہیں۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ غلو افراط کی طرف بھی بولا جاتا ہے اور تفریط کی طرف بھی جبکہ بعض اسے تفریط میں منحصر سمجھتے ہیں اور اس کے نقطہ مقابل کو تقصیر کہتے ہیں۔

دوسروں کو بھی گمراہ کردیا تو وہ ایک نئی گمراہی میں جاگرے۔ کیونکہ جو شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچ لے جائے درحقیقت وہ سب سے زیادہ گمراہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی قوتوں کو خود اپنی اور دوسرے لوگوں کی بدبختی میں تلف کردیا ہے اور دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے دوش پر اٹھالیا ہے۔ آیا وہ شخص کہ جو سیدھے راستے پر قرار پاچکا ہو کبھی اس بات کے لیے تیار ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اٹھائے۔

۷۸۔ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

۷۹۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

۸۰۔ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝

## ترجمہ

۷۸۔ جو لوگ بنی اسرائیل میں سے کافر ہوگئے ہیں انہیں حضرت داؤد و عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس بنا پر ہوا کہ وہ گناہ اور تجاوز کرتے تھے۔

۷۹۔ وہ ان برے اعمال سے جنہیں وہ خود انجام دیتے تھے ایک دوسرے کو منع نہیں کیا کرتے تھے۔

۸۰۔ تم ان میں سے بہت سے لوگوں کو دیکھو گے کہ وہ کافروں (اور بت پرستوں) کو دوست رکھتے ہیں (اور ان سے راہ و رسم بڑھاتے ہیں) انہوں نے کتنے برے اعمال اپنے (انجام اور آخرت) کے لیے آگے بھیجے ہیں کہ جن کا نتیجہ خدا کی ناراضگی تھی لہٰذا وہ ہمیشہ عذاب (الٰہی) میں رہیں گے۔

## تفسیر

ان آیات میں اس بنا پر کہ اہل کتاب کو ان سے پہلے لوگوں کی اندھی تقلید سے روکا جائے ان کی بدبختی کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی ہے اور ان دو بزرگ انبیاء نے خدا سے درخواست کی ہے کہ وہ انہیں اپنی رحمت سے دور رکھے (لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داؤد و عیسی ابن مریم)۔

اس سلسلے میں کہ صرف ان دو ہی پیغمبروں کا نام کیوں لیا گیا کئی احتمال پیش کیے گئے ہیں۔ کبھی تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے بعد زیادہ معروف نبی یہی دونوں تھے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اہل کتاب اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ داؤد کی اولاد ہیں۔ لہٰذا قرآن اس جملے کے ذریعہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ حضرت داؤد ان لوگوں سے کہ جنہوں نے کفر و طغیان اختیار کیا تھا متنفر تھے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس آیت میں دو تاریخی واقعات کی طرف اشارہ ہے کہ جس پر یہ دونوں عظیم پیغمبر غضب ناک ہوئے اور انہوں نے بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر لعنت کی۔ حضرت داؤد نے ساحلی شہر ایلہ کے ساکنین پر کہ جو اصحاب سبت کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا قصہ سورہ اعراف میں آئے گا اور حضرت عیسیٰ نے اپنے پیروکاروں میں سے اس گروہ پر لعنت و نفرین کی کہ جنہوں نے آسمانی مائدہ کے نازل ہونے کے بعد بھی انکار و مخالفت کی راہ اختیار کیے رکھی۔

بہرحال اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نسل بنی اسرائیل سے ہونا یا حضرت عیسیٰ کے ماننے والوں میں سے ہونا کسی کی نجات کا باعث نہیں ہوگا، جب تک ان کے اعمال کے ساتھ ہم آہنگی نہ پیدا کی جائے۔ بلکہ خود ان انبیاء نے ایسے افراد سے نفرت کی ہے۔

آیت کا آخری جملہ بھی اس مطلب کی تائید کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ نفرت و بیزاری کا یہ اعلان اس بنا پر تھا کہ وہ گنہگار اور تجاوز کرنے والے تھے (ذلك بما عصوا و كانوا يعتدون)۔

اس کے علاوہ وہ لوگ کسی طرح بھی اپنے لیے کسی اجتماعی ذمہ داری کے قائل نہ تھے اور ایک دوسرے کو غلط کاری سے منع نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے نیک لوگوں کا ایک گروہ خاموشی سے اور سازشی انداز میں گنہگار لوگوں میں عملی طور پر شوق پیدا کرتا تھا (كانوا لا يتناهون عن منكر فعلوه)۔

اس طرح ان کی زندگی کا لائحہ عمل بہت ہی پست اور ناپسندیدہ تھا (لبئس ما كانوا يفعلون)۔

اس آیت کی تفسیر میں پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہل بیتؑ سے ایسی روایات نقل ہوئی ہیں جو بہت ہی سبق آموز ہیں۔

ایک حدیث میں جو پیغمبرؐ سے روایت ہوئی ہے منقول ہے:

لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر ولتأخذن على يد السفيه و لتأطرنه على الحق اطرًا، او ليضربن الله قلوب بعضكم على بعض و يلعنكم كما لعنهم

تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو، نادان اور جاہل لوگوں کا ہاتھ پکڑو اور حق کی طرف دعوت دو ورنہ خدا تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کی مانند کر دے گا اور تمہیں اپنی رحمت سے اسی طرح دور کر دے گا جس طرح سے اس نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا تھا۔[1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں اور تفسیر قرطبی جلد چہارم صفحہ ۲۲۴۵ میں نیز اس میں اسی مضمون کی ایک حدیث ترمذی سے نقل کی گئی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے (کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ) کی تفسیر میں منقول ہے:

اما انھم لم یکونوا یدخلون مداخلھم ولا یجلسون مجالسھم ولکن کانوا اذا لقوھم ضحکوا فی وجوھھم وانسوا بھم۔[1]

یہ گروہ جن کی خدا مذمت کر رہا ہے ہرگز گنہگاروں کے کاموں اور ان کی محفلوں میں شریک نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ فقط اس وقت جبکہ اُن سے ملاقات کرتے تھے تو اُن کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور ان سے مانوس تھے۔

بعد والی آیت میں ان کے ایک اور غلط عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم اُن میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ وہ کافروں کے ساتھ محبت اور دوستی کی بنیادیں استوار کرتے ہیں (تری کثیرا منھم یتولون الذین کفروا)۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ان کی دوستی ایک عام دوستی کی طرح نہ تھی بلکہ وہ طرح طرح کے گناہوں سے مخلوط اور غلط اعمال و افکار کا شوق پیدا کرنے والی دوستی تھی لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: انہوں نے کیسے بُرے اعمال اپنی آخرت کے لیے آگے بھیجے ہیں کہ جن کا نتیجہ خدا کا غضب و غضب تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے عذاب الٰہی میں مبتلا رہیں گے۔

(لبئس ما قدمت لھم انفسھم ان سخط اللہ علیھم وفی العذاب ھم خلدون)

اس بارے میں کہ "الذین کفروا" سے اس آیت میں کون سے افراد مراد ہیں بعض نے تو یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ اس سے منظور مشرکین مکہ ہیں کہ جن کے ساتھ یہودیوں نے دوستی کی پینگیں بڑھا رکھی تھیں اور بعض نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے منظور وہ ظالم و ستمگر ہیں جن کے ساتھ یہودیوں نے گزشتہ زمانے میں دوستی کر رکھی تھی۔

وہ حدیث جو امام باقرؑ سے اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہے وہ بھی اس معنی کی تائید کرتی ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

یتولون الملوک الجبارین ویزینون لھم اھواءھم لیصیبوا من دنیاھم۔[2]

یہ گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھا جو جابر بادشاہوں کو دوست رکھتے تھے اور ان کے ہوس آلود گناہوں کو ان کی نظر میں اچھا کر کے پیش کرتے تھے تاکہ انہیں اُن کا قرب حاصل ہو اور ان کی دنیا سے بہرہ ور ہوں۔

اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ آیت دونوں ہی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہو بلکہ ان معنی سے بھی بڑھ کر عام ہو۔

۸۱۔ وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○

## ترجمہ

۸۱۔ اگر وہ خدا پر اور پیغمبر پر اور جو کچھ اس کے اُوپر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لے آتے تو (ہرگز) انہیں اپنا دوست نہ بناتے

---

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۴۹۲ و تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۶۶۱۔

[2] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

لیکن ان میں سے بہت سے لوگ فاسق ہیں۔

## تفسیر

اس آیت میں اللہ تعالےٰ انہیں اس غلط اور نادرست طریقۂ عمل سے راہ نجات کی طرف رہنمائی کر رہا ہے کہ اگر واقعاً خدا اور پیغمبر اور جو کچھ اس پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے تو کبھی بیگانوں اور خدا کے دشمنوں سے دوستی نہ کرتے اور نہ ہی انہیں اپنے لیے سہارے کے طور پر منتخب کرتے (ولو کانوا یؤمنون باللہ والنبی وما انزل الیہ ما اتخذوھم اولیآء)۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اُن میں اطاعت خدا کرنے والے لوگ بہت ہی کم ہیں اور اُن میں سے زیادہ تر فرمان خدا کے دائرہ سے خارج ہو چکے ہیں اور فسق کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں (ولٰکن کثیرًا منھم فٰسقون)۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس مقام پر "النبی" سے مراد پیغمبر اسلامؐ ہیں کیونکہ قرآن مجید کی مختلف آیات میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے اور یہ امر قرآن کی دسیوں آیات میں دکھائی دیتا ہے۔

آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے کہ "کانوا" کی ضمیر مشرکین اور بت پرستوں کی طرف لوٹتی ہو کہ اگر یہ مشرک جو یہودیوں کے دوست اور ان کے لیے قابل اعتماد ہیں پیغمبر اکرمؐ اور قرآن پر ایمان لے آتے تو یہودی کبھی انہیں اپنا دوست نہ بناتے اور یہ ان کی گمراہی اور فسق و فجور کی واضح نشانی ہے کیونکہ وہ کتب آسمانی کی پیروی کے دعوے کے ساتھ بت پرستوں سے اس وقت تک دوستی نہ کرتے جب تک وہ مشرک ہیں جبکہ ہوتا یہ ہے کہ جب وہ خدا اور آسمانی کتابوں کی طرف آجاتے ہیں تو یہ اُن سے دوری اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن پہلی تفسیر آیات کے ظاہری مفہوم سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے اور اس کے مطابق تمام ضمیریں ایک ہی مرجع (یعنی یہودیوں) کی طرف لوٹتی ہیں۔

۸۲۔ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰی ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

۸۳۔ وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤی اَعْیُنَهُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ۝

۸۴۔ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ یُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِیْنَ ۝

۸۵۔ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ ۝

۸۶۔ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ۝ ع

## ترجمہ

۸۲۔ یقینی طور پر تم یہود اور مشرکین کو مومنین کی دشمنی میں سب لوگوں سے بڑھا ہوا پاؤ گے لیکن وہ لوگ کہ جو خود کو مسیحی کہتے ہیں انہیں تم مومنین کے ساتھ دوستی میں قریب تر پاؤ گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں کچھ دانشمند اور دنیا سے دور افراد موجود ہیں اور وہ حق کے مقابلے میں تکبر نہیں کرتے۔[1]

۸۳۔ اور وہ جس وقت پیغمبر پر نازل ہونے والی آیات سنتے ہیں تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے (فرطِ شوق میں) آنسو جاری ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے حق کو پہچان لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں پس

---

[1] ساتواں پارہ آیت ۸۳ سے شروع ہوتا ہے لیکن آیت ۸۲ کو مضمون کی مناسبت سے یہاں درج کیا گیا ہے (مترجم)۔

تو ہمیں حق کی گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔

۸۴۔ ہم خدا پر اور اس حق پر جو ہم تک پہنچا ہے کیوں ایمان نہ لے آئیں جبکہ ہماری آرزو ہے کہ وہ ہمیں صالحین کے گروہ میں سے قرار دے۔

۸۵۔ خدا نے انہیں ان ہی باتوں کی وجہ سے جنت کے ایسے باغات ثواب وجزا کے طور پر دیئے کہ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور یہ نیکوکاروں کی جزا ہے۔

۸۶۔ اور وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں اور انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا وہ اہلِ دوزخ ہیں۔

## شانِ نزول

### اسلام کے پہلے مہاجرین

بہت سے مفسرین نے مثلاً طبرسی، نے 'مجمع البیان' میں اور فخرالدین رازی، اور 'المنار' کے مولف نے اپنی اپنی تفسیروں میں اپنے سے پہلے مفسرین کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہ آیات پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں نیز جو حدیث تفسیر برہان میں نقل ہوئی ہے اس میں بھی یہی بات شرح وبسط سے بیان کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں اسلامی روایات وتواریخ اور مفسرین کے اقوال سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ اس طرح ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی بعثت اور عمومی دعوت کے ابتدائی سالوں میں مسلمان بہت ہی کم تعداد میں تھے۔ قریش نے قبائل عرب کو یہ نصیحت کر رکھی تھی کہ ہر قبیلہ اپنے قبیلے کے ان لوگوں پر کہ جو پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لاچکے ہیں انتہائی سخت دباؤ ڈالیں اور اس طرح مسلمانوں میں سے ہر کوئی اپنی قوم وقبیلہ کی طرف سے انتہائی سختی اور دباؤ میں مبتلا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد جہادِ آزادی شروع کرنے کے لیے کافی نہیں تھی۔ پیغمبر اکرمؐ نے اس چھوٹے سے گروہ کی حفاظت اور مسلمانوں کے لیے حجاز سے باہر قیام گاہ مہیا کرنے کے لیے انہیں ہجرت کا حکم دیا اور اس مقصد کے لیے حبشہ کو منتخب فرمایا اور کہا کہ وہاں ایک نیک دل بادشاہ ہے جو ظلم وستم کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ تم وہاں چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ کوئی مناسب موقع ہمیں عطا فرمائے۔

پیغمبر اکرمؐ کی مراد نجاشی سے تھی (نجاشی ایک عام نام تھا جیسے "کسریٰ"، جو حبشہ کے تمام بادشاہوں کا خاص لقب تھا لیکن اس نجاشی کا اصل نام جو پیغمبرؐ کا ہم عصر تھا اصحمہ تھا جو کہ حبشہ کی زبان میں عطیہ وبخشش کے معنی میں ہے)۔

مسلمانوں میں سے گیارہ مرد اور چار عورتیں حبشہ جانے کے لیے تیار ہوئے اور ایک چھوٹی سی کشتی کرایہ پر لے کر بحری راستے سے حبشہ جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ بعثت کے پانچویں سال ماہ رجب کا واقعہ ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جناب

جعفر بن ابو طالب بھی مسلمانوں کے ایک دوسرے گروہ کے ساتھ حبشہ چلے گئے۔ اب اس اسلامی جمعیت میں ۸۲ مردوں کے علاوہ کافی تعداد میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔

اس ہجرت کی بنیاد بت پرستوں کے لیے سخت تکلیف دہ تھی کیونکہ وہ اچھی طرح سے دیکھ رہے تھے کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ وہ لوگ جو تدریجاً اسلام کو قبول کر چکے ہیں اور حبشہ کی سرزمین امن وامان کی طرف چلے گئے ہیں مسلمانوں کی ایک طاقتور جماعت کی صورت اختیار کر لیں گے۔ یہ حیثیت ختم کرنے کے لیے انہوں نے کام کرنا شروع کر دیا اس مقصد کے لیے انہوں نے جوانوں میں سے دو ہوشیار، فعال، حیلہ ساز اور عیار جوانوں یعنی عمرو بن عاص اور عمارہ بن ولید کا انتخاب کیا بہت سے ہدیے دے کر ان کو حبشہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ ان دونوں نے کشتی میں بیٹھ کر شراب پی اور ایک دوسرے سے لڑ پڑے۔ لیکن آخر کار وہ اپنی سازش کو روبہ عمل لانے کے لیے سرزمین حبشہ میں داخل ہو گئے۔ ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد وہ نجاشی کے دربار میں پہنچ گئے۔ دربار میں باریاب ہونے سے پہلے انہوں نے نجاشی کے درباریوں کو بہت قیمتی ہدیے دے کر ان کو اپنا موافق بنا لیا تھا اور ان سے اپنی طرفداری اور تائید کرنے کا وعدہ لے لیا تھا۔

"عمرو عاص" نے اپنی گفتگو شروع کی اور نجاشی سے اس طرح ہمکلام ہوا:

ہم سرداران مکہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان کچھ کم عقل جوانوں نے مخالفت کا علم بلند کیا ہے اور وہ اپنے بزرگوں کے دین سے پھر گئے ہیں اور ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ انہوں نے فتنہ و فساد برپا کر دیا ہے، لوگوں میں نفاق کا بیج بو دیا ہے، آپ کی سرزمین کی آزادی سے انہوں نے غلط فائدہ اٹھایا ہے اور انہوں نے یہاں آکر پناہ لے لی ہے۔ ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ وہ یہاں بھی خلل اندازی نہ کریں۔ بہتر ہے کہ آپ انہیں ہمارے سپرد کر دیں تاکہ ہم انہیں اپنی جگہ واپس لے جائیں۔

یہ کہہ کر ان لوگوں نے وہ ہدیے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے پیش کیے۔

نجاشی نے کہا:

جب تک میں اپنی حکومت میں پناہ لینے والوں کے نمائندوں سے نہ مل لوں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کر سکتا اور چونکہ یہ ایک مذہبی بحث ہے لہٰذا ضروری ہے کہ مذہبی نمائندوں ہی کو ایک جلسہ میں تمہاری موجودگی میں دعوت دی جائے۔

دوسرے دن ایک اہم جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں نجاشی کے مصاحبین اور عیسائی علماء کی ایک جماعت شریک تھی۔ جعفر بن ابی طالب مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے موجود تھے اور قریش کے نمائندے بھی حاضر ہوئے۔ نجاشی نے قریش کے نمائندوں کی باتیں سننے کے بعد جناب جعفر کی طرف رخ کیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنا نقطہ نظر بیان کریں۔

جناب جعفر ادائے احترام کے بعد اس طرح گویا ہوئے: پہلے ان سے پوچھیے کہ کیا ہم ان کے بھاگے ہوئے غلاموں میں سے ہیں؟

عمرو نے کہا: نہیں بلکہ آپ آزاد ہیں۔

جعفر: ان سے یہ بھی پوچھیے کہ کیا ان کا کوئی قرض ہمارے ذمہ ہے کہ جس کا وہ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں؟

عمرو: نہیں ہمارا آپ سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔

جعفر: کیا ہم نے تمہارا کوئی خون بہایا ہے کہ جس کا ہم سے بدلہ لینا چاہتے ہو؟

عمرو: نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

جعفر: تو پھر تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟ تم نے ہم پر اتنی سختیاں کیں اور اتنی تکلیفیں پہنچائیں اور ہم تمہاری سرزمین سے جو سراسر مرکز ظلم و جور تھی باہر نکل آئے ہیں۔

اس کے بعد جناب جعفر نے نجاشی کی طرف رُخ کیا اور کہا: ہم جاہل اور نادان تھے، بت پرستی کرتے تھے، مردار کا گوشت کھاتے تھے، طرح طرح کے بُرے اور شرمناک کام انجام دیتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، اپنے ہمسایوں سے بُرا سلوک کرتے تھے اور ہمارے طاقتور کمزوروں کے حقوق ہڑپ کر جاتے تھے۔

لیکن خداوند تعالےٰ نے ہمارے درمیان ایک پیغمبر کو مبعوث فرمایا، جس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم خدا کا کوئی مثل اور شریک نہ بنائیں اور فحشاء و منکر، ظلم و ستم اور قمار بازی ترک کردیں۔ ہمیں حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں، زکوٰۃ ادا کریں، عدل و احسان سے کام لیں اور اپنے وابستگان کی مدد کریں۔

نجاشی نے کہا: عیسیٰ مسیحؑ بھی انہی چیزوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

اس کے بعد اس نے جناب جعفر سے پوچھا: ان آیات میں سے جو تمہارے پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں کچھ تمہیں یاد ہیں۔

جعفر نے کہا: جی ہاں!

اور پھر انہوں نے سورۂ مریم کی تلاوت شروع کردی۔ اس سورہ کی ایسی ہلا دینے والی آیات کے ذریعہ جو مسیحؑ اور اُن کی ماں کو ہر قسم کی ناروا تہمتوں سے پاک قرار دیتی ہیں، جناب جعفر کے حسن انتخاب نے عجیب و غریب اثر کیا یہاں تک کہ مسیحی علماء کی آنکھوں سے فرطِ شوق میں آنسو بہنے لگے اور نجاشی نے پکار کر کہا: خدا کی قسم! ان آیات میں حقیقت کی نشانیاں نمایاں ہیں۔

جب عمرو نے چاہا کہ اب یہاں کوئی بات کرے اور مسلمانوں کو اس کے سپرد کرنے کی درخواست کرے، نجاشی نے ہاتھ بلند کیا اور زور سے عمرو کے منہ پر مارا اور کہا: خاموش رہو، خدا کی قسم! اگر ان لوگوں کی مذمت میں اس سے زیادہ کوئی بات کی تو میں تجھے سزا دوں گا۔ یہ کہہ کر مامورین حکومت کی طرف رُخ کیا اور پکار کر کہا: ان کے ہدیے ان کو واپس کردو اور انہیں حبشہ کی سرزمین سے باہر نکال دو۔ جناب جعفر اور اُن کے ساتھیوں سے کہا: تم آرام سے میرے ملک میں زندگی بسر کرو۔

اس واقعہ نے جہاں حبشہ کے کچھ لوگوں پر اسلام شناسی کے سلسلے میں گہرا تبلیغی اثر کیا وہاں یہ واقعہ اس بات کا بھی سبب بنا کہ کے مسلمان اس کو ایک اطمینان بخش جائے پناہ شمار کریں اور نئے مسلمان ہونے والوں کو اُس دن کے انتظار میں کہ جب وہ کافی قدرت و طاقت حاصل کریں وہاں پر بھیجتے رہیں۔

کئی سال گذر گئے۔ پیغمبرؐ بھی ہجرت فرما گئے اور اسلام روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا، عہد نامہ حدیبیہ لکھا گیا اور پیغمبر اکرمؐ فتح خیبر کی طرف متوجہ ہوئے۔

اس وقت جبکہ مسلمان یہودیوں کے سب سے بڑے اور خطرناک مرکز کے ٹوٹنے کی وجہ سے اتنے خوش تھے کہ پھولے نہیں سماتے تھے، دور سے انہوں نے ایک مجمع کو لشکر اسلام کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ معلوم ہوا کہ یہ وہی مہاجرین حبشہ ہیں، جو آغوش وطن میں پلٹ کر آرہے ہیں، جب کہ دشمنوں کی بڑی بڑی طاقتیں دم توڑ چکی ہیں اور اسلام کا پودا اپنی جڑیں کافی پھیلا چکا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے جناب جعفرؓ اور مہاجرین حبشہ کو دیکھ کر یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

لا ادری انا بفتح خیبر اسرام بقدوم جعفر؟

"میں نہیں جانتا کہ مجھے خیبر کے فتح ہونے کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کے پلٹ آنے کی"

کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے علاوہ شامیوں میں سے آٹھ افراد کہ جن میں ایک مسیحی راہب بھی تھا اور ان کا اسلام کی طرف شدید میلان پیدا ہو گیا تھا پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سورۂ یٰسین کی کچھ آیات سننے کے بعد رونا شروع کر دیا اور مسلمان ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ آیات مسیح کی سچی تعلیمات سے کس قدر مشابہت رکھتی ہیں۔

اس روایت کے مطابق جو تفسیر "المنار" میں سعید ابن جبیر سے منقول ہے نجاشی نے اپنے یار و انصار میں سے تیس بہترین افراد کو پیغمبر اکرمؐ اور دین اسلام کے ساتھ اظہار عقیدت کے لیے مدینہ بھیجا تھا اور یہ وہی تھے جو سورۂ یٰسین کی آیات سن کر رو پڑے تھے اور اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان مومنین کی عزت افزائی کی گئی۔ (یہ شان نزول اس بات کے خلاف نہیں کہ سورۂ مائدہ پیغمبر اکرمؐ کی عمر کے اواخر میں نازل ہوئی ہو۔ کیونکہ یہ بات اس سورہ کی اکثر آیات کے ساتھ مربوط ہے لہٰذا اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ان میں سے کچھ آیات قبل کے واقعات کے سلسلے میں نازل ہوئی ہوں اور پیغمبر کی ہدایت کے مطابق اس سورہ میں بہت سی مناسبات کی وجہ سے شامل کر دی گئی ہوں)۔

# تفسیر

## یہودیوں کی کینہ پروری اور عیسائیوں کی نرم دلی

ان آیات میں اُن یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان موازنہ کیا گیا ہے جو پیغمبرؐ کے ہم عصر تھے۔ پہلی آیت میں یہودیوں اور مشرکین کو ایک ہی صف میں قرار دیا گیا ہے اور عیسائیوں کو دوسری صف میں۔ ابتدا میں فرمایا گیا ہے، مومنین کے سخت ترین دشمن یہودی اور مشرکین ہیں لیکن عیسائی مومنین سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں (لتجدن اشد الناس عداوة للذین اٰمنوا الیهود والذین اشرکوا ولتجدن اقربهم مودة للذین اٰمنوا الذین قالوا انا نصری)۔

تاریخ اسلام اس حقیقت کی اچھی طرح گواہ ہے کیونکہ اسلام کے خلاف لڑی جانے والی بہت سی جنگوں کے میدان میں یہودی بلاواسطہ یا بالواسطہ طریقہ سے دخیل رہے ہیں اور کسی عہد شکنی اور دشمنی سے باز نہیں آتے تھے۔ اُن میں سے بہت ہی کم افراد ایسے ہیں جو حلقہ بگوش اسلام ہوئے جبکہ ہم اسلامی جنگوں میں بہت کم مسلمانوں کو عیسائیوں سے آمنا سامنا کرتے دیکھتے ہیں

اور ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان میں سے بہت سے افراد مسلمانوں کی صفوں میں آملے۔

اس کے بعد قرآن اس روحانی فرق کی دلیل اور رہن سہن کے اجتماعی طریقوں کو چند جملوں میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پیغمبر کے ہم عصر عیسائی کچھ ایسے امتیازات رکھتے تھے کہ جو یہودیوں میں نہیں تھے۔

پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ ان میں علماء اور دانشمندوں کی ایک ایسی جماعت موجود تھی جو دنیا پرست یہودی علماء کی طرح حقیقت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے تھے ( ذلك بان منهم قسيسين )۔[1]

نیز اُن کے درمیان کچھ لوگ تارک دنیا بھی تھے کہ جو از روئے عمل لالچی یہودیوں کے بالکل برخلاف تھے اگر چہ وہ بھی کئی طرح کے انحرافات کے مرتکب تھے لیکن پھر بھی وہ ایک ایسی سطح پر تھے جو یہودیوں سے بالاتر تھی (ورھبانا)۔

اُن میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو حق کے قبول کرنے میں خاضع تھے اور اپنی طرف سے تکبر کا اظہار نہیں کرتے تھے جبکہ یہودیوں کی اکثریت دین اسلام کو قبول کرنے سے اس وجہ سے سرتابی کرتی تھی کیونکہ وہ خود کو ایک برتر نسل سمجھتے تھے اور دین اسلام یہودیوں کی نسل میں قائم نہیں ہوا تھا ( و انهم لا يستكبرون )۔

علاوہ ازیں ان میں سے ایک جماعت ( جیسے جناب جعفر کے ساتھی اور حبشہ کے عیسائیوں میں سے کچھ لوگ ) ایسے تھے کہ وہ جس وقت قرآن کی آیات کو سنتے تھے تو حق کے حاصل ہو جانے کی خوشی میں ان کی آنکھوں سے شوق کے آنسو جاری ہو جاتے تھے ( واذا سمعوا ما انزل الى الرسول ترى اعينهم تفيض من الدمع مما عرفوا من الحق)۔

اور وہ صراحت کے ساتھ علی الاعلان بغیر کسی لگ لپیٹ کے پکار اُٹھتے تھے پروردگارا! ہم ایمان لے آئے ہیں ہمیں حق کے گواہوں اور محمدؐ کے ساتھیوں اور یار و انصار میں سے قرار دے ( يقولون ربنا امنا فاكتبنا مع الشٰهدين)۔

وہ اس آسمانی کتاب کی ہلا دینے والی آیات سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ پکار اُٹھتے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم خدائے یکتا پر اور ان حقائق پر جو اُس کی طرف سے آئے ہیں ایمان نہ لائیں جبکہ ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں صالحین کے زمرے میں قرار دے ( و ما لنا لا نؤمن بالله و ما جاءنا من الحق ونطمع ان يدخلنا ربنا مع القوم الصٰلحين)۔

البتہ جیسا ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں یہ موازنہ زیادہ تر پیغمبر اسلام کے ہم عصر یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہے کیونکہ یہودی آسمانی کتاب کے حامل ہونے کے باوجود مادیت سے بے اندازہ لگاؤ کی وجہ سے مشرکین کی صف میں جا کھڑے ہوئے تھے۔ جب کہ مذہبی نقطہ نظر سے اُن دونوں میں کوئی وجہ مشترک نہیں تھی۔ حالانکہ ابتدا میں یہودی اسلام کی بشارت دینے والوں میں شمار ہوتے تھے اور اُن میں عیسائیوں کی طرح تثلیث اور غلو جیسے انحرافات موجود نہیں تھے۔

لیکن ان کی شدید دنیا پرستی نے انہیں حق سے بالکل بیگانہ کر دیا جبکہ اُس زمانے کے عیسائی ایسے نہیں تھے۔

لیکن گذشتہ اور موجودہ زمانے کی تاریخ ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ بعد کے زمانوں کے عیسائی، اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ایسے جرائم کے مرتکب ہوئے جو یہودیوں کے جرائم سے کسی طرح کم نہ تھے۔ گذشتہ زمانے میں طویل اور خونیں صلیبی جنگیں

---

[1] کشیش اصل میں سریانی زبان کا لفظ ہے کہ جس کا معنی عیسائیوں کا مذہبی پیشوا اور رہنما ہے جس کو عربی میں قسیس کہا جاتا ہے اس کی جمع قسیسین ہے۔

اور اس زمانے کی ایسی بے شمار تحریکیں جو مسیحی سامراجی ممالک کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہیں کسی پر ڈھکی چھپی نہیں۔ لہٰذا اوپر والی آیات کو تمام عیسائیوں کے بارے میں ایک قانون کلی کے طور پر نہیں جاننا چاہیے۔ واذا سمعوا ما انزل الی الرسول۔ اور اس کے بعد کے جملے اس بات پر گواہ ہیں کہ یہ آیات صرف پیغمبر اکرمؐ کے ہم عصر عیسائیوں کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

اس کے بعد کی دو آیات میں ان ہی دونوں گروہوں کے انجام اور جزاء و سزا کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں نے صاحب ایمان افراد کے سامنے محبت کا اظہار کیا اور آیات الٰہی کے مقابلہ میں سر تسلیم خم کیا اور صراحت کے ساتھ اپنے ایمان کا اظہار کیا خداوند تعالیٰ اس کے بدلے میں بطور جزا و ثواب انہیں جنت کے ایسے باغات عطا فرمائے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور نیکوکار لوگوں کی یہی جزا ہے (فاثابھم اللہ بما قالوا جنات تجری من تحتھا الانھٰر خٰلدین فیھا و ذٰلک جزآء المحسنین)۔[1]

اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے دشمنی کا راستہ اختیار کیا اور کافر ہو گئے (والذین کفروا وکذبوا باٰیٰتنا اولٰئک اصحٰب الجحیم)۔

۸۷۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

۸۸۔ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝

۸۹۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ

---

[1] "اثابھم" ثواب کے مادے سے لیا گیا ہے کہ جو اصل میں "لوٹ آنے" "نیکی کرنے" اور کسی کو نفع پہنچانے کے معنی میں ہے۔

اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ○

## ترجمہ

۸۷۔ اے ایمان والو! اُن پاکیزہ چیزوں کو جو خدا نے تم پر حلال کر دی ہیں اپنے اُوپر حرام نہ کرو اور حد سے تجاوز نہ کرو کیونکہ خدا حد سے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

۸۸۔ اور خداوند تعالےٰ نے حلال اور پاکیزہ نعمات میں سے جو رزق تمہیں دے رکھا ہے اُنہیں کھاؤ اور اس خدا (کی مخالفت) سے پرہیز کرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔

۸۹۔ خداوند تعالیٰ تمہیں بے ہودہ (اور بے ارادہ) قسموں کی وجہ سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن وہ قسمیں کہ جنہیں (ارادہ کے ساتھ) تم نے محکم کیا ہو ان کے بارے میں مواخذہ کرے گا۔ اس قسم کی قسموں کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے (اور وہ کھانا ایسا ہونا چاہیے) جو تم عام طور پر اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔ یا دس مسکینوں کو لباس پہنانا ہے یا ایک غلام آزاد کرنا ہے اور جسے ان میں سے کچھ میسر نہ ہو وہ تین دن روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے۔ جب تم قسمیں کھاتے ہو (اور پھر ان کی مخالفت کرتے ہو) اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو اور انہیں نہ توڑو۔ خداوند تعالےٰ اسی طرح سے اپنی آیات کو تمہارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم اس کا شکر بجالاؤ۔

## شانِ نزول

### حد سے تجاوز نہ کرو

درج بالا آیات کے بارے میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ ایک دن پیغمبرؐ نے روز قیامت خداوند تعالےٰ کی عظیم عدالت میں لوگوں کی حالت وکیفیت سے متعلق کچھ بیان فرمایا۔ ان بیانات نے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا اور کچھ لوگ رونے لگے اُس کے بعد اصحاب پیغمبرؐ میں سے ایک گروہ نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ کچھ لذائذ اور راحتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے ان کی جگہ عبادت میں مشغول رہیں۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ نے قسم کھائی کہ رات کو بہت کم سویا کریں گے اور عبادت میں مشغول رہیں گے۔ بلال نے قسم کھائی کہ ہمیشہ روزہ رکھیں گے۔ عثمان بن مظعون نے قسم کھائی کہ اپنی بیوی سے مباشرت ترک کر کے عبادت کرتے رہیں گے۔ ایک دن عثمان بن مظعون کی بیوی عائشہ کے پاس آئی۔ وہ ایک جوان عورت تھی اور بڑی ہی حسین وجمیل تھی۔ عائشہ کو اس کی حالت پر تعجب ہوا اور کہنے لگی کہ تم اپنا بناؤ سنگھار کیوں نہیں کرتی۔ اس نے کہا کہ بناؤ سنگھار کس کے لیے کروں میرے

شوہر نے تو ایک عرصہ ہوا مجھے چھوڑ کر رہبانیت اختیار کر رکھی ہے۔ یہ باتیں پیغمبرؐ کے گوش گزار ہوئیں تو آپؐ نے ایک فرمان جاری فرمایا کہ تمام مسلمان مسجد میں جمع ہوں۔ جب سب لوگ مسجد میں اکٹھے ہوگئے تو آپؐ منبر پر تشریف لے گئے اور پروردگار کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

تم میں سے بعض لوگوں نے پاکیزہ چیزوں کو کیوں اپنے اوپر حرام کر لیا ہے میں اپنی سنت تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں، جو اس سے روگردانی کرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں رات کے ایک حصہ میں سوتا ہوں اور اپنی بیویوں سے مباشرت کرتا ہوں اور ہر روز روزہ بھی نہیں رکھتا۔

آگاہ رہو میں ہرگز تمہیں یہ حکم نہیں دیتا کہ عیسائیوں کے پادریوں اور راہبوں کی طرح دنیا ترک کر دو کیونکہ اس قسم کے مسائل اور اس طرح کی رہبانیت میرے دین میں نہیں ہے۔ میری امت کی رہبانیت جہاد میں ہے (اگر تم دنیا کو ترک کرنا چاہتے ہو تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ وہ جہاد جیسے تعمیری راستے پر چلتے ہوئے ہو) تم اپنے آپ کو سختی میں نہ ڈالو کیونکہ جو لوگ تم سے پہلے ہو گزرے ہیں اُن میں سے ایک گروہ اپنے آپ کو سختی میں ڈالنے کے نتیجے میں ہی ہلاک ہوا تھا۔

جن لوگوں نے یہ قسم کھا رکھی تھی کہ وہ ان چیزوں کو چھوڑ دیں گے وہ کھڑے ہوگئے اور انہوں نے کہا اے رسولِ خدا! اس سلسلے میں ہم نے قسم کھائی تھی اب اس قسم کے سلسلے میں ہماری ذمہ داری کیا ہے تو مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں جن کے ذریعے انہیں جواب دیا گیا۔[1]

اس مقام پر یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ مذکورہ قسموں میں سے بعض مثلاً وہ قسم جو عثمان بن مظعون سے نقل کی گئی ہے چونکہ وہ ان کی بیوی کے حقوق کے منافی تھی لہٰذا وہ قسم شرعاً جائز نہیں تھی۔ لیکن حضرت علیؑ کی قسم جو کہ رات کو بیدار رہنے اور عبادت میں مشغول رہنے کے سلسلے میں ہے ایک امر مباح اور جائز تھی اگرچہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیٰ اور بہتر یہی تھا کہ مسلسل ایسا نہ ہو لیکن یہ امر حضرت علیؑ کے مقام عصمت کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کی نظیر پیغمبرؐ کے بارے میں بھی سورہ تحریم کی آیت ۱ میں ہے:

یاایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک

اے پیغمبر! وہ امور جو تیرے لیے اللہ نے حلال قرار دیے ہیں اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے اوپر کیوں حرام کرتے ہو (یا اپنے آپ کو ان سے کیوں محروم کرتے ہو)۔

# تفسیر

## قسم اور اس کا کفارہ

اس آیت میں اور اس سے بعد کی آیات میں اہم اسلامی احکام کا ایک سلسلہ بیان ہوا ہے۔ اُن میں سے بعض تو ایسے ہیں جو

---

[1] مذکورہ بالا شانِ نزول کا کچھ حصہ تفسیر علی بن ابراہیم سے اور کچھ حصہ مجمع البیان اور دوسری تفاسیر سے لیا گیا ہے۔

اس روایت میں جناب امیرؑ کا ذکر درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ آپ اُن ذوات مقدسہ میں سے ہیں کہ جن سے ترک اولیٰ کا صدور بھی نہیں ہوتا۔ (مترجم)

پہلی مرتبہ بیان ہوئے ہیں۔ لیکن زیادہ اہم حصہ ان احکام کی توضیح وتاکید کے طور پر بھی بیان ہوا ہے جو قرآن کی دیگر آیات میں پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورہ پیغمبر کی عمر کے آخر میں نازل ہوئی ہے لہٰذا ضروری تھا کہ اس میں مختلف اسلامی احکام کے بارے میں زیادہ تاکید کی جائے۔ پہلی آیت میں بعض مسلمانوں کی طرف سے کچھ نعمات الٰہی کی تحریم کی طرف اشارہ ہوا ہے اور انہیں اس کام کی تکرار سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے ایمان لانے والو! طیبات اور ایسے پاکیزہ امور جنہیں خدا نے تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے اپنے اوپر حرام نہ کرو۔

(یاایها الذین اٰمنوا لا تحرموا طیبات ما احل الله لکم[1])۔

اس حکم کا تذکرہ شان نزول کے مفہوم کے علاوہ ممکن ہے اس بارے میں بھی ہو کہ اگر گذشتہ آیات میں کچھ عیسائی علماء اور رہبانوں کی مدح وستائش کی گئی ہے تو وہ ان کے حق کی طرف مائل ہونے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی وجہ سے تھی نہ کہ ان کے ترکِ دنیا کے عمل اور تحریم طیبات کی خاطر تھی اور مسلمان اس بارے میں ان کی پیروی کر سکتے۔ یہ حکم بیان کر کے اسلام نے صراحت کے ساتھ رہبانیت اور ترکِ دنیا سے جیسے عیسائی پادری اور راہب کرتے ہیں اپنی بیگانگی کا اعلان کیا ہے۔ اس امر کے بارے میں مزید تشریح سورہ حدید کی آیت ۲۷ "ورهبانية ابتدعوها" کے ذیل میں آئے گی اس کے بعد اس امر کی تاکید کے لیے کہتا ہے: سرحدوں اور حد بندیوں سے آگے نہ بڑھو کیونکہ خدا تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (ولا تعتدوا ان الله لا یحب المعتدین)۔

بعد والی آیت میں نئے سرے سے اس مطلب کی تاکید کرتا ہے البتہ فرق یہ ہے کہ گذشتہ آیت میں تحریم سے نہی کی گئی تھی اور اس آیت میں نعمات الٰہی سے جائز طور پر بہرہ ور ہونے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان چیزوں میں سے جو خداوند تعالیٰ نے تمہیں بطور روزی دی ہیں حلال و پاکیزہ چیزیں کھاؤ (وکلوا مما رزقکم الله حلالاً طیباً)۔

ان مواہب و نعمات سے بہرہ ور اور مستفید ہونے کی شرط یہ ہے کہ اعتدال، تقویٰ اور پرہیزگاری کو فراموش نہ کرو اسی لیے فرمایا:

(واتقوا الله الذی انتم به مؤمنون)

یعنی خدا پر تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس کے تمام احکام کا احترام کرو ان سے نفع بھی اٹھاؤ اور اعتدال و تقویٰ کو بھی ملحوظ نظر رکھو۔

اس جملے کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ حکم تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ مباحات وطیبات کو حرام قرار دینا تقویٰ کے عالی اور کامل درجے سے مناسبت نہیں رکھتا۔ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کسی طرف بھی حدِ اعتدال سے نہ نکلے۔

## قسموں کی دو قسمیں

قرآن بعد والی آیت میں ان قسموں کے بارے میں کہ جو حلال کی تحریم یا اور چیزوں کے متعلق کھائی جائیں مطالب کی وضاحت کرتے

---

[1] "حلال و طیب" کے معنی کے بارے میں پہلی جلد میں بسط سے بحث ہو چکی ہے۔

اگرچہ آیت کا ظاہری مفہوم مطلق ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام مختلف ذرائع سے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے استفادہ کرتا ہے اور ہمارے جیسے زمانے میں جبکہ غلام نہیں ہیں دیگر کفاروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تینوں چیزیں قیمت کے لحاظ سے بہت مختلف ہیں اور شاید یہ تفاوت اس بنا پر ہو کہ ہر شخص آزاد ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر سکے۔

لیکن چونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو ان میں سے کسی پر بھی قدرت نہ رکھتے ہوں لہٰذا اس حکم کے بعد فرماتا ہے: اور وہ لوگ جو ان میں سے کسی تک دسترس نہیں رکھتے انہیں تین دن کے روزے رکھنا چاہئیں (فمن لم یجد فصیام ثلاثة ایام)

اس بنا پر تین دن روزے رکھنا صرف ان لوگوں سے مربوط ہے جو ان اوپر والے تین امور میں سے کسی کی بھی انجام دہی کی قدرت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد تاکید کے طور پر قرآن کہتا ہے: تمہاری قسموں کا کفارہ یہ ہے جو بیان کیا گیا ہے (ذٰلک کفارة ایمانکم اذا حلفتم)۔

لیکن اس بنا پر کہ کوئی شخص یہ تصور نہ کرے کہ کفارہ دینے سے صحیح قسم کا توڑنا حرام نہیں ہے کہتا ہے: اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو (واحفظوا ایمانکم) دوسرے لفظوں میں قسم پر عمل کرنا شرعاً واجب ہے اور اس کا توڑنا حرام ہے۔ لیکن اگر توڑا ہے تو اس کا کفارہ دینا پڑے گا قرآن آیت کے آخر میں فرماتا ہے: اس طرح خدا تمہارے لیے اپنی آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو اور ان احکام کے بارے میں کہ جو فرد و اجتماع کی سعادت و سلامتی کے ضامن ہیں اس کی حد و پاس کرو (کذٰلک یبین اللّٰہ لکم اٰیاتہ لعلکم تشکرون)۔

۹۰۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

۹۱۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ○

۹۲۔ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ○

## ترجمہ

۹۰۔ اے ایمان لانے والو! شراب، قمار بازی، بت اور ازلام (جو ایک قسم کی لاٹری تھی) پلید اور عمل شیطان ہیں، ان سے اجتناب

کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

۹۱۔ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور قمار بازی کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی ڈال دے اور تمہیں ذکر خدا اور نماز سے باز رکھے تو کیا تم (ان تمام نقصانات اور اس تاکیدی نہی کے بعد) اس سے رکو گے ؟

۹۲۔ اور خدا و پیغمبر کی اطاعت کرو اور (اس کے فرمان کی مخالفت سے) ڈرو اور اگر تم روگردانی کرو گے تو (سزا کے مستحق ہو گے اور) جان لو کہ پیغمبر کے ذمہ واضح ابلاغ کے سوا اور کچھ نہیں ہے (اور اس نے یہ فریضہ تمہارے سامنے انجام دے دیا ہے)۔

## شان نزول

پہلی آیت کے بارے میں شیعہ و سنی تفاسیر میں مختلف شان نزول ذکر ہوئی ہیں، جو تقریباً ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ منجملہ ان کے تفسیر در منثور میں سعد بن ابی وقاص سے اس طرح منقول ہے: وہ کہتا ہے یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی۔ انصار میں سے ایک شخص نے کھانا تیار کیا ہوا تھا اور اس نے ہمیں دعوت دی اور چند افراد نے اس کی مجلس مہمانی میں شرکت کی اور کھانا کھانے کے علاوہ انہوں نے شراب بھی پی اور یہ اسلام میں شراب کی حرمت سے پہلے کا واقعہ ہے اور جب ان کے دماغ شراب سے گرم ہوئے تو انہوں نے اپنے افتخارات بیان کرنا شروع کر دیئے۔ آہستہ آہستہ معاملہ بڑھتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان میں سے ایک نے اونٹ کی ہڈی اٹھا کر میری ناک پر مار دی اور اسے چیر دیا۔ میں پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ ماجرا عرض کیا تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مسند احمد، سنن ابی داؤد، نسائی، اور ترمذی سے اس طرح منقول ہے: حضرت عمر (جو تفسیر فی ظلال جلد سوم ص ۴۴ کے مطابق شراب کے بڑے رسیا تھے) دعا کرتے اور کہتے تھے خدایا کوئی واضح بیان شراب کے بارے میں ہم پر نازل فرما۔ جب سورۂ بقرہ کی آیت (و یسئلونک عن الخمر والمیسر) ۲۱۹ نازل ہوئی تو پیغمبر نے ان کے سامنے اس آیت کی تلاوت فرمائی لیکن وہ پھر بھی یہی دعا کرتے رہے اور کہتے رہے کہ خدایا اس بارے میں کوئی واضح تر بیان ہم پر نازل فرما یہاں تک کہ سورۂ نساء کی آیت ۴۳ نازل ہوئی جو یہ ہے:

یاایھا الذین اٰمنوا لا تقربوا الصلوٰة وانتم سکاری

پیغمبر نے وہ بھی ان کے سامنے پڑھی۔ انہوں نے پھر بھی اپنی اسی دعا کو جاری رکھا یہاں تک کہ سورۂ مائدہ کی (آیہ زیر بحث) کہ جس میں اس موضوع پر ایک غیر معمولی صراحت موجود تھی نازل ہوئی۔ جب پیغمبر اکرمؐ نے یہ آیت حضرت عمر کے سامنے پڑھی تو انہوں نے کہا

انتھینا انتھینا

"ہم اب شراب پینے سے رک گئے۔ اب ہم شراب خواری سے رک گئے" [1]

---

[1] تفسیر المنار جلد ۷ صفحہ ۵۰۔

# تفسیر

## شراب کے بارے میں قطعی حکم اور اس کے تدریجی مراحل

جیسا کہ ہم نے اس تفسیر کی جلد دوم میں سورۂ نساء کی آیہ ۴۳ کے ذیل میں اشارہ کیا ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں شراب خواری اور مے نوشی کا بہت زیادہ رواج تھا اور یہ ایک عمومی وبا کی صورت اختیار کر گئی تھی یہاں تک کہ بعض مورخین کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے عشق کا خلاصہ تین چیزیں تھیں شعر، شراب اور جنگ!

روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شراب کے حرام ہونے کے بعد تک بھی بعض مسلمانوں کے لیے اس کی ممانعت کا مسئلہ حد سے زیادہ سخت اور مشکل تھا۔ یہاں تک کہ وہ یہ کہتے تھے کہ "ما حرم علینا شیء اشد من الخمر"

شراب کے حرام ہونے سے زیادہ اور کوئی حکم ہم پر سخت تر نہیں تھا[1]

یہ بات واضح ہے کہ اگر اسلام چاہتا کہ اس عظیم عمومی وبا کے خلاف نفسیات اور معاشرے کے اجتماعی اصول کو مدنظر رکھے بغیر برسرِ پیکار ہو جائے تو کامیابی ممکن نہ تھی لہٰذا اس نے مے نوشی کی بیخ کنی کے لیے تدریجی طریقہ اختیار کیا۔ پہلے ان کے اذہان و افکار کو آمادہ کیا گیا پھر حرمت کا حکم نافذ کیا گیا۔ کیونکہ مے نوشی کی عادت ان کی ایک فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی پہلے کی سورتوں میں بعض آیات میں اس کام کی بُرائی کی طرف کچھ اشارے کیے گئے۔ جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت ۶۷ میں ہے:

"ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منه سکرًا ورزقًا حسنًا"

تم انگور اور کھجور کے درخت کے پھلوں سے مسکرات (نشہ آور چیزیں) اور پاکیزہ روزی فراہم کرتے ہو۔

اس مقام پر لفظ "مسکر" یعنی سکر اور اس شراب کو جو وہ انگور اور خرما سے حاصل کرتے تھے رزقِ حسن کے مدمقابل بیان کیا گیا ہے اور اُسے ایک ناپاک اور آلودہ مشروب شمار کیا گیا ہے۔

لیکن شراب خواری کی بُری عادت نے اس سے کہیں زیادہ جڑیں پکڑی ہوئی تھیں کہ اس کی ان اشاروں سے بیخ کنی ہو جائے۔ اس کے علاوہ شراب اُن کی اقتصادی درآمدات کے ایک حصّہ کی ضامن بھی تھی لہٰذا جب مسلمان مدینے میں منتقل ہو گئے اور پہلی اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی تو شراب خواری کی ممانعت کے بارے میں دوسرا حکم قاطع تر صورت میں نازل ہوا تاکہ افکار کو (شراب کی) حرمت کے انتہائی حکم کے لیے اور زیادہ آمادہ کیا جا سکے۔ یہ موقع تھا جبکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۹ نازل ہوئی:

"یسئلونك عن الخمر والمیسر قل فیهما اثم کبیر و منافع للناس و اثمهما اکبر من نفعهما"

اس آیت میں بعض معاشروں مثلاً دورِ جاہلیت کے لیے شراب کے اقتصادی منافع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے خطرات

---

[1] المنار جلد ۷، صفحہ ۵۱۔

پہلی مرتبہ بیان ہوئے ہیں۔ لیکن زیادہ اہم حصہ ان احکام کی توضیح و تاکید کے طور پر بھی بیان ہوا ہے جو قرآن کی دیگر آیات میں پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورہ پیغمبرؐ کی عمر کے آخر میں نازل ہوئی ہے لہٰذا ضروری تھا کہ اس میں مختلف اسلامی احکام کے بارے میں زیادہ تاکید کی جائے۔ پہلی آیت میں بعض مسلمانوں کی طرف سے کچھ نعمات الٰہی کی تحریم کی طرف اشارہ ہوا ہے اور انہیں اس کام کی تکرار سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے ایمان لانے والو! طیبات اور ایسے پاکیزہ امور جنہیں خدا نے تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے اپنے اوپر حرام نہ کرو۔

(یا یھا الذین اٰمنوا لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم[1])۔

اس حکم کا تذکرہ شان نزول کے مفہوم کے علاوہ ممکن ہے اس بارے میں بھی ہو کہ اگر گزشتہ آیات میں کچھ عیسائی علماء اور رہبانوں کی مدح و ستائش کی گئی ہے تو وہ ان کے حق کی طرف مائل ہونے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی وجہ سے تھی نہ کہ ان کے ترک دنیا کے عمل اور تحریم طیبات کی خاطر تھی اور مسلمان اس بارے میں ان کی پیروی کر سکتے۔ یہ حکم بیان کرکے اسلام نے صراحت کے ساتھ رہبانیت اور ترکِ دنیا سے جیسے عیسائی پادری اور راہب کرتے ہیں اپنی بیگانگی کا اعلان کیا ہے۔ اس امر کے بارے میں مزید تشریح سورہ حدید کی آیت ۲۷ "و رھبانیۃ ابتدعوھا" کے ذیل میں آئے گی اس کے بعد اس امر کی تاکید کے لیے کہتا ہے: سرحدوں اور حد بندیوں سے آگے نہ بڑھو کیونکہ خدا تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین)۔

بعد والی آیت میں نئے سرے سے اس مطلب کی تاکید کرتا ہے البتہ فرق یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں تحریم سے نہی کی گئی تھی اور اس آیت میں نعمات الٰہی سے جائز طور پر بہرہ ور ہونے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان چیزوں میں سے جو خداوند تعالیٰ نے تمہیں بطور رزق دی ہیں حلال و پاکیزہ چیزیں کھاؤ (وکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیبًا)۔

ان مواہب و نعمات سے بہرہ ور اور مستفید ہونے کی شرط یہ ہے کہ اعتدال، تقویٰ اور پرہیزگاری کو فراموش نہ کرو اسی لیے فرمایا:

(واتقوا اللہ الذی انتم بہ مؤمنون)

یعنی خدا پر تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس کے تمام احکام کا احترام کرو ان سے نفع بھی اٹھاؤ اور اعتدال و تقویٰ کو بھی ملحوظ نظر رکھو۔

اس جملے کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ حکم تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ مباحات و طیبات کو حرام قرار دینا تقویٰ کے عالی اور کامل درجے سے مناسبت نہیں رکھتا۔ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کسی طرف بھی حدِ اعتدال سے نہ نکلے۔

## قسموں کی دو قسمیں

قرآن بعد والی آیت میں اُن قسموں کے بارے میں کہ جو حلال کی تحریم یا اور چیزوں کے متعلق کھائی جاتی ہیں بطور کلی بحث کرتے

---

[1] "حلال و طیب" کے معنی کے بارے میں پہلی جلد میں بحث ہو چکی ہے۔

ہوئے قسموں کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، پہلے کہتا ہے، خداوند تعالیٰ تمہیں لغو اور فضول قسموں کے بارے میں نہ کوئی مواخذہ کرے گا اور نہ ہی سزا دے گا (لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم)۔

جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۵ کی تفسیر میں بھی لغو قسموں کے مقابلے میں سزا نہ ہونے کے بارے میں بحث ہوئی تھی تو وہاں ہم نے کہا تھا کہ لغو قسم سے مراد جیسا کہ مفسرین اور فقہا نے کہا ہے، وہ قسمیں ہیں کہ جن کا ہدف و مقصد مشخص و معین نہ ہو اور جو قصد اور ارادہ ہمم سے سرزد ہوئی ہوں۔ بلکہ بغیر توجہ کیے واللہ۔ باللہ۔ یا لا واللہ یا بلی و اللہ کہہ دیا ہو یا شدت ہیجان و غضب کے وقت بغیر قصد و ارادہ کے قسم کھائی جائے۔

بعض کہتے ہیں کہ اگر انسان کسی چیز کا یقین رکھتا ہو اور وہ اس کی بنیاد پر قسم کھائے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ اُسے اشتباہ ہوا ہے تو ایسی قسم بھی لغو قسموں میں ہی شمار ہوگی۔ مثلاً یہ کہ کوئی شخص چغل خور، افراد کی چغلی کی وجہ سے اپنی بیوی کی کجروی کا یقین کر لے اور وہ اس کو طلاق دینے کی قسم کھالے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ وہ بات جھوٹی تھی تو اس قسم کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حتی قسموں میں قصد و ارادہ و تصمیم کے لازم ہونے کے علاوہ یہ بات بھی ضروری ہے کہ قسم کا مضمون کوئی غیر مشروع اور مکروہ فعل بھی نہ ہو۔ لہٰذا اگر انسان حالت اختیار میں قصد و ارادہ سے قسم کھائے کہ کسی فعل حرام یا مکروہ کو انجام دے گا، ایسی قسم کی بھی کوئی قیمت نہیں ہے اور اس کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔

احتمال یہ ہے کہ زیر نظر آیت میں لفظ لغو کا ایک وسیع مفہوم ہے یہاں تک کہ اس طرح کی قسم بھی اس میں شامل ہے۔

دوسری قسم کی قسمیں وہ ہیں جو قصد و ارادہ اور عزم مصمم سے کھائی جائیں۔ اس قسم کی قسموں کے بارے میں قرآن زیر بحث آیت میں کہتا ہے، خدا تمہارا ایسی قسموں کے بارے میں کہ جن کی گرہ کو تم نے محکم کر رکھا ہے مواخذہ کرے گا اور تمہیں اس پر عمل کرنے کا پابند اور ذمہ دار ٹھہرائے گا۔

(ولکن یؤاخذکم بما عقدتم الایمان)

لفظ "عقد" جیسا کہ ہم سورہ مائدہ کی ابتدا میں کہہ چکے ہیں اصل میں ایک محکم چیز کے اطراف کو جمع کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی وجہ سے رسی کے دونوں سروں میں گرہ لگانے کو "عقد" کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ لفظ معنوی امور میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ہر قسم کے عہد و پیمان کو بھی عقد کہتے ہیں۔

زیر نظر آیت میں "عقد ایمان" یعنی قسمیں باندھنے سے مراد کسی کام کے کرنے کا عزم مصمم ہے جو قسم کے مطابق انجام دیا جاتا ہے۔ البتہ قسم کا حتمی ہونا اس کی درستی کے لیے اکیلا کافی نہیں ہے بلکہ جس طرح اُوپر اشارہ ہوا ہے کہ قسم کا مضمون کم از کم کوئی امر مباح ہونا چاہیے اور یہ بھی جاننا چاہیے کہ خدا کے نام کے بغیر قسم معتبر نہیں ہے۔ اسی بنا پر اگر کوئی شخص خدا کے نام کی قسم کھاتا ہے کہ وہ کوئی نیک عمل یا کم از کم کوئی مباح کام انجام دے گا تو واجب ہے کہ وہ اپنی قسم پر عمل کرے اور اگر اس نے قسم توڑ لی تو اس کا کفارہ دینا پڑے گا۔ قسم کا کفارہ وہی ہے جو محل بحث آیت کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

اس قسم کی قسم کا کفارہ تین چیزوں میں سے ایک چیز ہے۔

پہلی چیز ہے دس مسکینوں کو کھانا کھلانا (فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین)۔

البتہ اس بنا پر کہیں اس حکم سے بعض لوگ یا استفادہ نہ کریں کہ پست و بے قیمت غذا کفارے کے طور پر کھانے لگیں ، تصریح کی گئی ہے کہ یہ کھانا کم از کم ایک متوسط غذا ہونا چاہیے جو عام طور پر اپنے گھر میں کھاتے ہیں (من اوسط ما تطعمون اھلیکم)۔

البتہ اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کیفیت کے لحاظ سے حد متوسط مراد ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ کیفیت کی طرف بھی اشارہ ہو اور مقدار و کمیت کی طرف بھی۔ جیسا کہ ایک روایت میں امام صادقؑ سے حد وسط کیفیت کے لحاظ سے اور ایک روایت میں امام باقرؑ سے حد وسط کمیت کے لحاظ سے نقل ہوا ہے کہ جن کا خلاصہ دونوں لحاظ سے حد وسط بنتا ہے۔[1]

یہ بات بغیر کہے ظاہر ہے کہ حد وسط کا مسئلہ دونوں لحاظ سے شہروں، آبادیوں اور زمانوں کے اختلاف کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف ہوگا۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ اوسط اچھے اور عالی کے معنی میں ہے کیونکہ "اوسط" کا ایک معنی "عالی" بھی ہے جیسا کہ سورہ قلم کی آیت ۲۸ میں ہے:

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ

ان میں سے بہترین شخص نے یہ کہا کہ کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔

دوسری چیز ہے دس محتاج لوگوں کو لباس پہنانا (او کسوتھم) البتہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ایسا لباس ہونا چاہیے کہ جو عام طور پر ان کو ڈھانپ لے اسی لیے بعض روایات میں ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا کہ اس آیت میں (کسوہ) سے مراد دو قطعہ لباس (یعنی قمیص و شلوار) ہیں اور اگر ہم بعض روایات میں جیسے وہ روایت جو امام باقرؑ سے نقل ہوئی ہے یہ پڑھتے ہیں کہ ایک کپڑے پر بھی قناعت کی جا سکتی ہے تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عربی قسم کے بڑے قمیص اکیلے ہی سارے بدن کو ڈھانپ سکتے ہیں۔ البتہ عورتوں کے لیے ایک قمیص چاہے وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو کافی نہیں ہے بلکہ سر اور گردن کو ڈھانپنے کے لیے دوپٹہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ عورت کو کم از کم جتنے لباس کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ اس سے کم نہیں ہے۔ تو اس احتمال کے ہوتے ہوئے بعید نہیں ہے کہ وہ لباس کہ جو کفارہ کے طور پر دیا جاتا ہے اس میں فصول، مکان اور زمان کے لحاظ سے تفاوت ہو جائے۔

اس سلسلے میں کہ کیا کیفیت کے لحاظ سے کم از کم کافی ہے یا یہاں بھی حد وسط کو ملحوظ رکھا جائے۔ مفسرین میں دو نظریے پائے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ آیت کے اطلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ہر قسم کا لباس کافی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس شرط کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو کھانا کھلانے میں تھی یہاں بھی حد وسط کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ البتہ پہلا احتمال آیت کے اطلاق کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

تیسری چیز ہے ایک غلام کو آزاد کرنا (او تحریر رقبۃ)۔

اس سلسلے میں کہ جو غلام آزاد ہوگا کیا اسے مسلمان اور مومن ہونا چاہیے یا کسی بھی غلام کو آزاد کرنا کافی ہے، فقہا کے درمیان اختلاف ہے اور اس کی وضاحت کتب فقہ میں پڑھنا چاہیے۔

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۶۴۴ اور تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۴۹۶۔

[2] اس سلسلے میں ایک حدیث بھی امام باقرؑ یا امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہے۔ تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۴۹۶۔

اگرچہ آیت کا ظاہری مفہوم مطلق ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام مختلف ذرائع سے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے استفادہ کرتا ہے اور ہمارے جیسے زمانے میں جبکہ غلام نہیں ہیں دیگر کفاروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تینوں چیزیں قیمت کے لحاظ سے بہت مختلف ہیں اور شاید یہ تفاوت اس بنا پر ہو کہ ہر شخص آزاد ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر سکے۔

لیکن چونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو ان میں سے کسی پر بھی قدرت نہ رکھتے ہوں لہٰذا اس حکم کے بعد فرماتا ہے: اور وہ لوگ جو ان میں سے کسی تک دسترس نہیں رکھتے انہیں تین دن کے روزے رکھنا چاہئیں (فمن لم یجد فصیام ثلاثة ایام)

اس بنا پر تین دن روزے رکھنا صرف ان لوگوں سے مربوط ہے جو ان مذکورہ تین امور میں سے کسی کی بھی انجام دہی کی قدرت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد تاکید کے طور پر قرآن کہتا ہے: تمہاری قسموں کا کفارہ یہ ہے جو بیان کیا گیا ہے (ذٰلك كفارة ايمانكم اذا حلفتم)۔

لیکن اس بنا پر کہ کوئی شخص یہ تصور نہ کرے کہ کفارہ دینے سے صحیح قسم کا توڑنا حرام نہیں ہے کہتا ہے: اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو (واحفظوا ایمانکم) دوسرے لفظوں میں قسم پر عمل کرنا شرعاً واجب ہے اور اس کا توڑنا حرام ہے۔ لیکن اگر توڑا ہے تو اس کا کفارہ دینا پڑے گا قرآن آیت کے آخر میں فرماتا ہے: اس طرح خدا تمہارے لیے اپنی آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو اور ان احکام کے بارے میں کہ جو فرد و اجتماع کی سعادت و سلامتی کے ضامن ہیں اس کی نعمتوں کا پاس کرو (کذٰلك یبین الله لکم اٰیاته لعلکم تشکرون)۔

۹۰۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

۹۱۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ○

۹۲۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

## ترجمہ

۹۰۔ اے ایمان لانے والو شراب، قمار بازی، بت اور ازلام (جو ایک قسم کی لاٹری تھی) پلید اور عمل شیطان ہیں، ان سے اجتناب

کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

۹۱۔ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور قمار بازی کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی ڈال دے اور تمہیں ذکر خدا اور نماز سے باز رکھے تو کیا تم (ان تمام نقصانات اور اس تاکیدی نہی کے بعد) اس سے رکو گے؟

۹۲۔ اور خدا و پیغمبرؐ کی اطاعت کرو اور (اس کے فرمان کی مخالفت سے) ڈرو اور اگر تم روگردانی کرو گے تو (سزا کے مستحق ہو گے اور) جان لو کہ پیغمبرؐ کے ذمہ واضح ابلاغ کے سوا اور کچھ نہیں ہے (اور اس نے یہ فریضہ تمہارے سامنے انجام دے دیا ہے)

## شان نزول

پہلی آیت کے بارے میں شیعہ و سنی تفاسیر میں مختلف شان نزول ذکر ہوئی ہیں، جو تقریباً ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ منجملہ ان کے تفسیر درمنثور میں سعد بن ابی وقاص سے اس طرح منقول ہے: وہ کہتا ہے یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی۔ انصار میں سے ایک شخص نے کھانا تیار کیا ہوا تھا اور اس نے ہمیں دعوت دی اور چند افراد نے اس کی مجلس مہمانی میں شرکت کی اور کھانا کھانے کے علاوہ انہوں نے شراب بھی پی اور یہ اسلام میں شراب کی حرمت سے پہلے کا واقعہ ہے اور جب ان کے دماغ شراب سے گرم ہوئے تو انہوں نے اپنے افتخارات بیان کرنا شروع کر دیئے۔ آہستہ آہستہ معاملہ بڑھتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان میں سے ایک نے اونٹ کی ہڈی اٹھا کر میری ناک پر مار دی اور اسے چیر دیا۔ میں پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ ماجرا عرض کیا تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مسند احمد، سنن ابی داؤد، نسائی، اور ترمذی سے اس طرح منقول ہے: حضرت عمر (جو تفسیر فی ظلال جلد سوم ص ۴۲ کے مطابق شراب کے بڑے رسیا تھے) دعا کرتے اور کہتے تھے خدایا کوئی واضح بیان شراب کے بارے میں ہم پر نازل فرما۔ جب سورۂ بقرہ کی آیت (و یسئلونک عن الخمر والمیسر ۲۱۹) نازل ہوئی تو پیغمبرؐ نے ان کے سامنے اس آیت کی تلاوت فرمائی لیکن وہ پھر بھی یہی دعا کرتے رہے اور کہتے رہے کہ خدایا اس بارے میں کوئی واضح تر بیان ہم پر نازل فرما یہاں تک کہ سورۂ نساء کی آیت ۴۳ نازل ہوئی جو یہ ہے:

یاایھا الذین اٰمنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری

پیغمبرؐ نے وہ بھی ان کے سامنے پڑھی۔ انہوں نے پھر بھی اپنی اسی دعا کو جاری رکھا یہاں تک کہ سورۂ مائدہ کی (آیہ زیر بحث) کہ جس میں اس موضوع پر ایک غیر معمولی صراحت موجود تھی نازل ہوئی۔ جب پیغمبر اکرمؐ نے یہ آیت حضرت عمر کے سامنے پڑھی تو انہوں نے کہا

انتھینا انتھینا

"ہم اب شراب پینے سے رک گئے۔ اب ہم شراب خواری سے رک گئے"[1]

---

[1] تفسیر المنار جلد ۷ صفحہ ۵۰۔

# تفسیر

## شراب کے بارے میں قطعی حکم اور اس کے تدریجی مراحل

جیسا کہ ہم نے اس تفسیر کی جلد دوم میں سورہ نساء کی آیہ ۴۳ کے ذیل میں اشارہ کیا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں شراب خواری اور مے نوشی کا بہت زیادہ رواج تھا اور یہ ایک عمومی وبا کی صورت اختیار کر گئی تھی یہاں تک کہ بعض مورخین کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے عشق کا خلاصہ تین چیزیں تھیں شعر و شراب اور جنگ!

روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شراب کے حرام ہونے کے بعد تک بھی بعض مسلمانوں کے لیے اس کی ممانعت کا مسئلہ حد سے زیادہ سخت اور مشکل تھا۔ یہاں تک کہ وہ یہ کہتے تھے کہ "ما حرم علینا شئ اشد من الخمر"۔

شراب کے حرام ہونے سے زیادہ اور کوئی حکم ہم پر سخت تر نہیں تھا[1]

یہ بات واضح ہے کہ اگر اسلام چاہتا کہ اس عظیم عمومی وبا کے خلاف نفسیات اور معاشرے کے اجتماعی اصول کو مدنظر رکھے بغیر برسرِ پیکار ہو جائے تو کامیابی ممکن نہ تھی لہٰذا اس نے مے نوشی کی بیخ کنی کے لیے تدریجی طریقہ اختیار کیا۔ پہلے ان کے اذہان و افکار کو آمادہ کیا گیا پھر حرمت کا حکم نافذ کیا گیا۔ کیونکہ مے نوشی کی عادت ان کی ایک فطرت ثانیہ بن چکی تھی پہلے کی سورتوں میں بعض آیات میں اس کام کی برائی کی طرف کچھ اشارے کیے گئے۔ جیسا کہ سورہ نحل کی آیت ۶۷ میں ہے:

"ومن ثمرات النخیل و الاعناب تتخذون منہ سکرا و رزقا حسنا"

تم انگور اور کھجور کے درخت کے پھلوں سے سکرات (نشہ آور چیزیں) اور پاکیزہ روزی فراہم کرتے ہو۔

اس مقام پر لفظ "سکر" یعنی مسکر اور اس شراب کو جو وہ انگور اور خرما سے حاصل کرتے تھے رزقِ حسن کے مدمقابل بیان کیا گیا ہے اور اُسے ایک ناپاک اور آلودہ مشروب شمار کیا گیا ہے۔

لیکن شراب خواری کی بری عادت نے اس سے کہیں زیادہ جڑیں پکڑی ہوئی تھیں کہ اس کی ان اشاروں سے بیخ کنی ہو جائے۔ اس کے علاوہ شراب ان کی اقتصادی درآمدات کے ایک حصہ کی ضامن بھی تھی لہٰذا جب مسلمان مدینے میں منتقل ہو گئے اور پہلی اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی تو شراب خواری کی ممانعت کے بارے میں دوسرا حکم قاطع تر صورت میں نازل ہوا تاکہ افکار کو (شراب کی) حرمت کے انتہائی حکم کے لیے اور زیادہ آمادہ کیا جا سکے۔ یہ موقع تھا جبکہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۹ نازل ہوئی:

"یسئلونک عن الخمر و المیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس و اثمھما اکبر من نفعھما"

اس آیت میں بعض معاشروں مثلاً دورِ جاہلیت کے لیے شراب کے اقتصادی منافع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے خطرات

---

[1] المنار جلد ۷، صفحہ ۵۱۔

اور عظیم نقصانات کی جانب توجہ مبذول کروائی گئی ہے جو کہ اس کے اقتصادی منافع سے کئی درجے بڑھ کر ہیں۔

اس کے بعد سورۂ نساء کی آیہ ۴۳ ہے:

"یاایھا الذین اٰمنوا لا تقربوا الصّلٰوۃ وانتم سکاریٰ حتی تعلموا ما تقولون"

اس میں مسلمانوں کو صراحت سے حکم دیا گیا ہے کہ وہ مستی کی حالت میں ہرگز نماز نہ پڑھیں جب تک یہ نہ جانیں کہ وہ اپنے خدا سے کیا باتیں کر رہے ہیں۔

البتہ اس آیت کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ نماز کی حالت کے علاوہ شراب پینا جائز ہے بلکہ مقصد وہی تدریجی طور پر اس کی حرمت کا حکم نافذ کرنا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ آیت نماز کی حالت کے علاوہ دوسری حالتوں کے سلسلے میں خاموش ہے اور صراحت سے کچھ نہیں کہتی۔

مسلمانوں کی احکام اسلام سے شناسائی اور اس عظیم معاشرتی روگ کو جو ان کے وجود کی گہرائیوں میں اتر چکا تھا جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ان کی فکری آمادگی اس بات کا سبب بنی کہ آخری حکم مکمل صراحت اور قاطعیت سے نازل ہوا کہ جس کے بعد بہانہ سازی کرنے والے بھی اس پر اعتراض نہ کر سکیں اور وہ یہی زیر بحث آیت ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں مختلف تعبیرات کے ذریعے اس کام کی ممنوعیت پر تاکید کی گئی ہے:

۱۔ آیت "یاایھا الذین اٰمنوا" کے خطاب سے شروع ہوئی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس حکم کی مخالفت روح ایمان کے منافی ہے۔

۲۔ اس کے بعد لفظ "انما" جو استعمال ہوا ہے حصر و تاکید کے لیے ہے۔

۳۔ شراب اور قمار بازی کو انصاب[1] (وہ بت کہ جن کی کوئی مخصوص شکل و صورت نہیں تھی صرف پتھر کے ٹکڑے سے بنے ہوئے تھے) کے ساتھ ساتھ ذکر کرتے ہوئے اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ شراب اور قمار بازی کا خطرہ اس قدر زیادہ ہے کہ وہ بت پرستی کے ہم پلہ قرار پایا ہے۔ اسی بنا پر پیغمبر اکرمؐ سے ایک روایت میں ہے:

"شارب الخمر کعابد الوثن"

شراب خوار بت پرست کی مانند ہے[2]

۴۔ شراب، قمار بازی اور اسی طرح بت پرستی اور ازلام (جو ایک قسم کی لاٹری ہے[3]) یہ سب رجس و پلیدی کے طور پر شمار کیے گئے ہیں (انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس)۔

۵۔ یہ تمام اعمال شیطانی اعمال میں سے قرار دیے گئے ہیں (من عمل الشیطٰن)۔

۶۔ آخر کار ان سے اجتناب کرنے کے بارے میں قطعی حکم صادر کرتے ہوئے فرماتا ہے (فاجتنبوہ)۔

---

[1] انصاب و نصیب کے بارے میں ہم اس تفسیر کی جلد سوم میں بحث کر چکے ہیں۔

[2] حاشیہ تفسیر طبری جلد ہفتم صفحہ ۳۱۔ یہی حدیث تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۶۶۹ میں امام صادقؑ سے بھی منقول ہے۔

[3] "ازلام" کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد سوم میں بحث کر چکے ہیں (دیکھیے ص۳۹ اردو ترجمہ)۔

ضمنی طور پر توجہ ہے کہ اجتناب، نہی کی نسبت زیادہ رسا مفہوم رکھتا ہے کیونکہ اجتناب کا معنی فاصلہ پر رہنا، دوری اختیار کرنا اور نزدیک نہ جانا ہے جو کہ "نہ پیو" سے کہیں بہتر اور رسا تر ہے۔

۷ - اس آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے کہ یہ حکم اس بنا پر دیا گیا ہے تاکہ تم کامیابی اور فلاح حاصل کرو (لعلکم تفلحون) یعنی اس کے بغیر کامیابی اور نجات ممکن نہیں ہے۔

۸ - بعد والی آیت میں شراب اور قمار بازی کے بعض واضح نقصان ذکر کیے گئے ہیں۔ پہلے کہتا ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور قمار بازی کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت و دشمنی کی تخم ریزی کرے اور تمہیں نماز اور ذکر خدا سے باز رکھے (انما یرید الشیطٰن ان یوقع بینکم العداوة والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر الله وعن الصلوٰة)۔

۹ - اس آیت کے آخر میں استفہام تقریری کے طور پر کہتا ہے کیا تم اس سے بچو گے اور رک جاؤ گے (فھل انتم منتھون)۔ یعنی کیا ان تمام تاکیدوں کے باوجود بھی ان دو عظیم گناہوں کو ترک کرنے کے بارے میں کوئی بہانہ جوئی یا شک و تردد کی گنجائش رہ گئی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر تک بھی جو گذشتہ آیات کی تصریحات کو اس لگاؤ کی وجہ سے جو (بعض مفسرین کی تصریح کے مطابق) انہیں شراب سے تھا کافی نہیں سمجھتے تھے لیکن اس آیت کے نزول کے بعد کہنے لگے کہ یہ حکم کافی و وافی اور قناعت کنندہ ہے۔

۱۰ - تیسری آیت میں اس حکم کی تاکید کے طور پر پہلے تو مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ خدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کریں اور اس کی مخالفت سے پرہیز کریں۔

"واطیعوا الله واطیعوا الرسول واحذروا"

اس کے بعد مخالفین کو دھمکی دیتا ہے کہ اگر انہوں نے پروردگار کے فرمان کی اطاعت سے روگردانی کی تو کیفر کردار اور سزا کے مستحق ہوں گے اور پیغمبر کی ذمہ داری اور فریضہ سوائے واضح ابلاغ و تبلیغ کے اور کچھ نہیں ہے (فان تولیتم فاعلموا انما علی رسولنا البلٰغ المبین)۔

## شراب اور قمار بازی کے مہلک اثرات

تفسیر نمونہ کی دوسری جلد میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۱۹ کے ذیل میں ان دو اجتماعی اور معاشرتی بلاؤں کے سلسلے میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے لیکن یہاں بھی تاکید مطلب کے لیے قرآن مجید کی اقتدا کے طور پر ضروری ہے کہ کچھ اور نکات کا تذکرہ کیا جائے۔ یہ نکات ان مختلف اعداد و شمار کا مجموعہ ہیں جن میں علیحدہ علیحدہ ان نقصانات کی گہرائی اور وسعت ظاہر ہوتی ہے جن کا تعلق ان دونوں سے ہے۔

۱ - ان اعداد و شمار کے مطابق جو انگلستان میں الکحل کے جنون کے بارے میں شائع ہوتے ہیں کہ جن میں اس دیوانگی کا دوسری چیزوں سے ہونے والی دیوانگی اور جنون سے موازنہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۲۴۹ الکحل کے دیوانوں کے مقابلہ میں صرف ۵۳ دیوانے دوسرے اسباب کی وجہ سے ہوئے تھے[۱]

---

[۱] سپیپزیوم الکحل صفحہ ۶۵۔

۲ ۔ دوسرے اعداد و شمار میں جو امریکہ کے اسپتالوں سے ہاتھ لگے ہیں ان کے نفسیاتی مریضوں میں سے ۸۵ فیصد الکحل سے مریض تھے[1]

۳ ۔ ایک انگریز دانشور جس کا نام "بنتام" ہے لکھتا ہے: مشروبات الکحل شمالی ممالک میں انسان کو احمق و بے وقوف بناتے ہیں اور جنوبی ممالک میں دیوانہ بنا دیتے ہیں۔ پھر مزید کہتا ہے: دین اسلام نے تمام قسم کے مشروبات الکحل کو حرام قرار دیا ہے اور یہ اسلام کی خصوصیات میں سے ہے[2]

۴ ۔ جن لوگوں نے مستی اور نشہ کی حالت میں کوئی قتل یا کسی اور جرم کا ارتکاب کیا ہے اور گھروں کے گھر ویران کر دیئے اور خاندان کے خاندان تباہ کر دیئے ہیں اگر ان کے اعداد و شمار جمع کیے جائیں تو وہ ہوش ربا حد تک بہت زیادہ ہوں گے[3]

۵ ۔ فرانس میں ہر روز ۴۰ افراد اپنی جان الکحل کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں[4]

۶ ۔ ایک اور اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں ایک سال میں نفسیاتی بیماریوں سے تلف ہونے والی جانیں دوسری عالمی جنگ میں امریکیوں کی تلف ہونے والی جانوں سے دوگنی تھیں اور محققین کے نظریہ کے مطابق امریکہ میں نفسیاتی بیماریوں میں مشروبات الکحل اور سگرٹ نوشی کا بنیادی حصہ ہے[5]

۷ ۔ ان اعداد و شمار کے مطابق جو ایک دانشور ہوگر کے ذریعے مجلہ علوم کی بیسویں سالگرہ کی مناسبت سے شائع ہوئے تھے ۶۰ فیصد قتل عمد، ۵۰ فیصد مار پیٹ اور زخمی کرنے کے جرائم، ۳۰ فیصد اخلاقی جرائم (جن میں محارم سے زنا کے جرائم بھی شامل ہیں) اور ۹۰ فیصد چوری چکاری کے جرائم شراب اور مشروبات الکحل کے ساتھ مربوط تھے۔ اسی دانشور کے اعداد و شمار کے مطابق ۴۰ فیصد مجرم بچے الکحل کے سابقہ اثر کے حامل ہیں[6]

۸ ۔ اقتصادی نقطہ نظر سے صرف انگلستان میں وہ نقصانات جو کاریگروں کے کارخانوں سے مے نوشی کی وجہ سے غیر حاضر رہنے سے پیدا ہوتے ہیں سال میں ۵۰ ملین ڈالر (تقریباً اسی کروڑ روپے موجودہ حساب سے) ہیں۔ یہ وہ رقم ہے جو ہزاروں نرسری، پرائمری اور ہائی سکولوں کے اخراجات پورے کر سکتی ہے[7]

۹ ۔ ان اعداد و شمار کے مطابق جو مے نوشی کے نقصانات کے سلسلے میں فرانس میں شائع ہوئے ہیں، ۱۳۷ ارب فرانک سالانہ انفرادی نقصانات کے علاوہ حکومت فرانس کے مخارج میں الکحل سے مندرجہ ذیل تفاصیل کے مطابق نقصان ہوتا ہے:۔

---

[1] کتاب سمپوزیوم الکحل صفحہ ۶۵۔

[2] تفسیر طنطاوی جلد اول صفحہ ۱۶۵۔

[3] دائرۃ المعارف فرید وجدی جلد ۳ صفحہ ۷۹۰

[4] بلاهای اجتماعی قرن ما صفحہ ۲۰۵۔

[5] مجموعہ انتشارات نسل نو۔

[6] سمپوزیوم الکحل صفحہ ۶۶۔

[7] مجموعہ انتشارات نسل جوان سال دوم صفحہ ۲۳۰۔

۶۰ ارب فرانک عدالت اور قید خانے کے اخراجات۔
۴۰ ارب فرانک تعاون عمومی اور خیرات کے اخراجات۔
۱۰ ارب فرانک شراب خواری کے ہسپتالوں کے اخراجات۔
۷۰ ارب فرانک معاشرے کے امن و امان کو برقرار رکھنے کے اخراجات۔

تو اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ نفسیاتی بیماریوں، ہسپتالوں، قتلوں، خونیں فسادات، چوریوں، زیادتیوں اور حادثوں کی تعداد میخواروں کی تعداد کے ساتھ براہِ راست منسلک ہے۔[1]

۱۰۔ امریکہ میں اعداد و شمار کے سب سے بڑے مرکز نے ثابت کر دیا ہے کہ قمار بازی کا ۴۰ فیصد جرائم میں براہِ راست حصہ ہے۔

دوسرے اعداد و شمار کے مطابق جو قمار بازوں کے سلسلے میں شائع ہوئے ہیں، بڑے افسوس کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ ۳۰ فیصد جیب تراشی، ۵۰ فیصد جنسی جرائم، ۱۰ فیصد اخلاقی خرابیاں، ۲۰ فیصد طلاقیں، ۴۰ فیصد مار پٹائی اور زخمی کرنے کے واقعات اور ۵ فیصد خودکشیاں قمار بازی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔[2]

۹۳۔ لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ع

### ترجمہ

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں، پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رکیں اور جو فرمانِ الٰہی ہو اسے مانیں۔ پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

**شانِ نزول:** تفسیر مجمع البیان، تفسیر طبری، تفسیر قرطبی اور بعض دوسری تفاسیر میں اس طرح آیا ہے کہ شراب و قمار بازی کی حرمت کی آیت

---

[1] نشریہ مرکز مطالعہ پیش رفت ہائے ایران (الکحل اور قمار بازی کے بارے میں)
[2] نشریہ مرکز مطالعہ پیش رفت ہائے ایران (برائے الکحل و قمار بازی)

کے نزول کے بعد بعض اصحاب پیغمبرؐ نے کہا کہ اگر ان دونوں کاموں کے یہ سب گناہ ہیں تو پھر ہمارے اُن مسلمان بھائیوں کا کیا بنے گا جو اس آیت کے نزول سے پہلے مر چکے ہیں اور انہوں نے اس وقت تک ان دونوں کاموں کو ترک نہیں کیا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔

## تفسیر

اس آیت میں ان لوگوں کے بارے میں جواب دیتے ہوئے جو شراب اور قمار بازی کی حرمت کے نزول سے پہلے مر چکے تھے یا اُن لوگوں کے بارے میں کہ جن کے کانوں تک ابھی تک یہ حکم نہیں پہنچا تھا اور وہ دور دراز کے علاقوں میں زندگی بسر کر رہے تھے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو ایمان رکھتے تھے اور عمل صالح انجام دیتے تھے اور یہ حکم اُن تک نہیں پہنچا تھا، اگر انہوں نے شراب پی ہے یا قمار بازی کی کمائی سے کھاتے رہے تو اُن پر کوئی گناہ نہیں ہے (لیس علی الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت جناح فیما طعموا[1])۔

اس کے بعد اس حکم کو اس بات کے ساتھ مشروط کرتا ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لے آئیں اور عمل صالح بجا لائیں (اذا ما اتقوا و اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت)۔

پھر اس امر کی تکرار کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: پھر تقویٰ اختیار کرو اور ایمان لے آؤ (ثم اتقوا و اٰمنوا)۔

اس کے بعد تیسری مرتبہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی حکم کی تکرار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پھر تقویٰ اختیار کرو اور نیکی کرو (ثم اتقوا و احسنوا)۔

آیت کے آخر میں فرمایا: خدا نیک لوگوں کو دوست رکھتا ہے (واللّٰہ یحب المحسنین)۔

ان تین جملوں کی تکرار کے سلسلے میں قدیم و جدید مفسرین کے درمیان بہت زیادہ اختلاف ہے، بعض انہیں تاکید پر محمول کرتے ہیں کیونکہ تقویٰ، ایمان اور عمل صالح کے موضوعات کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں پختگی کے ساتھ بار بار بیان کیا جائے اور تاکید کی جائے۔

لیکن بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ ان تینوں جملوں میں سے ہر ایک میں ایک علیحدہ اور جداگانہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے ان کے اختلاف کے سلسلے میں کئی احتمال پیش کیے ہیں کہ جن میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ جن کی کوئی دلیل اور شاہد نہیں ہے۔

شاید اس سلسلے میں بہترین بات یہ ہے کہ پہلی مرتبہ ذکر ہونے والے "تقویٰ" سے مراد وہی اندرونی اور باطنی احساس ذمہ داری ہے جو انسان کو دین کے بارے میں تحقیق و جستجو کرنے، پیغمبر کے معجزہ میں غور و فکر کرنے اور حق کے بارے میں جستجو کرنے پر اُبھارتی ہے

---

[1] یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "طعام" زیادہ تر کھانے کی چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ پینے کی چیزوں کے لیے لیکن بعض اوقات پینے کی چیزوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً سورہ بقرہ کی آیہ ۲۴۹ میں ہے: فمن شرب منہ فلیس منی ومن لم یطعمہ فانہ منی۔

جس کا نتیجہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب تک تقویٰ کا ایک مرحلہ وجودِ انسانی میں پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک اُسے تحقیقِ حق کی جستجو کی فکر لاحق نہیں ہوتی۔ اس بنا پر پہلی مرتبہ اُوپر والی آیت میں تقویٰ کے بارے میں جو گفتگو ہوئی ہے وہ تقویٰ کے اسی مرحلہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ چیز آیت کی ابتداء کے اس حصّے کے منافی نہیں ہے: لیس علی الذین امنوا وعملوا الصّٰلحٰت کیونکہ ہوسکتا ہے کہ آیت کی ابتدا میں ایمان ظاہری تسلیم کے معنی میں ہو لیکن جو ایمان تقویٰ کے بعد پیدا ہوتا ہے وہ حقیقی ایمان ہے۔

دوسری دفعہ جو تقویٰ کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے وہ اُس تقویٰ کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے اندر اور باطن میں نفوذ کر جائے کہ جس کا اثر زیادہ گہرا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ ایمان مستقر و ثابت ہے، کہ عمل صالح جس کا ایک حصّہ اور جزء ہے۔ اسی لیے دوسرے مرحلے میں ایمان کے ذکر کے بعد عمل صالح کا تذکرہ نہیں ہے۔ بس اتنا فرمایا گیا ہے اتقوا و امنوا ...... یعنی یہ ایمان اس قدر نافذ و ثابت ہے کہ اس کے بعد عمل صالح کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

تیسری مرتبہ تقویٰ سے متعلق جو گفتگو ہے اس سے مراد وہ تقویٰ ہے جو اپنے بلند ترین مرحلے تک پہنچ جاتا ہے اس طور پر کہ اب اُسے حتیٰ فرائض کی انجام دہی کی دعوت کے علاوہ احسان یعنی نیک کاموں کی دعوت بھی دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اُن کاموں کے لیے بھی کہ جو واجبات میں داخل نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ تقویٰ کے بارے میں تین مرتبہ کا یہ تذکرہ احساسِ ذمہ داری اور پرہیزگاری کے ایک ایک مرحلہ کی طرف اشارہ ہے، "ابتدائی مرحلہ"، "درمیانہ مرحلہ" اور "آخری مرحلہ" اور ان میں سے ہر ایک خود آیت میں ایک قرینہ رکھتا ہے کہ جس کا سہارا لے کر مقصد کو معلوم کیا جاسکتا ہے، بخلاف ان احتمالات کے جو بعض مفسرین نے ان تینوں قسم کے تقویٰ اور ایمان کے فرق کے بارے میں پیش کیے ہیں کہ جن کے لیے کوئی قرینہ اور شاہد موجود نہیں ہے۔

۹۴۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُهٗٓ اَیْدِیْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○

۹۵۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْیًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِیْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ

لیے ایک طرح کا امتحان ہے۔

# تفسیر

## حالتِ احرام میں شکار کرنے کے احکام

یہ آیات عمرہ اور حج کے احکام میں سے ایک حکم یعنی حالت احرام میں صحرائی اور دریائی جانوروں کے شکار کا مسئلہ بیان کرتی ہیں۔ پہلے تو اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ جس کا "حدیبیہ" والے سال مسلمانوں کو سامنا کرنا پڑا تھا ارشاد ہوتا ہے: اے ایمان والو! خدا تمہیں شکار میں سے ایک چیز کے ساتھ آزمائے گا، ایسے شکار جو تمہارے اس قدر نزدیک ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ تم نیزہ اور ہاتھ کے ساتھ انہیں شکار کرسکتے ہو (یاایها الذین اٰمنوا لیبلونکم الله بشیءٍ من الصید تناله ایدیکم ورماحکم)۔

آیت کی تعبیر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ پیش بینی کے طور پر لوگوں کو ایک ایسے واقعہ سے جو انہیں پیش آنے والا تھا آگاہ کرے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام شکار کا وہاں کے لوگوں کے ہاتھوں کی پہنچ میں آجانا ایک ایسا امر تھا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور یہ مسلمانوں کے لیے ایک قسم کی آزمائش تھی خصوصاً یہ دیکھتے ہوئے جانوروں کے گوشت سے غذا مہیا کرنے کی انہیں ضرورت بھی تھی۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہ جانور وسوسہ انگیزی کی صورت میں خیموں کے اطراف میں اور ان کے گرداگرد آتے جاتے تھے، اس قسم کی میسّر غذا سے محروم رہنا، وہ بھی اس زمانے اور وقت میں اور ایسے لوگوں کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔

بعض نے کہا ہے کہ اس جملہ سے مراد کہ "تمہارے ہاتھ سے شکار کے قابل ہوں گے"، یہ ہے کہ وہ انہیں جال وغیرہ سے پکڑ سکتے تھے لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ حقیقتاً ان کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ خود ہاتھ سے انہیں پکڑ سکتے تھے۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر فرمایا ہے: یہ ماجرا اس لیے ہوا تھا کہ وہ لوگ جو ایمان بالغیب کی بنا پر خدا سے ڈرتے ہیں دوسرے لوگوں سے ممتاز ہو جائیں (لیعلم الله من یخافه بالغیب)۔

جیسا کہ ہم جلد اوّل میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۴۳ کے ذیل میں کہہ چکے ہیں کہ "لنعلم" "تاکہ ہم جان لیں یا" لیعلم "" تاکہ خدا جان لے" وغیرہ جیسی تعبیرات سے مراد یہ نہیں ہے کہ خدا کسی چیز کو جانتا نہیں اس لیے وہ چاہتا ہے کہ آزمائش اور امتحان وغیرہ کے ذریعہ سے جان لے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم چاہتے کہ اپنی واقعیتِ علمی کو عملی جامہ اور تحققِ خارجی کا لباس پہنائیں کیونکہ باطنی نیتیں اور لوگوں کی آمادگیاں، تکامل و ارتقا، اور جزا و سزا کے لیے اکیلی ہی کافی نہیں ہیں بلکہ انہیں خارجی افعال کی شکل میں ظہور پذیر ہونا چاہیے تاکہ وہ ان آثار کے حامل ہو سکیں (مزید وضاحت کے لیے مذکورہ آیہ کی تفسیر کی طرف رجوع کیجئے)۔

آیت کے آخر میں اُن اشخاص کو کہ جو اس خدائی حکم کی مخالفت کرتے ہیں دردناک عذاب کی تہدید کی گئی ہے (فمن اعتدٰی بعد ذٰلك فله عذاب الیم) اگرچہ آیت کا آخری جملہ اجمالی طور پر حالت احرام میں شکار کی حرمت پر دلالت کرتا ہے لیکن بعد والی

اللّٰہُ عَزِیۡزٌ ذُوانۡتِقَامٍ ○

۹۶۔ اُحِلَّ لَکُمۡ صَیۡدُ الۡبَحۡرِ وَطَعَامُہٗ مَتَاعًا لَّکُمۡ وَلِلسَّیَّارَۃِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَیۡکُمۡ صَیۡدُ الۡبَرِّ مَا دُمۡتُمۡ حُرُمًا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیۡۤ اِلَیۡہِ تُحۡشَرُوۡنَ ○

## ترجمہ

۹۴۔ اے ایمان والو! خدا تمہیں شکار کی اس مقدار کے ساتھ کہ (جو تمہارے قریب آجائیں اور) تمہارے ہاتھ اور نیزے اُن تک پہنچ جاتے ہیں، آزمائے گا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون شخص غیب پر ایمان رکھتے ہوئے خدا سے ڈرتا ہے اور جو شخص اس کے بعد تجاوز کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

۹۵۔ اے ایمان والو! حالت احرام میں شکار کو قتل نہ کرو اور جو شخص تم میں سے جان بوجھ کر اسے قتل کرے گا تو اسے چاہیے کہ اس کا معادل کفارہ چوپاؤں میں سے دے۔ ایسا کفارہ کہ جس کے معادل ہونے کی دو آدمی تصدیق کریں اور وہ قربانی کی شکل میں (حریم) کعبہ میں پہنچے یا (قربانی کے بجائے) مساکین وفقراء کو کھانا کھلائے یا اس کے معادل روزے رکھے تاکہ اپنے کام کی سزا کا مزہ چکھے جو کچھ گذشتہ زمانے میں ہو چکا ہے خدا نے وہ معاف کیا اور جو شخص تکرار کرے خدا اس سے انتقام لے گا اور خدا توانا اور صاحبِ انتقام ہے۔

۹۶۔ دریا کا شکار اور اس کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے تاکہ تم اور مسافرین اس سے فائدہ اٹھائیں لیکن جب تک تم حالت احرام میں ہو تو صحرا کا شکار تم پر حرام ہے اور خدا (کی نافرمانی) سے کہ جس کی طرف تم محشور ہو گے ڈرتے رہو۔

## شانِ نزول

جیسا کہ کتاب کافی اور بہت سی تفاسیر میں منقول ہے کہ جس وقت پیغمبر اسلامؐ اور مسلمان حدیبیہ والے سال عمرہ کے لیے احرام باندھ کر چل پڑے تو انہیں راستے میں بہت سے وحشی جانوروں کا اس طرح سے سامنا ہوا کہ اُن کے لیے آسان تھا کہ ہاتھ یا نیزے سے انہیں شکار کریں۔ یہ شکار اس قدر زیادہ تھے کہ بعض نے لکھا ہے کہ سواریوں کے دوش بدوش انہیوں کے نزدیک آتے جاتے تھے تو اُوپر والی آیات میں سے پہلی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو شکار کرنے سے ڈرایا اور انہیں اس خطرے سے آگاہ کیا کہ یہ امراج کے

آیت میں مزید صراحت اور قطعیت کے ساتھ اور بطورِ عموم حالتِ احرام میں شکار کے حرام ہونے کا حکم صادر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے اے ایمان لانے والو! حالتِ احرام میں شکار نہ کرو (یآیھا الذین اٰمنوا لا تقتلوا الصید و انتم حرم)۔

کیا شکار کی حرمت (جو بعد والی آیت کے قرینہ کے ساتھ صحرائی شکار ہے) صحرائی تمام اقسامِ شکار پر محیط ہے چاہے وہ حلال گوشت ہوں یا حرام گوشت یا حلال گوشت شکار سے مخصوص ہے۔

مفسرین اور فقہا کے درمیان اس سلسلے میں کوئی ایک نظریہ نہیں ہے۔

تاہم فقہا و مفسرینِ امامیہ میں مشہور یہ ہے کہ حکم عام ہے اور جو روایات اہلِ بیت علیہم السلام کے طریق سے وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہیں بعض فقہائے اہلِ سنت مثلاً ابو حنیفہ ہمارے ساتھ اس سلسلے میں متفق ہیں مگر دوسرے بعض مثلاً شافعی اسے حلال گوشت جانوروں کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں بہرحال یہ حکم گھریلو جانوروں کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ گھریلو جانوروں کو صید و شکار نہیں کہا جاتا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ہماری روایات میں نہ صرف یہ کہ حالتِ احرام میں شکار کرنا حرام ہے بلکہ اس میں مدد کرنا، اشارہ کرنا اور شکار کی نشاندہی کرنا بھی حالتِ احرام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ یہ تصور کریں کہ صید و شکار کا مفہوم حرام گوشت جانوروں پر محیط نہیں ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ جانوروں کا شکار مختلف مقاصد کے لیے انجام پاتا ہے۔ بعض اوقات مقصود ان کے گوشت سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے، بعض اوقات ان کی کھال سے نفع حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات ان کی مزاحمت کو دور کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ وہ مشہور شعر جو حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے وہ بھی عمومیت کا مشاہد بن سکتا ہے، آپ فرماتے ہیں:

صید الملوک ارانب و ثعالب • و اذا رکبت فصیدی الابطال

بادشاہوں کے شکار خرگوش اور لومڑیاں ہیں لیکن میرا شکار، جب میں میدانِ جنگ میں وارد ہوتا ہوں تو شجاع اور بہادر ہوتے ہیں۔

(مزید وضاحت کے لیے فقہی کتب کی طرف رجوع کیا جائے)۔

اس کے بعد حالتِ احرام میں شکار کرنے کے کفارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: جو شخص جان بوجھ کر شکار کو قتل کرے تو اُسے چاہیے کہ چوپاؤں میں سے اُن جیسے جانور کفارہ میں دے یعنی انہیں قربانی کرکے ان کا گوشت فقراء و مساکین کو دے (و من قتلہ منکم متعمدا فجزاء مثل ما قتل من النعم)۔

یہاں مثل سے مراد کیا ہے؟ کیا شکل و صورت اور مقدار میں ایک جیسا ہونا، اس معنی میں کہ مثلاً اگر کوئی شخص کسی بڑے وحشی جانور مثلاً شتر مرغ کو شکار کرتا ہے تو اُسے چاہیے کہ اس کا کفارہ اونٹ کی صورت میں دے، یا اگر ہرن کا شکار کرتا ہے تو کفارہ کے لیے بھیڑ بکری کی قربانی دے جو تقریباً اس جیسی ہے؛ یا یہ کہ مثل سے مراد قیمت میں ایک جیسا ہونا ہے؟

فقہا اور مفسرین میں پہلا معنی ہی مشہور ہے اور آیت کا ظاہری مفہوم بھی اسی کے مطابق ہے، کیونکہ حلال گوشت اور حرام گوشت کے حکمِ عمومی کو مدِنظر رکھتے ہوئے دیکھیں تو بہت سے جانور ایسے ہیں جن کی قیمت ثابت و مشخص نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ اُن جیسے گھریلو

جانوروں کا انتخاب کیا جاسکے اور اس کا مثل شکل وصورت اور مقدار کے مطابق ہی مل سکے ورنہ دوسری صورت میں تو اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں کہ کسی طرح سے اس شکار کی قیمت معین کی جائے اور اُس کا مثل قیمت کے لحاظ سے حلال گوشت گھریلو جانوروں میں سے انتخاب کریں۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات مثل کے معاملے میں کوئی شک وتردد پیدا ہو جائے لہٰذا قرآن نے حکم دیا ہے کہ یہ کام دو باخبر اور عادل افراد کے زیر نظر انجام پذیر ہو (یحکم بہ ذوا عدل منکم)۔

اس سلسلے میں کہ یہ قربانی کہاں ذبح ہو، حکم دیتا ہے کہ وہ قربانی اور "ھدی" کی صورت میں کعبہ کا ہدیہ بنایا جائے اور سرزمین کعبہ میں پہنچے (ھدیًا بالغ الکعبۃ)۔ ضمنی طور پر توجہ رہے کہ ہمارے فقہا کے درمیان مشہور ہے کہ احرام عمرہ کی حالت میں شکار کا کفارہ مکہ میں ذبح ہونا چاہیے اور احرام حج کی حالت میں منیٰ اور قربان گاہ میں اور یہ بات اُوپر والی آیت کے منافی نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیت احرام عمرہ کی حالت میں نازل ہوئی ہے، اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ ضروری نہیں کہ کفارہ قربانی کی صورت میں ہو بلکہ دو اور چیزوں میں سے بھی ہر ایک اُس کی جانشین ہو سکتی ہے۔ پہلا یہ کہ اُس کے برابر رقم مساکین کو کھانا کھلانے میں صرف کی جائے (او کفارۃ طعام مسٰکین) یا اُس کے مساوی روزے رکھے (او عدل ذٰلک صیامًا)۔

اگرچہ آیت میں اُن مساکین کی تعداد جنہیں کھانا کھلانا ہے بیان نہیں ہوئی اور نہ ہی روزوں کے دنوں کی تعداد بتائی گئی ہے لیکن ایک طرف سے ان دونوں کا ایک دوسرے سے ساتھ ہونا اور دوسری طرف یہ صراحت کہ روزوں کے درمیان موازنہ ضروری ہے، نشاندہی کرتا ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ جتنے مسکینوں کو وہ کھانا کھلانا چاہے کھلا دے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ قربانی کی قیمت کے برابر ہونا چاہیے۔ باقی رہا یہ کہ روزہ اور مسکین کو کھانا کھلانے کے درمیان تعادل وبرابری کس طرح قائم ہو، تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک "مد" طعام (یعنی تقریباً ۷۵۰ گرام گندم وغیرہ) کے مقابلہ میں ایک دن روزہ رکھے اور بعض روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر دو "مد" طعام کے مقابلہ میں ایک روزہ رکھے۔ یہ حقیقت میں اس بنا پر ہے کہ ماہ مبارک رمضان میں جو اشخاص روزہ پر قدرت نہیں رکھتے تو وہ ہر دن کے بدلے میں ایک یا دو مد کھانا مساکین کو کھلائیں (اس امر کے بارے میں مزید وضاحت فقہی کتب میں ملاحظہ فرمائیں)۔

اس بارے میں کہ وہ شخص جو حالت احرام میں شکار کا مرتکب ہوا ہے کیا وہ ان تین چیزوں میں سے جس کو چاہے کرلے یا اُسے ترتیب کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ پہلے تو اُسے قربانی کرنا چاہیے اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو مساکین کو کھانا کھلائے اور اگر یہ بھی میسر نہ ہو تو پھر روزہ رکھے۔ اس سلسلے میں مفسرین اور فقہا کے درمیان اختلاف ہے لیکن آیت کا ظاہر اختیار کا معنی دیتا ہے۔ یہ کفارے تو اس بنا پر ہیں کہ وہ اپنے غلط کام کی سزا اور انجام کو دیکھ لیں (لیذوق وبال امرہٖ [1])۔

اور اس بنا پر کہ عموماً کوئی حکم بھی گذشتہ امور کو شامل نہیں ہوتا صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا نے اُن غلط کاریوں کو جو اس سلسلے میں گذشتہ زمانے میں تم نے انجام دی ہیں معاف کر دیا ہے (عفا اللہ عما سلف)۔

---

[1] وبال جیسا کہ راغب نے مفردات میں لکھا ہے اصل میں "وبل" اور "وابل" سے سخت بارش کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد مشکل، شاق اور سخت کام پر بھی بولا جانے لگا اور چونکہ سزا وعذاب میں بھی شدت اور سختی ہوتی ہے لہٰذا اسے وبال کہتے ہیں۔

اور جو شخص ان بار بار کے اظہار کے خطر، اور کفارہ کے حکم کی پروا نہ کرے اور پھر بھی حالت احرام میں شکار کا مرتکب ہو تو خدا ایسے شخص سے انتقام لے گا، اور خدا توانا و صاحب قدرت ہے اور بر محل انتقام لیتا ہے (و من عاد فینتقم اللہ منہ واللہ عزیز ذوانتقام)۔

مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا شکار کا کفارہ دوبارہ شکار کرنے سے دوگنا ہوتا ہے یا نہیں؟ تو آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ تکرار کی صورت میں صرف انتقام الٰہی کی تہدید اور دھمکی ہی دی گئی ہے اور اگر کفارہ کا تکرار بھی ہوتا تو صرف انتقام الٰہی کے ذکر پر اکتفا نہ کی جاتی اور تکرار کفارہ کی تصریح بھی ہوتی۔ ان روایات میں جو اہلِ بیت علیہم السلام کے طریق سے ہم تک پہنچی ہیں یہی بات بیان کی گئی ہے۔

بعد والی آیت میں دریائی شکار کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے: (حالت احرام میں) دریائی شکار اور اسے کھانا تمہارے لیے حلال ہے (احل لکم صید البحر و طعامہ)۔

اس بارے میں کہ طعام اور کھانے سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مراد وہ مچھلیاں ہیں جو شکار کیے بغیر مر جاتی ہیں اور پانی کے اُوپر رہ جاتی ہیں، جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے کیونکہ مردہ مچھلی کا کھانا حرام ہے۔ اگرچہ اہلِ سنت کی بعض روایات میں ان کے حلال ہونے کی صراحت موجود ہے۔

آیت کے ظاہری مفہوم سے جو بات زیادہ سے زیادہ معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ طعام سے مراد وہی خوراک ہے کہ جو شکار شدہ مچھلیوں سے تیار کی جاتی ہے کیونکہ آیت دو امور کو جائز قرار دے رہی ہے پہلے شکار کرنا اور دوسرے شکار شدہ کھانا کھانا۔

ضمناً اس تعبیر سے اس معروف فتویٰ کے لیے بھی اجمالی طور پر استفادہ ہوتا ہے جو ہمارے فقہا کے درمیان موجود ہے اور جو بَرّی (صحرائی) جانوروں کے بارے میں ہے اور وہ یہ کہ نہ صرف انہیں شکار کرنے کا اقدام حرام ہے بلکہ شکار شدہ جانور کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں ہے۔

اس کے بعد اس حکم کے فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ اس بنا پر ہے کہ تم اور مسافر اس سے فائدہ اٹھا سکیں (متاعاً لکم و للسیارۃ)۔

یعنی اس غرض سے کہ تم حالت احرام میں کھانے کے لیے زحمت و مشقت میں نہ پڑو اور ایک قسم کے شکار سے فائدہ اٹھا سکو یہ اجازت تمہیں دریائی شکار کے بارے میں دی جاتی ہے۔

اور چونکہ عموماً اگر مسافر یہ چاہیں کہ شکار شدہ مچھلی اپنے ساتھ لے جائیں تو اس میں نمک ملا کر اسے "ماہی شور" کی صورت میں تیار کر لیتے ہیں۔ بعض مفسرین نے مندرجہ بالا جملے کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ مقیم افراد تازہ مچھلی سے اور مسافر نمک لگی مچھلی سے استفادہ کریں۔

ہم نے درج بالا آیت میں یہ پڑھا ہے کہ دریائی شکار تمہارے لیے حلال ہے۔ یہاں اشتباہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا مفہوم دریائی شکاروں کے بارے میں ایک عمومی حکم نہیں ہے، جیسا کہ بعض نے خیال کیا ہے۔ آیت یہاں پر دریائی شکاروں کا اصل حکم بیان کرنا نہیں چاہتی۔ بلکہ آیت کا مقصد و ہدف یہ ہے کہ وہ احرام باندھے ہوئے شخص کو اس بات کی اجازت دے کہ دریا کے وہ شکار جو احرام سے پہلے اس پر حلال تھے احرام کی حالت میں بھی وہ اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آیت یہاں اصل تشریع

قانون بیان نہیں کر رہی بلکہ اس کی نظر اُن قانونی خصوصیات کی طرف ہے جو پہلے سے تشریع ہو چکا ہے۔ اصطلاح میں یہ بیان حکم عمومی کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ آیت صرف محرم کے احکام بیان کر رہی ہے۔

مگر دوسری مرتبہ تاکید کے طور پر حکم سابق کی طرف لوٹتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب تک تم حالت احرام میں ہو صحرائی اور وحشی جانوروں کا شکار تم پر حرام ہے (وحرم علیکم صید البر ما دمتم حرمًا)۔

آیت کے آخر میں اُن تمام احکام کی تاکید کے لیے، جو ذکر ہو چکے ہیں فرماتا ہے: اس خدا سے ڈرو جس کی بارگاہ میں تمہیں قیامت کے دن محشور ہونا ہے (واتقوا اللہ الذی الیہ تحشرون)۔

## حالت احرام میں شکار کی حرمت کا فلسفہ

ہمیں معلوم ہے کہ حج و عمرہ ان عبادات میں سے ہے جو انسان کو عالم مادہ سے جدا کر کے ایک ایسے ماحول میں جو روحانیت و معنویت سے معمور ہیں مستغرق کر دیتی ہیں۔ مادی زندگی کے مظاہرات، جنگ و جدال، جھگڑے فساد، جنسی ہوس رانیاں اور مادی لذات حج و عمرہ کے مراسم میں کلی طور پر چھوڑنا پڑتی ہیں اور انسان ایک قسم کی شرعی الٰہی ریاضت میں مشغول ہو جاتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ حالت احرام میں حرمت شکار بھی اسی مقصد کے ماتحت ہے۔

علاوہ ازیں اگر خانۂ خدا کے زائر کے لیے شکار کرنا ایک مشروع اور جائز کام ہوتا تو اس آمد و رفت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ جو ہر سال اس مقدس سرزمین میں ہوتی ہے، اس علاقہ کے بہت سے جانوروں کی نسل کہ جو خشکی اور پانی کی کمی کی وجہ سے پہلے ہی کم ہے، ختم ہو جاتی لہٰذا یہ حکم اس علاقے کے جانوروں کی نسل کی بقا کے لیے ایک قسم کی حفاظت و ضمانت ہے۔

خصوصاً اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ حالت احرام کے علاوہ بھی حرم میں شکار اور اسی طرح اس کے درختوں اور گھاس پھونس کا اکھاڑنا ممنوع ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حکم زندگی کے ماحول کی حفاظت اور اس علاقے کے سبزہ زاروں اور جانوروں کو فنا و نابودی سے بچانے کے مسئلہ سے نزدیکی ربط رکھتا ہے۔

یہ حکم اس قدر دقیق تشریع ہوا ہے کہ نہ صرف جانوروں کا شکار کرنا بلکہ اس سلسلہ میں مدد کرنا، یہاں تک کہ شکاریوں کو شکار کی نشاندہی کرنا اور انہیں شکار کرنے کی راہ سے دینا بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اہل بیتؑ کے طریق سے وارد شدہ روایات میں ہے کہ امام صادقؑ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

"لا تستحلن شیئًا من الصید وانت حرام ولا وانت حلال فی الحرم ولا تدلن علیہ محلا ولا محرمًا فیصطادہ ولا تشر الیہ فیستحل من اجلک فان فیہ فداء لمن تعمدہ"

ہرگز شکار میں سے کسی چیز کو حالت احرام میں حلال شمار نہ کرنا اور اسی طرح حرم کا شکار غیر حالت احرام میں بھی حلال نہیں۔ محرم و غیر محرم کو شکار کی نشاندہی بھی نہ کرنا کہ وہ شکار کر لے، یہاں تک کہ اس کی طرف اشارہ بھی نہ کرنا (اور نہ اسے کوئی حکم نہ دینا) کہ وہ تیری وجہ سے شکار کو حلال سمجھے کیونکہ یہ کام اس شخص کا شمار ہوگا جس نے شکار کا حکم دیا ہے یا اشارہ کیا ہے اور کفارہ بھی اسی پر واجب ہوگا۔[1]

حاشیہ بر صفحہ ۲۳۶

۹۷۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

۹۸۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ؕ

۹۹۔ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ○

## ترجمہ

۹۷ - خدا نے کعبہ، بیت الحرام کو لوگوں کے کام کے لیے سامان مہیا کرنے کا ایک وسیلہ قرار دیا ہے اور اس طرح حرمت والا مہینہ اور بے نشان قربانیاں اور نشاندار قربانیاں، اس قسم کے (حساب شدہ اور دقیق) احکام اس لیے ہیں کہ تمہیں معلوم ہو کہ خدا جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، جانتا ہے۔

۹۸ - جان لو کہ خدا شدید سزا دینے والا ہے (اور اس کے باوجود) وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

۹۹ - پیغمبرؐ کی ذمہ داری ابلاغِ رسالت (اور احکام الٰہی پہنچانے) کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے (اور وہ تمہارے اعمال کا جواب دہ نہیں ہے) اور خدا جانتا ہے کہ تم کن چیزوں کو آشکار اور کن چیزوں کو مخفی رکھتے ہو۔

## تفسیر

گذشتہ آیات میں حالتِ احرام میں شکار کی حرمت کے بارے میں بحث تھی۔ اس آیت میں "مکہ" کی اہمیت اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترتیب میں اس کے اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلے فرماتا ہے: خدا نے بیت الحرام کو لوگوں کے امر کے قیام کا ذریعہ قرار دیا (جعل اللّٰہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس)۔

یہ مقدس گھر لوگوں کے اتحاد کی علامت، دلوں کے مجتمع ہونے کا ایک وسیلہ اور مختلف رشتوں اور گرہوں کے استحکام کے لیے ایک عظیم مرکز ہے۔ اس مقدس گھر اور اس کی مرکزیت و معنویت کے سائے میں کہ جو گہری تاریخی بنیادوں پر استوار ہے اور اپنی بہت سی بے سامانیوں کا سامان (اور بہت سی خرابیوں اور کمزوریوں کی اصلاح) کر سکتے ہیں اور اپنی سعادت کا محل اس کی بنیادوں

---

حاشیہ صفحہ سابقہ۔

۱؎ وسائل الشیعہ جلد ۵ صفحہ ۵۔

پر کھڑا کر سکتے ہیں۔ اسی لیے سورہ آلِ عمران میں خانہ کعبہ کو وہ پہلا گھر بتایا گیا ہے جو لوگوں کے فائدے کے لیے بنایا گیا ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ "قیاماً للناس" کے معنی کی وسعت کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمان اس گھر کی پناہ میں اور حج کے اصلاحی حکم کے سائے میں اپنے تمام معاملات کی اصلاح کر سکتے ہیں۔

چونکہ ضروری تھا کہ یہ مراسم جنگ، کشمکش اور نزاع سے ہٹ کر امن وامان کے ماحول میں صورت پذیر ہوں، حرام مہینوں (وہ مہینے کہ جن میں جنگ مطلقاً حرام ہے) کے اثر کی طرف اس موضوع میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے (والشھر الحرام)۔[2]

علاوہ ازیں اس نظر سے کہ بے نشان قربانیوں (ھدی) اور نشاندار قربانیوں (قلائد) کا وجود، کہ جو مراسم حج وعمرہ میں مشغول ہونے کے دنوں میں لوگوں کو غذا مہیا کرتا ہے اور ان کی سوچ کو اس جہت سے آسودہ خاطر کرتا ہے، اس پروگرام کی تکمیل میں مخصوص اثر رکھتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے (والھدی والقلائد)۔

اور چونکہ یہ تمام پروگرام، قوانین اور مقرر شدہ احکام شکار، اور اسی طرح حرم مکہ و ماہ حرام وغیرہ ایک قانون ساز کی وسعتِ علم اور تدبیر کی گہرائی کا پتہ دیتے ہیں لہٰذا آیت کے آخر میں اس طرح کہتا ہے کہ خدا نے یہ منظم پروگرام اس لیے مقرر کیے ہیں تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اس کا علم اس قدر وسیع ہے کہ جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب کو جانتا ہے، اور وہ تمام چیزوں سے خصوصاً اپنے بندوں کی روحانی اور جسمانی ضروریات سے باخبر ہے (ذٰلک لتعلموا ان اللہ یعلم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض و ان اللہ بکل شیء علیم)۔

ہم جو کچھ سطور بالا میں کہہ آئے ہیں اُسے مدنظر رکھتے ہوئے آیت کی ابتدا اور انتہا کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان گہرے تشریعی احکام کو وہی ذات منظم کر سکتی ہے جو قوانین تکوینی کی گہرائی سے آگاہ اور باخبر ہو۔ جب تک کوئی زمین و آسمان کے تمام جزئیات اور روح وجسم کے تخلیقی رموز سے آگاہ نہ ہو، وہ ایسے احکام کی پیش بینی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہی قانون درست اور اصلاح کنندہ ہو سکتا ہے جو قانونِ خلقت و فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

پھر بعد والی آیت میں گذشتہ احکام کی تاکید، لوگوں کو ان کے انجام دینے کی تشویق اور مخالفین اور نافرمانوں کی تہدید کے طور پر فرماتا ہے: جان لو کہ خدا شدید العقاب (ہونے کے ساتھ ساتھ) غفور رحیم بھی ہے (اعلموا ان اللہ شدید العقاب و ان اللہ غفور رحیم)۔

نیز یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں "شدید العقاب" کو "غفور رحیم" پر مقدم رکھا گیا ہے، تو شاید یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدائی سزا کو اس کی پوری شدت کے باوجود توبہ کے پانی سے دھویا جا سکتا ہے اور خدا کی مغفرت ورحمت شاملِ حال ہو سکتی ہے۔

پھر مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: اپنے اعمال کے جواب دہ خود تمہی ہو، اور پیغمبر کی ذمہ داری تبلیغِ رسالت اور احکامِ خدا

---

[1] آلِ عمران۔ ۹۶۔

[2] حرام مہینوں کے بارے میں جلد اول میں سورہ بقرہ کی آیہ ۱۹۴ کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے۔

تم تک پہنچانے کے سوا کچھ نہیں ( ما علی الرسول الا البلٰغ )۔
اس کے باوجود خدا تمہاری نیتوں سے اور تمہارے سب آشکار و پنہاں اعمال سے باخبر و آگاہ ہے ( و اللہ یعلم ما تبدون و ما تکتمون )۔

## کعبہ کی اہمیت

کعبہ جس کا ان آیات اور گذشتہ آیات میں دو مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اصل میں مادہ "کعب" سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے پاؤں کے اُوپر کی ابھری ہوئی جگہ، بعد ازاں یہ لفظ ہر قسم کی بلندی اور اُبھری ہوئی چیز کے لیے استعمال ہونے لگا اور "مکعب" کو بھی اسی لیے "مکعب" کہا جاتا ہے کہ وہ چاروں اطراف سے ابھرا ہوا ہوتا ہے۔ اُن عورتوں کو جن کے سینے تازہ تازہ ابھر رہے ہوتے ہیں "کاعب" کہا جاتا ہے جس کی جمع "کواعب" ہے اس کی بھی یہی وجہ ہے بہر حال یہ لفظ (کعبہ) خانہ خدا کی ظاہری بلندی کی طرف اشارہ بھی ہے اور اس کے مقام کی عزت و بلندی کی علامت بھی ہے۔
کعبہ ایک طویل اور پُر حوادث تاریخ کا حامل ہے یہ تمام حوادث بہر حال اس کی عظمت و اہمیت ہی کے باعث ظہور پذیر ہوئے ہیں۔
کعبہ کی اہمیت اس قدر ہے کہ روایات اسلامی میں اسے خراب و ویران کرنے کو پیغمبر اور امام کے قتل کرنے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ اس کی طرف دیکھنا عبادت اور اس کے گرد طواف کرنا بہترین اعمال میں سے ہے۔ یہاں تک کہ ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

لاینبغی لاحد ان یرفع بنائہ فوق الکعبۃ ؛

مناسب نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنا گھر کعبہ سے اُونچا بنائے۔[1]

لیکن اس طرف توجہ رکھنا چاہیے کہ کعبہ کی اہمیت اور احترام قطعاً اس کی عمارت کی وجہ سے نہیں ہے، کیونکہ نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ میں حضرت امیر المومنین کے ارشاد کے مطابق:

خدا نے اپنے گھر کو ایک خشک جلی ہوئی اور سخت پہاڑوں کے درمیان والی زمین میں قرار دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اسے بہت ہی سادہ مصالحہ سے بنایا جائے، عام اور معمولی پتھر سے۔[2]

لیکن چونکہ خانہ کعبہ ایک قدیم ترین اور بہت ہی سابق ترین توحید اور خدا پرستی کا مرکز ہے اور مختلف ملل و اقوام کی توجہ کی مرکزیت کا نقطہ ہے لہٰذا اسے درگاہ خداوندی سے ایسی اہمیت میسّر آئی ہے۔

۱۰۰۔ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۴۸۲۔
[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۲ خطبہ قاصعہ۔

اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ ع

## ترجمہ

۱۰۰۔ کہہ دو کہ پاک و ناپاک (کبھی) برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاکوں کی کثرت تجھے بھلی معلوم ہو، خدا (کی مخالفت) سے پرہیز کرو، اے صاحبان عقل وخرد! تاکہ تم فلاح ونجات حاصل کر سکو۔

## تفسیر

### اکثریت پاکیزگی کی دلیل نہیں

گزشتہ آیات میں مشروبات الکحل، قماربازی، انصاب وازلام اور حالت احرام میں شکار کرنے کی حرمت کے سلسلے میں گفتگو تھی، چونکہ ہو سکتا ہے بعض لوگ ایسے گناہوں کے ارتکاب کے لیے کچھ معاشروں اور علاقوں میں اکثریت کے عمل کو دستاویز قرار دیں اور اس بہانے سے کہ مثلاً فلاں شہر کی اکثریت شراب پیتی ہے یا قمار بازی کرتی ہے یا یہ کہ لوگوں کی اکثریت فلاں قسم کے حالات میں حرمت شکار وغیرہ کی پرواہ نہیں کرتی لہٰذا وہ ان احکام پر عمل درآمد سے روگردانی کریں اور انہیں طاق نسیاں کردیں تو اس بنا پر کہ یہاں وہ اس مقام پر اور اس قسم کے افراد سے دیگر مواقع میں کلی طور پر چھین لیا جائے، خدا ایک بنیادی کلیہ قاعدہ مختصر سی عبارت میں بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے پیغمبر! پاک وناپاک کبھی برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاک لوگوں کی زیادتی اور آلودہ لوگوں کی کثرت تجھے تعجب میں ڈال دے اور بھلی معلوم ہو (قل لایستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرة الخبیث)۔

اس بنا پر درج بالا آیت میں خبیث وطیب ہر قسم کے پاک وناپاک وجود کے معنی میں ہے چاہے وہ پاک وناپاک کھانے کی چیزیں ہوں یا پاک وناپاک افکار ونظریات ہوں۔

آیت کے آخر میں صاحبان فکر ونظر اور ارباب عقل وہوش کو مخاطب کرتے ہوئے تاکید کرتا ہے کہ خدا سے ڈرو تاکہ کامران وکامیاب ہو جاؤ (فاتقوا اللہ یا اولی الالباب لعلکم تفلحون)۔

لیکن یہ جو آیت میں ایک واضح چیز کی توضیح کی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کوئی یہ خیال کرے کہ کچھ عوارض مثلاً پلید وناپاک کے طرفداروں کی زیادتی جسے اصطلاح میں "اکثریت" کہتے ہیں اس چیز کی باعث بنے کہ ناپاک چیز پاک کی ہم پلہ قرار پا جائے۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات کچھ لوگ انبوہ کثیر اور اکثریت کے میلانات کے زیر اثر آ جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اگر اکثریت کسی مطلب کی طرف مائل ہو جائے تو یہ اس مطلب کے بے چون وچرا درست ہونے کی قطعی نشانی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ایسے مواقع بہت سے ہو گزرے ہیں جن میں معاشروں کی اکثریت واضح اشتباہات اور غلطیوں میں گرفتار ہوئی ہے اور مواقع اور حقیقت میں جو چیز اچھی چیز کی بری چیز سے (اور خبیث کی طیب سے) پہچان کے لیے لازمی ہے "وہ اکثریت کیفی" ہے نہ کہ "اکثریت کمی"، یعنی قوی تر، والاتر اور اعلیٰ ترین افکار اور توانا تر اور پاکترین نظریات کی ضرورت ہے، نہ کہ طرفداروں کی کثرت

یہ مسئلہ شاید اس زمانے کے بعض لوگوں کے ذوق کے مطابق نہ ہو کیونکہ تلقین و تبلیغ کے ذریعے بہت کوشش کی گئی ہے کہ لوگ اکثریت کے رجحانات و میلانات کو نیک و بد کے پرکھنے کی ترازو کے طور پر قبول کریں ۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے یہ باور کر لیا ہے کہ "حق" وہ چیز ہے جس کو اکثریت پسند کرتی ہو اور اچھی چیز وہ ہے جس کی طرف اکثریت مائل ہو ۔ حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے ۔ دنیا کے بہت سے مصائب و آلام اسی طرز فکر کی وجہ سے ہیں ۔ ہاں اگر اکثریت صحیح رہبری اور درست تعلیمات سے بہرہ مند ہو جائے اور اصطلاحی طور پر عام معنی کے لحاظ سے ایک رشید اکثریت ہو تو پھر ممکن ہے کہ اس کے میلانات نیک و بد کی پہچان کا مقیاس و میزان بن سکیں، نہ کہ وہ اکثریتیں جن کی رہنمائی نہیں ہوتی اور جو غیر رشید ہیں ۔

بہرحال قرآن محل بحث آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : کبھی تمہیں بروں اور ناپاک چیزوں کی زیادتی تعجب میں نہ ڈالے ۔ دیگر مقامات پر بھی متعدد مرتبہ فرمایا ہے :

"و لکن اکثر الناس لا یعلمون"

اکثر لوگوں کے کام علم و دانش کے ماتحت نہیں ہوتے ۔

ضمنی طور پر توجہ کرنا چاہیے کہ اگر آیت میں لفظ "خبیث"، "طیب" پر مقدم رکھا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ محل بحث آیت میں روئے سخن، ان لوگوں کی طرف ہے جو خبیث کی زیادتی کو اس کی اہمیت کی دلیل سمجھتے ہیں ۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انہیں جواب دیا جائے، اس لیے قرآن ان کے گوش گزار کرتا ہے کہ نیکی و بدی اور اچھائی و برائی کا معیار کسی بھی موقع پر کثرت و قلت اور اکثریت و اقلیت نہیں ہے، بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت "پاکی"، "ناپاکی" سے بہتر ہے اور صاحبانِ عقل و فکر کبھی کثرت سے دھوکا نہیں کھاتے ۔ وہ ہمیشہ پلیدی سے دوری اختیار کرتے ہیں اگرچہ ان کے ماحول کے تمام افراد آلودہ ہوں ۔ وہ پاکیزگیوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں اگرچہ ان کے معاشرے کے تمام افراد اس کے خلاف ہوں ۔

۱۰۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ○

۱۰۲۔ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ○

## ترجمہ

۱۰۱۔ اے ایمان والو! تم ایسے مسائل کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر وہ تمہارے سامنے واضح ہو جائیں تو تمہیں برے لگیں اور اگر قرآن کے نزول کے وقت ان کے متعلق سوال کرو تو وہ تمہارے لیے آشکار ہو جائیں گے، خدا نے تمہیں معاف کر دیا ہے (اور ان سے صرفِ نظر کر لیا ہے) اور خدا بخشنے والا اور حلیم ہے ۔

۱۰۲۔ تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں سے ایک گروہ نے ان چیزوں کے متعلق سوال کیا تھا اور پھر ان کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے تھے (ہو سکتا ہے کہ تم بھی ایسے ہی ہو جاؤ)۔

## شانِ نزول

اُوپر والی آیت کے شانِ نزول کے سلسلے میں کتبِ حدیث و تفسیر میں مختلف اقوال نظر آتے ہیں لیکن جو اُوپر والی آیات اور اُن کی تعبیرات کے ساتھ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے وہ، وہ شانِ نزول ہے جو تفسیر مجمع البیان میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے منقول ہے۔ اور وہ یہ ہے:

ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا اور حج کے بارے میں خدا کا حکم بیان کیا تو ایک شخص جس کا نام "عکاشہ" تھا (اور ایک روایت کے مطابق "سراقہ") نے کہا کیا یہ حکم ہر سال کے لیے ہے اور ہر سال ہمیں حج بجا لانا ہو گا پیغمبرؐ نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا، لیکن اس نے اصرار کیا اور دو مرتبہ یا تین مرتبہ اپنے سوال کا تکرار کیا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: وائے ہو تم پر، کیوں اس قدر اصرار کر رہے ہو، اگر تمہارے جواب میں میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال تم پر حج واجب ہو جائے گا اور اگر ہر سال واجب ہو گیا تو اس کی انجام دہی کی تم میں طاقت نہیں ہو گی اور اگر اس کی مخالفت کی تو گنہگار ہو گے، لہٰذا جب تک میں تم سے کوئی چیز بیان نہ کروں تم اس پر اصرار نہ کیا کرو کیونکہ (ایک چیز) اُن امور میں سے جو (بعض) گذشتہ اقوام کی ہلاکت کا سبب بنی یہ تھی کہ وہ ہٹ دھرمی کرتے تھے اور بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے تھے، اور اپنے پیغمبر سے زیادہ سوال کرتے تھے، اس بنا پر جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اپنی توانائی کے مطابق اُسے انجام دو۔

"اذا امرتکم من شیء فأتوا منه ما استطعتم"

اور جب میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں تو اجتناب کیا کرو، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں اس کام سے روکا گیا۔[1]

کہیں اس سے اشتباہ نہ ہو کہ اس شانِ نزول سے مراد — جیسا کہ ہم آیت کی تفسیر میں بیان کریں گے — یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے لیے راہ پرسش (سوال) اور مطالب علمی سمجھنا بند کر دیا جائے، کیونکہ قرآن تو خود اپنی آیات میں صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے اس کا اہلِ علم سے سوال کریں۔

"فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ"[2]

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر درمنثور" اور "المنار" میں محلِ بحث آیت کے ذیل میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ شانِ نزول نقل کی گئی ہے۔

[2] نحل — ۴۳

بلکہ اس سے مراد بے جا سوال، بہانہ سازیاں اور ہٹ دھرمیاں ہیں۔ یہ طریقہ کار زیادہ تر لوگوں کے ذہنوں کی خرابی، گفتگو کرنے والے کی مزاحمت اور اس کے سلسلۂ گفتگو اور پروگرام کی پراگندگی کا سبب بنتا ہے۔

# تفسیر

## غیر مناسب سوالات

اس میں شک نہیں کہ سوال کرنا حقائق کو سمجھنے کی کلید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کم پوچھتے ہیں کم جانتے ہیں۔ آیات و روایات اسلامی میں بھی مسلمانوں کو تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ وہ نہیں جانتے پوچھیں، لیکن چونکہ ہر قانون کا کوئی نہ کوئی استثنائی پہلو ہوتا ہے لہٰذا تعلیم و تربیت کی یہ بنیاد بھی استثناء سے خالی نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض اوقات کچھ مسائل کا مخفی رہنا اجتماعی نظام کی حفاظت اور لوگوں کی مصلحتوں کے پیش نظر بہتر ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر واقعیت اور حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھانے کے لیے جستجو کرنا اور پے در پے سوال کرنا نہ صرف یہ کہ فضیلت نہیں رکھتا، بلکہ مذموم و ناپسندیدہ بھی ہے۔ مثلاً زیادہ تر ڈاکٹر اسی میں مصلحت جانتے ہیں کہ سخت اور وحشت ناک بیماریوں کو بیمار سے مخفی رکھیں۔ بعض اوقات صرف ساتھ والے لوگوں کو اصل ماجرا کی خبر دیتے ہیں، اس شرط کے ساتھ کہ بیمار سے چھپائے رکھیں، کیونکہ تجربہ نشاندہی کرتا ہے کہ بہت سے لوگ اگر اپنی بیماری کے گہرے پہلو سے باخبر ہو جائیں تو وحشت و سرگردانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ وحشت انہیں مار نہ ڈالے تو کم از کم بیماری سے صحت یابی میں تاخیر کا سبب تو ضرور بن جاتی ہے۔

لہٰذا ایسے مواقع پر بیمار کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے ہمدرد طبیب کے سامنے سوال و اصرار کرنے لگے کیونکہ اس کا بار بار اصرار بعض اوقات طبیب پر یہاں تک اس طرح تنگ کر دیتا ہے کہ وہ اپنی آسودگی اور دوسرے بیماروں کی خبرگیری کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں دیکھتا کہ اس "ہٹ دھرم" بیمار کے لیے حقیقت واضح کر دے، اگرچہ اسے اس سے بہت نقصانات اٹھانا پڑیں۔

اسی طرح لوگ اپنے ساتھیوں کے بارے میں لاعلمی کی زندگی کے محتاج ہیں اور اس عظیم سرمایہ کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے حالات کی تمام تفصیلات سے باخبر نہ ہوں، کیونکہ تقریباً ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمزوری موجود ہوتی ہے اور تمام کمزوریوں کا فاش ہو جانا، لوگوں کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے میں مشکلات پیدا کرے گا۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ ایک فرد بہت موثر شخصیت کا مالک ہے، اتفاق سے کسی پست اور گھٹیا خاندان میں پیدا ہوا ہے اب اگر اس کا سابقہ حال فاش ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس کے وجود کی تاثیر معاشرے میں متزلزل ہو جائے۔ اس لیے اس قسم کے مواقع پر لوگوں کو کسی طرح بھی اصرار نہیں کرنا چاہیے اور کسی جستجو میں نہیں پڑنا چاہیے۔

یا یہ کہ معاملات اجتماعی کے بہت سے حصے ایسے ہوتے ہیں جنہیں ایک حد تک پوشیدہ رہنا چاہیے اور ان کے افشاء پر اصرار کرنا معاشرے کی کامیابی پر منفی طور پر اثر انداز ہوگا۔

یہ اور ان جیسے کئی ایک مواقع ایسے ہیں جن میں سوال کرنا ممنوع نہیں ہے اور رہبر اور قائدین کو جب تک وہ بہت زیادہ دباؤ اور فشار میں نہ ہوں ان کا جواب نہیں دینا چاہیے۔

قرآن زیرِ نظر آیت میں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ کہتا ہے: اے ایمان لانے والو! ایسے امور کے افشا کے متعلق سوال نہ کرو کہ جو موجب رنج و تکلیف ہوں (یا ایھا الذین اٰمنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبدلکم تسؤکم)۔

لیکن اس سبب سے کہ بعض افراد کی طرف سے پے در پے سوالات کا ہونا اور ان کا جواب نہ دینا ممکن ہے دوسروں کے لیے شک و شبہ کا باعث بن جائے اور بہت سے مفاسد پیدا کرنے تو مزید کہتا ہے: اگر ایسے مواقع پر زیادہ اصرار کرو گے تو آیاتِ قرآن کے ذریعے تمہارے لیے افشا ہو جائیں گے اور تم زحمت و تکلیف میں پڑ جاؤ گے (وان تسئلوا عنھا حین ینزل القراٰن تبد لکم)۔

یہ جو ان کے افشا کرنے کو نزولِ قرآن کے زمانے کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سوالات ایسے مسائل سے مربوط تھے جنہیں وحی کے ذریعے ہی واضح اور روشن ہونا تھا۔

مزید ارشاد ہوتا ہے: یہ خیال نہ کرو کہ اگر خدا کچھ مسائل بیان کرنے سے سکوت اختیار کرتا ہے تو وہ ان سے غافل تھا بلکہ وہ تمہارے لیے وسعت چاہتا ہے اور انہیں معاف کر دیا ہے اور خدا بخشنے والا علیم و بردبار ہے (عفا اللہ عنھا واللہ غفور حلیم)۔

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان اللہ افترض علیکم فرائض فلا تضیعوھا وحدلکم حدوداً فلا تعتدوھا ونھی عن اشیاء فلا تنتھکوھا وسکت لکم عن اشیاء ولم یدعھا نسیاناً فلا تتکلفوھا"

خدا نے کچھ واجبات تمہارے لیے مقرر کیے ہیں انہیں ضائع نہ کرو اور کچھ حدود تمہارے لیے نافذ کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں سے منع کیا ہے ان کی پردہ دری نہ کرو اور کچھ امور سے خاموش رہا ہے اور ان کے پوشیدہ رکھنے کو اس نے بہتر سمجھا ہے اور یہ پوشیدہ رکھنا نسیان اور بھول چوک کی وجہ سے ہرگز نہیں تھا ایسے امور کے افشاء اور ظاہر کرنے پر اصرار نہ کرنا[1]

## ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے کہا جائے کہ اگر ان امور کا افشا کرنا لوگوں کی مصلحت کے خلاف ہے تو پھر اصرار کی صورت میں اسے کیوں افشا کیا جاتا ہے؟

اس کی دلیل وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے کہ بعض اوقات اگر پے در پے سوالات کے مقابلے میں سکوت اور خاموشی اختیار کر لی جائے تو اس سے کئی دوسرے مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں، بدگمانیاں سر اٹھا لیتی ہیں، اور لوگوں کے اذہان خراب ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اگر طبیب بیمار کے پے در پے سوالات کے جواب میں سکوت اختیار کرے تو

---

[1] مجمع البیان، آیہ محل بحث کے ذیل میں۔

بعض اوقات ہو سکتا ہے یہ امر بیمار کو طبیب کے بارے میں بیماری کی اصل تشخیص کے سلسلے میں شک میں ڈال دے اور وہ یہ خیال کرے کہ اصولی طور پر اس کی بیماری کی شناخت نہیں ہو سکی۔ لہٰذا وہ طبیب کی ہدایات پر عمل نہ کرے تو اس صورت میں طبیب کے پاس بیماری کے انکشاف کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اگرچہ بیماراس طریقے سے کئی ایک مشکلات اور دشواریاں پیدا کرے گا۔

بعد والی آیت میں اس آیت کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: گذشتہ اقوام میں سے بھی بعض لوگ اسی قسم کے سوالات کیا کرتے تھے اور جب انہیں جواب دیا گیا تو مخالفت اور نافرمانی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے (قد سألہا قوم من قبلکم ثم اصبحوا بہا کٰفرین)۔

اس سلسلے میں کہ یہ اشارہ گذشتہ اقوام میں سے کس قوم سے مربوط ہے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا تو خیال ہے کہ اس کا تعلق حضرت عیسیٰؑ کے اپنے شاگردوں کے ذریعہ مائدۂ آسمانی کی درخواست سے مربوط ہے کہ جس کے صورت پذیر ہو جانے کے بعد بعض مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔

بعض نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس کا ربط حضرت صالحؑ سے معجزہ طلب کرنے کے ساتھ ہے لیکن ظاہراً یہ تمام احتمالات صحیح نہیں ہیں کیونکہ آیت ایسے سوال کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جس کا معنی "پوچھنا" اور کشفِ مجہول کرنا ہے نہ کہ وہ سوال جس کا معنی تقاضا کرنا اور کسی چیز کی درخواست کرنا ہے۔ گویا لفظ "سوال" کا دونوں معنی میں استعمال ہونا اس قسم کے اشتباہ کا سبب بنا ہے۔

البتہ ممکن ہے کہ جماعت بنی اسرائیل مراد ہو کہ جب وہ ایک جرم (قتل) کی تحقیق کے سلسلے میں ایک گائے کے ذبح کرنے پر مامور ہوئے تھے (جس کی توضیح جلد اول میں گذر چکی ہے) تو انہوں نے موسیٰ سے ڈھیروں سوال کیے اور گائے کی جزئیات کے بارے میں ایسے پے درپے سوالات کیے جن کے بارے میں کوئی خاص حکم انہیں نہیں دیا گیا تھا۔ اسی بناء پر انہوں نے کام اپنے اوپر اتنا سخت کر لیا تھا کہ ایسی گائے کا ہاتھ آنا اس قدر مشکل اور قیمتی ہو گیا کہ قریب تھا کہ اس سے صرف نظر کر لیں۔

"واصبحوا بہا کٰفرین" — اس جملے کے بارے میں دو احتمال پائے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ "کفر" سے مراد نافرمانی اور مخالفت ہو جیسا کہ اوپر اشارہ کر چکے ہیں اور دوسرا یہ کہ کفر اپنے مشہور معنی میں ہو، کیونکہ بعض اوقات ایسے تکلیف دہ جوابات سننا جو سننے والے کے ذہن پر بوجھ ہوں اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ وہ اصل موضوع اور کہنے والے کی صلاحیت کا ہی انکار کرنے پر آمادہ ہو جائے، مثلاً یہ کہ بعض اوقات طبیب کی طرف سے ایک تکلیف دہ جواب کا سننا اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ بیمار اپنی طرف سے مخالفت کا اظہار کرے اور اس کی صلاحیت کا ہی انکار کر دے اور اس تشخیص کو بڑھاپے کا نتیجہ قرار دے یا یہ کہے کہ طبیب مخبوط الحواس ہے۔

اس بحث کے آخر میں ہم یہ نکتہ پھر دہرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ زیر بحث آیات کسی صورت میں بھی منطقی، علمی، تہذیبی اور تربیتی سوالات کی راہ لوگوں پر بند نہیں کرتیں بلکہ یہ پابندی منحصر طور پر صرف بے جا اور نامناسب سوالات اور ایسے امور کے متعلق جستجو سے مربوط ہے جس کے پوچھنے کی نہ صرف یہ کہ ضرورت و احتیاج نہیں ہے بلکہ ان کا چھپا رہنا ہی بہتر بلکہ بعض اوقات تو لازمی اور ضروری ہوتا ہے۔

۱۰۳۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○

۱۰۴۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْــــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○

## ترجمہ

۱۰۳۔ خدا نے کوئی "بحیرہ"، "سائبہ"، "وصیلہ"، "حام" قرار نہیں دیا لیکن جو لوگ کافر ہو گئے انہوں نے خدا پر جھوٹ باندھا اور ان میں سے زیادہ تر سمجھتے نہیں ہیں۔

۱۰۴۔ اور جس وقت ان سے کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور پیغمبر کی طرف آؤ۔ تو وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے پایا ہے وہ ہمارے لیے کافی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کچھ نہیں جانتے تھے اور انہوں نے ہدایت حاصل نہیں کی تھی۔

## تفسیر

آیت میں پہلے تو چار غیر مناسب "بدعات"[۱] کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ جو زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں موجود تھیں کہ انہوں نے کچھ جانوروں کے بارے میں کسی جہت سے علامت اور نشانی مقرر کی تھی اور ان کا گوشت کھانا ممنوع قرار دے رکھا تھا یہاں تک کہ ان کا دودھ پینا، اون کاٹنا اور ان پر سواری کرنا جائز شمار نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات ان جانوروں کو آزاد چھوڑ دیتے تھے کہ جہاں جائیں چلے جائیں اور کوئی شخص ان سے متعرض نہ ہوتا۔ یعنی عملی طور پر اس جانور کو بیکار اور فضول چھوڑ دیتے تھے۔

---

[۱] چار قسم کے مخصوص جانوروں کی طرف اشارہ ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں ان سے استفادہ ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے اس بدعت کو ختم کر دیا۔

لہٰذا قرآن مجید کہتا ہے: خدا ان احکام میں سے کسی کو بھی قانونی طور پر قبول نہیں کرتا نہ اس نے بحیرہ قرار دیا نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام (ما جعل اللّٰہ من بحیرۃ ولا سائبۃ ولا وصیلۃ ولا حام)۔

باقی رہی ان چار قسم کے جانوروں کی تشریح اور وضاحت تو وہ یہ ہے:

۱۔ بحیرہ: اس جانور کو کہتے ہیں کہ جس نے پانچ مرتبہ بچہ جنا ہو کہ جن میں سے پانچواں بچہ مادہ یا ایک روایت کے مطابق نر ہو۔ ایسے جانور کے کان میں ایک وسیع سوراخ کر دیتے تھے اور اسے اس کے حال پر آزاد چھوڑ دیتے تھے اور اسے ذبح یا قتل نہیں کرتے تھے۔

"بحیرہ" بحر کے مادہ سے وسعت اور پھیلاؤ کے معنی میں ہے۔ عرب سمندر کو بحر اس کی وسعت کی بنا پر ہی کہتے ہیں اور بحیرہ کو جو اس نام سے پکارتے تھے تو یہ اس وسیع شگاف کی وجہ سے تھا جو اس کے کان میں وہ کر دیتے تھے۔

۲۔ سائبہ وہ اونٹنی جس نے بارہ یا ایک روایت کے مطابق دس بچے جنے ہوں اُسے آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ کوئی اس پر سوار نہیں ہوتا تھا اور وہ جس چراگاہ میں جاتی آزاد تھی اور جس گھاٹ اور چشمے سے چاہتی پانی پیتی۔ کوئی اس سے مزاحمت کا حق نہیں رکھتا تھا۔ کبھی کبھار صرف اس کا دودھ دوہ لیتے اور مہمان کو پلاتے (سائبہ سیب کے مادہ سے، پانی جاری ہونے، اور چلنے میں آزادی کے معنی میں ہے)۔

۳۔ وصیلہ اس گوسفند کو کہتے تھے جس نے سات دفعہ بچہ جنا ہو اور ایک روایت کے مطابق اس گوسفند کو کہتے تھے جو دو بچوں کو ایک ہی مرتبہ جنم دے (وصیلہ وصل کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے باہم پیوستگی) ایسے جانور کو قتل کرنا بھی حرام سمجھتے تھے۔

۴۔ حام "مادہ حمایت" کا اسم فاعل ہے، جو حمایت کرنے والے کے معنی میں ہے۔ حام اس نر جانور کو کہتے ہیں جس سے مادہ جانوروں کی تلقیح اور جفتی میں استفادہ کیا جاتا ہے۔ جب عرب دس مرتبہ اس جانور سے جفتی میں استفادہ کر لیتے اور ہر دفعہ اس کے نطفہ سے بچہ پیدا ہو جاتا تو کہتے کہ اس جانور نے اپنی پشت کی حمایت کی ہے یعنی اب کوئی شخص اس پر سوار ہونے کا حق نہیں رکھتا (ایک معنی اس کا "حمی" "نگہداری، رکاوٹ اور ممنوعیت بھی ہے)۔

اوپر والے چار عناوین کے معنی میں مفسرین کے درمیان اور احادیث کے اندر دوسرے احتمال بھی نظر آتے ہیں لیکن سب کی قدر مشترک یہ ہے کہ مراد ایسے جانور تھے جنہوں نے حقیقت میں اپنے مالکوں کی زیادہ بار بار نتیجہ بخش طور پر خدمت کی ہو۔ وہ بھی ان کی اس خدمت کے صلے میں ان جانوروں کے لیے ایک قسم کے احترام اور آزادی کے قائل ہو جاتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ ان تمام مواقع پر جانوروں کی خدمات کے بدلے میں شکر گزاری اور قدر دانی کی روح کار فرما نظر آتی ہے اور اس لحاظ سے ان کا عمل قابل احترام تھا چونکہ ان جانوروں کے بارے میں ان سے استفادہ نہ کرنا ایک ایسا احترام تھا جس کا کوئی مفہوم نہ تھا علاوہ ازیں ایک قسم کا مال کا اتلاف، نعمات الٰہی کا ضیاع اور انہیں معطل کرنا بھی شمار ہوتا تھا سب چیزوں کو چھوڑتے ہوئے یہ جانور اس احترام کی وجہ سے جانکاہ تکالیف اور مصائب میں گرفتار ہو جاتے تھے کیونکہ عملی طور پر بہت کم افراد اس کے لیے تیار ہوتے تھے کہ انہیں صحیح غذا مہیا کریں اور ان کی حفاظت اور نگہداری کریں اور اگر اس چیز کو مدنظر رکھا جائے کہ یہ جانور بہت زیادہ سن کے ہوتے تھے تو مزید اندازہ ہو گا کہ وہ تکلیف دہ حالت میں بے پناہ محرومیوں میں زندگی بسر

کرتے تھے یہاں تک کہ مرجاتے انہی وجوہ کی بناء پر اسلام نے سختی سے ان امور سے منع کیا۔

ان سب باتوں کو چھوڑتے ہوئے کئی ایک روایات اور تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ ان سب چیزوں کو یا ان میں سے بعض کو بتوں کے لیے انجام دیتے تھے اور درحقیقت انہیں بت کی نذر کرتے تھے۔ لہٰذا اس صورت میں اسلام کا اس کام سے مبارزہ بت پرستی سے مقابلہ بھی تھا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض روایات کے مطابق جب اُن میں سے بعض جانور طبعی موت مرجاتے تو بعض اوقات اُن کے گوشت سے گویا بطور تبرک وتیمن استفادہ کرتے جو بذاتِ خود ایک قبیح فعل تھا[1]

اس کے بعد فرماتا ہے: کافر لوگ اور بت پرست ان چیزوں کی خدا کی طرف نسبت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ قانونِ الٰہی ہے (ولکن الذین کفروا یفترون علی اللّٰہ الکذب) اُن میں سے اکثر اس بارے میں تھوڑا سا بھی غور و فکر نہیں کرتے تھے اور اپنی عقل کو کام میں نہیں لاتے تھے، بلکہ دوسروں کی اندھی تقلید کرتے تھے (واکثرھم لا یعقلون)۔

بعد والی آیت میں ان کی بے تکی اور غیر مناسب تحریکوں کی دلیل و منطق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: جب اُن سے یہ کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور پیغمبر کی طرف آؤ، تو وہ اس کام سے روگردانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے لیے تو ہمارے بڑوں کے رسم و رواج اور ان کے طور طریقے اور دستور کافی ہیں (و اذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللّٰہ و الی الرسول قالوا حسبنا ما وجدنا علیہ اٰباءنا)۔

حقیقت میں انکی غلط کاریاں اور بُت پرستیاں ایک دوسری قسم کی بت پرستی سے پیدا ہوتی تھیں۔ وہ اپنے بزرگوں اور بڈے بوڑھوں کے بے ہودہ رسم و رواج اور طور طریقوں کو بلا قید و شرط اختیار کرتے تھے۔ گویا وہ صرف "بڑوں" اور "آباؤ اجداد" سے نسبت کو اپنے عقیدہ اور عادات و رسوم کی صحت و درستی کے لیے کافی سمجھتے تھے۔

قرآن صراحت سے انہیں جواب دیتا ہے: کیا ایسا نہیں کہ اُن کے آباؤ اجداد صاحب علم و دانش نہیں تھے لہٰذا انہیں ہدایت حاصل نہیں ہوئی تھی (اولو کان اٰباءھم لا یعلمون شیئًا و لا یھتدون)۔

یعنی اگر تمہارے وہ بڑے بوڑھے اور بزرگ جن پر تم اپنے عقیدہ اور اعمال کے لیے تکیہ کیے ہوئے ہو، ارباب علم و دانش اور ہدایت یافتہ ہوتے تو تمہارا ان کی پیروی کرنا جاہل کا عالم کی تقلید کرنے کے زمرے میں شمار ہوتا، لیکن اس صورت میں جبکہ تم خود بھی جانتے ہو کہ وہ کوئی چیز تم سے زیادہ نہیں جانتے تھے بلکہ شاید تم سے بھی پیچھے تھے تو اس حالت میں تو تمہارا معاملہ جاہل کا جاہل کی تقلید کرنے کا واضح مصداق ہے، جو کہ عقل و خرد کے ترازو میں بہت ہی ناپسندیدہ فعل ہے۔

چونکہ اوپر والے جملے میں قرآن نے لفظ "اکثر" استعمال کیا ہے اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس جہالت و تاریکی کے ماحول میں بھی ایک سمجھدار اقلیت اگرچہ وہ کمزور تھی، موجود تھی، جو ایسے اعمال کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۶۸۴۔

## اپنے بزرگوں اور بڑوں کے نام کا بت

منجملہ اُن امور کے جو زمانہ جاہلیت میں بڑی شدت کے ساتھ رائج تھے ایک اپنے بزرگوں اور بڑوں پر فخر کرنا اور پرستش کی حد تک بلا قید و شرط ان کی شخصیات، افکار، عادات اور رسوم کا احترام کرنا تھا۔ قرآن نے بھی اس امر کا مختلف آیات میں ذکر کیا ہے۔ نیز یہ امر زمانہ جاہلیت سے مخصوص نہیں تھا بلکہ آج بھی بہت سی اقوام و ملل میں موجود ہے اور شاید یہ ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف خرافات اور بے ہودہ چیزیں پھیلنے اور منتقل ہونے کے اصلی عوامل میں سے ایک ہے۔ گویا "موت" گزرے ہوئے لوگوں کے لیے ایک قسم کی معنویت اور تقدس پیدا کر دیتی ہے اور انہیں احترام و تقویٰ کے حالے میں لے لیتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قدر دانی کی روح اور اصول انسانی کے احترام کا تقاضا یہی ہے کہ آباؤ اجداد اور اپنے بزرگوں کو محترم سمجھا جائے لیکن اس معنی میں نہیں کہ انہیں معصوم عن الخطاء جان لیا جائے اور ان کے افکار و آداب پر تنقید، تحقیق اور تجسس چھوڑ ہی دیا جائے اور ان کی بے ہودہ باتوں کی بھی اندھی پیروی اور تقلید اختیار کر لی جائے۔

یہ عمل حقیقت میں ایک قسم کی بت پرستی اور جاہلانہ منطق ہے، بلکہ ضروری یہ ہے کہ ان کے حقوق اور مفید افکار روشن کے احترام کے باوجود، ان کے غلط مراسم اور طور طریقوں کو سختی سے کچلا جائے۔ خاص طور پر جبکہ آئندہ نسلیں زمانہ گزرنے کے ساتھ علم و دانش کی ترقی اور زیادہ تجربات کی بنا پر عام طور سے گزشتہ نسلوں کی نسبت زیادہ دانا اور ہوشمند ہیں اور کوئی عقل و خرد گذشتہ لوگوں کی اندھی تقلید کی اجازت نہیں دیتی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض علماء یہاں تک کہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اس کمزور منطق سے کنارہ کش نہیں ہوئے اور بعض اوقات بڑے ہی حیرت انگیز طریقے سے مضحکہ خیز خرافات کو عملاً قبول کر لیتے ہیں مثلاً بعض اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں سال کے آخر میں آگ کے اوپر سے کودتے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طرح اپنے بڑوں کی آتش پرستی کو زندہ رکھ سکیں اور درحقیقت ان کی یہ منطق زمانۂ جاہلیت کے بدوؤں کی سی منطق کے سوا اور کچھ نہیں۔

## بے دلیل تضاد

تفسیر المیزان میں تفسیر درمنثور سے اہلِ سنت کے علماء کے ایک گروہ سے منقول ہے کہ ابوالاحوص نامی ایک شخص سے مروی ہے، وہ کہتا ہے:

> میں پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے پرانا اور بوسیدہ لباس پہن رکھا تھا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس مال و دولت ہے؟ میں نے کہا جی ہاں! پیغمبرؐ نے فرمایا: کس قسم کا مال ہے؟ میں نے کہا: ہر قسم کا مال میرے پاس موجود ہے! اونٹ، گوسفند، گھوڑے وغیرہ۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: جب خدا تجھے کوئی چیز دے تو ضروری ہے کہ اس کے آثار بھی تم میں دکھائی دیں، نہ یہ کہ اپنی ثروت کو ایک طرف رکھ دو اور خود پرانا

مسکینوں کی طرح زندگی بسر کرو)۔

اس کے بعد فرمایا: کیا تمہارے اونٹوں کے بچے پھٹے ہوئے کانوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں یا سالم کانوں کے ساتھ، میں نے کہا: یقیناً صحیح سالم کانوں کے ساتھ، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اونٹنی کٹے ہوئے کان والا بچہ جنے؛ تو آپ نے فرمایا: پھر تو لازماً خود تم ہی تلوار ہاتھ میں لے کر ان میں سے بعض کے کانوں کو چیرتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ "بحیرہ" ہے اور کچھ دوسروں کے کانوں کو کاٹ کر کہتے ہو کہ یہ "صرم" ہے۔ میں نے کہا: جی ہاں ایسا ہی کرتا ہوں فرمایا: ہرگز ایسا کام نہ کرو، جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے، وہ تیرے لیے حلال ہے، اس کے بعد آپ نے (اس آیت کی) تلاوت کی؛ (ما جعل من بحیرۃ ولا سائبۃ ولا وصیلۃ ولا حام) (المیزان جلد ۶ صفحہ ۱۶۷)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مال کے ایک حصے کو معطل اور بے مصرف چھوڑ دیتے تھے اور کنجوسی کر کے پھٹے پرانے کپڑے پہنتے۔ درحاصل یہ ایک بے دلیل تضاد تھا۔

۱۰۵۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

## ترجمہ

۱۰۵۔ اے ایمان والو! اپنے اوپر نظر رکھو، جب تمہیں ہدایت حاصل ہو جائے تو ان لوگوں کی گمراہی جو گمراہ ہو چکے ہیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی، تمام چیزوں کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور وہ تمہیں اس عمل سے جو تم کیا کرتے تھے آگاہ کرے گا۔

## تفسیر

### ہر شخص اپنے کام کا جواب دہ ہے

گزشتہ آیت میں زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی اپنے بڑوں کی اندھی تقلید کے متعلق گفتگو تھی۔ قرآن نے واضح طور پر انہیں ڈرایا کہ اس قسم کی تقلید عقل و منطق کی رو سے درست نہیں ہے۔ اس کے بعد فطری طور پر یہ سوال ان کے ذہن میں آتا تھا کہ اگر ہم ایسے مسائل میں اپنا معاملہ اپنے بزرگوں سے الگ کریں تو پھر ان کی سرگزشت کیا ہو گی، علاوہ ازیں اگر ہم اس قسم کی تقلید سے دست بردار ہو جائیں تو ایسی ہی تقلید کرنے والے دیگر بہت سوں کے بارے میں کیا صورت ہو گی۔ زیر نظر آیت اس قسم کے سوالات کے جواب میں کہتی ہے: اے ایمان لانے والو! تم اپنے ہی جوابدہ ہو، اگر تم ہدایت یافتہ ہو گئے تو دوسروں کی گمراہی چاہے وہ تمہارے اپنے بڑے ہوں یا ہم عصر دوست و احباب، تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچائے گی (یا ایھا الذین آمنوا علیکم انفسکم لا

یضرکم من ضل اذا اهتدیتم)۔ اس کے بعد قیامت، حساب کتاب اور ہر کسی کے اعمال کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تم سب نے خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور تم میں سے ہر ایک کا حساب الگ ہوگا اور جو کچھ تم نے انجام دیا اس سے تمہیں آگاہ کیا جائے گا (الی اللّٰه مرجعکم جمیعاً فینبئکم بما کنتم تعملون)۔

## ایک سوال کا جواب

اس آیت کے بارے میں بہت زیادہ آوازیں بلند ہوتی ہیں بعض نے یہ خیال کر لیا ہے کہ اس آیت کے درمیان اور "امر معروف" "ونہی از منکر" کے حکم کے درمیان کہ جو اسلام کا ایک قطعی اور مسلم حکم ہے ایک قسم کا تضاد پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ آیت کہتی ہے کہ تم اپنے حالات کی طرف توجہ کرو (اور اپنے ہی متعلق سوچ بچار کرو اور اپنی حالت میں مگن رہو) دوسروں کا انحراف اور کجروی تمہاری حالت پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔

اتفاقاً روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کا اشتباہ آیت کے نزول کے زمانے میں بھی بعض کم علم لوگوں میں پایا جاتا تھا۔

"جبیر ابن نفیل" کہتے ہیں:

میں چند اصحاب پیغمبر کے حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا اور میں اُن میں سب سے زیادہ کم سن تھا۔ انہوں نے امر معروف اور نہی از منکر کے متعلق گفتگو شروع کر دی، میں ان کی باتوں کے درمیان بول پڑا اور میں نے کہا کہ کیا خدا قرآن میں یہ نہیں کہتا ہو: یا ایها الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم) اس بنا پر امر معروف اور نہی از منکر کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ اچانک اُن سب نے مجھے سرزنش کی اور کہنے لگے، تم قرآن کی ایک آیت کو اس کا معنی سمجھے بغیر الگ کر رہے ہو۔ میں اپنی گفتگو سے بہت ہی شرمندہ ہوا اور انہوں نے اپنا مباحثہ جاری رکھا۔ جب وہ وہاں سے مجلس برخاست کر کے اُٹھنے لگے، تو میری طرف رُخ کر کے کہنے لگے، تو کم سن نوجوان ہے اور تو نے قرآن کی ایک آیت کو اس کا معنی سمجھے بغیر اُسے باقی سے الگ کر لیا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ تم ایسے زمانے کو پاؤ کہ تم یہ دیکھو کہ بخل لوگوں پر چھایا ہوا ہے، اور ان پر اس کی فرمانروائی ہے اور ہوس لوگوں کا پیشوا ہے اور ہر شخص صرف اپنی ہی رائے پسند کرتا ہے۔ ایسے زمانے میں تم صرف اپنا ہی خیر مناؤ، دوسروں کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی (یعنی آیت ایسے زمانے کے ساتھ مربوط ہے)۔

ہمارے زمانے کے بعض آرام پرست بھی جب دو عظیم خدائی فرائض امر معروف اور نہی از منکر کی انجام دہی کی گفتگو ہوتی ہے تو جوابدہی سے اپنے کندھوں کو خالی رکھنے کے لیے اس آیت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے معنی میں تحریف کرتے ہیں۔ حالانکہ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان دو احکام کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔

کیونکہ:

پہلی بات تو یہ ہے کہ محل بحث آیت کہتی ہے کہ ہر شخص کا حساب کتاب الگ الگ ہے اور دوسروں کی گمراہی مثلاً اپنے گزرے ہوئے بزرگوں یا غیروں کی گمراہی ہدایت یافتہ لوگوں کی ہدایت پر کوئی ضرب نہیں لگاتی، یہاں تک کہ اگر وہ بھائی بھائی بھی ہوں، یا باپ بیٹا ہوں لہٰذا تم ان لوگوں کی پیروی مت کرو اور خود اپنے آپ کو بچاؤ (غور کیجئے)۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ آیت اس موقع کی طرف اشارہ کرتی ہے جس وقت امر بمعروف اور نہی از منکر کارگر نہ ہوں یا ان کی تاثیر کے حالات موجود نہ ہوں۔ بعض اوقات کچھ لوگ ایسے موقع پر پریشان ہو جاتے ہیں، کہ ان حالات میں ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ تمہارے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے کیونکہ تم نے اپنے فرض کی انجام دہی کر دی ہے اور انہوں نے قبول نہیں کیا، یا ان میں قبول کرنے کی اہلیت اور اسباب موجود نہیں تھے، اس بنا پر کوئی نقصان تمہیں نہیں پہنچے گا۔

یہی مفہوم اس حدیث میں جو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں موجود ہے۔ اسی طرح بعض دوسری احادیث میں نقل ہوا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے اس آیت کے متعلق سوال ہوا تو آپؐ نے فرمایا:

"ایتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنکر فاذا رایت دنیا مؤثرة وشحا مطاعا وهوی متبعا واعجاب کل ذی رأی برأیه فعلیك بخویصة نفسك وذر عوامهم"

"امر بمعروف و نہی از منکر کرو، لیکن جب دیکھو کہ لوگ دنیا کو ترجیح دیتے ہیں اور مقدم سمجھتے ہیں بخل اور ہوا و ہوس ان پر حکمران ہے اور ہر شخص صرف اپنی ہی رائے کو پسند کرتا ہے (اور اس کے کان کسی دوسرے کی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں) تو اپنے آپ میں لگ جاؤ اور لوگوں کو چھوڑ دو۔"[1]

بہرحال اس میں شک نہیں کہ امر بمعروف اور نہی از منکر ارکان اسلام میں سے اہم ترین مسئلہ ہے، جس کی جوابدہی سے کسی طرح بھی سبکدوشی ممکن نہیں، صرف ان مواقع پر یہ دونوں فرائض ساقط ہو جاتے ہیں جب ان کے اثر انداز ہونے کی امید نہ ہو، اور لوازمی ضروری شرائط ان میں موجود نہ ہوں۔[2]

۱۰۶۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُونَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَمِنَ الْآثِمِينَ ○

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۶۸۴۔

[2] اس سلسلے میں تفصیلی اسلامی احکام جاننے کے لیے امام خمینی کی توضیح المسائل کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے باب کی طرف رجوع فرمائیں، نیز دیگر متعلقہ اسلامی کتب کا مطالعہ کریں۔ (مترجم)۔

۱۰۷۔ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○

۱۰۸۔ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○ ع

## ترجمہ

۱۰۶ ـ اے ایمان لانے والو! جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے تو وصیت کرتے وقت اپنے میں سے دو عادل افراد کو بلاو، یا اگر تم سفر میں ہو اور تمہیں موت آپہنچے (اور راستے میں تمہیں کوئی مسلمان نہ ملے) تو اغیار میں سے دو افراد، اور اگر شہادت ادا کرتے وقت ان کے سچے ہونے میں شک کرو تو انہیں نماز کے بعد روک رکھو تاکہ وہ یہ قسم کھائیں کہ ہم حق کو کسی چیز کے بدلے فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اگرچہ ہمارے رشتہ داروں کے بارے میں ہو اور ہم خدائی شہادت کو نہیں چھپاتے کہ مبادا ہم گنہگاروں میں سے ہو جائیں۔

۱۰۷ ـ اور اگر اطلاع حاصل ہو جائے کہ وہ دونوں گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں (اور انہوں نے حق کو چھپایا ہے) تو دو اور افراد کہ جن پر پہلے گواہوں نے ظلم کیا ہے ان کی جگہ قرار پائیں گے اور خدا کی قسم کھائیں گے کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی کی نسبت حق کے زیادہ قریب ہے، اور ہم تجاوز و زیادتی کے مرتکب نہیں ہوئے اور اگر ہم نے ایسا کیا ہو تو ہم ظالمین میں سے ہوں گے۔

۱۰۸ ـ یہ کام زیادہ سبب بنے گا کہ وہ حق کی گواہی دیں (اور خدا سے ڈریں) اور یا (لوگوں سے) ڈریں کہ (ان کا جھوٹ فاش ہو جائے گا اور) ان کی قسموں کی جگہ دوسری قسمیں لے لیں گی اور خدا (کی مخالفت) سے ڈرو اور کان دھر کر بات سنو اور خدا فاسقین کی ہدایت نہیں کرتا۔

## شانِ نزول

مجمع البیان اور بعض دوسری تفاسیر میں درج بالا آیات کی شانِ نزول کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ مسلمانوں میں سے "ابن ابی ماریہ" نامی ایک شخص دو عرب عیسائیوں کی ہمراہی میں جن کے نام "تمیم" اور "عدی" تھے اور وہ دونوں بھائی تھے تجارت کے ارادے سے مدینہ سے نکلا۔ اثنائے راہ میں "ابن ابی ماریہ" جو مسلمان تھا بیمار ہو گیا اس نے وصیت نامہ لکھا اور اسے اپنے سامان میں چھپا دیا اور اپنا مال اپنے دو ہمسفر عیسائیوں کے سپرد کرتے ہوئے وصیت کی کہ وہ اسے اس کے رشتہ داروں تک پہنچا دیں وہ مر گیا۔ اس کے ہمسفر دونوں افراد نے اس کا مال و اسباب کھولا اور اس میں سے گراں قیمت اور زیادہ اہم چیزیں اٹھا لیں اور باقی مال وارثوں کو پہنچا دیا۔ وارثوں نے جب سامان کھولا تو انہیں اس میں اُن چیزوں میں سے جو "ابن ابی ماریہ" اپنے ساتھ لے گیا تھا کچھ چیزیں نہ ملیں۔ اچانک اُن کی نظر وصیت نامے پر پڑی۔ انہوں نے دیکھا کہ تمام چوری شدہ مال کی تفصیل اس میں درج ہے۔ انہوں نے اُن دو ہمسفر عیسائیوں کے سامنے ماجرا پیش کیا۔ انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ جو کچھ اس نے ہمیں دیا وہ ہم نے تمہارے سپرد کر دیا۔ مجبوراً انہوں نے پیغمبرؐ سے شکایت کی تو زیرِ نظر آیات نازل ہوئیں جن میں اس سلسلے میں حکم بیان کیا گیا۔

لیکن اس شانِ نزول سے کہ جو کتاب کافی میں بیان ہوئی ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے تو دوسرے مال و متاع کا انکار کیا اور معاملہ پیغمبرؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ پیغمبرؐ کے پاس چونکہ ان دو افراد کے خلاف کوئی دلیل موجود نہیں تھی تو انہیں قسم کھانے پر آمادہ کیا اور اُن سے قسم لینے کے بعد انہیں بری کر دیا۔ لیکن کچھ وقت نہیں گزرا تھا کہ اُن دونوں آدمیوں کے پاس سے مالِ متنازعہ میں سے کچھ مال مل گیا اور اس طرح سے اُن کا جھوٹ ثابت ہو گیا، ماجرا پیغمبرؐ کی خدمت میں عرض کیا گیا پیغمبرؐ انتظار میں تھے کہ درج بالا آیات نازل ہوئیں۔ اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ مرنے والے کے ورثا قسم کھائیں اور پھر آپؐ نے مال ان کے سپرد کر دیا۔

## تفسیر

اسلام کے اہم ترین مسائل میں سے ایک حفظِ حقوق اور لوگوں کے اموال اور مکمل عدالت اجتماعی کے اجراء کرنے کا مسئلہ ہے۔ اُوپر والی آیات اس حصہ سے مربوط احکام کا ایک گوشہ ہیں۔

پہلے اس بنا پر کہ وارثوں کے حقوق مرنے والے کے مال میں سے ضائع نہ ہوں اور پسماندگان یتیم اور چھوٹے بچوں کا حق پامال نہ ہو، صاحبِ ایمان افراد کو حکم دیتا ہے اور ان سے یہ کہتا ہے: اے ایمان لانے والو! جب تم میں سے کسی کو موت آگھیرے تو وصیت کرتے وقت دو عادل افراد کو گواہی کے لیے بلاؤ اور اپنا مال امانت کے طور پر ورثا کے حوالے کرنے کے لیے ان کے سپرد کر دو (یا ایها الذین اٰمنوا شهادة بینکم اذا حضر احدکم الموت حین الوصیة اثنان ذوا عدل منکم)۔

یہاں عدل سے مراد وہی عدالت ہے جو گناہ کبیرہ وغیرہ سے پرہیز کرنے کے معنی میں ہے۔ البتہ آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی ہے کہ عدالت سے مراد "امور مالی میں امانت" اور "عدم خیانت" ہو مگر یہ کہ دوسرے دلائل سے ثابت ہو کہ اس سے مزید شرط بھی

اس سلسلے میں ضروری ہیں۔

"منکم" سے مراد یعنی تم مسلمانوں میں سے، غیر مسلم افراد کے مقابلے میں ہے کہ جس کی طرف بعد والے جملے میں اشارہ ہوگا۔

البتہ اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ یہاں عام شہادت کے متعلق بحث نہیں ہے، بلکہ یہ وہ شہادت ہے جو وصیت کے ساتھ وابستہ ہے، یعنی یہ دونوں افراد وصی بھی ہیں اور گواہ بھی۔ باقی رہا یہ احتمال کہ یہاں پر دو گواہوں کے علاوہ ایک تیسرے شخص کا وصی کے طور پر انتخاب بھی ضروری ہے تو وہ ظاہر آیت کے خلاف اور شانِ نزول کے مخالف ہے، کیونکہ ہم شان نزول میں پڑھ چکے ہیں کہ ابن ماریہ کے ہمسفر صرف دو افراد تھے کہ جنہیں اس نے اپنی میراث پر وصی اور گواہ ٹھہرایا تھا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: اگر تم مسافرت میں ہو اور تم پر موت کی مصیبت آپڑے (اور مسلمانوں میں سے کوئی وصی اور شاہد نہیں مل سکے) تو اس مقصد کے لیے غیر مسلمانوں میں سے دو افراد کا انتخاب کرو (او آخران من غیرکم ان انتم ضربتم فی الارض فاصابتکم مصیبۃ الموت)۔

اگرچہ آیت میں اس موضوع سے متعلق کوئی بات دکھائی نہیں دیتی کہ غیر مسلموں میں سے وصی و شاہد کا انتخاب مسلمانوں میں سے کسی مسلمان کے نہ ملنے کے ساتھ مشروط ہے، البتہ یہ بات واضح ہے کہ مراد ایسی صورت میں ہی ہے جب مسلمان تک رسائی نہ ہو اور مسافرت کی قید کا ذکر بھی اسی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی طرح کلمہ "او" اگرچہ عام طور پر اختیار کے لیے آتا ہے لیکن یہاں بھی بہت سے دوسرے مواقع کی طرح "ترتیب" ہی مقصود ہے، یعنی پہلے تو مسلمانوں میں سے انتخاب ہونا چاہیے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر غیر مسلموں میں سے انتخاب کرو۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ غیر مسلموں سے یہاں صرف اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہی مراد ہیں کیونکہ اسلام مشرکوں اور بت پرستوں کی اہمیت کا کبھی قائل نہیں ہوا۔

پھر حکم دیتا ہے کہ گواہی دینے کے وقت، رفع شک کی غرض سے، ان دونوں افراد کو نماز کے بعد اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اللہ کی قسم کھائیں (تحبسونهما من بعد الصلوٰة فیقسمان باللہ ان ارتبتم) اور ان کی شہادت اس طرح سے ہونا چاہیے کہ وہ یہ کہیں کہ: ہم اس بات پر آمادہ نہیں ہیں کہ حق کو مادی منافع کی خاطر بیچ ڈالیں اور ناحق گواہی دیں اگرچہ ہمارے رشتہ داروں اور عزیزوں کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو (لا نشتری بہ ثمنا ولو کان ذا قربیٰ) اور ہم کبھی خدائی گواہی کو نہیں چھپائیں گے کیونکہ اس طرح تو ہم گنہگاروں میں سے ہو جائیں گے (ولا نکتم شہادۃ اللہ انا اذاً لمن الاثمین)۔

اس حقیقت پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ:

اولاً یہ تمام امور شک و شبہ اور اتہام کی صورت میں احتیاط و رعایت کے سلسلے میں ہیں۔

دوسرا یہ کہ ظاہر آیت کے مطابق مسلمان اور غیر مسلم میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے بلکہ حقیقت میں یہ تو اتہام کے مواقع پر لوگوں کے مال کی حفاظت کے لیے ایک طرح کا محکم ضابطہ ہے [illegible] کیونکہ یہ حکم عدم اتہام کے مواقع کے ساتھ مربوط ہے، لہٰذا اس بنا پر نہ تو اس آیت کا حکم منسوخ ہوا ہے اور نہ ہی یہ غیر مسلموں کے ساتھ مخصوص ہے (غور کیجئے)۔

تیسرا یہ کہ نماز سے مراد غیر مسلموں کی صورت میں از روئے اصول و قاعدہ خود ان کی ہی نماز ہونا چاہیے کہ جو ان میں توجہ اور خوف خدا پیدا کرتی ہے باقی رہا مسلمانوں کے بارے میں تو ایک گروہ کا نظریہ تو یہ ہے کہ اس سے مراد خاص طور پر نماز عصر ہے اور اہل بیت علیہم السلام کی بعض روایات میں بھی اس بارے میں اشارہ ہوا ہے لیکن آیت کا ظاہر مطلق ہے اور وہ ہر نماز کے لیے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری روایات میں خصوصیت کے ساتھ نماز عصر کا ذکر استحبابی پہلو رکھتا ہو کیونکہ نماز عصر میں لوگ زیادہ تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ علاوہ ازیں فیصلہ اور قضاوت کا وقت بھی مسلمانوں کے نزدیک زیادہ تر یہی ہوتا تھا۔

چوتھا یہ کہ شہادت کے لیے نماز کے وقت کا انتخاب اس بنا پر تھا کیونکہ اس موقع پر انسان میں خدا خوفی کی روح بیدار ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ [1]

زمان و مکان کی حالت انسان کو حق کی طرف متوجہ کر دیتی ہے، یہاں تک کہ بعض فقہا نے کہا ہے کہ اگر گواہی کے لیے مکہ میں ہوں تو بہتر ہے خصوصاً کعبہ کے پاس "رکن" و "مقام" کے درمیان کہ جو بہت ہی مقدس جگہ ہے اور اگر مدینہ میں ہوں تو پیغمبر کے منبر کے پاس یہ شہادت ادا ہو۔

بعد والی آیت میں ایسے موقع کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ دونوں گواہ خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں اور انہوں نے حق کے خلاف گواہی دی ہے۔ جیسا کہ آیت کی شان نزول میں بیان ہوا ہے۔ ایسے موقع کے لیے حکم یہ ہے کہ: اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ دونوں گواہ گناہ، جرم اور تعدی کے مرتکب ہوئے ہیں اور انہوں نے حق کو پامال کر دیا ہے تو دوسرے دو آدمی ان لوگوں میں سے لیے جائیں گے جن پر پہلے گواہوں نے ظلم کیا ہے یعنی مرنے والے کے ورثا میں سے اور وہ اپنا حق ثابت کرنے کے لیے گواہی دیں گے (فان عثر علی انهما استحقا اثماً فاخران یقومان مقامهما من الذین استحق علیهم الاولیان)۔

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں کہا ہے کہ یہ آیت معنی اور اعراب کے لحاظ سے پیچیدہ ترین اور مشکل ترین آیات قرآن میں سے ہے۔ لیکن دو نکات کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آیت اس قدر پیچیدہ بھی نہیں ہے۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ لفظ "اثم" (گناہ) کے قرینہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں "استحق" سے مراد جرم اور دوسرے کے حق پر تجاوز ہے اور دوسرے یہ کہ "اولیان" یہاں "اولان" کے معنی میں ہے یعنی وہ دو گواہ کہ جنہیں پہلے گواہی دینا چاہیے تھی اور اب وہ راہ راست سے منحرف ہو گئے ہیں۔ بنا بریں آیت کا معنی اس طرح ہو گا کہ اگر کوئی ایسی اطلاع مل جائے کہ پہلے والے دو گواہ غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں تو دو اور افراد ان کی جگہ لے لیں گے یہ دو گواہ ان لوگوں میں سے ہوں گے کہ جن پر پہلے دو گواہوں نے زیادتی اور تجاوز کیا ہے [2]

---

[1] عنکبوت۔ ۴۵۔

[2] اس بنا پر اعراب کے لحاظ سے "آخران" مبتدا ہے اور "یقومان مقامهما" خبر ہے اور "اولیان" "استحق" کا فاعل ہے۔ "والذین" ورثا کے معنی میں ہے جن پر ظلم ہوا ہے اور جار و مجرور "من الذین" کا "آخران" کی صفت ہو گا (غور کیجئے گا)۔

آیت کے ذیل میں دوسرے دو گواہوں کی ذمہ داری یوں بیان کی گئی ہے: وہ خدا کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی پہلے دو افراد کی گواہی کی نسبت زیادہ سچ اور حق کے زیادہ قریب ہے اور ہم تجاوز اور کسی ظلم و ستم کے مرتکب نہیں ہوں گے اور اگر ہم ایسا کریں تو ظالموں میں سے قرار پائیں گے (فیقسمان باللّٰہ لشھادتنا احق من شھادتھما وما اعتدینا انا اذا لمن الظّٰلمین)۔

حقیقت میں مرنے والے کے اولیاء پہلے سے اس کے مال و متاع کے بارے میں مسافرت کے وقت یا مسافرت کے علاوہ جو کچھ جانتے ہیں اس کی بنیاد پر گواہی دیں گے کہ پہلے دو گواہ ظلم و خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں، اور یہ گواہی مشاہدہ کی بنا پر ہے نہ کہ حدس و قرائن کی رو سے۔

زیر بحث آیت کے آخر میں درحقیقت ان احکام کا فلسفہ بیان ہو رہا ہے جو شہادت کے سلسلے میں پہلی آیات میں گزر چکے ہیں کہ اگر اوپر والے حکم کے مطابق عمل ہو یعنی دونوں گواہوں کو نماز کے بعد جماعت کی موجودگی میں گواہی کے لیے طلب کریں اور ان کی خیانت ظاہر ہونے کی صورت میں دوسرے افراد ورثاء میں سے ان کی جگہ لیں اور حق کو واضح کریں تو یہ طریقہ عمل اس بات کا سبب بنے گا کہ گواہ گواہی کے معاملے میں خود غرضی سے کام لیں گے اور خدا کے خوف یا خلق خدا کے ڈر سے واقع کے مطابق گواہی دیں گے (ذٰلک ادنی ان یأتوا بالشھادۃ علی وجھھا او یخافوا ان ترد ایمان بعد ایمانھم)۔

درحقیقت یہ کام اس بات کا سبب بنے گا کہ ان میں خدا کے سامنے یا بندگان خدا کے سامنے زیادہ سے زیادہ بازپرس کا خوف پیدا ہو جائے اور وہ حق کے مرکز سے روگرداں نہ ہوں۔

آیت کے آخر میں تمام گذشتہ احکام کی تاکید کے لیے ایک حکم دیا گیا ہے:

پرہیزگاری اختیار کرو اور فرمان خدا کان لگا کر سنو اور یہ جان لو کہ خدا فاسق گروہ کو ہدایت نہیں کرتا (واتقوا اللّٰہ واسمعوا واللّٰہ لا یھدی القوم الفٰسقین)۔

۱۰۹۔ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○

## ترجمہ

۱۰۹۔ اُس دن سے ڈرو جس دن خدا پیغمبروں کو جمع کرے گا اور انہیں کہے گا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا تو وہ کہیں گے ہمیں تو پتہ نہیں تو خود تمام پوشیدہ چیزوں کا جاننے والا ہے۔

## تفسیر

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیات کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ گذشتہ آیات کے ذیل میں جو حق و باطل کی شہادت کے مسئلہ

کے ساتھ مربوط نہیں، تقویٰ اور حکم خدا کی مخالفت سے ڈرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس آیت میں کہتا ہے کہ اس دن سے ڈرو جس دن خدا پیغمبروں کو جمع کرے گا اور ان سے رسالت اور ان کی ماموریت کے بارے میں سوال کرے گا اور ان سے کہے گا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا (یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ فَیَقُوۡلُ مَاذَاۤ اُجِبۡتُمۡ)۔

وہ اپنے کسی بھی قسم کے ذاتی علم کی نفی کرتے ہوئے تمام حقائق کو علم پروردگار کے ساتھ وابستہ کرکے کہیں گے، خداوندا ہمیں کوئی علم نہیں ہے تو ہی تمام پوشیدہ اور چھپی ہوئی چیزوں سے آگاہ ہے (قالوا لا علم لنا انک انت علام الغیوب)۔

اس طرح تمہارا ایسے علام الغیوب خدا اور ایسی عدالت سے سامنا ہوگا، اس لیے تم اپنی گواہیوں میں حق وانصاف کو ملحوظ نظر رکھو۔ یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں۔

پہلا :۔ یہ کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء ومرسلین اپنی امت کے گواہ اور شاہد ہیں جب کہ زیر بحث آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے علم کی نفی کرتے ہیں اور تمام چیزوں کو خدا کے سپرد کر رہے ہیں۔

لیکن ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ دونوں باتیں دو علیحدہ علیحدہ مرحلوں کے ساتھ مربوط ہیں۔ پہلے مرحلہ میں جس کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہے انبیاء علیہم السلام نے پروردگار کے سوال کے جواب میں اظہار ادب کیا ہے اور اپنے آپ سے علم کی نفی کی ہے اور تمام چیزوں کو خدا کے علم سے وابستہ کیا ہے، لیکن بعد کے مرحلوں میں اپنی امت کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں اس کو واضح کریں گے اور اس کی گواہی دیں گے، یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح سے کہ بعض اوقات استاد اپنے شاگرد سے کہتا ہے کہ فلاں شخص کے سوال کا جواب دو اور شاگرد پہلے تو اظہار ادب کے طور پر اپنے علم کو استاد کے علم کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر قرار دیتا ہے اور پھر جو کچھ وہ جانتا ہے اسے بیان کرتا ہے۔

دوسرا :۔ یہ کہ انبیاء علیہم السلام اپنے سے علم کی نفی کیسے کریں گے حالانکہ وہ عام عادی علم کے علاوہ بہت سے مخفی حقائق پروردگار کی تعلیم کے ذریعے جانتے ہیں۔

اگرچہ اس سوال کے جواب میں مفسرین نے طرح طرح کی باتیں کی ہیں لیکن ہمارے عقیدے کے مطابق یہ بات بالکل واضح اور روشن ہے کہ یہاں پر انبیاء علیہم السلام کی مراد یہ ہے کہ وہ اپنے علم کو خدا کے علم کے مقابلے میں ہیچ سمجھتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے، ہماری ہستی اس کی بے پایاں ہستی کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں ہے اور ہمارا علم اس کے علم کے سامنے کوئی علم ہی شمار نہیں ہوتا اور خلاصہ یہ ہے کہ "ممکن" جو کچھ بھی ہو "واجب" کے مقابلے میں کوئی چیز ہی نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں اگرچہ انبیاء علیہم السلام کا علم ودانش اپنے مقام پر بہت زیادہ ہے لیکن جب اس کا قیاس علم پروردگار کے ساتھ کیا جائے گا تو وہ کوئی علم شمار نہیں ہوگا۔

حقیقت میں عالم واقعی وہ ذات ہے کہ جو ہر جگہ اور ہر وقت حاضر وناظر ہو اور تمام ذرات عالم کے ایک دوسرے سے

---

* جو کچھ اوپر کہا جا چکا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراب کے لحاظ سے "یوم" "اتقوا" کا مفعول ہے کہ جو اس کی تقدیر ہے اور پہلی آیت سے ظاہر ہوتا ہے

وصل و پیوند سے باخبر ہو اور اس جہان کی تمام خصوصیات سے کہ جو ایک وحدت کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ ملا ہوا ہے، آگاہ ہو اور یہ صفت صرف خدا وند تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہے۔

ہم نے اب تک جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت پیغمبروں اور اماموں سے ہر قسم کے علم غیب کی نفی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے خیال کر رکھا ہے کیونکہ علم غیب ذاتی طور پر تو اس ہستی سے ہی مربوط ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ حاضر ہو۔ اس کے علاوہ کوئی بھی بالذات اس قسم کے علم کا حامل نہیں ہے بلکہ جتنا خدا نے اُسے علم غیب دیا ہے اتنا ہی وہ جانتا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات اس چیز کی گواہ ہیں کہ جن میں سے سورۂ جن کی آیہ ۲۶ میں ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ

خداوند تعالیٰ عالم الغیب ہے اور سوائے ان رسولوں کے کہ جنہیں اس نے برگزیدہ کیا ہے اور کسی کو اپنے علم غیب سے آگاہ نہیں کرتا۔

نیز سورہ ہود کی آیہ ۴۹ میں ہے:

"تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ"

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تجھ پر وحی کرتے ہیں۔

ان آیات اور ان جیسی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ علم غیب ذات خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن جس شخص کے لیے وہ جتنا مصلحت سمجھتا ہے اسے تعلیم دیتا ہے اور اس کی کیت و کیفیت اس کی خواہش اور مشیت سے مربوط ہے۔

۱۱۰۔ إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ۖ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي ۖ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ○

# ترجمہ

۱۱۰۔ وہ وقت یاد کرو جب خدا نے عیسٰی بن مریم سے کہا کہ اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کی ہے جب میں نے روح القدس کے ذریعے تیری تقویت کی کہ تو گہوارے میں اور بڑے ہوکر لوگوں سے گفتگو کرتا تھا، اور جب میں نے تجھے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی اور جب کہ تو میرے حکم سے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا اور مادر زاد اندھے اور برص کی بیماری والے کو تو میرے حکم سے شفا دیتا تھا اور مردوں کو (بھی) تو میرے حکم سے زندہ کرتا تھا اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھے اذیت و تکلیف پہنچانے سے باز رکھا جب تو ان کے پاس واضح دلائل لے کر آیا تھا لیکن ان میں سے کافروں کی ایک جماعت نے کہا کہ یہ تو کھلے ہوئے جادو کے سوا کچھ نہیں۔

# تفسیر

## مسیح پر انعامات الٰہی

یہ آیت اور سورۂ مائدہ کے آخر تک بعد والی آیات حضرت عیسٰیؑ کی سرگذشت اور ان نعمات سے مربوط ہیں جو آنجناب اور ان کی امت کو بخشی گئیں اور وہ یہاں پر مسلمانوں کی بیداری اور آگاہی کے لیے بیان ہوئی ہیں پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ وقت یاد کرو جب خدا نے عیسٰی ابن مریم سے فرمایا کہ تم اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کی ہے (اذ قال اللہ یٰعیسی ابن مریم اذکر نعمتی علیك و علی والدتك)۔

اس تفسیر کے مطابق اوپر والی آیات ایک مستقل بحث شروع کر رہی ہیں جو مسلمانوں کے لیے تربیتی پہلو رکھتی ہے اور اس کا اسی دنیا کے ساتھ ربط ہے۔ لیکن بعض مفسرین مثلاً طبرسی، بیضاوی اور ابوالفتوح رازی نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ آیت پہلی آیت کا ضمیمہ ہے اور اس کا ربط ان سوالات اور باتوں سے ہے جو خداوند تعالیٰ قیامت کے دن پیغمبروں سے کرے گا اور اس بنا پر "قال" جو فعل ماضی ہے یہاں "یقول" یعنی فعل مضارع کے معنی میں ہوگا۔ لیکن یہ احتمال ظاہر آیت کے خلاف ہے، خاص طور پر جبکہ معمول یہ ہے کہ کسی کے لیے نعمتوں کا شمار کرنا اس میں روح شکرگزاری زندہ کرنے کی غرض سے ہوتا ہے۔ جبکہ قیامت میں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں آئے گا۔ اس کے بعد اپنی نعمات کا ذکر شروع کر دیا ہے، پہلے کہتا ہے: میں نے تجھے روح القدس کے ذریعے تقویت دی ہے (اذ ایدتك بروح القدس)۔

روح القدس کے معنی کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اول میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے [1]

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

خلاصہ یہ کہ ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد وحی لانے والا فرشتہ یعنی جبرئیل ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد وہی غیبی طاقت ہو جو حضرت عیسیٰؑ کو معجزے دکھانے اور رسالت کے کام سرانجام دینے کے لیے تقویت دیتی تھی اور یہ چیز انبیاء کے علاوہ دوسروں میں بھی ضعیف تر درجہ میں موجود ہوتی ہے۔ نعمات الٰہی میں سے دوسری نعمت تجھ پر یہ ہے کہ روح القدس کی تائید کے ذریعے تو لوگوں کے ساتھ گہوارے میں اور پختہ کار ہو کر گفتگو کرتا تھا (تکلم الناس فی المھد وکھلاً)۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ تیری گہوارہ کی باتیں بھی بڑے ہونے کے بعد کی باتوں کی مانند پختہ اور جچی تلی ہوتی تھیں اور وہ بچوں کی طرح بے وزن نہیں ہوتی تھیں۔

تیسری نعمت یہ ہے کہ میں نے تجھے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی (واذ علمتك الكتاب والحكمة والتوراة والانجيل)۔ کتاب کے ذکر کے بعد تورات و انجیل کا تذکرہ جبکہ وہ بھی آسمانی کتابوں میں سے ہیں حقیقت میں اجمال کے بعد تفصیل کی صورت میں ہے۔

چوتھی نعمت یہ ہے کہ تو میرے حکم سے پرندے کی شکل کی ایک چیز مٹی سے بناتا تھا اس کے بعد اس میں پھونکتا تھا تو وہ میرے حکم سے ایک زندہ پرندہ ہو جاتی تھی (واذ تخلق من الطين كهيئة الطير باذنی فتنفخ فيها فتكون طيرًا باذنی)۔

پانچویں نعمت یہ ہے کہ تو میرے اذن سے مادر زاد اندھے اور برص کی بیماری میں مبتلا شخص کو شفا دیتا تھا (وتبرئ الاكمه والابرص باذنی)۔ اور تو میرے اذن سے مردوں کو بھی زندہ کیا کرتا تھا (واذ تخرج الموتى باذنی) اور بالآخر میری نعمتوں میں سے ایک اور نعمت تجھ پر یہ تھی کہ میں نے بنی اسرائیل کو تجھے نقصان پہنچانے سے اس وقت باز رکھا جب کہ ان کے کافر تیرے واضح اور روشن دلائل کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں کھلا جادو کہنے لگے۔ میں نے اس تمام شور و غل اور سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں کے مقابلے میں تیری حفاظت کی تاکہ تو اپنی دعوت کو آگے بڑھا سکے (واذ كففت بنی اسرائيل عنك اذ جئتهم بالبينات فقال الذين كفروا منهم ان هٰذا الا سحر مبين)۔

یہاں پر ایک بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں چار مرتبہ لفظ "باذنی" (میرے حکم سے) دہرایا گیا ہے تاکہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے غلو اور ادعائے الوہیت کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ یعنی جو کچھ وہ انجام دیتے تھے اگرچہ بہت عجیب و غریب اور حیرت انگیز تھا اور خدائی کاموں کے ساتھ شباہت رکھتا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی کام خود عیسیٰؑ کی طرف سے نہیں تھا بلکہ یہ سب کام خدا کی طرف سے انجام پذیر ہوتے تھے۔ وہ ایک بندۂ خدا تھے اور خداوند تعالیٰ کے تابع فرمان تھے اور ان کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ خدائے لایزال کی قدرت سے تھا۔

ہوسکتا ہے یہ کہا جائے کہ یہ تمام کی تمام نعمتیں حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ مربوط تھیں تو اس آیت میں ان نعمتوں کو ان کی والدہ جناب مریمؑ کے لیے بھی نعمت کیوں شمار کیا گیا۔

---

حاشیہ صفحہ سابقہ

۱؎ تفسیر نمونہ جلد اول (اردو ترجمہ) صفحہ ۲۵۶

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات مسلم ہے کہ جو نعمت بیٹے تک پہنچتی ہے وہ حقیقت میں اس کی ماں کو بھی پہنچی ہے کیونکہ دونوں ایک اصل سے ہیں اور ایک ہی درخت کی شاخ اور جڑ ہیں۔

ضمنی طور پر جیسا کہ ہم سورہ آل عمران کی آیہ ۴۹ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں یہ آیت اور اسی قسم کی آیات اولیاء خدا کی ولایت تکوینی کے واضح دلائل میں سے ہیں کیونکہ مسیح کے قصّے میں مُردوں کو زندہ کرنے، مادر زاد اندھوں اور لاعلاج بیماروں کو شفا دینے کو مسیح کی ذات کی طرف منسوب کیا گیا ہے البتہ اذن و فرمانِ خدا کے ساتھ۔

اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات عین ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ عالم تکوین میں تصرف کرنے کے لیے اس قسم کی قدرت کسی شخص کے اختیار میں دے دے کہ وہ کبھی کبھی اس قسم کے اعمال انجام دے لیا کرے اور اس آیت کی تفسیر انبیاءؑ کے دعا کرنے اور خدا کی طرف سے ان کی دعا قبول ہونے کے ساتھ کرنا مکمل طور پر ظواہر آیات کے خلاف ہے۔ البتہ اولیاء خدا کی ولایت تکوینی سے ہماری مراد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جیسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ کیونکہ اس مقدار سے زیادہ کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ مزید وضاحت کے لیے جلد دوم کی طرف رجوع کریں[1]

۱۱۱۔ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ○

۱۱۲۔ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

۱۱۳۔ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ○

۱۱۴۔ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ○

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۱۲۵۔ (اردو ترجمہ)۔

۱۱۵۔ قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۠

## ترجمہ

۱۱۱۔ اور وہ وقت یاد کرو جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے بھیجے ہوئے پر ایمان لاؤ۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلمان ہیں۔

۱۱۲۔ وہ وقت کہ جب حواریوں نے یہ کہا کہ اے عیسٰی بن مریم! کیا تیرا پروردگار آسمان سے مائدہ نازل کر سکتا ہے تو اس نے (جواب میں) کہا اگر تم صاحبان ایمان ہو تو اللہ سے ڈرو۔

۱۱۳۔ وہ کہنے لگے (ہم یہ بات بری نیت سے نہیں کہتے بلکہ) ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل (آپ کی رسالت پر) مطمئن ہو جائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہم سے سچی بات کہی ہے اور ہم اس پر گواہ ہو جائیں۔

۱۱۴۔ عیسٰیؑ نے عرض کیا اے خدا! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے مائدہ نازل فرما تاکہ وہ ہمارے اوّل و آخر کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے نشانی ہو اور ہمیں روزی عطا فرما، تو بہترین روزی دینے والا ہے۔

۱۱۵۔ خداوند تعالیٰ نے (اس کی دعا قبول فرمالی اور) کہا: میں اُسے تم پر نازل کروں گا، لیکن جو شخص تم میں سے اس کے بعد کافر ہو جائے گا (اور وہ انکار کی راہ اختیار کرے گا) اُسے میں ایسی سزا دوں گا کہ عالمین میں سے ویسی سزا کسی کو نہ دی ہو گی۔

## تفسیر

### حواریوں پر مائدہ کے نزول کا واقعہ

اس بحث کے بعد جو مسیحؑ اور ان کی والدہ کے بارے میں نعمات الٰہی کے سلسلہ میں گذشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے ان آیات میں اُن نعمات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حواریوں یعنی حضرت عیسٰیؑ کے نزدیکی اصحاب و انصار کو بخشی گئی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے، اُس وقت کو یاد کرو جب ہم نے حواریوں کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے بھیجے ہوئے مسیح پر ایمان لے آؤ تو انہوں نے میری دعوت کو قبول کر لیا اور کہا کہ ہم ایمان لے آئے، خدایا! گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں اور تیرے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں (و اذ اوحیت الی الحواریین ان اٰمنوا بی و برسولی قالوا اٰمنا و اشهد باننا مسلمون)۔

البتہ یہ بات ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ لفظ وحی قرآن کریم میں ایک وسیع معنی کا حامل ہے اور ان وحیوں میں منحصر نہیں ہے کہ جو پیغمبروں پر نازل ہوتی ہیں بلکہ وہ الہام بھی جو مختلف افراد کے دلوں پر ہوتے ہیں اس کے مصداق ہیں اور اسی لیے مادرِ موسیٰؑ کے بارے میں (سورہ قصص آیہ ۷ میں) وحی کا لفظ آیا ہے[1] یہاں تک کہ حیوانات کے طبعی و فطری الہامات کے لیے بھی قرآن میں لفظ وحی استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھیوں کے لیے ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے وہ وحی مراد ہو جو حضرت مسیحؑ کے ذریعے اور معجزات کی شکل میں ان کی طرف بھیجی جاتی تھی، ہم نے حواریوں کے بارے میں یعنی حضرت عیسیٰؑ کے اصحاب اور شاگردانِ خاص کے لیے جلد دوم صفحہ ۱۲۹ پر بحث کی ہے[2]

اس کے بعد مائدہ آسمانی کے نزول کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: مسیحؑ کے اصحابِ خاص نے حضرت عیسیٰؑ سے کہا کیا تیرا پروردگار ہمارے لیے آسمان سے غذا بھیج سکتا ہے (اذ قال الحواریون یا عیسی ابن مریم هل یستطیع ربك ان ینزل علینا مائدة من السماء)۔

"مائدہ" لغت میں خوان، دسترخوان اور طبق کو بھی کہا جاتا ہے اور اُس غذا کو بھی کہتے ہیں جو اُس میں رکھی ہوئی ہو۔ اصل میں یہ "مید" کے مادہ سے بنایا گیا ہے جس کے معنی حرکت دینے اور ہلانے کے ہیں اور شاید دسترخوان اور غذا پر مائدہ کا اطلاق اس نقل و انتقال کی وجہ سے ہی ہو جو اُن میں صورت پذیر ہوتا رہتا ہے۔

حضرت مسیحؑ نے اس مطالبہ پر کہ جس میں ایسے ایسے معجزات و آیات دکھانے کے باوجود شک اور تردّد کی بو آرہی تھی، غور کیا اور انہیں تنبیہ کی اور کہا کہ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو (قال اتقوا الله ان کنتم مؤمنین)۔

لیکن انہوں نے جلد ہی حضرت عیسیٰؑ کو بتا دیا کہ ہمارا اس مطالبہ سے کوئی غلط مقصد نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ہماری کسی ہٹ دھرمی کی غرض پوشیدہ ہے بلکہ ہماری تمنا یہ ہے کہ ہم اس مائدہ میں سے کھائیں (اور آسمانی غذا کے کھانے سے نورانیت ہمارے دل میں پیدا ہوگی، کیونکہ غذا مسلمہ طور پر روحِ انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے، اس کے علاوہ) ہمارے دلوں میں راحت پیدا ہوگی اور اطمینان حاصل ہوگا اور یہ عظیم معجزہ دیکھنے سے ہم علم الیقین کی سرحد تک پہنچ جائیں گے اور یہ جان لیں گے کہ آپ

---

[1] و اوحینا الی ام موسی ان ارضعیه فاذا خفت علیه فالقیه فی الیم ...... ہم نے موسیٰ کی والدہ پر وحی کی کہ اُسے دودھ پلاؤ اور جب اس کے بارے میں تمہیں ڈر ہو تو اُسے دریا میں پھینک دو۔

[2] اُردو ترجمہ میں دیکھئے۔

نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے تاکہ ہم اس پر گواہی دے سکیں (قالوا نرید ان نأکل منہا وتطمئن قلوبنا ونعلم ان قد صدقتنا ونکون علیہا من الشاھدین)۔

جب حضرت عیسیٰؑ ان کے اس مطالبہ میں ان کی حسنِ نیت سے آگاہ ہوئے تو ان کی درخواست کو بارگاہِ خداوندی میں اس طرح سے بیان فرمایا کہ خداوندا ہمارے لیے آسمان سے مائدہ بھیج جو ہمارے اول و آخر کے لیے عید ہو اور تیری طرف سے ایک نشانی شمار ہو اور ہمیں رزق عطا فرما کہ تو ہی بہترین روزی رساں ہے (قال عیسی ابن مریم اللّٰھم ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء تکون لنا عیدًا لاولنا واٰخرنا واٰیۃ منک وارزقنا وانت خیر الرّٰزقین)۔

اس میں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ان کی درخواست کو بہت ہی عمدہ طریقے سے بارگاہِ خداوندی میں پیش کیا، جس میں حق طلبی کی روح کا اظہار بھی پایا جاتا ہے اور اجتماعی و عمومی مصالح کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے اس دعا کو جو حسنِ نیت اور خلوص کے ساتھ دل سے نکلی تھی قبول کر لیا اور ان سے فرمایا کہ میں اس قسم کا مائدہ تم پر نازل کروں گا لیکن اس بات پر بھی توجہ رہنی چاہیے کہ اس مائدہ کے اترنے کے بعد تمہاری ذمہ داری بہت سخت ہو جائے گی اور اس قسم کا واضح معجزہ دیکھنے کے بعد جس شخص نے راہِ کفر اختیار کی تو اسے ایسی سزا دوں گا کہ عالمین میں سے کسی کو ایسی سزا نہیں دی ہوگی (قال اللّٰہ انی منزلھا علیکم فمن یکفر بعد منکم فانی اعذبہ عذابًا لا اعذبہ احدًا من العٰلمین)۔

## چند ضروری نکات کی یاد دہانی

ان آیات میں چند ایسے نکات ہیں کہ جن کا مطالعہ کرنا ضروری ہے:

(۱) مائدہ کے مطالبہ سے کیا مراد تھی، اس میں تو شک نہیں ہے کہ حواریین اس درخواست میں کوئی بُرا ارادہ نہیں رکھتے تھے اور ان کا مقصد حضرت عیسیٰؑ کے مقابلے میں ہٹ دھرمی کرنا نہیں تھا بلکہ مزید اطمینان کی جستجو تھا تاکہ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں جو شکوک و شبہات اور وسوسے باقی ہیں وہ بھی دور ہو جائیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی مطلب کو استدلال کے ذریعے یہاں تک کہ کبھی کبھی تجربہ کی بنیاد پر بھی ثابت کر لیتا ہے لیکن جب مسئلہ زیادہ اہم ہوتا ہے تو بہت سے وسوسے اور شکوک و شبہات اس کے دل کے گوشوں میں باقی رہ جاتے ہیں لہٰذا اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ یا تو بار بار کے تجربے اور آزمائش کے ذریعے اور یا استدلالِ علمی کو عینی مشاہدات کے ساتھ بدل کر شکوک و شبہات اور وسوسوں کو اپنے دل کی گہرائیوں سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ باوجود اس کے کہ وہ ایمان و یقین کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے پھر بھی خداوند تعالیٰ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ مسئلہ معاد کا اپنی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ کریں تاکہ ان کا وہ ایمان جو از روئے علم تھا "عین الیقین" اور شہود سے بدل جائے۔

لیکن اس سبب سے کہ حواریوں کے مطالبہ کا ظاہری طور پر جو مطلب نکلتا تھا وہ چھبتا ہوا معلوم ہوتا تھا لہٰذا حضرت عیسیٰؑ نے اسے بہانہ جوئی پر محمول کیا اور ان پر اعتراض کیا، لیکن جب انہوں نے کافی وضاحت کے ساتھ اپنا مقصد روشن کر دیا تو حضرت عیسیٰؑ نے بھی ان کی بات کو تسلیم کر لیا۔

۲۔ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّکَ سے کیا مراد ہے؟ سلطور پر ابتدا میں یہ جملہ یہی معنی دیتا ہے کہ حواریین نزول مائدہ کے سلسلے میں قدرت خدا میں شک رکھتے تھے لیکن اس کی تفسیر میں اسلامی مفسرین کے بعض بیانات جالب نظر ہیں۔ پہلا یہ کہ یہ درخواست انہوں نے ابتدائے کار میں کی تھی، جب کہ وہ مکمل طور پر صفات خداوندی سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ دوسرا یہ کہ ان کی مراد یہ تھی کہ کیا خداوند تعالیٰ کے نزدیک اس میں مصلحت ہے کہ وہ اس قسم کا مائدہ ہم پر نازل کردے۔ جیسا کہ مثال کے طور پر ایک شخص دوسرے سے یہ کہے کہ میں اپنی ساری دولت فلاں شخص کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔ یعنی میں اس میں مصلحت نہیں سمجھتا، نہ یہ کہ میں قدرت نہیں رکھتا۔ تیسرا یہ کہ "یستطیع" کا معنی "یستجیب" ہو۔ کیونکہ مادہ طوع کا معنی انقیاد و مطیع ہونا ہے اور جب وہ باب (استفعال) میں چلا جائے تو پھر اس سے یہ مطلب لیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر اس جملے کا یہ معنی ہوگا کہ کیا تیرا پروردگار ہماری اس بات کو قبول کرے گا کہ آسمانی مائدہ ہم پر نازل کرے۔

۳۔ یہ آسمانی مائدہ کیا تھا: یہ آسمانی مائدہ جن چیزوں پر مشتمل تھا ان کے بارے میں قرآن میں کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن احادیث میں کہ جن میں سے ایک حدیث امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھانا چند روٹیاں اور چند مچھلیاں تھیں۔ شاید اس قسم کے معجزے کے مطالبے کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے سن رکھا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بنی اسرائیل پر مائدہ آسمانی اُترا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بھی حضرت عیسیٰ سے اسی قسم کا تقاضا کیا۔

۴۔ کیا ان پر کوئی مائدہ نازل ہوا: باوجود اس کے کہ مذکورۂ بالا آیات نزول مائدہ کو تقریباً صراحت کے ساتھ بیان کر رہی ہیں کیونکہ خداوند تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے نزول مائدہ کی تردید کی ہے اور انہوں نے یہ کہا ہے کہ جب حواریین نے نزول مائدہ کے بعد کی سخت ذمہ داری کا احساس کیا تو انہوں نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا لیکن حق بات یہ ہے کہ مائدہ ان پر نازل ہوا۔

۵۔ عید کسے کہتے ہیں: عید لغت میں مادہ عود سے ہے جس کے لغوی معنی بازگشت (لوٹ آنا) کے ہیں۔ اسی لیے ان دنوں کو جن میں کسی قوم و ملت کی مشکلات برطرف ہو جاتی ہیں اور وہ پہلے جیسی کامیابیوں اور راحتوں کی طرف پلٹ آتی ہے، عید کہا جاتا ہے۔ اسلامی عیدوں کو اس مناسبت سے عید کہا جاتا ہے کہ ماہ مبارک رمضان میں ایک مہینے کی اطاعت کے بعد یا حج کا عظیم فریضہ انجام دینے کی وجہ سے روح میں پہلی سی فطری صفائی اور پاکیزگی لوٹ آتی ہے اور وہ آلودگیاں جو خلاف فطرت ہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ چونکہ نزول مائدہ کا دن کامیابی، پاکیزگی اور خدا پر ایمان لانے کی طرف بازگشت کا دن تھا لہٰذا حضرت عیسیٰ نے اس کا نام عید رکھا۔ جیسا کہ روایات میں آیا ہے مائدہ کا نزول اتوار کے دن ہوا تھا لہٰذا شاید عیسائیوں کے نزدیک اتوار کے احترام کی علتوں میں سے ایک علت یہ بھی ہو۔

حضرت علی علیہ السلام سے نقل شدہ ایک روایت میں ہے کہ:

"و کل یوم لا یعصی اللہ فیہ فھو یوم عید"

یعنی ہر وہ دن کہ جس میں خداوند تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی جائے وہ عید کا دن ہے[1]

[1] نہج البلاغۃ کلمات قصار ۴۲۸۔

یہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ ہے کیونکہ گناہ کو چھوڑنے کا دن کامیابی، پاکیزگی اور فطرت اولیہ کی طرف لوٹنے کا دن ہے۔

۶۔ عذاب شدید کس بنا پر تھا۔ یہاں پر ایک اہم نکتہ ہے جس کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ جب ایمان مرحلہ شہود اور عین الیقین کو پہنچ جائے یعنی حقیقت کو آنکھ سے دیکھنے اور کسی قسم کے تردد اور وسوسے کی گنجائش باقی نہ رہے تو پھر ایسے شخص کی ذمہ داری اور مسئولیت بہت ہی زیادہ سخت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اب یہ وہ سابق انسان نہیں ہے کہ جس کا ایمان پایۂ شہود پر نہیں تھا اور کبھی کبھار اس میں وسوسے پیدا ہو جاتے تھے۔ وہ ایمان اور ذمہ داری کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ اب اس کی تھوڑی تقصیر اور کوتاہی بھی مجازات شدید اور سخت سزا کا سبب بنے گی۔ اسی لیے تو انبیاء اور اولیاء خدا کی مسئولیت بہت سخت تھی اس طرح کہ وہ ہمیشہ اس سے وحشت و پریشانی میں رہتے تھے۔ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی اس قسم کی باتوں کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً اصولی طور پر ہر کسی کو معلوم ہے کہ اس کے شہر اور علاقے میں کئی بھوکے ایسے موجود ہیں جن کے بارے میں اس سے بازپرس ہوگی۔ لیکن جب وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لے کہ ایک بے گناہ انسان بھوک کی شدت سے فریاد کر رہا ہے تو اب اس کی جوابدہی کی صورت بدل جائے گی اور سخت تر ہو جائے گی۔

۷۔ عہد جدید اور مائدہ:۔ موجودہ چاروں انجیلوں میں مائدہ کے بارے میں اس طرح کی گفتگو نہیں ہے جس طرح کہ ہم قرآن مجید میں دیکھتے ہیں۔ اگرچہ انجیل یوحنا باب ۲۱ میں ایک بیان ایسا موجود ہے کہ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے لوگوں کو کھانا کھلانے اور آن کی طرف سے روٹی اور مچھلی کے ساتھ معجزانہ طور پر دعوت کا ذکر کیا گیا ہے لیکن تھوڑی سی توجہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا مائدہ آسمانی اور حواریوں کے مسئلے سے کوئی ربط نہیں ہے[1]

کتاب "اعمال رسولان" میں بھی جو "عہد جدید" کی ایک کتاب ہے، پطرس نامی ایک حواری پر نزول مائدہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ بھی اس بحث سے الگ چیز ہے کہ جس کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں، لیکن کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے ایسے حقائق ہیں کہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے مگر وہ موجودہ انجیلوں میں نہیں ہیں، ایسے ہی جیسا کہ بہت سے ایسے مطالب ہیں جو انجیلوں میں لکھے ہوئے ہیں مگر وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل نہیں ہوئے تھے لہٰذا اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے نزول مائدہ کے واقعہ کے سلسلے میں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی[2]

۱۱۶۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ

---

[1] الہدیٰ الی دین المصطفیٰ۔ جلد ۲ صفحہ ۲۴۹۔

[2] حوالہ سابقہ۔

لَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ○

۱۱۷- مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ○

۱۱۸- اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○

## ترجمہ

۱۱۶- وہ وقت یاد کرو جب خداوند تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا کہ (اے عیسیٰ) کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ دو خدا بنا لو وہ جواب دیں گے کہ تیری ذات پاک ہے، مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ ایسی بات کہوں جو میرے لائق نہیں ہے۔ اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوگی تو اس کا تجھے ضرور علم ہوگا۔ تُو ان سب باتوں کو جانتا ہے کہ جو میرے نفس و روح میں ہیں۔ لیکن میں جو کچھ تیری ذات پاک میں ہے اسے نہیں جانتا، کیونکہ تو تمام اسرار اور پوشیدہ چیزوں سے باخبر ہے۔

۱۱۷- مجھے تو نے جس کام پر مامور کیا تھا میں نے اس کے سوا ان سے اور کوئی بات نہیں کہی تھی۔ میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ اس خدا کی پرستش کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے اور میں تو اس وقت تک ہی ان کا نگران اور گواہ تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا اور جب تو نے مجھے ان کے درمیان سے اٹھا لیا تو پھر تُو ہی ان کا نگران تھا اور تو ہی ہر چیز پر گواہ ہے۔

۱۱۸- (اس صورت میں) اگر تو انہیں سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں (اور وہ تیری سزا سے بچ نکلنے کی قدرت نہیں رکھتے) اور اگر تو انہیں بخش دے تو تُو توانا و حکیم ہے (نہ تیری سزا عدمِ حکمت کی نشانی ہے اور نہ ہی تیری بخشش کمزوری کی علامت ہے)۔

# تفسیر

## حضرت مسیح کی اپنے پیروکاروں کے شرک سے بیزاری

یہ آیات قیامت کے دن خدا کی حضرت مسیح سے گفتگو کے بارے میں ہیں اور دلیل اس کی یہ ہے کہ بعد کی چند آیات میں ہے کہ:

ھذا یوم ینفع الصدقین صدقھم

آج کا دن وہ دن ہے کہ جس میں سچوں کو ان کی سچائی فائدہ دے گی۔

اور یہ بات مسلم ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔

اس کے علاوہ (فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم) کا جملہ اس پر دوسری دلیل ہے کہ یہ گفتگو مسیح کی نبوت و رسالت کا زمانہ گزرنے کے بعد کی ہے اور آیت کی ابتدا "قال" کے جملے کے ساتھ کرنا کہ جو فعل ماضی کے لیے ہے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا کیونکہ قرآن میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ قیامت سے مربوط مسائل زمان ماضی کی شکل میں بیان کیے گئے ہیں اور یہ چیز قیامت کے قطعی و یقینی ہونے کی دلیل ہے یعنی اس کا زمانہ آئندہ میں واقع ہونا ایسا مسلم ہے گویا کہ وہ زمانہ ماضی میں واقع ہو چکا ہے لہٰذا اسے فعل ماضی کے صیغہ کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

بہر حال پہلی آیت یہ کہتی ہے کہ خداوند تعالیٰ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ سے کہے گا کہ کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ اپنا معبود قرار دو اور ہماری پرستش کرو (واذ قال اللہ یعیسی ابن مریم ءانت قلت للناس اتخذونی وامی الھین من دون اللہ)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے بلکہ صرف توحید اور عبادتِ خدا کی دعوت دی ہے لیکن اس استفہام کا مطلب یہ ہے کہ آن سے آن کی امت کے سامنے اقرار لے کر ان کی امت کا جرم ثابت کیا جائے۔

مسیح علیہ السلام اس سوال کے جواب میں انتہائی احترام کے ساتھ چند جملے کہیں گے۔

۱۔ پہلے خداوند تعالیٰ کو ہر قسم کے شریک و شبیہ سے پاک بیان کرتے ہوئے کہیں گے: اے خدا! تو ہر قسم کے شریک سے پاک ہے (قال سبحنک)۔

۲۔ کس طرح ممکن ہے کہ میں ایسی بات کہوں جو میرے لیے شائستہ اور مناسب نہیں ہے (وما یکون لی ان اقول ما لیس لی بحق)۔

حقیقت میں نہ صرف اس بات کے کہنے کی وہ اپنے سے نفی کرتے ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر میں اس قسم کا کوئی حق ہی نہیں رکھتا اور اس قسم کی گفتگو میرے مرتبہ و مقام کے ساتھ ہرگز سازگار ہی نہیں۔

۳۔ اس کے بعد پروردگار عالم کے علم بے پایاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: میری گواہ یہ حقیقت ہے

کہ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے اس کا علم ضرور ہوتا کیونکہ تو اس سے بھی آگاہ ہے جو میری روح کے اندر ہے جب کہ میں اُس سے بے خبر ہوں جو تیری ذات پاک میں ہے۔ کیونکہ تو علام الغیوب ہے اور تمام رازوں اور پوشیدہ چیزوں سے باخبر ہے (ان کنت قلتہ فقد علمتہ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک انک انت علام الغیوب)[1]

۴۔ میں نے جو بات ان سے کہی ہے وہ صرف وہی تھی جس کے لیے تو نے مجھے مامور کیا تھا اور وہ یہ کہ میں انہیں تیری عبادت کی طرف دعوت دوں اور اُن سے کہوں کہ اس خدائے یگانہ کی پرستش کرو کہ جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے (ماقلت لھم الا ما امرتنی بہ ان اعبدوا اللہ ربی وربکم)۔

۵۔ اور جس وقت تک میں اُن کے درمیان رہا ان کا نگران و گواہ تھا، اور میں نے انہیں راہِ شرک اختیار نہیں کرنے دیا، لیکن جب تو نے مجھے اُن کے درمیان سے اٹھالیا تو پھر تو ہی اُن کا نگران و نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے (وکنت علیھم شھیدًا ما دمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم وانت علی کل شیٔ شھید)[2]

۶۔ ان تمام باتوں کے باوجود پھر بھی حکم تو تیرا ہی چلے گا اور جو تو چاہے گا وہی ہوگا۔ اب اگر تو انہیں ان کے اس عظیم انحراف پر سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور وہ تیری اس سزا سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکیں گے اور تیرا یہ حق تیرے نافرمان بندوں کے لیے ثابت ہے اور اگر تو انہیں بخش دے اور ان کے گناہوں کی طرف سے چشم پوشی کرے تو تو توانا و حکیم ہے نہ تو تیری بخشش ہی کمزوری کی علامت ہے اور نہ ہی تیری سزا حکمت و حساب سے خالی ہے (ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفرلھم فانک انت العزیز الحکیم)۔

## دو سوال اور ان کا جواب

۱۔ کیا عیسائیوں کی تاریخ میں کہیں دیکھا گیا ہے کہ وہ مریم کو اپنا معبود قرار دیتے ہوں۔ یا یہ کہ وہ صرف تثلیث یعنی تین خداؤں "باپ خدا" "بیٹا خدا" اور "روح القدس" کے قائل تھے اور اس میں شک نہیں ہے کہ ان کے نظریہ کے مطابق "روح القدس" "باپ خدا" اور "بیٹا خدا" کے درمیان واسطہ ہے اور وہ مریم کے علاوہ ہے۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ عیسائی حضرت مریم کو خدا تو نہیں جانتے تھے لیکن اس کے باوجود اُن کے اور ان کے مجسے کے سامنے مراسم عبادت سرانجام دیتے رہتے تھے جیسا کہ بت پرست بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے پھر بھی انہیں عبادت میں خدا کا شریک سمجھتے تھے اور زیادہ واضح الفاظ میں "اللہ" بمعنی خدا اور "اِلٰہ" بمعنی معبود میں فرق ہے، عیسائی جناب مریم کو اِلٰہ یعنی معبود جانتے تھے نہ کہ خدا۔

---

[1] یہاں پر لفظ نفس کا اطلاق روح اور جان کے معنی میں نہیں ہے بلکہ نفس کا ایک معنی ذات ہے (جیسے کہتے ہیں وہ بنفسِ نفیس آئے)۔

[2] "توفی" کے معنی کے بارے میں اور یہ کہ اس سے مراد مرنا نہیں ہے۔ سورہ آل عمران کی آیہ ۵۵ کے ذیل میں صفحہ ۳۴۱ پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ (جلد ۲ اُردو ترجمہ)۔

ایک مفسر کی تعبیر کے مطابق اگرچہ کوئی عیسائی فرقہ لفظ الٰہ اور معبود کا اطلاق جناب مریم پر نہیں کرتا بلکہ انہیں صرف خدا کی ماں سمجھتے ہیں، لیکن عملی طور پر اس کے سامنے خضوع و خشوع اور مراسم عبادت بجا لاتے ہیں، چاہے یہ نام ان کے لیے رکھیں یا نہ رکھیں۔ اس کے بعد وہ مزید کہتا ہے کہ کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ بیروت میں عیسائیوں کے مجلہ "مشرق" کے ساتویں سال کے نویں شمارے میں پاپ پیوس نہم کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر حضرت مریم کی شخصیت کے بارے میں چند قابلِ ملاحظہ مطالب منتشر ہوئے تھے اس شمارہ میں پوری صراحت کے ساتھ لکھا تھا کہ مشرقی گرجوں میں بھی مغربی گرجوں کی طرح حضرت مریم کی عبادت کی جاتی ہے۔ اسی مجلہ کے پانچویں سال کے چودھویں شمارے میں ایک مقالہ انستاس کرملی کے قلم سے لکھا ہوا درج تھا جس میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ حضرت مریم کی عبادت کے مسئلہ کے سلسلہ میں عہد عتیق اور تورات سے بھی کوئی دلیل پیدا کی جائے۔ چنانچہ وہ سانپ (شیطان) اور عورت (حوا) کی دشمنی کی داستان کو مریم کے عنوان سے تفسیر کرتا ہے۔ اس بنا پر حضرت مریم کی پرستش اور عبادت ان میں موجود ہے۔

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ ایسے الفاظ میں جس سے شفاعت کی بو آتی ہے اپنی اُمت کے مشرکین کے بارے میں کیوں گفتگو کرتے ہیں اور یہ کیوں عرض کرتے ہیں کہ اگر تو انہیں بخش دے تو تو عزیز و حکیم ہے۔

اس کے جواب میں اس نکتے کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ اگر حضرت عیسیٰؑ کا ہدف شفاعت ہوتا تو آپ یوں فرماتے کہ (انک انت الغفور الرحیم) کیونکہ خدا کا غفور و رحیم ہونا مقام شفاعت کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خدا کی عزیز و حکیم کے ساتھ توصیف کر رہے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے شفاعت اور بخشش کی درخواست منظور نہیں ہے بلکہ اس میں ہدف اصلی اپنی ذات سے ہر قسم کے اختیار کی نفی کرنا اور معاملہ کو پروردگار کے سپرد کرنا ہے یعنی یہ کام تیرے ہی ہاتھ میں ہے اگر چاہے تو بخش دے اور اگر چاہے تو سزا دے دے اگرچہ نہ تیری سزا بغیر دلیل کے ہے اور نہ ہی تیری بخشش بغیر علت و سبب کے ہے اور ہر حالت میں میری قدرت و توانائی سے تو باہر ہی ہے۔

علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے درمیان کسی گروہ نے اپنے اشتباہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے توبہ کی راہ اختیار کر لی ہو اور یہ جملہ اُس گروہ کے بارے میں ہو۔

۱۱۹۔ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۭ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

---

ؒ تفسیر المنار جلد ہفتم صفحہ ۲۶۳۔

۱۲۰۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

## ترجمہ

۱۱۹۔ خدا کہتا ہے کہ یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی فائدہ بخشے گی۔ ان کے لیے جنت کے باغات ہیں جن کے (درختوں) کے نیچے پانی کی نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، خدا اُن سے راضی و خوشنود ہوگا اور وہ خدا سے راضی اور خوشنود ہوں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

۱۲۰۔ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان تمام چیزوں کی حکومت اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

## تفسیر

### عظیم کامیابی

روزِ قیامت خداوند تعالیٰ کی حضرت عیسیٰؑ سے گفتگو جس کی تشریح گذشتہ آیات میں ہو چکی ہے کے ذکر کے بعد اس آیت میں ہم پڑھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ اس گفتگو کے بعد یوں فرماتا ہے: آج کا دن وہ دن ہے جس میں سچوں کو اُن کی سچائی فائدہ دے گی (قال الله هٰذا يوم ينفع الصّٰدقين صدقهم)۔

یقیناً اس جملے میں صدق و راستی سے مراد دنیا میں گفتار و کردار اور راستی و سچائی ہے جو آخرت میں مفید ہوگی ورنہ آخرت کی سچائی اور راستی جو کہ محل تکلیف ہی نہیں ہے وہ کوئی بھی فائدہ نہیں دے گی اس کے علاوہ اس دن کی تو حالت و کیفیت ہی ایسی ہوگی کہ کوئی شخص سچائی کے سوا کچھ اور کہہ ہی نہ سکے گا۔ یہاں تک کہ سب ہی گنہگار و خطاکار اپنے اپنے اعمال بد کا اعتراف کرلیں گے اور یوں اس دن جھوٹ بولنے کا کوئی وجود ہی نہ ہوگا۔

اس بنا پر وہ لوگ جنہوں نے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا اور اپنی رسالت کا کام انجام دیا اور سچائی اور درستی کے سوا انہوں نے اور کوئی راستہ اختیار نہیں کیا جیسے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے سچے پیرو یا باقی تمام انبیاء علیہم السلام کے سچے پیروکار کہ جو اس دنیا میں سچائی کی راہ پر گامزن ہوئے۔ وہ اپنے اعمال سے پوری طرح بہرہ مند ہوں گے۔

ضمناً اس جملے سے اجمالی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدق و راستی میں تمام نیکیوں کا خلاصہ آجاتا ہے، گفتار میں

صداقت وراستی اور عمل میں صداقت وراستی اور قیامت کے دن صرف صداقت وراستی ہی وہ سرمایہ ہے کہ جو کام آئے گا۔ اس کے علاوہ اور کچھ کام نہیں آئے گا۔

اس کے بعد سچوں کو ملنے والی جزا کے بارے میں یوں بیان کرتا ہے: ان کے لیے بہشت کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے (لہم جنٰت تجری من تحتہا الانہٰر خٰلدین فیہا ابداً)۔

اور اس مادی نعمت سے زیادہ اہم یہ ہے کہ خدا بھی ان سے راضی ہے اور وہ بھی خدا سے راضی ہیں (رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ)۔

اور اس میں شک نہیں کہ یہ عظیم نعمت جو مادی اور معنوی نعمت کی جامع ہے بہت بڑی کامیابی شمار ہوگی (ذٰلک الفوز العظیم)۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں بہشت کے باغوں کا اس کی تمام نعمتوں کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد خدا کی اپنے بندوں سے خوشنودی اور بندوں کی خدا سے خوشنودی کی نعمت کا ذکر ہے اور اس کے بعد (ذٰلک الفوز العظیم) کا جملہ ہے۔ اس سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ طرفین کی یہ رضایت وخوشنودی کس قدر اہمیت کی حامل ہے (خدا کی بندوں سے خوشنودی اور بندوں کی خدا سے خوشنودی)۔

کیونکہ عین ممکن ہے کہ انسان اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتوں میں غرق ہو لیکن جب وہ یہ احساس کرے گا کہ اس کا مولیٰ اور اس کا معبود ومحبوب اس سے ناراض ہے تو وہ تمام نعمتیں اس کی روح کے لیے تلخی اور اذیت کا سبب بن جائیں گی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کو ہر چیز میسر ہو لیکن جو کچھ اُس کے پاس ہے وہ اُس پر راضی اور قانع نہ ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ تمام نعمتیں اس کیفیت کے ساتھ اس کو خوش بخت نہیں رکھ سکتیں اور اُسے اندرونی تکلیف ہمیشہ آزار میں رکھے گی اور روحانی اطمینان جو کہ سب سے بڑی نعمت الٰہی ہے اُس سے چھین لے گی۔

علاوہ ازیں جب خدا کسی سے خوش ہوگا تو جو کچھ وہ چاہے گا خدا اُسے دے گا اور جب یہ اُس کو وہ کچھ دے دے، جو وہ چاہتا ہے، تو وہ بھی اُس سے خوش ہوگا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ خدا انسان سے خوش ہو اور وہ بھی اپنے خدا سے راضی ہو۔

آخری آیت میں آسمانوں، زمین اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے پر خدا کی حاکمیت و مالکیت کی طرف اشارہ ہوا ہے اور اس کی قدرت کی عمومیت تمام چیزوں پر بیان ہوئی ہے (للہ ملک السمٰوٰت والارض وما فیہن وھو علیٰ کل شیء قدیر)۔ یہ تذکرہ حقیقت میں خدا سے بندوں کی رضا وخوشنودی کی دلیل اور علت کے عنوان سے آیا ہے کیونکہ جو ہستی تمام چیزوں پر قدرت رکھتی ہو اور جو سراسر عالم ہستی پر حکومت رکھتی ہو وہ قدرت رکھتی ہے کہ جو کچھ اس کے بندے اس سے چاہیں وہ انہیں بخش دے اور انہیں خوشنود و راضی کرے۔

ضمنی طور پر یہ بھی ہو سکتا ہے یہاں مریم کی پرستش کے سلسلے میں عیسائیوں کے عمل کے غلط ہونے کی طرف

اشارہ ہو کیونکہ عبادت کے لائق تو صرف وہ ذات ہے جو سراسر عالم آفرینش پر حکمران ہو نہ کہ مریم جو کہ مخلوق ہونے کے علاوہ کچھ نہیں۔

---

یہاں ـــــ سورہ مائدہ ـــــ کی تفسیر اختتام کو پہنچتی ہے۔

# سُورۂ انعام

مکی سورہ ــــــــــ ۱۶۵ آیات

# سورۂ انعام

## شرک کی مختلف اقسام اور بت پرستی کے خلاف جہاد

کہا جاتا ہے کہ یہ انہتروان (۶۹) سورہ ہے جو مکہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ البتہ اس کی چند آیات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ چند آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ لیکن اُن روایات سے جو اہل بیتؑ کے طریق سے ہم تک پہنچی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی تمام آیات ایک جگہ نازل ہوئی ہیں۔ اس بنا پر وہ سب کی سب "مکی" ہوں گی۔

اس سورہ کا بنیادی ہدف اور مقصد دوسری مکی سورتوں کی طرح ہی تین اصولوں "توحید" "نبوت" اور "قیامت" کی طرف دعوت دینا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر اس میں مسئلہ توحید اور شرک و بت پرستی کے خلاف مبارزہ کیا گیا ہے اور وہ اس طور پر کہ اس سورہ کی آیات کے اہم حصے میں روئے سخن مشرکین اور بت پرستوں کی طرف ہی ہے اور اسی مناسبت سے بعض اوقات بحث کا سلسلہ مشرکین کے اعمال و کردار اور بدعات تک پہنچ جاتا ہے۔

بہر حال اس سورہ کی آیات میں تدبر و تفکر جو انتہائی جاندار اور واضح و روشن دلائل پر مشتمل ہے، انسان کے اندر روح توحید و خدا پرستی کو زندہ کرتا ہے اور شرک کی بنیادوں کو اکھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ شاید اسی معنوی وابستگی اور مسئلہ توحید کی باقی سب مسائل پر اولیت کی بنا پر ہی اس سورہ کی تمام آیات یکجائی طور پر ایک ہی دفعہ نازل ہوئی ہیں۔

اور وہ روایات جو اس سورہ کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس امر کے سبب سے ہی ہیں ہم بارہا پڑھتے ہیں کہ سورہ انعام کے نزول کے وقت ستر ہزار فرشتے اسے لے کر نازل ہوئے تھے، اور جو شخص اس سورہ کو پڑھے (اور اس کے سائے میں اس کی روح و جان سرچشمۂ توحید سے سیراب ہو) تو وہ تمام فرشتے اس کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس سورہ کی آیات میں غور و فکر کرنا مسلمانوں میں سے روح نفاق و پراگندگی کو نکال باہر کرے اور کانوں کو سننے والا آنکھوں کو دیکھنے والا اور دلوں کو دانا بنا دے۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض لوگ اس سورہ سے صرف اس کے الفاظ کے پڑھنے پر قناعت کرتے ہیں اور اپنی ذاتی اور خاص مشکلات کے حل کے لیے طویل و عریض تقریبات اور نشستیں منعقد کرتے ہیں جنہیں "ختم انعام" کے نام سے یاد کرتے ہیں مسلمہ طور پر اگر ان تقریبات میں سورہ کے مضامین میں غور و فکر کیا جائے تو نہ صرف مسلمانوں کی شخصی و ذاتی مشکلات حل ہوں گی بلکہ ان کی عمومی مشکلات بھی حل ہو جائیں گی۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ قرآن کو ایک ایسے سلسلہ اوراد کے طور سے دیکھتے ہیں کہ جس میں ایسی خاصیتیں پائی جاتی ہیں جو رازی راز ہیں اور کسی کو معلوم نہیں ہیں اور اس کے الفاظ کو پڑھنے کے علاوہ کچھ بھی تو غور نہیں کرتے۔ حالانکہ قرآن سارے

کا سارا سبق ہے اور مدرسہ، ایک پروگرام ہے اور بیداری، ایک رسالت ہے اور علم آگہی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوۡرَ ۬ؕ ثُمَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّہِمۡ یَعۡدِلُوۡنَ ○

۲۔ ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ طِیۡنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنۡدَہٗ ثُمَّ اَنۡتُمۡ تَمۡتَرُوۡنَ ○

## ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ حمد و ستائش اُس خدا کے لیے ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور نور کو ایجاد کیا لیکن کافر خدا کے لیے شریک و شبیہ قرار دیتے ہیں حالانکہ اس کی توحید اور یکتائی کی دلیلیں تخلیق کائنات میں ظاہر و عیاں ہیں۔

۲۔ وہ وہی ذات ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر اُس نے ایک مدت مقرر کی (تاکہ انسان درجہ کمال کو پہنچ جائے) اور حتمی اجل اسی کے پاس ہے (اور وہ اس سے آگاہ ہے) اس کے باوجود تم (مشرک لوگ اس کی توحید و یکتائی یا اس کی قدرت میں) شک و شبہ رکھتے ہو اور اس کا انکار کرتے ہو۔

## تفسیر

اس سورہ کا خداوند تعالیٰ کی حمد و ستائش کے ساتھ آغاز ہوا ہے۔

پہلے عالم کبیر (آسمان و زمین) اور ان کے نظاموں کی پیدائش کے طریق سے اور اس کے بعد عالم صغیر یعنی انسان کی آفرینش کے راستے سے لوگوں کو اصل توحید کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ پہلے کہتا ہے: حمد و سپاس اُس خدا کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا (الحمد للہ الذی خلق السمٰوٰت و الارض)۔

وہ خدا جو نور و ظلمت دونوں کا مبدا ہے، دو خداؤں کی پرستش کا عقیدہ رکھنے والوں کے نظریے کے برخلاف وہی تنہا تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ وجعل الظلمات و النور) لیکن مشرکین و کفار بجائے اس کے کہ اس نظام احد سے توحید

کا حق حاصل کریں اپنے پروردگار کے لیے شریک و شبیہ قرار دیتے ہیں ( ثم الذین کفروا بربھم یعدلون )[1]۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ مشرکین کے عقیدہ کو لفظ "ثم" کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جو کہ لغت عرب میں (ترتیب یا فاصلہ کے لیے) بولا جاتا ہے، اور اس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ ابتدا میں تمام نوع بشر میں توحید ایک اصل فطری اور عقیدہ عمومی کی حیثیت سے موجود تھی اور شرک بعد میں اس اصل فطری سے ایک انحراف کی صورت میں پیدا ہوا۔

اس بارے میں کہ آسمان و زمین کی پیدائش کے سلسلہ میں لفظ "خلق" اور نور و ظلمت کے بارے میں لفظ "جعل" کیوں استعمال کیا گیا ہے، مفسرین نے طرح طرح کے خیالات ظاہر کیے ہیں، لیکن وہ بات جو ذہن سے قریب تر معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ خلقت کسی چیز کے اصل وجود کے بارے میں ہے اور جعل ان خواص و آثار و کیفیات کے بارے میں ہوتا ہے جو اس کے بعد وجود پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ نور و ظلمت تبعی پہلو رکھتے ہیں اس لیے انہیں جعل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے ایک حدیث اس آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

یہ آیت حقیقت میں تین قسم کے انحراف کرنے والے گروہوں کو جواب دے رہی ہے۔ پہلا گروہ مادہ پرستوں کا ہے جو دنیا کو ازلی "قدیمی" سمجھتے تھے اور خلق و آفرینش کے منکر تھے۔ دوسرا گروہ دو خداؤں کی پرستش کرنے والوں کا ہے جو نور و ظلمت کو دو مستقل مبدا قرار دیتے تھے۔ تیسرا گروہ مشرکین عرب کا ہے، جو خدا کے لیے شریک و شبیہ کے قائل تھے۔ یہ ان کا رد بھی ہے[2]۔

## کیا تاریکی بھی مخلوقات میں سے ہے

اوپر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح نور خدا کی مخلوق ہے اسی طرح ظلمت بھی اس کی مخلوق ہے، حالانکہ فلاسفہ اور علم طبیعات (PHYSICS) کے علماء میں یہ مشہور ہے کہ "ظلمت" "عدم نور" کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ معدوم کو مخلوق کا نام نہیں دیا جا سکتا اس بنا پر زیر بحث آیت میں ظلمت کو کس طرح خدا کی مخلوق شمار کیا گیا ہے۔

اس سوال کے جواب میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ظلمت ہمیشہ ظلمت مطلقہ کے معنی میں نہیں ہوتی۔ بلکہ زیادہ تر فراواں قوی نور کے مقابلے میں بہت کم اور ضعیف نور کے لیے بھی ظلمت کا لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً ہم سب کہتے ہیں "تاریک رات" حالانکہ یہ بات مسلم ہے کہ رات میں ظلمت مطلقہ نہیں ہوتی۔ بلکہ رات کی تاریکی ہمیشہ کم رنگ ستاروں کے نور کی آمیزش

---

[1] یعدلون، مادہ عدل (بروزن حفظ) سے ہے جس کے معنی مساوی اور ہم وزن کے ہیں اور یہاں شریک و شبیہ کا قائل ہونے کے معنی میں ہے۔

[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۰۱۔

رکھتی ہے یا دوسرے منابع نور سے لی ہوئی ہوتی ہے اس بنا پر آیت کا معنی و مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے تمہارے لیے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی قرار دی ہے کہ جن میں سے ایک کا نور بہت قوی ہے اور دوسرے کا نور بہت کمزور ہے اور یہ بات واضح و بدیہی ہے کہ اس قسم کی ظلمت مخلوق خدا میں سے ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ توضیح ہے کہ ظلمت مطلقہ ایک ایسا امر ہے جسے عدم کہا جاتا ہے لیکن کوئی بھی امر معدوم جب مخصوص حالات میں واقع ہو تو حتماً اور یقیناً اس عدم کا سرچشمہ ایک امر وجودی ہی ہوتا ہے۔ یعنی وہ چیز جو ظلمت مطلقہ کو مخصوص حالات میں معین اہداف و مقاصد کے لیے وجود میں لاتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وسائل وجودی سے استفادہ کرے۔ مثلاً ہم چاہتے ہیں کہ ایک مخصوص وقت کے لیے کمرے کو ایک عکس ظاہر کرنے کے لیے تاریک کریں، تو اس کے لیے ہم مجبور ہیں کہ کسی تدبیر سے نور کو روکیں تاکہ اس معین وقت میں تاریکی پیدا ہو جائے تو ایسی ظلمت مخلوق ہے (مخلوق بالتبع) اور اصطلاحی طور پر اگرچہ عدم مطلق مخلوق نہیں ہے لیکن عدم خاص وجود ہی کا ایک حصہ ہے اور وہ مخلوق ہے۔

## نور رمز وحدت ہے اور ظلمت رمز پراگندگی

ایک دوسرا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ یہ آیات قرآن میں نور صیغہ مفرد کے ساتھ ہے اور ظلمت جمع کی صورت میں (ظلمات)۔

ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ ظلمت (خواہ حسی ہو یا معنوی) ہمیشہ پراگندگیوں، جدائیوں اور دوریوں کا سرچشمہ ہوتی ہے جبکہ نور رمز وحدت و اجتماع ہے۔

ہم نے اکثر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہم گرمی کی کسی رات میں صحن کے درمیان یا بیابان کے اندر ایک چراغ روشن کرتے ہیں تو ہر قسم کے جانور تھوڑی سی دیر میں اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور واقعی زندگی مختلف صورتوں میں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن جب ہم اس "چراغ" کو بجھا دیتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کسی طرف چل دیتا ہے اور سب پراگندہ اور منتشر ہو جاتے ہیں۔ اجتماعی اور معنوی مسائل میں بھی یہی صورت ہے۔ علم، قرآن اور ایمان کا نور سرمایہ وحدت ہے اور جہل، کفر اور نفاق کی تاریکی پراگندگی کا سبب ہے۔

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورۃ خدا پرستی اور توحید کی بنیادوں کو دلوں میں مستحکم کرنے کے لیے پہلے انسان کو عالم کبیر کی طرف متوجہ کرتی ہے اور بعد والی آیت میں عالم صغیر یعنی انسان کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ اس سلسلے میں انتہائی حیرت انگیز مسئلہ یعنی اس کی خاک اور گیلی مٹی سے پیدائش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ وہی خدا ہے جس نے تمہیں گیلی مٹی سے پیدا کیا (ھو الذی خلقکم من طین)۔

یہ صحیح ہے کہ ہماری خلقت ہمارے ماں باپ سے ہوئی ہے نہ کہ خاک سے لیکن چونکہ سب سے پہلے انسان کی پیدائش خاک اور گیلی مٹی سے ہوئی تھی لہٰذا ہمیں اسی طرح خطاب کرنا درست ہے۔

اس کے بعد انسان کی عمر کے کمال کو پہنچنے کے مراحل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، اس کے بعد ایک مدت

مقرر کی کہ جس میں انسان روئے زمین میں پرورش پاکر کمال کو پہنچے (ثم قضی اجلا)۔

اجل اصل میں "مدت معین" کے معنی میں ہے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آخری وقت یا موقع کو بھی اجل کہا جاتا ہے، مثلاً کہتے ہیں کہ اجل دین آپہنچا یعنی قرض کی ادائیگی کا وقت آخر آپہنچا ہے۔ یہ جو موت کے آجانے کو اجل کہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انسان کی عمر کا آخری لمحہ اس موقع پر ہوتا ہے۔

اس کے بعد اس بحث کی تکمیل کے لیے قرآن کہتا ہے: اجل مسمی خدا کے پاس ہے (واجل مسمی عندہ)۔

اس کے بعد کہتا ہے: تم مشرک لوگ اس پیدا کرنے والے کے بارے میں کہ جس نے انسان کو بے قدر وقیمت اور حقیر چیز یعنی گیلی مٹی سے پیدا کیا ہے اور تمہیں ایسے ایسے حیرت انگیز مرحلوں سے گزارا ہے، شک کرتے ہو اور انکار کا راستہ اختیار کرتے ہو۔ تم نے بتوں جیسی حقیر مخلوق کو خدا کا ہم پلہ قرار دے لیا ہے یا تم مردوں کے زندہ کرنے اور قیامت کے برپا کرنے کے بارے میں خداوند تعالیٰ کی قدرت میں شک و شبہ رکھتے ہو (ثم انتم تمترون)۔

## اجل مسمی کیا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ لفظ "اجل مسمی" اور "اجلاً" آیت میں دو الگ الگ معانی کے لیے ہے اور یہ جو بعض نے دونوں کو ایک ہی معنی میں لیا ہے تو یہ لفظ "اجل" کے تکرار کے ساتھ، خصوصاً دوسری مرتبہ "مسمی" کے ہوتے ہوئے کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

اسی لیے مفسرین نے ان دونوں کے فرق کے بارے میں کئی بحثیں کی ہیں لیکن جو کچھ قرآن کریم کی دوسری تمام آیات کے قرینے سے اور اسی طرح اُن روایات سے جو اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا فرق اس بات میں ہے کہ جب "اجل" اکیلا ہو تو یہ غیر حتمی عمر، مدت اور وقت کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور "اجل مسمی" حتمی عمر اور معین مدت کے معنی میں ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں "اجل مسمی" طبیعی موت کو کہتے ہیں اور "اجل" وقت سے پہلے آنے والی موت ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ بہت سی موجودات اپنی طبعی و فطری ساخت اور ذاتی استعداد و قابلیت کے مطابق ایک طولانی مدت تک باقی رہ سکتی ہیں لیکن یہ بات بھی ممکن ہے کہ اس مدت کے دوران کچھ ایسی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں جو انہیں ان کی آخری عمر طبیعی تک پہنچنے سے روک دیں، مثلاً ایک تیل سے جلنے والا چراغ، اس کے تیل کی مقدار کے پیش نظر ممکن ہے کہ بیس گھنٹے روشنی دینے کی استعداد رکھتا ہو، لیکن ایک آندھی کا جھونکا یا پانی کا چھینٹا یا اس کی نگہداشت نہ کرنا اس کی کوتاہ عمری کا سبب بن جائے۔

اگر چراغ کو کسی ایسی رکاوٹ کا سامنا نہ ہو اور تیل کے آخری قطرے تک جلتا ہوا خاموش ہو جائے تو وہ اپنی حتمی اجل کو پہنچ گیا ہے اور اگر اس سے پہلے ہی کچھ رکاوٹیں چراغ کی خاموشی کا سبب بن جائیں تو اس کی عمر کی مدت کو "اجل غیر حتمی" کہیں گے۔

ایک انسان کے بارے میں بھی معاملہ اسی طرح ہے۔ اگر اس کی بقا کے لیے تمام شرائط جمع ہوں اور موانع برطرف ہوں تو اس کی ساخت اور استعداد اس بات کی متقضی ہوگی کہ وہ ایک طولانی مدت تک زندگی بسر کرے، اگرچہ اس مدت نے آخرکار ختم ہو جانا ہے اور اس کی ایک حد ضرور ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ غذا میں بد پرہیزی کے اثر سے یا مختلف چیزوں کی عادت میں مبتلا ہونے یا خودکشی کرنے یا کچھ گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے اس مدت سے بہت پہلے ہی مر جائے تو موت کی پہلی صورت کو "اجل مسمی" اور دوسری صورت کو اجل غیر حتمی کہتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں حتمی اجل اس صورت میں ہے جب ہم تمام علل واسباب پر نظر رکھیں اور اجل غیر حتمی اس صورت میں ہے جب صرف متقضیات کی طرف دیکھیں۔ اس دونوں طرح کی اجل کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سے مطالب واضح ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ کہ ہم روایات میں پڑھتے ہیں کہ صلۂ رحمی عمر کو زیادہ اور قطع رحمی عمر کو کم کر دیتی ہے (یہاں عمر اور اجل سے مراد غیر حتمی اجل ہے)۔

ایک آیت میں ہے کہ:

"فاذا جاء اجلهم لا يستأخرون ساعة و لا يستقدمون"

جب انکی (موت) اجل آجاتی ہے تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکتی ہے اور نہ آگے۔[1]

تو یہاں اجل سے مراد وہی حتمی موت ہے۔

اس بنا پر یہ آیت اس موقع سے مربوط ہے جب انسان اپنی آخری عمر کو پہنچ گیا ہو۔ لیکن جو موتیں جو قبل از وقت واقع ہو جائیں ان پر اس آیت کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

اور ہر صورت میں اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ دونوں اجلیں خدا ہی کی طرف سے معین ہوتی ہیں، ایک مطلق طور پر اور دوسری مشروط اور معلق طریقے سے، بالکل اسی طرح جیسے کہ ہم کہتے ہیں کہ چراغ بیس گھنٹوں کے بعد بلا شرط خاموش ہو جائے گا، اور یہ بھی ہم کہہ دیتے ہیں کہ اگر آندھی چل پڑی تو دو ہی گھنٹوں کے بعد بجھ جائے گا۔ یہ بات انسانی قوموں اور ملتوں کے بارے میں بھی اسی طرح ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص یا فلاں قوم فلاں مقدار عمر کے بعد قطعی ویقینی طور پر ختم ہو جائے گی اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وہ ظلم وستم، نفاق واختلاف، اور سہل انگاری وسستی اختیار کریں گے تو اس مدت کے ایک تہائی عرصے میں ہی ختم ہو جائے گی۔ دونوں اجلیں خدا کی طرف سے ہیں ایک مطلق ہے اور دوسری مشروط۔

امام صادق علیہ السلام سے اوپر والی آیت کے ذیل میں اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"هما اجلان اجل محتوم و اجل موقوف"

یہ دو قسم کی اجلوں کی طرف اشارہ ہے، اجل حتمی اور اجل مشروط۔

دوسری احادیث میں جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں اس بات کی تصریح ہو گئی ہے کہ اجل غیر حتمی (مشروط) آگے

---

[1] اعراف آیہ ۳۴۔

پیچھے ہو سکتی ہے لیکن اجلِ حتمی قابلِ تغیر نہیں ہے[1]

۳۔ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝

## ترجمہ

۳۔ اور آسمانوں اور زمین میں خدا تو وہی ہے جو تمہاری پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے اور آشکار کو بھی اور جو کچھ تم (انجام دیتے ہو اور) کسب کرتے ہو اس سے بھی باخبر ہے۔

## تفسیر

اس آیت میں توحید اور خداوند تعالیٰ کی یگانگی کے سلسلے میں گذشتہ بحث کی تکمیل کی گئی ہے اور اُن لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو موجودات کی ہر نوع کے لیے علیحدہ علیحدہ خداؤں کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ بارش کا خدا، جنگ کا خدا، صلح کا خدا، آسمان کا خدا وغیرہ وغیرہ۔ کہتا ہے، وہی ہے وہ خدا کہ جس کی الوہیت تمام آسمانوں اور زمین پر حکومت کرتی ہے ــــ (وھو اللّٰہ فی السّمٰوٰت و فی الارض)[2]

یعنی اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ تمام چیزوں کا خالق وہی ہے تو ان سب کا مدبر و مدیر بھی وہی ہوگا، کیونکہ زمانہ جاہلیت میں مشرکین بھی خالق اور آفریدگار اللہ ہی کو جانتے تھے لیکن تدبیر و تصرف بتوں کے ہاتھ سمجھتے تھے۔

آیت انہیں جواب دیتی ہے کہ جو ذات خالق ہے تمام چیزوں میں تدبیر و تصرف بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ خداوند تعالیٰ ہر جگہ حاضر ہے، آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی اور کوئی جگہ اُس سے خالی نہیں ہے یہ بات نہیں ہے کہ وہ جسم ہے یا اُس کا کوئی مکان ہے بلکہ وہ تمام جگہوں پر احاطہ رکھتا ہے۔

یہ بات ضروری ہے کہ جو ہر جگہ حکومت کرتا ہو اور ہر چیز کی تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہو اور وہ ہر جگہ حاضر ہو، وہ تمام اسرار اور پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے لہٰذا بعد والے جملے میں کہتا ہے کہ: ایسا خدا وہی ہے جو تمہارے پوشیدہ اور آشکار امور کو جانتا ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو اس سے بھی باخبر ہے (یعلم سرکم وجھرکم ویعلم ماتکسبون)۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ "سر" و "جھر" آیت میں انسانوں کے اعمال اور ان کی نیتوں پر بھی محیط ہے اس بناء پر

---

[1] نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۷۰۰۔

[2] اس جملے کی ترکیب کے سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ "ھو" مبتدا ہے اور "اللّٰہ" خبر ہے اور "فی السمٰوٰت ..." کا جار مجرور اس فعل سے متعلق ہے جو لفظ اللہ سے سمجھا جاتا ہے اور حقیقت میں جملے کا معنی اس طرح ہے: "ھو المتفرد فی السمٰوٰت بالالوھیۃ"

"ماتکسبون" (جو کچھ انجام دیتے ہو) کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ کسب و عمل کے نتیجوں اور روحانی حالت کے معنی میں اچھے اور بُرے اعمال کا حاصل ہے۔ یعنی وہ تمہارے اعمال اور نیتوں سے بھی باخبر ہے اور اُن کے اثرات سے بھی جو یہ اعمال تمہاری روح میں پیدا کرتے ہیں۔ بہرحال اس جگہ کا ذکر انسانوں کے اعمال کے سلسلہ میں تاکید کے لیے ہوا ہے۔

۴۔ وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ○

۵۔ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ○

## ترجمہ

۴۔ کوئی نشانی اور آیات خدا میں سے کوئی آیت اُن تک نہیں پہنچی مگر یہ کہ وہ اُس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

۵۔ انہوں نے حق کا انکار کر دیا جب کہ وہ ان کی طرف آیا، لیکن جس بات کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے بہت جلد انہیں اس کی اطلاع مل جائے گی اور وہ اپنے اعمال کے نتائج سے آگاہ ہو جائیں گے۔

## تفسیر

ہم بیان کر چکے ہیں کہ سورہ انعام میں زیادہ تر روئے سخن مشرکین کی طرف ہے اور قرآن مجید ان کی بیداری اور آگاہی کے لیے طرح طرح کے وسائل و ذرائع سے کام لیتا ہے۔ یہ آیت اور بہت سی دوسری آیات جو اس کے بعد آئیں گی اسی موضوع سے متعلق ہیں۔

اس آیت میں حق اور خدائی نشانیوں کے مقابلے میں مشرکین کے تکبر، لاپرواہی اور ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، وہ ایسے ہٹ دھرم اور لاپرواہ ہیں کہ پروردگار کی نشانیوں میں سے جس نشانی کو بھی دیکھتے ہیں فوراً اس سے منہ پھیر لیتے ہیں (وما تأتیهم من آیة من آیٰت ربهم الا کانوا عنها معرضین)[1]

---

[1] یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ لفظ "آیة" نکرہ سیاق نفی میں ہے لہٰذا عمومیت کا فائدہ دے گا یعنی وہ کسی بھی آیت اور کسی بھی نشانی کے مقابلے میں نہیں ٹھہرتے اور اس کا مطالعہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

یعنی ہدایت وراہ یابی کی سب سے پہلی شرط ہی جو کہ تحقیق وجستجو ہے ان میں موجود نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ حق کو حاصل کرنے کا جوش وولولہ اور عشق اُن میں موجود نہیں ہے، کہ وہ ان پیاسوں کی طرح جو پانی کے پیچھے دوڑتے ہیں حق کی تلاش میں ہوں، بلکہ اگر صاف وشفاف پانی کا چشمہ بھی ان کے گھر کے سامنے جوش مارنے لگے، تو وہ اس کی طرف سے منہ پھیرلیں اور بالکل اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ خواہ یہ آیات ان کے پروردگار کی طرف سے ہی کیوں نہ ہوں (دقت فرمائیں) اوران کی تربیت وتکامل کے لیے ہی کیوں نہ نازل ہوئی ہوں۔

یہ صورت زمانہ جاہلیت اور مشرکین عرب میں ہی منحصر نہیں، اب بھی ہم بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جو ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ گئے ہیں لیکن وہ خدا اور مذہب کے بارے میں تحقیق وجستجو کرنے کی ایک لمحہ کے لیے بھی زحمت اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں یہ تو معمولی بات ہے اگر اتفاق سے کوئی کتاب یا تحریر اس سلسلے کی ان کے ہاتھ میں آجائے تو اس کی طرف نگاہ تک نہیں کرتے، اور اگر کوئی شخص اس بارے میں اُن سے گفتگو کرے تو وہ سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ ہٹ دھرم جاہل اور بے خبر لوگ ہیں جو ممکن ہے بعض اوقات عالم کے لباس میں ملبوس ہوں۔

اس کے بعد ان کے اس عمل کے نتیجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے اس کی تکذیب کی حالانکہ اگر وہ پروردگار کی آیات اور نشانیوں میں غور وفکر کرتے تو وہ حق کو اچھی طرح سے دیکھ لیتے اور پہچان لیتے اور اُسے باور کرلیتے (فقد کذبوا بالحق لما جاء ھم) اور اس تکذیب اور جھٹلانے کا نتیجہ وہ بہت جلدی پالیں گے اور اس کی خبر کہ جس کا انہوں نے مذاق اڑایا تھا اُن تک پہنچ جائے گی (فسوف یأتیھم انبٰؤا ما کانوا بہ یستھزءون)۔

اوپر والی آیات میں درحقیقت کفر کے تین مراحل کی طرف اشارہ ہوا ہے جن میں ہر مرحلہ بہ مرحلہ شدت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ پہلا مرحلہ اعراض وروگردانی کا ہے اس کے بعد تکذیب اور جھٹلانے کا مرحلہ ہے اور بعد میں حقائق اور آیاتِ خدا کے استہزاء تمسخر اور مذاق اڑانے کا مرحلہ ہے۔

یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان کفر کی راہ میں کسی ایک مرحلہ پر رکتا نہیں ہے، بلکہ جس قدر وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کی شدت انکار، عداوت، حق سے دشمنی اور خدا سے بیگانگی میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔

آیت کے آخر میں جو تہدید کی گئی ہے اس سے منظور یہ ہے کہ آئندہ چل کر جلدی یا بدیر بے ایمانی کا بُرا انجام دنیا اور آخرت میں ان کا دامن پکڑے گا۔ بعد کی آیات بھی اس تفسیر کی گواہ اور شاہد ہیں۔

۶۔ اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَبْلِھِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَکِّنْ لَّکُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْھِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّجَعَلْنَا الْاَنْھٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھِمْ فَاَھْلَکْنٰھُمْ بِذُنُوْبِھِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ

بَعۡدِهِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِيۡنَ ○

## ترجمہ

۶۔ کیا انہوں نے دیکھا نہیں ہے کہ ہم نے کتنی گذشتہ اقوام کو ہلاک کیا ہے وہ قومیں کہ (جو تم سے کہیں زیادہ طاقتور تھیں اور) جنہیں ہم نے ایسی توانائیاں عطا کی تھیں جو تمہیں نہیں دی ہیں، ہم نے ان کی طرف پے در پے بارشیں بھیجیں اور ان کی (آبادیوں) کے نیچے نہریں جاری کیں (لیکن جب انہوں نے سرکشی اور طغیانی کی تو) ہم نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا، اور ان کے بعد ہم دوسری قوم کو وجود میں لے آئے۔

## تفسیر

### سرکشی کرنے والوں کی سرگذشت

اس آیت کے بعد قرآن بت پرستوں اور مشرکین کو بیدار کرنے کے لیے شرک و بت پرستی کے مختلف محرکات کی مناسبت سے ایک مرحلہ وار تربیتی پروگرام پیش کرتا ہے پہلے تو عامل غرور کو ختم کرنے کے لیے کہ جو طغیان و سرکشی کے اہم عوامل میں سے ایک عامل ہے کام کا آغاز کرتا ہے اور اقوام گذشتہ کی کیفیت اور ان کے دردناک انجام کی یاددہانی کرانے کے ساتھ ان افراد کو کہ جن کی آنکھوں کے اوپر غرور کا پردہ پڑا ہوا ہے تنبیہ کرتے ہوئے کہتا ہے: کیا انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم نے کیسی کیسی قومیں ان سے پہلے ہلاک کر دیں وہ ایسی قومیں تھیں جنہیں ہم نے روئے زمین کی وہ توانائیاں دے رکھی تھیں جو تمہارے اختیار میں نہیں دیں (الم یروا کم اھلکنا من قبلھم من قرن مکنٰھم فی الارض مالم نمکن لکم) ان میں سے ایک یہ ہے کہ: ہم نے ان کے لیے یکے بعد دیگرے برکت والی بارشیں بھیجیں (وارسلنا السماء علیھم مدرارا[1])۔

اور دوسرا یہ ہے کہ جاری پانی کی نہریں ان کی آبادیوں کے نیچے جاری کی ہیں اور ان کے اختیار میں دی ہیں وجعلنا الانھٰر تجری من تحتھم)۔

لیکن جب انہوں نے سرکشی کا راستہ اختیار کر لیا تو ان امکانات میں سے کوئی چیز بھی انہیں خدائی سزا سے نہ بچا سکی اور ہم نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے نیست و نابود کر دیا (فاھلکنٰھم بذنوبھم)۔

---

[1] مدرار - اصل میں "در" کے مادہ سے ہے جس کا معنی دودھ ہے۔ بعد میں دوسری بہنے والی چیزوں مثلاً بارش کے برسنے پر بھی بولا جانے لگا اور مدرار مبالغہ کا صیغہ ہے اور ارسلنا السماء حقیقت میں زیادہ مبالغے کے لیے ہے۔

ان کے بعد ہم دوسری قوموں کو ان کی جگہ لے آئے (و انشأنا من بعدھم قرنا آخرین)۔

کیا گذشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ ان کے لیے باعث عبرت نہیں ہونا چاہیے اور انہیں خواب غفلت سے بیدار اور مستی غرور سے ہوشیار نہیں ہو جانا چاہیے۔ کیا وہ خدا جس نے گذشتہ لوگوں کے لیے یہ عمل کیا ہے، یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہی ان کے ساتھ بھی کرے؟

## چند اہم نکات

۱۔ "قرن" اگرچہ عموماً طویل زمانہ کے معنی میں (مثلاً سو سال، ستر سال یا تیس سال کے لیے) آیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی جیسا کہ اہل لغت نے تصریح کی ہے ایسی جمعیت اور قوم کو بھی کہا جاتا ہے کہ جو ایک ہی زمانے میں موجود رہی ہو۔ اصولی طور پر قرن مادہ اقتران سے ہے اور نزدیکی کے معنی دیتا ہے اور چونکہ معصر واحد اور قریب والے زمانے کے لوگ ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں لہٰذا انہیں بھی اور ان کے زمانے کو بھی قرن کہا جاتا ہے۔

۲۔ قرآن کریم کی آیات میں بارہا اس امر کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ مادی وسائل کی فراوانی کم ظرف افراد کے غرور و غفلت کا باعث بن جاتی ہے، کیونکہ وہ ان چیزوں کی اپنے پاس موجودگی کی صورت میں اپنے آپ کو پروردگارِ عالم کی طرف سے بے نیاز سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ وہ اس بات کی طرف سے غافل ہوتے ہیں کہ اگر ہر ہر لحظہ کے لیے اور ہر ہر ثانیہ کے لیے خداوند تعالیٰ کی کمک اور امداد ان تک نہ پہنچے تو وہ نابود ہو جائیں اور بالکل ختم ہو جائیں جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی"

انسان طغیان و سرکشی کرتا ہے جب وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے[1]

۳۔ یہ تنبیہ صرف بت پرستوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ قرآن آج بھی اس مشینی دور کی سرمایہ دار دنیا کو بھی کہ جو وسائل زندگی فراہم ہونے کی وجہ سے بادۂ غرور سے سرمست ہو چکی ہے تنبیہ کرتا ہے کہ وہ گزرے ہوئے لوگوں کی حالت کو فراموش نہ کرے کہ وہ گناہوں کے اثر سے کس طرح تمام چیزوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، ہو سکتا ہے کہ تم بھی ایک اور عالمی جنگ کی ایک چنگاری سے سب کچھ ہاتھ سے دے بیٹھو اور اپنے صنعتی تمدن سے پہلے والے زمانے کی طرف پلٹ جاؤ۔ تمہیں اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ ان کی بدبختی کا سبب گناہ، ظلم و ستم، ناانصافی اور عدم ایمان کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی۔ یہی کچھ تمہارے معاشرے میں بھی آشکار ہو چکا ہے۔

حقیقتاً فراعنۂ مصر، ملوک سبا، سلاطین کلدہ و آشور اور قیصران روم کی تاریخ اور ان کی بے حساب ناز و نعمت اور اس افسانوی زندگی کا مطالعہ اور اس کے بعد اس دردناک انجام کا مطالعہ کہ کس طرح ان کے ظلم اور کفر نے ان کی

---

[1] علق۔ آیہ ۶ و ۷۔

زندگی کے دفتر کو لپیٹ کر رکھ دیا، ہر شخص کے لیے اور ہم سب کے لیے ایک عظیم اور واضح درس عبرت ہے۔

۷۔ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ○

## ترجمہ

۷۔ اگر ہم کاغذ پر (لکھی ہوئی کوئی) کتاب تجھ پر نازل کرتے اور وہ (دیکھنے کے علاوہ) اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے بھی تو پھر بھی کفار یہی کہتے کہ یہ تو کھلے جادو کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

## تفسیر

### ہٹ دھرمی کا آخری درجہ

ان کے انحراف کے اسباب میں سے دوسری چیز تکبر اور ہٹ دھرمی ہے کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ کیونکہ عام طور پر متکبر لوگ ہی ہٹ دھرم ہوتے ہیں، کیونکہ تکبر انہیں حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہی بات ان کی ہٹ دھرمی کا سبب بن جاتی ہے، اور وہ ہر واضح دلیل اور روشن برہان کا اسی طرح سے انکار کرتے ہیں خواہ ان کا وہ انکار بدیہیات کے انکار تک پہنچ جائے، جیسا کہ ہم نے بارہا خود اپنی آنکھوں سے متکبر اور خود خواہ افراد میں اس بات کا مشاہدہ کیا ہے۔

قرآن اس مقام پر بعض بت پرستوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نضر بن حارث، عبداللہ بن ابی امیہ اور نوفل بن خویلد تھے انہوں نے پیغمبر سے یہ کہا تھا کہ ہم صرف اس صورت میں ایمان لائیں گے جب خدا کی طرف سے چار فرشتوں کے ساتھ ہم پر خط نازل ہوگا۔ قرآن کہتا ہے: اگر اسی طرح جیسا کہ ان کا مطالبہ ہے کسی کاغذ کے صفحہ پر ہی کوئی تحریر یا اس کی مانند ہی کوئی اور چیز تم پر نازل کردیں اور مشاہدہ کرنے کے علاوہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے چھوئیں بھی پھر بھی وہ یہی کہیں گے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے (ولو نزلنا علیک کتابا فی قرطاس فلمسوہ بایدیھم لقال الذین کفروا ان ھٰذا الا سحر مبین)۔

یعنی ان کی ہٹ دھرمی کا دائرہ اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ وہ روشن ترین محسوسات کا بھی یعنی ان باتوں کا بھی جو دیکھنے اور چھونے سے معلوم ہو سکتی ہیں انکار کر دیتے ہیں اور جادو کا بہانہ کرکے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے روگرداں ہو جاتے ہیں، حالانکہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں حقائق کے ثبوت کے لیے ان نشانیوں کے دسویں حصہ پر ہی قناعت کر لیتے ہیں اور اسے ہی قطعی اور مسلم جان لیتے ہیں۔ یہ بات صرف اس وجہ سے ہے کہ خود خواہی، تکبر اور شدید ہٹ دھرمی نے ان کی روح پر سایہ

ڈال رکھا ہے۔

ضمنی طور پر اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ "قرطاس" کا معنی ہر وہ چیز ہے کہ جس پر لکھتے ہیں خواہ وہ چیز کاغذ ہو یا چمڑا یا تختیاں آج قرطاس صرف کاغذ کو کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جن چیزوں پر لکھا جاتا ہے اُن میں سے کاغذ کا ہی سب سے زیادہ رواج ہے۔

۸۔ وَقَالُوا لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ○

۹۔ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ○

۱۰۔ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ○

## ترجمہ

۸۔ انہوں نے کہا کہ اس کے اُوپر کوئی فرشتہ کیوں نہ نازل ہوا (تاکہ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دینے میں اس کی مدد کرتا) لیکن اگر ہم کوئی فرشتہ بھیج دیتے (اور اصل امر محسوس طور پر مشاہدہ میں آجاتا) تو پھر تو معاملہ ہی صاف ہو جاتا (اور ایسی صورت میں اگر وہ مخالفت کریں گے) تو پھر انہیں مہلت نہیں دی جائے گی (اور وہ سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے)۔

۹۔ اور اگر اُسے فرشتہ قرار دیتے تو یقیناً اُسے بھی ایک مرد کی صورت میں ہی لاتے پھر بھی (ان کے خیال کے مطابق تو) ہم معاملہ کو ان پر مشتبہ ہی چھوڑ دیتے جیسے وہ دوسروں پر معاملہ مشتبہ بناتے ہیں۔

۱۰۔ (اس حالت سے پریشان نہ ہو) تجھ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا تھا لیکن آخر کار جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی نے ان کے دامن کو پکڑ لیا (اور ان پر عذاب الٰہی نازل ہو گیا)۔

---

# تفسیر

## بہانہ تراشیاں

کفر اور انکار کے اسباب میں سے ایک اور سبب بہانہ جوئی ہے۔ اگرچہ بہانہ جوئی کی علت بھی دوسرے عوامل مثلاً تکبر و خود خواہی وغیرہ ہی ہے، لیکن یہ آہستہ آہستہ ایک منفی فکر کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہ خود حق کے مقابلے میں سر تسلیم خم نہ کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

اُن بہانہ تراشیوں میں سے کہ جو مشرکین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں کیا کرتے تھے اور قرآن مجید کی کئی آیات میں ان کی طرف اشارہ بھی ہوا ہے اور زیر بحث آیت میں بھی اس کا بیان ہوا ہے، ایک یہ ہے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ پیغمبر نے اتنے عظیم کام کو اکیلے ہی اپنے ہاتھ میں کیوں لے لیا ہے۔ اس ماموریت میں کوئی اور موجود، جو نوع بشر میں سے نہ ہو بلکہ فرشتوں کی جنس سے ہو، اس کی ہمراہی کیوں نہیں کرتا۔ کیا ایسا انسان کہ جو ہماری ہی جنس سے ہو تنہا بارِ رسالت کو اپنے کندھے پر اُٹھا سکتا ہے؟ (وقالوا لولا انزل علیہ ملک)۔

حالانکہ آپ کی نبوت کے ثبوت میں واضح نشانیوں اور روشن دلائل کے ہوتے ہوئے اِن بہانہ تراشیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ علاوہ ازیں نہ تو فرشتہ انسان سے زیادہ قدرت رکھتا ہے اور نہ ہی اس سے زیادہ رسالت کے لیے استعداد بلکہ انسان اُس سے کئی درجے زیادہ اہل ہے قرآن دو جملوں کے ساتھ کہ جن میں سے ہر ایک اپنے اندر ایک استدلال رکھتا ہے انہیں جواب دیتا ہے۔

پہلا یہ کہ اگر فرشتہ نازل ہو جائے اور پھر بھی وہ ایمان نہ لائیں، تو اُن سب کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے گا (ولو انزلنا ملکا لقضی الامر ثم لا ینظرون)۔

لیکن یہ بات کہ فرشتے کے آنے اور اس کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمراہی سے منکرین کیوں موت اور ہلاکت میں گرفتار ہوں گے، اس کی دلیل وہی ہے کہ جس کی طرف قبل کی چند آیات میں اشارہ ہو چکا ہے کہ اگر نبوت کامکمل طور پر مشاہدہ ہو جائے، یعنی فرشتے کے آنے سے غیب شہود میں بدل جائے اور تمام چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو پھر تو اتمام حجت کا آخری مرحلہ بھی پورا ہو جائے گا کیونکہ اس سے بڑھ کر اور کسی دلیل کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ تو ان حالات میں اگر کوئی مخالفت کرے گا تو اس کی سزا اور عذاب یقینی ہو جائے گا۔ لیکن خداوند تعالیٰ بندوں پر اپنے لطف و رحمت کی وجہ سے اور اس غرض سے کہ اُن کے پاس نظر ثانی کے لیے موقع باقی رہے یہ کام نہیں کرتا۔ مگر خاص مواقع پر کہ جہاں وہ یہ جانتا ہے کہ مدمقابل اُسے قبول کرنے کی مکمل استعداد رکھتا ہے یا ایسے مواقع پر جہاں جانبِ مخالف نابود ہونے کا مستحق ہے یعنی اُس نے ایسے عمل انجام دیئے ہوں کہ وہ خدائی سزا کا مستحق بن گیا ہو، تو اس موقع پر اس کے تقاضے کے مطابق ترتیب اثر دیا جاتا ہے اور جب وہ قبول نہیں کرتا تو اس کی نابودی کا حکم صادر ہو جاتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام رہبری اور لوگوں کی تربیت کے ذمہ دار ہونے اور ان کے لیے عملی نمونہ پیش کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لازماً نوعِ بشر میں سے ہوں اور ان کے ہم رنگ وہم صفات ہوں اور تمام غرائز و صفات انسانی اُن میں موجود ہوں کیونکہ فرشتہ، علاوہ اس کے کہ وہ انسان کے لیے دیکھنے کے قابل نہیں ہے، اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ انسان کے لیے نمونہ عمل بن سکے کیونکہ نہ وہ انسان کی ضروریات اور تکالیف سے آگاہ ہے اور نہ ہی وہ اس کے غرائز و خواہشات سے آشنا ہے۔ اسی دلیل سے اس کی رہبری ایسے موجود کے لیے کہ جو ہر لحاظ سے اس سے مختلف ہے بالکل ناکارہ ہوگی۔

لہٰذا قرآن دوسرے جواب میں کہتا ہے: اگر ہم اُسے فرشتہ قرار دیتے اور اُن کے مطالبے پر عمل کرتے تو پھر بھی ہمارے لیے یہ لازم تھا کہ ہم انسان کی تمام صفات کو اس میں پیدا کرتے اور اسے صورت وسیرت میں مرد بناتے (ولو جعلناہ ملکًا لجعلناہ رجلًا)[1]۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اُس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "لجعلناہ رجلًا" سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ ہم اسے صرف انسانی شکل دے دیں گے، جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے، بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم اُسے ظاہر و باطن کے لحاظ سے صفاتِ انسانی سے متصف کریں گے۔

اس کے بعد اس کا نتیجہ پیش کرتا ہے کہ اس حالت میں وہ ہم پر پھر انہی سابقہ اعتراضات کو دہراتے کہ کسی انسان کو رہبر کے طور پر کیوں مامور کیا گیا ہے اور حقیقت کو ہم پر پوشیدہ رکھا ہے (وللبسنا علیھم ما یلبسون)۔

لبس (بروزن درس)، پردہ پوشی اور اشتباہ کاری کے معنی میں ہے اور لُبس (بروزن قفل) لباس پہننے کے معنی میں ہے پہلے کی ماضی لبس (بروزن ضرب) ہے اور دوسرے کی ماضی لَبِس (بروزن حسب ہے) اور یہ بات واضح ہے کہ آیت میں پہلے والا مفہوم، یعنی اگر ہم فرشتے کو بھیجتے تو ضروری تھا کہ وہ انسانی صورت وسیرت میں ہو۔ اس حالت میں ان کے عقیدے کے مطابق ہم نے لوگوں کو اشتباہ اور خطا میں ڈالا ہوتا اور وہ پھر ہمارے لیے انہی سابقہ نسبتوں کو دہراتے جس طرح کہ وہ خود نادان اور بے خبر لوگوں کو اشتباہ اور خطا میں ڈالتے ہیں اور حقیقت کا چہرہ اُن سے چھپاتے ہیں۔

اس بنا پر "لبس" اور پردہ پوشی کی خدا کی طرف نسبت ان کے زاویہ نگاہ سے ہے۔

آخر میں خداوند تعالیٰ پیغمبر کو تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے: ان کی مخالفت، ہٹ دھرمی اور سخت گیری سے پریشان نہ ہوں کیونکہ آپ سے پہلے کے پیغمبروں میں سے بھی بہت سے پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا، لیکن آخر کار جس چیز کا وہ تمسخر کیا کرتے تھے اسی نے اُن کے دامن کو پکڑ لیا اور ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا (ولقد استھزئ برسل من قبلک فحاق بالذین سخروا منھم ما کانوا بہ یستھزءون)۔

---

[1] جعلناہ کی ضمیر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، اور اس کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے کہ جو پیغمبر کے ساتھ اس کی نبوت کو مستحکم کرنے کے لیے مبعوث ہو۔ دوسری صورت میں تو ان کے مطالبے پر عمل ہوگا اور پہلی صورت میں ان کے مطالبے سے بھی بڑھ کر صورت ہوگی۔

درحقیقت یہ آیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دل کی تسلی کا سبب بھی ہے کہ اس کی راہ میں ذرا سا تزلزل بھی ان کے ارادہ میں نہ آئے اور ہٹ دھرم مخالفین کے لیے دھمکی بھی ہے کہ وہ اپنے کام کے بُرے اور دردناک انجام کو سوچ لیں۔[1]

۱۱۔ قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ۝

## ترجمہ

۱۱۔ (اے رسول) کہہ دو کہ تم زمین میں چلو پھرو۔ اس کے بعد (دیکھو اور) غور کرو کہ جو لوگ آیاتِ خداوندی کو جھٹلاتے تھے ان کا انجام کیا ہوا؟۔

## تفسیر

قرآن مجید نے اس مقام پر ان ہٹ دھرم اور خود خواہ لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا ہے اس نے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ وہ انہیں کہیں کہ وہ زمین میں چلیں پھریں اور جو لوگ حقائق کو جھٹلاتے تھے ان کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ شاید وہ بیدار ہو جائیں (قل سیروا فی الارض ثم انظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ گزشتہ لوگوں اور اُن قوموں کے آثار کو دیکھنا کہ جنہوں نے حقائق کو ٹھکرانے کی وجہ سے فنا اور نابودی کا راستہ اختیار کر لیا تھا، تاریخ کی کتابوں میں ان کے حالات کے پڑھنے سے کہیں بڑھ کر پُر اثر ہے، کیونکہ یہ آثار حقیقت کو محسوس اور قابلِ لمس بناتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لفظ "انظروا" (دیکھو) استعمال کیا گیا ہے نہ کہ "تفکروا" (غور و فکر کرو)۔

ضمناً لفظ "ثم" کا ذکر جو عام طور عطف با فاصلہ زمانی کے لیے آتا ہے ممکن ہے اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنے

---

[1] اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ لفظ "حاق" کا معنی نازل ہوا، وارد ہوا ہے۔ اور "ما کانوا بہ یستہزءون" سے مراد انبیاء کا عذاب الٰہی کی خبریں دینا ہے، کہ جنہیں ہٹ دھرم دشمن ٹھٹھے میں اڑا دیا کرتے تھے۔ مثلاً حضرت نوح کا بار بار طوفان کی دھمکی دینا کہ جو بت پرست قوم کے لیے ایک مذاق کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس بنا پر آیت میں کلمہ "جزاء" کے مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ بعض نے کہا ہے۔ بلکہ اس کا معنی اس طرح ہے: جن سزاؤں کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ ان پر نازل ہو گئیں۔

کے لیے ہو کر اپنی سیر اور فیصلہ میں جلدی نہ کریں بلکہ جب گذرے ہوئے لوگوں کے آثار کا مشاہدہ کریں تو حوصلا اور دقت کے ساتھ غور و فکر کریں پھر اس سے نتیجہ اخذ کرکے ان کے کام کا انجام آنکھوں سے دیکھیں۔

زمین میں سیر و سیاحت کرنے اور افکار کو بیدار کرنے میں اس کی غیر معمولی تاثیر کے بارے میں ہم جلد دوم میں سورہ آلِ عمران کی آیہ ۱۳۷ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

۱۲۔ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

۱۳۔ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِی الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

## ترجمہ

۱۲۔ کہہ دو کہ وہ چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں کس کی ہیں، کہہ دو کہ وہ سب خدا کی ہیں جس نے رحمت (اور بخشش) کو اپنے اُوپر ضروری قرار دے لیا ہے (اور اسی دلیل سے) تم سب کو قطعی طور پر قیامت کے دن کہ جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے جمع کرے گا صرف وہی لوگ ایمان نہیں لائیں گے جنہوں نے اپنا سرمایۂ حیات ضائع کر دیا ہے اور خسارے کا شکار ہیں۔

۱۳۔ اور جو کچھ رات اور دن میں ہے وہ بھی سب اسی کے لیے ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

## تفسیر

اس آیت میں پہلے کی طرح مشرکین سے بحث ہو رہی ہے۔ گذشتہ آیات میں مسئلہ توحید کو موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ اس آیت میں مسئلہ معاد پر بحث ہو رہی ہے۔ توحید کی طرف اشارہ کرنے کے ساتھ ہی اس کے بعد مسئلہ قیامت اور معاد کو بڑے عمدہ طریقے سے بیان کیا جا رہا ہے۔ آیت سوال و جواب کی صورت میں ہے۔ سوال کرنے والا اور جواب دینے والا دونوں ایک ہی ہیں جو ادبیات میں ایک خوبصورت طریقہ ہے۔

---

## معاد پر استدلال

معاد پر استدلال کے لیے مقدمے کے طور پر دو باتیں کہی گئی ہیں :

۱ ۔ پہلے کہتا ہے : کہہ دو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے کس کے لیے ہے (قل لمن ما فی السمٰوٰت والارض)۔ پھر اس کے بعد فوراً بلا فاصلہ کہتا ہے کہ تم خود زبانِ فطرت اور ان کی روح کا جواب دے دو کہ خدا کے لیے (قل للّٰہ)۔

اس مقدمہ کے مطابق تمام جہان خدا کی ملکیت ہے اور اس کی تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے ۔

۲ ۔ پروردگار عالم تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے ۔ وہی ہے وہ ذات کہ جس نے رحمت کو اپنے ذمے لیا ہے اور بے شمار نعمتیں سب کے لیے عام کر دی ہیں ( کتب علی نفسہ الرحمۃ )۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا خدا اجازت دے کہ انسانوں کا رشتہ حیات موت کے ذریعہ کلی طور پر منقطع ہو جائے اور کمال کی جانب اس کا سفر ختم ہو جائے ۔ کیا یہ بات اس کے اصلاً فیاض ہونے اور اس کی رحمت واسعہ کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے ۔ کیا وہ اپنے بندوں کے بارے میں کہ جن کا وہ مالک و مدبر ہے اس قسم کی بے مہری کر سکتا ہے کہ وہ ایک مدت کے بعد بالکل فنا ہو جائیں اور ان کا کوئی وجود ہی باقی نہ رہے ۔

مسلمہ طور پر ایسا نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ اس کی رحمت واسعہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ موجودات کو خاص طور پر انسان کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے اور آگے بڑھائے جس طرح اپنی رحمت کے سائے میں ایک بے قدر و قیمت چھوٹے سے بیج کو تناور اور پھلدار درخت میں یا گلِ زیبا کی شاخ میں بدل دیتا ہے ۔ جیسا کہ اپنے فیض و کرم کے سائے میں ایک بے قدر و قیمت نطفہ کو انسان کامل میں بدل دیتا ہے ۔ اسی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کو کہ جو بقا اور حیات جاودانی کی استعداد رکھتا ہے موت کے بعد نئی زندگی کے لباس میں اور زیادہ وسیع عالم میں لے آئے اور تکامل کی سیر ابدی میں اس کی رحمت کا ہاتھ اس کے سر پر ہو ۔

لہٰذا ان دونوں مقدمات کے بعد کہتا ہے کہ مسلمہ طور پر تم سب کو قیامت کے دن کہ جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے جمع کرے گا (لیجمعنکم الیٰ یوم القیٰمۃ لاریب فیہ)۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ آیت سوال سے شروع ہو رہی ہے جسے اصطلاح میں استفہام تقریری کہتے ہیں جس میں طرفِ مقابل سے اقرار لینا مطلوب ہوتا ہے اور چونکہ یہ مطلب فطرت کی نگاہ سے بھی مسلم تھا اور خود مشرکین بھی اس کے معترف تھے کہ عالم ہستی کی مالکیت بتوں سے متعلق نہیں ہے بلکہ خدا سے مربوط ہے، لہٰذا وہ خود ہی بلا فاصلہ سوال کا جواب دیتا ہے اور مختلف مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں یہ ایک اچھا طریقہ شمار ہوتا ہے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ معاد کے لیے دوسرے مقامات پر مختلف طریقوں سے مثلاً قانونِ عدالت، قانونِ تکامل اور حکمتِ پروردگار کے طریق سے استدلال ہوا ہے، لیکن رحمت کے ساتھ استدلال ایک نیا استدلال ہے، جو اوپر والی آیت میں موضوع بحث قرار پایا ہے ۔

آیت کے آخر میں ہٹ دھرم مشرکین کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ لوگ جو زندگی کے بازارِ تجارت میں اپنے وجود کا سرمایہ ضائع کر چکے ہیں وہ ان حقائق پر ایمان نہیں لائیں گے ( الذین خسروا انفسہم فہم لا یؤمنون )۔

کس قدر عجیب و غریب تعبیر ہے! بعض اوقات انسان مال یا مقام یا اپنے سرمائے میں سے کوئی اور چیز ہاتھ سے کھو بیٹھتا ہے۔ ان چیزوں میں اگرچہ اس نے نقصان کیا ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس نے ایسی چیزیں اپنے ہاتھ سے دی ہیں جو اس کے وجود کا جز نہیں ہیں۔ یعنی یہ چیزیں اس کے وجود سے باہر ہیں۔ لیکن سب سے بڑا خسارہ جسے حقیقی خسارے کا نام دیا جا سکتا ہے اس وقت ہو گا جب انسان خود اپنی اصل ہستی ہی کو ہاتھ سے دے بیٹھے اور خود اپنے وجود کو ہی داؤ پر لگا دے۔

حق کے دشمن اور ہٹ دھرم لوگ اپنی عمر کی پونجی اور اپنی فکر، عقل، فطرت اور تمام روحانی و جسمانی نعمات کو جنہیں راہ حق میں کام آنا چاہیے تھا، تاکہ وہ اپنے کمال کو پہنچ سکیں، کلی طور پر ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں نہ سرمایہ باقی رہتا ہے نہ سرمایہ دار، یہ تعبیر قرآن مجید کی متعدد آیات میں آئی ہے اور یہ دہلا دینے والی تعبیرات ہیں کہ جو منکرینِ حق اور گنہگاروں کا دردناک انجام واضح کر دیتی ہیں۔

## ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ابدی زندگی مومنین کے لیے تو مصداق "رحمت" ہے لیکن اُن کے غیر کے لیے ہے تو سوائے "زحمت و بدبختی" کے اور کوئی چیز نہ ہو گی۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کا کام اسبابِ رحمت فراہم کرنا ہے۔ اُس نے انسان کو پیدا کیا اور اُسے عقل دی اور اس کی رہبری اور رہنمائی کے لیے پیغمبر بھیجے اور طرح طرح کی نعمتوں کو اس کے اختیار میں دے دیا اور حیاتِ جاوداں کی طرف سب کے لیے راہیں کھول دیں۔ یہ سب چیزیں بغیر استثناء کے رحمت ہیں۔

اب اگر راستے میں ان رحمتوں کے نتیجہ اور ثمر تک پہنچنے سے پہلے انسان خود راستے کو چھوڑ جائے اور تمام اسباب رحمت کو اپنے لیے زحمت میں تبدیل کر دے تو یہ بات ان اسباب کے رحمت ہونے کی نفی نہیں کرتی اور ملامت کا حقدار وہ انسان ہے کہ جس نے اسباب رحمت کو عذاب میں بدل لیا ہے۔

بعد والی آیت اصل میں گذشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ پہلی آیت میں خداوند تعالیٰ کی تمام موجودات کے بارے میں مالکیت کی طرف اشارہ تھا اس طریق سے کہ وہ سب ایک اُفق مکان میں واقع ہیں لہٰذا فرمایا کہ خدا ان تمام چیزوں کا مالک ہے کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔

اب یہ آیت اس کے اُفق وسعت زمان میں واقع ہونے کے طریق سے اس کی مالکیت کی طرف اشارہ ہے۔ لہٰذا کہتا ہے: اور اس کے لیے ہے جو کچھ رات اور دن میں ہے ( ولہ ما سکن فی اللیل والنہار )۔

حقیقت میں جہانِ مادہ اس سے یعنی زمان و مکان سے خالی نہیں ہے۔ اور تمام موجودات جو ظرفِ زمان و مکان میں آتے ہیں یعنی تمام جہانِ مادہ اس کی ملکیت ہے اور یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ رات اور دن اس نظامِ شمسی کے ساتھ ہی مخصوص ہے بلکہ تمام موجوداتِ آسمان و زمین شب و روز رکھتے ہیں اور بعض میں ہمیشہ دن ہوتا ہے رات نہیں ہوتی اور بعض میں ہمیشہ رات ہوتی ہے دن نہیں ہوتا۔ مثلاً سورج میں ہمیشہ دن ہے کیونکہ وہاں روشنی ہی روشنی ہے اور تاریکی کا کوئی وجود نہیں ہے جبکہ بعض ستارے بجھے ہوئے اور بے نور ہیں وہ آسمان کہ جو ستاروں سے بہت دور ہیں وہاں ہمیشہ رات کی تاریکی چھائی رہتی ہے اور اوپر والی آیت ان سب پر صادق آتی ہے۔

ضمنی طور پر اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ "سکن" کسی موجود کی چیز میں سکونت، توقف اور قرار پانے کے معنی میں ہے، چاہے وہ موجود حالتِ حرکت میں ہو یا سکون میں، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ہم فلاں شہر میں ساکن ہیں یعنی ہم وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور مقیم ہیں چاہے ہم اس شہر کی سڑکوں پر حالتِ حرکت میں ہوں یا کہیں حالتِ سکون میں ہوں۔

آیت میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہاں "سکون" صرف حرکت کے مقابلے میں ہو اور چونکہ یہ دونوں امور نسبتی ہیں لہٰذا ایک کا ذکر ہمیں دوسرے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس بنا پر آیت کا مطلب یوں ہو جاتا ہے کہ جو کچھ روز و شب اور افقِ زمان میں سکون و حرکت کی حالت میں ہے وہ سب خدا کی ملکیت ہے۔

اور اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ آیت توحید کے استدلالات میں سے ایک استدلال کی طرف اشارہ ہو کیونکہ "حرکت" و "سکون" دو عارضی حالتیں ہیں۔ جو حتمی طور پر حادث ہیں اور وہ قدیم و ازلی نہیں ہو سکتیں کیونکہ حرکت عبارت ہے ایک چیز کا دو مختلف اوقات میں دو مختلف مکانوں میں ہونے سے اور سکون ہے ایک چیز کا دو زمانوں میں ایک معین مکان میں رہنا۔ اس بنا پر حرکت و سکون کی ذات میں سابقہ حالت کی طرف توجہ پوشیدہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ چیز کہ جو اس حالت سے پہلے دوسری حالت میں ہو وہ ازلی نہیں ہو سکتی۔

اس گفتگو سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "اجسام حرکت و سکون سے خالی نہیں ہیں" "اور جو حرکت و سکون سے خالی نہ ہو وہ ازلی نہیں ہو سکتا"

لہٰذا تمام اجسام حادث ہیں اور چونکہ وہ حادث ہیں لہٰذا وہ پیدا کرنے والے کے محتاج ہیں (غور کیجیے گا)۔

لیکن چونکہ خدا جسم نہیں ہے لہٰذا وہ نہ حرکت رکھتا ہے نہ سکون، نہ زمان رکھتا ہے نہ مکان، اسی لیے وہ ازلی و ابدی ہے اور آیت کے آخر میں توحید کا ذکر کرنے کے بعد خداوند تعالیٰ کی دو نمایاں صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے (وھو السمیع العلیم)

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہانِ ہستی کی وسعت اور وہ موجودات کہ جو زمان و مکان کے افق میں قرار رکھتے ہیں کبھی بھی اس بات میں مانع نہیں ہیں کہ خدا ان کے اسرار سے آگاہ ہو۔ بلکہ وہ ان کی گفتگو سنتا ہے یہاں تک کہ وہ ایک کمزور چیونٹی کی حرکت کو بھی جانتا ہے جو تاریک رات میں سیاہ پتھر کے اوپر ایک خاموش دور دراز کے درے کی گہرائی میں ہو اور اس کی ضروریات اور باقی تمام موجودات کی حاجات سے آگاہ ہے اور سب کے

اعمال اور کاموں سے مطلع ہے۔

۱۴۔ قُلۡ اَغَيۡرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَهُوَ يُطۡعِمُ وَلَا يُطۡعَمُ ؕ قُلۡ اِنِّىۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَكُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَسۡلَمَ وَلَا تَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ○

۱۵۔ قُلۡ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّىۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ○

۱۶۔ مَنۡ يُّصۡرَفۡ عَنۡهُ يَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡمُبِيۡنُ ○

## ترجمہ

۱۴۔ کہہ دو کیا میں غیر خدا کو اپنا ولی بناؤں جب کہ وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ، وہ ہے کہ جو روزی دیتا ہے اور کسی سے روزی نہیں لیتا۔ تم کہہ دو کہ میں اس بات پر مامور ہوں کہ میں سب سے پہلے اس کے حکم کو تسلیم کرنے والا" (مسلمان) ہوں (اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ) مشرکین میں سے نہ ہونا۔

۱۵۔ کہہ دو کہ میں بھی اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو بڑے دن (قیامت کے) عذاب سے ڈرتا ہوں۔

۱۶۔ اس دن جس شخص کے اُوپر سے عذاب الٰہی ٹل جائے (تو یوں سمجھو کہ) خدا نے اپنی رحمت اس کے شاملِ حال کر دی ہے اور یہ واضح کامیابی ہے۔

## تفسیر

### خدا کے سوا اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے

بعض نے ان آیات کے لیے ایک شانِ نزول نقل کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اہلِ مکہ میں سے کچھ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: اے محمدؐ! تم نے اپنی قوم کا دین چھوڑ دیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کام کا عامل سوائے فقر کے اور کوئی نہیں ہے۔ ہم اس بات کے لیے حاضر ہیں کہ اپنا مال تیرے ساتھ بانٹ لیں اور تجھے بہت ثروت مند کر دیں تاکہ تم ہمارے خداؤں سے دست بردار ہو جاؤ اور ہمارے اصلی دین کی طرف پلٹ آؤ تو اُوپر والی آیات نازل ہوئیں اور انہیں جواب دیا گیا[1]۔ البتہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وارد شدہ روایات کے مطابق اس سورہ

حاشیہ بر صفحۂ آئندہ

کی آیات مکہ میں یکجا طور پر نازل ہوئی ہیں اس بناء پر ہر ایک آیت کے لیے خاص اور علیحدہ شانِ نزول نہیں ہو سکتا لیکن اس سورہ کے نازل ہونے سے پہلے پیغمبرؐ اور مشرکین کے درمیان گفتگو اور بحثیں ہوتی رہتی تھیں لہٰذا اس سورہ کی بعض آیات میں ان بحثوں کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ اس بناء پر کوئی امر مانع نہیں ہے کہ رسول اللہؐ اور مشرکین کے درمیان اس قسم کی باتیں ہوئی ہوں اور خداوند تعالیٰ ان آیات میں ان باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دے رہا ہو۔

بہرحال ان آیات میں بھی ہدف و مقصد اثباتِ توحید اور شرک و بت پرستی کے خلاف مبارزہ ہی ہے۔ مشرکین باوجود اس کے کہ وہ خلقتِ عالم کو خداوند تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہی مخصوص سمجھتے تھے لیکن انہوں نے بتوں کو اپنی پناہ گاہ سمجھ رکھا تھا اور بعض اوقات اپنی ہر ایک حاجت کے لیے کسی ایک بت کا سہارا لیتے تھے اور متعدد خداؤں (بارش کا خدا، نور کا خدا، ظلمت کا خدا، جنگ و صلح کا خدا، رزق و روزی کا خدا) کے قائل تھے اور یہ وہی ارباب انواع کا عقیدہ ہے جو قدیم یونان میں بھی وجود رکھتا تھا۔

قرآن اس قسم کے غلط نظریے کو ختم کرنے کے لیے پیغمبرؐ کو اس طرح حکم دیتا ہے: انہیں کہہ دو کہ کیا میں غیر خدا کو اپنا ولی و سرپرست اور پناہ گاہ قرار دے لوں حالانکہ وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور تمام موجودات کو رزق دینے والا ہے بغیر اس کے کہ خود اسے روزی کی ضرورت ہو (قل اغیر اللّٰہ اتخذ ولیا فاطر السمٰوٰت و الارض و ھو یطعم ولا یطعم)۔

اس بناء پر جب تمام چیزوں کو پیدا کرنے والا وہی ہے اور کسی دوسرے کی قدرت کا سہارا لیے بغیر اس نے سارے جہان کو پیدا کیا ہے اور سب کی روزی اسی کے ہاتھ میں ہے تو پھر کونسی دلیل ہے کہ انسان اس کے غیر کو اپنا ولی، سرپرست اور پناہ گاہ قرار دے۔ اصولی طور پر باقی سب مخلوق ہیں اور اپنے وجود کے تمام لمحات میں اس کے محتاج ہیں۔ لہٰذا وہ کس طرح دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کر سکتے ہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اوپر والی آیت میں جب آسمان و زمین کی خلقت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو خدا کا "فاطر" کے عنوان سے تعارف کراتا ہے۔ "فاطر" "فطور" کے مادہ سے ہے جس کے معنی شگافتہ کرنے (پھاڑنے) کے ہیں۔ ابن عباس سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ مجھے فاطر السمٰوٰت والارض کے معنی اس وقت سمجھ میں آئے جب دو عربوں کو ایک کنویں کے بارے میں جھگڑتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک اپنی ملکیت کے ثبوت میں یہ کہتا تھا کہ "انا فطرتھا" میں نے اس کنویں کو شگافتہ کیا ہے اور بنایا ہے۔

لیکن ہم فاطر کے معنی کو آج موجودہ علوم کی مدد سے ابن عباس کی نسبت بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کیونکہ یہ آج کے دقیق ترین علمی نظریات کے مطابق انتہائی پسندیدہ تعبیر ہے جو پیدائش جہان کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہے کیونکہ سائنس دانوں اور محققین کی تحقیقات کے مطابق عالم بزرگ (مجموعہ جہان) اور عالم کوچک (نظام شمسی) سب کے سب ابتداء میں ایک ہی

---

حاشیہ صفحہ سابق: ۱۔ تفسیر ابو الفتوح رازی و تفسیر مجمع البیان زیرِ نظر آیات کے ذیل میں۔

تو وہ تھے کہ جو پے در پے تھپیڑوں کے باعث ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور اس کے کہکشاں اور نظام ہائے شمسی اور مختلف کُرّے وجود میں آگئے۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۳۰ میں یہ مطلب زیادہ صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جہاں پر فرمایا گیا ہے:

"اولم یرالذین کفروا ان السمٰوٰت والارض کانتا رتقا ففتقناھما"

کیا کافر نہیں جانتے کہ آسمان و زمین آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے ہم نے انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا۔

ایک اور نکتہ کی طرف سے بھی غفلت نہیں کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ صفات خدا میں سے یہاں صرف بندوں کو روزی دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تعبیر شاید اس بنا پر ہے کہ انسان کی مادی زندگی میں زیادہ تر وابستگیاں انہیں مادی ضروریات کے زیر اثر ہیں۔ یہی بات جسے اصطلاح میں روٹی کا ایک لقمہ کھانا کہتے ہیں انسان کو طاقتوروں اور ارباب دولت کے سامنے جھکنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ بعض اوقات تو لوگ پرستش کی حد تک ان کے سامنے سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ قرآن اس عبارت میں کہتا ہے: تمہاری روزی اس کے ہاتھ میں ہے، نہ تو وہ ایسے افراد کے ہاتھ میں ہے اور نہ ہی بتوں کے ہاتھ میں صاحبان مال و اقتدار خود نیاز مند ہیں اور انہیں کھانے کی احتیاج ہوتی ہے۔ یہ صرف خدا ہے کہ جو کھلاتا تو ہے مگر خود ایسے کھانے کی احتیاج نہیں ہے۔

قرآن حکیم کی دوسری آیات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کی ملکیت و رازقیت کے مسئلہ اور بارش برسانے اور سبزہ زار کی پرورش کرنے کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ مخلوقات سے وابستگی کا خیال لوگوں کے دماغ سے بالکل نکال دے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی پیش کش کا جواب دینے کے لیے کہ جو پیغمبر اکرمؐ کو یہ دعوت دیتے تھے کہ وہ شرک کے ساتھ رشتہ جوڑ لیں، کہتا ہے: علاوہ اس کے کہ عقل مجھے یہ حکم دیتی ہے کہ صرف اس ذات پر بھروسہ کروں جو آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے، وحی الٰہی بھی مجھے حکم دیتی ہے کہ پہلا مسلمان میں بنوں اور کسی طرح بھی مشرکین کی صف میں نہ جاؤں

قل انی امرت ان اکون اول من اسلم ولا تکونن من المشرکین۔[1]

اس میں شک نہیں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ سے پہلے دوسرے پیغمبر اور ان کی صالح اُمتیں بھی مسلمان تھیں۔ اور خداوند تعالیٰ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرتی تھیں۔ اس بنا پر جب وہ یہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان بنوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اُمت کا سب سے پہلا مسلمان۔

اور یہ حقیقت میں ایک اہم تربیتی مطلب کی طرف اشارہ بھی ہے کہ ہر رہبر کو اپنے مکتب و روش کے احکام کی انجام دہی میں تمام افراد سے زیادہ پیش قدمی کرنا چاہیے۔ اسے اپنے دین کا سب سے پہلا مومن اور اس پر عمل کرنے والا ہونا

---

[1] انی امرت ..... غیر مستقیم خطاب ہے اور جملہ ولا تکونن ..... خطاب مستقیم ہے شاید یہ تفاوت اس سبب سے ہے کہ شرک سے دوری اور نفرت پہلا مسلمان ہونے کی نسبت کئی درجہ زیادہ اہم ہے۔ اسی لیے شرک سے دوری کا مسئلہ خطاب مستقیم کی صورت میں "نون تاکید ثقیلہ" کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

چاہیے اور سب سے زیادہ کوشش کرنے والا اور اپنے مکتب کے لیے سب سے زیادہ فدا کاری کرنے والا ہونا چاہیے۔

بعد والی آیت میں اس خدائی حکم پر جو وحی کے ذریعہ پیغمبر پر نازل ہوا ہے تاکید مزید کے لیے کہتا ہے: میں بھی خود اپنے لیے جوابدہی کا احساس کرتا ہوں اور قوانین الٰہی سے کسی طرح مستثنیٰ نہیں ہوں۔ میں بھی اگر خداوند تعالیٰ کے حکم سے منحرف ہو جاؤں اور مشرکین کی ہاں میں ہاں ملانے لگ جاؤں اور اس کی نافرمانی اور عصیان کروں تو اس عظیم دن ــ روزِ قیامت ــ کی سزا سے خائف و ترساں ہوں (قل انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم)[1]۔

اس آیت سے بھی اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبروں میں جوابدہی کا احساس دوسروں میں جوابدہی کے احساس سے زیادہ ہوتا ہے۔

آخری آیت میں اس لیے کہ ثابت ہو جائے کہ پیغمبر بھی لطف و رحمت خداوندی پر بھروسہ کیے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے اور تمام اختیارات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، یہاں تک کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی پروردگار کی رحمتِ بے پایاں پر ہی چشم امید لگائے ہوئے ہیں اور اپنی نجات و کامیابی اسی سے طلب کرتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ رسول کہتے ہیں جو شخص اس عظیم دن پروردگار کی سزا سے نجات پا جائے تو رحمت خدا اس کے شاملِ حال ہو گئی ہے اور یہ ایک توفیق الٰہی اور کھلی کامیابی ہے (من یصرف عنہ یومئذ فقد رحمہ و ذٰلک الفوز المبین)۔

یہ آیات توحید کا آخری درجہ بیان کرتی ہیں، یہاں تک کہ ان لوگوں کو کہ جو پیغمبروں کو بھی خدا کے ساتھ مستقل پناہ گاہ مانتے تھے، جیسے عیسائی جو حضرت عیسیٰؑ کو نجات دہندہ سمجھتے تھے، صراحت کے ساتھ جواب دیا گیا ہے کہ پیغمبر تک بھی اس کی رحمت کے محتاج ہیں۔

۱۷۔ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۭ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

۱۸۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ○

## ترجمہ

۱۷۔ اگر خدا تجھے کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے علاوہ کوئی بھی اسے برطرف نہیں کر سکتا اور اگر وہ تجھے کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ تمام چیزوں پر قدرت رکھنے والا ہے (اور ہر نیکی اسی کی قدرت سے بنی ہے)۔

---

[1] یہ بات قابل توجہ ہے کہ جملہ بندی کی ترتیب کا تقاضا یہ ہے کہ لفظ "اخاف" جملہ "ان عصیت ربی" کے بعد ذکر ہو۔ کیونکہ وہ شرط کی جزا کے طور پر استعمال ہوا ہے لیکن پیغمبر کا خوف اور جوابدہی کا احساس اس بات کا سبب بنا کہ پروردگار کے حکم کے سامنے "اخاف" (میں ڈرتا ہوں) کا لفظ تاکید کے لیے مقدم رکھا جائے۔

۱۸۔ وہی ہے کہ جو اپنے تمام بندوں پر قاہر و مسلط ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔

# تفسیر

## پروردگار کی قدرتِ قاہرہ

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کا سب سے پہلا ہدف شرک و بت پرستی کی بیخ کنی ہے۔ مندرجہ بالا دونوں آیات میں بھی اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے، تم لوگ غیر خدا کی طرف کیوں توجہ کرتے ہو؟ مصائب سے نجات، رفعِ ضرر اور حصولِ منفعت کے لیے خود ساختہ خداؤں سے کیوں پناہ لیتے ہو؟ حالانکہ اگر تجھے معمولی سے معمولی اور حقیر سے حقیر نقصان بھی پہنچے تو سوائے خدا کے اس کو برطرف کرنے والا اور کوئی نہ ہوگا اور اگر کوئی خیر و برکت اور کامیابی و سعادت تجھے نصیب ہو تو وہ بھی اسی کی قدرت کا پرتو ہے۔ کیونکہ وہی ہے کہ جو تمام چیزوں پر قدرت رکھتا ہے (وان یمسسک اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ہو وان یمسسک بخیر فہو علی کل شیء قدیر)[1]

حقیقت میں غیر خدا کی طرف توجہ لوگ اس لیے کرتے ہیں کہ یا تو وہ انہیں سرچشمۂ خیرات جانتے ہیں یا وہ انہیں مصائب و مشکلات کا برطرف کرنے والا سمجھتے ہیں جیسا کہ طاقت و اقتدار رکھنے والوں کے سامنے پرستش کی حد تک خضوع و خشوع بھی ان ہی دونوں اسباب کی بنا پر ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت کہتی ہے کہ ارادۂ خداوندی تمام چیزوں پر حکومت کرتا ہے۔ اگر وہ کسی نعمت کو کسی سے سلب کر لے یا کوئی نعمت کسی کو عطا کر دے تو دنیا میں کوئی منبعِ قدرت ایسا نہیں ہے جو اُسے پلٹا سکے تو پھر وہ غیر خدا کے سامنے سرِ تعظیم کیوں جھکاتے ہیں۔

"خیر" و "شر" کے بارے میں "یمسسک" کی تعبیر کہ جو مادہ "مس" سے ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی خیر و شر تک بھی اس کے ارادہ و قدرت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

یہ ذکر بھی لازمی ہے کہ اوپر والی آیت ثنویین یعنی دو خداؤں کی پرستش کرنے والوں کے عقیدہ کی۔ کہ جو خیر و شر کے دو علیحدہ علیحدہ مبدء کے قائل تھے۔ صراحت کے ساتھ تردید کرتی ہے اور دونوں کو خدا کی طرف سے سمجھتی ہے۔ لیکن ہم اپنے مقام پر یہ عرض کر آئے ہیں کہ "مطلق شر" کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے، تو اس بنا پر جب شر کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے تو اُس سے ایسے امور مراد ہوتے ہیں کہ جو ظاہر میں سلبِ نعمت ہوتے ہیں لیکن فی الواقع اپنے مقام پر وہ خیر ہیں اور یا وہ بیدار کرنے کے لیے یا تعلیم و تربیت کے لیے اور یا تکبر، سرکشی اور خود پسندی کو برطرف کرنے کے

---

[1] "ضر" ایسے نقصانات کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسان کو پیش آتے ہیں، خواہ وہ جسمانی پہلو رکھتے ہوں جیسے کسی عضو کا نقصان اور مختلف بیماریاں یا وہ روحانی پہلو رکھتے ہوں جیسے جہالت، حماقت، دیوانگی یا دوسرے پہلو جیسے مال، اولاد یا عزت کا چلے جانا۔

لیے اور یا دوسری مصلحتوں کے لیے ہوتے ہیں۔

بعد والی آیت میں اس بحث کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے: وہی ہے جو اپنے تمام بندوں پر قاہر و مسلط ہے (وھو القاھر فوق عبادہ)۔

"قہر" اور "غلبہ" کا اگرچہ ایک ہی معنی ہے، لیکن لغوی بنیاد کی نظر سے ان دونوں کے معنی میں تفاوت ہے۔ قہر قاہر اس قسم کے غلبہ و کامیابی کو کہا جاتا ہے کہ جس میں مدمقابل کسی بھی قسم کا غلبہ اپنی طرف سے ظاہر نہیں کر سکتا لیکن لفظ غلبہ میں یہ مفہوم موجود نہیں ہے اور یہ ممکن ہے کہ غلبہ پانے کے بعد مدمقابل اس پر کامیابی حاصل کرے۔ دوسرے لفظوں میں قاہر اسے کہتے ہیں جو مدمقابل پر اس طرح تسلط اور برتری رکھتا ہو کہ اس میں مقابلے کی مجال ہی نہ ہو بالکل اس پانی کے برتن کی طرح کہ جسے آگ کے ایک چھوٹے سے شعلہ پر ڈالا جائے تو وہ اسے فوراً خاموش کر دے۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ قاہریت عام طور پر ایسے موقع پر استعمال ہوتی ہے کہ جب طرف مقابل کوئی عاقل موجود ہو، لیکن غلبہ عام ہے اور غیر عاقل موجودات پر کامیابیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے[1]

اس بنا پر پہلی آیت میں، خود ساختہ خداؤں اور صاحبان اقتدار کے مقابلہ میں اگر خدا کی قدرت کی عمومیت کی طرف اشارہ ہوا ہے تو وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ مجبور ہے کہ ایک مدت تک دوسری قدرتوں کے ساتھ دست و گریبان ہو یہاں تک وہ انہیں چت کر دے، بلکہ اس کی قدرت، قدرت قاہرہ ہے، اور "فوق عبادہ" کی تعبیر بھی اسی معنی کی تکمیل کے لیے ہے۔

اس حالت میں کس طرح ممکن ہے کہ ایک باخبر انسان اسے چھوڑ دے اور ایسے موجودات و اشخاص کے پیچھے جائے کہ جو اپنی طرف سے کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتے، یہاں تک کہ ان میں جو معمولی اور حقیر سی قدرت موجود ہے وہ بھی خدا ہی کی عطا کردہ ہے۔

لیکن اس مقصد کے پیش نظر کہیں یہ وہم نہ ہو جائے کہ ممکن ہے خدا بھی بعض صاحبان قدرت کی طرح اپنی نامحدود قدرت سے تھوڑا بہت غلط فائدہ اٹھا لیتا ہو، آیت کے آخر میں فرماتا ہے کہ اس کے باوجود وہ حکیم ہے اور اس کے تمام کام حساب کے مطابق ہیں اور وہ خبیر و آگاہ ہے اور معمولی سے معمولی اشتباہ اور خطا بھی اپنی قدرت کو عمل میں لانے میں نہیں کرتا (وھو الحکیم الخبیر)۔

فرعون کے حالات میں ہے کہ وہ بنی اسرائیل کو ان کی اولاد کے قتل کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے: وانا فوقھم قاھرون[2] یعنی میں ان کے اوپر کامل طور پر مسلط ہوں۔ یعنی وہ اپنی اس قدرت قاہرہ کو۔ کہ جو واقع میں ایک حقیر قدرت سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی ظلم و ستم اور دوسروں کے حقوق کی پرواہ نہ کرنے کی

---

[1] المیزان جلد ۷، صفحہ ۳۴۔

[2] اعراف۔ ۱۲۷۔

دلیل قرار دیتا تھا۔ لیکن خداوند حکیم و خبیر اس قدرت قاہرہ کے باوجود اس سے بہت منزہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا ظلم اور غلطی معمولی سے معمولی بندے کے حق میں روا رکھے۔

یہ بات بھی کہے بغیر واضح ہے کہ (فوق عبادہ) کے لفظ سے مراد مرتبہ و مقام کی برتری ہے نہ کہ مکانی برتری، کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ خدا کوئی مکان نہیں رکھتا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض بد دماغوں نے اوپر والی آیت کی تعبیر کو خدا کے جسم ہونے کی دلیل قرار دیا ہے، حالانکہ اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ فوق (اوپر) کی تعبیر خدا کی اپنے بندوں پر قدرت کے لحاظ سے معنوی برتری کے بیان کے لیے ہے۔ یہاں تک کہ فرعون کے بارے میں بھی حالانکہ وہ ایک انسان تھا اور جسم رکھتا تھا یہی لفظ مقام کی برتری کے لیے استعمال ہوا ہے نہ کہ مکانی برتری کے لیے (غور کیجئے گا)۔

۱۹۔ قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ۚ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۘ

۲۰۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۠

## ترجمہ

۱۹۔ کہہ دو کہ سب سے بڑی گواہی کس کی ہے۔ کہہ دو کہ خداوند تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔ (اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ) اس نے یہ قرآن میرے اوپر وحی کیا ہے تاکہ تمہیں اور ان تمام افراد کو ڈراؤں کہ جن تک یہ قرآن پہنچے (اور حکم خدا کی مخالفت کا خوف دلاؤں) کیا سچ مچ تم یہ گواہی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں، کہہ دو کہ میں ہرگز اس قسم کی گواہی نہیں دیتا، کہہ دو کہ خدا یگانہ و یکتا ہے اور میں اس سے جو اس کا شریک قرار دے بری و بیزار ہوں۔

۲۰۔ وہ لوگ کہ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے اس (پیغمبر کو) اچھی طرح سے پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں

کو پہچانتے ہیں، صرف وہ اشخاص کہ جو اپنا سرمایۂ وجود کھو بیٹھے ہیں ایمان نہیں لاتے۔

## تفسیر

### سب سے بڑا گواہ

جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے کہ مشرکین مکہ کا ایک گروہ پیغمبر اکرمؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ تو کیسا پیغمبر ہے کہ کوئی بھی تیرا موافق اور حامی نہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے یہود و نصاریٰ سے بھی تیرے بارے میں تحقیق کی ہے، وہ بھی تورات و انجیل کی بنیاد پر تیری حقانیت کی گواہی نہیں دیتے۔ کم از کم کوئی تم ہمیں دکھاؤ کہ جو تمہاری رسالت کی گواہی دے۔ مندرجہ بالا آیات اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ ان سب ہٹ دھرم مخالفین کے مقابلے میں کہ جنہوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور آپ کی حقانیت کی ان سب نشانیوں کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں اور پھر بھی گواہ اور شاہد کا مطالبہ کرتے ہیں، کہہ دیجئے ہمارے عقیدے اور نظریے کے مطابق سب سے بڑا گواہ کون ہے (قل ای شیء اکبر شھادۃ)۔

کیا اس کے سوا بھی کچھ ہے کہ سب سے بڑی شہادت پروردگار کی شہادت ہے؟ تو کہہ دو کہ خدائے بزرگ و برتر میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے (قل اللہ شھید بینی و بینکم)۔

اور اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ اس نے اس قرآن کو مجھ پر وحی کیا ہے (و اوحی الی ھذا القراٰن)۔

وہ قرآن جو ممکن نہیں ہے کہ فکر انسانی کا گھڑا ہوا ہو، وہ بھی اس زمانے میں اور اس ماحول اور مقام میں، وہ قرآن جو کئی قسم کے شواہد اعجاز پر مشتمل ہے۔ اس کے الفاظ اعجاز آمیز ہیں، اور اس کے معانی اس سے بھی زیادہ اعجاز آمیز ہیں۔ کیا یہی ایک عظیم شاہد خداوند تعالیٰ کی طرف سے میری دعوت کی حقانیت کی گواہی کی دلیل نہیں ہے؟۔

ضمنی طور پر اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سب سے بڑا معجزہ ہے اور پیغمبر اکرمؐ کے دعوے کی صداقت کا سب سے بڑا گواہ ہے۔

اس کے بعد نزول قرآن کا ہدف و مقصد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ قرآن اس مقصد کے لیے مجھ پر نازل ہوا ہے کہ میں تمہیں اور ان تمام لوگوں کو جن کے کانوں تک پوری تاریخ بشر میں اور وسعت زمانی میں اور تمام نقاط جہاں میں۔ میری باتیں پہنچیں انہیں خدا کے حکم کی مخالفت سے ڈراؤں اور اس مخالفت کے دردناک عواقب انجام کی طرف متوجہ کروں (لانذرکم بہ و من بلغ)۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہاں گفتگو صرف "انذار" اور ڈرانے کے بارے میں ہے حالانکہ عام طور پر ہر جگہ بشارت بھی ساتھ ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ گفتگو ایسے ہٹ دھرم لوگوں کے مقابلہ میں تھی جو مخالفت پر اصرار کرتے رہے ہیں۔

ضمنی طور پر "و من بلغ" (وہ تمام لوگ کہ جن تک یہ بات پہنچ جائے) کے الفاظ کا ذکر قرآن کی رسالت جہانی

اور دعوت عمومی اور پیام عالمی کا پتہ دیتا ہے۔

حقیقت میں اس سے زیادہ مختصر اور اس سے زیادہ جامع تعبیر اس مقصد کے ادا کرنے کے لیے اور متصور ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کی وسعت میں غور کرنے سے قرآن کی دعوت کے نسلِ عرب یا خاص زمانے اور خاص علاقے سے مخصوص نہ ہونے کے بارے میں ہر قسم کا ابہام اور شک و شبہ دور ہو جاتا ہے۔ علماء کے ایک گروہ نے ایسی تعبیرات سے مسئلہ ختم نبوت کے لیے بھی استفادہ کیا ہے۔ کیونکہ اُوپر والی تعبیر کے مطابق پیغمبر اُن تمام لوگوں پر مبعوث تھے کہ جن تک آپ کی باتیں پہنچی ہیں اور یہ اُن تمام افراد کے لیے ہے کہ جو اس جہاں کے آخر تک دنیا میں قدم رکھیں گے۔

اہل بیت علیہم السلام کے طرق سے منقول احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابلاغ و تبلیغ قرآن سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ اس کا عینِ متن دوسری اقوام تک پہنچے حتیٰ کہ اس کے ترجموں اور مفاہیم کا دوسری زبانوں میں پہنچنا بھی آیت کے معنی میں داخل ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ سے اُوپر والی آیت کے بارے میں سوال ہوا تو حضرتؑ نے فرمایا:

"بکل لسان"[1]

یعنی ہر زبان میں ہو۔

ضمنی طور پر مسلہ اصول فقہ کے قوانین میں سے ایک قاعدہ "قبح عقاب بلا بیان" ہے، وہ بھی اُوپر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ اصول فقہ میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جب تک کوئی حکم کسی شخص تک نہ پہنچے وہ شخص اُس حکم کے لیے جواب دہ نہیں ہو سکتا (مگر یہ کہ حکم حاصل کرنے میں اس نے خود کوتاہی کی ہو) مندرجہ بالا آیت بھی یہی کہتی ہے کہ وہ لوگ کہ جن تک میری بات پہنچ جائے وہ اس کے لیے جوابدہ ہیں اور اس طرح سے وہ لوگ کہ جنہیں احکام کے حصول میں کوتاہی نہ کرنے کے باوجود اصل حکم نہ پہنچا ہو کوئی مسئولیت نہیں رکھتے۔

تفسیر "المنار" میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح نقل ہوا ہے:

قیدیوں کا ایک گروہ آپ کے پاس لایا گیا، حضرتؑ نے اُن سے پوچھا کہ کیا انہوں نے تمہیں اسلام کی دعوت دی تھی؟ انہوں نے کہا کہ نہیں! آپؐ نے حکم دیا کہ انہیں رہا کر دو، اس کے بعد آپؐ نے اُوپر والی آیت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ انہیں چھوڑ دو کہ یہ اپنی جگہ پر واپس چلے جائیں کیونکہ انہیں حقیقت اسلام کی تبلیغ نہیں ہوئی اور اس کی طرف انہیں دعوت نہیں دی گئی۔[2]

---

[1] تفسیر برہان۔ نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۷۰۰، آیہ ہذا کے ذیل میں۔

[2] المنار جلد ۷، صفحہ ۳۴۱۔

نیز اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "شیٔ" کا اطلاق کہ جو فارسی کے لفظ "چیز" کا ہم معنی ہے، خدا پر کرنا جائز ہے لیکن وہ ایسی چیز ہے کہ جو دوسری چیزوں کی مانند نہیں ہے کہ جو مخلوق و محدود ہیں بلکہ وہ خالق ہے اور نامحدود ہے۔

پھر اس کے بعد پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ اُن سے پوچھو کیا واقعاً تم گواہی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ اور خدا بھی ہیں؟ (ائنکم لتشھدون ان مع اللہ اٰلھۃ اخری) اس کے بعد کہتا ہے کہ انہیں صراحت کے ساتھ کہہ دو کہ میں کبھی ایسی گواہی نہیں دیتا، کہہ دو کہ وہ خدا یکتا و یگانہ ہے اور جنہیں تم اس کا شریک بناتے ہو میں اُن سے بری و بیزار ہوں (قل لا اشھد قل انما ھو الٰہ واحد و اننی بریٔ مما تشرکون)۔

درحقیقت آیت کے آخر میں ان چند جملوں کا ذکر ایک اہم نفسیاتی نکتے کے لیے کیا گیا ہے، اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ مشرکین اس قسم کا تصور کر لیں کہ شاید ان کی گفتگو نے روح پیغمبرؐ میں کچھ تنزلزل پیدا کر دیا ہو اور وہ یہ اُمید لیے ہوئے مجلس سے جدا ہوں اور اپنے دوستوں کو بشارت دیں کہ شاید محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بعد اپنی دعوت میں نظر ثانی کر لیں یہ جملے کہ جو صراحت اور قاطعیت سے سرشار ہیں اس اُمید کو کلی طور پر نا اُمیدی میں بدل رہے ہیں اور انہیں نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ بات ان کے خیال و گمان سے بالکل باہر ہے اور معمولی سے معمولی تنزلزل بھی آپ کی دعوت میں پیدا نہیں ہوگا اور تجربہ سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ کسی بحث کے آخر میں اس قسم کے قطعی الفاظ کا ذکر آخری نتیجے تک پہنچنے کے لیے گہرا اثر رکھتا ہے۔

اور اس آیت کے بعد والی آیت میں اُن لوگوں کو کہ جو اس بات کے مدعی تھے کہ اہلِ کتاب کسی قسم کی گواہی پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں نہیں دیتے صراحت کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہتا ہے، "وہ لوگ کہ جن پر ہم نے آسمانی کتاب نازل کی ہے وہ پیغمبرؐ کو خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں بالکل اسی طرح سے جس طرح سے کہ وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں (الذین اٰتینا ھم الکتٰب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم)۔

یعنی وہ نہ صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصل ظہور اور اس کی دعوت سے آگاہ ہیں بلکہ وہ تو اس کی جزئیات و خصوصیات اور دقیق نشانیوں کو بھی جانتے ہیں، اس بنا پر اگر کچھ اہلِ مکہ کہتے تھے کہ ہم نے اہلِ کتاب کی طرف رجوع کیا ہے لیکن انہیں بھی پیغمبرؐ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے، تو یا تو واقعاً وہ جھوٹ بولتے تھے اور انہوں نے (اہلِ کتاب سے) تحقیق ہی نہیں کی تھی، اور یا پھر اہلِ کتاب نے حقائق کو چھپا لیا اور ان کے سامنے بیان نہ کیا، جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات ان کے حق کو پوشیدہ رکھنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اس بات کی بیشتر وضاحت تفسیر نمونہ کی جلد اول میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۶ کے ذیل میں گزر چکی ہے (دیکھئے اُردو ترجمہ صفحہ ۴۱۳)۔

آیت کے آخر میں ایک آخری نتیجہ کے طور پر بتاتا ہے، صرف وہی لوگ اس پیغمبرؐ پر (ان واضح نشانیوں کے باوجود) ایمان نہیں لاتے کہ جو زندگی کے بازارِ تجارت میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے ہیں اور اپنے وجود کی تمام پونجی ہرا بیٹھے ہیں (الذین خسروا انفسھم فھم لا یؤمنون)

۲۱۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِہٖ ؕ اِنَّہٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○

۲۲۔ وَیَوْمَ نَحْشُرُھُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَیْنَ شُرَکَآؤُکُمُ الَّذِیْنَ کُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ○

۲۳۔ ثُمَّ لَمْ تَکُنْ فِتْنَتُھُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشْرِکِیْنَ ○

۲۴۔ اُنْظُرْ کَیْفَ کَذَبُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَضَلَّ عَنْھُمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ○

## ترجمہ

۲۱۔ اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا کہ جس نے خدا پر جھوٹ باندھا (اور اس کے لیے شریک کا قائل ہوا) یا اس کی آیات کو جھٹلایا۔ یقیناً ظالم نجات کا منہ نہ دیکھ پائیں گے۔

۲۲۔ وہ دن کہ جس میں ہم ان سب کو محشور کریں گے تو مشرکین سے کہیں گے کہ تمہارے وہ معبود کہاں ہیں کہ جنہیں تم خدا کا شریک خیال کیا کرتے تھے (وہ تمہاری مدد کو کیوں نہیں آتے)۔

۲۳۔ پھر ان کا جواب اور عذر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ کہیں گے کہ اس خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم مشرک نہیں تھے۔

۲۴۔ دیکھو وہ کس طرح خود اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولتے ہیں اور جسے جھوٹ موٹ خدا کا شریک سمجھتے تھے اسے چھوڑ بیٹھیں گے۔

# تفسیر

## سب سے بڑا ظلم

شرک و بت پرستی کی ہر طرح سے بیخ کنی کا پروگرام دینے کے بعد اوپر والی آیات میں سے پہلی آیت میں صراحت کے ساتھ استفہام انکاری کی صورت میں کہتا ہے، ان مشرکین سے بڑھ کر اور کون ظالم ہے کہ جنہوں نے خدا پر جھوٹ باندھا اور اس کا شریک قرار دیا یا اس کی آیات کی تکذیب کی ہے۔ ( ومن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبًا او کذب بآیاتہ )۔

درحقیقت پہلا جملہ انکار توحید کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا جملہ انکار نبوت کی طرف اشارہ ہے اور واقعاً اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم نہیں ہو سکتا کہ انسان بے قدر جمادات کو یا ناتواں انسان کو ایک لا محدود وجود کے مساوی قرار دے جو سارے عالم پر حکومت کرتا ہے۔ یہ کام تین جہت سے ظلم شمار ہوتا ہے۔

ایک ظلم اس کی ذات پاک کے ساتھ کہ اس کے لیے شریک کا قائل ہوا۔

دوسرے اپنے اوپر ظلم کہ اپنی حیثیت کو یہاں تک گرا دیا کہ اسے پتھر کے ایک ٹکڑے اور لکڑی کی پرستش تک نیچے لے آیا۔

تیسرے ایک معاشرے اور سوسائٹی پر ظلم کہ شرک کے زیر اثر تفرقہ و پراگندگی اور روح وحدت و یگانگی سے دوری میں گرفتار ہوا۔

مسلمہ طور پر کوئی بھی ظالم خاص طور پر ایسے ظالم کہ جن کا ظلم ہر پہلو سے نمایاں ہے، سعادت و رستگاری اور نجات و فلاح کا منہ نہیں دیکھیں گے ( انہ لا یفلح الظٰلمون )۔

البتہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ لفظ شرک ذکر نہیں ہوا لیکن قبل و بعد کی آیات پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو سب کی سب شرک کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں واضح ہوتا ہے کہ لفظ " افترٰی " سے اس آیت میں مراد وہی ذات الٰہی کے لیے شرک کی تہمت ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں ۱۵ مواقع پر کچھ لوگوں کا ظالم ترین اور ستمگار ترین کے عنوان سے تعارف کرایا گیا ہے، اور وہ سب کے سب جملہ استفہامیہ " ومن اظلم " یا " فمن اظلم " (کون زیادہ ظالم ہے) کے ساتھ شروع ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان آیات میں سے اکثر شرک و بت پرستی اور آیات الٰہی کے انکار کے بارے میں ہی گفتگو کرتی ہیں یعنی ان میں اصل توحید ہی پیش نظر ہے لیکن ان میں سے بعض دوسرے مسائل کے بارے میں بھی ہیں مثلاً:

" وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ "

ان سے زیادہ اور کون شخص ظالم ہے جو مساجد میں ذکر خدا سے روکتے ہیں؟ (بقرہ - ۱۱۴)۔

ایک اور مقام پر ہے :

"وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ"

اُن سے بڑھ کر اور کون ظالم ہے جو شہادت کو چھپاتے ہیں ( بقرہ - ۱۴۰ ) ۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ اِن گروہوں میں سے ہر گروہ ہی سب سے بڑھ کر ظالم ہو جب کہ "ظالم ترین" کا لفظ تو ان میں سے صرف ایک گروہ پر ہی صادق آتا ہے ۔

اس کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ ان سب امور کی حقیقت میں ایک ہی جڑ ہے اور وہ ہے شرک، کفر اور عناد ۔ کیونکہ لوگوں کو مساجد میں ذکر خدا سے منع کرنا اور انہیں ویران و برباد کرنے کی کوشش کرنا کفر و شرک کی نشانی ہے ۔ اسی طرح شہادت کو چھپانا ہے کہ ظاہری طور پر اس سے مراد حقائق پر شہادت کو چھپانا ہے کہ جو وادی کفر میں لوگوں کے بھٹکنے کا سبب بنتا ہے لہٰذا یہ بات بھی شرک و کفر اور خدائے یگانہ کے انکار کی مختلف قسموں میں سے ہے ۔

بعد والی آیت میں قیامت میں مشرکین کے انجام کے سلسلے میں بحث ہوگی تا کہ واضح ہو جائے کہ انہوں نے بتوں جیسی کمزور مخلوق پر بھروسہ کرکے نہ اس دنیا میں اطمینان و راحت حاصل کیا ہے اور نہ ہی دوسرے جہاں میں ۔ ارشادِ الٰہی ہے :

اس روز جب کہ ہم اُن سب کو ایک ہی جگہ مبعوث کریں گے اور مشرکین سے کہیں گے کہ تمہارے وہ بناوٹی معبود جنہیں تم خدا کا شریک خیال کرتے تھے کہاں ہیں ؟ ۔ اور وہ تمہاری مدد کے لیے کیوں نہیں آتے ؟ اور کسی قسم کا اثر ان کی قدرت نمائی کا اس وحشتناک عرصۂ قیامت میں کیوں نظر نہیں آتا ( ویوم نحشرهم جمیعًا ثم نقول للذین اشرکوا این شرکائکم الذین کنتم تزعمون ) ۔

کیا اصل بنیاد یہی نہ تھی کہ وہ مشکلات میں تہاری مدد کریں گے ؟ اور کیا تم نے بھی اسی اُمید پر ان کی پناہ حاصل نہیں کی تھی ؟ تو پھر ان کا یہاں پر کوئی معمولی سے معمولی اثر بھی کیوں دکھائی نہیں دیتا ؟

وہ ہکا بکا رہ جائیں گے اور عجیب و غریب وحشت و حیرت میں ڈوب جائیں گے اور اس سوال کا اُن کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا ۔ سوائے اس کے کہ قسم کھا کر کہنے لگیں کہ خدا کی قسم ہم کبھی بھی مشرک نہیں تھے ۔ ان کا گمان یہ ہوگا جیسے وہاں بھی حقائق کا انکار کیا جاسکتا ہے ( ثم لم تکن فتنتهم الا ان قالوا و الله ربنا ما کنا مشرکین ) ۔ اس بارے میں کہ اوپر والی آیت میں لفظ "فتنہ" کس معنی میں ہے ، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ۔ بعض مفسرین اسے فروتنی اور معذرت کے معنی میں لیتے ہیں ۔ بعض جواب کے معنی میں لیتے ہیں اور بعض نے شرک کے معنی میں لیا ہے [1]

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ "فتنہ" و امتحان سے مراد ان کا وہی دلی میلان ہو ۔ یعنی ان کے شرک و بت پرستی سے ان کے لگاؤ کا نتیجہ کہ جس نے ان کی عقل و فہم پر پردہ ڈال رکھا ہوگا کہ قیامت کے دن جب پردے ہٹ جائیں گے تو اس وقت وہ اپنی اتنی بڑی خطا کی طرف متوجہ ہوں گے اور اپنے اعمال سے بیزاری اختیار

[1] جب یہ لفظ معذرت اور جواب کے معنی میں لیا جائے گا تو اس صورت میں آیت کسی لفظ کے مقدر ہونے کی محتاج نہیں ہوگی لیکن اگر شرک کے معنی میں ہو تو ضروری ہے کہ لفظ "نتیجہ" کو مقدر مانا جائے یعنی ان کے شرک کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ قسم کھائیں گے کہ وہ مشرک نہیں تھے ۔

کریں گے اور ان سے کلی طور پر انکار کر دیں گے۔

لغت میں "فتنہ" کا اصل معنی جیسا کہ راغب "مفردات" میں کہتا ہے یہ ہے کہ سونے کو آگ میں ڈال دیں اور اسے خوب تیز آنچ دیں تاکہ اس کا باطن ظاہر ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ وہ کھرا ہے یا کھوٹا۔ اس معنی کو اُوپر والی آیت میں ایک تفسیر کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ لوگ جب قیامت کے دن سخت پریشانی اور اُس دن کی وحشتوں میں غرق ہوں گے تو پھر انہیں ہوش آئے گا اور وہ اپنی غلطی پر آگاہ ہوں گے اور اپنی نجات کے لیے اپنے گذشتہ اعمال کا انکار کریں گے۔

بعد والی آیت میں اس مقصد سے کہ لوگ ان کے رسوا کن انجام سے عبرت حاصل کریں کہا گیا ہے کہ اچھی طرح غور کرو اور دیکھو کہ ان کا معاملہ کہاں تک پہنچ گیا ہے کہ انہوں نے اپنی روش اور مسلک سے کاملاً بیزاری اختیار کر لی ہے اور اس کا انکار کرتے ہیں یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے جھوٹ بولتے ہیں (انظر کیف کذبوا علی انفسھم)۔

اور تمام سہارے جو انہوں نے اپنے لیے [illegible] کیے ہوئے تھے اور انہیں خدا کا شریک سمجھتے تھے ہاتھ سے نکل جائیں گے اور ان کی کہیں بھی رسائی نہیں ہوگی (وضل عنھم ما کانوا یفترون)۔

## چند اہم نکات

۱۔ "انظر" سے مراد مسلّمہ طور پر عقل کی آنکھوں سے دیکھنا ہے، نہ کہ ظاہری آنکھوں سے دیکھنا، کیونکہ قیامت کا میدان اس دنیا میں ظاہری نہیں دیکھا جا سکتا۔

۲۔ یہ جو کچھ کہا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے اُوپر جھوٹ باندھا تو اس کا معنی ہے کہ انہوں نے دنیا میں اپنے آپ کو فریب دیا اور راہِ حق سے نکل گئے، یا یہ کہ دوسرے جہاں میں جو قسم کھا رہے ہیں کہ ہم مشرک نہیں تھے تو یہ حقیقت میں وہ اپنے آپ سے جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ مسلّمہ طور پر وہ مشرک تھے۔

۳۔ یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُوپر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اپنے سابقہ شرک کا قیامت کے دن انکار کر دیں گے جب کہ روزِ قیامت کی کیفیت اور حقائق کا حسی طور پر مشاہدہ اس طرح سے ہوگا کہ کسی شخص کو یہ مجال نہ ہوگی کہ حق کے خلاف کوئی بات کرے۔ بالکل اس طرح سے جیسے کوئی جھوٹے سے جھوٹا آدمی بھی ہمیں ایسا دکھائی نہیں دیتا جو روزِ روشن میں سورج کے سامنے کھڑا ہو کر یہ کہے کہ فضا تاریک ہے، اس کے علاوہ بعض دوسری آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ روزِ قیامت صراحت کے ساتھ اپنے شرک کا اقرار کریں گے، اور کسی حقیقت کو نہیں چھپائیں گے مثلاً:

"وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰہَ حَدِیْثًا" (نساء - ۴۲)

اس سوال کے دو جواب دیئے جا سکتے ہیں:

پہلا جواب: یہ ہے کہ قیامت میں کئی مراحل ہوں گے، ابتدائی مراحل میں مشرکین خیال کریں گے کہ جھوٹ بول کر بھی خدا کے دردناک عذاب اور سزا سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے لہٰذا وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق جھوٹ بولیں گے

لیکن بعد کے مراحل میں جب وہ یہ سمجھ لیں گے کہ اس طریقہ سے بھاگنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو پھر اپنے اعمال کا اعتراف کریں گے حقیقت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن انسان کی آنکھوں کے سامنے سے رفتہ رفتہ پردے ہٹیں گے۔ ابتدا میں جب کہ مشرکوں نے اپنے نامہ عمل کا پوری طرح غور سے مطالعہ نہیں کیا ہوگا تو جھوٹ کا سہارا لیں گے لیکن بعد کے مراحل میں جب پردے پوری طرح اُٹھ جائیں گے اور تمام چیزیں نظروں کے سامنے ہوں گی تو پھر انہیں اعتراف کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آئے گا۔

ٹھیک مجرموں کی طرح جو ابتدائی تفتیش میں تمام باتوں سے، یہاں تک کہ اپنے دوستوں سے شناسائی کا بھی انکار کر دیتے ہیں لیکن جب انہیں جرم کی اسناد اور منہ بولتی دستاویزات دکھائی جاتی ہیں تو وہ سمجھ جاتے ہیں کہ معاملہ اتنا واضح ہے کہ انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں، لہٰذا پھر وہ اعتراف بھی کر لیتے ہیں اور سب کچھ اگل دیتے ہیں۔

یہ جواب امیرالمومنین حضرت علیؑ سے ایک حدیث میں نقل ہوا ہے [1]

دوسرا جواب یہ ہے کہ اوپر والی آیت اُن افراد کے بارے میں ہے جو حقیقت میں اپنے آپ کو مشرک نہیں سمجھتے تھے مثلاً عیسائی، جو تین خداؤں کے قائل ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو موحد خیال کرتے ہیں۔ یا یہ آیت ایسے اشخاص کے بارے میں ہے جو توحید کے نعرے لگاتے تھے، لیکن ان کے عمل سے شرک کی بو آتی تھی کیونکہ وہ انبیاء کرام کے احکام پاؤں کے نیچے روندتے تھے، غیر خدا پر بھروسہ رکھتے اور خدا کے اولیاء کی ولایت کا انکار کرتے تھے لیکن اس کے باوجود خود کو موحد سمجھتے تھے۔ یہ لوگ قیامت کے دن قسم کھائیں گے کہ ہم تو موحد تھے لیکن بہت جلد انہیں سمجھا دیا جائے گا کہ وہ باطن میں مشرکین میں داخل تھے۔ یہ جواب بھی کئی ایک روایات میں حضرت علی علیہ السلام اور حضرت صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے [2]

اور دونوں جواب قابل قبول ہیں۔

۲۵۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۗ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۗ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

۲۶۔ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ

---

[1] نورالثقلین جلد اول صفحہ ۷۰۸۔

[2] نورالثقلین جلد اول صفحہ ۷۰۸۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○

## ترجمہ

۲۵۔ ان میں سے کچھ لوگ تیری بات تو سنتے ہیں لیکن ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ انہیں نہ سمجھیں، اور ہم نے ان کے کانوں کو بوجھل کر دیا ہے اور وہ (اس قدر ہٹ دھرم ہیں) کہ اگر حق کی تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ وہ جب تیرے پاس آتے ہیں تو تجھ سے جھگڑنے لگتے ہیں اور کافر کہتے ہیں کہ یہ تو پرانے لوگوں کے افسانے ہیں۔

۲۶۔ وہ دوسروں کو اُس سے روکتے ہیں اور خود بھی اُس سے دوری اختیار کرتے ہیں۔ اپنے سوا وہ کسی کو ہلاک نہیں کرتے لیکن سمجھتے نہیں۔

## تفسیر

### حق قبول نہ کرنے والوں کا طرزِ عمل

اس آیت میں بعض مشرکین کی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ حقائق سننے کے لیے خود سے ذرہ بھر توجہ بھی نہیں دیتے۔ یہ تو ایک معمولی سی بات ہے۔ وہ تو اس سے دشمنی پر بھی اُتر آتے ہیں اور تہمتوں کے ذریعہ خود کو اور دوسروں کو بھی اُس سے دور رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں یوں کہا گیا ہے: اُن میں سے بعض تیری بات تو سنتے ہیں لیکن ان کے دلوں پر ہم نے پردے ڈال دیئے ہیں، تاکہ وہ اُسے سمجھ نہ سکیں، اور ان کے کانوں میں ہم نے بوجھل پن پیدا کر دیا ہے تاکہ وہ اُسے نہ سنیں (ومنهم من يستمع اليك وجعلنا على قلوبهم اكنة ان يفقهوه و فى اذانهم وقرًا[1])

حقیقت میں زمانہ جاہلیت کے اندھے تعصبات اور مادی منافع میں غرق ہوتے چلے جانا اور ہوا و ہوس کی پیروی کرنا ان کی عقل و ہوش پر اس طرح غالب آگیا ہے کہ گویا وہ پردے کے نیچے آگئے ہیں (جس کی وجہ سے) نہ تو وہ کسی حقیقت کو سن سکتے ہیں اور نہ ہی مسائل کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں۔

ہم یہ بات کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ اگر اس قسم کے مسائل کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے تو یہ حقیقت

---

[1] اکنۃ "جمع" "کنان" بروزن "کتاب" پردہ کے معنی میں ہے، یا ہر وہ چیز جو چھپا دے اور "وقر" کان کے بوجھل ہونے کے معنی میں ہے۔

میں قانون "علیت" اور خاصیتِ عمل کی طرف اشارہ ہوتا ہے یعنی کج روی میں تسلسل اور ہٹ دھرمی اور بے دینی پر اصرار کا اثر یہ ہے کہ انسان کی روح بھی اسی سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور یہ اعمال انسان کو ٹیڑھے آئینے کی طرح بنا دیتے ہیں کہ (اس ٹیڑھے آئینہ میں) ہر چیز کج اور ٹیڑھی ہی نظر آتی ہے۔ تجربے نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ بدکار اور گنہگار افراد ابتدا میں اپنے بُرے کام سے پریشان اور بے آرام ہوتے ہیں لیکن پھر تدریجاً اُس کے عادی ہو جاتے ہیں اور شاید ایک ایسا دن بھی آجائے کہ وہ اپنے بُرے اعمال کو واجب اور ضروری سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ان کی حق سے مخالفت کرنے اور گناہ پر ہٹ دھرمی اور اصرار کی سزاؤں میں سے ایک سزا ہے کہ جو ہٹ دھرم گنہگاروں کے دامن سے چمٹ جاتی ہے۔

اسی لیے ارشاد ہوتا ہے کہ ان کا معاملہ اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اگر وہ تمام آیات خدا اور اُس کی نشانیوں کو بھی دیکھ لیں تو پھر بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے (وان یروا کل اٰیۃ لا یؤمنوا بہا)۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ جب وہ تیرے پاس آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے دل کے کانوں کو تیری باتوں کی طرف متوجہ کریں اور کم سے کم ایک حق کے متلاشی کی طرح کوئی نہ کوئی حقیقت معلوم ہو جانے کے احتمال میں ہی اس کے بارے میں کچھ غور کریں، وہ منفی روح اور منفی فکر کے ساتھ تیرے سامنے آتے ہیں اور لڑنے، جھگڑنے اور اعتراض کرنے کے سوا ان کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا (حتی اذا جاؤک یجادلونک)۔

وہ تیری اُن باتوں کو سُن کر جو چشمۂ وحی سے نکلی ہیں اور تیری حق گو زبان پر جاری ہوئی ہیں تجھ پر تہمت لگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ باتیں گذشتہ انسانوں کے گھڑے ہوئے قصوں اور افسانوں کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتیں (یقول الذین کفروا ان ھٰذا الا اساطیر الاولین)۔

بعد والی آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ صرف اتنی بات پر ہی قناعت نہیں کرتے اور باوجود اس کے کہ وہ خود گمراہ ہیں ہمیشہ اسی تلاش میں رہتے ہیں کہ حق کے متلاشی لوگوں کو اپنی طرح طرح کی زہر افشانیوں کے ذریعے اس راستے پر چلنے سے روکیں لہٰذا وہ انہیں پیغمبر کے قریب جانے سے منع کرتے ہیں (وھم ینھون عنہ) اور خود بھی اس سے دور دور ہی رہتے ہیں (وینئون عنہ)[1]۔

وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ جو شخص حق کے ساتھ الجھے اور اُس سے بیر رکھے اُس نے خود اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے اور انجام کار قانونِ آفرینش کے مسلمہ اصول کے مطابق حق کا چہرہ باطل کے بادلوں کی اوٹ سے نمایاں ہو جاتا ہے اور "حق" میں جو قوتِ جاذبہ پائی جاتی ہے اُس سے وہ کامیاب ہو کر رہے گا اور باطل اُس بے قدر و قیمت جھاگ کی طرح جو پانی کے اوپر آجاتا ہے نابود ہو کر رہے گا۔ اس بنا پر ان کی کوشش اور فعالیت ان کی اپنی ہی شکست پر انجام پذیر ہوگی اور وہ خود اپنے سوا اور کسی کو بھی ہلاک نہیں کریں گے لیکن اُن میں اس حقیقت کو سمجھنے کی طاقت نہیں ہے (وان یھلکون الا انفسھم وما یشعرون)۔

---

[1] ینئون "نائی" کے مادہ سے ہے جو بروزن "سعی" ہے دوری اختیار کرنے کے معنی میں ہے۔

## مومن قریش حضرت ابوطالب پر ایک بہت بڑی تہمت

اوپر والی آیت کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت اُن بتوں سے متعلق ہے جو ہٹ دھرم مشرکین اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سخت ترین دشمنوں کے بارے میں ہیں۔ ”ھُمْ“ کی ضمیر عربی ادب کے قواعد کے مطابق اُن لوگوں کی طرف لوٹتی ہے جن کے بارے میں اِس آیت میں بحث کی گئی ہے یعنی وہ متعصب کافر جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کرنے اور آزار پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دیتے تھے۔

لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ سنت کے بعض مفسرین نے عربی ادب کے تمام قواعد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دوسری آیت کو پہلی آیت سے علیٰحدہ کرکے اُسے حضرت ابوطالب یعنی امیرالمومنین علیؑ کے والد کے لیے قرار دے دیا ہے۔ وہ آیت کا اس طرح معنی کرتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو پیغمبر اسلامؐ کا دفاع کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُس سے دور رہتے ہیں (وھم ینھون عنہ وینئون عنہ)۔

اور وہ قرآن کی کچھ اور آیات کو جن کے بارے میں ان کے اپنے مقام پر اشارہ ہوگا مثلاً سورہ توبہ کی آیت ۱۱۳ اور سورہ قصص کی آیت ۵۶ کو بھی اپنے مدعا پر گواہ قرار دیتے ہیں۔

لیکن تمام علمائے شیعہ اور اہلِ سنت کے بعض بزرگ علماء مثلاً ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ نے اور قسطلانی نے ارشاد الساری میں اور زینی دحلان نے سیرۃ حلبی کے حاشیہ میں حضرت ابوطالب کو مومنین اہلِ اسلام میں سے بیان کیا ہے۔ اسلام کی بنیادی کتابوں کے منابع میں بھی ہمیں اس موضوع کے بہت سے شواہد ملتے ہیں کہ جن کے مطالعہ کے بعد ہم گہرے تعجب اور حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ حضرت ابوطالب ایک گروہ کی طرف سے اس قسم کی بے مہری اور اتہام کا محل کیوں قرار پاگئے ہیں؟

جو شخص اپنے تمام وجود کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ کا دفاع کیا کرتا تھا اور بار ہا خود اپنے آپ کو اور اپنے فرزند کو پیغمبر اسلامؐ کے وجود مقدس کو بچانے کے لیے خطرات کے مواقع پر ڈھال بنا دیا کرتا تھا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس پر ایسی تہمت لگائی جائے۔

یہی سبب ہے کہ دقتِ نظر کے ساتھ تحقیق کرنے والوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابوطالب کے خلاف مخالفت کی لہر ایک سیاسی ضرورت کی وجہ سے ہے جو شجرۂ خبیثۂ بنی اُمیہ کی حضرت علی علیہ السلام کے مقام و مرتبہ کی مخالفت سے پیدا ہوئی ہے۔

کیونکہ یہ صرف حضرت ابوطالب کی ذات ہی نہیں تھی کہ جو حضرت علی علیہ السلام کے قرب کی وجہ سے ایسے حملے کی زد میں آئی ہو بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو تاریخ اسلام میں کسی طرح سے بھی امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے نزدیکی رکھتا ہے ایسے ناجوانمردانہ حملوں سے نہیں بچ سکا۔ حقیقت میں حضرت ابوطالب کا کوئی گناہ نہیں تھا سوائے

اس کے کہ وہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام جیسے عظیم پیشوائے اسلام کے باپ تھے۔

ہم یہاں پر اُن بہت سے دلائل میں سے جو واضح طور پر ایمانِ ابوطالب کی گواہی دیتے ہیں کچھ دلائل مختصر طور پر فہرست وار بیان کرتے ہیں۔ تفصیلات کے لیے اُن کتابوں کی طرف رجوع کریں جو اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

۱۔ حضرت ابوطالب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے خوب اچھی طرح سے جانتے تھے کہ اُن کا بھتیجا مقام نبوت تک پہنچے گا کیونکہ مورخین نے لکھا ہے کہ جس سفر میں حضرت ابوطالب قریش کے قافلے کے ساتھ شام گئے تھے تو اپنے بارہ سالہ بھتیجے محمد کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس سفر میں انہوں نے آپ سے بہت سی کرامات مشاہدہ کیں۔ ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ جونہی قافلہ بحیرا نامی راہب کے قریب سے گزرا کہ جو قدیم عرصے سے ایک گرجے میں مشغول عبادت تھا اور کتبِ عہدین کا عالم تھا اور تجارتی قافلے اپنے سفر کے دوران اس کی زیارت کے لیے جاتے تھے، تو راہب کی نظریں قافلہ والوں میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جم کر رہ گئیں، جن کی عمر اس وقت بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔

بحیرا نے تھوڑی دیر کے لیے حیران و ششدر رہنے اور گہری اور پُر معنی نظروں سے دیکھنے کے بعد کہا: یہ بچہ تم میں سے کس سے تعلق رکھتا ہے؟ لوگوں نے ابوطالب کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔

"بحیرا" نے کہا: اس بچہ کا مستقبل بہت درخشاں ہے، یہ وہی پیغمبر ہے کہ جس کی نبوت و رسالت کی آسمانی کتابوں نے خبر دی ہے اور میں نے اس کی تمام خصوصیات کتابوں میں پڑھی ہیں[1]

ابوطالب اس واقعہ اور اس جیسے دوسرے واقعات سے پہلے دوسرے قرائن سے بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور معنویت کو سمجھ چکے تھے۔

اہلِ سنت کے عالم شہرستانی (صاحب ملل و نحل) اور دوسرے علماء کی نقل کے مطابق ایک سال آسمانِ مکہ نے اپنی برکت اہلِ مکہ سے روک لی اور سخت قسم کی قحط سالی نے لوگوں کا رخ کیا تو ابوطالب نے حکم دیا کہ اُن کے بھتیجے محمدؐ کو جو ابھی شیر خوار ہی تھے لایا جائے۔ جب بچے کو اس حال میں کہ وہ ابھی پوتڑے میں لپیٹا ہوا تھا انہیں دیا گیا تو وہ اُسے لینے کے بعد خانۂ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور تفرع و زاری کے ساتھ اس طفل شیر خوار کو تین مرتبہ اُوپر کی طرف بلند کیا اور ہر مرتبہ کہتے تھے، پروردگارا، اس بچے کے حق کا واسطہ ہم پر برکت والی بارش نازل فرما۔ کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ افق کے کنارے سے بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا اور مکہ کے آسمان پر چھا گیا اور بارش سے ایسا سیلاب آیا کہ یہ خوف پیدا ہونے لگا کہ کہیں مسجد الحرام ہی ویران نہ ہو جائے۔

اس کے بعد شہرستانی لکھتا ہے کہ یہی واقعہ جو ابوطالب کی اپنے بھتیجے کے بچپن سے اس کی نبوت و رسالت سے آگاہ ہونے پر دلالت کرتا ہے اُن کے پیغمبر پر ایمان رکھنے کا ثبوت بھی ہے اور ابوطالب نے بعد میں اشعار ذیل اسی

---

[1] تلخیص از سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۹۱ اور سیرہ حلبی جلد اول صفحہ ۱۳۱ اور دیگر کتب۔

واقعہ کی مناسبت سے کہے تھے۔

وابیض یستسقی الغمام بوجهه ـــ ثمال الیتامی عصمة الارامل

"وہ ایسا روشن چہرے والا ہے کہ بادل اس کی خاطر سے بارش برساتے ہیں وہ یتیموں کی پناہ گاہ اور بیواؤں کے محافظ ہیں۔"

یلوذ به الهلاك من آل هاشم ـــ فهم عنده فی نعمة وفواضل

"بنی ہاشم میں سے جو چل بسے ہیں وہ اسی سے پناہ لیتے ہیں اور اسی کے صدقے میں نعمتوں اور احسانات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔"

ومیزان عدل لا یخیس شعیرة ـــ ووزان صدق وزنه غیر هائل

"وہ ایک ایسی میزان عدالت ہے کہ جو ایک جو برابر بھی اِدھر اُدھر نہیں کرتا اور درست کاموں کا ایسا وزن کرنے والا ہے کہ جس کے وزن کرنے میں کسی شک وشبہ کا خوف نہیں ہے۔"

قحط سالی کے وقت قریش کا ابوطالب کی طرف متوجہ ہونا اور ابوطالب کا خدا کو آنحضرت کے حق کا واسطہ دینا شہرستانی کے علاوہ اور دوسرے بہت سے عظیم مورخین نے بھی نقل کیا ہے۔ علامہ امینی نے اسے اپنی کتاب "الغدیر" میں "شرح بخاری"، "المواہب اللدنیہ"، "الخصائص الکبریٰ"، "شرح بہجۃ المحافل"، "سیرہ حلبی"، "سیرہ نبوی" اور "طلبۃ الطالب" سے نقل کیا ہے۔[1]

۲۔ اس کے علاوہ مشہور اسلامی کتابوں میں ابوطالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ہماری دسترس میں ہیں۔ اُن میں سے کچھ اشعار ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

والله لن یصلوا الیك بجمعهم ـــ حتی اوسد فی التراب دفینا

"اے میرے بھتیجے خدا کی قسم جب تک ابوطالب مٹی میں نہ سو جائے اور لحد کو اپنا بستر نہ بنالے دشمن ہرگز ہرگز تجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

فاصدع بامرك ما علیك غضاضة ـــ وابشر بذاك وقر منك عیونا

"لہٰذا کسی چیز سے نہ ڈر اور اپنی ذمہ داری اور ماموریت کا ابلاغ کر، بشارت دے اور آنکھوں کو ٹھنڈا کر۔"

ودعوتنی وعلمت انك ناصحی ـ ولقد دعوت وکنت ثم امینا

"تو نے مجھے اپنے مکتب کی دعوت دی اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرا ہدف ومقصد صرف پند ونصیحت کرنا اور بیدار کرنا ہے، تو اپنی دعوت میں امین اور صحیح ہے۔"

---

[1] الغدیر جلد ہفتم صفحہ ۳۴۶۔

ولقد علمت ان دین محمد (ص) ـــ من خیر ادیان البریة دیناً[1]

"میں یہ بھی جانتا ہوں کہ محمد کا دین و مکتب تمام دینوں اور مکتبوں میں سب سے بہتر دین ہے۔

اور یہ اشعار بھی انہوں نے ہی ارشاد فرمائے ہیں:

الم تعلموا انا وجدنا محمداً ـــ رسولا کموسیٰ خط فی اول الکتب

"اے قریش کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موسیٰ علیہ السلام کی مثل ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے مانند خدا کے پیغمبر اور رسول ہیں جن کے آنے کی پیشین گوئی پہلی آسمانی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے اور ہم نے اسے پالیا ہے۔"

وان علیه فی العباد محبة ـــ ولاحیف فی من خصه الله فی الحب[2]

"خدا کے بندے اس سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں اور جسے خداوند تعالیٰ نے اپنی محبت کے لیے مخصوص کر لیا ہو اس شخص سے یہ لگاؤ بے موقع نہیں ہے۔"

ابن ابی الحدید نے جناب ابو طالب کے کافی اشعار نقل کرنے کے بعد (کہ جن کے مجموعہ کو ابن شہر آشوب نے "متشابہات القرآن" میں تین ہزار اشعار کہا ہے) کہتا ہے:

ان تمام اشعار کے مطالعہ سے ہمارے لیے کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ ابو طالب اپنے بھتیجے کے دین پر ایمان رکھتے تھے۔

۳۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت سی ایسی احادیث بھی نقل ہوئی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان کے فداکار چچا ابو طالب کے ایمان پر گواہی دیتی ہیں۔ منجملہ ان کے کتاب "ابو طالب مومن قریش" کے مؤلف کی نقل کے مطابق ایک یہ ہے کہ جب ابو طالب کی وفات ہوگئی تو پیغمبر اکرمؐ نے ان کی تشییع جنازہ کے بعد اس سوگواری کے ضمن میں جو اپنے چچا کی وفات کی مصیبت میں آپؐ کر رہے تھے آپؐ یہ بھی کہتے تھے:

"واابتاه! وا اباطالباه! واحزناه علیك! کیف اسلو علیك یا من ربیتنی صغیراً، واجبتنی کبیراً، وکنت عندك بمنزلة العین من الحدقه والروح من الجسد"[3]

ہائے میرے بابا! ہائے ابو طالب! میں آپ کی وفات سے کس قدر غمگین ہوں۔ کس طرح آپ کی مصیبت کو میں بھول جاؤں، اے وہ شخص جس نے بچپن میں میری پرورش اور تربیت کی اور بڑے ہونے پر میری دعوت پر لبیک کہی، میں آپ کے نزدیک اس طرح تھا جیسے آنکھ خانۂ چشم میں اور روح بدن میں۔

---

[1] و [2] خزانۃ الادب، تاریخ ابن کثیر، شرح ابن ابی الحدید، فتح باری، بلوغ الارب، تاریخ ابو الفدا، سیرۃ نبوی و..... (یہ حوالہ جات الغدیر جلد ۷ کے مطابق درج کئے گئے ہیں)۔

[3] شیخ الاباطح، بنقلہ از ابو طالب مومن قریش۔

نیز آپؐ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ:

"ما نالت منی قریش شیئاً اکرھہ حتی مات ابو طالب"[1]

اہلِ قریش اس وقت تک کبھی میرے خلاف ناپسندیدہ اقدام نہ کر سکے جب تک ابو طالب کی وفات نہ ہو گئی۔

۴۔ ایک طرف سے یہ بات مسلّم ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کو ابو طالب کی وفات سے کئی سال پہلے یہ حکم مل چکا تھا کہ وہ مشرکین کے ساتھ کسی قسم کا دوستانہ رابطہ نہ رکھیں، اس کے باوجود ابو طالب کے ساتھ اس قسم کے تعلق اور مہر و محبت کا اظہار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں مکتب توحید کا معتقد جانتے تھے، ورنہ یہ بات کس طرح ممکن ہو سکتی تھی کہ دوسروں کو تو مشرکین کی دوستی سے منع کریں اور خود ابو طالب سے عشق کی حد تک مہر و محبت رکھیں۔

۵۔ اُن احادیث میں بھی کہ جو اہلِ بیت پیغمبرؐ کے طرق سے ہم تک پہنچی ہیں حضرت ابو طالب کے ایمان و اخلاص کے بڑی کثرت سے مدارک نظر آتے ہیں، کہ جن کا یہاں نقل کرنا طول کا باعث ہوگا، یہ احادیث منطقی اور عقلی استدلالات کی حامل ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث جو چوتھے امام علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس میں امام علیہ السلام نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا ابو طالب مومن تھے؟ جواب دینے کے بعد ارشاد فرمایا:

ان ھنا قوماً یزعمون انہ کافر اس کے بعد فرمایا کہ:

"واعجباً کل العجب ایطعنون علی ابی طالب او علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وقد نہاہ اللہ ان تقر مؤمنۃ مع کافر غیر آیۃ من القرآن ولا یشک احد ان فاطمۃ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا من المؤمنات السابقات فانہا لم تزل تحت ابی طالب حتی مات ابو طالب رضی اللہ عنہ"

"یعنی تعجب کی بات ہے کہ بعض لوگ یہ کیوں خیال کرتے ہیں کہ ابو طالب کافر تھے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ وہ اس عقیدہ کے ساتھ پیغمبرؐ اور ابو طالب پر طعن کرتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ قرآن کی کئی آیات میں اس بات سے منع کیا گیا ہے (اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ) مومن عورت ایمان لانے کے بعد کافر کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور یہ بات مسلّم ہے کہ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا سابق ایمان لانے والوں میں سے ہیں اور وہ ابو طالب کی زوجیت میں ابو طالب کی وفات تک رہیں۔"[2]

۶۔ ان تمام باتوں کو چھوڑتے ہوئے اگر ہر چیز میں ہی شک کریں تو کم از کم اس حقیقت میں تو کوئی شک نہیں کر سکتا کہ ابو طالب اسلام اور پیغمبر اکرمؐ کے درجۂ اوّل کے حامی و مددگار تھے، ان کی اسلام اور پیغمبرؐ کی حمایت اس درجہ تک

---

[1] طبری، مطابق نقل ابو طالب مومن قریش۔

[2] کتاب الحجہ۔ درجات الرفیعہ نقل از الغدیر جلد ۸۔

پہنچی ہوئی تھی کہ جسے کسی طرح بھی رشتہ داری اور قبائلی تعصبات سے منتفی نہیں کیا جاسکتا۔

اس کا زندہ نمونہ شعب ابوطالب کی داستان ہے۔ تمام مورخین نے لکھا ہے کہ جب قریش نے پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کا ایک شدید اقتصادی، سماجی اور سیاسی بائیکاٹ کر لیا اور اپنے ہر قسم کے روابط اُن سے منقطع کر لیے تو آنحضرتؐ کے واحد حامی اور مدافع ابوطالب نے اپنے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا اور برابر تین سال تک ہاتھ کھینچے رکھا اور بنی ہاشم کو ایک درّہ کی طرف لے گئے جو مکہ کے پہاڑوں کے درمیان تھا اور شعب ابوطالب کے نام سے مشہور تھا اور وہاں پر سکونت اختیار کر لی۔ ان کی فداکاری اس مقام تک جا پہنچی کر قریش کے حملوں سے بچانے کے لیے کئی ایک مخصوص قسم کے برج تعمیر کرنے کے علاوہ ہر رات پیغمبر اکرمؐ کو ان کے بستر سے اُٹھاتے اور دوسری جگہ اُن کے آرام کے لیے مہیا کرتے اور اپنے فرزند دلبند علیؑ کو ان کی جگہ پر سلا دیتے اور جب حضرت علیؑ کہتے، بابا جان! میں تو اس حالت میں قتل ہو جاؤں گا تو ابوطالب جواب میں کہتے: میرے پیارے بچے بردباری اور صبر ہاتھ سے نہ چھوڑو، ہر زندہ موت کی طرف رواں دواں ہے۔ میں نے تجھے فرزند عبداللہ کا فدیہ قرار دے دیا ہے۔ یہ بات اور بھی طالب توجہ ہے کہ جو حضرت علی علیہ السلام باپ کے جواب میں کہتے ہیں کہ بابا جان! میرا یہ کلام اس بنا پر نہیں تھا کہ میں راہ محمدؐ میں قتل ہونے سے ڈرتا ہوں، بلکہ میرا یہ کلام اس بنا پر تھا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں کس طرح سے آپ کا اطاعت گزار اور احمد مجتبیٰ کی نصرت و مدد کے لیے آمادہ و تیار ہوں[1]

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص بھی تعصب کو ایک طرف رکھ کر غیر جانبداری کے ساتھ ابوطالب کے بارے میں تاریخ کی سنہری سطروں کو پڑھے گا تو وہ ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ کا ہمصدا ہو کر کہے گا:-

ولولا ابوطالب و ابنہ ـــــ لما مثل الدین شخصا وقاما

فذاك بمكة آوى وحامى ـــــ وهذا بيثرب جس الحماما[2]

"اگر ابوطالب اور ان کا بیٹا نہ ہوتے تو ہرگز دین ومکتب اسلام باقی نہ رہتا اور اپنا قد سیدھا نہ کرتا۔ ابوطالب تو مکہ میں پیغمبر کی مدد کے لیے آگے بڑھے اور علیؑ یثرب (مدینہ) میں حمایت اسلام کی راہ میں گرداب موت میں ڈوب گئے۔"

۲۷۔ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

۲۸۔ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○

---

[1] الغدیر جلد ۸۔

[2] الغدیر جلد ۸۔

## ترجمہ

۲۷۔ اگر تم (ان کی حالت) دیکھو جس وقت وہ آگ کے سامنے کھڑے ہوئے کہتے ہیں کہ کاش ہم (دوبارہ دنیا کی طرف) پلٹ جاتے اور اپنے پروردگار کی باتوں کی تکذیب نہ کرتے اور مومنین میں سے ہو جاتے۔

۲۸۔ (وہ واقع میں پشیمان نہیں ہیں) بلکہ ان کے وہ اعمال و نیات جنہیں وہ پہلے چھپائے ہوئے تھے ان کے سامنے آشکار ہو گئے (اور وہ وحشت میں پڑ گئے ہیں) اور اگر وہ پلٹ جائیں تو وہ پھر انہی اعمال کی طرف لوٹ جائیں گے جن سے انہیں روکا گیا ہے۔ اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔

## تفسیر

### وقتی اور بے اثر بیداری

گذشتہ دو آیات میں مشرکین کی ہٹ دھرمی کے کچھ اعمال کی طرف اشارہ ہوا تھا اور ان دو آیات میں ان کے اعمال کے نتائج کا منظر مجسم ہوا ہے تاکہ وہ دیکھ لیں کہ انہیں کیسا بُرا انجام درپیش ہے اور وہ بیدار ہو جائیں یا کم از کم ان کی کیفیت دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اگر تم ان کی حالت جب وہ قیامت کے دن جہنم کی آگ کے سامنے کھڑے ہوں گے، دیکھو تو تم تصدیق کرو گے کہ وہ کس دردناک انجام و عاقبت میں گرفتار ہوئے ہیں (ولو تریٰ اذ وقفوا علی النار.....)[1]۔

وہ اس حالت سے اس طرح منقلب ہوں گے کہ داد و فریاد کریں گے کاش اس سرنوشت شوم سے نجات اور بُرے کاموں کی تلافی کے لیے دوبارہ دنیا میں پلٹ جاتے، اور وہاں آیات خدا کی تکذیب نہ کرتے اور مومنین کی صف میں قرار پاتے (فقالوا یٰلیتنا نرد ولا نکذب باٰیٰت ربنا و نکون من المؤمنین)[2]۔

---

[1] اس بنا پر "لو" بمعنی شرط ہے اور اس کی جزا وضاحت کی وجہ سے محذوف ہے۔

[2] اہم نکتہ کہ جس کی طرف توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ مشہور قرأت کے مطابق جو دسترس میں ہے "نرد" رفع کے ساتھ اور "لا نکذب" اور "نکون" نصب کے ساتھ پڑھا گیا ہے، حالانکہ ظاہراً ایک دوسرے پر معطوف ہیں لہٰذا تمام کو ایک جیسا ہونا چاہیے۔ اس کی بہترین توجیہ یہ ہے کہ "نرد" جزء تمنی ہے اور "لا نکذبَ" حقیقت میں اس کا جواب ہے اور "واؤ" یہاں بمنزلہ "فا" کے ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ تمنی کا جواب جب "فا" کے بعد ہو تو منصوب ہوتا ہے، فخر الدین رازی، مرحوم طبرسی اور ابوالفتوح رازی جیسے مفسرین نے اس کی اور وجوہ بھی ذکر کی ہیں، لیکن جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ واضح ہے اس بنا پر یہ آیت سورہ "زمر" کی آیہ ۵۸ کے مشابہ ہے جو اس طرح ہے، لو ان لی کرۃ فاکون من المحسنین۔

بعد والی آیت میں کہا گیا ہے کہ یہ جھوٹی آرزو ہے بلکہ یہ اس بنا پر ہے کہ اس دنیا میں جو عقائد، نیتیں اور اعمال انہوں نے چھپا رکھے تھے وہ سب اُن کے سامنے آشکار ہو گئے ہیں اور وہ وقتی طور پر بیدار ہوئے ہیں (بل بدا لھم ما کانوا یخفون من قبل)۔

لیکن یہ پائیدار اور محکم بیداری نہیں ہے، اور مخصوص حالات میں پیدا ہوئی ہے لہٰذا، اگر بفرض محال وہ دوبارہ اس جہاں میں پلٹ بھی جائیں تو انہی کاموں کے پیچھے لگیں گے جن سے انہیں روکا گیا تھا (ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ)۔ اس بنا پر وہ اپنی آرزو اور مدعا میں سچے نہیں ہیں اور وہ جھوٹ بولتے ہیں (وانھم لکاذبون)۔

## چند اہم نکات

۱۔ "بدالھم" (ان کے لیے آشکار ہوا) سے ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقائق کے ایک سلسلہ کو نہ صرف لوگوں سے بلکہ خود اپنے آپ سے بھی مخفی رکھتے تھے جو قیامت کے دن اُن پر آشکار ہو جائیں گے اور یہ مقام تعجب نہیں ہے کہ انسان کسی حقیقت کو خود اپنے آپ تک سے بھی مخفی رکھے اور اپنے وجدان اور فطرت پر پردہ ڈال دے تاکہ وہ جھوٹا اطمینان حاصل کرے۔ وجدان کو فریب دینے کا مسئلہ اور حقائق کو اپنے آپ سے چھپانا اہم مسائل میں سے ہے کہ جس پر وجدان کی فعالیت سے مربوط بحثوں میں خصوصی غور و فکر کیا گیا ہے۔ مثلاً ہم بہت سے ہوس پرست افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے ہوس آلود اعمال کے شدید نقصان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن اس سبب سے کہ راحت کے خیال سے اپنے اعمال کو جاری رکھیں یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اس آگاہی کو اپنے اندر ہی چھپائے رکھیں۔

لیکن بہت سے مفسرین نے لفظ "لھم" کی تعبیر کی طرف توجہ کیے بغیر آیت کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ وہ ایسے اعمال پر منطبق ہو کہ جنہیں وہ لوگوں سے مخفی رکھتے تھے (غور کیجئے)۔

۲۔ ممکن ہے کہا جائے کہ آرزو کرنا کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس میں جھوٹ یا سچ ہو اور وہ اصطلاح میں "انشاء" کی ایک قسم ہے اور "انشاء" میں جھوٹ یا سچ کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ بہت سے "انشاء" ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ کسی خبر کا مفہوم بھی موجود ہوتا ہے، جن میں صدق یا کذب کی گنجائش ہوتی ہے مثلاً بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میری تمنا یہ ہے کہ خدا مجھے بہت سا مال دے تو میں تمہاری مدد کروں۔ یہ ایک آرزو ہے۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر خدا مجھے ایسا مال دیدے تو میں تمہاری مدد کروں گا اور یہ ایک خبری مفہوم ہے۔ جو ہو سکتا ہے جھوٹا ہو۔ لہٰذا مد مقابل جو اُس کے بخل اور تنگ نظری سے آگاہ ہے کہتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، اگر خدا تجھے دے بھی دے تو پھر بھی تو ہرگز ایسا نہیں کرے گا (ایسی صورت بہت سے انشائی جملوں میں نظر آتی ہے)۔

۳۔ یہ جو ہم آیت میں پڑھتے ہیں کہ اگر وہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں تو دوبارہ وہی کام کرنے لگیں گے، یہ اس بنا پر ہے کہ بہت سے لوگ جس وقت اپنی آنکھ سے اپنے اعمال کے نتائج دیکھتے ہیں، یعنی مرحلہ شہود کو پہنچ جاتے ہیں تو وہ وقتی طور پر پریشان اور پشیمان ہو کر یہ آرزو کرتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے اعمال کی تلافی کر سکیں۔ لیکن یہ ندامت

اور پشیمانیاں جو اُسی حالِ شہود اور عمل کا نتیجہ دیکھنے سے مربوط ہیں، ناپائیدار ہوتی ہیں جو تمام لوگوں میں عینی سزاؤں کا سامنا کرتے وقت پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن جب مشاہدات عینی برطرف ہو جاتے ہیں تو یہ خاصیت بھی زائل ہو جاتی ہے اور سابقہ کیفیت پلٹ آتی ہے۔

انہی بت پرستوں کی طرح کہ جو سمندر کے سخت طوفانوں میں گرفتار ہونے پر اور خود کو موت اور فنا کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھ کر خدا کے سوا تمام چیزیں بھول جاتے ہیں لیکن جونہی طوفان رکتا ہے اور وہ امن وامان کے ساحل تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر تمام چیزیں اپنی جگہ پلٹ آتی ہیں[1]

۴۔ اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہیے کہ مذکورہ بالا حالات بت پرستوں کی ایک خاص جماعت کے ساتھ مخصوص ہیں کہ جن کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے، یہ نہیں کہ سب بت پرست ایسے تھے۔ لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس بات پر مامور تھے کہ باقی تمام کو پند و نصیحت کریں، انہیں بیدار کریں اور ہدایت کریں۔

۲۹۔ وَقَالُوْٓا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ○

۳۰۔ وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰی وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○

۳۱۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰٓی اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْهَا ۙ وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰی ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ ○

۳۲۔ وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

## ترجمہ

۲۹۔ انہوں نے کہا: اس دنیاوی زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور ہم ہرگز دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے نہیں جائیں گے۔

---

[1] یونس۔ ۲۲۔

۳۰۔ اگر تم انہیں اس وقت دیکھو جب وہ اپنے پروردگار (کی عدالت) کے سامنے کھڑے ہوں گے تو انہیں کہا جائے گا: کیا یہ حق نہیں ہے؟ تو وہ اس کے جواب میں کہیں گے (جی ہاں) ہمارے پروردگار کی قسم (یہ حق ہے)۔ تو وہ کہے گا: جس بات کا تم انکار کیا کرتے تھے اس کی سزا میں اب عذاب کا مزہ چکھو۔

۳۱۔ جنہوں نے لقائے پروردگار کا انکار کیا مسلّمہ طور پر انہوں نے نقصان اٹھایا (اور یہ انکار ہمیشہ رہے گا) یہاں تک کہ قیامت آجائے گی تو وہ کہیں گے ہائے افسوس کہ ہم نے اس کے بارے میں کوتاہی کی۔ وہ اپنے گناہوں کا (بھاری بوجھ) اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوں گے اور کیسا بُرا بوجھ ہے جو انہوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہوگا۔

۳۲۔ اور دنیاوی زندگی سوائے کھیل کود کے اور کچھ نہیں ہے اور آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو پرہیزگار ہیں۔ کیا تم سوچتے نہیں ہو۔

## تفسیر

پہلی آیت کی تفسیر میں دو احتمال ہیں۔ ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم اور سخت قسم کے مشرکین کی گفتگو کے بعد ہونے والی حالت کی نشاندہی ہے کہ جو قیامت کا منظر دیکھ کر یہ آرزو کریں گے کہ دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں اور تلافی کریں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ لوگ پلٹ بھی جائیں تو نہ صرف یہ کہ تلافی کی فکر نہیں کریں گے اور اپنے کاموں کو جاری رکھیں گے بلکہ اصلاً دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے جانے اور قیامت کا ہی انکار کردیں گے اور بڑے تعجب کے ساتھ کہیں گے کہ زندگی تو صرف یہ دنیاوی زندگی ہی ہے اور اب ہم کبھی دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے نہیں جائیں گے (وقالوا ان ھی الا حیاتنا الدنیا و ما نحن بمبعوثین)[1]

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ آیت مشرکین کے ایک ایسے گروہ کے بارے میں ہے کہ جو معاد کا بالکل ہی انکار کرتے تھے اور یہ ایک جدا بحث پیش کررہی ہے کیونکہ مشرکین عرب میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو معاد کا عقیدہ نہیں رکھتی تھی جبکہ بعض ایسے لوگ بھی تھے جو کسی نہ کسی طرح معاد پر ایمان رکھتے تھے۔

بعد کی آیت میں قیامت کے دن ان کے انجام کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے قرآن یوں کہتا ہے: اگر تم

---

[1] اس احتمال کے مطابق "وقالو" عطف ہے "عادوا" پر اور اس احتمال کو تفسیر "المنار" کے مؤلف نے اختیار کیا ہے۔

اُس وقت انہیں دیکھو کہ جب وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے اور اُن سے کہا جائے گا کیا یہ حق نہیں ہے؛ (ولو ترٰی اذ وقفوا علٰی ربھم قال الیس ھٰذا بالحق) تو وہ جواب میں کہیں گے اجی ہاں ! ہمارے پروردگار کی قسم یہ حق ہے (قالوا بلٰی و ربنا)۔

دوبارہ اُن سے کہا جائے گا: پس تم عذاب اور سزا کا مزہ چکھو، کیونکہ تم اس کا انکار کیا کرتے تھے اور کفر کرتے تھے (قال فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون)۔

مسلّم طور پر (پروردگار کے سامنے کھڑے ہونا) یہ نہیں ہے کہ خدا کوئی مکان رکھتا ہو بلکہ یہ اس کی سزا کے سامنے کھڑا ہونے کے معنی میں ہے جیسا کہ بعض مفسّرین نے بیان کیا ہے یا یہ عدالت الٰہی میں حاضر ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ نماز کے وقت انسان یہ کہتا ہے کہ میں خدا کے سامنے کھڑا ہوں۔

بعد والی آیت میں معاد و قیامت کا انکار کرنے والوں کے نقصان اور گھاٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جنہوں نے پروردگار کی ملاقات کا انکار کیا ہے مسلّم طور پر نقصان میں گرفتار ہیں (قد خسر الذین کذبوا بلقاء اللّٰہ)۔

جیسا کہ پہلے اشارتاً بیان کیا جا چکا ہے پروردگار کی ملاقات سے مراد یا تو ملاقات معنوی اور ایمان شہودی ہے (شہود باطنی) یا میدان قیامت اور اس کی جزا و سزا کے مناظر سے ملاقات ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ انکار ہمیشہ کے لیے جاری نہیں رہے گا اور یہ صرف اس وقت تک ہو گا جب اچانک قیامت برپا ہو جائے اور وہ ان وحشتناک مناظر کا سامنا کریں اور اپنے اعمال کے نتائج اپنی آنکھ سے دیکھ لیں، اس موقع پر ان کی فریاد بلند ہو گی، ہائے افسوس! ہم نے ایسے دن کے لیے کس قدر کوتاہی کی تھی (حتی اذا جاءتھم الساعۃ بغتۃ قالوا یا حسرتنا علٰی ما فرطنا فیھا)۔ "ساعت" سے مراد ہے قیامت کا دن، اور "بغتۃ" کا معنی ہے بطور ناگہانی اور اچانک کہ جس کے وقت کو خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، واقع ہو جائے گی اور قیامت کے دن کے لیے اس نام (ساعۃ) کے انتخاب کا سبب یا تو یہ ہے کہ اس گھڑی لوگوں کا حساب بڑی تیزی کے ساتھ انجام پائے گا اور یا یہ اس کے ناگہانی طور پر وقوع پذیر ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لوگ عالم برزخ سے عالم قیامت کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔

"حسرت" کا معنی "کسی چیز پر افسوس کرنا" ہے، لیکن عرب جب زیادہ متاثر ہوں تو خود حسرت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں "یا حسرتنا" گویا حسرت کی شدت و سختی اس قدر ہے جیسے وہ ایک موجود چیز کی شکل میں اُس کے سامنے مجسم کھڑی ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے وہ گناہوں کا بوجھ اپنے دوش پر لیے ہوئے ہیں (وھم یحملون اوزارھم علٰی ظھورھم)۔

"اوزار" جمع ہے "وزر" کی جس کا معنی ہے سنگین بوجھ، اور یہاں اس سے مراد گناہ ہیں اور یہ آیت تجسم اعمال کی ایک دلیل بن سکتی ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذمہ داری اور جوابدہی کے بار کی سنگینی مراد ہو، کیونکہ ذمہ داریوں کو ہمیشہ بھاری بوجھ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے "کیسا برا بوجھ وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوں گے (الا ساء ما یزرون)۔

مندرجہ بالا آیت میں منکرین معاد کے خسارے اور نقصان کی کچھ باتیں بیان ہوئی ہیں۔ اس بات کی دلیل واضح ہے کیونکہ معاد پر ایمان رکھنا علاوہ اس کے کہ انسان کو ہمیشہ کی سعادت بخش زندگی کے لیے آمادہ کرتا ہے اور اُسے کمالات علمی و عملی کی تحصیل کی دعوت دیتا ہے، آلودگیوں اور گناہوں کے مقابلہ میں انسان کو کنٹرول کرنے میں بھی گہرا اثر رکھتا ہے۔ ہم معاد سے مربوط مباحث میں انشاء اللہ انفرادی و اجتماعی نظر سے اس کے اصلاحی اثر کو وضاحت سے بیان کریں گے۔

اس کے بعد آخرت کی زندگی کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کی حیثیت بیان کرنے کے لیے یوں ارشاد ہوتا ہے، دنیاوی زندگی سوائے کھیل کود کے اور کچھ نہیں (وما الحیوۃ الدنیا الالعب ولھو)۔

اس بنا پر وہ لوگ جنہوں نے صرف دنیا سے دل باندھا ہوا ہے اور اس کے علاوہ اور کسی چیز کے نہ وہ خواہشمند ہیں اور نہ ہی طلبگار ہیں درحقیقت یہ ایسے ہوس باز بچے ہیں کہ جنہوں نے عمر کا ایک حصہ کھیل کود میں گزار دیا ہے اور ہر چیز سے بے خبر رہے ہیں۔

دنیاوی زندگی کو لہو و لعب سے تشبیہ اس وجہ سے دی گئی ہے کیونکہ عام طور پر کھیل کود کے کام اندر سے خالی اور بے بنیاد ہوتے ہیں، جو حقیقی زندگی کے متن سے دور ہیں۔ نہ تو وہ شکست کھاتے ہیں، جنہوں نے فی الحقیقت شکست کھائی ہے اور نہ ہی وہ شکست یافتہ ہوتے ہیں جنہوں نے بازی کو جیت لیا ہے کیونکہ کھیل کے ختم ہونے پر ہر چیز اپنی جگہ پر لوٹ جاتی ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچے ایک دوسرے کے گرد بیٹھ جاتے ہیں اور کھیل شروع کر دیتے ہیں ایک کو "امیر" اور دوسرے کو "وزیر" ایک کو "چور" اور ایک کو قافلہ بناتے ہیں، لیکن تھوڑی سی دیر نہیں گزرتی کہ نہ کوئی امیر رہتا ہے نہ وزیر، نہ چور رہتا ہے اور نہ قافلہ۔

یا تماشیں جو کھیل کود کے طور پر انجام پاتی ہیں اُن میں جنگ، عشق یا دشمنی کے منظر مجسم ہوتے ہیں لیکن گھڑی بھر کے بعد کسی چیز کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔

دنیا ایک ڈرامے کی طرح ہی ہے کہ جس کے کردار اس دنیا کے لوگ ہیں اور کبھی کبھی یہ بچگانہ کھیل ہمارے عقلمندوں اور فہمیدہ لوگوں تک کو بھی اپنے میں مشغول رکھتا ہے، لیکن بہت جلدی کھیل اور ڈرامہ ختم ہونے کا اعلان ہو جاتا ہے۔

"لعب" (بروزن لزج) اصل میں مادہ لعاب (بروزن غبار) لعاب دہن اور رالوں کے معنی میں ہے جو لبوں سے گرتی ہیں اور یہ جو کھیل کو لعب کہتے ہیں اس بنا پر ہے کہ وہ بھی منہ سے رال کے گرنے کی طرح ہے، جو بغیر کسی مقصد کے انجام پاتا ہے۔

اس کے بعد آخرت کی زندگی کا اس سے موازنہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: آخرت کا گھر متقی لوگوں کے لیے بہتر ہے کیا تم فکر نہیں کرتے اور عقل سے کام نہیں لیتے ہو (وللدار الاخرۃ خیر للذین یتقون افلا تعقلون)۔

کیونکہ وہ فنا نہ ہونے والی اور ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے، جس کا جہاں بہت وسیع ہے، اور جس کی سطح بہت ہی اونچی ہے۔ وہ ایک ایسے عالم میں ہے جس کا تعلق حقیقت کے ساتھ ہے نہ کہ مجاز کے ساتھ۔ وہ ایک واقعیت ہے خیال نہیں ہے۔ وہ ایک ایسا جہان ہے جس کی نعمتیں درد و رنج کے ساتھ ملی ہوئی نہیں ہیں اور سراسر خالص نعمتیں ہی نعمتیں ہیں جن میں دُکھ، تکلیف نہیں ہے۔

چونکہ ان واقعات کو صحیح طور پر سمجھنا، دنیا کے فریب دینے والے مظاہر کو پیش نظر رکھتے ہوئے، غور و فکر کرنے والے لوگوں کے سوا دوسروں کے لیے ممکن نہیں ہے لہٰذا آیت کے آخر میں روئے سخن ایسے ہی افراد کی طرف ہے۔

ایک حدیث میں جو ہشام بن حکم کے واسطے سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، آپ نے یوں فرمایا ہے،

اے ہشام! خدا نے عقلمند لوگوں کو نصیحت کی ہے اور آخرت کے لیے تعلق رکھنے والا بنایا ہے، اور کہا ہے کہ دنیا کی زندگی سوائے کھیل کود کے اور کچھ نہیں ہے اور دارِ آخرت متقی اور پرہیزگار لوگوں کے لیے بہتر ہے، کیا تم اپنی عقل اور فکر کو کام میں نہیں لاتے ہو[1]

شاید یہ بات ذکر کرنے کی ضرورت نہ ہو کہ ان آیات کا ہدف اور اصل مقصد مادی دنیا کے مظاہر کے ساتھ دل لگانے اور وابستگی اختیار کرنے اور اس کے آخری مقصد کو بھلا دینے کے خلاف جہاد ہے۔ ورنہ وہ لوگ جنہوں نے دنیا کو حصولِ سعادت کا وسیلہ قرار دے لیا ہے وہ حقیقت میں آخرت کے متلاشی ہیں نہ کہ دنیا کے۔

۳۳۔ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○

۳۴۔ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ○

## ترجمہ

۳۳۔ ہم جانتے ہیں کہ تجھے ان لوگوں کی گفتگو غمگین کر دیتی ہے (مگر تم غم نہ کھاؤ اور جان لو) کہ وہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے بلکہ وہ ظالم تو آیاتِ خدا کا انکار کرتے ہیں۔

---

[1] نور الثقلین جلد ا صفحہ ۱۷۔

۳۴۔ تجھ سے پہلے پیغمبروں کی بھی تکذیب کی گئی ہے مگر انہوں نے اُن تکذیبوں کے مقابلہ میں صبر کیا اور استقامت سے کام لیا اور (اس راہ میں) انہوں نے رنج و تکلیف اٹھائی یہاں تک کہ ہماری مدد اُن تک آن پہنچی (تم بھی اسی طرح رہو اور یہ اللہ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے) اور کوئی چیز اللہ کی سنتوں کو بدل نہیں سکتی اور تمہیں گذشتہ پیغمبروں کی خبریں تو پہنچ ہی گئی ہیں۔

# تفسیر

## مصلحین کے راستے میں ہمیشہ مشکلات رہی ہیں

اس میں شک نہیں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی منطقی گفتگو اور فکری مبارزات میں جو وہ ہٹ دھرم اور سخت مشرکین کے ساتھ رکھتے تھے بعض اوقات ان کی ہٹ دھرمی سے اور اپنی باتوں سے اُن کی روح میں اثر نہ ہونے سے اور بعض اوقات ان کی اُن غیر مناسب نسبتوں سے جو وہ حضرتؐ کی طرف دیتے تھے غمگین اور اندوہ ناک ہو جاتے تھے۔ خداوند تعالیٰ بارہا قرآن مجید میں اپنے پیغمبرؐ کو ایسے مواقع پر تسلی اور دلاسا دیا کرتا تھا تاکہ آنحضرتؐ زیادہ گرمجوشی اور صبر واستقامت کے ساتھ اپنے پروگرام میں مشغول رہیں۔ انہی میں سے مندرجہ بالا آیات بھی ہیں پہلی آیت میں فرماتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں تجھے محزون و مغموم کر دیتی ہیں (قد نعلم انه ليحزنك الذی يقولون)۔

لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے وہ تو درحقیقت ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں۔

لہٰذا ان کے اصل مخالف تو حقیقت میں ہم ہیں نہ کہ تم (فانهم لا يكذبونك ولكن الظّلمين بأيات الله يجحدون)۔

اور اس بات کی نظیر ہمارے درمیان گفتگو میں بھی نظر آتی ہے جبکہ بعض اوقات بزرگ تر شخصیت اپنے نمائندہ کے ناراحت ہونے کے وقت اُس سے کہتی ہے کہ تم کوئی غم نہ کرو یہ اصل میں تو انہوں نے میری مخالفت کی ہے، لہٰذا اگر کوئی مشکل پیدا ہوگی تو وہ میرے لیے ہوگی نہ کہ تمہارے لیے اور اس طرح سے وہ شخصیت اس کی تسلی و تشفی کے اسباب مہیا کرتی ہے۔

زیرِ نظر آیت میں مفسرین نے کچھ اور احتمالات بھی پیش کیے ہیں۔ لیکن ظاہر مفہوم وہی ہے جو ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں۔

یہ احتمال بھی ایک جہت سے قابلِ ملاحظہ ہے کہ آیت سے مراد یہ ہے کہ تیرے مخالفین حقیقت میں تو تیرے صدق و راستی کے معتقد ہیں اور تیری دعوت کے حق ہونے میں شک نہیں رکھتے اگرچہ ان کے منافع خطرے میں پڑ جانے کا خوف ان کے لیے حق کو تسلیم کرنے میں مانع ہو جاتا ہے یا تعصب اور ہٹ دھرمی اسے قبول کرنے کی اجازت

نہیں دیتی۔

تواریخ اسلامی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سخت ترین دشمن تک باطناً آپ کی صداقت اور راست بازی کے معتقد تھے۔ ان میں سے ایک یہ واقعہ ہے کہ ایک دن ابوجہل نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ سے مصافحہ کیا، تو کسی نے اس پر اعتراض کیا: تم اس شخص سے مصافحہ کیوں کر رہے ہو۔ اس نے کہا: خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ وہ پیغمبر ہے لیکن کیا ہم کسی زمانے میں "عبد مناف" کے تابع اور پیرو رہے ہیں! یعنی اس کی دعوت کو قبول کرنا اس بات کا سبب بن جائے گا کہ ہم ان کے قبیلہ کے تابع ہو جائیں) اور یہ بھی تاریخوں میں لکھا ہوا ہے کہ ایک رات ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریق، جو مشرکین مکہ کے سردار اور رئیس تھے ہیں سے ہر ایک اپنے مخفی طریقے سے کہ کوئی شخص ان کی طرف متوجہ نہ ہو، یہاں تک کہ یہ تینوں افراد بھی ایک دوسرے کی حالت سے باخبر نہیں تھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات سننے کے لیے ایک گوشہ میں چھپ کر بیٹھ گئے اور صبح تک آیات قرآن کی تلاوت سنتے رہے، جب صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو وہاں سے چلتے بنے لیکن لوٹتے وقت راستہ میں ایک دوسرے کا آمنا سامنا ہو گیا تو ہر ایک اپنا عذر دوسرے سے بیان کرنے لگا۔ پھر انہوں نے عہد کیا کہ اب دوبارہ یہ کام نہیں کریں گے کیونکہ اگر قریش کے جوانوں کو اس بات کی خبر ہو گئی تو یہ بات ان کے محمدؐ کی طرف جھکاؤ کا سبب بن جائے گی۔

دوسری رات اس گمان سے کہ اس کے ساتھی اس رات نہیں آئیں گے ہر ایک آیات قرآن سننے کی غرض سے پیغمبرؐ کے گھر کے قریب یا مسلمانوں کے مجمع کے قریب آ گیا۔ لیکن صبح ہوتے ہی پھر ان کا راز ایک دوسرے پر فاش ہو گیا اور ایک دوسرے کو سرزنش اور ملامت کرنے لگے اور نئے سرے سے عہد و پیمان باندھا کہ یہ آخری بار ہے۔

لیکن اتفاق کی بات ہے کہ یہ کام تیسری رات پھر دہرایا گیا، جب صبح ہوئی تو اخنس بن شریق اپنا عصا لیے ہوئے ابوسفیان کی تلاش میں نکلا اور اس سے کہنے لگا، مجھے صاف صاف بتا کہ تمہاری ان باتوں کے بارے میں جو تم نے محمدؐ سے سنی ہیں کیا عقیدہ ہے۔ تو وہ کہنے لگا خدا کی قسم کچھ چیزیں تو میں نے ایسی سنی ہیں جنہیں میں نے اچھی طرح جان لیا ہے اور ان کا مقصود و مضمون اچھی طرح سمجھ لیا ہے لیکن کچھ ایسی آیات بھی سنی ہیں جن کا معنی و مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اخنس نے کہا خدا کی قسم میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں اس کے بعد وہ اٹھا اور ابوجہل کی تلاش میں گیا اور یہی سوال اس سے کیا کہ ان باتوں کے بارے میں جو تم نے محمدؐ سے سنی ہیں تمہاری کیا رائے ہے۔ اس نے کہا تو کیا سننا چاہتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم اور اولاد عبد مناف سرداری کے حصول میں ایک دوسرے کے رقیب ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو کھانا کھلایا تو ہم نے بھی اس غرض سے کہ کہیں پیچھے نہ رہ جائیں کھانا کھلایا، انہوں نے سواریاں بخشیں تو ہم نے بھی سواریاں بخشیں، انہوں نے اور دوسری عنایات کیں تو ہم نے بھی اور دوسری عنایات کیں تو اس طرح سے ہم ایک دوسرے کے دوش بدوش تھے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں پیغمبر ہے کہ جس پر آسمانی وحی نازل ہوتی ہے لیکن اب ہم اس امر میں ان کی رقابت کس طرح کر سکتے ہیں (و اللہ لا نؤمن بہ ابداً و لا نصدقہ) خدا کی قسم ہم کبھی بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے، اخنس کھڑا ہو گیا اور اس کی مجلس سے نکل گیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دن "اخنس بن شریق" کا ابوجہل سے آمنا سامنا ہو گیا جب کہ وہاں پر اور کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا۔ تو اخنس نے اس سے کہا: سچ بتاؤ محمدؐ سچا ہے یا جھوٹا، قریش میں سے کوئی شخص سوا میرے اور تیرے یہاں موجود نہیں ہے جو ہماری باتوں کو سُنے۔

ابوجہل نے کہا: وائے ہو تجھ پر خدا کی قسم! وہ میرے عقیدے میں سچ کہتا ہے اور اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن اگر یہ اس بات کی بنا ہو جائے کہ محمدؐ کا خاندان سب چیزوں کو اپنے قبضہ میں کرے، حج کا پرچم، حاجیوں کو پانی پلانا کعبہ کی پردہ داری اور مقام نبوت تو باقی قریش کے لیے کیا باقی رہ جائے گا۔[1]

ان روایات اور ان ہی جیسی دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے سخت ترین دشمن باطناً آپ کی سچائی کے معترف تھے لیکن قبائلی رقابتیں اور اسی قسم کی دوسری باتیں انہیں اجازت نہیں دیتی تھیں یا وہ اس بات کی جرأت نہیں رکھتے تھے کہ باقاعدہ ایمان لے آئیں۔

البتہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس قسم کا باطنی اعتقاد جب تک روح تسلیم کے ساتھ نہ ملا ہو کسی قسم کا اثر نہیں رکھتا اور انسان کو سچے مومنین کے زمرہ میں قرار نہیں دیتا۔

بعد والی آیت میں، اس تسلی کی تکمیل کے لیے گذشتہ انبیاء کے حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: یہ امر صرف تیری ذات کے ساتھ ہی مختص نہیں ہے بلکہ تجھ سے پہلے جتنے رسول گزرے ہیں ان کی بھی اسی طرح سے تکذیب کی جاتی تھی (ولقد کذبت رسل من قبلك)۔

لیکن اُن انبیاء نے اُن تکذیبوں اور تکلیفوں کے مقابلہ میں پامردی اور استقامت دکھائی یہاں تک کہ ہماری مدد و نصرت ان کو پہنچی اور آخر کار وہ کامیاب ہوئے (فصبروا علی ما کذبوا واوذوا حتی اتاھم نصرنا)۔

اور یہ ایک سنت الٰہی ہے کہ جسے کوئی چیز دگرگوں نہیں کر سکتی (ولا مبدل لکلمات اللہ)۔

اس بنا پر تم بھی ان تکذیبوں اور آزاروں اور سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں کے حملوں کے مقابلے میں صبر و استقامت سے کام لو اور یہ جان لو کہ اسی سنت کے مطابق خداوند تعالیٰ کی امداد اور پروردگار عالم کے لطف تمہیں حاصل ہوں گے اور آخر کار تم بھی اُن سب پر کامیابی حاصل کرو گے اور وہ خبریں جو گذشتہ پیغمبروں کے حالات کی تجھ تک پہنچی ہیں کہ انہوں نے مخالفتوں اور شدائد کے مقابلے میں کس طرح صبر و تحمل کیا اور کامیاب ہوئے، وہ تمہارے لیے ایک واضح و روشن گواہ ہیں (ولقد جاءك من نبأ المرسلین)۔

درحقیقت اُوپر والی آیت ایک بنیادی کلیہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ کلیہ یہ ہے کہ ہمیشہ معاشرے کے صالح رہنما جو پست افکار اور معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط رسموں اور خرافات کے مقابلے میں اصلاحی پروگرام پیش کرنے اور صحیح راہ دکھانے کے لیے قیام کرتے ہیں، انہیں ایسے منافع خور اور دروغ گو لوگوں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا

---

[1] مندرجہ بالا روایات تفسیر المنار اور مجمع البیان سے اس آیت کے ذیل میں بیان کردہ تفسیر سے لی گئی ہیں۔

تھا کہ جن کے منافع اس جدید دین و مذہب کی ترقی سے خطرے میں پڑ جاتے تھے۔
وہ اپنے بُرے مقاصد کی پیش رفت کے لیے کسی بھی بات کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور تمام حربے مثلاً تکذیب کا حربہ، تہمت کا حربہ، محاصرۂ اجتماعی کا حربہ تکلیفیں اور دکھ پہنچانے کا حربہ، قتل کرنے اور لوٹ مار کرنے کا حربہ غرضیکہ وہ ہر وسیلے کو کام میں لاتے تھے لیکن حقیقت اپنی اُس جذب و کشش اور گہرائی کے ذریعہ جو اُس کے اندر ہوتی ہے۔ سنتِ الٰہی کے مطابق۔ آخر کار اپنا کام کرے گی اور راستے کے یہ تمام کانٹے ایک ایک کرکے سب ختم ہو جائیں گے۔
لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ اس کامیابی کی بنیادی شرط بردباری، مقاومت، پامردی اور استقامت ہے۔
قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں سنن کو "کلمات اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ "کلم و کلام" دراصل ایک ایسی تاثیر کے معنی میں ہے کہ جو آنکھ یا کان سے محسوس ہو سکے "کلم" تاثیرات عینی کے معنی میں ہے اور "کلام" اُن تاثیرات کو کہتے ہیں جو کانوں سے محسوس کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس میں وسعت پیدا ہو گئی اور اب "الفاظ" کے علاوہ معانی پر بھی "کلمہ" کا لفظ بولا جانے لگا ہے۔ یہاں تک کہ "عقیدہ"، "مکتب"، اور "روش و سنت" پر بھی بولا جاتا ہے۔

۳۵۔ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِى الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِى السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝

۳۶۔ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝

## ترجمہ

۳۵۔ اور اگر تم پر اُن کا اعراض (روگردانی) کرنا گراں ہے تو اگر تم سے ہو سکے تو زمین میں نقب لگا لو یا آسمان میں سیڑھی لگا لو۔ (اور زمین و آسمان کی گہرائیوں میں جستجو کرو) تاکہ کوئی آیت (یا دوسری کوئی اور نشانی) ان کے لیے لا سکو (لیکن یہ جان لو کہ یہ ہٹ دھرم پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے) لیکن اگر خدا چاہے تو انہیں (جبراً) ہدایت پر جمع کر سکتا ہے (لیکن جبری ہدایت کا کیا فائدہ ہے) پس تم ہرگز جاہلوں میں سے نہ ہونا۔

۳۶۔ صرف وہ لوگ (تیری دعوت) قبول کرتے ہیں جو سننے والے کان رکھتے ہیں۔ لیکن مُردے (اور وہ لوگ جو روحِ انسانی ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں ایمان نہیں لائیں گے اور) خدا انہیں (قیامت کے دن) مبعوث کرے

گا پھر وہ اس کی طرف پلٹ جائیں گے۔

# تفسیر

## زندہ تمام مردے

یہ دونوں آیات اُن آیات کا بقیہ ہیں جو پیغمبر کو تسلی کے سلسلے میں گذشتہ آیات میں گزر چکی ہیں۔ چونکہ فکر و روحِ پیغمبرؐ مشرکین کی گمراہی اور ہٹ دھرمی سے زیادہ دکھی اور پریشان تھی اور آپ چاہتے تھے کہ جیسے بھی ہو سکے انہیں مومنین کی صف میں کھینچ لائیں، خدا فرماتا ہے: اگر ان کا اعراض و روگردانی تیرے لیے زیادہ سخت اور گراں ہے تو اگر تم سے ہو سکے تو زمین کو پھاڑ ڈالو اور اس میں نقب لگاؤ اور جستجو کرو، یا آسمان پر کوئی سیڑھی لگاؤ اور اطراف آسمان کی بھی جستجو کرو اور اُن کے لیے کوئی اور آیت یا کوئی دوسری نشانی تلاش کر کے لاسکو تو لے آؤ لیکن یہ جان لو کہ وہ اس قدر ہٹ دھرم ہیں کہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے (وان کان کبر علیک اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض اوسلما فی السماء فتأتیھم بایة)[1]۔

"نفق" اصل میں نقب اور زمین کے نیچے کے راستوں کے معنی میں ہے اور اگر منافق کو منافق کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی مناسبت کی وجہ سے ہے کہ وہ ظاہری راہ و روش کے علاوہ اپنے لیے ایک مخفی راہ و روش بھی رکھتا ہے اور "سلم" سیڑھی کے معنی میں ہے۔

خداوند تعالیٰ اس جملے کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو یہ سمجھا رہا ہے کہ تمہاری تعلیمات، دعوت اور سعی و کوشش میں کسی قسم کا نقص نہیں ہے بلکہ نقص و عیب ان کی طرف سے ہے انہوں نے یہ پختہ ارادہ کر رکھا ہے کہ وہ حق کو قبول نہیں کریں گے۔ لہٰذا کسی قسم کی کوئی کوشش ان پر اثر نہیں کرتی تو تم پریشان نہ ہو جاؤ۔

لیکن اس بنا پر کسی کو یہ توہم نہ ہو جائے کہ خدا میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ اُن سے اپنی بات کو تسلیم کرا سکے، بلا فاصلہ فرماتا ہے: اگر خدا چاہے تو وہ اُن سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا ہے، یعنی وہ تیری دعوت کے سامنے ان کا سرِ تسلیم خم کرا کے انہیں حق اور ایمان کا اعتراف کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے (ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدیٰ)۔

لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کا جبری ایمان بے فائدہ ہے۔ انسان کی فطرت میں حصول کمال کے لیے "اختیار" اور "آزادیٔ ارادہ" ہی بنیاد ہوتے ہیں۔ یہ آزادیٔ ارادہ ہی ہے کہ جس کی وجہ سے مومن کی کافر سے، نیک کی بد سے، امانت دار کی خائن سے، سچے کی جھوٹے سے قیمت پہچانی جاتی ہے، ورنہ جبری ایمان و تقویٰ سے اچھے اور بُرے کے درمیان کسی قسم کا فرق باقی نہیں رہے گا اور یہ مفاہیم جبر کی صورت میں اپنی قدر و قیمت بالکل کھو بیٹھتے ہیں۔

---

[1] حقیقت میں "ان استطعت" کا جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے: ان استطعت...... فافعل ولکنھم لا یومنون۔

اس کے بعد کہتا ہے یہ باتیں ہم نے تجھ سے اس لیے کہی ہیں کہ کہیں تو جاہلوں میں سے نہ ہو جائے ۔ یعنی بیتاب نہ ہو، صبر واستقامت کو ہاتھ سے نہ دے اور ان کے کفر و شرک پر اتنا دکھی نہ ہو، اور یہ جان لو کہ راستہ تو وہی ہے کہ جس پر تم چل رہے ہو ( فلا تکونن من الجاھلین )۔

اس میں شک نہیں ہے کہ پیغمبر ان حقائق کو خوب اچھی طرح سے جانتے تھے لیکن خداوند تعالیٰ یاد دہانی اور تسلی کے طور پر اپنے پیغمبر کے لیے ان الفاظ کو دہرا رہا ہے ۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ ہم کسی ایسے شخص کو جس کا بیٹا مر گیا ہو یوں کہتے ہیں کہ: غم نہ کھاؤ، دنیا فنا کی جگہ ہے، سب ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے، اس کے علاوہ تم تو ابھی جوان ہو۔ تمہاری اور بھی اولاد ہو جائے گی، لہٰذا زیادہ بیتاب نہ ہو۔

مسلمہ طور پر دار دنیا کا فانی ہونا یا اس کا جوان ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جو اس پر پوشیدہ ہو، یہ تمام باتیں اُس سے صرف یاد دہانی کے طور پر کہی جاتی ہیں۔

باوجود اس کے کہ اُوپر والی آیت جبر کی نفی کرنے والی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے، بعض مفسرین جیسے فخرالدین رازی نے اسے مسلک جبر کی دلیلوں میں سے ایک دلیل سمجھا ہے اور وہ لفظ ( ولو شاء ..... ) کا سہارا لیتے ہوئے کہتا ہے: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نہیں چاہتا کہ کفار ایمان لائیں۔

( حالانکہ وہ اس سے ) غافل ہیں کہ مشیت وارادہ اُوپر والی آیت میں مشیت وارادۂ اجباری ہے یعنی خدا یہ نہیں چاہتا کہ لوگ جبر سے اور زبردستی ایمان لائیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی رضا ورغبت اور اپنے ارادہ سے بخوشی ایمان لائیں۔ اس بنا پر یہ آیت جبریوں کے عقیدہ کی نفی پر واضح گواہ ہے۔

بعد والی آیت میں اس موضوع کی تکمیل اور پیغمبر کی مزید دلجوئی اور تسلی کے لیے کہتا ہے کہ جو لوگ سننے والے کان رکھتے ہیں وہ تیری دعوت کو قبول کرتے ہیں اور اس پر لبیک کہتے ہیں ( انما یستجیب الذین یسمعون )۔

لیکن وہ لوگ جو عملاً مردوں کی صف میں شامل ہیں وہ ایمان نہیں لاتے یہاں تک کہ خدا انہیں قیامت کے دن اُٹھائے اور وہ اس کی بارگاہ میں لوٹیں ( والموتیٰ یبعثھم اللہ ثم الیہ یرجعون[1] )۔

وہ ایسا دن ہے کہ قیامت کے مناظر دیکھ کر وہ ایمان لے آئیں گے لیکن اُن کا اس وقت ایمان لانا انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا کیونکہ یہ عظیم منظر دیکھ کر جو لوگ ایمان لائیں گے ان کا یہ ایمان ایک قسم کا اضطراری ایمان ہوگا۔

شاید اس بات کے وضاحت کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہو کہ "موتیٰ" ( مردے ) سے مراد اُوپر والی آیت میں جسمانی طور پر مردے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد باطنی ومعنوی مردے ہیں کیونکہ ہم دو قسم کی موت وحیات رکھتے ہیں، ایک حیات و موت مادی ہے اور دوسری موت وحیاتِ معنوی۔ اسی طرح شنوائی اور بینائی بھی دو قسم کی ہے ایک مادی اور دوسری

---

[1] ترکیب کی نظر سے "الموتیٰ" مبتدا ہے اور "یبعثھم اللہ" اس کی خبر ہے اور یہ جو کہتا ہے کہ وہ مردوں کو مبعوث کرے گا اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی قسم کی تبدیلی ان کے حالات میں پیدا نہیں ہوگی سوائے اس کے کہ وہ قیامت میں مبعوث ہوں گے اور حقائق کو دیکھیں گے۔

معنوی۔ اسی دلیل سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایسے اشخاص کے بارے میں کہ جو آنکھیں بھی رکھتے ہیں کان بھی رکھتے ہیں یا زندہ سالم تو ہیں لیکن وہ حقائق کو نہیں سمجھتے کہتے ہیں کہ وہ اندھے بہرے ہیں یا بالکل مردہ ہیں، کیونکہ جو ردعمل ایک بینا و شنوا یا ایک زندہ انسان سے ہونا چاہیے وہ حقائق کے سامنے نہیں دکھاتے۔ قرآن مجید میں ایسی تعبیرات کثرت سے نظر آتی ہیں اور ان میں ایک خاص کشش پائی جاتی ہے بلکہ قرآن حیات مادی اور ظاہری زندگی کو جس کی نشانی صرف کھانا، سونا اور سانس لینا ہے، کچھ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ ہمیشہ حیاتِ معنوی و انسانی پر جو ذمہ داری و جوابدہی اور احساس و درد اور بیداری و آگاہی کے ساتھ ملی ہوئی ہو، انحصار کرتا ہے۔

اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ نابینائی و ناشنوائی اور معنوی موت خود ان کی اپنی وجہ سے ہے، وہ خود ہی وہ لوگ ہیں کہ جو بار بار گناہ کرنے اور اس پر اصرار اور ہٹ دھرمی کرنے کے سبب سے اس مرحلہ تک پہنچ جاتے ہیں کیونکہ بالکل اسی طرح سے جیسا کہ اگر کوئی انسان ایک مدت تک اپنی آنکھ کو بند کیے رکھے تو وہ آہستہ آہستہ اپنی بینائی اور نظر کو گنوا بیٹھے گا اور شاید ایک روز بالکل اندھا ہو جائے۔ جو اشخاص اپنے دل کی آنکھوں کو حقائق کی طرف سے بند کرلیں تو وہ تدریجاً اپنی معنوی بصارت کی قوت کو زائل کر دیں گے۔

۳۷۔ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○

## ترجمہ

۳۷۔ اور انہوں نے کہا کہ کوئی نشانی (اور معجزہ) اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر کیوں نازل نہیں ہوتا، تم کہہ دو کہ خداوند تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی نشانی نازل کرے لیکن اُن میں سے اکثر کو اس کا علم نہیں ہے۔

## تفسیر

اس آیت میں مشرکین کی بہانہ جوئیوں میں سے ایک بہانہ جوئی کو بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جب سردارانِ قریش میں سے کچھ قرآن کا مقابلہ کرنے سے عاجز آگئے تو پیغمبرؐ سے کہنے لگے کہ ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے اگر تم سچ کہتے ہو تو عصائے موسیٰ اور ناقہ صالح جیسے معجزات ہمارے لیے لے آؤ۔ قرآن اس بارے میں کہتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ کوئی نشانی اور معجزہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر کیوں نازل نہیں ہوا (وقالوا لولا نزل علیہ آیۃ من ربہ)۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ یہ تجویز حقیقت کی تلاش کے لیے پیش نہیں کرتے تھے کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے لیے کافی مقدار میں معجزات لا چکے تھے اور اگر قرآن کے علاوہ جو مضامین عالیہ پر مشتمل ہے۔ آپ کے پاس اور کوئی معجزہ نہ بھی ہوتا تو وہی قرآن جو انہیں کئی آیات میں باقاعدہ مقابلے کی دعوت دے چکا تھا اور اصطلاح کے مطابق انہیں چیلنج کر چکا تھا، وہی آپ کی نبوت کے اثبات کے لیے کافی تھا لیکن یہ ابوالہوس بہانہ جو ایک طرف سے یہ چاہتے تھے کہ قرآن کی تحقیر کریں اور دوسری طرف سے پیغمبرؐ کی دعوت قبول کرنے سے روگردانی کریں۔ لہٰذا پے در پے نئے سے نئے معجزہ کی درخواست کرتے تھے اور مسلمہ طور پر اگر پیغمبرؐ ان کی درخواست کو تسلیم بھی کر لیتے تو "ھذا سحر مبین" کہہ کر سب کا انکار کر دیتے۔ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

لہٰذا قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے، خداوند تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی ایسی نشانی اور معجزہ (کہ جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو) اپنے پیغمبر پر نازل کرے (قل ان اللہ قادر علی ان ینزل اٰیۃ) لیکن اس میں ایک ایسا اشکال ہے کہ جس سے تم بے خبر ہو اور وہ یہ ہے کہ اگر اس قسم کے تقاضوں پر جو تم ہٹ دھرمی کی بنا پر کرتے ہو تمہاری بات مان لی جائے اور تم پھر بھی ایمان نہ لاؤ تو تم سب کے سب خداوند تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار ہو کر نابود ہو جاؤ گے۔ کیونکہ یہ پروردگار عالم کی بارگاہِ اقدس میں اور اس کے بھیجے ہوئے رسول اور اس کے آیات و معجزات کی انتہائی بے حرمتی ہے لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں (ولکن اکثرھم لایعلمون)۔

## ایک اشکال اور اس کا جواب

جیسا کہ تفسیر مجمع البیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں پہلے بعض مخالفین اسلام نے اس آیت کو دستاویز قرار دیتے ہوئے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے پاس کوئی معجزہ نہیں تھا کیونکہ جس وقت کفار اُن سے معجزہ دکھانے کا تقاضا کیا کرتے تھے تو وہ اُن سے صرف اتنا کہنے پر ہی قناعت کیا کرتے تھے کہ خدا ہی ایسی چیزوں پر قدرت رکھتا ہے لیکن تمہاری اکثریت نہیں جانتی۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ متاخرین میں سے بعض لکھنے والوں نے بھی یہی پُرانا افسانہ دہرایا ہے اور اپنی تحریروں میں اُسی پُرانے اعتراض کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔

جواباً عرض ہے کہ:

پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قبل و بعد کی آیات کا ٹھیک طور پر مطالعہ نہیں کیا ہے اور یہ غور نہیں کیا کہ یہاں پر اُن ہٹ دھرم لوگوں کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جو کسی طرح بھی حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اب اگر پیغمبرؐ نے اُن کے تقاضا کو پورا نہیں کیا تو اس کی وجہ بھی یہی تھی۔ ورنہ قرآن میں یہ کہاں ہے کہ حق کی جستجو اور حق کی طلب کرنے والے افراد نے پیغمبرؐ سے معجزہ کا تقاضا کیا ہو اور آپؐ نے ان کی خواہش کو رد کر دیا ہو۔ اسی سورہ انعام کی آیہ ۱۱۱ میں اسی قسم کے ہٹ دھرم افراد کے سلسلہ میں ہے:

"ولو اننا نزلنا الیھم الملائکۃ وکلمھم الموتیٰ وحشرنا علیھم کل شیء قبلاً ما کانوا لیؤمنوا"[ملہ]

دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے یہ مطالبہ سردارانِ قریش کی ایک جماعت کی طرف سے تھا اور انہوں نے قرآن کریم کی تحقیر اور اُس سے بے پرواہی برتتے ہوئے اس قسم کا مطالبہ کیا تھا اور یہ بات مسلم ہے کہ پیغمبر ایسے تقاضوں کے سامنے جن کا سرچشمہ ایسے اسباب ہوں سر نہیں جھکا سکتے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں انہوں نے گویا قرآن کریم کی باقی تمام آیات کو اپنی نگاہ سے دور کر رکھا ہے کہ کس طرح قرآن نے خود ایک جاودانہ معجزہ کے طور پر اپنا تعارف کروایا ہے اور بارہا مخالفین کو مقابلے کی دعوت دیتا رہا ہے اور اُن کے ضعف و ناتوانی کو آشکار کر چکا ہے۔

معترضین نے سورۂ اسراء کی پہلی آیت کو بھی بھلا دیا ہے جو صریحاً کہتی ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ایک ہی رات میں مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک لے گیا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ یہ بات باور نہیں کی جا سکتی کہ قرآن انبیاء و مرسلین کے معجزات اور خارق عادات سے پُر ہو اور پیغمبر اسلام کہے کہ میں تمام انبیاء کا خاتم ہوں، سب سے افضل و برتر ہوں اور میرا دین بالاترین دین ہے لیکن حق کے متلاشیوں کے لیے کمترین معجزہ بھی اپنی طرف سے نہ دکھا سکے۔ کیا اس صورت میں غیر جانبدار حقیقت طلب افراد کے لیے اس کی دعوت میں نقطہ ابہام پیدا نہیں ہوگا۔

اگر اُن کے پاس کوئی معجزہ نہ ہوتا تو ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ دوسرے انبیاء کے معجزات کا بالکل ہی نام تک نہ لیتے تاکہ وہ اپنے پروگرام کی توجیہ کر سکیں اور اپنے اُوپر کیے جانے والے اعتراضات کے راستوں کو بند کر دیں، اور یہ بات کہ وہ برملا طور پر کھلے دل کے ساتھ پے در پے دوسروں کے معجزات بیان کر رہے ہیں اور موسیٰؑ بن عمران، عیسیٰؑ بن مریمؑ، ابراہیمؑ، صالحؑ اور نوحؑ کے خارق عادت کام اور معجزات کو ایک ایک کر کے بیان کرتے چلے جا رہے ہیں یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ اپنے معجزات کی طرف سے کاملاً مطمئن تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تواریخ اسلام، معتبر روایات اور نہج البلاغہ میں پیغمبر اکرمؐ سے مختلف قسم کے معجزات نقل ہوئے ہیں کہ جن کا مجموعہ حد تواتر کو پہنچا ہوا ہے۔

۳۸۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝

## ترجمہ

۳۸۔ کوئی زمین میں چلنے والا جانور اور کوئی دو پروں سے اُڑنے والا پرندہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ تمہاری طرح کی

ملہ۔ آیت کا مفہوم یہ ہے: اگر ہم ان کے پاس فرشتے بھی نازل کرتے اور مُردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور تمام چیزوں کو گروہ در گروہ ان کے پاس لا کھڑا کرتے تو یہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ (مترجم)

اُمت ہیں۔ ہم نے کسی چیز کو اس کتاب میں فروگذاشت نہیں کیا ہے پھر وہ سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف محشور ہوں گے۔

# تفسیر

چونکہ یہ آیت وسیع مباحث اپنے پیچھے رکھتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ پہلے آیت کے الفاظ کے معانی اور پھر اس کی اجمالی تفسیر ذکر کرکے، پھر باقی مباحث کو بیان کریں۔

"دابۃ" "دبیب" کے مادہ سے آہستہ چلنے اور چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھانے کے معنی میں ہے عام طور پر زمین پر چلنے والے سب جانداروں کو دابّہ کہا جاتا ہے اگرچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سخن چین اور چغل خور کو "دیبوب" کہا جاتا ہے اور حدیث میں وارد ہوا ہے:

"لا یدخل الجنۃ دیبوب"

کوئی چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔

یہ بھی اسی لحاظ سے ہے کہ وہ آہستہ آہستہ دو افراد کے درمیان آمد و رفت کرتا ہے تاکہ انہیں ایک دوسرے سے بدبین اور بدظن کردے۔

"طائر" ہر قسم کے پرندے کو کہا جاتا ہے۔ البتہ چونکہ بعض مواقع پر ایسے امورِ معنوی و روحانی پر بھی جو پیش رفت اور پرواز رکھتے ہیں، یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ لہٰذا زیرِ بحث آیت میں اس لحاظ سے کہ نگاہ صرف پرندوں پر مرکوز رہے (یطیر بجناحیہ) یعنی اپنے دو پروں کے ساتھ اڑتا ہے کے جملہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

"امم" جمع ہے "اُمت" کی اور اُمت کا معنی ہے" وہ جماعت جو ایک قدرِ مشترک رکھتی ہو" مثلاً ان کا دین ایک ہو یا زبان ایک ہو یا صفات اور افعال ایک جیسے ہوں۔

"یحشرون" "حشر" کے مادہ سے جمع کرنے کے معنی میں ہے لیکن قرآن میں عام طور پر روزِ قیامت کے اجتماع پر یہ لفظ بولا جاتا ہے خصوصاً جب اُس کے ساتھ "الی ربھم" کا ضمیمہ ہو۔

گذشتہ آیات مشرکین کے بارے میں بحث کر رہی تھیں اور انہیں اس انجام کی طرف جو انہیں قیامت میں پیش آئے گا متوجہ کر رہی تھیں۔ اب یہ آیت تمام زندہ موجودات اور تمام قسم کے حیوانات کے عام حشر و نشر اور قیامت میں اُٹھنے کا بیان کر رہی ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: کوئی زمین پر چلنے والا جانور نہیں اور کوئی دو پروں سے اُڑنے والا پرندہ نہیں مگر یہ کہ وہ بھی تمہاری طرح کی اُمت ہیں (وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم)

اور اس طرح سے تمام قسم کے جانور اور ہر قسم کے پرندے انسانوں کی طرح اپنے لیے ایک اُمت ہیں لیکن یہ کہ یہ ایک جیسا ہونا اور یہ شباہت کس جہت سے ہے، اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض ان کی انسانوں سے شباہت خلقت کے تعجب خیز اسرار کی جہت سے سمجھتے ہیں کیونکہ دونوں ہی خالق دآفریدگار کی عظمت کی نشانیاں اپنے ساتھ لیے ہوئے ہیں۔

بعض سمجھتے ہیں کہ یہ شباہت زندگی کی مختلف ضروریات کی جہت سے ہے یا اُن وسائل کے لحاظ سے کہ جن کے ذریعے وہ اپنی طرح طرح کی حاجتوں کو پورا کرتے ہیں۔

جبکہ کچھ دوسرے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی انسان کے ساتھ شباہت سے مراد ادراک اور فہم و شعور میں شباہت ہے۔ یعنی وہ بھی اپنے عالم میں علم، شعور اور ادراک رکھتے ہیں، وہ خدا کی معرفت رکھتے ہیں اور اپنی توانائی کے مطابق اس کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں اگرچہ ان کی فکر، انسانی فکر و فہم سے بہت نچلی سطح پر ہے اور جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا، آیت کا ذیل آخری نظریے کو تقویت دیتا ہے۔

پھر بعد کے جملے میں ہے: ہم نے کتاب میں کسی چیز کو فروگذاشت نہیں کیا ہے (ما فرطنا فی الکتاب من شیئ)۔

ممکن ہے کہ "کتاب" سے مراد قرآن مجید ہو کہ تمام چیزیں (یعنی وہ تمام چیزیں امور جو انسان کی تربیت و ہدایت اور تکامل و ارتقا سے مربوط ہیں) اس میں موجود ہیں۔ البتہ بعض اوقات کلی صورت میں بیان ہوئے ہیں جیسے ہر قسم کے علم و دانش کی طرف دعوت اور بعض اوقات جزئیات کو بھی بیان کیا گیا ہے جیسے بہت سے احکام اسلامی اور مسائل اخلاقی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ "کتاب" سے مراد "عالم ہستی" ہو کیونکہ عالم آفرینش ایک عظیم کتاب کی مانند ہے کہ جس میں تمام چیزیں آگئی ہیں اور کوئی چیز اس میں فروگذار نہیں ہوئی۔

اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ آیت میں دونوں تفاسیر ہی مراد ہوں کیونکہ نہ تو قرآن میں مسائل تربیتی فروگذار ہوئے ہیں اور نہ ہی عالم آفرینش و خلقت میں کوئی نقص، کمی اور کسر رہ گئی ہے۔

اور آیت کے آخر میں ہے: وہ تمام خدا کی طرف قیامت میں جمع ہوں گے (ثم الی ربهم یحشرون)۔

ظاہر یہ ہے کہ "هم" کی ضمیر اس جملے میں تمام چلنے والے جانوروں اور پرندوں کی تمام اصناف اور انواع و اقسام کی طرف لوٹتی ہے اور اس طرح سے قرآن اُن کے لیے بھی قیامت میں محشور ہونے کا قائل ہوا ہے اور زیادہ تر مفسرین نے اسی مطلب کو قبول کیا ہے کہ تمام قسم کے جاندار حشر و نشر اور جزا و سزا رکھتے ہیں۔ صرف بعض اس کے منکر ہوئے ہیں اور انہوں نے اس آیت کی اور دوسری آیات کی ایک اور طرح توجیہ کی ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا ہے کہ "حشر الی اللہ" سے مراد زندگی کا ختم ہونا اور موت ہے[1]

لیکن جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں قرآن مجید میں اس تعبیر کا ظاہر وہی قیامت میں حشر و نشر کا ہونا اور دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے جانا ہے۔ اس بنا پر آیت مشرکین کو آگاہ کر رہی ہے کہ وہ خدا جس نے تمام قسم کے جانوروں کو پیدا کیا، اُن کی ضروریات کو مہیا کیا اور ان کے تمام افعال کا نگران ہے اور اُن سب کے لیے اُس نے حشر و نشر قرار دیا ہے

---

[1] یہ احتمال المنار کے مؤلف نے ابن عباس سے نقل کیا ہے۔

کیسے ممکن ہے کہ وہ تمہارے لیے حشر و نشر قرار نہ دے اور بعض مشرکین کے قول کے مطابق دنیاوی زندگی اور اس کی حیات و موت کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو۔

## چند قابلِ غور باتیں

۱۔ کیا جانوروں کے لیے بھی حشر و نشر ہے: اس میں شک نہیں کہ حساب و کتاب اور جزا و سزا کی پہلی شرط مسئلۂ عقل و شعور ہے اور اس کے بعد فرائض کا وجوب اور جوابدہی کی ذمہ داری ہے۔ اس عقیدے کے طرفدار کہتے ہیں کہ ایسے ثبوت موجود ہیں کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جانور بھی اپنی مقدار و انداز کے مطابق فہم و ادراک رکھتے ہیں۔ منجملہ اُن کے یہ ہے کہ بہت سے جانوروں کی زندگی ایسے تعجب انگیز اور پرکشش نظام کے ساتھ ملی ہوئی ہے جو ان کے فہم و شعور کی سطح عالی کو واضح کرتی ہے۔ کون ایسا شخص ہے کہ جس نے چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں اور ان کے عجیب و غریب تمدن اور ان کے چھتے اور بلوں کے تعجب انگیز نظام کی باتیں نہ سنی ہوں اور اُن کے تحسین آمیز ادراک و شعور پر آفرین نہ کہی ہو۔ اگرچہ بعض حضرات اس بات کی طرف مائل ہیں کہ ان تمام باتوں کو ایک فطری اور طبعی الہام جانیں۔ حالانکہ اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ ان کے اعمال لاعلمی کی صورت میں (فطری طور پر بغیر عقل کے) انجام پا جاتے ہیں۔

اس بات میں کونسا امر مانع ہے کہ ان کے یہ تمام اعمال جیسا کہ ان کا ظاہر نشاندہی کرتا ہے، عقل و ادراک کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جانور بغیر گذشتہ تجربے کے اور پیش بینی نہ ہونے کے حوادثات کے مقابلے میں نئی راہ تلاش کر لیتے ہیں۔ مثلاً وہ بھیڑ جس نے عمر بھر کبھی بھیڑیئے کو نہیں دیکھا جب پہلی بار اس کو دیکھتی ہے تو اچھی طرح اس دشمن کے خطرناک ہونے کی تشخیص کر لیتی ہے اور جس ذریعہ سے ہو سکے اپنے دفاع اور خطرے سے نجات کے لیے کوشش کرتی ہے۔

بہت سے جانور جو اپنے مالکوں کے ساتھ تدریجی طور پر لگاؤ اور محبت پیدا کر لیتے ہیں اس موضوع کا دوسرا گواہ ہیں۔ بہت سے درندے اور خطرناک کتے اپنے مالکوں کے ساتھ حتیٰ کہ اُن کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بھی ایک مہربان خدمت گار کی طرح برتاؤ کرتے ہیں۔

جانوروں کی وفاداری کے بہت سے واقعات اور یہ کہ وہ کس طرح سے انسانی خدمات کا بدلہ اتارتے ہیں کتابوں میں اور لوگوں کے درمیان مشہور ہیں کہ اُن تمام کو محض افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔

مسلّم ہے کہ ان تمام باتوں کو آسانی کے ساتھ فطرت کی پیداوار نہیں کہا جا سکتا کیونکہ فطرت عام طور پر ایک ہی قسم کے دائمی کاموں کا سرچشمہ ہوتی ہے لیکن وہ اعمال جو ایسی خاص شرائط میں پیش بینی کے قابل نہ تھے عکس العمل کے عنوان سے انجام پاتے ہیں فطرت کی نسبت فہم و شعور سے زیادہ شباہت رکھتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں بہت سے جانوروں کو اہم مقاصد کے لیے تربیت دی جاتی ہے: مجرموں کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس کے کتے، خطوں کو پہچانے کے لیے کبوتر، دکانوں سے سودا سلف خریدنے کے لیے بعض جانور، شکار کرنے کے

یہ شکاری جانور سدھائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اہم اور مشکل فرائض عجیب و غریب عمدگی سے انجام دیتے ہیں (آجکل تو بعض جانوروں کے لیے باقاعدہ تربیتی ادارے معرضِ وجود میں آچکے ہیں)۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر قرآن کی متعدد آیات میں ایسے مطالب دکھائی دیتے ہیں جو بعض جانوروں کے فہم و شعور کے بارے میں قابلِ ملاحظہ دلیل شمار ہوتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے لشکر کو دیکھ کر چیونٹیوں کے فرار کرنے کا واقعہ اور ہدہد کا سبا اور یمن کے علاقے میں آنا اور وہاں سے ہیجان انگیز خبروں کو سلیمان کے پاس لانا، اس مدعا پر شاہد ہیں۔

روایات اسلامی میں بھی متعدد احادیث جانوروں کے قیامت میں اُٹھنے کے سلسلے میں نظر آتی ہیں منجملہ اُن کے حضرت ابوذر سے نقل ہوا ہے، وہ فرماتے ہیں :

ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارے سامنے دو بکریوں نے ایک دوسرے کو سینگ مارے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جانتے ہو کہ انہوں نے ایک دوسرے کو سینگ کیوں مارے ہیں، حاضرین نے عرض کیا کہ نہیں۔ پیغمبرؐ نے فرمایا لیکن خدا جانتا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا اور عنقریب ان کے درمیان فیصلہ کرے گا[1]

اور ایک روایت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بطریق اہلِ سنت نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا :

ان اللہ یحشر ھذہ الامم یوم القیامۃ ویقتص من بعضھا لبعض حتی یقتص للجماء من القرناء"؛

خداوند تعالیٰ ان تمام جانوروں کو قیامت کے دن محشور کرے گا اور بعض کا بعض سے قصاص لے گا۔ یہاں تک کہ اُس جانور کا قصاص کہ جس کے سینگ نہیں ہیں اور کسی دوسرے نے بلا وجہ اُسے سینگ مارا ہے اُس سے لے گا[2]

سورۂ تکویر کی آیہ پانچ میں ہے :

"وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ "

اور اس وقت جب کہ جانور محشور کیے جائیں گے۔

اگر اس آیت کا معنی قیامت کے دن کا حشر لیں (نہ کہ دنیا کے ختم ہونے کے وقت محشور و جمع ہونا) تو اُوپر والی بحث کی منقول دلیلوں میں سے یہ ایک اور دلیل ہوگی۔

۲۔ حشر و نشر ہے تو پھر فرائض بھی ہیں، ایک اہم سوال جو یہاں پیش آتا ہے، اور جب تک وہ حل نہ ہو اُوپر والی

---

[1] تفسیر مجمع البیان و نور الثقلین محل بحث آیہ کے ذیل میں۔

[2] تفسیر المنار، محل بحث آیت کے ذیل میں۔

آیت کی تفسیر واضح نہیں ہوتی اور دوسوال یہ ہے کہ کیا ہم یہ قبول کرسکتے ہیں کہ حیوانات بھی فرائض وواجبات رکھتے ہیں جبکہ شرعی تکلیف کی مسلّم شرائط میں سے ایک عقل ہے اور اسی بنا پر بچہ اور دیوانہ شخص شرعی تکلیف کے دائرے سے خارج ہیں تو کیا جانور ایسی عقل رکھتے ہیں کہ ان پر تکلیف عائد ہو۔ کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ ایک جانور ایک نابالغ بچے اور حتیٰ کہ دیوانوں سے زیادہ سمجھ رکھتا ہو؟ اور اگر ہم یہ قبول کریں کہ وہ اس قسم کی عقل وادراک نہیں رکھتے تو پھر یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ فرائض وواجبات اُن پر لاگو ہوں۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تکلیف یعنی فرائض وواجبات کے کئی مراحل ہوتے ہیں اور ہر مرحلے کے لیے اپنی مناسبت سے ادراک وعقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بہت سی تکالیف اور واجبات وفرائض جو قوانین اسلامی میں ایک انسان کے لیے بنائے گئے ہیں ایسے ہیں کہ جو عقل وادراک کی ایک سطح عالی کے بغیر انجام دیئے ہی نہیں جاسکتے اور ہم ہرگز ایسی تکالیف جانوروں کے لیے قبول نہیں کرسکتے کیونکہ اُن کو بجا لانے کی شرط اُن جانوروں کو حاصل ہی نہیں ہے۔

لیکن تکلیف کا ایک آسان اور نچلی سطح کا مرحلہ بھی متصور ہوتا ہے کہ جس کے لیے مختصر فہم وشعور بھی کافی ہے۔ ہم اس قسم کے فہم وشعور اور اس قسم کی تکالیف کا جانوروں سے قطعی انکار نہیں کرسکتے۔

یہاں تک کہ ان بچوں اور دیوانوں کے بارے میں بھی جو کچھ مسائل کو سمجھتے ہیں تمام تکالیف کا انکار کرنا مشکل ہے۔ مثلاً اگر ہم چودہ سالہ نوخیز بچوں کو جو حدِ بلوغ کو تو نہیں پہنچے لیکن مکمل طور سے تمام مطالب انہوں نے پڑھے اور سمجھے ہیں، نظر میں رکھیں اب اگر وہ عمداً قتل نفس کے مرتکب ہوں جب کہ وہ اس عمل کے تمام نقصانات ومضرات کو جانتے ہیں تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا دنیاوی تعزیراتی قوانین بھی غیر بالغ افراد کو بعض گناہوں میں سزا دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی سزائیں مسلمہ طور پر بہت خفیف ہوتی ہیں۔

اس بنا پر بلوغ وعقل کامل مرحلہ عالی وکامل میں شرطِ تکلیف ہے، لیکن نچلے مراحل میں یعنی چند ایسے گناہوں کے بارہ میں کہ جن کی قباحت اور برائی نچلی سطح کے انسانوں کے لیے بھی مکمل طور سے قابلِ فہم ہے ان کے لیے بلوغ اور عقل کامل کو شرط نہیں جانا جاسکتا۔

مراتبِ تکلیف کے فرق اور مراتب عقل کے فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے مذکورہ اعتراض جانوروں کے بارے میں بھی حل ہو جائے گا۔

۲۔ کیا یہ آیت تناسخ کی دلیل ہے، تعجب کی بات یہ ہے کہ تناسخ کے بیہودہ عقیدہ کے بعض طرفداروں نے اس آیت سے اپنے مسلک کے لیے استدلال کیا ہے اور انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت یہ کہتی ہے کہ جانور بھی تمہاری طرح اُمتیں ہیں، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ذاتی طور پر ہماری طرح نہیں ہیں تو اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسانوں کی روح بدن سے جدا ہونے کے بعد جانوروں کے بدن میں چلی جاتی ہے اور اس ذریعے سے وہ اپنے بعض بُرے اعمال کی سزا پائے۔

لیکن اس بات کے علاوہ کہ عقیدہ تناسخ قانون ارتقا اور عقل و منطق کے خلاف ہے اور اس سے قیامت و معاد کا انکار لازم آتا ہے (جیسا کہ اپنے مقام پر ہم نے اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے) اُوپر والی آیت کسی طرح بھی اس مسلک پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مجتمعات حیوانی کئی جہات سے انسانی مجتمعات کی طرح ہیں اور شباہت صرف بالقوۃ نہیں بلکہ بالفعل ہے (یعنی عملی طور پر ایسا ہے) کیونکہ وہ بھی ادراک و شعور کا کچھ حصہ اور مسئولیت کا کچھ حصہ اور حشر و نشر اور قیامت میں اٹھائے جانے کا کچھ حصہ رکھتے ہیں لہٰذا ان جہات سے انسان کے ساتھ شباہت رکھتے ہیں۔

لیکن اس بات سے کوئی اشتباہ اور غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے مختلف جانوروں کے لیے ایک خاص مرحلہ میں مسئولیت و تکلیف رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے لیے بھی کوئی رہبر و پیشوا (نبی و امام) ہوتا ہے اور وہ بھی کوئی نہ کوئی مذہب اور شریعت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ بعض صوفیوں سے نقل ہوا ہے بلکہ اس قسم کے مواقع پر ان کا رہبر و رہنما صرف ان کا ادراک و شعور باطنی ہی ہوتا ہے یعنی وہ معین مسائل کا فہم رکھتے ہیں اور اپنے شعور کی مقدار اور اندازے کے مطابق اس کے مقابلہ میں مسئول و جوابدہ ہیں۔

۳۹۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

## ترجمہ

۳۹۔ اور وہ لوگ جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں تاریکیوں میں بہرے اور گونگے قرار پاتے ہیں۔ جسے خدا چاہتا ہے (اور وہ اسی کا مستحق ہوتا ہے) اُسے وہ گمراہ کرتا ہے اور جسے وہ چاہتا ہے (اور اس کو اس بات کے لائق پاتا ہے) اسے سیدھے راستے پر قرار دیتا ہے۔

## تفسیر

### بہرے اور گونگے

قرآن ہٹ دھرم منکرین کی بحث کو دوبارہ شروع کر رہا ہے اور کہتا ہے: وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا بہرے اور گونگے ہیں، اور ظلمت و تاریکی میں قرار پائے ہیں (والذین کذبوا بآیاتنا صم و بکم فی الظلمات) نہ تو وہ ایسے سننے والے کان رکھتے ہیں کہ جو حقائق کو سنیں اور نہ ہی ایسی حق گو زبان رکھتے ہیں کہ اگر انہوں نے کسی حقیقت کو سمجھ لیا ہو تو دوسروں سے بیان کر دیں اور چونکہ خود خواہی، خود پرستی، ہٹ دھرمی اور

جہالت کی تاریکی نے انہیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے لہٰذا وہ حقائق کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تو اس طرح سے وہ ان تین عظیم نعمتوں (یعنی سننا، دیکھنا اور بولنا) سے جو انہیں خارجی دنیا سے مربوط کرتی ہیں محروم ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ بہروں سے مراد وہ مقلد ہیں جو بغیر چون وچرا کے اپنے گمراہ رہبروں کی پیروی کرتے ہیں اور انہوں نے اپنے کان بند کر رکھے ہیں اور خدائی رہبروں کی بات نہیں سنتے اور گونگے افراد سے مراد وہی گمراہ رہبر ہیں جو حقائق کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں لیکن اپنی حیثیت اور اپنے مادی منافع کی حفاظت کے لیے انہوں نے اپنے لبوں پر مہر سکوت لگائی ہوئی ہے اور دونوں گروہ جہالت اور خود پرستی کی تاریکی میں گرفتار ہیں [1]

اور اس کے بعد فرماتا ہے کہ "خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے جادۂ مستقیم پر برقرار رکھتا ہے

(من یشا اللہ یضللہ و من یشاٴ یجعلہ علی صراط مستقیم)

ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مشیت و ارادۂ خدا کی طرف ہدایت و ضلالت کی نسبت دینا ایک ایسی بات ہے کہ جس کی قرآن کی دوسری آیات سے اچھی طرح تفسیر ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ ہم پڑھتے ہیں:

"یضل اللہ الظالمین"

خدا ظالموں کو گمراہ کرتا ہے۔

دوسری جگہ ہے:

"و ما یضل بہ الا الفاسقین"

صرف فاسقین کو گمراہ کرتا ہے۔

ایک اور جگہ ہے:

"و الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"

جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم انہیں سیدھی راہوں کی ہدایت کریں گے۔

ان آیات اور قرآن کریم کی دوسری آیات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ہدایتیں اور وہ ضلالتیں کہ جن کی ان مواقع پر خدا کے ارادہ کی طرف نسبت دی گئی ہے حقیقت میں وہ جزائیں اور وہ سزائیں ہیں جو وہ اپنے بندوں کو اچھے یا برے اعمال کے بدلے دیتا ہے اور زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات انسان سے ایسے برے اعمال سرزد ہو جاتے ہیں کہ جن کے زیر اثر ایک ایسی وحشتناک تاریکی اس کی روح کو گھیر لیتی ہے کہ جس سے حقیقت بین آنکھیں چھین لی جاتی ہیں اور اس کے کان حق کی آواز کو نہیں سنتے، اور اس کی زبان حق بات کہنے سے رک جاتی ہے۔

اس کے برعکس کبھی انسان سے ایسے بہت سے نیک کام صادر ہوتے ہیں کہ ایک عالم نور و روشنی اس

---

[1] المیزان جلد ہفتم صفحہ ۸۴۔

کی روح پر نیچا در ہوتا ہے، اس کی نظر و ادراک زیادہ وسیع اور اس کی فکر فزوں تر اور اس کی زبان حق بات کہنے میں گویا تر ہو جاتی ہے۔ یہ ہے معنی ہدایت و ضلالت کا جس کی خدا کے ارادے کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔

۴۰۔ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

۴۱۔ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ○

## ترجمہ

۴۰۔ کہہ دو کیا تم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ اگر خدا کا عذاب تم پر نازل ہو جائے یا قیامت آ جائے تو کیا تم (اپنی مشکلات کے حل کے لیے) خدا کے سوا کسی اور کو بلاؤ گے اگر تم سچے ہو۔

۴۱۔ نہیں بلکہ تم صرف اسی کو بلاؤ گے اور اگر وہ چاہے گا تو اس مشکل کو جس کے لیے تم نے اُسے بلایا ہے برطرف کر دے گا اور جسے (آج) تم (خدا کا) شریک قرار دیتے ہو (اسے اس دن) بھول جاؤ گے۔

## تفسیر

### فطری توحید

دوبارہ روئے سخن مشرکین کی طرف کرتے ہوئے ایک دوسرے طریقے سے توحید و یگانہ پرستی کے لیے اُن کے سامنے استدلال کرتا ہے۔ وہ اس طریقے سے کہ انہیں اُن کی زندگی کے بہت ہی سخت اور دردناک لمحات یاد دلاتا ہے اور ان کے وجدان سے مدد چاہتا ہے کہ اس قسم کے لمحات میں جب کہ ہر چیز کو بھول جاتے ہیں تو اس وقت خدا کے علاوہ اور کوئی پناہ گاہ انہیں اپنے لیے سجھا دیتا ہے۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اگر خدا کا دردناک عذاب تمہارے پیچھے آپہنچے یا قیامت اپنی اس ہولناکی، ہیجان اور وحشتناک حادثات کے ساتھ برپا ہو جائے، تو سچ بتاؤ کہ کیا تم خدا کے سوا کسی اور کو اپنے شدائد کو برطرف کرنے کے لیے پکارو گے قل ارء یتکم ان اتٰکم عذاب اللّٰہ او اتتکم الساعۃ اغیر اللّٰہ تدعون ان کنتم صٰدقین[1]

---

[1] جیسا کہ عربی ادب کے علماء نے تصریح کی ہے "ک" "م" "ارء یتکم" میں اور "کم" "اتٰکم" میں نہ اسم ہے نہ ضمیر بلکہ صرف خطاب ہے۔
بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

یہ آیت نہ صرف مشرکین کے لیے ہے بلکہ معنی کے اعتبار سے باطنی طور پر تمام افراد کے لیے شدائد اور سخت حوادث کے ظہور کے وقت قابلِ فہم ہے۔ ممکن ہے کہ عام حالات میں اور چھوٹے چھوٹے حادثات میں انسان غیر خدا کے ساتھ متوسل ہو جائے لیکن جب حادثہ بہت زیادہ سخت ہو تو انسان تمام چیزوں کو بھول جاتا ہے۔ البتہ یہی حالت ہوتی ہے وہ جبکہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں نجات کے لیے ایک قسم کی اُمید محسوس کرتا ہے کہ جو ایک پوشیدہ اور نامعلوم قدرت سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے۔ یہی وہ توجہ ہوتی ہے جو خدا کی طرف ہوتی ہے اور یہی حقیقت توحید ہے۔

یہاں تک کہ مشرکین اور بت پرست بھی اس قسم کے لمحات میں بتوں کی بات کو درمیان میں نہیں لاتے اور وہ سب کو بھلا دیتے ہیں۔

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: بلکہ تم صرف اسی کو پکارتے ہو اگر وہ چاہے تو تمہاری مشکل کو حل کر دے اور وہ شریک جو تم نے خدا کے لیے تیار کر رکھے تھے ان سب کو بھلا دیتے ہو (بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء و تنسون ما تشرکون)۔

## چند اہم نکات

۱۔ جو استدلال اُوپر کی دو آیات میں نظر آتا ہے وہی توحید فطری والا استدلال ہے کہ جس سے دو مباحث میں استفادہ کیا جا سکتا ہے ایک خدا کے اصل وجود کے اثبات میں اور دوسرا اس کی یگانگت اور توحید ثابت کرنے میں۔ اسی لیے اسلامی روایات میں اور اسی طرح علماء کے کلام میں منکرین خدا کے مقابلے میں بھی اور مشرکین کے مقابلے میں بھی استدلال کیا گیا ہے۔

۲۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اُوپر والے استدلال میں قیامت کے بپا ہونے کی بات درمیان میں آئی ہے۔ حالانکہ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ وہ تو اس قسم کے دن کو بالکل قبول ہی نہیں کرتے تھے۔ اس بنا پر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان کے سامنے اس قسم کا استدلال پیش کیا جائے۔

لیکن اس حقیقت پر توجہ کرنا چاہیے کہ پہلے تو وہ سب قیامت کے منکر نہیں تھے بلکہ اُن میں سے ایک گروہ ایک طرح سے قیامت کا اعتقاد رکھتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے کہ "ساعت" سے مراد وہی موت کی

---

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ: جو حقیقت میں تاکید کے لیے آتا ہے۔ ایسے مواقع پر عام طور پر فعل مفرد کی شکل میں آتا ہے اور اس کا مفرد، تثنیہ اور جمع ہونا اسی حرف خطاب کے تغیرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لیے "ارءیتکم" میں باوجودیکہ مخاطب جمع ہے فعل "رئیت" مفرد لایا گیا اور اس کا جمع ہونا "کم" سے جو کہ حرف خطاب ہے سمجھا گیا ہے۔ ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ معنی کے لحاظ سے مساوی ہے "اخبرنی" یا "اخبرونی" کے لیکن حق یہ ہے کہ یہ لفظ اپنے استفہامی معنی کی مکمل حفاظت کرتا ہے اور "اخبرونی" اس کے معنی کا لازمہ ہے نہ کہ خود اس کا معنی ہے (غور کیجئے گا)۔

گھڑی یا وحشتناک حوادث کی گھڑی ہو جو انسان کو موت کی چوکھٹ تک لے جاتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر ہولناک حوادث کی طرف اشارہ ہو کیونکہ قرآنی آیات بار بار کہتی ہیں کہ قیامت کی ابتدا بہت ہی ہولناک حوادث کے سلسلے کے ساتھ شروع ہو گی اور زلزلے، طوفان، بجلیاں اور ایسی ہی دوسری ناگہانی آفتیں اس وقت وقوع پذیر ہونگی۔

۳۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ قیامت کا دن اور اس سے قبل کے حوادث حتمی اور یقینی مسائل میں سے ہیں اور کسی طرح بھی قابلِ تغیر نہیں ہیں تو پھر اوپر والی آیت میں یہ کیوں کہا گیا ہے اگر خدا چاہے تو اُسے برطرف کردے گا۔ کیا اس سے صرف پروردگار عالم کی قدرت کا بیان کرنا مقصود ہے یا کوئی اور معنی مراد ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ خدا ان کی دعا سے اصل قیام ساعت اور روزِ قیامت کو ہی ختم کردے گا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مشرکین بلکہ غیر مشرکین بھی جب قیامت کے روبرو ہوں گے تو اس کے حوادث مشکلات اور اس کے سخت ترین عذاب سے جو انہیں درپیش ہونگے وحشت اور پریشانی میں ہوں گے اور خدا سے درخواست کریں گے کہ وہ اس کیفیت اور حالت کو ان کے لیے آسان کردے اور انہیں خطرات سے رہائی بخشے۔ تو حقیقت میں یہ دعا دردناک حوادث سے اپنے آپ کی نجات کے لیے ہے نہ کہ قیامت کے ختم ہو جانے کی دعا۔

۴۲۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ○

۴۳۔ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

۴۴۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ○

۴۵۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

## ترجمہ

۴۲۔ ہم نے اُن اُمتوں پر جو تم سے پہلے تھیں (پیغمبر بھیجے) اور جب وہ ان کی مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑے

ہوئے) تو ہم نے انہیں شدت و تکلیف اور رنج و بے آرامی میں مبتلا کر دیا کہ شاید (وہ بیدار ہو جائیں اور حق کے سامنے) سر تسلیم خم کر دیں۔

۴۳۔ جب ہمارا عذاب ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے (خضوع کیوں نہیں کیا؟) اور سر تسلیم کیوں خم نہ کیا، لیکن اُن کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ہر اُس کام کو جو وہ کرتے تھے اُن کی نظروں میں پسندیدہ کر کے دکھایا۔

۴۴۔ جب (نصیحتوں نے کوئی فائدہ نہ دیا اور) جو کچھ انہیں یاد دہانی کرائی گئی تھی وہ اُسے بھول گئے تو ہم نے (نعمتوں میں سے) تمام چیزوں کے دروازے اُن کے لیے کھول دیئے یہاں تک کہ وہ (مکمل طور پر خوشحال ہو گئے (اور انہوں نے ان کے ساتھ دل لگا لیا) تو ہم نے یکایک انہیں دھر پکڑا (اور سخت سزا دی) تو اُس وقت وہ سب کے سب مایوس ہو گئے (اور امید کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے)۔

۴۵۔ اور (اس طرح سے) جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا (اور ان کی نسل منقطع ہو گئی) اور حمد مخصوص ہے اس خدا کے لیے کہ جو عالمین کا پروردگار ہے۔

# تفسیر

## نصیحت قبول نہ کرنے والوں کا انجام

ان آیات میں بھی گمراہوں اور مشرکین کے بارے میں گفتگو جاری ہے اور قرآن ایک دوسرے راستے سے ان کو بیدار کرنے کے لیے اس موضوع کا پیچھا کرتا ہے۔ یعنی ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گذشتہ زمانوں اور صدیوں کی طرف لے جاتا ہے اور گمراہ، ستم گر اور مشرک امتوں کی کیفیت ان سے بیان کرتا ہے کہ کس طرح سے تربیت و بیداری کے عوامل ان کے لیے بروئے کار لائے گئے لیکن ان میں سے ایک گروہ نے پھر بھی کسی کی طرف توجہ نہ کی اور آخر کار ایسی بدبختی ان کو دامنگیر ہوئی کہ وہ آنے والوں کے لیے عبرت بن گئے۔

پہلے کہتا ہے کہ ہم نے گذشتہ امتوں کی طرف پیغمبر بھیجے اور چونکہ انہوں نے کوئی پرواہ نہیں کی لہٰذا ہم نے انہیں بیداری اور تربیت کی خاطر مشکلات اور سخت حوادث مثلاً فقر و فاقہ، خشک سالی و بیماری، درد و رنج اور "باساء" و "ضراء"[1]

---

[1] "باساء" اصل میں شدت و رنج کے معنی میں ہے اور جنگ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اسی طرح قحط و خشک سالی اور فقر وغیرہ کے لیے

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

سے دوچار کر دیا، کہ شاید وہ متوجہ ہو جائیں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں (ولقد ارسلنا الی امم من قبلک فاخذنٰهم بالبأساء والضراء لعلهم یتضرعون)۔

بعد والی آیت میں کہتا ہے کہ انہوں نے ان دردناک اور بیدار کرنے والے عوامل سے نصیحت کیوں نہ لی اور بیدار کیوں نہ ہوئے اور خدا کی طرف کیوں نہ لوٹے (فلولا اذ جاءهم بأسنا تضرعوا)۔

اصل میں ان کے بیدار نہ ہونے کی دو وجوہات تھیں ۔ ان میں سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ گناہ کی زیادتی اور شرک میں ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کے دل تاریک اور سخت ہو گئے اور ان کی روح کوئی اثر قبول نہیں کرتی تھی (ولکن قست قلوبهم)۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ شیطان نے (ان کی نفس پرستی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے) ان کے اعمال کو ان کی نگاہ میں زینت دے رکھا تھا اور جس بُرے عمل کو وہ انجام دیتے تھے اسے خوبصورت وزیبا اور ہر غلط کام کو درست و صحیح خیال کرتے تھے (وزین لهم الشیطان ما کانوا یعملون)۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے کہ جب سخت گیریاں اور گوشمالیاں ان کے لیے مؤثر ثابت نہ ہوئیں تو ہم نے ان کے ساتھ محبت اور مہربانی کا راستہ اختیار کیا اور جب انہوں نے پہلے سبق کو بھلا دیا تو ہم نے ان کے لیے دوسرا سبق شروع کر دیا اور طرح طرح کی نعمتوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے کہ شاید وہ بیدار ہو جائیں اور اپنے پیدا کرنے والے اور ان نعمتوں کو بخشنے والے کی طرف توجہ کریں اور راہِ راست کو پالیں (فلما نسوا ما ذکروا به فتحنا علیهم ابواب کل شیء)۔

لیکن یہ سب نعمتیں دوہری خصوصیت رکھتی تھیں، یہ ان کی بیداری کے لیے اظہارِ محبت بھی تھیں اور اگر بیدار نہ ہوں تو دردناک عذاب کا مقدمہ بھی تھیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب انسان ناز و نعمت میں ڈوبا ہوا ہو اور اچانک وہ سب نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اس کے لیے انتہائی دردناک ہوتا ہے ۔ اس کے برخلاف اگر اس سے تدریجاً واپس لی جائیں تو اس صورت میں اس پر کوئی اثر نہ ہو گا۔

اسی لیے کہتا ہے کہ ہم نے انہیں اس قدر نعمتیں دیں کہ جس سے وہ مکمل طور پر خوشحال ہو گئے، لیکن وہ بیدار نہ ہوئے، لہٰذا ہم نے ان سے وہ اچانک چھین لیں اور ہم نے انہیں عذاب دیا اور اُمید کے سب دروازے ان پر بند ہو گئے (حتّٰی اذا فرحوا بما اوتوا اخذنٰهم بغتة فاذا هم مبلسون[1])۔

---

بقیہ حاشیہ صفحہ سابق ۔ بھی لیکن "ضراء" روحانی تکالیف مثلاً غم و اندوہ، جہالت و نادانی یا وہ پریشانیاں جو بیماری یا مقام و منصب اور مال و ثروت کے ہاتھ سے نکل جانے سے پیدا ہوتی ہیں کے معنی میں ہے۔ شاید ان دونوں میں فرق اس سبب سے ہے کہ "بأساء" عام طور سے خارجی پہلو رکھتا ہے اور "ضراء" روحانی اور معنوی پہلو رکھتا ہے یعنی روحانی تکالیف کو "ضراء" کہتے ہیں۔ تو اس بنا پر "بأساء" "ضراء" کے عوامل کی ایجاد میں سے ایک عامل ہے (غور کیجئے گا)۔

[1] "مبلسون" اصل میں مادہ "ابلاس" سے اس غم و اندوہ کے معنی میں ہے جو انسان کو ناگوار حوادث کی شدت سے عارض ہو اور ابلیس کا نام بھی اسی سے لیا گیا ہے اور اوپر والی تعبیر شدت غم و اندوہ کی نشاندہی کرتی ہے جو گنہگاروں کو گھیر لیتی ہے۔

اور اس طرح ستمگروں کی نسل منقطع ہوگئی اور ان کی دوسری نسل آگے نہ چل سکی (فقطع دابر القوم الذین ظلموا)۔
"دابر" اصل میں کسی چیز کے پچھلے اور آخری حصہ کو کہتے ہیں اور چونکہ خداوند تعالیٰ نے ان کی تربیت کے یہ تمام ذرائع کو بروئے کار لانے میں کسی قسم کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لہٰذا آیت کے آخر میں کہتا ہے: حمد مخصوص اس خدا کے لیے ہے کہ جو تمام عالمین کا پروردگار ہے (والحمد للّٰه رب العالمین)۔

## چند اہم نکات

۱۔ بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان آیات اور گزشتہ آیات کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ گزشتہ آیات میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کی گئی تھی کہ مشرکین ہجوم مشکلات کے وقت خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور خدا کے سوا ہر کسی کو بھلا دیتے ہیں لیکن ان آیات میں ہے کہ ہجوم مشکلات کے وقت بھی وہ بیدار نہیں ہوتے۔

ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے یہ ظاہری اختلاف ختم ہو جاتا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ شدائد کے ظہور کے وقت جلدی گزر جانے والی اور وقتی بیداریاں بیداری شمار نہیں ہوتیں کیونکہ وہ جلدی اپنی پہلی حالت کی طرف پلٹ جاتی ہیں گزشتہ آیات میں چونکہ توحید فطری کا بیان کرنا مقصود تھا، اس کے ثبوت کے لیے وہی بیداریاں اور وقتی توجہات اور غیر خدا کو فراموش کرنا ہی کافی تھا خواہ ایسا حادثہ کے موقع پر ہی ہوا ہو لیکن ان آیات میں موضوع سخن ہدایت پانی اور بے راہ روی سے راہ راست کی طرف پلٹنے سے متعلق ہے اور مسلّمہ طور پر جلد گزر جانے والی اور وقتی بیداری اس میں کوئی اثر نہیں کرتی۔

بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ گزشتہ آیات پیغمبرؐ کے ہمعصر مشرکین کے ساتھ مربوط ہیں، لیکن زیر بحث آیات گزشتہ اقوام سے متعلق ہیں لہٰذا ان دونوں میں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے[1]

لیکن یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کہ پیغمبرؐ کے ہمعصر ہٹ دھرم مشرک گزشتہ زمانہ کے گمراہوں سے بہتر ہوں۔ اس بنا پر صحیح حل وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکا۔

۲۔ زیر نظر آیات میں ہے کہ جب شدائد کے ظہور سے تربیتی اثر نہ ہو تو خداوند عالم ایسے گنہگاروں پر نعمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے، تو کیا یہ کام تنبیہ کے بعد تشویق کے لیے ہے یا عذاب کے دردناک ہونے کا ایک مقدمہ ہے؛ یعنی اصطلاح کے مطابق اس قسم کی نعمتیں نعمت استدراجی ہیں۔ جو سرکش بندوں کو بتدریج آہستہ آہستہ ناز و نعمت، خوشحالی و سرور اور ایک قسم کی غفلت میں ڈبو دیتی ہیں اور پھر ایک دم ان سے تمام نعمتوں کو چھین لیا جاتا ہے

آیت میں کچھ ایسے قرائن موجود ہیں جن سے دوسرے احتمال کی تقویت ملتی ہے لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ دونوں ہی احتمال مراد ہوں۔ یعنی پہلے بیداری کے لیے تشویق ہو اور اگر وہ مؤثر نہ ہو تو وہ نعمت

---

[1] فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر میں اس فرق کی طرف اشارہ کیا ہے (جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۴)۔

کے چھیننے اور دردناک عذاب کرنے کے لیے ایک مقدمہ ہو۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح نقل ہوا ہے:

اذا رأیت اللہ یعطی العبد من الدنیا علی معاصیہ ما یحب فانما ھو استدراج ثم تلا رسول اللہ (ص) فلما نسوا......

"جب تم یہ دیکھو کہ خدا گناہوں کے مقابلے میں نعمت بخشتا ہے تو تم سمجھ لو کہ یہ سزا کا مقدمہ اور تمہید ہے پھر آپؐ نے اوپر والی آیت کی تلاوت کی" (مجمع البیان و نور الثقلین ذیل آیہ)۔

حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"یا ابن آدم اذا رأیت ربک سبحانہ یتابع علیک نعمہ وانت تعصیہ فاحذرہ"

(نہج البلاغۃ کلمہ ۲۵)

اے آدم کے بیٹے! جب تو یہ دیکھے کہ خدا تجھے پے در پے نعمتیں بخش رہا ہے جب کہ تو گناہ کرتا جا رہا ہے، تو تو اس کی سزا اور عذاب سے ڈر کیونکہ یہ عذاب کا مقدمہ ہے۔

کتاب تلخیص الاقوال میں امام حسن عسکریؑ سے اس طرح نقل ہوا ہے:

امیر المومنینؑ کے غلام قنبر کو حجاج کے سامنے پیش کیا گیا تو حجاج نے اس سے پوچھا کہ تو علیؑ بن ابی طالب کے لیے کیا کام کیا کرتا تھا۔ قنبر نے کہا کہ میں آپ کے لیے وضو کے اسباب فراہم کرتا تھا۔ حجاج نے پوچھا کہ علیؑ جب وضو سے فارغ ہوتے تھے تو کیا کہا کرتے تھے۔ قنبر نے کہا کہ وہ یہ آیت پڑھا کرتے تھے:۔

فلما نسوا ما ذکروا بہ فتحنا علیھم ابواب کل شیء ــ اور آخر آیت تک تلاوت کی۔ حجاج نے کہا کہ میرا گمان یہ ہے کہ علیؑ اس آیت کو ہم پر تطبیق کیا کرتے تھے۔ قنبر نے پوری دلیری کے ساتھ جواب دیا، کہ جی ہاں! (نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۱۸)۔

۴۔ ان آیات میں ہے کہ بہت سے رنج اور حوادث سے مراد تو جلد بیداری کی حالت کو ایجاد کرنا ہے اور یہ آفات اور بلاؤں کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ ہے۔ جس کے متعلق ہم توحید[1] کی بحث میں گفتگو کر چکے ہیں۔

لیکن توجہ کے لائق بات یہ ہے کہ اس امر کو پہلے لفظ "لعل" (شاید) کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ذکر کا سبب یہ ہے کہ مصائب اور بلائیں بیداری کے لیے تنہا کافی نہیں ہیں بلکہ یہ تو آمادگی رکھنے والے دلوں کے لیے زمین ہموار کرتی ہیں۔ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ "لعل" کلام خدا میں عام طور سے ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں اور دوسری شرائط بھی درمیان میں پائی جاتی ہیں۔

دوسرا یہ کہ یہاں تضرع کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو اصل میں دودھ کے پستان میں آجانے اور دوہنے والے کے سامنے

---

[1] کتاب "آفریدگار جہاں" اور کتاب "جستجوئے خدا" کی طرف رجوع فرمائیں۔

اس کے مطیع ہونے کے معنی میں ہے پھر اس کے بعد یہ لفظ تواضع اور خضوع کے ساتھ ملی ہوئی اطاعت کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا یعنی ان دردناک حادثات کو ہم اس لیے ایجاد کرتے تھے تاکہ وہ غرور و سرکشی اور خود خواہی کی سواری سے نیچے اتریں اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔

۴۔ یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ آیت کے آخر میں خداوند تعالیٰ (الحمد للہ رب العالمین) کہتا ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ ظلم و فساد کی جڑ کو کاٹنا اور ایسی نسل کا نابود ہو جانا جو اس کام کو جاری رکھ سکے اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ شکر و سپاس کی جگہ ہے۔

ایک حدیث میں جو فضیل بن عیاض نے امام صادق علیہ السلام سے نقل کی ہے میں آپ نے فرمایا:

من احب بقاء الظالمین فقد احب ان یعصی اللہ، ان اللہ تبارک و تعالیٰ حمد بنفسہ

بهلاك الظلمة فقال: فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمد للہ رب العالمین۔

جو شخص ستمگروں اور ظالموں کی بقا چاہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ خدا کی نافرمانی ہوتی رہے (موضوع ظلم اس قدر اہم ہے کہ) خدا نے ظالموں کو نابود کرنے کے مقابلہ میں اپنی حمد و ستائش کی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ ستمگر قوم کی نسل منقطع کر دی گئی اور حمد و سپاس مخصوص ہے اس خدا کے لیے جو عالمین کا پروردگار ہے۔

۴۶۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ○

۴۷۔ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

۴۸۔ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

۴۹۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○

## ترجمہ

۴۶۔ کہہ دو کہ کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اگر خدا تمہارے کان اور آنکھیں تم سے لے لے اور تمہارے دلوں

پر مہر لگا دے (کہ تم کوئی بات نہ سمجھ سکو) تو خدا کے سوا اور کون ہے کہ جو یہ چیزیں تمہیں دیدے، دیکھو ہم آیات کی کس طرح مختلف طریقوں سے تشریح کرتے ہیں اس کے بعد وہ لوگ منہ پھیر لیتے ہیں۔

۴۷۔ کہہ دو کہ کیا تم نے یہ بھی غور کیا کہ اگر خدا کا عذاب اچانک (اور پوشیدہ) یا آشکار تمہارے پاس آجائے تو کیا ظالموں کے گروہ کے سوا اور کوئی ہلاک ہو گا۔

۴۸۔ اور ہم پیغمبروں کو نہیں بھیجتے سوائے اس کے کہ وہ بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ہوتے ہیں، پس جو لوگ ایمان لے آئیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ان کے لیے نہ تو کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

۴۹۔ وہ لوگ جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، ان کی نافرمانیوں کے سبب خداوند تعالیٰ کا عذاب انہیں پہنچے گا۔

# تفسیر

## نعمتیں بخشنے والے کو پہچانیئے

روئے سخن بدستور مشرکین ہی کی طرف ہے۔

ان آیات میں ایک دوسرے بیان کے ذریعے ان کو بیدار کرنے کے لیے استدلال ہوا ہے اور دفع ضرر کے حوالے سے کہا گیا ہے: اگر خدا کان اور آنکھ جیسی اپنی گراں بہا نعمتیں تم سے لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے اس طرح سے کہ تم اچھے اور بُرے اور حق و باطل کے درمیان تمیز نہ کر سکو تو خدا کے سوا کون ہے جو یہ نعمتیں تمہیں پلٹا سکے (قل ارءیتم ان اخذ اللہ سمعکم وابصارکم وختم علی قلوبکم من الہ غیر اللہ یأتیکم بہ)۔

حقیقت میں مشرکین بھی قبول کرتے تھے کہ خالق و رازق خدا ہی ہے اور بتوں کی بارگاہ خدا میں شفاعت کے عنوان سے پرستش کرتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ بجائے اس کے کہ تم ان بے قدر و قیمت بتوں کی پرستش کرو کہ جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے تم براہ راست خدا کے دروازے پر کیوں نہیں جاتے وہ خدا جو تمام نیکیوں اور برکات کا سرچشمہ ہے۔

اس اعتقاد کے علاوہ جو تمام بت پرست خدا کے بارے میں رکھتے تھے، یہاں پر ان کی عقل کو بھی فیصلہ کی دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ بت جو نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں اور نہ ہی عقل و شعور رکھتے ہیں، وہ دوسروں کو یہ چیزیں کیسے عطا کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: دیکھو ہم کس طرح مختلف طریقوں سے [illegible] دلائل کی تشریح کرتے ہیں لیکن وہ پھر بھی حق سے منہ پھیر لیتے ہیں (انظر کیف نصرف الآیات ثم ھم یصدفون)۔

"ختم" کے معنی اور اس بات کی علت کہ "سمع" قرآن کی آیات میں عام طور پر مفرد اور ابصار جمع کیوں آتا ہے؟ اس بارے میں ہم نے اسی تفسیر کی پہلی جلد ص ۹۰ (اردو ترجمہ) پر بحث کی ہے۔

"نصرف" تصریف کے مادہ سے تغیر کے معنی میں ہے اور یہاں مختلف شکل کے استدلال کرنا مراد ہے۔

"یصدفون" "صدف" (بروزن ہدف) کے مادہ سے ہے جو "سمت" اور "طرف" کے معنی میں ہے اور چونکہ انسان اعراض کرتے وقت منہ پھیرنے کے وقت دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے لہٰذا یہ لفظ اعراض کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ البتہ جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے یہ مادہ اعراض کرنے اور شدید روگردانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

بعد والی آیت میں ان تینوں عظیم الٰہی نعمتوں (آنکھ، کان اور فہم) کے ذکر کے بعد کہ جو دنیا و آخرت کی تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہیں، تمام نعمتوں کے کلی طور پر سلب ہونے کے امکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہیں کہہ دو کہ اگر خدا کا عذاب اچانک بلا کسی اطلاع کے یا آشکارا بلکے پکارے تمہارے پاس آ جائے تو کیا ظالموں کے سوا کوئی اور نابود ہوگا (قل ارءیتکم ان اتاکم عذاب الله بغتة او جهرة هل يهلك الا القوم الظالمون[1])۔

"بغتة" کا معنی ناگہانی اور اچانک ہے اور "جهرة" آشکارا اور علی الاعلان کے معنی میں ہے۔ قاعدہ کی رو سے تو آشکار کے مقابلہ میں پنہاں ہونا چاہیے نہ کہ ناگہانی۔ لیکن چونکہ ناگہانی امور کے مقدمات عام طور پر مخفی اور پنہاں ہوتے ہیں، کیونکہ اگر وہ پنہاں نہ ہوں تو ناگہانی نہیں بنتے، اس بنا پر "بغتة" کے لفظ میں پنہاں کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے۔

اس سے منظور یہ ہے کہ جو ذات طرح طرح کی سزائیں دینے اور نعمتوں کے چھین لینے پر قدرت رکھتی ہے وہ صرف اور صرف ذات خدا ہے اور بتوں کا اس معاملے میں کوئی دخل نہیں ہے۔

اس بنا پر کوئی دلیل اور وجہ نہیں ہے کہ ان کی پناہ لو لیکن چونکہ خدا حکیم اور رحیم ہے لہٰذا وہ ستم گاروں کو ہی سزا دیتا ہے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "ظلم" ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر قسم کے شرک اور گناہوں کو شامل ہے بلکہ قرآن کی آیات میں شرک کو ظلم عظیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا:

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭاِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

بیٹا! خدا کا کسی کو شریک نہ بنانا کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے۔ (لقمان ـ ۱۳)

بعد والی آیت میں خدائی پیغمبروں کے فرائض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: نہ صرف یہ کہ بیجان بتوں سے کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ بزرگ انبیاء اور خدائی رہبر و رہنما بھی سوائے ابلاغ رسالت، بشارت و نذارت اور تشویق و تہدید

---

[1] "ارءیتکم" کے معنی اور اس کے تجزیہ اور ترکیب کے بارے میں اس سورہ کی آیہ ۴۰ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں اور یہ بیان کر چکے ہیں (ہمارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ اسے "اخبرونی" کے معنی میں لیں بلکہ اس کا مفہوم ہے "هل علمتم" "کیا تمہیں معلوم ہے")۔

کے اور کوئی کام نہیں کرتے اور جو بھی نعمت ہے وہ خدا کے حکم سے اور اسی کی طرف سے ہے اور وہ (انبیاء) بھی اپنی حاجات کو اسی سے طلب کرتے ہیں (وما نرسل المرسلین الا مبشرین ومنذرین)۔

اس آیت کے گذشتہ آیات کے ساتھ تعلق کے بارے میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ گذشتہ آیات میں کئی قسم کی تشویق و تہدید سے متعلق گفتگو تھی، اس آیت میں ہے کہ یہ وہی ہدف ہے کہ جس کے لیے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔ ان کا کام بھی بشارت و نذارت (خوشخبری دینا اور ڈرانا ہی) تھا۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ راہ نجات دو چیزوں میں منحصر ہے: وہ لوگ جو ایمان لے آئیں اور اپنی اصلاح کرلیں (اور عمل صالح انجام دیں) انہیں نہ خدائی سزا کا خوف ہے اور نہ ہی انہیں اپنے گذشتہ اعمال کا غم و اندوہ ہے (فمن اٰمن واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)۔

اور ان کے مقابلے میں جو لوگ آیات الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں وہ اس فسق اور نافرمانی کے بدلے میں خدائی سزا اور عذاب میں گرفتار ہوں گے (والذین کذبوا بایاتنا یمسھم العذاب بما کانوا یفسقون)۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ آیات خدا کی تکذیب کرنے والوں کی سزا کے بارے میں "یمسھم العذاب" کی تعبیر ہوئی ہے (یعنی پروردگار کا عذاب انہیں مس کرتا ہے)۔ گویا عذاب ہر جگہ ان کے پیچھے لگا رہتا ہے اور اس کے بعد وہ انہیں بدترین طریقہ سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

اس نکتہ کا ذکر بھی لازم ہے کہ "فسق" ایک وسیع المعنی لفظ ہے اور ہر طرح کی نافرمانی، خدا کی اطاعت سے باہر ہوجانا یہاں تک کہ کفر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اوپر والی آیت میں بھی یہی معنی مراد ہے۔ اس بنا پر ان بحثوں کا جو فخر الدین رازی اور دیگر مفسرین نے فسق کے بارے میں اس مقام پر کی ہیں اور اسے گناہوں کے معنی میں بھی شامل سمجھتے ہوئے دفاع کے لیے کھڑے ہوگئے ہیں، کوئی محل باقی نہیں رہتا۔

۵۰۔ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۗ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

## ترجمہ

۵۰۔ کہہ دو کہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ خدا کے خزانے میرے پاس ہیں اور نہ میں غیب سے آگاہ ہوں (سوائے اس کے جو خدا مجھے تعلیم دیتا ہے) اور میں تمہیں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو خدا کی طرف سے مجھ پر وحی ہوتی ہے، کہہ دو کہ کیا نابینا اور بینا برابر ہیں تم اس پر غور کیوں

نہیں کرتے ؟

# تفسیر

## غیب سے آگاہی

اوپر والی آیت میں کفار و مشرکین کے مختلف اعتراضات پر دیئے گئے جوابات کا آخری حصہ بیان ہوا ہے اور ان کے اعتراضات کے تین حصوں کا مختصر جملوں میں جواب دیا گیا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ وہ (کفار و مشرکین) پیغمبرؐ سے عجیب و غریب معجزات کے مطالبے کیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کا مطالبہ اس کی اپنی خواہش کے مطابق ہوا کرتا تھا یہاں تک کہ وہ دوسروں کی درخواست پر دکھائے جانے والے معجزات کے مشاہدہ پر بھی قناعت نہیں کرتے تھے۔ وہ پیغمبرؐ سے کبھی سونے کے مکانات کا، کبھی ملائکہ کے نزول کا، کبھی مکہ کی خشک اور بے آب و گیاہ زمین کے سرسبز و شاداب باغوں میں بدل جانے کا اور کبھی دوسری قسم کے مطالبات کا تقاضا کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۹۰ کے ذیل میں اس کی تفصیل آئے گی۔

گویا وہ ایسے عجیب و غریب تقاضے کرکے پیغمبرؐ کے لیے ایک قسم کے مقام الوہیت اور زمین و آسمان کی ملکیت کی توقع رکھتے تھے۔ لہٰذا ان افراد کے جواب میں پیغمبرؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ میرا یہ ہرگز دعویٰ نہیں ہے کہ خدا کے خزانے میرے ہاتھ میں ہیں (قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ)۔

"خزائن" جمع ہے "خزینہ" کی اور خزینہ ہر چیز کے منبع و مرکز کو کہتے ہیں کہ جس کی حفاظت کے لیے اور دوسروں کی اس تک دسترس حاصل کرنے کے لیے اسے وہاں جمع کیا گیا ہو۔

وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ۔ (سورۂ حجر آیہ ۲۱)

اور ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم معلوم اندازے کے سوا اُسے نازل نہیں کرتے۔

اس آیت کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ "خزائن اللہ" تمام چیزوں کے منبع اور مرکز کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں اور حقیقت میں یہ منبع اسی ذات لامتناہی کے قبضۂ قدرت میں ہے کہ جو تمام کمالات اور قدرتوں کا سرچشمہ ہے۔

اس کے بعد اُن افراد کے مقابلے میں کہ جو یہ توقع رکھتے تھے کہ پیغمبرؐ انہیں تمام گذشتہ اور آئندہ کے اسرار سے آگاہ کریں یہاں تک کہ انہیں یہ بھی بتلائیں کہ اُن کی زندگی سے متعلق کون سے حادثات رونما ہوں گے تاکہ وہ رفع ضرر اور جلب منفعت کے لیے آمادہ ہو جائیں، کہتا ہے: کہیے! میں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں تمام پوشیدہ امور اور اسرار غیب سے آگاہ ہوں (ولا اعلم الغیب)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ تمام چیزوں سے صرف وہی ذات باخبر ہو سکتی ہے جو ہر مکان اور ہر

زمان میں حاضر و ناظر ہو اور وہ صرف خدا ہی کی ذات پاک ہے لیکن اس کے سوا ہر وہ شخص کہ جس کا وجود ایک معین زمان و مکان میں محدود ہو طبعاً ہر چیز سے باخبر نہیں ہو سکتا لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ خداوند عالم علم غیب کا کچھ حصہ کہ جس کی وہ مصلحت جانتا ہے اور جو خدائی رہبروں کی رہبری کی تکمیل کے لیے ضروری ہے ان کے اختیار میں دیدے۔ البتہ اس کو بالذات علم غیب نہیں کہتے بلکہ اس کو بالعرض علم غیب کہتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں یہ عالم الغیب سے یاد کیا ہوا اور پڑھا ہوا ہوتا ہے۔

قرآن کی متعدد آیات گواہی دیتی ہیں کہ خدا نے اس قسم کا علم نہ صرف یہ کہ انبیاء اور خدائی رہنماؤں کو دیا ہے بلکہ بعض اوقات ان کے غیر کو بھی دیا ہے۔ منجملہ ان آیات کے سورۂ جن آیہ ۲۶ و ۲۷ میں ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ

خدا تمام پوشیدہ امور سے آگاہ ہے اور وہ کسی کو اپنے علم غیب سے آگاہ نہیں کرتا مگر ان رسولوں کو جن سے وہ راضی ہو۔

اصولی طور پر مقام رہبری کی تکمیل کے لیے۔ علی الخصوص ایسی رہبری جو تمام لوگوں کے لیے ہو، بہت سے ایسے مسائل پر مطلع ہونے کی ضرورت ہے جو باقی دوسرے لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں اور اگر خدا یہ علم غیب اپنے بھیجے ہوئے افراد اور اپنے اولیاء کو نہ دے تو ان کا مقام رہبری تکمیل تک نہیں پہنچتا (غور کیجیے گا)۔

یہ بات تو اپنے مقام پر مسلم ہے کہ بعض اوقات ایک موجود زندہ بھی اپنی زندگی کو جاری رکھنے کے لیے غیب کے ایک گوشہ کو جاننے کا محتاج ہے اور خدا اُسے اس کے اختیار میں دیتا ہے۔ مثلاً ہم نے سُنا ہے کہ بعض حشرات اور کیڑے مکوڑے گرمیوں میں سردیوں کے موسمی حالات کی پیش بینی کرتے ہیں۔ یعنی خداوند تعالیٰ نے یہ علم غیب خصوصیت کے ساتھ انہیں دے رکھا ہے کیونکہ ان کی زندگی اس کے بغیر بسا اوقات فنا کی گود میں چلی جاتی ہے۔ ہم اس امر کی مزید تفصیل انشاء اللہ سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۸ کے ذیل میں بیان کریں گے۔

تیسرے جملے میں اُن لوگوں کے سوال کے جواب میں کہ جو یہ توقع رکھتے تھے کہ خود پیغمبرؐ کو فرشتہ ہونا چاہیے یا کسی فرشتہ کو ان کے ہمراہ ہونا چاہیے اور کسی قسم کے عوارض بشری (مثلاً کھانا، کوچہ و بازار میں چلنا پھرنا) اس میں نظر نہ آئیں ارشاد ہوتا ہے: میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں فرشتہ ہوں (ولا اقول لکم انی ملک)۔

بلکہ میں تو صرف ان احکام و تعلیمات کی پیروی کرتا ہوں کہ جو پروردگار کی طرف سے بذریعہ وحی مجھ تک پہنچتے ہیں (ان اتبع الا ما یوحیٰ الی)۔

اس جملے سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے پاس جو کچھ بھی تھا اور آپ جو کچھ بھی کرتے تھے اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہی تھی اور جیسا کہ بعض حضرات نے خیال کیا ہے کہ وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرتے تھے، ایسا ہرگز نہیں تھا اور اسی طرح نہ وہ قیاس پر عمل کرتے تھے اور نہ ہی کسی اور بات پر بلکہ دینی امور میں آپ کا ہر قدم صرف وحی کی پیروی میں ہوتا تھا[1]

[1] حاشیہ بر صفحہ آئندہ

اور آیت کے آخر میں پیغمبر کو حکم دیا جا رہا ہے کہ "کہہ دو کہ کیا نابینا اور بینا افراد برابر ہیں اور کیا وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنی آنکھوں اور فکر و عقل کو بند کر رکھا ہے ان اشخاص کے برابر ہیں جو حقائق کو اچھی طرح سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کیا تم اس بات پر غور نہیں کرتے (قل ھل یستوی الاعمٰی والبصیر افلا تتفکرون)۔

گذشتہ تین جملوں کے بعد اس جملے کا ذکر ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ اس سے پہلے جملوں میں پیغمبر نے فرمایا میں نہ خدائی خزانے رکھتا ہوں، نہ غیب کا عالم ہوں اور نہ ہی میں فرشتہ ہوں میں تو صرف وحی کا پیروکار ہوں، لیکن یہ گفتگو اس معنی میں نہیں ہے کہ تم جیسے ہٹ دھرم بت پرستوں کی طرح ہوں بلکہ میں ایک بینا انسان ہوں جب کہ تم نابیناؤں کی طرح ہو اور یہ دونوں مساوی نہیں ہیں۔

اس ... کا پہلے جملوں سے تعلق اور جوڑ کے بارے میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ توحید اور پیغمبر کی حقانیت کی دلیلیں بالکل واضح و آشکار ہیں لیکن انہیں دیکھنے کے لیے چشم بینا کی ضرورت ہے اور اگر تم قبول نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بات مبہم یا پیچیدہ ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم بینا نہیں ہو۔ کیا بینا اور نابینا برابر ہیں؟۔

۵۱۔ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○

## ترجمہ

۵۱۔ اس (قرآن) کے ذریعے اُن لوگوں کو ڈراؤ جو حشر و نشر اور قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں (وہ دن کہ جس میں) یار و یاور، سرپرست اور شفاعت کرنے والا سوائے اس (خدا) کے نہ رکھتے ہوں گے، شاید وہ تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کریں۔

## تفسیر

گذشتہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا تھا کہ نابینا اور بینا یکساں نہیں ہیں اور اس کے عین بعد اس آیت میں پیغمبر کو حکم دیا جا رہا ہے، "قرآن کے ذریعے ایسے لوگوں کو ڈراؤ اور بیدار کرو جو قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں۔ یعنی کم از کم ان کے دل کی آنکھیں اتنی ضرور کھلی ہوئی ہیں کہ وہ یہ احتمال رکھتے ہیں کہ حساب و کتاب ہوگا اور اس احتمال کے زیر سایہ اور جوابدہی کے خوف سے قبول کرنے کے لیے آمادگی رکھتے ہیں (وانذر به الذین یخافون ان یحشروا الٰی ربھم)۔

---

حاشیہ برصفحہ سابقہ: لہ پیغمبر کے تمام امور دینی تھے وہاں دنیاوی اور دینی امور کا کوئی الگ الگ تصور نہیں ہے (مترجم)۔

شاید ہم کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ افراد کی ہدایت کے لیے صرف ایک لائق رہبر اور ایک جامع تربیتی پروگرام ہی کافی نہیں ہے بلکہ خود افراد میں بھی ایک قسم کی آمادگی ضروری ہے۔ جیسا کہ آفتاب کی روشنی چاہ سے راہ کو تلاش کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ چشم بینا کی بھی ضرورت ہے اور مستعد و آمادہ بیج بھی بارآور نہیں ہو سکتا جب تک کہ زمین آمادہ و تیار نہ ہو۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو گیا ہے کہ " بہ " کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے، اگرچہ قبل کی آیات میں قرآن کا صراحت کے ساتھ ذکر نہیں ہوا، لیکن یہ بات قرائن سے واضح ہے۔

اسی طرح " یخافون " (ڈرتے ہیں) سے مراد وہی نقصان و ضرر کا احتمال ہے کہ جو ہر عقلمند کے ذہن میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ انبیاء اور رہبران خدا کی دعوت پر غور کرتا ہے کہ شاید ان کی دعوت حق ہو، اور اس کی مخالفت زیاں اور خسارے کا سبب بنے لہٰذا کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ان کی دعوت کا مطالعہ کروں اور ان کے دلائل پر غور کروں؟۔

یہ ہدایت کی اولین شرائط میں سے ایک ہے، اور یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے علمائے عقائد لزوم " دفع ضرر محتمل " کے عنوان سے مدعی نبوت کی دعوت کے مطالعہ کے وجوب اور خدا کی شناسائی کے بارے میں مطالعہ کے لزوم کی دلیل قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اس قسم کے بیدار دل افراد اس دن سے ڈرتے ہیں کہ جب سوائے خدا کے اور کوئی پناہ گاہ اور شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا (لیس لھم من دونہ ولی و لا شفیع)۔

ہاں ایسے افراد کو ڈراؤ اور انہیں خدا کی طرف دعوت دو کیونکہ اُن کے بارے میں تقویٰ اور پرہیزگاری کی امید ہے (لعلھم یتقون)۔

البتہ اس آیت میں غیر خدا کی شفاعت و ولایت کی نفی مردان خدا کی ولایت و شفاعت کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتی۔ کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ یہاں بالذات شفاعت و ولایت کی نفی مراد ہے، یعنی یہ دو مقام ذاتی طور پر خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اب اگر اس کا غیر مقام ولایت و شفاعت رکھتا ہے تو وہ اس کے اِذن و اجازت اور فرمان کے ساتھ ہے جیسا کہ قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط

کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اس کے حکم کے بغیر شفاعت کرے (بقرہ ۲۵۵)۔

اس کی مزید توضیح اور شفاعت کی مکمل بحث کے بارے میں تفسیر نمونہ کی جلد اوّل صفحہ ۱۹۴ (اُردو ترجمہ) اور جلد اوّل صفحہ ۵۹۵ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۵۲۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ

وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○

۵۳۔ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ○

## ترجمہ

۵۲۔ ان لوگوں کو جو صبح شام خدا کو پکارتے ہیں اور اس کی ذات پاک کے علاوہ کسی پر نگاہ نہیں رکھتے اپنے سے دور نہ کر۔ نہ ان کا حساب تجھ پر ہے اور نہ تیرا حساب ان پر ہے، اگر تو ان کو دھتکارے گا تو ظالموں میں سے ہو جائے گا۔

۵۳۔ اور اس طرح ہم نے ان میں سے بعض کو دوسرے بعض کے ساتھ آزمایا ہے (تونگروں کو فقیروں کے ذریعے) تاکہ وہ یہ کہیں کہ کیا یہ ہیں وہ کہ جنہیں خدا نے ہمارے درمیان سے (چنا ہے اور) ان پر احسان کیا ہے (اور انہیں نعمت ایمان سے نوازا ہے) تو کیا خدا شکر کرنے والوں کو بہتر طور پہچانتا نہیں ہے؟

## تفسیر

### شانِ نزول

اوپر والی آیات کی شان نزول میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں کہ جو سب کی سب ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک وہ ہے کہ جو تفسیر "در المنثور" میں اس طرح نقل ہوئی ہے کہ قریش کی ایک جماعت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے گزری جب کہ صہیب، عمار، بلال اور خباب اور ان ہی جیسے دوسرے فقیر اور مزدور قسم کے مسلمان پیغمبر کی خدمت میں حاضر تھے، انہوں نے یہ منظر دیکھ کر تعجب کیا (اور چونکہ وہ شخصیت کو مال و ثروت اور مقام و منصب میں منحصر سمجھتے تھے لہٰذا وہ ان مردانِ بزرگ کے مقام روحانی کی عظمت اور آئندہ کے عظیم اسلامی اور انسانی معاشرے کی تشکیل کے سلسلے میں ان کے کارناموں کے نقوش کو سمجھ نہ سکے) اور کہنے لگے کہ اے محمدؐ! کیا آپ نے ساری جمعیت میں سے بس انہی افراد پر قناعت کر لی ہے؟ کیا یہی ہیں وہ کہ جنہیں خدا نے ہمارے درمیان میں سے منتخب کیا ہے؟ کیا

ہم ان کے پیرو ہو جائیں ؛ جتنا جلدی ہو سکے آپ انہیں اپنے سے دور کر دیجئے تو شاید ہم آپ کے قریب آجائیں اور آپ کی پیروی کر لیں ۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان کے اس تقاضے اور مطالبے کو شدت کے ساتھ رد کر دیا گیا۔

بعض مفسرین اہل سنت نے اسی جیسی ایک حدیث نقل کی ہے ۔ مثلاً "المنار" کے مؤلف نے اسی کے مانند روایت کرتے ہوئے مزید اضافہ کیا ہے کہ عمر بن خطاب وہاں حاضر تھے اور انہوں نے پیغمبر اکرم سے یہ تقاضا کیا کہ اس میں کیا حرج ہے کہ ہم ان کے مطالبہ کو مان لیں اور یہ دیکھیں کہ وہ کیا کرتے ہیں تو اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان کے اس تقاضے کو بھی رد کر دیا۔

اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اس سورہ کی بعض آیات کی شان نزول کا ذکر کرنا اس بات کے منافی نہیں کہ یہ پوری سورت ایک ہی جگہ پر نازل ہوئی ہو۔ کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس سورت کے نزول سے پہلے طرح طرح کے حوادث مختلف فاصلوں میں رونما ہو چکے ہوں اور یہ سورت ان سب حوادث کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہو۔

اس مقام پر اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری نظر آتا ہے کہ کچھ روایات میں یہ نقل ہوا ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرمؐ نے ان کی پیش کش قبول نہ کی تو انہوں نے یہ درخواست کی کہ اشراف قریش اور فقیر صحابہ کے درمیان باری مقرر کریں یعنی ایک روز ان کے لیے اور ایک دن ان کے لیے مقرر دیں تاکہ وہ اکٹھے ایک ہی جلسہ میں نہ بیٹھیں تو پیغمبر اکرمؐ نے پہلے ان کی یہ تجویز قبول کر لی تاکہ شاید یہ بات ان کے ایمان لانے کا ذریعہ بن جائے تو انہوں نے کہا کہ یہ مطلب ایک قرارداد کے عنوان سے تحریر میں لایا جائے پیغمبر نے حضرت علیؑ کو مذکورہ قرارداد لکھنے پر مامور ہی کیا تھا کہ اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اس کام سے روک دیا گیا۔

لیکن یہ روایت علاوہ اس کے کہ تعلیمات اسلامی کی روح کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی اور آپ نے کبھی اس قسم کے امتیازی سلوک کی طرف جھکاؤ کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ہر جگہ معاشرۂ اسلامی کی وحدت کی بات کی ہے ، قبل کی آیت کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتی جس میں کہا گیا ہے کہ ؛ " ان اتبع الا ما یوحیٰ الی " (میں تو صرف وحی الہٰی کی پیروی کرتا ہوں ) ۔ یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبرؐ نے وحی کا انتظار کیے بغیر اس تجویز کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہو ۔

علاوہ ازیں " لا تطرد " کا جملہ جو زیر بحث آیت کی ابتدا میں ہے ، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان کا مطالبہ اصحاب پیغمبرؐ کے اس گروہ کو مطلقاً ہمیشہ کے لیے اپنے سے دور کرنے کے لیے تھا نہ کہ نوبت اور باری مقرر کرنے کا مطالبہ تھا ۔ کیونکہ " تناوب " اور " طرد " میں بہت فرق ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شان نزول وہی ہے جو ہم ابتدا میں بیان کر چکے ہیں ۔

## طبقاتی تقسیم کے خلاف جنگ

اس آیت میں مشرکین کی ایک اور بہانہ جوئی کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہیں توقع تھی کہ پیغمبرؐ فقیر

طبقے کے مقابلے میں ثروت مندوں کے لیے امتیاز کے قائل ہو جائیں گے اور ان کا خیال تھا کہ ان کا ان اصحاب پیغمبرؐ کے پاس بیٹھنا ان کے لیے عیب اور بہت بڑا نقص ہے حالانکہ وہ اس بات سے غافل تھے کہ اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ اس قسم کے لغو اور بے بنیاد امتیازات کو ختم کر دے۔ اسی لیے وہ اس تجویز پر بہت مُصر تھے کہ پیغمبرؐ اس گروہ کو اپنے قرب سے دور کریں لیکن قرآن صراحت کے ساتھ اور وزنی دلائل پیش کرکے ان کی تجویز کی نفی کرتا ہے، پہلے کہتا ہے: اُن اشخاص کو کہ جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور سوائے اس کی ذات پاک کے ان کی نظر کسی پر نہیں ہے انہیں ہرگز اپنے سے دور نہ کرنا (ولا تطرد الذین یدعون ربهم بالغداوة والعشی یریدون وجهه[1])۔

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ یہاں بجائے اس کے کہ ان اشخاص کا نام یا عنوان ذکر کیا جاتا صرف اس صفت کے ذکر کرنے پر قناعت ہوئی ہے کہ وہ صبح و شام — اور دوسرے لفظوں میں، ہمیشہ — خدا کی یاد میں لگے رہتے ہیں اور یہ عبادت و پرستش اور پروردگار کی طرف توجہ نہ تو کسی اور غرض کے لیے ہے اور نہ ہی ریاکاری سے بلکہ (ان کی یہ عبادت) صرف اس کی ذات پاک کے لیے ہے، وہ اُسے صرف، خود اُسی کی خاطر چاہتے ہیں اور اس کے پاس آتے ہیں اور کوئی امتیاز اس امتیاز کی برابری نہیں کر سکتا۔

قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ثروت مند اور خود پسند مشرکین کی طرف سے یہ پہلی اور آخری بار نہ تھا کہ انہوں نے پیغمبرؐ کو ایسی تجویز پیش کی ہو۔ بلکہ وہ بارہا ایسا اعتراض کر چکے تھے کہ پیغمبرؐ نے کچھ بیکس و بینوا افراد کو اپنے گرد کیوں جمع کر لیا ہے اور ان کا یہ اصرار تھا کہ آپ انہیں اپنے پاس سے چلتا کر دیں۔

حقیقت میں یہ لوگ ایک پرانی غلط ذہنیت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ افراد میں امتیاز دولت و ثروت کے سبب سے ہوتا ہے اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ معاشرے کے طبقات جو ثروت کی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں وہ محفوظ رہنے چاہییں اور ہر وہ دین اور ہر وہ دعوت جو طبقاتی زندگی کو ختم کرنا چاہے اور ان امتیازات کو نظر انداز کرے وہ ان کی نظر میں مطرود اور ناقابلِ قبول ہے۔

ہم حضرت نوح علیہ السلام کے حالات میں بھی پڑھتے ہیں کہ ان کے زمانے کے "بڑے آدمی" اُن سے یہ کہتے تھے:

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ

ہم نہیں دیکھتے کہ کسی نے تمہاری پیروی کی ہو سوائے اُن لوگوں کے کہ جو ہم میں سے فرومایہ اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں (ہود آیہ ۲۷)۔

اور وہ اسے ان کی رسالت کے باطل ہونے کی دلیل سمجھتے تھے۔

ایک نشانی اسلام اور قرآن کی عظمت کی بلکہ کلی طور پر انبیاء کی عظمت کی یہ ہے کہ اُن سے جتنی سختی کے ساتھ ہو سکتا

---

[1] "وجہ" کا معنی لغت میں چہرہ ہے اور بعض اوقات ذات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ زیر نظر آیت میں اس سے مراد دوسرا معنی ہی ہے۔ اس موضوع کے بارے میں مزید تفصیل تفسیر نمونہ کی جلد اول صفحہ ۴۲۵ (اردو ترجمہ) پر مطالعہ کریں۔

تھا اس قسم کی سوچوں کا مقابلہ کیا اور ایسے معاشروں میں کہ جن میں طبقاتی اختلاف ایک دائمی مسئلہ شمار ہوتا تھا، اس موہوم امتیاز کو کچلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ سلمان، ابی ذر، صہیب، خباب اور بلال جیسے پاک دل، صاحب ایمان اور عقلمند افراد میں مال و دولت نہ رکھنے کے باوجود معمولی سی بھی کمزوری اور نقص نہیں ہے اور بے مغز، کوردل، خودخواہ اور متکبر ثروت مند اپنی دولت و ثروت کی وجہ سے اجتماعی اور معنوی امتیازات سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے۔

بعد والے جملے میں فرمایا گیا ہے، "کوئی وجہ نہیں کہ اس قسم کے صاحبان ایمان کو تو اپنے سے دور کرے، نہ ان کا حساب تیرے اُوپر ہے اور نہ تیرا حساب اُن کے اُوپر ہے" (ما علیک من حسابھم من شیء وما من حسابک علیھم من شیء) اس کے باوجود اگر تم اُن کو اپنے سے دور کروگے تو ستم گروں اور ظالموں میں سے ہو جاؤ گے (فتطردھم فتکون من الظٰلمین)۔

اس بارے میں کہ یہاں پر حساب سے کونسا حساب مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا احتمال ہے کہ اس سے مراد ان کی روزی کا حساب ہے۔

یعنی اگر ان کا ہاتھ مال و دولت سے خالی ہے تو وہ تمہارے کندھے پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتے کیونکہ ان کی روزی کا حساب تو اللہ پر ہے، جیسا کہ تم بھی اپنی زندگی کا بوجھ ان پر نہیں ڈالتے، اور تمہاری روزی کا حساب اُن پر نہیں ہے۔

ابھی ہم وضاحت کریں گے یہ احتمال بعید نظر آتا ہے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ حساب سے مراد اعمال کا حساب ہے جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ یہ کس طرح فرماتا ہے کہ ان کے اعمال کا حساب تم پر نہیں ہے حالانکہ ان کا کوئی بُرا عمل نہیں تھا کہ ایسی بات کرنا ضروری ہوتا، یہ اس بنا پر ہے کہ مشرکین اصحاب پیغمبرؐ میں سے فقراء کو مال و ثروت نہ ہونے کی وجہ سے خدا سے دُور سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ اگر ان کے اعمال خدا کے ہاں قابل قبول ہوتے تو پھر انہیں زندگی کے لحاظ سے خوشحال کیوں نہیں بنایا گیا۔ علاوہ ازیں وہ انہیں اس بات سے متہم کرتے تھے کہ شاید ان کا ایمان لانا زندگی کی اصلاح اور روٹی پانی کے حصول کے لیے تھا۔

قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ فرض کرو کہ وہ ایسے ہی ہوں، لیکن ان کا حساب تو خدا کے ساتھ ہے۔ صرف اس بات پر کہ وہ ایمان لے آئے ہیں اور مسلمانوں کی صف میں شامل ہو گئے ہیں، کسی قیمت پر انہیں دھتکارا نہیں جانا چاہیے اور اس طرح سے امراء قریش کی بہانہ جوئیوں پر گرفت کی گئی ہے۔

شاید یہ تفسیر وہی ہے کہ جو حضرت نوحؑ کی داستان میں بیان ہوئی ہے جو اشراف قریش کی داستان کے مشابہ ہے۔ جہاں قوم نوح آپ سے کہتی ہے:

انؤمن لک واتبعک الارذلون۔

کیا ہم تجھ پر ایمان لے آئیں؛ حالانکہ بے وقعت افراد نے تیری پیروی کی ہے۔

حضرت نوحؑ ان کے جواب میں کہتے ہیں:

وما علمی بما کانوا یعملون ان حسابھم الا علی ربی لو تشعرون وما انا بطارد المؤمنین۔

مجھے ان کے اعمال کی کیا خبر ہے، ان کے اعمال کا حساب تو اللہ پر ہے اگر تم جانو اور جنہوں نے ایمان کا اظہار کیا ہے میں انہیں اپنے سے دور نہیں کر سکتا[1]

خلاصہ یہ کہ پیغمبر کی ذمہ داری یہ ہے کہ بغیر کسی فرق وامتیاز کے جو شخص بھی ایمان کا اظہار کرے خواہ وہ کسی بھی قوم، قبیلہ اور طبقہ سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو اُسے قبول کرے چہ جائیکہ وہ پاک دل اور صاحب ایمان افراد ہوں کہ جو خدا کے سوا کسی کے جویا نہیں ہیں اور ان کا گناہ صرف یہ ہے کہ ان کا ہاتھ مال وثروت سے خالی ہے اور وہ اشراف کی نکبت بار زندگی میں آلودہ نہیں ہیں۔

## اسلام کا ایک عظیم امتیاز

ہم جانتے ہیں کہ آجکل کی مسیحیت میں مذہبی راہنماؤں کا دائرہ اختیار مضحکہ انگیز حد تک وسعت پا چکا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے لیے گناہ بخشش دینے کے حق کے قائل ہیں اور اسی بنا پر اگر وہ چاہیں تو کسی شخص کو معمولی سی بات پر دھتکار دیں اور کافر قرار دے دیں اور چاہیں تو کسی کو قبول کر لیں۔

قرآن مجید زیر نظر آیت میں اور دیگر آیات میں صراحت کے ساتھ یاد دہانی کراتا ہے کہ نہ صرف مذہبی علماء بلکہ پیغمبر کی ذات تک بھی اظہار ایمان کرنے والے کو دھتکارنے اور دور کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے، جب کہ انہوں نے کوئی ایسا کام بھی انجام نہیں دیا کہ جو ان کے اسلام سے خارج ہونے کا سبب بنے۔ گناہوں کی بخشش اور بندوں کا حساب وکتاب صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے سوا کوئی بھی اس کام میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتا۔

لیکن کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو، آیت میں موضوع بحث "طرد مذہبی" ہے نہ کہ "طرد حقوقی" اس معنی میں کہ اگر مثلاً ایک مدرسہ خاص قسم کے طالب علموں کے لیے وقف ہوا اور کوئی شخص ابتداء سے ان شرائط کا حامل ہو اور بعد میں اس میں یہ شرائط باقی نہ رہیں تو اسے اس مدرسہ سے نکالنا کوئی مانع نہیں رکھتا اور اسی طرح اگر مدرسہ کا متولی مدرسہ کی مصلحتوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے کچھ اختیارات رکھتا ہو تو اس مدرسے کے نظام اور اس کی حیثیت وموقعیت کی حفاظت کے لیے ان جائز اختیارات سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے (اس بنا پر وہ مطالب جو تفسیر المنار میں اس آیہ کے ذیل میں اس مطلب کے برخلاف نظر آتے ہیں وہ "طرد مذہبی" کے "طرد حقوقی" سے اشتباہ سے پیدا ہوئے ہیں)۔

بعد والی آیت میں بے ایمان دولت مند افراد کو تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ واقعات ان کے لیے آزمائش ہیں اور اگر وہ ان آزمائشوں کی بھٹی سے صحیح طریقے سے باہر نہ نکل سکے تو وہ دردناک عواقب وانجام کے متحمل ہوں گے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اس طرح سے ان میں سے بعض کو دوسرے بعض کے ذریعے آزمایا (وکذلک فتنا بعضهم ببعض) یہاں "فتنة" آزمائش کے معنی میں ہے[2]

---

[1] شعراء ۱۱۱ تا ۱۱۴۔

[2] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۱ سورہ بقرہ کی آیہ ۱۹۱ (صفحہ ۶۶۴ اردو ترجمہ) اور آیہ ۱۹۲ (صفحہ ۴۶۹ اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

اس سے سخت آزمائش اور کیا ہوگی کہ وہ اشراف اور دولت مند کہ جنہوں نے سالہا سال سے یہ عادت بنالی ہوئی ہے کہ اپنے تمام معاملات کو نچلے طبقے کے لوگوں سے بالکل الگ رکھیں، نہ ان کی خوشی میں شریک ہوں اور نہ ہی ان کے رنج و غم میں، یہاں تک کہ ان کی قبریں بھی ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوں، وہ یکایک ان تمام آداب و رسوم کو توڑ ڈالیں اور ان عظیم زنجیروں کو اپنے ہاتھ پاؤں سے نکال پھینکیں اور ایسے دین کو اپنالیں کہ جس کی طرف سبقت کرنے والے لوگ اصطلاح کے مطابق نچلے درجے اور طبقہ فقراء کے آدمی شمار ہوتے ہیں۔

پھر مزید ارشاد ہوتا ہے کہ ان تونگروں کا معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ سچے مومنین کی طرف حقارت کی نگاہ ڈال کر کہتے ہیں، "کیا یہی لوگ ہیں کہ جنہیں خدا نے ہمارے درمیان میں سے چن لیا ہے اور انہیں نعمت ایمان و اسلام کے ساتھ نوازا ہے، کیا یہ اس قسم کی باتوں کی قابلیت رکھتے ہیں (لیقولوا اھٰؤلاء من الله علیھم من بیننا[1])۔

بعد میں ان کا جواب دیا گیا ہے کہ صاحبان ایمان ایسے افراد ہیں کہ انہوں نے عقل و تفکر کی نعمت کا شکر ادا کیا ہے اور اُس کو روبہ عمل لائے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے پیغمبر کی دعوت کی نعمت کا شکر ادا کیا ہے اور ان کی دعوت کو قبول کیا ہے۔ اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی اور اس سے بڑھ کر شکر اور کیا ہوگا۔ اسی بنا پر خدا نے ایمان کو ان کے دلوں میں راسخ کر دیا ہے۔ کیا خدا شکر گذاروں کو بہتر نہیں پہچانتا (الیس الله باعلم بالشاکرین)۔

۵۴۔ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

۵۵۔ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

## ترجمہ

۵۴۔ جب وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائے ہیں تمہارے پاس آئیں تو اُن سے کہو، تم پر سلام ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اُوپر رحمت فرض کر لی ہے۔ تم میں سے جو آدمی نادانی سے کوئی بُرا کام کرے اس کے بعد توبہ اور اصلاح (و تلافی) کرے تو وہ بخشنے والا مہربان ہے

---

[1] سورۂ آلِ عمران آیہ ۱۶۴ کے ذیل میں اشارہ ہوچکا ہے کہ "منت" اصل میں نعمت بخشنے کے معنی میں ہے مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ (صفحہ ۲۹۴ اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

۵۵۔ اور ہم اس طرح سے آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں (اور واضح کرتے ہیں) تاکہ گنہگاروں کا راستہ آشکار ہو جائے۔

# تفسیر

بعض کا نظریہ تو یہ ہے کہ پہلی آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جن کے متعلق گذشتہ آیات میں پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا تھا کہ انہیں اپنے پاس سے دھتکاریں نہیں اور انہیں اپنے سے جدا نہ کریں، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت کچھ گنہگاروں کے بارے میں ہے کہ جو پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے تھے اور انہوں نے یہ اظہار کیا تھا کہ ہم نے بہت گناہ کیے ہیں اس پر رسول اللہؐ نے سکوت اختیار کیا تو زیرِ نظر آیت نازل ہوئی۔

بہرحال اس کی شانِ نزول خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس میں شک نہیں کہ آیت کا مفہوم کلی اور وسیع ہے اور سب پر محیط ہے، کیونکہ پہلے ایک قانونِ کلی کے طور پر پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ تمام اہلِ ایمان کو خواہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ ہوں، نہ صرف یہ کہ اپنے پاس سے دھتکاریں نہیں بلکہ انہیں گلے لگائیں اور قبول کریں، اور فرمایا گیا کہ: جب وہ لوگ کہ جو ہماری آیات پر ایمان لا چکے ہیں تیرے پاس آئیں تو اُن سے کہو تم پر سلام ہو (واذا جآءک الذین یؤمنون بآیٰتنا فقل سلٰم علیکم)۔

یہ سلام ممکن ہے کہ خدا کی طرف سے اور پیغمبرؐ کے وسیلے سے ہو اور یا براہ راست خود پیغمبرؐ کی طرف سے ہو، اور یہ ہر حال میں ان کی پذیرائی اور استقبال کرنے اور اُن سے افہام و تفہیم اور دوستی کرنے کی دلیل ہے۔

دوسرے جملہ میں مزید فرمایا گیا ہے: تمہارے پروردگار نے رحمت کو اپنے اُوپر فرض کر لیا ہے (کتب ربکم علیٰ نفسہ الرحمۃ)۔

"کتب" جو مادہ کتابت سے ہے لکھنے کے معنی میں ہے اور بہت سے مواقع پر لازم ہونے، قبول کرنے اور ذمہ لینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ لکھنے کے آثار میں سے ایک اثر کسی چیز کا مسلّم ہونا اور ثابت رہ جانا ہے۔

تیسرے جملہ میں کہ جو درحقیقت رحمتِ الٰہی کی توضیح و تفسیر ہے، ایک محبت آمیز تعبیر کے ساتھ یوں فرمایا گیا ہے: تم میں سے جو شخص کوئی کام ازروئے جہالت انجام دے، اس کے بعد توبہ کرلے اور اصلاح اور تلافی کرے تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے (انہ من عمل منکم سوء بجہالۃ ثم تاب من بعدہ واصلح فانہ غفور رحیم)۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں[1] ایسے مواقع پر "جہالت" سے مراد وہی شہوت اور خواہش نفسانی کا غلبہ اور طغیان و سرکشی ہے، جس میں انسان حق سے دشمنی اور عداوت کی بنا پر نہیں بلکہ ہوا و ہوس کے غلبہ کی خاطر اس طرح ہو جاتا ہے

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۲۹۴ (اردو ترجمہ)

کہ فروغ عقل اور خواہش کا کنٹرول ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے، ایسا شخص اگر چہ گناہ اور حرام کا علم رکھتا ہے مگر چونکہ اس کا علم ہوا و ہوس کے پردے میں آگیا ہے اس لیے اس پر "جہالت" کا اطلاق ہوا ہے مسلمہ طور پر ایسا شخص اپنے گناہ کے لیے جوابدہ ہے، لیکن چونکہ وہ گناہ عداوت اور دشمنی کی بنا پر نہیں تھا لہٰذا وہ سعی و کوشش کرتا ہے کہ اس کی اصلاح اور تلافی ہو جائے۔

حقیقت میں یہ آیت پیغمبر اسلام کو حکم دے رہی ہے کہ تم کسی بھی صاحب ایمان فرد کو خواہ وہ کسی طبقہ سے ہو، کسی نسل سے ہو اور کیسے ہی حالات سے دوچار ہو نہ صرف یہ کہ اپنے پاس سے نہ دھتکارو بلکہ اپنے دامن کو یکساں طور پر سب کے لیے کھول دو، یہاں تک کہ اگر کچھ لوگ بہت سے گناہوں میں آلودہ بھی ہوں تو انہیں بھی قبول کرو اور ان کی اصلاح کرو۔

بعد والی آیت میں اس مطلب کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے ہم اپنی آیات، نشانیاں اور احکام، اس طرح روشن اور مشخص کرتے ہیں کہ حق کے متلاشیوں اور اطاعت گزاروں کا راستہ بھی واضح و آشکار ہو جائے اور ہٹ دھرم گنہگاروں اور حق کے دشمنوں کی راہ بھی معلوم و روشن ہو جائے (وکذالك نفصل الآیات ولتستبین سبیل المجرمین[1])۔

واضح ہے کہ اوپر والی آیت میں "مجرم" سے مراد ہر گنہگار نہیں ہے، کیونکہ اس آیت میں پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب گنہگار ان کے پاس آئیں، خواہ انہوں نے نادانی کی بنا پر کتنے ہی غلط اعمال انجام دیئے ہوں، انہیں قبول کریں۔ اس بنا پر یہاں مجرم سے مراد وہی ہٹ دھرم اور سخت قسم کے گنہگار ہیں جو کسی ذریعہ سے بھی حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے ہوں، یعنی حق کی طرف اس عمومی اور ہمہ گیر دعوت کے بعد، یہاں تک کہ ان گنہگاروں کو دعوت دینے کے بعد کہ جو اپنے کام سے پشیمان ہیں، اب ہٹ دھرم اور ناقابل توجہ مجرموں کے طرز عمل کو مکمل طور پر واضح کیا جا رہا ہے۔

۵۶۔ قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ۝

۵۷۔ قُلْ اِنِّیْ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝

---

[1] حقیقت میں جملہ "ولتستبین" عطف ہے ایک محذوف جملہ پر جو مقابلہ کے قرینہ سے سمجھا جاتا ہے یعنی "لتستبین سبیل المؤمنین المطیعین ولتستبین سبیل المجرمین" تاکہ اطاعت کرنے والے مومنین کا راستہ اور گنہگاروں کا راستہ الگ الگ واضح اور روشن ہو جائے۔

۵۸۔ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ○

## ترجمہ

۵۶۔ تم کہہ دو کہ مجھے ان کی پرستش سے منع کیا گیا ہے جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ کہہ دو کہ میں تمہاری ہوا و ہوس کی پیروی نہیں کرتا، اگر میں ایسا کروں گا تو گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوں گا۔

۵۷۔ تم کہہ دو کہ میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح اور روشن دلیل رکھتا ہوں اور تم نے اُس کی تکذیب کی ہے (اور اُسے قبول نہیں کیا) وہ چیز کہ جس کے بارے میں تمہیں زیادہ جلدی ہے وہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ حکم اور فرمان جاری کرنا صرف خدا ہی کے اختیار میں ہے جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے اور وہ (حق کو باطل سے) بہترین (طریقے پر) جدا کرنے والا ہے۔

۵۸۔ تم کہہ دو کہ اگر وہ چیز جس کے بارے میں تمہیں جلدی ہے میرے پاس ہوتی (اور میں تمہاری درخواست پر عمل کرتا تو عذاب الٰہی تم پر نازل ہو جاتا اور) میرا اور تمہارا کام انجام کو پہنچ جاتا اور خدا ظالموں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے۔

## تفسیر

### بے جا اصرار اور ہٹ دھرمی

ان آیات میں روئے سخن اُسی طرح ہٹ دھرم مشرکین اور بت پرستوں کی طرف ہے جیسا کہ اس سورہ کی زیادہ تر آیات اسی بحث کے گرد گھومتی ہیں۔ ان آیات کا لب و لہجہ اس طرح کا ہے جیسا کہ انہوں نے پیغمبر کو دعوت دی تھی کہ پیغمبر اُن کے دین کی طرف جھک جائے لہٰذا پیغمبر کو حکم ہوتا ہے کہ وہ انہیں صراحت کے ساتھ کہہ دے کہ مجھے ان کی پرستش سے منع کیا گیا ہے جن کی تم خدا کے علاوہ پرستش کرتے ہو (قل انی نهیت ان اعبد الذین تدعون من دون اللّٰه)۔

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

لفظ "ںنھیت" (ممنوع قرار دیا گیا ہوں) جو فعل ماضی مجہول کی صورت میں لایا گیا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ بتوں کی پرستش کا ممنوع ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔

اس کے بعد "کہہ دو اے پیغمبر کہ میں تمہاری ہوا و ہوس کی پیروی نہیں کرتا" (قل لا اتبع اھوائکم)۔ اس جملے کے ذریعے ان کے مطالبہ کا واضح جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ بت پرستی کوئی منطقی دلیل نہیں رکھتی اور ہرگز عقل و خرد سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ عقل اچھی طرح سے سمجھتی ہے کہ انسان جمادات سے اشرف ہے تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسان دوسری مخلوق کے سامنے یہاں تک کہ ایک پست تر مخلوق کے سامنے سر تعظیم جھکائے۔ اس کے علاوہ زیادہ تر بت خود انسان کے گھڑے اور بنے ہوئے ہوتے تھے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ چیز جو خود انسان کی مخلوق ہو اس کی معبود اور اس کی حلال مشکلات ہو جائے۔ اس بنا پر بت پرستی کا سرچشمہ اندھی تقلید، خرافات اور ہوا پرستی کی پیروی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

آخر میں مزید تاکید کے لیے ارشاد ہوتا ہے: اگر میں ایسا کام کروں تو یقیناً گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت یافتہ لوگوں میں سے نہ رہوں گا (قد ضللت اذًا وما انا من المھتدین)۔

بعد والی آیت میں انہیں ایک اور جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ: میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح اور روشن دلیل رکھتا ہوں، اگرچہ تم نے اُسے قبول نہیں کیا اور اس کی تکذیب کی ہے (قل انی علی بینة من ربی وکذبتم به)۔

"بینة" اصل میں ایسی چیز کو کہتے ہیں کہ جو دو چیزوں کے درمیان اس طرح سے جدائی ڈال دے کہ اُن میں کسی طرح سے دوبارہ اتصال اور باہمی تعلق نہ ہو سکے۔ اس کے بعد روشن اور واضح دلیل کو بھی کہا جانے لگا کیونکہ وہ حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔

فقہی اصطلاح میں اگرچہ "بینة" دو عادل افراد کی گواہی کو کہا جاتا ہے لیکن اس کا لغوی معنی کامل طور پر وسیع ہے اور دو عادلوں کی گواہی اس کا ایک مصداق ہے، اور اگر معجزات کو "بینة" کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی بنا پر ہے کہ وہ حق کو باطل سے جدا کرتے ہیں، اور اگر آیات و احکام الٰہی کو "بینة" کہتے ہیں تو وہ بھی اس وسیع مفہوم کے ایک مصداق کے طور پر۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں بھی پیغمبرؐ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس بات کا سہارا لیں کہ خدا پرستی کی راہ میں اور بتوں سے جنگ میں میرا مدرک کامل طور سے روشن اور آشکار ہے اور تمہارا انکار اور تکذیب اس کی اہمیت میں کوئی کمی پیدا نہیں کر سکتے۔

---

حاشیہ صفحہ سابق: لہ لفظ "الذین" کا استعمال جو ذوی العقول جمع مذکر کے لیے ہوتا ہے بتوں کے لیے اس بنا پر ہوا ہے، کیونکہ اُن کی فکر کے زاویے سے اُن سے گفتگو کی جا رہی ہے۔

اس کے بعد ان کی بہانہ سازیوں میں سے ایک اور بہانہ جوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ اگر تم حق پر ہو تو وہ عذاب کہ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو اسے جلدی لے آؤ۔ پیغمبر اُن کے جواب میں کہتے ہیں: وہ چیز کہ جس کے بارے میں تم جلدی کر رہے ہو وہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے (ما عندی ما تستعجلون بہ) تمام کام اور تمام احکام سب کے سب خدا کے ہاتھ میں ہیں (ان الحکم الا للّٰہ)۔

اور بعد میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: وہی ہے کہ جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے اور وہ حق کو باطل سے سب سے بہتر طور پر جدا کرنے والا ہے (یقص الحق و ھو خیر الفاصلین)۔

ظاہر ہے کہ حق کو باطل سے وہی اچھی طرح جدا کر سکتا ہے کہ جس کا علم سب سے زیادہ ہو اور اُس کے لیے حق و باطل کی شناخت کامل طور سے روشن ہو۔ علاوہ ازیں وہ اپنے علم و دانش کو روبہ عمل لانے کے لیے کافی قدرت بھی رکھتا ہو اور یہ دونوں صفات (علم و قدرت) نامحدود اور بے پایاں طور پر صرف خداوند تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہیں، لہٰذا وہی حق کو باطل سے سب سے بہتر طور پر جدا کرنے والا ہے۔

بعد والی آیت میں پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ اس ہٹ دھرم اور نادان گروہ کی جانب سے عذاب و سزا کے مطالبہ پر انہیں کہہ دو کہ وہ چیز جس کے جلدی ہو جانے کا مطالبہ تم مجھ سے کرتے ہو اگر وہ میرے قبضہ و اختیار میں ہوتی اور میں تمہاری درخواست پر عمل کر دیتا تو میرا اور تمہارا کام ختم ہو گیا ہوتا (قل لو ان عندی ما تستعجلون بہ لقضی الامر بینی و بینکم)۔

لیکن اس غرض سے کہ کہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ان کی سزا کو بھلا دیا گیا ہے آخر میں قرآن کہتا ہے: خداوند تعالیٰ ستمگاروں اور ظالموں کو سب سے بہتر طور پر پہچانتا ہے اور موقع پر انہیں سزا دے گا (واللّٰہ اعلم بالظالمین)۔

## چند اہم نکات

۱۔ قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی گذشتہ قومیں اپنے انبیاء سے یہی درخواست کرتی رہیں کہ اگر تم سچے ہو تو پھر اُس عذاب کو، جس کے ہمارے اُوپر نازل ہونے کی توقع رکھتے ہو ہماری طرف کیوں نہیں بھیجتے۔

قوم نوحؑ نے بھی اُن سے یہی درخواست کی تھی اور کہا تھا کہ اے نوح! تم ہم سے اتنی باتیں کیوں کرتے ہو اور ہم سے کیوں جھگڑتے ہو، اگر تم سچ کہتے ہو تو وہ عذاب جس سے ہمیں ڈرا رہے ہو اُسے جلدی سے لے آؤ۔

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ۔

(ھود - ۳۲)

ایسا ہی تقاضا قوم صالحؑ نے بھی اُن سے کیا تھا۔ (اعراف - ۷۷)

قوم عاد نے بھی اپنے پیغمبر ہودؑ سے ایسا ہی تقاضا کیا تھا (اعراف ۷۰)

سورہ بنی اسرائیل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ درخواست پیغمبر اسلامؐ سے بارہا کی گئی یہاں تک کہ انہوں نے یہ کہا کہ ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے مگر اس وقت جب تم چند کاموں میں سے کوئی ایک انجام دو اُن میں سے

ایک یہ ہے کہ تم آسمانی پتھر ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہم پر پھینکو (اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا) (بنی اسرائیل ۹۲)
یہ نامعقول تقاضے یا تو استہزاء اور تمسخر کے طور پر ہوتے تھے۔

اور یا سچ مچ طلبِ اعجاز کے لیے اور دونوں صورتوں میں یہ ایک احمقانہ فعل تھا کیونکہ دوسری صورت میں ان کی نابودی کا سبب ہوتا لہٰذا معجزہ سے استفادہ کا محل ہی باقی نہ رہتا اور پہلی صورت میں بھی اُن واضح دلائل اور نشانیاں کے ہوتے ہوئے کہ جو تمام پیغمبر اپنے ساتھ رکھتے تھے اور جن سے ہر دیکھنے والے کی نگاہ میں کم از کم ان کی صداقت کا احتمال تو پیدا ہو جاتا تھا تو ایسے احتمال کے ہوتے ہوئے کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنی نابودی کا تقاضا کرے یا اس سے مذاق کرے، لیکن تعصب اور ہٹ دھرمی ایک ایسی عظیم بلا ہے کہ جو ہر قسم کی فکر و منطق کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔

۲۔ " ان الحکم الا للّٰہ " کا جملہ ایک واضح معنی رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر قسم کے فرامین و احکام خواہ وہ عالم آفرینش و تکوین سے متعلق ہوں یا وہ عالمِ احکام دینی و تشریع سے تعلق رکھتے ہوں، سب کے سب خدا کے ہاتھ میں ہیں۔
اس بنا پر اگر کوئی پیغمبر ان کاموں میں سے کسی کام کو کرکے دکھاتا ہے تو وہ بھی اسی کے فرمان سے کرتا ہے۔
مثلاً اگر حضرت عیسیٰ مردہ کو زندہ کرتے ہیں تو وہ بھی اسی کے اِذن سے ہے اسی طرح ہر وہ منصب جو کسی کو سپرد ہوا ہے خواہ وہ رہبری الٰہی ہو یا قضاوت و حکمرانی، پروردگار کی طرف سے ہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اتنے واضح اور روشن جملے سے پوری تاریخ میں بارہا غلط استفادہ کیا گیا ہے۔
کبھی خوارج نے جنگ صفین میں "حکمین" کے تعین کے مسئلہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہ جو خود اُن کے اور اُن جیسے لوگوں کے تقاضے پر صورت پذیر ہوا تھا اس جملے کا سہارا لیا اور حضرت علیؑ کے ارشاد کے مطابق وہ ایک کلمۂ حق کو ایک باطل معنی میں استعمال کرتے رہے اور رفتہ رفتہ جملہ ( لا حکم الا للّٰہ ) ان کا شعار ہو گیا۔

وہ اس قدر نادان و احمق تھے کہ خیال کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص خدا کے فرمان اور دستورِ اسلام کے مطابق بھی کسی موضوع میں حَکَم مقرر ہو جائے تو وہ " ان الحکم الا للّٰہ " کا مخالف ہے حالانکہ وہ قرآن کو زیادہ پڑھتے تھے لیکن اُسے بہت کم سمجھتے تھے کیونکہ قرآن تو اسلامی خاندانی جھگڑوں کے سلسلے میں بھی عورت اور مرد کی طرف سے حَکَم کے انتخاب کی تصریح کرتا ہے:

فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا (نساء ۔ ۳۵)

کچھ دوسرے لوگوں نے ۔ جیسا کہ فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے ۔ اس جملے کو مسلک جبر کی ایک دلیل قرار دیا ہے ۔ کیونکہ جب ہم یہ قبول کر لیں کہ جہانِ آفرینش کے تمام فرمان خدا کے ہاتھ میں ہیں تو پھر تو کوئی اختیار کسی کے لیے باقی ہی نہیں رہتا۔

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ بندوں کے ارادہ کی آزادی اور ان کا مختار ہونا بھی پروردگار کے فرمان سے ہے ۔ یہ خدا ہی تو ہے کہ جو یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے کاموں میں مختار اور آزاد ہوں تاکہ ان کے مختار اور آزاد ہونے کی حالت میں ان کے کندھوں پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالے اور ان کی تربیت ہو۔

۳۔ "یقص" لغت میں "قطع کرنے" اور "کسی چیز کے توڑنے" کے معنی میں آیا ہے[1] اور یہ جو زیر نظر آیت میں ہے "یقص الحق" (خدا حق کو توڑتا ہے) یعنی مکمل طور پر اُسے باطل سے جدا اور الگ کر دیتا ہے، تو اس بناء پر بعد والا جملہ "وھو خیر الفاصلین" (وہ بہترین طور پر جدا کرنے والا ہے) اس امر کی تاکید شمار ہوگا اور اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ "یقص" "قصہ" سے نہیں ہے کہ جس کا معنی سرگذشت اور داستان بیان کرنا ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے۔

۵۹۔ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○

۶۰۔ وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

۶۱۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ○

۶۲۔ ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۟ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ○

## ترجمہ

۵۹۔ غیب کی چابیاں صرف اسی کے پاس ہیں اور اس کے علاوہ کوئی اُسے نہیں جانتا اور خشکی اور دریا میں جو کچھ ہے وہ اُسے جانتا ہے کوئی پتہ (کسی درخت سے) نہیں گرتا مگر یہ کہ وہ اُس سے آگاہ ہے اور نہ زمین کی پوشیدہ

---

[1] قاموس کہتا ہے: "قص الشعر والظفر قطع منھما بالمقص ای المقراض" بالوں اور ناخنوں کو مقراض یعنی قینچی سے کاٹنے کو عرب قص اور مقراض کو مقص (کسرہ میم و فتح قاف کے ساتھ) کہتے ہیں۔

تاریک جگہوں میں کوئی دانہ ہے اور نہ ہی کوئی خشک و تر چیز وجود رکھتی ہے مگر یہ کہ وہ واضح کتاب (کتاب علم خدا) میں ثبت ہے۔

۶۰۔ وہی وہ ذات ہے کہ جو تمہاری روح کو رات کے وقت (نیند میں) لے لیتا ہے اور جو کچھ تم نے دن میں کسب کیا (اور انجام دیا) ہے اس سے باخبر ہے پھر وہ دن میں (نیند سے) تمہیں اٹھاتا ہے (اور یہ کیفیت ہمیشہ جاری رہتی ہے) یہاں تک کہ معین گھڑی آپہنچے۔ اس کے بعد تمہاری بازگشت اسی کی طرف ہوگی اور جو کچھ عمل تم کرتے ہو وہ اس کی تمہیں خبر دے گا۔

۶۱۔ وہ اپنے بندوں پر مکمل تسلط رکھتا ہے، اور تمہارے اوپر نگہبان بھیجتا ہے، یہاں تک کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے تو ہمارے بھیجے ہوئے اس کی جان لے لیتے ہیں اور وہ (بندوں کے اعمال کے حساب کی نگہداری میں) کوتاہی نہیں کرتے۔

۶۲۔ اس کے بعد (تمام بندے) خدا کی طرف جو ان کا مولائے حقیقی ہے پلٹ جائیں گے۔ جان لو کہ حکم کرنا اسی کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ سب سے جلدی حساب کرنے والا ہے۔

# تفسیر

## اسرارِ غیب

گذشتہ آیات میں گفتگو خدا کے علم و قدرت اور اس کے حکم و فرماں کے دائرے کی وسعت کے بارے میں تھی اب ان آیات میں اس بیان کی جو گذشتہ آیات میں اجمالاً ذکر ہوا تھا وضاحت کی جارہی ہے۔

سب سے پہلے علم خدا کے موضوع کو لیتے ہوئے کہتا ہے:

"غیب کے خزانے (یا غیب کی چابیاں) سب کی سب خدا کے پاس ہیں اور اس کے علاوہ کوئی انہیں نہیں جانتا (وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمہا الا ھو)۔

"مفاتح" جمع "مفتح" (بروزن بہتر) چابی کے معنی میں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جمع مفتح" (بروزن دفتر) خزانہ اور کسی چیز کی حفاظت کے مرکز کے معنی میں ہو۔

پہلی صورت میں آیت کا معنی اس طرح ہو گا کہ تمام غیب کی چابیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں اور دوسری صورت میں معنی یہ ہو گا کہ غیب کے تمام خزانے اسی کے قبضے میں ہیں۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ دونوں ہی معانی ایک عبارت میں مراد ہوں اور جیسا کہ ہم علم اصول میں ثابت کر چکے ہیں کہ ایک لفظ کا استعمال چند معانی میں کوئی مانع نہیں رکھتا اور دونوں صورتوں میں یہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں، کیونکہ جہاں کہیں خزانہ ہے وہاں چابی بھی موجود ہے۔

لیکن زیادہ تر یہی نظر میں آتا ہے کہ "مفاتح" چابیوں کے معنی میں ہے نہ کہ خزائن کے معنی میں، کیونکہ مقصد و ہدف یہاں علم خدا کو بیان کرنا ہے اور وہ چابی کے مسئلہ کے ساتھ۔ جو مختلف ذخائر سے آگاہی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ دو اور مواقع پر جہاں قرآن میں لفظ "مفاتح" استعمال ہوا ہے، وہاں بھی چابی ہی مراد ہے[1]

اس کے بعد مزید توضیح و تاکید کے لیے کہتا ہے: جو کچھ بر و بحر میں ہے خدا اسے جانتا ہے (ویعلم ما فی البر والبحر)

"بر" وسیع مکان کے معنی میں ہے اور عام طور پر خشک علاقوں کو "بر" کہا جاتا ہے اور "بحر" بھی اصل میں وسیع جگہ کے معنی میں ہے کہ جس میں زیادہ پانی جمع ہو اور عام طور پر یہ لفظ سمندروں پر اور کبھی بڑے بڑے دریاؤں پر بھی بولا جاتا ہے۔

بہر حال خدا کی اُن چیزوں سے آگاہی کہ جو خشکیوں اور سمندروں میں ہے اس کے علم کے تمام چیزوں پر احاطے کے معنی میں ہے اور اس جملہ کے معنی کی وسعت کی طرف توجہ سے (جو کچھ خشکیوں میں اور سمندروں میں ہے خدا اسے جانتا ہے) حقیقت میں اس کے وسیع علم کا ایک گوشہ واضح ہوتا ہے۔

یعنی وہ سمندروں کی گہرائیوں میں چھوٹے اور بڑے اربوں زندہ موجودات کی جنبش سے۔
اور تمام جنگلوں اور پہاڑوں میں درختوں کے پتوں کے ہلنے سے۔
اور ہر غنچہ کے چٹخنے اور ہر پھول کے کھلنے کی قطعی تاریخ سے۔
اور بیابانوں میں نسیم کی موجوں کے چلنے اور ذروں کی غلطیدگی سے۔
اور ہر انسان کے بدن کی رگوں کی صحیح گنتی اور خون کے گلوبیولز (GLO BULES) سے۔
اور ایٹم کے اندر تمام الیکٹرانوں (ELECTRONS) کی مخفی حرکتوں سے۔
اور آخر یہ کہ تمام افکار و تخیلات جو ہمارے دماغوں کے پردوں کے اندر سے گزرتے ہیں
اور ہماری روح کی گہرائیوں تک نفوذ کرتے ہیں ......... ہاں ہاں وہ ان سب سے یکساں طور پر باخبر ہے۔

پھر بعد والے جملے میں خدا کے علمی احاطہ کی تاکید کے لیے اس بارے میں خصوصیت کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کوئی پتہ درخت سے جدا نہیں ہوتا مگر یہ کہ وہ اسے جانتا ہے (وما تسقط من ورقة الا یعلمها)

---

[1] ما ان مفاتحه لتنوء بالعصبة اولی القوة (قصص - ۷۶) او ما ملکتم مفاتحه (نور - ۶۱)

یعنی اُن پتوں کی تعداد اور شاخوں سے اُن کے جدا ہونے کا وقت، ہوا کے درمیان ان کی گردش، اور ان کے زمین پر آگرنے کا لمحہ۔ یہ سب امور اس کے علم کے سامنے واضح اور روشن ہیں اسی طرح کوئی دانہ زمین کی کسی پوشیدہ جگہ میں نہیں ٹھہرتا مگر یہ کہ وہ اس کی تمام خصوصیات کو جانتا ہے (ولا حبة فی ظلمات الارض)۔

درحقیقت (اس آیت میں) دو حساس نقطوں پر انگشت رکھی گئی ہے، کہ جن کا احاطہ کرنا کسی بھی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے، خواہ ہزاروں سال اُس کی عمر کے گزر جائیں اور خواہ وہ کتنی ہی صنعتی مہارت اور حیرت انگیز ارتقائی منزلیں کیوں نہ طے کر لے۔

ایسا کونسا انسان ہے جو یہ جانتا ہو کہ ہوائیں ہر شب و روز میں تمام کرۂ زمین پر کتنی قسم کے گھاس پھوس کے بیج اُن کے پودوں سے جدا کر کے کہاں کہاں بکھیر رہی ہیں۔ ایسے ایسے بیج جو بعض اوقات ممکن ہے کہ سالہا سال تک زمین کی گہرائیوں میں اس وقت تک چھپے ہوئے پڑے رہیں جبکہ اُن کی نشو و نما کے لیے کافی مقدار میں پانی حاصل نہ ہو جائے۔

ایسا کونسا انسان ہے جو یہ جانتا ہو کہ ہر لمحے کیڑے مکوڑوں کے ذریعے یا انسانوں کے وسیلے سے کتنے دانے اور کس کس قسم کے بیج، اور زمین کے کن کن نقاط میں، بکھیرے جا رہے ہیں۔

کونسا برقی دماغ ہے وہ جو جنگلوں کے درختوں کی شاخوں سے ہر روز جھڑنے والے پتوں کی تعداد کا شمار کر سکے۔ کسی ایک جنگل کے منظر کی طرف نگاہ کرتے ہوئے، خاص طور پر موسم خزاں میں اور خصوصاً مسلسل بارش یا تیز ہوا کے بعد، اور اس عجیب و غریب منظر کو دیکھتے ہوئے کہ جو پتوں کے پے در پے گرنے سے پیدا ہوتا ہے، یہ حقیقت اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ بات ہرگز ہرگز ممکن نہیں ہے کہ اس قسم کے علوم تک انسان کی دسترس ہو سکے۔

حقیقتاً پتوں کا گرنا ان کی موت کا وقت ہے اور تاریک زمینوں میں دانوں کا گرنا، ان کی حیات و زندگی کی طرف پہلا قدم ہے اور صرف اُسی کی ذات ہے وہ کہ جو اس موت و زندگی کے نظام سے باخبر ہے۔ یہاں تک کہ ایک دانہ اپنی کامل زندگی اور پھوٹنے کی طرف جو مختلف قدم اٹھاتا ہے، وہ ہر لمحہ اور ہر گھڑی اس کے علم کی بارگاہ میں واضح و آشکار ہے۔

اس امر کے بیان کا ایک اثرِ فلسفی ہے اور ایک اثرِ تربیتی۔ اس کا فلسفی اثر تو یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کے خیال کی کہ جو خدا کے علم کو کلیات میں منحصر سمجھتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا اس جہان کے جزئیات سے آگاہ نہیں ہے، نفی کرتا ہے اور صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا تمام کلیات و جزئیات سے مکمل آگاہی رکھتا ہے[1]

باقی رہا اس کا تربیتی اثر تو واضح ہے، کیونکہ اس وسیع و بے پایاں علم پر ایمان رکھنا انسان سے یہ کہتا ہے کہ تیرے وجود کے تمام اسرار، اعمال، گفتار، نیات اور افکار سب کے سب اس کی ذات پاک کے لیے واضح و آشکار ہیں، اس قسم کے ایمان کے ساتھ کس طرح ممکن ہے کہ انسان اپنے حالات پر نگاہ نہ رکھے اور اپنے اعمال، گفتار اور نیات پر کنٹرول نہ کرے۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے کتاب "خدا را چگونہ بشناسیم" کی طرف رجوع کریں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: کوئی خشک وتر نہیں ہے مگر یہ کہ وہ کتاب مبین میں ثبت ہے (ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین)۔

یہ جملہ ایک مختصر سی عبارت کے ساتھ، تمام موجودات کے لیے خدا کے غیر متناہی علم کی وسعت کو بیان کرتا ہے اور کوئی چیز اس سے مستثنیٰ نہیں ہو گی کیونکہ "تر" اور "خشک" سے مراد ان کا لغوی معنی نہیں ہے، بلکہ یہ تعبیر معمولاً عمومیت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

کتاب مبین کے بارے میں مفسرین نے مختلف احتمال پیش کیے ہیں لیکن ان میں جو بات زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ کتاب مبین سے مراد وہی مقام علم پروردگار ہے یعنی تمام موجودات اس کے بے پایاں علم میں ثبت ہیں اور اس کی لوح محفوظ سے تعبیر کرنا بھی اسی معنی کے مطابق قرار دینے کے قابل ہے کیونکہ یہ بات بعید نہیں ہے کہ لوح محفوظ سے مراد بھی وہی صفحہ علم خدا ہو۔

کتاب مبین کے معنی میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے مراد عالم خلقت اور سلسلہ علت و معلول ہو کہ تمام چیزیں اس میں لکھ دی گئی ہیں۔

بہت سی روایات میں جو اہل بیت علیہم السلام کے طرق سے پہنچی ہیں ان میں "ورقة" سقط شدہ جنین کے معنی میں، "حبہ" فرزند کے معنی میں، "ظلمات الارض" ماؤں کے رحم کے معنی میں اور "رطب" ان نطفوں کے معنی میں جو زندہ رہتے ہیں اور "یابس" ان کے معنی میں جو ختم ہو جاتے ہیں تفسیر ہوئی ہے[1]

اس میں شک نہیں کہ یہ تفسیر ان الفاظ کے لغوی معنی پر جمود کی صورت میں تو تطبیق نہیں کرتی، کیونکہ "ورقہ" کا معنی ہے پتہ "حبہ" کا معنی ہے دانہ اور "ظلمات الارض" کا معنی ہے زمین کی تاریکیاں اور "رطب" کا معنی ہے تر اور "یابس" کا معنی ہے خشک۔ لیکن آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے حقیقت میں اس تفسیر سے مسلمانوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہا ہے کہ انہیں آیات قرآن میں ایک وسیع اور کشادہ نگاہ کے ساتھ غور کرنا چاہیے اور ان کے معانی سمجھنے میں صرف لفظ پر جمود نہ کریں بلکہ جہاں قرائن معنی کی وسعت پر دلالت کرتے ہوں تو وسعت معنی کی طرف نگاہ رکھیں۔

اوپر والی روایت میں حقیقت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اوپر والی آیت کا مفہوم صرف گھاس پھوس کے دانوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ انسانی نطفوں کے بیج تک اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

بعد والی آیت میں اعمالِ انسانی پر علم خدا کے احاطہ کی بحث کی گئی ہے کہ جو اس کا ہدف اصلی ہے اور خدا کی قدرت قاہرہ کو بھی مشخص کیا گیا ہے تا کہ لوگ اس مجموعی بحث سے ضروری تربیتی نتائج حاصل کر سکیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسی ذات ہے کہ جو تمہاری روح کو رات کے وقت قبض کر لیتی ہے اور جو کچھ تم دن میں انجام دیتے ہو اور کمائی کرتے ہیں اُس سے آگاہ ہے (وھو الذی یتوفٰکم بالیل ویعلم ما جرحتم بالنھار)۔

---

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۵۲۸۔

"توفی" لغت میں واپس لے لینے کے معنی میں ہے اور یہ جو نیند کو ایک طرح سے روح کو واپس لے لینا کہا گیا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ نیند۔ جیسا کہ معروف ہے۔ موت کی بہن ہے، موت انسانی دماغ کے کارخانہ کا مکمل طور سے معطل ہو جانا ہے اور روح وجسم کے تعلق کا مطلقاً منقطع ہو جاتا ہے، جبکہ نیند صرف دماغی کارخانہ کے ایک حصہ کا تعطل ہے اور اس تعلق کا ضعیف ہو جانا ہے اس بنا پر نیند موت کا ایک چھوٹا مرحلہ شمار ہوتی ہے۔[1]

"جرحتم" "جرح" کے مادہ سے ہے، یہاں اکتساب اور کسی چیز کو حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی تم رات دن خدا کے علم وقدرت کے سائے میں رہتے ہو۔ وہ ذات کہ جو مٹی کے اندر نباتات کے دانوں کی پرورش اور ہر زمان ومکان میں پتوں کے گرنے اور ان کی موت سے آگاہ ہے، وہ تمہارے اعمال سے بھی آگاہ ہے۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ نیند اور بیداری کا نظام بار بار دہرایا جا رہا ہے رات کو تم سو جاتے ہو اور دن تمہیں بیدار کر دیتا ہے، اور یہ حالت اسی طرح سے جاری رہتی ہے یہاں تک کہ زندگی کے آخری لمحات آ جاتے ہیں (ثم یبعثکم فیہ لیقضی اجل مسمی)۔[2]

بالآخر بحث کے آخری نتیجہ کو یوں بیان کیا گیا ہے: پھر سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے، اور وہ تمہیں ہر اس سے جو تم انجام دے چکے ہو آگاہ کرے گا (ثم الیہ مرجعکم ثم ینبئکم بما کنتم تعملون)۔

بعد والی آیت میں دوبارہ بندوں کے اعمال کی نسبت خدا کے علمی احاطے کی مزید وضاحت اور قیامت کے دن ان کے حساب کی انتہائی دقیق نگہداشت کے بارے میں قرآن کہتا ہے: وہ اپنے بندوں پر مکمل تسلط رکھتا ہے اور وہی ہے جو تمہارے لیے محافظ ونگہبان بھیجتا ہے تاکہ وہ تمہارے اعمال کا حساب انتہائی احتیاط کے ساتھ محفوظ کریں (وھو القاھر فوق عبادہ ویرسل علیکم حفظۃ)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ "قاہریت" کسی چیز پر ایسے غلبہ اور تسلط کامل کے معنی میں ہے کہ جس میں مدمقابل میں ٹھہرنے کی کوئی طاقت وسکت ہی نہ ہو اور بعض کے نظریہ کے مطابق یہ لفظ عام طور پر ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے کہ جس میں مدمقابل عقل رکھتا ہو جبکہ لفظ غلبہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی سی خصوصیت نہیں رکھتا، بلکہ اس کا معنی کامل طور سے وسیع ہے۔

"حفظۃ"، "حافظ" کی جمع ہے اور یہاں ان فرشتوں کے معنی میں ہے کہ جو انسانوں کے اعمال کی حفاظت پر مامور ہیں جیسا کہ سورہ انفطار کی آیہ ۱۰ تا ۱۲ میں ہے:

اِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ۔

---

[1] تفسیر نمونہ کی جلد ۲ صفحہ ۱۳۳ پر بھی اس سلسلہ میں گفتگو کر چکے ہیں۔

[2] "فیہ" کی ضمیر "نہار" کی طرف لوٹتی ہے اور "بعث" بھی یہاں نیند سے اٹھنے اور بیدار ہونے کے معنی میں ہے اور "اجل مسمی" سے مراد وہ عمر ہے جو کسی شخص کے لیے مقرر ہے۔

تمہارے اُوپر نگہبانی کرنے والے محافظ (فرشتے) متعین کر دیئے گئے ہیں وہ محترم و مکرم لکھنے والے ہیں جو تمہارے ہر کام سے آگاہ ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ وہ اعمال انسانی کے محافظ نہیں ہیں بلکہ ان کی ڈیوٹی خود انسان کی اجل معین تک حوادث بلایا سے حفاظت کرنا ہے اور وہ "حتی اذا جاء احدکم الموت" کو کہ جو "حفظة" کے بعد ذکر ہوا ہے اس کا قرینہ سمجھتے ہیں اور سورۂ رعد کی آیہ ۱۱ کو بھی ممکن ہے اس بات پر شاہد قرار دیں[۱]

لیکن پوری زیر بحث آیت پر غور و فکر کرنے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ "حفظة" سے مراد یہاں وہی حفظِ اعمال ہے۔ باقی رہے وہ فرشتے جو انسانوں کی حفاظت پر مامور ہیں اُن کے بارے میں انشاءاللہ ہم سورۂ رعد کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس حساب کی نگہداری زندگی کے ختم ہونے کے آخری لمحے اور موت کے آجانے تک جاری ہے (حتی اذا جاء احدکم الموت)۔

اس وقت ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) جو قبض ارواح پر مامور ہیں اس کی روح کو قبض کر لیتے ہیں (توفته رسلنا)[۲]

آخر میں مزید کہتا ہے کہ یہ فرشتے کسی طرح بھی اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی، قصور اور تفریط نہیں کرتے، نہ روح کے لینے کے لمحہ کو مقدم کرتے ہیں اور نہ مؤخر (وھم لا یفرطون) یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ صفت انسانوں کے اعمال کے حساب کی حفاظت کرنے والے فرشتوں سے مربوط ہو کہ وہ اعمال کے حساب کی نگرانی و حفاظت میں کم سے کم کوتاہی اور قصور نہیں کرتے اور زیر بحث آیت میں گفتگو کا مدار بھی اسی حصہ پر ہے۔

بعد والی آیت میں انسان کے آخری مرحلہ کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: افراد بشر اپنے دورانِ زندگی کو ختم کرنے کے بعد اپنے ان اعمال ناموں کے ساتھ کہ جن میں پوری تنظیم کے ساتھ سب کچھ ثبت و ضبط ہوگا قیامت کے دن اپنے اس پروردگار کی طرف جو اُن کا حقیقی مولا ہے پلٹ جائیں گے (ثم ردوا الی اللہ مولاھم الحق)۔

اور اس عدالت میں انصاف کرنا، حکم دینا اور فیصلہ کرنا خدا کی پاک ذات کے ساتھ مخصوص ہے (الا له الحکم)۔

اور افراد بشر اپنی پُرشور طولانی تاریخ میں جو جو عمل کرتے رہے اور ان کے جو اعمال نامے تھے ان کا بڑی تیزی کے ساتھ حساب کرے گا (وھو اسرع الحاسبین)۔

یہاں تک کہ بعض روایات میں ہے کہ:

انه سبحانه یحاسب جمیع عباده علی مقدار حلب شاة

خداوند تعالیٰ اپنے تمام بندوں کا حساب اتنے تھوڑے سے وقت میں لے لے گا جتنے وقت میں

---

[۱] تفسیر المیزان جلد ۷ صفحہ ۱۳۴۔

[۲] قبض ارواح اور آدمی کی جان کے لینے کے بارے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۲ صفحہ ۵۶ کی طرف رجوع کریں۔

ایک بکری کا دودھ دوہا جاتا ہے [۱]

جیسا کہ ہم سورہ بقرہ کی آیہ ۲۰۲ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں بندوں کا حساب اتنی تیزی کے ساتھ لیا جائے گا کہ لمحہ بھر میں اُن سب کا تمام حساب کر لیا جائے گا اور ایک بکری کے دودھ دوہنے کے وقت کا بیان اور اُوپر والی روایت کم سے کم وقت کی نشاندہی کے لیے ہے اور اسی لیے ایک دوسری روایت میں ہے:

ان اللّٰہ تعالیٰ یحاسب الخلائق کلھم فی مقدار لمح البصر [۲]

خداوند تعالیٰ تمام بندوں کا حساب ایک لحظہ میں کر لے گا۔

اور اس کی دلیل وہی ہے جو اُوپر والی آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے اور وہ یہ کہ انسان کے اعمال خود اُس کے وجود میں اور اس کے اطراف کے موجودات میں اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ یعنی وہ بالکل ان مشینوں کی طرح ہیں کہ جو اپنی حرکت کی مقدار اور اپنی کارکردگی کو نمبروں والے آلات میں ظاہر کر دیتے ہیں زیادہ واضح الفاظ میں (یوں کہا جاسکتا ہے) اگر ایسے دقیق آلات موجود ہوں تو انسان کی آنکھ میں ایسی خیانت آمیز نظروں کی تعداد کو جو اُس نے کی ہیں، پڑھا جاسکتا ہے اور انسان کی زبان پر آئے ہوئے جھوٹ، تہمتوں، زبان کے زخموں اور غلط باتوں کی تعداد کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کی روح کے علاوہ اس کے بدن کا ہر عضو خود اپنے اندر اعداد و شمار بتلانے والے اور حساب کتاب ظاہر کرنے والے آلات رکھتا ہے کہ ایک ہی لحظہ میں اس کا سارا حساب و کتاب معلوم ہو جائے گا۔

اب اگر ہم کچھ روایات میں یہ پڑھتے ہیں کہ زیادہ فرائض رکھنے والے اور بہت زیادہ مال و دولت کے مالک افراد کا حساب اس دن بہت طولانی ہوگا تو وہ حقیقت میں اس بناء پر نہیں ہے کہ اُن کے اصل حساب تک رسائی نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ وہ اس بنا پر ہے کہ ان کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ ان سوالات کا جو اُن کے اعمال کی نسبت ہوں گے جواب دیں۔ یعنی جوابدہی کے بوجھ کی سنگینی اور جواب دینے کا لازمی و ضروری ہونا اور اتمام حجت ان کی پیشی کے وقت کو طولانی کر دے گا۔

یہ آیات بندگانِ خدا کے لیے مکمل تربیتی درس ہے، خدا کا اس جہان کے چھوٹے سے چھوٹے ذرات سے آگاہ ہونا تمام چیزوں پر اس کا احاطہ علمی، بندوں کی نسبت اس کی قدرت و قہاریت، اس کا تمام اعمال بشر سے مطلع ہونا، باریک بین لکھنے والوں کے ذریعہ حسابِ اعمال کی نگہداری و حفاظت، وقت مقرر پر اس کی جان کا لینا، قیامت کے دن اس کا اٹھایا جانا اور پھر اس انسان کے تمام کاموں کی دقت نظر اور سرعت کے ساتھ جانچ پڑتال۔

کون ہے کہ جو ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتا ہو اور پھر اپنے اعمال پر نظر نہ رکھے؟ بے حساب ظلم و ستم کرے، بلاوجہ جھوٹ بولے اور دوسروں پر زیادتی کرے، کیا یہ اعمال مذکورہ اصول پر ایمان، اعتقاد اور توجہ کے ساتھ کبھی جمع ہو سکتے ہیں؟

---

[۱] مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۳۱۳۔

[۲] تفسیر مجمع البیان جلد ۱ و جلد ۲ صفحہ ۲۹۸۔

۶۳- قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○

۶۴- قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ○

## ترجمہ

۶۳- کہہ دو کہ کون ہے وہ کہ جو تمہیں خشکی اور سمندروں کی تاریکیوں سے رہائی بخشتا ہے جب کہ تم اُسے آشکار اور پوشیدہ طور پر (دل ہی دل میں) پکارتے ہو (اور کہتے ہو کہ) اگر تو نے ہمیں ان (خطرات اور تاریکیوں) سے رہائی بخش دی، تو ہم شکرگزاروں میں سے ہو جائیں گے۔

۶۴- کہہ دو کہ خدا تمہیں ان چیزوں سے اور ہر مشکل و پریشانی سے نجات بخشتا ہے پھر بھی تم اس کے لیے شریک قرار دیتے ہو (اور کفر کی راہ پر چلتے ہو)۔

## تفسیر

### وہ نور جو تاریکی میں چمکتا ہے

دوبارہ قرآن مشرکین کا ہاتھ پکڑ کر ان کی فطرت کے اندر لے جاتا ہے، اور اس اسرار آمیز نہاں خانہ میں انہیں توحید کے نور اور یکتا پرستی کی نشاندہی کراتا ہے اور پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ انہیں اس طرح کہیں : کون ہے وہ کہ جو تمہیں برو بحر کی تاریکیوں سے نجات دیتا ہے (قل من ینجیکم من ظلمٰت البر والبحر)۔

اس بات کی یاددہانی کرادینا بھی ضروری ہے کہ ظلمت و تاریکی کبھی تو جنبۂ حسی رکھتی ہے اور کبھی جنبۂ معنوی۔ ظلمتِ حسی یہ ہے کہ نور کلی طور پر منقطع ہو جائے یا اس قدر کمزور ہو جائے کہ انسان کسی جگہ کو نہ دیکھ سکے یا مشکل سے دیکھ سکے اور ظلمتِ معنوی مشکلات مصیبتیں اور پریشانیاں ہیں کہ جن کا انجام تاریک و نامعلوم ہے۔ جہالت تاریکی ہے، اجتماعی و اقتصادی حرج مرج اور فکری بے سروسامانیاں، انحرافات اور اخلاقی آلودگیاں کہ جن کے بُرے انجام پیش بینی کے قابل نہیں ہیں یا وہ چیز کہ جو بدبختی اور پریشانی کے سوا کچھ نہ ہو، یہ سب کی سب ظلمت ہیں۔

ظلمت و تاریکی اپنی ذات سے ہولناک اور توہم انگیز ہے کیونکہ بہت سے خطرناک جانوروں، چوروں اور مجرموں کا حملہ رات کی تاریکی میں ہی ہوتا ہے اور ہر شخص کو اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی خطرہ درپیش رہتا ہے، لہٰذا تاریکی میں پھنس جانے کی

صورت میں اوہام و خیالات انسان کی جان لے لیتے ہیں۔ خیالات کے مختلف زاویوں سے مختلف صورتیں اور وحشت ناک شکلیں نکل نکل کر بھاگنے لگتی ہیں اور عام افراد کو خوف و ہراس میں پھنسا دیتی ہیں۔

ظلمت و تاریکی عدم کا ایک شعبہ ہے اور انسان ذاتی طور پر عدم سے بھاگتا ہے اور وحشت رکھتا ہے۔ اسی سبب سے وہ عام طور سے تاریکی سے ڈرتا ہے۔

اگر یہ تاریکی واقعی وحشت ناک حوادث سے مل جائے، مثلاً انسان ایک ایسے سمندری سفر میں پھنس جائے جس میں اندھیری رات ہو، موجوں کا خوف ہو اور طوفان آیا ہوا ہو، تو اس کی وحشت و پریشانی اُن مشکلات سے کئی درجے زیادہ ہوئی جو دن کے وقت ظاہر ہوں۔ کیونکہ عام طور سے ایسے حالات میں انسان کے لیے چھٹکارے کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح اگر اندھیری رات میں کسی جنگل بیابان میں انسان راستہ بھول جائے اور درندوں کی وحشت ناک آوازیں، جو رات کے وقت اپنے شکار کی تلاش میں ہوتے ہیں، دور اور نزدیک سے سنائی دے رہی ہوں یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ جس میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے اور خود اپنے اور اُس تابناک نور کے سوا جو اُس کی روح کی گہرائی میں چمکتا ہے اور اُسے ایک مبدا کی طرف بلاتا ہے کہ صرف وہی ہے کہ جو اس قسم کی مشکلات کو حل کر سکتا ہے، باقی اُسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ اس قسم کے حالات جہانِ توحید و خداشناسی کا دریچہ ہیں۔ اس لیے بعد کے جملے میں ارشاد ہوتا ہے: اس قسم کی حالت میں تم اس کے لاتناہی لطف و کرم سے مدد طلب کرتے ہو، بعض اوقات آشکار اور خضوع و خشوع کے ساتھ اور کبھی پوشیدہ طریقے سے دل ہی دل کے اندر اُسے پکارتے ہو (تدعونہ تضرعًا و خفیۃ)۔

اور ایسی حالت میں تم فوراً اس عظیم مبداء کے ساتھ عہد و پیمان باندھتے ہو کہ اگر ہمیں اس خطرے سے نجات دے دے تو ہم یقیناً اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں گے اور اُس کے سوا کسی اور سے دل نہیں لگائیں گے (لئن انجٰنا من ھٰذہ لنکونن من الشاکرین)۔

لیکن اے پیغمبر! تم اُن سے کہہ دو کہ خدا تمہیں ان تاریکیوں سے اور ہر قسم کے دوسرے غم و اندوہ سے نجات دیتا ہے (اور بارہا تمہیں نجات دی ہے) لیکن تم رہائی پانے کے بعد اسی شرک و کفر کے راستے پر چل پڑتے ہو (قل اللہ ینجیکم منھا و من کل کرب ثم انتم تشرکون)۔

## چند اہم نکات

۱۔ "تضرع" کا ذکر جو دعائے آشکار کے معنی میں ہے اور "خفیۃ" کا تذکرہ جو کہ پنہانی دعا ہے شاید اس سبب سے ہو کہ مشکلات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ بعض اوقات شدت کے مرحلے تک نہ پہنچنے کی وجہ سے انسان کو پنہانی دعا کی دعوت دیتی ہیں اور بعض اوقات وہ شدید مرحلے تک پہنچ جاتی ہیں تو علی الاعلان دستِ دعا بلند کرتا ہے اور بعض اوقات نالہ و فریاد کی نوبت آ جاتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ خدا تمہاری شدید مشکلات کو بھی حل کرتا ہے اور ضعیف مشکلات کو بھی۔

۲۔ بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ آیت میں انسان کی چار نفسیاتی حالتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جن میں سے ہر ایک مشکلات کے ظہور کے وقت ایک قسم کا عکس العمل ہے حالتِ دعا و نیاز، حالتِ تضرع و خضوع، حالتِ اخلاص اور مشکلات سے نجات

حاصل ہوتے وقت شکر گزاری کے التزام کی حالت۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان افراد میں سے بہت سوں کے لیے یہ قیمتی حالات بجلی کی طرح جلدی سے گزر جانے والے اور شدائد و مشکلات کے مقابلے میں تقریباً اضطراری شکل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان میں علم و آگاہی نہیں ہوتی لہٰذا شدائد و مشکلات کے برطرف ہوتے ہی خاموشی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

اس بنا پر یہ حالات اگرچہ زود گزر ہی ہوں پھر بھی دور افتادہ افراد کے لیے خدا شناسی کے سلسلے میں دلیل بن سکتے ہیں۔

۴۔ "کرب" (بروزن حرب) دراصل زمین کو نیچے اوپر کرنے اور کھودنے کے معنی میں ہے۔ نیز وہ محکم گرہ جو پانی کے ڈول کی طناب میں لگائی جاتی ہے، کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس کے بعد وہ غم و اندوہ جو انسان کے دل کو زیر و زبر کرتے ہیں اور جو گرہ کی طرح انسان کے دل پر بیٹھ جاتے ہیں کے لیے بھی بولا جانے لگا۔

اس بنا پر اوپر والی آیت میں لفظ "کرب" جو ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور ہر قسم کی بڑی سے بڑی مشکلات پر محیط ہے یہ "بر و بحر کی تاریکیوں" کا ذکر کرنے کے بعد کہ جو شدائد کے ایک خاص حصہ کو کہا جاتا ہے، ایک خاص مفہوم بیان کرنے کے بعد ایک عام مفہوم کے طور پر آیا ہے (غور کیجیئے گا)۔

یہاں پر وہ حدیث بیان کرنا کہ جو اس آیت کے ذیل میں بعض اسلامی تفاسیر میں نقل ہوئی ہے نامناسب نہ ہوگا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

خیر الدعاء الخفی وخیر الرزق ما یکفی

بہترین دعا وہ ہے کہ جو پنہانی (اور انتہائی خلوص کے ساتھ) صورت پذیر ہو اور بہترین روزی وہ ہے کہ جو بقدر کفایت ہو (نہ کہ ایسی ثروت اندوزی کہ جو دوسروں کی محرومیت کا سبب بنے اور انسان کے کندھے پر ایک سنگین بوجھ ہو)۔

اور اسی حدیث کے ذیل میں ہے:

مر بقوم رفعوا اصواتهم بالدعا فقال انكم لا تدعون الاصم ولا غائبًا وانما تدعون سميعًا قريبًا[1]

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک گروہ کے قریب سے گزرے وہ لوگ بلند آواز سے دعا کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا: تم کسی بہرے کو تو نہیں پکار رہے اور نہ ہی کسی ایسے شخص کو پکار رہے ہو کہ جو تم سے پوشیدہ اور دور ہو بلکہ تم ایک ایسی ہستی کو پکار رہے ہو کہ جو سننے والا بھی ہے اور قریب بھی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دعا آہستہ آہستہ اور توجہ اور اخلاص کے ساتھ کی جائے تو بہتر ہے۔

۶۵۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰٓ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ

---

[1] تفسیر مجمع البیان و نور الثقلین مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں۔

اَرۡجُلِكُمۡ اَوۡ يَلۡبِسَكُمۡ شِيَعًا وَّيُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ ؕ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَفۡقَهُوۡنَ ○

## ترجمہ

۶۵۔ تم کہہ دو کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی عذاب یا تو اوپر کی طرف سے تم پر نازل کر دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے کی طرف سے بھیج دے۔ یا تمہیں مختلف گروہوں کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ بھڑا دے اور جنگ (و ناراحتی) کا ذائقہ تم میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ذریعے چکھا دے۔ دیکھو ہم طرح طرح کی آیات کو کس طرح اُن کے لیے واضح کرتے ہیں شاید وہ سمجھ لیں (اور پلٹ آئیں)۔

## تفسیر

### رنگ رنگ کے عذاب

گذشتہ آیات میں توحید فطری کے بیان کے ضمن میں درحقیقت بندوں کے ساتھ ایک قسم کی تشویق اور اظہارِ محبت ہوا تھا کہ خداوند تعالیٰ شدائد و مشکلات کے وقت انہیں کس طرح اپنی پناہ میں لے لیتا ہے اور ان کی خواہشات کو پورا کرتا ہے۔

اس آیت میں تربیت کے مختلف طرق کی تکمیل کے لیے خدائی عذاب اور سزا سے ڈرانے کے مسئلہ کا سہارا لیا گیا ہے یعنی جس طرح کہ خدا ارحم الراحمین اور بے سہارا لوگوں کو پناہ دینے والا ہے، اسی طرح طغیانگروں اور سرکشوں کے مقابلے میں قہار و منتقم بھی ہے۔ اس آیت میں پیغمبر کو حکم دیا جا رہا ہے کہ مجرموں کو تین قسم کی سزاؤں کی دھمکی دو، اُوپر کی طرف کے عذابوں کی نیچے کی طرف کے عذابوں کی اور باہمی اختلاف کے ذریعے جنگ کی آگ کے بھڑک اٹھنے اور خونریزی کی سزائیں، لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ: تم کہہ دو کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی عذاب یا تو اُوپر کی طرف سے تم پر نازل کرے یا تمہارے پاؤں کی طرف سے بھیج دے (قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم او من تحت ارجلکم)۔

یا تمہیں مختلف گروہوں کی صورت میں ایک کو دوسرے کے ساتھ بھڑا دے اور جنگ و خونریزی کا ذائقہ تم میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ذریعہ چکھا دے او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم بأس بعض)۔

اور آیت کے آخر میں قرآن مزید کہتا ہے: دیکھو! ہم طرح طرح کی نشانیوں اور دلائل کو کس طرح اُن کے لیے بیان

کرتے ہیں شاید وہ سمجھ جائیں اور حق کی طرف لوٹ آئیں (انظر کیف نصرف الآیات لعلھم یفقھون)۔

## چند اہم نکات

۱۔ اس بارے میں کہ "اوپر" کی طرف سے "عذاب" اور "نیچے" کی طرف سے عذاب سے کیا مراد ہے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ (فوق و تحت) بہت ہی وسیع معنی رکھتے ہیں۔ ان میں حسی طور پر اوپر اور نیچے کا مفہوم بھی شامل ہے یعنی ایسی سزائیں جو اوپر کی طرف سے آتی ہیں مثلاً بجلیاں، خطرناک بارشیں اور طوفان اور ایسی سزائیں جو نیچے کی طرف سے آتی ہیں مثلاً زلزلے اور زمین کو ویران و برباد کرنے والے شگاف اور دریاؤں اور سمندروں کے طوفان، سب اس میں داخل ہیں۔

وہ دردناک عذاب بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے کہ جو حکام کے طبقہ اور معاشرے کے اوپر والے حصے کی طرف سے بعض قوموں کے سروں پر آتے ہیں اور وہ پریشانیاں اور سختیاں جو مزدوروں اور نافہم اور فرض ناشناس افراد کی طرف سے لوگوں کو دامنگیر ہو جاتی ہیں جو بعض اوقات پہلے گروہ کے عذاب سے کمتر نہیں ہوتیں، سبھی اس کے معنی میں داخل ہیں۔

اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے زمانے کے خوفناک جنگی ہتھیار کہ جو فضا اور زمین سے وحشت ناک صورت میں انسانی زندگی کو تباہ کر دیتے ہیں اور تھوڑی سی دیر میں آباد ترین شہروں کو ہوائی بمباری اور زمینی حملوں سے، میزائیلوں اور آبدوزوں سے خاکستری ٹیلوں میں بدل دیتے ہیں وہ بھی آیت کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں۔

۲۔ "یلبسکم" "لبس" (بروزن حبس) مادہ بھیڑ کرانے اور ایک دوسرے سے ٹکروانے کے معنی میں ہے نہ کہ مادہ "لبس" (بروزن قرض) لباس پہننے کے معنی میں۔ اس بنا پر جملہ کا معنی یوں ہوگا کہ وہ تمہیں مختلف گروہوں اور دستوں کی شکل میں ایک دوسرے سے ٹکرا بھی سکتا ہے[1]

اور یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اختلافِ کلمہ (تفرقہ بازی یا پھوٹ) اور جمعیت کی پراگندگی کا مسئلہ اس قدر خطرناک ہے کہ وہ آسمانی عذاب اور بجلیوں اور زلزلوں کا ہم پلہ اور ہم پایہ قرار پایا ہے، حقیقتاً ہے بھی ایسا ہی بلکہ بعض اوقات اختلاف و پراگندگی سے پیدا ہونے والی ویرانیاں اُن ویرانیوں سے کئی درجے زیادہ ہوتی ہیں جو بجلیوں اور زلزلوں سے آتی ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ آباد ملک نفاق اور تفرقہ بازی کے منحوس سائے میں مطلق تباہی کی نذر ہو جاتے ہیں اور یہ جملہ تمام مسلمانانِ عالم کے لیے ایک تنبیہ اور صدائے ہوشیار باش ہے۔

یہ احتمال بھی اس جملہ کی تفسیر میں موجود ہے کہ خدا نے آسمانی اور زمینی عذاب کے مقابلہ میں دو دوسرے عذاب بیان کیے ہیں، ایک عقیدہ اور فکر و نظر کے اختلاف کا عذاب (جو حقیقت میں اُوپر کے عذابوں کی مانند ہے) [illegible] دوسرے عمل اور اجتماعی طور طریقوں میں اختلاف کا عذاب جس کا نتیجہ جنگ اور خونریزی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جو نیچے کی

---

[1] شیعًا جمع ہے شیعہ کی جس کا معنی گروہ ہے۔

طرف کے عذاب کے مشابہ ہے۔ اس بنا پر آیت میں چار قسم کے طبیعی عذابوں اور دو قسم کے اجتماعی عذابوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۳۔ اس بات کا اشتباہ نہ ہونے پائے کہ زیر بحث آیت کہتی ہے کہ خدا تمہارے درمیان تفرقہ ڈال دے گا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا بلا وجہ لوگوں کو نفاق و اختلاف میں گرفتار کردے گا بلکہ یہ لوگوں کے بُرے اعمال خودخواہیوں خود پرستیوں اور شخصی نفع خوریوں کا نتیجہ ہے کہ جس کا اثر نفاق اور تفرقہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور خدا کی طرف اس کی نسبت اس سبب سے ہے کہ اس نے اس قسم کا اثر ان بُرے اعمال میں قرار دیا ہے۔

۴۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان آیات میں روئے سخن مشرکین اور بت پرستوں کی طرف ہے، ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایک مشرک معاشرہ جو توحید اور یکتا پرستی کے راستہ سے منحرف ہو چکا ہے، وہ طبقات بالا کے ظلم و ستم میں بھی گرفتار ہوتا ہے اور نچلے طبقہ کی فرض ناشناسی کی مصیبت میں بھی گرفتار ہوتا ہے، اختلاف عقیدہ کی خرابیوں سے بھی دوچار ہوتا ہے اور اجتماعی خونیں کشمکشوں میں بھی گرفتار ہوتا ہے۔ جیسا کہ آج کی مادی دنیا کے معاشرے، جو صرف صنعت و ثروت کے بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں ان تمام عظیم بلاؤں میں مبتلا ہیں اور ان کے درمیان ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ ہمیں ایسے مذاہب کا بھی علم ہے کہ جو توحید و خدا پرستی کا دم بھرتے ہیں لیکن عملی طور پر مشرک اور بت پرست ہیں۔ ایسے مذاہب و اقوام بھی انہی مشرکین کے سے انجام میں گرفتار ہوں گے اور یہ جو ہم بعض احادیث میں پڑھتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ:

کل ھذا فی اھل القبلۃ

یہ سب سزائیں مسلمانوں میں بھی واقع ہوں گی۔

ممکن ہے کہ یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہو کہ جب مسلمان توحید کے راستے سے منحرف ہو جائیں، خودخواہی اور خود پرستی اخوت اسلامی کی جگہ لے لے، شخصی مفاد عمومی مفاد پر مقدم سمجھا جانے لگے اور ہر شخص اپنی ہی فکر میں لگ جائے اور خدائی احکام بھلا دیئے جائیں، تو وہ بھی ایسے انجام میں گرفتار ہو جائیں گے۔

۶۶۔ وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۚ قُلْ لَسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيلٍ ۝

۶۷۔ لِكُلِّ نَبَإٍ مُسْتَقَرٌّ ۚ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝

## ترجمہ

۶۶۔ تیری قوم نے اس کی تکذیب اور انکار کیا حالانکہ وہ حق ہے (ان سے) کہہ دو کہ میں تمہارے بارے میں (قبول کرنے اور ایمان لانے کا) جوابدہ نہیں ہوں (میرا فریضہ صرف ابلاغ رسالت ہے نہ کہ تمہیں ایمان پر مجبور کرنا)۔

۶۷۔ ہر خبر (جو خدا نے تمہیں دی ہے آخر کار اس) کی ایک قرار گاہ ہے (اور وہ اپنی وعدہ گاہ میں انجام پائے گی) اور تم جلدی ہی جان لوگے۔

# تفسیر

یہ دونوں آیات حقیقت میں اس بحث کی تکمیل ہیں جو خدا، معاد اور حق نما اسلام کی طرف دعوت دینے اور خدائی سزاؤں سے ڈرانے کے سلسلے میں گذشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ: تیری قوم جمعیت یعنی قریش اور مکہ کے لوگوں نے تیری تعلیمات کی تکذیب کی حالانکہ وہ سب حق ہیں اور مختلف عقلی، فطری اور حسی دلائل ان کی تائید کرتے ہیں (وکذب بہ قومک وھو الحق[1])۔

اس بنا پر ان کی تکذیب اور انکار سے ان حقائق کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی خواہ مخالفت کرنے والے اور منکرین کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔

اس کے بعد حکم دیا گیا ہے کہ: ان سے کہہ دو کہ میری ذمہ داری تو صرف ابلاغِ رسالت ہے اور میں تمہارے قبول کرنے کا ضامن نہیں ہوں (قل لست علیکم بوکیل)۔

ان متعدد آیات سے کہ جن میں یہی تعبیر اور اسی کے مانند تعبیر آئی ہے (مثلاً انعام — ۱۰۷، یونس — ۱۰۸، زمر — ۴۱ اور شوریٰ — ۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مواقع پر "وکیل" سے مراد ایسا شخص ہے کہ جو ہدایت عملی کے لیے جوابدہ اور دوسروں کا ضامن ہو۔ اس طرح پیغمبر انہیں بتاتے ہیں کہ یہ صرف تم ہو کہ جو حقیقت قبول کرنے یا رد کرنے کے سلسلے میں پورا پورا اختیار رکھتے ہو اور ہدایت کو قبول کرتے ہو۔ میں تو صرف ابلاغ رسالت اور دعوت الٰہی پر مامور ہوں۔

بعد والی آیت میں ایک مختصر اور پُر معنی جملہ کے ساتھ انہیں تنبیہ کر رہا ہے اور صحیح راستہ انتخاب کرنے کے بارے میں دقتِ نظر اور باریک بینی کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے: ہر خبر جو خدا یا پیغمبر تمہیں دیتے ہیں بالآخر اس جہاں میں یا دوسرے جہاں میں اس کی کوئی نہ کوئی قرار گاہ ہے اور آخر کار وہ اپنی مقررہ میعاد پر انجام پائے گی اور تمہیں بہت جلد اس کی خبر ہو جائے گی (لکل نبأ مستقر وسوف تعلمون[2])۔

---

[1] ضمیر "بہ" کو بعض نے قرآن کی طرف لوٹایا ہے اور بعض نے اس خاص عذاب کی طرف جو اس سے پہلی آیت میں بیان ہوا تھا لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ ان تمام باتوں کی طرف اور پیغمبر کی تمام تعلیمات کی طرف جن کی دشمنان پیغمبر تکذیب و انکار کیا کرتے تھے لوٹتی ہے، اور آیت کا آخری جملہ بھی اس معنی پر گواہ ہے۔

[2] ہو سکتا ہے "مستقر" مصدر میمی بمعنی استقرار ہو، یا یا اسم زمان و مکان محل استقرار کے معنی میں ہو۔ پہلی صورت میں خدائی وعدوں کے اصل تحقق کی خبر دے رہا ہے اور دوسری صورت میں ان وعدوں کے زمان و مکان کی خبر ہے۔

۶۸- وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○

۶۹- وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○

## ترجمہ

۶۸- جس وقت تم ان لوگوں کو دیکھو کہ جو ہماری آیات کا مذاق اُڑاتے ہیں تو اُن سے منہ پھیر لو۔ یہاں تک کہ وہ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں اور اگر شیطان تمہیں بھلا دے تو جونہی (اس) ستم گر گروہ کی طرف تمہاری توجہ ہو جائے تو اُن کے پاس بیٹھنے سے کنارہ کشی کرو۔

۶۹- اور اگر صاحب تقویٰ افراد (انہیں ہدایت اور پند و نصیحت کرنے کے لیے ان کے پاس بیٹھ جائیں) تو ان کے حساب (و گناہ) میں سے کوئی چیز ان کے اُوپر عائد نہیں ہوگی لیکن (یہ کام صرف انہیں) یاد دہانی کرانے کے لیے ہونا چاہیے شاید (وہ سنیں اور) پرہیزگاری اختیار کریں۔

## شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ جب پہلی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو کفار اور آیات الٰہی کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے منع کر دیا گیا، تو مسلمانوں کی ایک جماعت کہنے لگی کہ اگر ہم چاہیں کہ اس حکم پر ہر جگہ عمل کریں تو نہ ہمیں مسجد الحرام میں جانا چاہیے اور نہ ہی خانہ کعبہ کا طواف کرنا چاہیے (کیونکہ وہ مسجد کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اور آیات الٰہی کے بارے میں باطل باتوں میں مشغول ہیں اور ہم مسجد الحرام کے کسی بھی گوشہ میں خواہ کتنا بھی مختصر توقف کریں اس میں ان کی باتیں ہمارے کانوں تک پہنچ سکتی ہیں)۔ اس موقع پر دوسری آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ایسے مواقع پر انہیں نصیحت کریں اور جتنا ہو سکے ان کی ہدایت اور رہنمائی کریں۔

اس آیت کے لیے شان نزول کا ذکر جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں تمام سورۃ کے اکٹھا نازل ہونے کے منافی نہیں کیونکہ ممکن ہے مسلمانوں کی زندگی میں ایسے مختلف حوادث پیش آئیں، اس کے بعد ایک سورہ اکٹھی نازل ہو

اور اس کی کوئی آیت ان حوادث میں سے کسی حصہ کو مدنظر رکھتے ہوئے آئی ہو۔

# تفسیر

## اہلِ باطل کی مجالس سے دوری

چونکہ اس سورہ کے زیادہ تر مباحث مشرکین اور بت پرستوں کی کیفیت کے بارے میں ہیں لہٰذا ان دو آیات میں اُن سے مربوط ایک دوسرے مسئلہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے، پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ارشاد ہوتا ہے کہ جس وقت تم ہٹ دھرم اور بے منطق مخالفین کو دیکھو کہ وہ آیات خدا کا استہزاء کر رہے ہیں تو اُن سے منہ پھیر لو جب تک وہ اس کام سے صرف نظر کر کے دوسری گفتگو کو شروع نہ کریں (واذا رایت الذین یخوضون فی اٰیاتنا فاعرض عنھم حتّٰی یخوضوا فی حدیث غیرہ)[1]۔

اس جملے میں اگرچہ روئے سخن پیغمبرؐ کی طرف ہے، لیکن یہ بات مسلم ہے کہ یہ حکم آپؐ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام مومنین کے لیے ہے۔ اس حکم کا فلسفہ بھی واضح ہے کہ اگر مسلمان ان کی مجالس میں شرکت کرتے تھے تو وہ انتقام لینے اور انہیں تکلیف پہنچانے کے لیے اپنی باطل اور ناروا باتوں کو جاری رکھتے تھے، لیکن جب وہ بے اعتنائی کے ساتھ اُن کے قریب سے گزر جائیں تو وہ فطرتاً خاموش ہو جائیں گے اور دوسرے مسائل شروع کر دیں گے، کیونکہ ان کا سارا مقصد تو پیغمبر اور مسلمانوں کو تکلیف پہنچانا تھا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ یہ موضوع اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ "اگر شیطان تمہیں یہ بات بھلا دے اور اس قسم کے افراد کے ساتھ بھول کر ہم نشین ہو جاؤ تو جب بھی اس موضوع کی طرف توجہ ہو جائے فوراً اُس مجلس سے کھڑے ہو جاؤ اور اُن ظالموں کے پاس نہ بیٹھو" (واما ینسینک الشیطٰن فلا تقعد بعد الذکرٰی مع القوم الظٰلمین)[2]۔

## دو سوال اور ان کا جواب

پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ شیطان پیغمبر پر تسلط پیدا کرے اور ان کے نسیان کا باعث بنے، دوسرے

---

[1] "خوض" جیسا کہ "راغب" کتاب "مفردات" میں کہتا ہے دراصل پانی میں وارد ہونے اور اس میں چلنے (اور نہانے) کے معنی میں ہے لیکن بعد میں اور امور میں وارد ہونے کے معنی میں بھی بولا جانے لگا، لیکن قرآن میں اس لفظ کا اطلاق زیادہ تر باطل اور بے بنیاد مطالب میں وارد ہونے کے معنی میں ہوا ہے۔

[2] شاید یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ "لا تقعد" (ان کے پاس نہ بیٹھو) سے مراد یہ نہیں ہے کہ صرف ایسے افراد کے پاس بیٹھنا ممنوع ہے بلکہ مقصد تو ان کی جماعت میں شرکت کرنا ہے، چاہے بیٹھنے کی شکل میں ہو یا قیام کی صورت میں یا چلنے کی حالت میں۔

لفظوں میں کیا مقام عصمت اور خطا سے معصومیت کے باوجود حتیٰ کہ موضوعات میں یہ بات ممکن ہے کہ پیغمبر اشتباہ اور نسیان میں گرفتار ہو جائے۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر چہ روئے سخن آیت میں پیغمبر کی طرف ہے لیکن حقیقت میں ان کے پیروکار مراد ہیں کہ اگر وہ فراموش کاری میں گرفتار ہو جائیں اور کفار کے گناہ آمیز اجتماعات میں شریک ہو جائیں تو جس وقت بھی انہیں یاد آجائے فوراً وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوں اور باہر نکل جائیں، اور اس قسم کی بحث ہماری روزمرہ کی گفتگو میں اور مختلف زبانوں کے ادبیات میں عام نظر آتی ہے کہ انسان روئے سخن تو کسی اور کی طرف کرتا ہے مگر اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرے سن لیں، عربوں کی مشہور ضرب المثل کی طرح، جس میں کہتے ہیں:

ایاك اعنی و اسمعی یاجارۃ

میری مراد تو تم ہو اور اے پڑوسن تو سن لے۔

بعض مفسرین نے مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں اور ابو الفتوح نے اپنی مشہور تفسیر میں ایک دوسرا جواب دیا ہے کہ جس کا ماحصل یہ ہے کہ انبیاء کے لیے خدا کی طرف سے احکام کے پہچاننے اور مقام رسالت میں سہو و فراموشی اور بھول چوک کا ہونا تو جائز نہیں ہے لیکن موضوعات خارجی میں اگر لوگوں کی گمراہی کا سبب نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن یہ جواب اس اصول کے ساتھ جو ہمارے متکلمین کے درمیان مشہور ہے کہ انبیاء و ائمہ علیہم السلام احکام کے علاوہ عام موضوعات میں بھی غلطی سے معصوم و مصئون ہیں مناسبت نہیں رکھتا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ بعض علمائے اہل سنت نے اس آیت کو رہبران دینی کے لیے تقیہ جائز نہ ہونے کی دلیل قرار دیا ہے کیونکہ آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے، دشمنوں کے سامنے تقیہ نہ کرو یہاں تک کہ اگر تم اُن کی مجلس میں بھی موجود ہو تو ان کی مجلس سے کھڑے ہو جاؤ۔

اس اعتراض کا جواب بھی بالکل واضح اور روشن ہے، کیونکہ شیعہ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ہر جگہ تقیہ ضروری ہے بلکہ تقیہ بعض مواقع پر تو قطعاً حرام ہے اور اس کا وجوب صرف ایسے مواقع کے لیے ہے کہ جہاں تقیہ کرنے اور اظہارِ حق نہ کرنے میں کچھ ایسے فوائد و منافع ہوں کہ جو اس کے اظہار سے زیادہ ہوں یا یہ کہ تقیہ دفع ضرر اور خطر کلی کے دور ہونے کا موجب ہو۔

بعد والی آیت میں ایک موقع کو مستثنیٰ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اگر صاحب تقویٰ لوگ نہی از منکر کی غرض سے ان کے جلسوں میں شرکت کریں اور پرہیزگاری کی اُمید اور اُن کے گناہ سے پلٹ آنے کی اُمید پر انہیں نصیحت کریں تو کوئی مانع نہیں ہے اور ہم اُن کے گناہ کو ایسے افراد کے حساب میں نہیں لکھیں گے، کیونکہ ہر حالت میں ان کا ارادہ تو خدمت اور اپنے فرض کی بجا آوری تھا (و ما علی الذین یتقون من حسابھم من شیء و لکن ذکری لعلھم یتقون)۔

اس آیت کے لیے ایک دوسری تفسیر بھی بیان ہوئی ہے لیکن ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ظاہر آیت اور

اس کی شان نزول کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

ضمناً اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہیے کہ صرف وہ افراد اس استثنا سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ جو آیت کی تعبیر کے مطابق تقویٰ اور پرہیزگاری کے مقام کے حامل ہوں اور نہ صرف یہ کہ وہ خود اُن سے متاثر نہ ہوں، بلکہ وہ انہیں خود اپنے سے متاثر کر سکیں۔

سورہ نساء کی آیت ۱۴۰ کے ذیل میں بھی مذکورہ آیت کے مشابہ ایک مضمون آیا ہے اور وہاں پر دوسرے مطالب بیان ہوئے ہیں[1]

۷۰۔ وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهِ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ وَإِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذْ مِنْهَا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۝

## ترجمہ

۷۰۔ تم ایسے لوگوں کو کہ جنہوں نے اپنے فطری دین کو کھیل تماشا (اور استہزاء) بنا لیا ہے اور دنیاوی زندگی نے انہیں مغرور کر دیا ہے، چھوڑ دو اور انہیں نصیحت کرو تاکہ وہ اپنے اعمال کے (بُرے نتائج) میں گرفتار نہ ہوں۔ (اس دن) خدا کے سوا نہ ان کا کوئی یار و یاور ہوگا اور نہ ہی کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا اور (ایسے شخص سے) خواہ وہ کسی بھی قسم کا عوض کیوں نہ دے اس سے قبول نہیں کیا جائے گا وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو اُن اعمال میں گرفتار ہوئے ہیں کہ جو انہوں نے انجام دیئے ہیں۔ ان کے پینے کے لیے گرم پانی ہے اور دردناک عذاب ہے، یہ اس سبب سے ہوگا کیونکہ انہوں نے کفر اختیار کیا ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۶۲۳

# تفسیر

## دینِ حق کو کھیل بنانے والے

یہ آیت اصل میں گذشتہ آیت کی بحث کی تکمیل کر رہی ہے اور پیغمبر اکرم کو حکم دے رہی ہے کہ وہ "ایسے اشخاص سے کہ جنہوں نے اپنے دین و آئین کو مذاق بنالیا ہے اور لہو لعب کو دین قرار دے لیا ہے اور دنیاوی زندگی اور اس کے وسائل نے انہیں مغرور کر دیا ہے، منہ پھیرلیں اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں" (وذر الذین اتخذوا دینهم لعبًا ولهوًا وغرتهم الحیوة الدنیا)۔

یہ بات واضح ہے کہ ایسے اشخاص کو چھوڑ دینے کا حکم مسئلہ جہاد کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتا، کیونکہ جہاد کی کچھ خاص شرائط ہیں اور کفار کے ساتھ بے اعتنائی برتنے کی شرائط دوسری ہیں۔ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر انجام پذیر ہونا چاہیے، بعض اوقات تو بے اعتنائی کے ذریعہ ہی مخالفین کو دبانا لازم ہوتا ہے اور کبھی مبارزہ و جہاد اور مسلح جنگ کے ذریعہ مقابلہ ضروری ہوتا ہے اور بعض حضرات نے جو یہ تصور کر لیا ہے کہ آیات جہاد نے اوپر والی آیت کو منسوخ کر دیا ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔

حقیقت میں مندرجہ بالا آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا دین اپنے مفاہیم کے لحاظ سے بیہودہ اور فضول ہے اور انہوں نے چند ایسے اعمال کا نام دین رکھ لیا ہے جو بچوں کے کاموں اور بوڑھوں کی لغویات سے زیادہ مشابہ ہیں۔ ایسے لوگ بحث و گفتگو کے قابل نہیں ہیں۔ لہٰذا حکم دیا گیا ہے کہ تم اُن سے رُخ موڑ لو اور ان کی اور ان کے کھوکھلے مذہب کی پرواہ نہ کرو۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ "دینهم" سے مراد وہی ان کا شرک و بت پرستی والا مذہب ہی ہے۔ یہ احتمال کہ اس سے مراد "دین حق" ہو اور ان کی طرف دین کی اضافت و نسبت دین کے فطری ہونے کی وجہ سے ہو، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کفار کی ایک جماعت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ وہ خود اپنے دین و مذہب کو ایک لہو و لعب ہی سمجھتے تھے، اور ہرگز اس میں ایک حقیقی مطلب کے طور پر غور نہیں کرتے تھے۔ یعنی وہ اپنی بے ایمانی میں بھی بے ایمان تھے اور اپنے بے بنیاد مذہب کے اصولوں سے بھی وفادار نہیں تھے۔

بہر حال آیت کفار کے ساتھ کوئی اختصاص نہیں رکھتی اور اُن تمام لوگوں کے حالات پر محیط ہے جو مقدساتِ الٰہی اور احکام خداوندی کو اپنے شخصی اور مادی مقاصد کے حصول کا ایک کھیل قرار دیتے ہیں۔ دین کو دنیا کا آلہ اور خدا کے حکم کو اغراض شخصی کا کھلونا بنا لیتے ہیں۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں ان اعمال پر تنبیہ کریں کیونکہ ایسا دن آنے والا ہے جس میں ہر شخص اپنے اعمال کے آگے سپر انداختہ ہوگا اور اس کے لیے اُس کے چنگل سے فرار کی راہ نہیں ہوگی (وذکر بہ ان تبسل نفس بما کسبت)[1]۔

اور اُس دن خدا کے سوا نہ تو کوئی اس کا حامی و مددگار ہوگا اور نہ ہی کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا (لیس لھا من دون اللہ ولی ولا شفیع)۔

ان کا معاملہ اُس دن اس قدر سخت اور دردناک ہوگا اور وہ اپنے اعمال کی زنجیر میں اس طرح گرفتار ہوں گے کہ "خواہ کتنا بھی تاوان اور جرمانہ (بالفرض اُن کے پاس ہو اور وہ) دیں کہ اپنے آپ کو سزاؤں سے نجات دلا لیں تو وہ اُن سے قبول نہیں کیا جائے گا" (و ان تعدل کل عدل لا یؤخذ منھا)[2]

کیونکہ وہ اپنے اعمال میں گرفتار ہو چکے ہیں، اس دن نہ تو تلافی کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی توبہ کا وقت باقی ہے لہٰذا ان کے لیے نجات کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی (اولئک الذین ابسلوا بما کسبوا)۔

اس کے بعد ان کی دردناک سزاؤں کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے حق اور حقیقت کو ٹھکرا دیا ہے لہٰذا ان کے لیے دردناک عذاب کے ساتھ پینے کے لیے کھولتا ہوا گرم پانی ہوگا (لھم شراب من حمیم وعذاب الیم بما کانوا یکفرون) وہ گرم گرم کھولتے ہوئے پانی کی وجہ سے اندر سے جل رہے ہوں گے اور باہر کی طرف سے آگ میں جل رہے ہوں گے۔

ایک نکتہ کہ جس کی طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے یہ ہے کہ (اولئک الذین ابسلوا بما کسبوا) "وہ اپنے اعمال میں گرفتار ہوں گے" حقیقت میں اُن سے تاوان قبول نہ ہونے اور ان کا ولی و شفیع نہ ہونے کی دلیل و علت کے طور پر ہے۔ یعنی ان کی سزا کسی خارجی عامل کی وجہ سے نہیں ہے کہ جسے کسی طرح سے دفع کیا جا سکے، بلکہ خود ان کی ذات و صفات اور اعمال کے اندر ہی اس کا سرچشمہ ہے، وہ اپنے بُرے اعمال کے قیدی ہیں اس لیے اُن کی رہائی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اعمال اور ان کے آثار سے الگ ہونا خود اپنے آپ سے جدا ہونے کے مترادف ہے۔

لیکن اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہیے کہ یہ شدت و سختی اور راہ بازگشت کا مسدود ہونا اور شفاعت کا عدم وجود ایسے

---

[1] "تبسل" اصل میں مادہ "بسل" (بروزن نسل) کسی چیز سے قہر و غلبہ کے ذریعہ بچنے اور منع کرنے کے معنی میں ہے، اسی لیے کسی کو تسلیم و سپردگی کے لیے ابھارنے کو ابسال کہا جاتا ہے۔ نیز اسی مناسبت سے سزا دینے اور یرغمال بنانے کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، اور "جیش باسل" لشکر شجاع کے معنی میں بھی اسی مناسبت سے ہے، کیونکہ وہ دوسروں کو قہر و غلبہ سے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اوپر والی آیت میں بھی کسی شخص کا تسلیم اور گرفتار ہونا اپنے بُرے اعمال کے چنگل میں کے معنی میں آیا ہے۔

[2] "عدل" یہاں معادل اور وہ چیز جو کسی غلط کام کی تلافی کے طور پر دی جائے کے معنی میں ہے تاکہ مد مقابل آزاد ہو جائے۔ حقیقت میں اس کا معنی غرامت، جرمانے اور فدیہ سے شباہت رکھتا ہے۔

دونوں کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو کفر پر اصرار کرتے رہے اور ہمیشہ اسی پر کاربند رہے، جیسا کہ (بما کانوا یکفرون)
کے جملے سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ فعل مضارع کسی چیز کے استمرار کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔

۷۱۔ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ

۷۲۔ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِىْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ

## ترجمہ

۷۱۔ تم کہہ دو کہ کیا ہم خدا کے سوا کسی اور چیز کو پکاریں کہ جو نہ ہمارے لیے کوئی فائدہ دینے والی ہے اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچانے والی اور (اس طرح سے) ہم پیچھے کی طرف پلٹ جائیں جب کہ خدا نے ہمیں ہدایت کر دی ہے، اس شخص کی مانند کہ جسے شیاطین کے وسوسوں نے گمراہ کر دیا ہو اور وہ زمین میں حیران ہو، حالانکہ اس کے ایسے یار و مددگار بھی ہیں کہ جو اُسے ہدایت کی طرف بلاتے ہیں (اور یہ کہتے ہیں) کہ ہماری طرف آؤ۔ تم کہہ دو کہ صرف خدا کی ہدایت ہی (اصل) ہدایت ہے، اور ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم عالمین کے پروردگار کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔

۷۲۔ اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اس سے ڈرو اور وہی ہے وہ ذات کہ جس کی طرف تم محشور ہو گے۔

## تفسیر

یہ آیت اُس اصرار کے مقابلہ میں کہ جو مشرکین مسلمانوں کو کفر و بت پرستی کی دعوت کے لیے کرتے تھے، پیغمبر کو حکم دے رہی ہے کہ ایک دندان شکن دلیل کے ساتھ انہیں جواب دیں، اور ایک استفہام انکاری کی صورت میں اُن سے پوچھیں کہ کیا تم یہ کہتے ہو کہ ہم کسی ایسی چیز کو خدا کا شریک قرار دیں کہ جو نہ ہمارے لیے کوئی فائدہ رکھتی ہے کہ اس فائدہ کی خاطر ہم اس کی طرف جائیں اور نہ ہی کوئی ضرر رکھتی ہے کہ ہم اس کے نقصان سے ڈریں؟ (قل اندعوا من دون اللہ ما لا ینفعنا ولا یضرنا)

یہ جملہ حقیقت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عام طور سے انسان کے تمام کام ان ہی دونوں سرچشموں میں سے کسی ایک سرچشمہ سے پیدا ہوتے ہیں، یا تو وہ نفع کے حصول کی خاطر ہوتے ہیں (خواہ وہ مادی نفع ہو یا معنوی) اور یا دفع ضرر کی خاطر ہوتے ہیں (ضرر بھی خواہ معنوی ہو یا مادی)۔

کوئی عاقل کیسے کوئی ایسا کام کرے گا کہ جس میں ان دونوں میں سے کوئی سا عامل بھی موجود نہ ہو؟

اس کے بعد مشرکین کے مقابلے میں ایک اور استدلال پیش کیا گیا ہے اور یوں ارشاد ہوتا ہے: اگر ہم بت پرستی کی طرف پلٹ جائیں اور ہدایت الٰہی کے بعد شرک کی راہ میں گامزن ہو جائیں (تو اس طرح) تو ہم پیچھے کی طرف لوٹ جائیں گے اور یہ بات قانونِ ارتقا کے خلاف ہے کہ جو عالم حیات کا ایک عمومی قانون ہے (ونرد علی اعقابنا بعد اذ ھدانا اللہ)[1]

اس کے بعد ایک مثال کے ذریعہ اس مطلب کو اور زیادہ واضح اور روشن کیا گیا ہے اور قرآن یوں کہتا ہے: (توحید سے شرک کی طرف بازگشت) مثل اس کے ہے کہ کوئی شخص شیطانی وسوسوں سے (یا غولہائے بیابانی سے کہ جو جاہلیت کے عربوں کے خیال کے مطابق راستوں میں گھات لگا کر بیٹھے ہوا کرتے تھے اور مسافروں کو ان کی راہ سے بے راہ کر دیا کرتے تھے) راہِ مقصد گم کر دے اور بیابانان میں حیران و سرگرداں رہ گیا ہو (کالذی استھوتہ الشیاطین فی الارض حیران)۔

حالانکہ اُس کے ایسے دوست بھی ہیں کہ جو اُسے ہدایت اور شاہراہ (حق) کی طرف بلاتے ہیں اور اُسے آوازیں دے رہے ہیں کہ ہماری طرف آؤ۔ لیکن وہ اس طرح سے حیران و سرگرداں ہے کہ جیسے وہ اُن کی باتوں کو سن ہی نہیں رہا ہے، یا وہ قوتِ ارادی نہیں رکھتا (لہ اصحاب یدعونہ الی الھدی ائتنا)[2]

اور آیت کے آخر میں پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ تم صراحت کے ساتھ یہ کہہ دو کہ: "ہدایت صرف خدا کی ہدایت ہے اور ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم صرف عالمین کے پروردگار کے سامنے سرتسلیم خم کریں" (قل ان ھدی اللہ ھو الھدی وامرنا لنسلم لرب العلمین)۔

یہ جملہ حقیقت میں مشرکین کے مذہب کی نفی پر ایک اور دلیل ہے کیونکہ صرف ایسی ذات کے سامنے ہی سرتسلیم خم

---

لہ "اعقاب" جمع "عقب" (بروزن خشن) ایڑی کے معنی میں ہے اور ایڑی پر پھرنے کو پیچھے کی طرف پھرنا کہتے ہیں اور یہ ہدف و مقصد سے انحراف اور پھرنے کی طرف اشارہ ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے آجکل ارتجاع (یعنی رجعت پسندی) سے تعبیر کرتے ہیں۔

ٹلہ "استھوتہ" "ھوی" کے مادہ سے ہے اور یہ لفظ کسی کو ہوا و ہوس کی پیروی پر آمادہ کرنے کے معنی میں ہے، "حیران" لغت میں آمد و رفت کے معنی میں ہے اور عام طور سے سرگردانی سے کنایہ ہے۔ کیونکہ لوگ سرگردانی سے کچھ راستہ چلتے ہیں پھر پلٹ آتے ہیں اس بناء پر یہ آیت ان افراد کو جو ایمان سے شرک کی طرف پلٹ جائیں سرگرداں ہوا پرستوں سے تشبیہ دیتی ہے جو اپنا اصل پروگرام شیطانی الہام کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔

کرنا چاہیے کہ جو مالک و خالق اور مربیٔ عالم ہستی ہو، نہ کہ بتوں کے سامنے کہ جو اس جہان کی ایجاد و تخلیق میں کوئی نقش و اثر نہیں رکھتے۔

## ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت سے پہلے مشرکین کے مذہب کے پیرو تھے کہ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ :۔

نرد علی اعقابنا

کیا ہم سابقہ حالت کی طرف پلٹ جائیں۔

حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے کبھی بھی بت کے سامنے سجدہ نہیں کیا اور کسی بھی تاریخ میں اس قسم کی کوئی چیز لکھی ہوئی نہیں ہے پھر اصولی طور پر مقام عصمت بھی ایسے کسی امر کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ لفظ حقیقت میں مسلمانوں کی ایک جماعت کی زبان سے ادا ہوا ہے نہ کہ ذات پیغمبر کی زبان سے اسی لیے جمع کے صیغہ اور ضمیروں کے ساتھ ادا ہوا ہے۔

بعد والی آیت میں دعوت الٰہی کے بعد عائد ہونے والے فرائض کی یوں تشریح کی گئی ہے کہ ہم نے توحید کے علاوہ یہ حکم دیا ہے کہ "نماز قائم کرو اور تقویٰ اختیار کرو" (و ان اقیموا الصلوٰة و اتقوه)۔

اور آخر میں مسئلہ معاد و قیامت کی طرف توجہ کرواتے ہوئے اور یہ کہ تمہارا حشر و نشر اور بازگشت خدا کی طرف ہے اس بحث کو ختم کر دیا گیا ہے (وھو الذی الیہ تحشرون)۔

حقیقت میں ان چند مختصر جملوں میں وہ پروگرام کہ جس کی طرف پیغمبر دعوت دیا کرتے تھے اور جس کا سرچشمہ عقل اور فرمان خدا تھا، چار اصولوں کے پروگرام کی صورت میں کہ جس کا آغاز توحید اور انجام معاد و قیامت تھا اور اس کے درمیانی مراحل خدائی رشتوں کو محکم کرنا اور ہر گناہ سے پرہیز کرنا تھا، پیش کیا گیا ہے۔

۷۳۔ وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۖ وَيَوْمَ يَقُولُ كُنْ فَيَكُونُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ○

## ترجمہ

۷۳۔ اور وہی ہے وہ ذات کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، اور اس دن وہ کہے گا "ہو جا"

تو (جس بات کا ارادہ کیا ہے) وہ ہو جائے گا، اس کا قول حق ہے، اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا اس دن تو حکومت اسی کے ساتھ مخصوص ہوگی۔ وہ (تمام) پوشیدہ اور ظاہر و آشکار (چیزوں) سے باخبر ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔

## تفسیر

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیت کے مطالب پر ایک دلیل ہے، اور پروردگار عالم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور اس کی ہدایت کی پیروی کرنے کے لازم ہونے کی بھی ایک دلیل ہے۔ لہٰذا پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ خدا ہی ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (وھو الذی خلق السمٰوٰت والارض بالحق)۔

صرف وہی ذات کہ جو مبداء عالم ہستی ہے، رہبری کے لیے شائستہ و لائق ہے اور صرف اسی کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہیے کیونکہ اس نے تمام چیزوں کو ایک صحیح مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔

اوپر والے جملے میں "حق" سے مراد وہی نتیجہ، مقصد، ہدف، مصالح اور حکمتیں ہیں۔ یعنی اس نے ہر چیز کو کسی مصلحت اور ہدف و نتیجہ کے لیے پیدا کیا ہے حقیقت میں یہ جملہ اس مطلب سے مشابہ ہے جو سورہ ص آیہ ۲۷ میں بیان ہوا ہے کہ جہاں پر ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا

ہم نے آسمان کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے فضول اور بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے، نہ صرف مبداء عالم ہستی وہی ہے بلکہ معاد و قیامت بھی اسی کے حکم سے صورت پذیر ہوگی "اور جس دن وہ حکم دے گا کہ قیامت بپا ہو جائے تو وہ فوراً بپا ہو جائے گی"[1] (ویوم یقول کن فیکون)

بعض نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس جملے سے مراد وہی آغاز آفرینش اور مبداء جہان ہستی ہے کہ تمام چیزیں اس کے فرمان سے ایجاد ہوتی ہیں، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "یقول" فعل مضارع ہے۔ اور یہ کہ اس جملے سے پہلے اصل آفرینش کی طرف اشارہ ہوا ہے اور اسی طرح بعد کے جملوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ جملہ قیامت اور اس کے بارے میں حکم خدا کے ساتھ ہی مربوط ہے۔

---

[1] اس بارے میں کہ "یوم" جو قواعد ادبی کے مطابق ظرف ہے کس سے متعلق ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض اسے "خلق" کے جملے سے بعض "اذکروا" کے جملے سے جو محذوف ہے متعلق سمجھتے ہیں لیکن یہ بات بعید نہیں ہے کہ وہ "یکون" سے متعلق ہو، اور پھر جملے کا معنی اس طرح ہوگا "یکون القیامۃ یوم یقول اللہ لہ کن"

جیسا کہ ہم (تفسیر نمونہ کی) جلد اول (سورہ بقرہ کی آیہ ۱۱۷ کے ذیل) میں بیان کر چکے ہیں۔ "کن فیکون" سے مراد یہ نہیں ہے کہ خدا ایک لفظی فرمان "ہو جا" کی طرح صادر فرماتا ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کے خلق کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کسی دوسرے عامل کی احتیاج کے بغیر اس کا ارادہ خود بخود جامۂ عمل پہن لیتا ہے، اگر اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ چیز دفعۃً اور ایک ہی مرتبہ موجود ہو جائے تو وہ ایک ہی دفعہ موجود ہو جاتی ہے اور اگر اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ چیز تدریجاً وجود میں آئے تو اس کا تدریجی پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: خدا کی بات حق ہے۔ یعنی جس طرح آفرینش کی ابتداء ہدف و نتیجہ اور مصلحت کی بنیاد پر تھی۔ قیامت و معاد بھی اسی طرح ہو گی (قولہ الحق)۔

اور اس دن جب صور میں پھونکا جائے گا اور قیامت برپا ہو جائے گی، تو حکومت و مالکیت اسی کی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہو گی (ولہ الملک یوم ینفخ فی الصور)۔

یہ صحیح ہے کہ خدا کی مالکیت اور حکومت تمام عالم ہستی پر ابتدائے جہاں سے رہی ہے اور دنیا کے خاتمہ تک اور عالم قیامت میں بھی جاری رہے گی اور قیامت کے ساتھ کوئی اختصاص نہیں رکھتی لیکن چونکہ اس جہان میں اہداف و مقاصد کی تکمیل اور کاموں کے انجام دینے کے لیے عوامل و اسباب کا ایک سلسلہ اثر انداز ہوتا ہے لہٰذا بعض اوقات یہ عوامل و اسباب خدا سے جو مسبب الاسباب ہے غافل کر دیتے ہیں۔ مگر وہ دن کہ جس میں تمام اسباب بے کار ہو جائیں گے تو اس کی مالکیت و حکومت ہر زمانے سے زیادہ آشکار و واضح ہو جائے گی، ٹھیک ایک دوسری آیت کی طرح جو یہ کہتی ہے کہ:

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔

حکومت اور مالکیت آج (قیامت کے دن) کس کی ہے؟ صرف خدائے یگانہ و قہار کے لیے ہے۔ (سورہ المؤمن۔ آیہ ۱۶)

اس بارے میں کہ صور۔ جس میں پھونکا جائے گا۔ سے مراد کیا ہے اور اسرافیل صور میں کس طرح پھونکے گا کہ اس سے تمام جہان والے مر جائیں گے اور دوبارہ صور میں پھونکے گا تو سب زندہ ہو جائیں گے اور قیامت برپا ہو جائے گی۔ انشاء اللہ ہم سورۂ زمر کی آیہ ۶۸ کے ذیل میں شرح و بسط کے ساتھ بحث کریں گے کیونکہ یہ بحث اس آیت کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

اور آیت کے آخر میں خدا کی صفات میں سے تین صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: خدا پنہاں و آشکار سے باخبر ہے (عالم الغیب والشھادۃ)۔

اور اس کے تمام کام حکمت کی رو سے ہوتے ہیں اور وہ تمام چیزوں سے باخبر ہے (وھو الحکیم الخبیر)۔

قیامت سے مربوط آیات میں اکثر خدا کی ان صفات کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ وہ آگاہ بھی ہے اور قادر و حکیم بھی یعنی اپنے علم و آگاہی کے اقتضا کے مطابق وہ ہر شخص کو مناسب جزا دیتا ہے۔

۷۴۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

## ترجمہ

۷۴۔ (اور یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے مربی (چچا) آزر سے یہ کہا کہ کیا تم بتوں کو اپنا خدا بناتے ہو، میں تو تمہیں اور تمہاری قوم کو واضح گمراہی میں پاتا ہوں۔

## تفسیر

چونکہ یہ سورہ شرک و بت پرستی سے مقابلے کا پہلو رکھتی ہے اور اس میں روئے سخن زیادہ تر بت پرستوں کی طرف ہے لہٰذا ان کو بیدار کرنے کے لیے مختلف طریقوں سے استفادہ کیا گیا ہے، یہاں بہادر بت شکن ابراہیم کی سرگزشت کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بت شکنی کے سلسلہ میں ان کی قوی منطق کو چند آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے بیانِ توحید اور بتوں سے مبارزہ کے سلسلہ میں بہت سے مباحث میں اسی سرگذشت کو ذکر کیا ہے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ تمام اقوام کے لیے خصوصاً مشرکین عرب کے لیے قابلِ احترام تھے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ ابراہیم نے اپنے باپ (چچا) کو تنبیہ کی اور اس سے کہا کہ کیا تم نے ان بے قیمت اور بے جان بتوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے (واذ قال ابراهیم لابیه اٰزر اتتخذ اصناما اٰلهة)۔

اس میں شک نہیں کہ میں تجھے اور تیرے پیروکار اور ہم مسلک گروہ کو واضح گمراہی میں دیکھتا ہوں، اس سے زیادہ گمراہی اور کیا ہوگی کہ انسان اپنی مخلوق کو اپنا معبود قرار دے اور بے جان و بے شعور موجود کو اپنی پناہ گاہ سمجھ لے اور اپنی مشکلات کا حل اُن سے طلب کرے (انی اراك وقومك فی ضلال مبین)۔

### کیا آزر حضرت ابراہیمؑ کا باپ تھا

لفظ "اب" عربی زبان میں عام طور پر باپ کے لیے بولا جاتا ہے، اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بعض اوقات چچا، نانا، مربی و معلم اور اسی طرح وہ افراد کہ جو انسان کی تربیت میں کچھ نہ کچھ زحمت و مشقت اٹھاتے ہیں ان پر بھی بولا جاتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جب یہ لفظ بولا جائے اور کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو پھر معنی کے لیے پہلے باپ ہی ذہن میں آتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سچ مچ اوپر والی آیت یہ کہتی ہے کہ وہ بت پرست شخص (آزر) حضرت ابراہیمؑ کا

باپ تھا، توکیا ایک بت پرست اور بت ساز شخص ایک اولوالعزم پیغمبر کا باپ ہو سکتا ہے، اس صورت میں کیا انسان کی نفسیات و صفات کی وراثت اس کے بیٹے میں غیر مطلوب اثرات پیدا نہیں کر دے گی۔

اہلِ سنت مفسرین کی ایک جماعت نے پہلے سوال کا مثبت جواب دیا ہے اور آزر کو حضرت ابراہیمؑ کا حقیقی باپ سمجھا ہے، جب کہ تمام مفسرین و علماء شیعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کا باپ نہیں تھا، بعض اسے آپ کا نانا اور بہت سے حضرت ابراہیمؑ کا چچا سمجھتے ہیں۔

وہ قرائن جو شیعہ علماء کے نقطہ نظر کی تائید کرتے ہیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ کسی تاریخی منبع و مصدر اور کتاب میں حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام آزر شمار نہیں کیا گیا بلکہ سب نے "تارخ" لکھا ہے۔ کتب عہدین میں بھی یہی نام آیا ہے، قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جو لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کا باپ آزر تھا، یہاں انہوں نے ایسی توجیہات کی ہیں جو کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ ابراہیمؑ کے باپ کا نام تارخ اور اس کا لقب آزر تھا۔ حالانکہ یہ لقب بھی منابع تاریخ میں ذکر نہیں ہوا۔ یا یہ کہ آزر ایک بت تھا کہ جس کی ابراہیمؑ کا باپ پوجا کرتا تھا، حالانکہ یہ احتمال اوپر والی آیت کے ظاہر کے ساتھ جو یہ کہتی ہے کہ آزر ان کا باپ تھا کسی طرح بھی مطابقت نہیں رکھتی، مگر یہ کہ کوئی جملہ یا لفظ مقدر مانیں جو کہ خلاف ظاہر ہو۔

۲۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ مسلمان یہ حق نہیں رکھتے کہ مشرکین کے لیے استغفار کریں اگرچہ وہ ان کے عزیز و قریب ہی ہوں۔ اس کے بعد اس غرض سے کہ کوئی آزر کے بارے میں ابراہیمؑ کے استغفار کو دستاویز قرار نہ دے اس طرح کہتا ہے:۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ

(سورہ توبہ، ۱۱۴)

ابراہیمؑ کی اپنے باپ آزر کے لیے استغفار صرف اُس وعدہ کی بنا پر تھی جو انہوں نے اُس سے کیا تھا۔ چونکہ آپ نے یہ کہا تھا کہ:

سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۚ (مریم ۴۷)

یعنی میں عنقریب تیرے لیے استغفار کروں گا۔

یہ اس اُمید پر تھا کہ شاید وہ اس وعدہ کی وجہ سے خوش ہو جائے اور بت پرستی سے باز آ جائے لیکن جب اُسے بت پرستی کی راہ میں پختہ اور ہٹ دھرم پایا تو اس کے لیے استغفار کرنے سے دستبردار ہو گئے۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ابراہیمؑ نے آزر سے مایوس ہو جانے کے بعد پھر کبھی اس کے لیے طلب مغفرت نہیں کی۔ اور ایسا کرنا مناسب بھی نہیں تھا۔ تمام قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیمؑ کی جوانی کے زمانے کا ہے جب کہ آپ شہر بابل میں رہائش پذیر تھے اور بت پرستوں کے ساتھ مبارزہ اور مقابلہ کر رہے تھے۔

لیکن قرآن کی دوسری آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ ابراہیمؑ نے اپنی آخری عمر میں خانۂ کعبہ کی تعمیر کے بعد اپنے باپ کے لیے طلبِ مغفرت کی ہے (البتہ ان آیات میں جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ باپ سے "اب" کو تعبیر نہیں کیا بلکہ "والد" کے ساتھ تعبیر کیا ہے جو صراحت کے ساتھ باپ کے مفہوم کو ادا کرتا ہے)۔

جیسا کہ قرآن میں ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ......

رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ۔

حمد و ثنا اس خدا کے لیے ہے کہ جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا کیے، میرا پروردگار دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے، اے پروردگار مجھے، میرے ماں باپ اور مومنین کو قیامت کے دن بخش دے[1]

اس آیت کو سورہ توبہ کی آیت کے ساتھ ملانے سے جو مسلمانوں کو مشرکین کے لیے استغفار کرنے سے منع کرتی ہے اور ابراہیم کو بھی ایسے کام سے۔ سوائے ایک مدت محدود کے وہ بھی صرف ایک مقدس مقصد و ہدف کے لیے۔ روکتی ہے، اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ زیرِ بحث آیت میں "اب" سے مراد باپ نہیں ہے بلکہ چچا یا نانا یا کوئی اور اسی قسم کا رشتہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں "والد" باپ کے معنی میں صریح ہے جب کہ "اب" میں صراحت نہیں پائی جاتی۔

قرآن کی آیات میں لفظ "اب" ایک مقام پر چچا کے لیے بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورہ بقرہ آیہ ۱۳۳:

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا

یعقوب کے بیٹوں نے اس سے کہا ہم تیرے خدا اور تیرے آباء ابراہیم و اسماعیل و اسحاق کے خدائے یکتا کی پرستش کرتے ہیں۔

ہم یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اسماعیلؑ یعقوبؑ کے چچا تھے باپ نہیں تھے۔

۴۔ مختلف اسلامی روایات سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے:

لم یزل ینقلنی اللّٰہ من اصلاب الطاهرین الی ارحام المطهرات حتی اخرجنی فی عالمکم هذا لم یدنسنی بدنس الجاهلیة۔

خداوند تعالیٰ مجھے ہمیشہ پاک آباؤ اجداد کے صلب سے پاک ماؤں کے رحم میں منتقل کرتا رہا اور اس نے مجھے کبھی زمانہ جاہلیت کی آلودگیوں اور گندگیوں میں آلودہ نہیں کیا[2]

---

[1] سورہ ابراہیم آیہ ۳۹ - ۴۱۔

[2] اس روایت کو بہت سے شیعہ و سنی مفسرین مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں نیشاپوری نے تفسیر غرائب القرآن میں فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں نقل کیا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت کی واضح ترین آلودگی شرک و بت پرستی ہے اور جنہوں نے اسے آلودگی زنا میں منحصر سمجھا ہے ان کے پاس اپنے قول پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ قرآن کہتا ہے کہ:

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ۔

مشرکین گندگی میں آلودہ اور ناپاک ہیں[1]

طبری جو علمائے اہل سنت میں سے ہے اپنی تفسیر جامع البیان میں مشہور مفسر مجاہد سے نقل کرتا ہے کہ وہ صراحت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ آزر ابراہیم کا باپ نہیں تھا[2]

اہل سنت کا ایک دوسرا مفسر آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں اسی آیت کے ذیل میں کہتا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ کہ آزر ابراہیم کا باپ نہیں تھا شیعوں سے مخصوص ہے ان کی کم اطلاعی کی وجہ سے ہے کیونکہ بہت سے علماء (اہل سنت) بھی اسی بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ آزر ابراہیم کا چچا تھا[3]

"سیوطی" مشہور سنی عالم کتاب مسالک الحنفاء میں فخرالدین رازی کی کتاب اسرار التنزیل سے نقل کرتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے ماں باپ اور اجداد کبھی بھی مشرک نہیں تھے اور اس حدیث سے جو ہم اوپر پیغمبر اکرم سے نقل کر چکے ہیں استدلال کیا ہے۔ اس کے بعد سیوطی خود اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

ہم اس حقیقت کو دو طرح کی اسلامی روایات سے ثابت کر سکتے ہیں۔ پہلی قسم کی روایات تو وہ ہیں کہ جو یہ کہتی ہیں کہ پیغمبر کے آباؤ اجداد حضرت آدم تک ہر ایک اپنے زمانہ کا بہترین فرد تھا (ان احادیث کو "صحیح بخاری" اور "دلائل النبوۃ" سے بیہقی وغیرہ نے نقل کیا ہے)۔

اور دوسری قسم کی روایات وہ ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ ہر زمانے میں موحد و خدا پرست افراد موجود رہے ہیں، ان دونوں قسم کی روایات کو باہم ملانے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اجداد پیغمبر کہ جن میں سے ایک ابراہیم کے باپ بھی ہیں یقیناً موحد تھے[4]

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس طرف توجہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت کی مذکورہ بالا تفسیر ایک ایسی تفسیر ہے جو خود قرآن اور مختلف اسلامی روایات کے واضح قرائن کی بنیاد پر بیان ہوئی ہے نہ کہ تفسیر بالرائے ہے جیسا کہ بعض متعصب اہل سنت مثلاً مؤلف المنار نے کہا ہے۔

۷۵۔ وَكَذَٰلِكَ نُرِيَ إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ

---

[1] سورۂ توبہ آیہ ۲۸۔

[2] جامع البیان جلد ۷ صفحہ ۱۵۸۔

[3] تفسیر روح المعانی جلد ۷ صفحہ ۱۶۹۔

[4] مسالک الحنفاء صفحہ ۱۷ مطابق نقل حاشیہ بحار الانوار طبع جدید جلد ۱۵ صفحہ ۱۱۸ اور بعد۔

الْمُوْقِنِيْنَ ○

۷۶۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ○

۷۷۔ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ○

۷۸۔ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○

۷۹۔ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

## ترجمہ

۷۵۔ اس طرح ہم نے آسمانوں اور زمین کے ملکوت ابراہیم کو دکھائے تاکہ وہ اہل یقین میں سے ہو جائے۔

۷۶۔ جب رات (کی تاریکی) نے اُسے ڈھانپ لیا تو اُس نے ایک ستارے کو دیکھا تو کہا۔ کیا یہ میرا خدا ہے؟ لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو کہا کہ میں غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

۷۷۔ اور جب اُس نے چاند کو دیکھا کہ وہ (سینۂ افق کو چیر کر) نکلا ہے تو اُس نے کہا کیا یہ میرا خدا ہے؟ لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہا کہ اگر میرا پروردگار میری رہنمائی نہ کرے تو میں یقینی طور پر گمراہ جماعت میں سے ہو جاؤں گا۔

۷۸۔ اور جب اُس نے سورج کو دیکھا کہ وہ (سینۂ افق کو چیر کر نکل رہا ہے تو کہا کہ کیا یہ میرا خدا ہے؟ یہ تو (سب سے) بڑا ہے لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہا اے قوم میں اُن شریکوں سے جنہیں تم (خدا کے لیے)

قرار دیتے ہو بیزار ہوں۔

۷۹۔ میں نے تو اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ میں اپنے ایمان میں مخلص ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

# تفسیر

## آسمانوں میں توحید کی دلیلیں

اس سرزنش اور ملامت کے بعد جو ابراہیمؑ بتوں کی کرتے تھے، اور اُس دعوت کے بعد جو آپؑ نے آزر کو بت پرستی کے ترک کرنے کے لیے کی تھی ان آیات میں خدا ابراہیم کے بت پرستوں کے مختلف گروہوں کے ساتھ منطقی مقابلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن کے واضح عقلی استدلالات کے طریق سے اصل توحید کو ثابت کرنے کی کیفیت بیان کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے: جس طرح ہم نے ابراہیم کو بت پرستی کے نقصانات سے آگاہ کیا اسی طرح ہم نے اس کے لیے تمام آسمانوں اور زمین پر پروردگار کی مالکیت مطلقہ اور تسلط کی نشاندہی کی (وکذلک نری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض)[1]۔

"ملکوت" اصل میں "ملک" (بروزن حکم) کے مادہ سے ہے جو حکومت و مالکیت کے معنی میں ہے اور "و" اور "ت" کا اضافہ تاکید و مبالغہ کے لیے ہے، اس بنا پر یہاں اس سے مراد تمام عالم ہستی پر خدا کی حکومت مطلقہ ہے۔

یہ آیت اصل میں اُس تفصیل کا ایک اجمال ہے کہ جو بعد کی آیات میں سورج، چاند اور ستاروں کی کیفیت کا مشاہدہ کرنے کے بارے میں اور اُن کے غروب ہونے سے اُن کے مخلوق ہونے پر دلیل لانے کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہے۔

یعنی قرآن نے پہلے ان مجموعی واقعات کا اجمالی بیان کیا ہے اس کے بعد ان کی تشریح شروع کی ہے اور اس طرح سے ابراہیمؑ کو ملکوت آسمان و زمین دکھانے کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔

اور آیت کے آخر میں قرآن فرماتا ہے: ہمارا ہدف و مقصد یہ تھا کہ ابراہیم اہل یقین میں سے ہو جائے (ولیکون من الموقنین)۔

---

[1] اس بنا پر آیت میں ایک حذف اور تقدیر موجود ہے جو آیات قبل سے واضح ہوتی ہے اور حقیقت میں آیت کا مضمون اس طرح ہے: کما اریناابراھیم قبح ما کان علیه قومه من عبادة الاصنام کذلک نری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض۔ غور کیجئے گا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ابراہیمؑ خدا کی یگانگت کا استدلالی و فطری یقین رکھتے تھے، لیکن اسرارِ آفرینش کے مطالعہ سے یہ یقین درجہ کمال کو پہنچ گیا، جیسا کہ وہ قیامت اور معاد کا یقین رکھتے تھے، لیکن سربریدہ پرندوں کے زندہ ہونے کے مشاہدہ سے ان کا ایمان "عین الیقین" کے مرحلہ کو پہنچ گیا۔

بعد والی آیات میں اس موضوع کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے جو ستاروں اور آفتاب کے طلوع و غروب سے ابراہیمؑ کے استدلال کو ان کے خدا نہ ہونے پر واضح کرتا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جب رات کے تاریک پردے نے سارے عالم کو چھپا لیا تو اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک ستارہ ظاہر ہوا۔ ابراہیم نے پکار کر کہا کہ کیا یہ میرا خدا ہے؛ لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو انہوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ میں ہرگز ہرگز غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور انہیں عبودیت و ربوبیت کے لائق نہیں سمجھتا (فلما جن علیہ الیل رأی کوکبا قال ھٰذا ربی فلما افل قال لا احب الآفلین)۔

انہوں نے دوبارہ اپنی آنکھیں صفحہ آسمان پر گاڑ دیں۔ اس دفعہ چاند کی چاندی جیسی ٹکیہ وسیع اور دل پذیر روشنائی کے ساتھ صفحہ آسمان پر ظاہر ہوئی۔ جب چاند کو دیکھا تو ابراہیمؑ نے پکار کر کہا کیا یہ ہے میرا پروردگار؛ لیکن آخر کار چاند کا انجام بھی اُس ستارے جیسا ہی ہوا اور اُس نے بھی اپنا چہرہ پردۂ افق میں چھپا لیا تو حقیقت کے متلاشی ابراہیمؑ نے کہا کہ اگر میرا پروردگار مجھے اپنی طرف رہنمائی نہ کرے تو میں گمراہوں کی صف میں جا کھڑا ہوں گا (فلما رأی القمر بازغا قال ھٰذا ربی فلما افل قال لئن لم یھدنی ربی لاکونن من القوم الضالین)۔

اُس وقت رات آخر کو پہنچ چکی تھی اور اپنے تاریک پردوں کو سمیٹ کر آسمان کے منظر سے بھاگ رہی تھی، آفتاب نے افقِ مشرق سے سر نکالا اور اپنے زیبا اور لطیف نور کو زر لبفت کے ایک ٹکڑے کی طرح دشت و کوہ و بیابان پر پھیلا دیا، جس وقت ابراہیمؑ کی حقیقت بین نظر اُس کے خیرہ کرنے والے نور پر پڑی تو پکار کر کہا، کیا میرا خدا یہ ہے؛ جو سب سے بڑا ہے اور سب سے زیادہ روشن ہے، لیکن سورج کے غروب ہو جانے اور آفتاب کی ٹکیہ کے ہیولائے شب کے منہ میں چلے جانے سے ابراہیمؑ نے اپنی آخری بات ادا کی، اور کہا: اے گروہ (قوم) میں ان تمام بناوٹی معبودوں سے جنہیں تم نے خدا کا شریک قرار دے لیا ہے بری و بیزار ہوں (فلما رأی الشمس بازغۃ قال ھٰذا ربی ھٰذا اکبر فلما افلت قال یا قوم انی بریٓء مما تشرکون)۔

اب جب کہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس متغیر و محدود اور قوانینِ طبیعت کے چنگل میں اسیر مخلوقات کے ماوراء ایک ایسا خدا ہے کہ جو اس سارے نظام کائنات پر قادر و حاکم ہے تو میں تو اپنا رُخ ایسی ذات کی طرف کرتا ہوں کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور اس عقیدے میں میں کم سے کم شرک کو بھی راہ نہیں دیتا، میں تو موحد خالص ہوں اور مشرکین میں سے نہیں ہوں (انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین)۔

اس آیت کی تفسیر اور بعد والی آیات کی تفسیر میں اور یہ کہ ابراہیمؑ جیسے موحد و یکتا پرست نے کس طرح آسمان کے ستارے کی طرف اشارہ کیا اور یہ کہا کہ یہ میرا خدا ہے مفسرین نے بہت بحث کی ہے۔ ان تمام تفاسیر میں سے دو تفسیریں زیادہ

قابلِ ملاحظہ ہیں کہ جن میں سے ہر ایک کو بعض بزرگ مفسرین نے اختیار کیا ہے اور ان پر منابع حدیث میں بھی شواہد موجود ہیں۔

پہلی یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ذاتی طور پر یہ چاہتے تھے کہ خدا شناسی کے بارے میں غور و فکر کریں اور اُس معبود کو جسے وہ اپنی پاک فطرت کی بناء پر اپنی روح و جان کی گہرائیوں میں پاتے تھے تلاش کریں۔ وہ خدا کو نورِ فطرت اور عقلی اجمالی دلیل سے تو پہچان چکے تھے، اور ان کی تمام تعبیرات بتلاتی ہیں کہ انہیں اُس کے وجود میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں تھا لیکن وہ اس کے حقیقی مصداق کی تلاش میں تھے، بلکہ اُس کے حقیقی مصداق کو بھی جانتے تھے مگر چاہتے یہ تھے کہ زیادہ واضح عقلی استدلال کے ذریعہ "حق الیقین" کے مرحلہ تک پہنچ جائیں۔ اور یہ واقعہ دوران نبوت سے پہلے کا ہے اور احتمال یہ ہے کہ ابتداء بلوغ یا قبل از بلوغ کا ہے۔

کچھ روایات اور تواریخ میں ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ ابراہیمؑ کی نظر آسمان کے ستاروں پر پڑی تھی اور وہ رات کے نیلگوں صفحہ آسمان کو اس کے روشن اور چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ آپ کی والدہ اُن کے بچپنے سے ہی نمرود جبار کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے خوف سے ایک غار کے اندر ان کی پرورش کر رہی تھیں۔

لیکن یہ بات بہت ہی بعید نظر آتی ہے کہ کوئی انسان کئی سالوں تک غار کے اندر ہی زندگی گزارتا رہے یہاں تک کہ ایک تاریک رات میں بھی اس سے باہر قدم نہ رکھا ہو۔ شاید بعض کی نظر میں اس احتمال کی تقویت (رای کوکبا) کے جملے کے سبب سے ہو کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے اس وقت تک ستارہ نہیں دیکھا تھا۔

لیکن یہ تعبیر کسی لحاظ سے بھی یہ مفہوم اپنے اندر نہیں رکھتی، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ انہوں نے اس وقت تک ستارے، چاند اور سورج کو دیکھا تو بہت دفعہ تھا لیکن ایک محقق توحید کے طور پر یہ پہلی دفعہ تھی کہ اُن پر نظر ڈالی اور ان کے طلوع و غروب کو مقام خدائی کی نفی کے ساتھ مربوط ہونے پر غور کرنے لگے۔ درحقیقت ابراہیمؑ نے انہیں بارہا دیکھا تھا لیکن اس نظر سے نہیں۔

اس بنا پر جب ابراہیمؑ یہ کہتے ہیں کہ: ھٰذا ربی (یہ میرا خدا ہے) تو یہ ایک قطعی خبر کے عنوان سے نہیں ہے، بلکہ یہ ایک فرض اور احتمال کے طور پر ہے اور غور و فکر کے لیے ہے۔ اس کی صحیح مثال یہ ہے کہ جس طرح ہم جب کسی حادثہ کی علت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو تمام احتمالات اور فروض کو ایک ایک کر کے مطالعہ کے لیے فرض کرتے چلے جاتے ہیں اور ہر ایک کے لوازم کی تحقیق کرتے ہیں تاکہ حقیقی علت کو پا سکیں اور اس قسم کی بات نہ تو کفر ہے اور نہ ہی نفیِ ایمان پر دلالت کرتی ہے بلکہ یہ زیادہ سے زیادہ تحقیق اور بہتر سے بہتر شناسائی کا ایک طریقہ ہے اور ایمان کے بلند مراتب تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے۔ جیسا کہ "معاد" کے سلسلہ میں بھی حضرت ابراہیمؑ مرحلہ شہود اور اُس سے پیدا ہونے والے اطمینان تک پہنچنے کے لیے بیشتر تحقیق کے درپے ہوئے تھے۔ تفسیر عیاشی میں محمد بن مسلم کے واسطے سے امام باقرؑ یا امام صادقؑ سے اس طرح منقول ہے:

انما کان ابراهیم طالباً لربه ولم یبلغ کفراً وانه من فکر من الناس فی مثل ذلك فانه بمنزلته۔

ابراہیمؑ نے یہ گفتگو تحقیق کے طور پر کی تھی اور ہرگز ان کی بات کفر نہیں تھی اور لوگوں میں سے جو شخص بھی تفکر و

تحقیق کے لیے بیت ہے تو وہ ابراہیمؑ کی طرح ہوگا۔[1]

اس سلسلے میں دو روایات اور بھی تفسیر نور الثقلین سے نقل ہوئی ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات ستارہ پرستوں اور سورج پرست لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے کی اور احتمال یہ ہے کہ بابل میں بت پرستوں کے ساتھ سخت قسم کے مقابلے اور مبارزات کرنے اور اس زمین سے شام کی طرف نکلنے کے بعد جب ان اقوام سے ان کا آمنا سامنا ہوا تو اس وقت یہ گفتگو کی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ بابل میں نادان قوموں کی ہٹ دھرمی کو ان کی غلط راہ و رسم میں آزما چکے تھے لہٰذا اس بنا پر کہ آفتاب و ماہتاب کے پجاریوں اور ستارہ پرستوں کو اپنی طرف متوجہ کریں، پہلے ان کے ہم صدا ہوگئے اور ستارہ پرستوں سے کہنے لگے کہ تم یہ کہتے ہو کہ یہ زہرہ ستارا میرا پروردگار ہے، بہت اچھا چلو اسے دیکھتے ہیں یہاں تک کہ اس عقیدے کا انجام تمہارے سامنے پیش کروں۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس ستارے کا چمکدار چہرہ افق کے تاریک پردے کے پیچھے چھپ گیا، یہ وہ مقام تھا کہ ابراہیمؑ کے ہاتھ میں ایک محکم ہتھیار آگیا اور وہ کہنے لگے میں تو کبھی ایسے معبود کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر "ھذا ربی" کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے عقیدے کے مطابق یہ میرا خدا ہے، یا یہ کہ آپ نے بطور استفہام فرمایا: کیا یہ میرا خدا ہے؟ اس سلسلے میں بھی ایک حدیث تفسیر نور الثقلین اور دیگر تفاسیر میں عیون اخبار الرضاؑ سے نقل ہوئی ہے۔

## حضرت ابراہیمؑ کا توحید پر استدلال

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کے غروب ہونے سے ان کی ربوبیت کی نفی پر کس طرح سے استدلال کیا؟

ممکن ہے کہ یہ استدلال تین طریقوں سے ہو۔

۱۔ موجودات کا پروردگار اور مربی (جیسا کہ لفظ "رب" سے معلوم ہوتا ہے) ایسا ہونا چاہیے کہ جس کا مخلوقات کے ساتھ ہمیشہ قریبی ربط ہو کہ ایک لحظہ کے لیے بھی اُن سے جدا نہ ہو، اس بنا پر وہ موجود جو غروب ہو جائے اور کئی ساعت تک اپنے نور و برکت کو ختم کیے رکھے اور بہت سے موجودات سے بالکل بیگانہ ہو جائے، ان کا پروردگار اور رب کس طرح ہو سکتا ہے؟

۲۔ وہ موجود جو غروب و طلوع کرنے والا ہے وہ قوانین کے چنگل کا اسیر ہے، وہ چیز جو خود ان قوانین کی محکوم ہے وہ ان پر حاکم اور ان کی مالک کس طرح ہو سکتی ہے۔ وہ خود ایک کمزور مخلوق ہے اور ان کے تابع فرمان ہے اور ان سے انحراف اور تخلف کی کم سے کم توانائی بھی نہیں رکھتی۔

۳۔ جو موجود حرکت رکھتا ہے وہ یقیناً ایک حادث موجود ہے کیونکہ جیسا کہ فلسفہ میں تفصیل کے ساتھ ثابت

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۳۸۔

ہو چکا ہے کہ حرکت ہر مقام پر حدوث کی دلیل ہے کیونکہ حرکت خود ایک قسم کا وجود حادث ہے اور وہ چیز جو معرض حوادث میں ہے یعنی حرکت رکھتی ہے وہ ایک ازلی وابدی وجود نہیں ہو سکتی۔ (غور کیجئے)۔

## چند اہم نکات

۱۔ زیر بحث آیت میں لفظ "کذالک" (اسی طرح سے) اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح سے ہم نے ابراہیمؑ کی عقل و خرد کے لیے بت پرستی کے مضرات و نقائص واضح کیے تھے اسی طرح سے آسمان و زمین پر خدا کی حکومت و مالکیت کی بھی ہم نے اُسے نشاندہی کرائی، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تجھے اپنی قدرت وحکومت کے آثار آسمانوں پر دکھائے اسی طرح ابراہیمؑ کو ہم نے دکھائے تھے تاکہ ان کے ذ وہ خدا سے زیادہ آشنا ہو جائے۔

۲۔ "جن" (مادہ "جن" بروزن "فن" سے) کسی چیز کو چھپانے کے معنی میں ہے اور زیر بحث آیت میں جملہ کا معنٰی یہ ہے کہ "جب رات نے ابراہیمؑ سے موجودات کا چہرہ چھپا دیا" اور یہ جو دیوانہ کو مجنون کہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ گویا ایک پردہ اس کی عقل پر پڑ گیا ہے اور نظر نہ آنے والے موجود کو جو جن کہتے ہیں تو وہ بھی اسی لحاظ سے ہے۔ جنین بھی بچے کے شکم مادر میں پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ہے اور جنت کا اطلاق بہشت اور باغ پر بھی اسی بنا پر ہے کہ اس کی زمین درختوں کے نیچے چھپی ہوئی ہوتی ہے اور دل کو جنان (بروزن زمان) اسی لیے کہتے ہیں چونکہ وہ سینہ کے اندر پوشیدہ ہے، یا یہ کہ وہ انسان کے اسرار اور رازوں کو چھپائے رکھتا ہے۔

۳۔ یہ کہ "کوکباً" (ایک ستارہ) سے کونسا ستارہ مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن زیادہ تر مفسرین نے زہرہ یا مشتری کا ذکر کیا ہے اور کچھ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانوں میں ان دونوں ستاروں کی پرستش کی جایا کرتی تھی اور اٰلہۃ (خداؤں) کا حصہ شمار ہوتے تھے لیکن اس حدیث میں جو امام علیؑ بن موسیٰ رضا سے عیون الاخبار میں نقل ہوئی ہے یہ تصریح ہوئی ہے کہ یہ زہرہ ستارہ تھا۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی امام صادقؑ سے یہی بات مروی ہے[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کلدہ اور بابل کے لوگوں نے وہاں بت پرستوں کے ساتھ مقابلے اور مبارزے شروع کر رکھے تھے اور وہ ہر ایک ستارے کو خالق یا کسی خاص موجودات کا رب النوع سمجھتے تھے، "مریخ" کو رب النوع جنگ اور مشتری کو رب النوع عدل وعلم اور عطارد کو رب النوع وزراء اور آفتاب کو سب کا بادشاہ سمجھتے تھے[2]

۴۔ "بازغ" "بزغ" کے مادہ سے (بروزن نذر) ہے۔ یہ اصل میں شگاف کرنے اور خون جاری کرنے کے معنی میں

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۷۳۵، وصفحہ ۷۳۷۔

[2] تفسیر ابوالفتوح جلد چہارم صفحہ ۴۷۷ (حاشیہ)۔

استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے حیوانات کی جراحی کو بزغ کہتے ہیں۔ اس لفظ کا آفتاب یا ماہتاب کے طلوع پر اطلاق حقیقت میں ایک قسم کی خوبصورت تشبیہ ہے کیونکہ آفتاب و ماہتاب اپنے طلوع کے وقت گویا تاریکی کے پردے کو پھاڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں افق کے کنارے پر ایک ہلکی سی سرخی جو خون کے رنگ سے ملتی جلتی ہوتی ہے اپنے اطراف میں ایجاد کر لیتے ہیں۔

۵۔ "فطر"۔ "فطور" کے مادہ سے شگاف کرنے اور پھاڑنے کے معنی میں ہے اور جیسا کہ اسی سورہ کی آیہ ۱۴ کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اس لفظ کا آسمان وزمین کی پیدائش پر اطلاق شاید اس سبب سے ہو کہ موجودہ زمانے کے علم کے مطابق ابتداء میں سارا عالم ایک ہی کرہ تھا اور بعد میں مختلف ٹکڑے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے گئے اور آسمانی ات یکے بعد دیگرے وجود میں آتے گئے (مزید توضیح کے لیے مذکورہ آیت کی تفسیر کی طرف رجوع کیا جائے)۔

۶۔ "حنیف" کا معنی خالص ہے جیسا کہ اس کی تفصیل سورہ آلِ عمران آیہ ۶۷ کے ذیل میں جلد دوم تفسیر نمونہ ص ۱۶۱ (اردو ترجمہ) میں بیان ہو چکی ہے۔

۸۰۔ وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ اَتُحَاجُّوْنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ۚ وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ۚ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ۚ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝

۸۱۔ وَكَیْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ۚ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

۸۲۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

۸۳۔ وَتِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیْنٰهَاۤ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۚ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۚ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ۝

## ترجمہ

۸۰۔ اُس (ابراہیم) کی قوم نے اُس سے حجت بازی شروع کی تو اُنہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں

حجت بازی کیوں کرتے ہو۔ حالانکہ خدا نے مجھے (واضح دلائل کے ساتھ) ہدایت کی ہے اور جسے تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو میں اُس سے نہیں ڈرتا۔ (اور مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا) مگر یہ کہ میرا پروردگار کچھ چاہے۔ میرے پروردگار کی آگاہی اور علم اس قدر وسیع ہے کہ وہ تمام چیزوں پر حاوی ہے، کیا تم متذکر (اور بیدار) نہیں ہوتے۔

۸۱۔ میں تمہارے بتوں سے کس طرح ڈروں جب کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے خدا کا ایسا شریک قرار دے لیا ہے کہ جس کے بارے میں اس نے تم پر کوئی دلیل نازل نہیں کی (سچ بتاؤ) ان دونوں گروہوں (بت پرستوں اور خدا پرستوں) میں سے کونسا گروہ (سزا سے) امن میں رہنے کے زیادہ لائق ہے۔ اگر تم جانتے ہو۔

۸۲۔ ہاں ہاں وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کیا، ان کا انجام امن ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

۸۳۔ یہ ہمارے دلائل تھے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دیئے تھے۔ ہم جس شخص کے درجات کو چاہتے ہیں (اور اُسے لائق دیکھتے ہیں) اُوپر لے جاتے ہیں۔ تیرا پروردگار حکیم اور دانا ہے۔

## تفسیر

اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں حضرت ابراہیمؑ کے توحیدی استدلالات کے سلسلہ میں گذر چکی ہے، ان آیات میں اُسی بحث و گفتگو کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی بت پرست قوم و جمعیت سے ہوئی تھی پہلے فرمایا گیا ہے، قوم ابراہیم ان کے ساتھ گفتگو اور کج بحثی کرنے لگی (وحاجه قومه)۔

ابراہیمؑ نے ان کے جواب میں کہا (تم مجھ سے خدائے یگانہ کے سلسلے میں بحث اور مخالفت کیوں کرتے ہو حالانکہ خدا نے مجھے منطقی اور واضح دلائل کے ساتھ راہ توحید کی ہدایت کی ہے (قال اتحاجونی فی الله وقد هدان)۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے بت پرستوں کی جمعیت اس کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ جس قیمت پر بھی ممکن ہو سکے ابراہیمؑ کو اُن کے عقیدے سے ہٹا لیں اور بت پرستی کے آئین کی طرف کھینچ لیں۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ انتہائی شجاعت و شہامت کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لیے ڈٹ گئے اور منطقی دلائل کے ساتھ سب کی باتوں کے جواب دیئے۔

یہ بات کہ وہ (بت پرست) کس منطق سے حضرت ابراہیمؑ کا مقابلہ کرتے تھے ان آیات میں صراحت کے ساتھ کوئی چیز بیان نہیں ہوئی لیکن حضرت ابراہیمؑ کے جواب سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آپ کو اپنے خداؤں اور بتوں کے غیض وغضب اور سزا کی دھمکی دی اور ان کی مخالفت سے ڈرایا تھا، کیونکہ آیت کے آخر میں ہم حضرت ابراہیمؑ کی زبانی اس طرح پڑھتے ہیں: میں ہرگز تمہارے بتوں سے نہیں ڈرتا کیونکہ ان میں یہ قدرت ہی نہیں ہے کہ کسی کو نقصان و ضرر پہنچا سکیں (ولا اخاف ما تشرکون بہ) ۔کوئی شخص اور کوئی چیز مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی مگر یہ کہ خدا چاہے (الا ان یشاء ربی شیئًا)[۱]

گویا ابراہیمؑ اس جملے کے ذریعے یہ چاہتے ہیں کہ ایک احتمالی پیش بندی کرلیں اور کہیں کہ اگر اس کشمکش کے دوران بالفرض مجھے کوئی حادثہ پیش آجائے، تو اس کا بتوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی ربط نہیں ہوگا بلکہ اس کا تعلق مشیت الٰہی کے ساتھ ہوگا کیونکہ بے شعور و بے جان بت تو اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں وہ کسی دوسرے کے نفع و نقصان کے کیا مالک ہوں گے؟

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: میرے پروردگار کا علم و دانش اس طرح ہمہ گیر و وسیع ہے کہ ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے (وسع ربی کل شیء علما)۔

یہ جملہ حقیقت میں سابقہ جملے کی ایک دلیل ہے اور وہ یہ ہے کہ بت ہرگز کوئی نفع یا نقصان پہنچا ہی نہیں سکتے، کیونکہ وہ کسی قسم کا علم و آگاہی ہی نہیں رکھتے، اور نفع اور نقصان پہنچانے کی پہلی شرط علم و شعور اور آگاہی ہے صرف وہ خدا کہ جس کے علم و دانش نے تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہوا ہے وہی سود و زیاں بھی پہنچا سکتا ہے، تو پھر میں اس کے غیر کے غیض و غضب سے کیوں ڈروں۔

آخر میں اُن کے فکر و فہم کو بیدار کرنے کے لیے، انہیں مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے: کیا ان تمام باتوں کے باوجود بھی تم متذکر اور بیدار نہیں ہوتے (افلا تتذکرون)۔

بعد والی آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی ایک اور منطق و استدلال کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ بت پرست گروہ سے کہتے ہیں: "یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں بتوں سے ڈروں اور تمہاری دھمکیوں کے مقابلہ میں اپنے اندر وحشت اور خوف پیدا کروں حالانکہ مجھے تو ان بتوں میں عقل و شعور اور قدرت کی کسی قسم کی کوئی نشانی دکھائی نہیں دیتی، لیکن تم باوجود اس کے کہ خدا کے وجود پر ایمان رکھتے ہو اور اس کی قدرت اور علم کو بھی جانتے ہو اور اس نے کسی قسم کا کوئی حکم بتوں کی پرستش کے بارے میں تمہاری طرف نازل نہیں کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود تم تو اس سے نہیں ڈرتے، تو میں

---

[۱] حقیقت میں اُوپر والا استثناء، استثناء منقطع سے شباہت رکھتا ہے، کیونکہ بتوں سے نفع و نقصان کی قدرت کی کلی طور پر نفی ہوئی ہے اور خدا کے لیے ثابت ہے۔ اگرچہ اس جملے کے معنی میں اور مفسرین نے اور احتمال بھی ذکر کیے ہیں، لیکن جو کچھ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

بتوں کے غضب سے کس طرح ڈروں (وکیف اخاف ما اشرکتم و لا تخافون انکم اشرکتم باللّٰہ ما لم ینزل به علیکم سلطانا)[1] کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بت پرست ایسے خدا کے منکر نہ تھے جو آسمان اور زمین کا خالق ہے۔ وہ تو صرف بتوں کو عبادت میں شریک کرتے تھے اور انہیں درگاہ خداوندی میں شفیع خیال کرتے تھے۔

اب تم ہی انصاف کرو کہ میں امن وامان کا زیادہ حقدار ہوں یا تم (فای الفریقین احق بالا من ان کنتم تعلمون)۔

حقیقت میں اس مقام پر ابراہیمؑ کی منطق ایک عقلی منطق ہے جو اس واقعیت کی بنیاد پر قائم ہے کہ تم مجھے بتوں کے غضب ناک ہونے کی دھمکی دے رہے ہو۔ حالانکہ ان کے وجود کی تاثیر موہوم ہے، لیکن تم اس عظیم خدا سے بالکل نہیں ڈرتے جسے تم اور میں دونوں قبول کرتے ہیں اور ہمیں اس کے حکم کا پیرو ہونا چاہیے اور اس کی طرف سے بتوں کی پرستش کا کوئی حکم نہیں پہنچا۔ تم نے ایک قطعی ویقینی امر کو تو چھوڑ رکھا ہے اور ایک موہوم چیز کے ساتھ چمٹے ہوئے ہو۔

بعد والی آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی زبانی اُس سوال کا جواب نقل ہوا ہے جو خود انہوں نے قبل کی آیت میں پیش کیا تھا (اور علمی استدلالات میں یہ ایک عمدہ طریقہ ہے کہ بعض اوقات استدلال کنندہ شخص مدمقابل کی طرف سے سوال کرکے پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مطلب اتنا واضح ہے کہ جس کا جواب ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیے)۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم وستم کے ساتھ مخلوط نہیں کیا، امن وامان بھی انہی کے لیے ہے اور ہدایت بھی انہی کے ساتھ مخصوص ہے (الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولٰئك لھم الامن وھم مھتدون)۔

اُس روایت میں بھی جو امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، اس بات کی تاکید ہوتی ہے کہ یہ گفتگو حضرت ابراہیمؑ کی بت پرستوں کے ساتھ گفتگو کا ضمیمہ ہے[2]

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ جملہ خدا کا بیان ہوگا نہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی گفتگو۔ لیکن پہلا احتمال علاوہ اس کے کہ یہ روایت میں وارد ہوا ہے، آیات کی وضع وترتیب کے ساتھ بھی زیادہ بہتر مطابقت رکھتا ہے لیکن یہ احتمال کہ یہ جملہ بت پرستوں کی گفتگو ہو جو حضرت ابراہیمؑ کی باتیں سننے کے بعد بیدار ہوئے ہوں بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

## یہاں ظلم سے کیا مراد ہے؟

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہاں "ظلم" شرک کے معنی میں ہے۔ سورۂ لقمان (کی آیہ ۱۳) میں جو یہ وارد

---

[1] سلطان کا معنی برتری وکامیابی ہے اور چونکہ دلیل وبرہان کامیابی کا سبب ہوتا ہے لہٰذا بعض اوقات اُسے بھی سلطان کہتے ہیں اور اوپر والی آیت اسی معنی میں ہے۔ یعنی بتوں کی پرستش کی اجازت کے لیے کسی قسم کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور حقیقت میں یہ ایسا مطلب ہے جس کا کوئی بھی بت پرست انکار نہیں کرسکتا کیونکہ اس قسم کا حکم عقل یا وحی ونبوت کے ذریعے سے ہی معلوم ہوسکتا ہے اور ان دونوں باتوں میں سے کوئی سی دلیل موجود نہیں ہے

[2] تفسیر مجمع البیان ذیل آیہ زیر بحث۔

ہوا ہے کہ "ان الشرك لظلم عظیم" (شرک ظلم عظیم ہے) کو اس معنی کا شاہد قرار دیا ہے۔

ایک روایت میں بھی ابن مسعود سے یہ نقل ہوا ہے کہ جس وقت یہ (زیر بحث) آیہ نازل ہوئی، تو یہ بات لوگوں کو بہت گراں معلوم ہوئی۔ عرض کیا اے اللہ کے رسول ایسا کون ہے کہ جس نے اپنے اُوپر تھوڑا بہت ظلم نہ کیا ہو (لہٰذا یہ آیت تو سبھی کو شامل کر لیتی ہے) رسول اللہؐ نے فرمایا:

جو تم نے خیال کیا ہے اس سے وہ مراد نہیں ہے۔ کیا تم نے خدا کے صالح بندے (لقمان کا) قول نہیں سنا (جو اپنے بیٹے سے) کہتا ہے "میرے بیٹے خدا کا شریک قرار نہ دے کہ شرک ظلم عظیم ہے"[1]

لیکن چونکہ قرآن کی آیات بہت سے مواقع پر دو یا دو سے زیادہ معانی کی حامل ہوتی ہیں لہٰذا ممکن ہے کہ ان میں سے ایک معنی دوسرے معنی سے زیادہ وسیع اور عمومی ہو تو آیہ میں یہ احتمال بھی ہے کہ "امنیت" سے مراد عام امنیت ہے خواہ خدا کے عذاب سے امن وامان ہو یا اجتماعی دردناک حوادث سے امن وامان ہو۔

یعنی جنگیں ایک دوسرے پر زیادتیاں، مفاسد اور جرائم سے امان، یہاں تک کہ روحانی سکون واطمینان صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب کہ انسانی معاشرے میں دو اصولوں کی حکمرانی ہو، اوّل ایمان اور دوسرے عدالت اجتماعی، اگر خدا پر ایمان کی بنیادیں ہل جائیں اور پروردگار کے سامنے جوابدہی کا احساس ختم ہو جائے اور عدالت اجتماعی کی جگہ ظلم وستم کا دور دورہ ہو، تو ایسے معاشرے میں امن وامان ختم ہو جائے گا اور یہی سبب ہے کہ دنیا کے بہت سے مفکرین کی طرف سے دنیا میں بدامنی کی مختلف صورتوں کو ختم کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود دنیا کے لوگوں کا دائمی امن وامان سے دن بدن فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے، اس کیفیت کا سبب وہی ہے کہ جس کی طرف زیر نظر آیت میں اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ ایمان کی بنیادیں ہل رہی ہیں اور عدالت کی جگہ ظلم کا دور دورہ ہے۔

خاص طور پر روحانی امن وسکون میں ایمان کی تاثیر سے تو کسی کے لیے بھی تردید کی گنجائش نہیں ہے۔ جیسا کہ ارتکاب ظلم سے وجدان کی پریشانی اور روحانی امن وسکون کا چھن جانا کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

بعض روایات میں بھی حضرت صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ زیر بحث آیت سے مراد یہ ہے کہ:

وہ لوگ کہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم کے مطابق اُمت اسلامی کی ولایت ورہبری کے سلسلے میں آپ کے بعد ایمان لے آئیں اور اُسے دوسرے لوگوں کی ولایت ورہبری کے ساتھ مخلوط نہ کریں تو وہ امن وامان میں ہیں[2]

یہ تفسیر حقیقت میں آیہ شریفہ میں موجود مطلب کی روح اور نچوڑ پر نظر رکھتے ہوئے بیان ہوئی ہے کیونکہ اس آیت میں خدا کی ولایت ورہبری کے متعلق گفتگو ہے اور اُسے اس کے غیر کی رہبری کے ساتھ خلط ملط نہ کرنے کے سلسلے

---

[1] تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۷۴۰۔

میں ہے اور چونکہ حضرت علی علیہ السلام کی رہبری آیہ "انما ولیکم اللہ و رسولہ" کے اقتضا کے مطابق خدا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہبری کا پرتو ہے اور خدا کی طرف سے معین نہ ہونے والی رہبریاں ایسی نہیں ہیں لہٰذا اوپر والی آیت ایک وسیع نظر سے ان سب پر محیط ہوگی، اس بناء پر اس حدیث سے مراد یہ نہیں ہے کہ آیت کا مفہوم اسی حق میں منحصر ہے، بلکہ یہ تفسیر آیت کے اصلی مفہوم کا پرتو ہے۔

اسی لیے ہم حضرت امام صادق علیہ السلام کی ایک دوسری حدیث میں پڑھتے ہیں کہ یہ آیت خوارج جو ولیِ خدا کی ولایت سے نکل گئے تھے اور شیطان کی ولایت و رہبری میں چلے گئے تھے، کے بارے میں بھی ہے۔[1]

بعد والی آیت اُن تمام بحثوں کی طرف۔ ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے کہ جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے توحید کے بیان اور شرک کے خلاف مبارزہ و مقابلہ کے سلسلہ میں نقل ہوئی ہیں ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: یہ ہمارے وہ دلائل تھے جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم و جمعیت کے مقابلہ میں دیئے تھے (وتلك حجتنا اٰتيناها ابراهيم على قومه)۔

یہ صحیح ہے کہ اس استدلال میں منطقی پہلو بھی تھا اور ابراہیمؑ عقلی قوت اور فطری الہام کی بناء پر اُن تک پہنچے تھے لیکن چونکہ یہ قوتِ عقل اور وہ الہامِ فطرت سب خدا کی ہی طرف سے تھے، لہٰذا خدا ان تمام استدلالات کو اپنی نعمات میں سے شمار کر رہا ہے کہ جو ابراہیمؑ کے دل جیسے آمادہ دلوں میں منعکس ہوتے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "تلك" عربی زبان میں بعید کے لیے اسم اشارہ ہے۔ لیکن بعض اوقات موضوع کی اہمیت، اور اس کا بلند پایہ ہونا اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ ایک نزدیک کا موضوع بھی اسم اشارہ بعید سے ذکر ہو، جس کی مثال سورہ بقرہ کی ابتداء میں ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔

یہ عظیم کتاب وہ ہے کہ جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

پھر اس بحث کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے: ہم جس کے درجات کو چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں (نرفع درجات من نشاء)۔[2]

لیکن اس غرض سے کہ کوئی اشتباہ واقع نہ ہو۔ کہ لوگ یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ خدا اس درجے کے بلند کرنے میں کسی تبعیض سے کام لیتا ہے، قرآن فرماتا ہے: تیرا پروردگار حکیم اور عالم ہے اور وہ جو درجات عطا فرماتا ہے وہ ان کی لیاقت و قابلیت سے آگاہی اور میزانِ حکمت کے مطابق عطا فرماتا ہے اور جب تک کوئی شخص لائق اور قابل نہ ہو اُس سے بہرہ مند نہیں ہوگا (ان ربك حكيم عليم)۔

---

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۵۳۸۔

[2] "درجہ" کے بارے میں اور اس کے اور "درک" کے درمیان فرق کے بارے میں ہم سورۂ نساء آیہ ۱۴۵ جلد دوم ص۱۲۵ میں بحث کر چکے ہیں۔

۸۴۔ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۙ

۸۵۔ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ

۸۶۔ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ

۸۷۔ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

## ترجمہ

۸۴۔ اور ہم نے اُسے (ابراہیمؑ کو) اسحاق ویعقوب عطا کیے اور ہم نے ہر ایک کو ہدایت کی، اور نوحؑ کو بھی (ہم نے ان سے) پہلے ہدایت کی تھی، اور اس کی ذریت واولاد میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو (ہم نے ہدایت کی) اور ہم نیکوکاروں کو اسی طرح سے جزا دیتے ہیں۔

۸۵۔ اور (اسی طرح) زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس سب کے سب صالحین میں سے تھے۔

۸۶۔ اور اسماعیل، الیسع، یونس اور ہر ایک کو ہم نے عالمین پر فضیلت دی۔

۸۷۔ اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے کچھ افراد کو ہم نے برگزیدہ کیا اور انہیں راہ راست کی ہدایت کی۔

## تفسیر

ان آیات میں اُن نعمات میں سے ایک کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو خداوند تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو عطا کی تھیں، اور وہ نعمت ہے صالح اولاد اور برومند اور لائق نسل جو نعمات الٰہی میں سے ایک عظیم ترین نعمت ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے، ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاق اور یعقوب (فرزند اسحاق) عطا کیے (ووھبنا لہ اسحٰق ویعقوب)

اور اگر یہاں ابراہیمؑ کے دوسرے فرزند اسماعیل کی طرف اشارہ نہیں ہوا بلکہ بحث کے دوران کہیں ذکر آیا ہے، شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اسحاق کا سارہ جیسی بانجھ ماں سے پیدا ہونا، وہ بھی بڑھاپے کی عمر میں، بہت عجیب و غریب امر اور ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔

پھر اس چیز کو بیان کرنے کے لیے کہ ان دونوں کا افتخار صرف پیغمبر زادہ ہونے کے پہلو سے نہیں تھا، بلکہ وہ ذاتی طور پر بھی فکر صحیح اور عمل صالح کے سائے میں نور ہدایت کو اپنے دل میں جاگزیں کیے ہوئے تھے، قرآن کہتا ہے، ان میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت کی (کلاً ھدینا)۔

اس کے بعد یہ بتانے کے لیے کہ کہیں یہ تصور نہ ہو کہ ابراہیمؑ سے قبل کے دور میں کوئی علم بردار توحید نہیں تھا اور یہ کام بس انہی کے زمانے سے شروع ہوا ہے مزید کہتا ہے "اس سے پہلے ہم نے نوحؑ کی بھی ہدایت و رہبری کی تھی (ونوحا ھدینا من قبل)۔

اور ہم جانتے ہیں کہ نوحؑ پہلے اولوالعزم پیغمبر ہیں جو آئین و شریعت کے حامل تھے اور وہ پیغمبران اولوالعزم کے سلسلے کی پہلی کڑی تھے۔

حقیقت میں حضرت نوحؑ کی حیثیت اور ان کے مقام کی طرف اشارہ کر کے کہ جو حضرت ابراہیمؑ کے اجداد میں سے ہیں، اور اسی طرح پیغمبروں کے اس گروہ کے مقام کا تذکرہ کر کے کہ جو ابراہیمؑ کی اولاد اور ذریت میں سے تھے، حضرت ابراہیمؑ کی ممتاز حیثیت کو وراثت، اصل اور ثمرہ کے حوالے سے مشخص کیا گیا ہے۔

اور اس کے بعد بہت سے انبیاء کے نام گنوائے ہیں جو ذریت ابراہیمؑ میں سے تھے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: ابراہیمؑ کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون تھے (ومن ذریته داؤد وسلیمان وایوب ویوسف وموسیٰ وھارون) اور اس جملے کے ساتھ کہ "اس قسم کے نیکوکار لوگوں کو ہم جزا دیں گے" واضح کرتا ہے کہ ان کا مقام و حیثیت ان کے اعمال و کردار کی بنا پر تھا (وکذلک نجزی المحسنین)۔

اس سلسلے میں کہ "من ذریته" (اس کی اولاد میں سے) کی ضمیر کس کی طرف لوٹتی ہے، ابراہیمؑ کی طرف یا نوحؑ کی طرف، مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن زیادہ تر مفسرین ابراہیمؑ کی طرف لوٹاتے ہیں اور ظاہراً اس بات کی تردید نہیں کرنا چاہیے کہ مرجع ضمیر ابراہیمؑ ہیں کیونکہ آیت کی بحث ان خدائی نعمات کے بارے میں ہے جو ابراہیمؑ کی نسبت سے ہوئی تھیں نہ کہ حضرت نوحؑ کے بارے میں۔ علاوہ ازیں ان متعدد روایات سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے، جنہیں ہم بعد میں نقل کریں گے۔

صرف ایک مطلب اس بات کا سبب بنا ہے کہ بعض مفسرین نے ضمیر کو نوحؑ کی طرف لوٹایا ہے اور وہ ہے بعد کی آیات میں حضرت یونسؑ اور حضرت لوطؑ کا نام، کیونکہ تاریخ میں مشہور یہ ہے کہ یونسؑ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے نہیں تھے اور لوطؑ بھی حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے یا بھانجے تھے۔

لیکن یونسؑ کے بارے میں تمام مورخین میں اتفاق نہیں ہے، بعض انہیں بھی اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے

ہی سمجھتے ہیں[1] اور بعض انہیں انبیاء بنی اسرائیل میں سے شمار کرتے ہیں[2]

علاوہ ازیں عام طور پر مورخین نسب کی باپ کی طرف سے حفاظت کرتے ہیں یوں اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ حضرت یونسؑ کا بھی حضرت عیسیٰؑ کی طرح کہ جن کا نام درج بالا آیات میں ہے کا سلسلہ نسب ماں کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتا ہو۔

باقی رہے لوطؑ تو وہ اگرچہ ابراہیمؑ کے فرزند نہیں تھے لیکن ان کے خاندان اور رشتہ داروں میں سے تھے، تو جس طرح عربی زبان میں بعض اوقات "چچا" کو "اب" (باپ) کہا جاتا ہے اسی طرح بھتیجے اور بھانجے پر بھی ذریت اور فرزند کا اطلاق ہوتا ہے، اس طرح سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ظاہر آیات سے دست بردار ہو جائیں جو کہ ابراہیمؑ کے بارے میں ہیں اور ضمیر کو نوحؑ کی طرف پلٹا دیں جو یہاں موضوع سخن بھی نہیں ہیں۔

بعد کی آیت میں زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ کا نام لیا گیا ہے اور مزید کہا گیا ہے کہ یہ سب صالحین میں سے تھے یعنی ان کا مقام و منزلت تشریفاتی اور اجباری پہلو نہیں رکھتا تھا بلکہ انہوں نے عمل صالح کے ذریعہ بارگاہ خداوندی میں عظمت و بزرگی حاصل کی تھی (وزکریا ویحیٰی وعیسٰی والیاس کل من الصّٰلحین)۔

بعد والی آیت میں بھی چار اور پیغمبروں اور خدائی رہنماؤں کے نام آئے ہیں اور فرمایا گیا ہے: اور اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط بھی، اور سب کو ہم نے عالمین پر فضیلت عطا کی (واسمٰعیل والیسع ویونس ولوطا وکلا فضلنا علی العٰلمین)۔ اس بارے میں کہ الیسع کس قسم کا نام ہے اور پیغمبروں میں سے کون سے پیغمبر کی طرف اشارہ ہے مفسرین اور ادباء عرب کے درمیان اختلاف ہے بعض اسے ایک عبرانی نام سمجھتے ہیں جو اصل میں یوشع تھا اس کے بعد اس پر الف لام داخل ہوئے اور شین، سین سے تبدیل ہو گئی اور بعض کا نظریہ ہے کہ یہ ایک عربی نام ہے اور "یسع" سے لیا گیا ہے (جو وسعت کا فعل مضارع ہے)۔ یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اسی صورت میں گذشتہ انبیاءؑ میں سے کسی نبی کا نام تھا بہرحال وہ جناب بھی نسل ابراہیمؑ میں سے ایک پیغمبر ہیں۔

اور آخری آیت میں مذکورہ انبیاء کے صالح آباؤ اجداد، اولاد اور بھائیوں کی طرف کہ جن کے نام یہاں تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیے گئے ایک کلی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کے آباؤ اجداد، ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے کچھ افراد کو ہم نے فضیلت دی، انہیں برگزیدہ کیا اور راہ راست کی ہدایت کی (ومن اٰبائھم وذریاتھم واخوانھم واجتبینٰھم وھدینٰھم الی صراط مستقیم)۔

## چند قابل توجہ امور

۱۔ فرزندانِ پیغمبر۔ اوپر والی آیات میں حضرت عیسیٰؑ کو فرزندان ابراہیمؑ (اور ایک احتمال کی بنا پر فرزندان نوحؑ)

---

[1] تفسیر آلوسی جلد ۷، صفحہ ۱۸۴۔

[2] دائرۃ المعارف فرید وجدی جلد دہم صفحہ ۱۰۰۵ (ذیل مادہ یونس)۔

میں سے شمار کیا گیا ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ جناب صرف ماں کی طرف سے ابراہیمؑ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔
یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ سلسلہ نسب باپ اور ماں دونوں کی طرف سے یکساں طور پر آگے بڑھتا ہے اور اسی دلیل سے پوتے اور نواسے دونوں ہی انسان کی ذریت اور فرزند شمار ہوتے ہیں۔
اسی سبب سے آئمہ اہل بیتؑ کو جو سب کے سب بیٹی کی طرف سے پیغمبر اکرمؐ تک پہنچتے ہیں ابناء رسول اللہ (فرزندان رسولؐ) کہا جاتا ہے۔
اگرچہ زمانۂ جاہلیت میں جب کہ عورت کی کوئی اہمیت نہیں تھی نسب کو صرف باپ کی طرف سے سمجھتے تھے لیکن اسلام نے اس جاہلانہ فکر پر قلم بطلان پھیر دیا، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لکھنے والوں میں سے بعض قلم نگار جو آئمہ اہل بیتؑ کے ساتھ صحیح لگاؤ نہیں رکھتے یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ اس امر کا انکار کریں اور ابن رسول اللہ کہنے سے اجتناب کریں اور سنن جاہلیت کو زندہ کریں۔
اتفاق سے یہ موضوع خود آئمہ علیہم السلام کے زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا اور انہوں نے اسی آیت کے ساتھ کہ جو ایک دندان شکن دلیل ہے، انہیں جواب دیا۔
منجملہ ان کے کتاب کافی اور تفسیر عیاشی میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپؑ نے فرمایا:
خداوند عالم نے قرآن میں حضرت عیسٰیؑ کا نسب جو کہ ماں کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتے تھے ذریت (اولاد کی اولاد) کے عنوان سے بیان کیا ہے۔
پھر آپؑ نے آیہ (ومن ذریته داؤد وسلیمان) کو آخر تک اور بعد کی آیت کو لفظ عیسٰیؑ تک تلاوت فرمایا۔
تفسیر عیاشی میں بھی ابو الاسود سے مروی ہے وہ کہتا ہے:
ایک دن حجاج نے کسی کو یحییٰ بن معمر کے پاس بھیجا جو خاندان رسالت سے محبت رکھتا تھا (اور اس سے پوچھا) کہ میں نے سنا ہے کہ تو حسنؑ اور حسینؑ کو فرزندان رسولؐ سمجھتا ہے اور اس سلسلے میں آیات قرآن سے استدلال کرتا ہے، حالانکہ میں نے قرآن کو اول سے آخر تک پڑھا ہے مجھے تو کوئی ایسی آیت نہیں ملی۔ یحییٰ بن معمر نے اس کے جواب میں کہا کہ کیا تو نے سورہ انعام کی وہ آیت بھی پڑھی ہے کہ جو یہ کہتی ہے کہ "ومن ذریته داؤد وسلیمان ...... ویحییٰ وعیسیٰ" اس نے کہا کہ ہاں میں نے پڑھی ہے تو اس نے کہا کہ کیا ان آیات میں حضرت عیسٰیؑ کو ذریت ابراہیمؑ میں شمار نہیں کیا گیا ہے حالانکہ وہ باپ کی طرف سے تو ان تک نہیں پہنچتے تھے۔
عیون الاخبار میں ایک طویل حدیث ہے جس میں امام موسیٰؑ بن جعفرؑ کی ہارون الرشید اور موسیٰ بن مہدی سے گفتگو منقول ہے جس میں ہے:
اس (ہارون) نے امام کاظم علیہ السلام سے کہا کہ تم لوگ کس طرح کہتے ہو کہ ہم ذریت پیغمبرؐ ہیں حالانکہ پیغمبرؐ کا کوئی بیٹا تو نہیں تھا اور نسل بیٹے سے چلتی ہے نہ کہ بیٹی سے اور تم ان کی بیٹی کی اولاد ہو، امام علیہ السلام

نے جواب میں اس سے کہا کہ اس سوال کو رہنے دے لیکن ہارون نے اصرار کیا اور کہا میں کسی طرح بھی اس سوال سے صرف نظر نہیں کروں گا کیونکہ تم لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ سب کچھ قرآن مجید میں موجود ہے لہٰذا اس بارے میں قرآن کی کوئی آیت دکھایئے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا:

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و من ذریته داؤد و سلیمان وایوب و یوسف و موسٰی و ھارون و کذٰلک نجزی المحسنین و زکریا و یحیی و عیسٰی۔

اس کے بعد آپ نے سوال کیا اے ہارون عیسٰیؑ کا باپ کون تھا اس نے کہا عیسٰیؑ کا تو کوئی باپ نہیں تھا۔ فرمایا۔ تو اس بنا پر اگر وہ انبیاء کی ذریت سے ملحق ہیں تو مریم کی طرف سے ہیں۔ ہم بھی رسول خدا کی ذریت میں اپنی ماں فاطمہؑ کے ذریعے سے ملحق ہیں۔[۱]

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ بعض متعصب سنی مفسرین نے بھی یہ موضوع اپنی تفسیر میں اسی آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ ان میں سے ایک فخر الدین رازی ہیں جنہوں نے اپنی تفسیر کبیر میں لکھا ہے:

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حسنؑ و حسینؑ ذریت پیغمبر ہیں کیونکہ خدا نے عیسٰیؑ کو ذریت ابراہیمؑ میں شمار کیا ہے حالانکہ وہ صرف ماں کی طرف سے ان (حضرت ابراہیمؑ) سے تعلق رکھتے ہیں۔[۲]

تفسیر "المنار" کا مؤلف بھی جو بعض مخصوص مذہبی مباحث میں فخر رازی سے کم متعصب نہیں ہے فخر رازی کی اس گفتگو کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے:

اس باب میں ایک حدیث حضرت ابوبکر سے بھی صحیح بخاری میں پیغمبرؐ سے نقل ہوئی ہے کہ آپؐ نے امام حسنؑ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا:

ان ابنی ھٰذا سید۔

میرا یہ بیٹا سید و سردار ہے۔

یعنی آپؐ نے "میرا بیٹا" کے لفظ کا امامؑ پر اطلاق فرمایا حالانکہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے نزدیک لفظ ابن (بیٹا) کا بیٹی کی اولاد پر اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ اسی بنا پر لوگ اولاد فاطمہؑ کو اولاد رسولؐ اور عترت و اہل بیت رسولؐ جانتے تھے۔

بہر حال اس میں شک نہیں ہے کہ اولاد کی اولاد بیٹی کی ہو یا بیٹے کی انسان کی اولاد شمار ہوتی ہے اور اس سلسلے میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ ہی یہ تفریق ہمارے پیغمبرؐ کے خصوصیات میں سے ہے اور اس مسئلہ کی مخالفت کا سرچشمہ سوائے تعصب یا زمانہ جاہلیت کے افکار کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسی لیے تمام احکام اسلام میں جواز ازدواج،

---

[۱] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۴۳۔

[۲] تفسیر فخر رازی جلد ۱۳ صفحہ ۶۶۔

ارث وغیرہ کے قبیل سے ہیں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں صرف ... مستثنا ہے، اور وہ مسئلہ خمس ہے جو سیادت کے ساتھ مخصوص ہے اور ایک خاص جہت سے جو فقہ کی کتاب خمس میں ... لی ہے اس موضوع کا استثناء ہوا ہے۔

۲۔ ان پیغمبروں کے تین حصوں میں کیوں بیان ہوئے؟ بعض مفسرین نے یہ احتمال بیان کیا ہے کہ پہلا گروہ یعنی داؤد، سلیمان، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ، یہ چھ افراد ان پیغمبروں میں سے تھے جو مقام نبوت و رسالت کے علاوہ حکومت و سلطنت بھی رکھتے تھے، اور شاید جملہ کذلک نجزی المحسنین جو ان ... ناموں کے ذکر کے بعد آیا ہے ان فراواں نیکیوں کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اپنی اپنی حکومت کے زمانہ میں لوگوں پر کی تھیں۔

لیکن دوسرا گروہ یعنی زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور الیاسؑ اُن انبیاء میں سے ہیں کہ جو مقام نبوت و رسالت کے علاوہ زہد و تقویٰ میں اعلیٰ نمونہ تھے: "کل من الصالحین" کا جملہ اُن کے اسمائے گرامی کے بعد ہو سکتا ہے کہ اسی ... طرف اشارہ ہو۔

اور تیسرے گروہ (کے انبیاء) یعنی اسماعیلؑ، الیسعؑ، یونسؑ اور لوطؑ یہ امتیاز رکھتے تھے کہ انہوں نے بڑ... اور دین خدا کو محکم کرنے کے لیے ہجرت کے پروگرام کو عملی شکل دی اور جملہ "کلا فضلنا علی العٰلمین" کا ذکر بھی ... پر کہ اس جملہ میں انہی چار افراد کی طرف اشارہ ہے نہ کہ ان تمام پیغمبروں کی طرف کہ جن کا ذکر ان تین آیات میں ... ہو سکتا ہے کہ اُن کے مختلف قوموں اور دنیا جہاں کے لوگوں کے درمیان سیر کی طرف اشارہ ہو۔

۳۔ انسان کی شخصیت کے تعارف میں صالح اور نیک اولاد کی اہمیت: ایک دوسرا موضوع جو زیر بحث آیات سے معلوم ہوتا ہے یہی مسئلہ ہے کیونکہ خدا شجاع و بت شکن ابراہیمؑ کے مقام والا کے تعارف کے لیے عالم انسانیت کی عظیم شخصیتوں کا جو آپ کی اولاد میں سے مختلف زمانوں میں عالم وجود میں آئی تھیں شرح و بسط اور تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے، اس طور پر کہ ان ۲۵ انبیاء میں سے کہ جن کے نام سالم قرآن میں بیان ہوئے ہیں ان آیات میں ۱۶ نام ابراہیمؑ کے فرزندوں اور وابستگان کے ہیں اور ایک نام اُن کے اجداد میں سے آیا ہے اور یہ حقیقت میں عام مسلمانوں کے لیے ایک عظیم درس ہے تاکہ وہ یہ جان لیں کہ ان کی اولاد اور عزیزوں کی شخصیت ان کی شخصیت کا جزو شمار ہوتی ہے لہٰذا اُن سے مربوط تربیتی اور انسانی مسائل بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

۴۔ ایک اعتراض کا جواب: ممکن ہے کہ کچھ لوگ آخری آیت سے، جو یہ کہتی ہے کہ ہم نے ان کے بعض آباؤ اجداد اور اولاد اور بھائیوں کو برگزیدہ کیا اور انہیں راہ راست کی ہدایت کی، یہ سمجھا کریں کہ انبیاء کے آباؤ اجداد سب کے سب باایمان افراد نہیں تھے اور اُن میں غیر موحد بھی ہیں۔ جیسا کہ بعض مفسرین اہل سنت نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "اجتبیناھم وھدینٰھم" سے مراد اس تعبیر کے قرینہ سے کہ جو اسی سلسلہ آیات میں موجود ہے، مقام نبوت و رسالت ہے، یہ مشکل حل ہو جاتی ہے یعنی آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ ہم نے اُن میں سے بعض کو مقام نبوت کے لیے برگزیدہ کیا، اور یہ باقی دوسروں کے موحد د

خدا پرست ہونے کی نفی نہیں۔ ... سورہ کی آیہ ۹۰ میں بھی (جو اس آیت سے ... آیات بعد کی آیت ہے) ہدایت کا اطلاق مقام نبوت پر ہو

۸۸۔ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

۸۹۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ○

۹۰۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ○

## ترجمہ

۸۸۔ یہ خدا کی ہدایت ہے کہ جو اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کی ہدایت کرتا ہے اور اگر ... ہو جائیں تو انہوں نے جو کچھ عمل کیا تھا وہ سب کا سب (ضائع اور) نابود ہو جائے گا۔

۸۹۔ وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکم و نبوت عطا کی ہے اور اگر وہ اس کا انکار کریں اور کافر ہو جائیں تو کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ) ہم نے ایسے لوگوں کو اس کا نگہبان بنایا ہے کہ جو اس کا کفر و انکار کرنے والے نہیں ہیں۔

۹۰۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنہیں خدا نے ہدایت کی ہے پس تم ان کی ہدایت کی اقتدا (و پیروی) کرو (اور) یہ کہو کہ میں اس (رسالت و تبلیغ) کے بدلے میں تم سے کوئی اجر اور بدلہ نہیں مانگتا یہ رسالت تو عالمین کے لیے

---

۱؎ ترکیب کے لحاظ سے "من اٰبائهم" یہ جار مجرور ہے کہ جس کا تعلق یا تو لفظ "فضلنا" سے جو پہلی کی آیت میں ذکر ہوا ہے، یا محذوف ہے اور بعد کا جملہ اس محذوف پر دلالت کرتا ہے اور اصل میں اس طرح تھا "اجتبینا ھم من اٰبائھم" ضمناً توجہ رکھنا چاہیے کہ اوپر والی آیت میں "من" تبعیضیہ ہے۔

ایک یاد دہانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

# تفسیر

## تین اہم امتیاز

گذشتہ آیات میں خداوند تعالیٰ پیغمبروں کے مختلف گروہوں کے ناموں کے ذکر کے بعد یہاں ان کی زندگی کے کلی اور اصلی خطوط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلے فرماتا ہے: یہ خدا کی ہدایت ہے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت و رہبری کرتا ہے (ذلک ھدی اللہ یھدی بہ من یشاء من عبادہ) یعنی اگرچہ وہ صالح اور نیک لوگ تھے اور عقل و فکر کی قوت اور اپنے تمام وجود کے ساتھ ہدایت کی راہ میں قدم اٹھاتے تھے لیکن پھر بھی اگر توفیق الٰہی ان کے شامل حال نہ ہوتی اور اس کی مہربانی کا ہاتھ ان کی دستگیری کرتے ہوئے انہیں سہارا نہ دیتا تو ان سب کے بارے میں بھی اور ہر شخص کے لیے لغزش کا امکان موجود تھا اور موجود ہے۔ پھر اس بنا پر کہیں یہ تصور نہ کر لیا جائے کہ انہوں نے اس راہ میں مجبوراً قدم اٹھایا ہے اور اسی طرح کوئی یہ تصور بھی نہ کرے کہ خداوند تعالیٰ ان کے بارے میں ایک استثنائی اور بغیر کسی دلیل اور وجہ کے کوئی خاص نظر رکھتا تھا فرماتا ہے: اگر فرض کریں کہ پیغمبر اس مقام و حیثیت کے باوجود جو وہ رکھتے تھے مشرک ہو جاتے تو ان کے تمام اعمال حبط ہو جاتے (ولو اشرکوا لحبط عنھم ما کانوا یعملون)۔

یعنی ان کے لیے بھی وہی قوانین الٰہی جاری ہیں جو دوسروں کے بارے میں جاری ہوتے ہیں اور کوئی استثناء کسی کے لیے نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں تین اہم امتیازات و خصوصیات کی طرف جو انبیاء کے تمام امتیازات کی بنیاد ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ ایسے لوگ تھے کہ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب عطا کی اور مقام حکم بھی اور نبوت بھی (اولئک الذین اتیناھم الکتاب والحکم والنبوۃ)۔

البتہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ سب صاحب کتاب تھے بلکہ چونکہ گفتگو ان سب کے متعلق ہو رہی ہے لہٰذا اجتماعی طور پر سب کی طرف کتاب کی نسبت دی گئی اس کی مثال ٹھیک اس طرح ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں کتاب میں علماء اور ان کی کتب کا تعارف کرایا گیا ہے یعنی ان کی کتب کہ جنہوں نے کوئی کتاب لکھی ہے۔

ضمنی طور پر اس بارے میں کہ "حکم" سے کیا مراد ہے تین احتمال پائے جاتے ہیں:

۱۔ حکم کا مفہوم اس لفظ یہاں عقل و فہم و ادراک کے معنی میں ہے یعنی اس کے علاوہ کہ ہم نے انہیں آسمانی کتاب دی ہے اس کو سمجھنے کی قدرت بھی انہیں بخشی ہے کیونکہ کتاب کا وجود قوی و کامل ادراک و فہم کے بغیر کوئی اثر نہیں رکھتا۔

۲۔ منصب قضاوت، یعنی وہ آن آسمانی قوانین کے سائے میں جو کتاب الہیٰ میں تھے، لوگوں کے درمیان فیصلہ کرسکتے تھے اور اُن سب میں ایک قاضی اور دادرس عادل کی تمام شرائط کامل طور پر موجود تھیں۔

۳۔ حکومت وسلطنت، کیونکہ وہ مقام نبوت ورسالت کے علاوہ مقام حکومت کے بھی حامل تھے۔

اُوپر والے تمام معانی کا شاہد۔ اس کے علاوہ کہ حکم کا لغوی معنی ان تمام معانی پر منطبق ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ قرآن کی مختلف آیات میں بھی حکم ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے[1]

اور اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اوپر والی آیت میں لفظ حکم ایک جامع معنی میں کہ جس میں تینوں اوپر والے مفہوم موجود ہوں، استعمال ہوا ہو کیونکہ حکم اصل میں جیسا کہ راغب "مفردات" میں کہتا ہے منع کرنے اور روکنے کے معنی میں ہے اور چونکہ عقل، شتباہات اور غلط کاریوں سے روکتی ہے، اسی طرح صحیح قضاوت وفیصلہ کرنا ظلم وستم کرنے سے منع کرتا ہے اور عادل حکومت دوسروں کی ناروا ونا جائز حکومتوں کو روک دیتی ہے (لہٰذا لفظ حکم) ان تینوں (معانی) میں سے ہر ایک معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم اشارہ کرچکے ہیں کہ تمام انبیاء ان تمام مقامات کے حامل نہیں تھے لیکن جب ایک گروہ کی طرف کچھ احکام کی نسبت دی جائے، تو یہ بات ضروری نہیں ہے کہ اس جماعت کے تمام افراد اُن تمام احکام کے حامل ہوں بلکہ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے بعض ان احکام میں سے فقط بعض احکام کے ہی حامل ہوں۔ لہٰذا کتاب آسمانی کا موضوع جو صرف مذکورہ معدودے چند انبیاء کے بارے میں تھا، مندرجہ بالا آیت کے سمجھنے میں ہمارے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے، اگر یہ گروہ یعنی مشرکین، اہل مکہ اور ان جیسے لوگ ان حقائق کو قبول نہ کریں تو تیری دعوت جواب کے بغیر نہیں رہے گی کیونکہ ہم نے ایک گروہ کو اس امر پر مامور کردیا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اسے قبول کریں بلکہ اس کی حفاظت ونگہبانی بھی کریں۔ وہ ایسا گروہ ہے کہ جو (ایمان لانے کے بعد کفر کے راستے پر گامزن نہ ہوں گے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم رکھیں گے (فان یکفر بھا ھؤلاء فقد وکلنا بھا قوما لیسوا بھا بکافرین)۔

تفسیر "المنار" اور تفسیر "روح المعانی" میں بعض مفسرین سے نقل ہوا ہے کہ اس جماعت سے مراد ایرانی ہیں کہ جنہوں نے بہت جلدی اسلام قبول کیا اور اس کی پیش رفت میں اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ کوشاں رہے اور ان کے علماء اور دانشمندوں نے مختلف اسلامی فنون میں بہت زیادہ کتابیں لکھی ہیں[2]

---

[1] سورۂ لقمان کی آیہ ۱۲ میں علم وفہم کے معنی میں، سورہ ص کی آیہ ۲۲ میں قضاوت کے معنی میں اور ... ۲۶ میں حکومت کے معنی میں آیا ہے۔

[2] آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ "ھؤلاء" سے مراد خود انبیاء ہوں یعنی بفرض محال اگر یہ بزرگ انبیاء خدا ادائے رسالت

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

آخری آیت میں ان بزرگ پیغمبروں کے پروگرام (اور کارناموں) کو ہدایت کے ایک اعلیٰ نمونے کے طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے تعارف کراتے ہوئے قرآن کہتا ہے: یہ ایسے لوگ ہیں کہ ہدایت الٰہی جن کے شاملِ حال تھی لہٰذا تم بھی ان کی ہدایت کی اقتداء کرو (اولئك الذین ھدی اللّٰہ فبھداھم اقتدہ)[1]۔

یہ آیت دوبارہ تاکید کرتی ہے کہ تمام پیغمبروں کا اصولِ دعوت ایک ہی ہے۔ اگرچہ خصوصیات کے لحاظ سے مختلف زمانوں کی مختلف ضروریات کے تناسب سے احکام فرق رکھتے تھے اور بعد کے دین و آئین قبل کے ادیان سے کامل تر ہوتے رہے اور علمی و تربیتی کلاسیں اپنے انتہائی درجے تک کہ جو آخری کورس تھا یعنی اسلام تک پہنچی ہیں۔

اس بارے میں کہ اس ہدایت سے کونسی ہدایت مراد ہے کہ جو پیغمبر اسلام کے لیے نمونہ قرار پائی ہے۔ بعض مفسرین نے تو یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد مشکلات کے مقابلہ میں صبر و پائیداری ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اس سے مقصود توحید اور تبلیغِ رسالت ہے لیکن ظاہراً ہدایت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو توحید کو بھی اور دوسرے اصول اعتقادی کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور صبر و استقامت اور باقی اخلاق، تعلیم اور تربیت کے اصول بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زیر نظر آیت اس بات کے منافی نہیں کہ اسلام تمام گذشتہ ادیان و شرائع کا ناسخ ہے کیونکہ نسخ تو صرف احکام کے ایک حصہ کے لیے ہوتا ہے نہ کہ ان کی دعوت کے کلی اصول منسوخ ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں سے یہ کہہ دیں کہ: میں تم سے اپنی رسالت کے بدلے میں کسی قسم کا کوئی اجر اور بدلے کا مطالبہ نہیں کرتا۔ جیسا کہ گذشتہ انبیاء نے بھی کوئی ایسی درخواست نہیں کی تھی میں بھی انبیاء کی ہمیشہ کی اس سنت کی پیروی کرتے ہوئے ان کی اقتدا کرتا ہوں (قل لا اسئلکم علیہ اجرًا)۔

نہ صرف یہ کہ انبیاء اور ان کی سنتِ جاوید کی اقتدار کا تقاضا یہ ہے کہ میں کسی قسم کی اجرت کا مطالبہ نہ کروں بلکہ اس سبب سے بھی کہ یہ پاک دین جو میں تمہارے لیے لایا ہوں ایک خدائی امانت ہے جو میں تمہیں سپرد کر رہا ہوں

---

حاشیہ بر صفحہ سابقہ: سے سرتابی کر لیتے، تو پھر بھی خدائی پیغام زمین پر نہ پڑا رہتا، اور ایک دوسری جماعت اسے عالمین تک پہنچانے پر مامور ہو جاتی۔ قرآن میں ایسی تعبیرات کی نظیر بھی پائی جاتی ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر ہم پڑھتے ہیں:

لئن اشرکت لیحبطن عملك. (زمر ۶۵)

[1] اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ "اقتدہ" میں "ہ" ضمیر نہیں ہے بلکہ "ھاء سکت" ہے جو وقف کے وقت کلام میں حرف متحرک سے ملحق ہوتی ہے جیسا کہ ہمزۂ وصل استعمال ہوتا ہے کہ جو شروع کے حرف کو ساکن کے ساتھ شروع نہ کرنے کی بنا پر آغاز کلام میں لایا جاتا ہے تو جس طرح ہمزۂ وصل اتصال کلام کے وقت ساقط ہو جاتا ہے اسی طرح "ہائے سکت" بھی ساقط ہو جانی چاہیے، لیکن چونکہ یہ "ھاء" قرآن

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

تو خدائی امانت تم تک پہنچانے کا اجر اور جزاء (مانگنے) کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں یہ قرآن، رسالت اور ہدایت تمام عالمین کے لیے ایک صدائے بیدار باش اور یاد آوری ہے (ان ھو الا ذکری للعالمین)۔

اور اس قسم کی عمومی نعمت جو سب کے لیے ہے، نور آفتاب، امواج ہوا اور بارش برسنے کے مانند ہے کہ جو عمومی اور جہانی پہلو رکھتی ہے اور کبھی بھی اس کی خرید و فروخت نہیں ہوتی اور کوئی اس کے بدلے میں اجر و جزا نہیں لیتا۔ یہ ہدایت و رسالت ؟ کوئی خصوصی اور اختصاصی پہلو نہیں رکھتی کہ جس کے لیے کسی بدلے کا قائل ہوا جا سکے۔

(ا جملہ کی تفسیر میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے ان کا ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ اور قبل کی آیات کے ساتھ تعلق کامل طور پر واضح ہو جاتا ہے)۔

ضمنی طور پر آخری جملے سے یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ دین اسلام کوئی علاقائی اور قومی پہلو نہیں رکھتا بلکہ یہ ایک عالمی اور انسانی دین ہے جو ہر جگہ اور ہر شخص کے لیے ہے۔

۹۱۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ○

## ترجمہ

۹۱۔ انہوں نے خدا کو جیسا کہ پہچاننا چاہیے تھا نہیں پہچانا جب کہ انہوں نے یہ کہا کہ اس نے کسی انسان پر کوئی چیز نازل نہیں کی، تم یہ کہہ دو کہ وہ کتاب جو موسیٰ لائے تھے، کس نے نازل کی تھی۔ وہ کتاب جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی۔ (لیکن تم لوگوں نے) اُسے پراگندہ کر دیا ہے۔ تم اس کے کچھ حصے کو تو آشکار کرتے

---

حاشیہ بر صفحہ سابقہ: ۔۔۔ کے رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے، لہٰذا رسم الخط کے ظاہر کی رعایت کرتے ہوئے، احتیاط کو اسی بات میں سمجھتے ہیں کہ یہاں وقف ہو تاکہ "ھاء" ظاہر ہو سکے۔

ہو اور کچھ کو پوشیدہ رکھتے ہو اور تمہیں ایسے مطالب کی تعلیم دی گئی ہے کہ جن سے تم اور تمہارے آباؤ اجداد باخبر نہیں تھے۔ کہہ دو کہ خدا نے ...... اور پھر انہیں ان کی ہٹ دھرمی میں چھوڑ دو تاکہ وہ کھیل کود میں پڑے رہیں۔

## شان نزول

### خدانا شناس

ابن عباس سے منقول ہے:

یہودیوں کی ایک جماعت نے کہا: اے محمد! کیا واقعاً خدا نے تم پر کتاب نازل کی ہے؟

پیغمبر نے فرمایا: ہاں،

وہ کہنے لگے: خدا کی قسم خدا نے کوئی کتاب بھی آسمان سے نازل نہیں کی [1]

اس آیت کی شان نزول میں کچھ اور روایات بھی نقل ہوئی ہیں اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں وہ سب سے بہتر ہے اور زیادہ مناسب ہے۔

## تفسیر

اس بارے میں کہ یہ آیت یہودیوں کے متعلق ہے یا مشرکین کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ پیغمبر اکرمؐ کی مکہ میں یہود سے گفتگو اور ملاقات نہیں تھی اور جو کچھ اُن کے ساتھ معاملہ زیادہ مدینہ میں تھا اور دوسری طرف یہ کہ سورہ انعام کہ یہ آیت جس کا جزء ہے مکی ہے، بعض کا نظریہ ہے کہ یہ آیت استثنائی طور پر مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے کسی خاص مناسبت کی وجہ سے اس مکی سورہ کے وسط میں رکھی گئی ہے اور قرآن میں اس امر کے کئی نمونے موجود ہیں۔

حقیقت مطلب واضح ہونے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ آیت کی اجمالی تفسیر کو سمجھ لیں اور اس کے بعد اس بارے میں کہ آیت کن لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور اس کا ہدف و مقصد کیا ہے بحث کریں۔

آیت پہلے یہ کہتی ہے کہ: انہوں نے خدا کو جس طرح چاہیے اس طرح نہیں پہچانا، کیونکہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ خدا نے کوئی کتاب کسی [illegible] نہیں کی (وما قدروا اللہ حق قدره اذ قالوا ما انزل اللہ علی بشر من شیء)۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، ابو الفتوح رازی اور المنار زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ تم اُن کے جواب میں یہ کہو کہ وہ کتاب جو موسیٰ لائے تھے اور جو لوگوں کے لیے نور و ہدایت تھی وہ کس نے نازل کی تھی (قل من انزل الکتٰب الذی جاء بہ موسٰی نوراً و ھدی للناس)۔

وہی کتاب کہ جسے تم نے پراگندہ صفحات میں تبدیل کر دیا ہے، اس کا کچھ حصہ جو تمہارے مفاد میں ہے (لوگوں پر) ظاہر کرتے ہو اور اس کا بہت سا حصہ جسے تم اپنے لیے مضر سمجھتے ہو (لوگوں سے) چھپاتے ہو (تجعلونہ قراطیس تبدونھا و تخفون کثیراً)۔

"اور اس آسمانی کتاب میں تمہیں ایسے مطالب کی تعلیم دی گئی ہے کہ جنہیں تم اور تمہارے آباؤ اجداد جانتے نہیں تھے اور خدائی تعلیم کے بغیر اُسے جان بھی نہیں سکتے تھے" وعلمتم مالم تعلموا انتم ولا اٰباؤکم)۔

آیت کے آخر میں پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ: تم صرف خدا کو یاد کرو اور انہیں ان کی باطل باتوں، ہٹ دھرمی اور کھیل کود میں چھوڑ دو کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنہوں نے کتاب الٰہی اور اس کی آیات کو کھیل بنا رکھا ہے (قل اللہ ثم ذرھم فی خوضھم یلعبون)۔

اب اگر یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہو اور روئے سخن یہودیوں کی طرف ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ یہودیوں کی ایک جماعت تمام انبیاء پر آسمانی کتاب کے نزول کی منکر تھی تو کیا یہ ممکن ہے کہ یہودی اور تورات کی پیروی کرنے والے کتاب آسمانی کے نزول کا انکار کریں۔ جی ہاں! اگر آپ تعجب نہ کریں تو ایک خاص مطلب کی طرف توجہ کرنے سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ہم کتب عہد جدید (اناجیل) اور کتب عہد قدیم (تورات اور اس کے ساتھ وابستہ کتب) کا دقت نظر سے مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کتب میں سے کوئی بھی آسمانی لب و لہجہ نہیں رکھتی۔ یعنی خدا کے انسان سے گفتگو کرنے کا پہلو ان میں نہیں ہے، بلکہ ان سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتابیں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے شاگردوں اور غیر شاگرد پیروکاروں کی زبان سے تاریخ اور سیرت کی صورت میں لکھی گئی ہیں۔

اور ظاہراً موجودہ وقت کے یہودی اور عیسائی بھی اس مطلب کا انکار نہیں کرتے کیونکہ ان کتابوں میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی وفات کی داستان اور بہت سے ایسے واقعات جو ان کے بعد کے زمانے سے مربوط ہیں لکھے ہوئے ہیں یہ (واقعات) پیش گوئی کے طور پر نہیں بلکہ گزرے ہوئے زمانے کی ایک خبر کے طور پر ہیں۔ کیا یہ بات ممکن ہے کہ ایسی کتاب حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی ہو؟

زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ کتابیں چونکہ ایسے انسانوں کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہیں جو وحی آسمانی سے باخبر تھے لہٰذا یہ کتب مقدس، قابلِ اعتماد اور اشتباہ سے پاک ہیں۔

تو اس نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن کے لب و لہجہ سے کہ جو خدا کے پیغمبرؐ سے اور بندوں سے خطاب کی شکل میں ہے کیوں تعجب کرتے تھے؟ اور اوپر والی شانِ نزول میں بھی ہم نے پڑھا ہے کہ انہوں نے تعجب کے ساتھ آپ سے پوچھا کہ کیا خدا نے آسمانی کتاب نازل کی ہے، اور پھر انہوں نے اس امر کا کلی طور پر انکار کیا ہے کہ کوئی کتاب خدا کی طرف سے کسی انسان پر حتیٰ کہ موسیٰؑ پر بھی نازل ہوئی ہے۔

لیکن خدا ان کے جواب میں اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تم خود یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ الواح اور کچھ مطالب موسیٰ پر نازل ہوئے تھے۔ یعنی جو کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے اگر وہ کتاب آسمانی نہیں ہے تو کم از کم یہ تو تم قبول کرتے ہو کہ اس قسم کی کوئی چیز خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھی کہ جس کے کچھ حصّہ تو تم آشکار کرتے ہو اور زیادہ تر حصّہ چھپاتے ہو۔
اس طرح سے اس بارے میں کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا کہ یہ کہا جائے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہودی کتاب آسمانی کے نزول کے منکر ہوں۔

اور اگر یہ آیت اس سورہ کی باقی آیات کی طرح مشرکین کے بارے میں ہو تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ہر قسم کی آسمانی کتاب کے نزول کے منکر ہو گئے تھے تاکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا انکار کر سکیں، لیکن خدا ان کے لیے یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس قسم کا دعویٰ کریں حالانکہ خدا نے تورات موسیٰ پر نازل کی، اور مشرکین اگرچہ دینِ یہود قبول نہیں کرتے تھے لیکن وہ گذشتہ انبیاء کو اور حضرت ابراہیمؑ کو یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کو احتمالاً ایک خاص علاقے اور زمانے کے پیغمبر کے طور پر قبول کرتے تھے اور خود کو دینِ ابراہیمؑ کا پیروکار سمجھتے تھے۔ اسی لیے جب پیغمبر اسلام نے ظہور کیا تو وہ ان کی علامات کی جستجو کے لیے اہلِ کتاب کے پاس گئے اور اُن سے درخواست کی کہ وہ اپنی کتب کا مطالعہ کریں اور تحقیق کریں کہ کیا وہ اس قسم کے پیغمبر کی خبر دیتی ہیں، تو اگر وہ ان کتب کو بالکل قبول نہ کرتے ہوتے تو کس طرح ممکن تھا کہ وہ اس قسم کی درخواست کریں لہٰذا وہ یہود سے سوال کرنے کے بعد جو کچھ اُن کے فائدے میں تھا اُسے ظاہر کرتے اور جو اُن کے لیے مضر تھا اُسے مخفی رکھتے (مثلاً پیغمبر کی اُن نشانیوں کے جو گذشتہ کتب میں آئی تھیں) لیکن پہلی تفسیر آیہ کے لب ولہجہ، شان نزول اور اُن ضمائر کے ساتھ جو آیت میں ہیں زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

## چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ قراطیس: یہ جمع ہے "قرطاس" کی اور اس کی اصل جیسا کہ بعض نے کہا ہے یونانی زبان سے لی گئی ہے۔ اس کا معنی جیسا کہ راغب نے "مفردات" میں کہا ہے "ہر وہ چیز ہے کہ جس کے اُوپر لکھا جائے" اس بنا پر یہ لفظ عام کاغذ جانوروں کے چمڑے، درختوں کی چھال اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے لیے بھی کہ جن پر قدیم ایام میں خطا اور کتابیں لکھتے تھے، استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ کاغذ پر لکھنے کی مذمت: ممکن ہے کہ یہ سوال ہو کہ آیت میں یہودیوں کی مذمت کیوں کی گئی ہے کہ انہوں نے وحی آسمانی کو کاغذ وغیرہ پر لکھا تھا، یہ تو کوئی مذمت کی بات نہیں ہے۔

ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ مذمت اس لحاظ سے نہیں ہے بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ مطالب تورات کو پراگندہ کاغذات اور اسی کی مانند دوسری چیزوں کے اُوپر لکھتے تھے، پھر جو کچھ اُن کے فائدہ میں ہوتا تھا اُس کو تو وہ دوسرے لوگوں کو دکھاتے تھے اور جو ان کے نقصان میں ہوتا تھا اُسے مخفی رکھتے تھے۔

۳۔ "وما قدروا اللہ حق قدرہ" (خدا کو جس طرح چاہیے انہوں نے نہیں پہچانا اور اس کے اوصاف کو سمجھا نہیں) حقیقت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص خدا کو صحیح طریقے سے پہچان لے وہ یہ انکار نہیں کر سکتا کہ اس کی طرف سے رہبر و رہنما کتب آسمانی کے ساتھ نوع بشر کے لیے بھیجے گئے کیونکہ حکمتِ خدا کا تقاضا یہ ہے کہ:

اوّل تو اس نے انسان کو جس ہدف و مقصد کے لیے پیدا کیا ہے یعنی ہدفِ ارتقا، اس کے لیے جو پرپیچ و خم راستہ اس کے سامنے ہے اس میں اس کی مدد کرے ورنہ بصورت دیگر اس نے غرضِ تخلیق کا تقاضا پورا نہیں کیا اور یہ ہدف و مقصد دی بھیجنے، کتاب آسمانی نازل کرنے اور ہر قسم کی خطا و اشتباہ سے خالی، پاک اور صحیح تعلیمات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دوسرے یہ بات کیسے ممکن ہے کہ خدا کی رحمت عامہ و خاصہ کا مقام اس بات کی اجازت دے دے کہ وہ انسان کو راہِ سعادت میں جہاں پر وہ ہزار ہا رکاوٹوں سے دوچار ہے اور بہت سی پھسلنے کی جگہیں اس کی راہ میں موجود ہیں اکیلا چھوڑ دے اور اس کی دستگیری اور رہنمائی کے لیے جامع تعلیمات کے ساتھ رہبر و رہنما نہ بھیجے (اس بنا پر اس کی حکمت بھی اور اس کی رحمت بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ کتب آسمانی بھیجے)۔

اس میں تو شک نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ کی کنہ ذات اور کنہ صفات کی معرفت تو کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے اور زیر بحث آیت میں ایسا کوئی نظریہ نہیں ہے بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ خدا کی ذات اور صفات کی جتنی مقدار انسان کے لیے ممکن ہے اگر وہ حاصل ہو جائے تو اس بات میں کوئی تردد باقی نہیں رہے گا کہ اس قسم کا خدا اپنے بندوں کو بغیر سرپرست اور بغیر کتابِ آسمانی کے نہیں چھوڑے گا۔

۹۲۔ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝

## ترجمہ

۹۲۔ اور یہ وہ کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، یہ ایک ایسی بابرکت کتاب ہے کہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہیں ان سب کی تصدیق کرتی ہے (اسے ہم نے اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم لوگوں کو خدائی جزا و صلہ کی بشارت دو) اور اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم ام القریٰ (مکہ) اور اس کے گرد اگرد کے لوگوں کو ڈراؤ۔ جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس پر بھی ایمان لے آتے ہیں اور اپنی نمازوں کی حفاظت و

نگرانی کرتے ہیں۔

# تفسیر

اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیت میں یہودیوں کی آسمانی کتاب کے بارے میں تھی، یہاں قرآن کی طرف جو ایک دوسری آسمانی کتاب ہے اشارہ ہوتا ہے اور حقیقت میں تورات کا ذکر قرآن کے ذکر کے لیے ایک مقدمہ کے طور پر ہے، تاکہ ایک بشر پر کتابِ آسمانی کے نزول پر تعجب نہ کریں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: یہ وہ کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے (وھٰذا کتاب انزلناہ)۔

یہ ایک بہت ہی بابرکت کتاب ہے کیونکہ یہ طرح طرح کی خوبیوں، نیکیوں اور کامیابیوں کا سرچشمہ ہے (مبارک)۔

اس کے علاوہ ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں تصدیق کرتی ہے (مصدق الذی بین یدیہ)۔

اس سے مراد کہ قرآن گذشتہ مقدس کتابوں کی تصدیق کرتا ہے یہ ہے کہ وہ تمام علامات (اور نشانیاں) جو اُن میں آئی ہیں وہ اس سے مطابقت رکھتی ہیں اور اس طرح گذشتہ دو جملوں میں قرآن کی حقانیت کی دو نشانیاں بیان ہوئی ہیں۔ ایک ان نشانیوں کا موجود ہونا کہ جن کی گذشتہ کتب میں خبر دی گئی تھی اور دوسرے قرآن کریم کے خود اپنے مضامین عالیہ کہ جن میں ہر قسم کی خیر و برکت اور وسیلۂ سعادت موجود ہے۔ اس بناء پر اس کے مضامین عالیہ کے لحاظ سے بھی اور اسناد و تاریخی مدارک کی نظر سے بھی اس میں حقانیت کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔

اس کے بعد نزولِ قرآن کے ہدف و مقصد کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے: ہم نے اسے اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم ام القریٰ (مکہ) اور ان تمام لوگوں کو جو اس کے اطراف و جوانب میں رہتے ہیں، ڈراؤ اور ان کی ذمہ داریوں اور فرائض سے انہیں آگاہ کرو (ولتنذر ام القریٰ ومن حولھا)۔ [1]

اور چونکہ "انذار" یعنی ذمہ داریوں اور فرائض کی طرف متوجہ کرنا اور ان کے ترک کرنے سے ڈرانا خصوصاً ایسے اشخاص کو جو سرکش و طغیانگر ہوں قرآن کریم کا اہم ترین پروگرام ہے، لہٰذا صرف اسی حصے کی طرف اشارہ ہوا ہے اور آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ: وہ لوگ جو قیامت کے دن پر، حساب و کتاب پر اور اعمال کی جزا پر ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب پر بھی ایمان لے آئیں گے اور اپنی نمازوں کی حفاظت بھی

---

[1] اس بارے میں کہ "لتنذر" کا عطف کس پر ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن زیادہ ترجیحات نظر آتی ہے یہ ہے کہ یہ ایک محذوف لفظ مثلاً "لتبشر" وغیرہ پر عطف ہو۔

کریں گے (والذین یؤمنون بالآخرۃ یؤمنون بہ وھم علیٰ صلاتھم یحافظون)۔

## چند قابلِ توجہ مطالب

۱۔ اسلام ایک عالمی دین ہے: قرآن کریم کی مختلف آیات اچھی طرح سے گواہی دیتی ہیں کہ اسلام ایک عالمی دین ہے۔ وہ تعبیرات جیسے:

لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ

میرا ہدف یہ ہے کہ میں تم سب کو اور اُن تمام لوگوں کو جن تک میری بات پہنچے قرآن کے ذریعے ڈراؤں (انعام - ۱۹)۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ

یہ قرآن عالمین کے لیے تذکر و یاد دہانی ہے (انعام - ۹۰)

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا

کہہ دو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ (اعراف - ۱۵۸) اور ایسی بہت سی دوسری آیات کہ جو قرآن میں بکثرت موجود ہیں اس حقیقت پر گواہ ہیں اور خاص طور پر قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں، یعنی اس موقع پر جب کہ اسلام ابھی اس شہر کے حدود اربعہ سے باہر نہیں نکلا تھا۔

لیکن زیرِ بحث آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پیغمبرؐ کی بعثت کا ہدف مکہ اور اس کے گرداگرد کے لوگوں کو ڈرانا اور انہیں ہدایت کرنا کیسے بیان کیا گیا ہے؟ کیا یہ اسلام کے عالمی دین ہونے کے منافی نہیں؟

اتفاق سے یہ اعتراض بعض یہودیوں اور بعض دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے نقل ہوا ہے اور انہوں نے اپنے گمان میں اسلام کے عالمی دین ہونے کے مقابلہ میں اس کو ایک محکم ہتھیار پایا ہے جو اسے ایک خاص علاقہ میں محدود کر دیتا ہے (یعنی مکہ اور اطراف مکہ)[1]

## جواب

دو نکات کی طرف توجہ کرنے سے یہ امر کامل طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت نہ صرف یہ کہ اسلام کے عالمی ہونے کے منافی نہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے یہ اسلام کے عالمی ہونے کی ایک دلیل ہے۔

---

[1] تفسیر المنار جلد ۷ صفحہ ۶۲۱۔ تفسیر فی ظلال جلد ۳ صفحہ ۳۰۷ میں کچھ مستشرقین کی طرف سے یہ اعتراض نقل ہوا ہے۔

۱ - قریہ، قرآن کی زبان میں ہر قسم کی آبادی کے معنی میں ہے چاہے وہ بڑا شہر ہو یا چھوٹا یا کوئی گاؤں، مثلاً ہم سورۂ یوسف میں یوسف کے بھائیوں کی زبان سے ان کے باپ کے سامنے ان کا بیان پڑھتے ہیں کہ:

وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا

ہم جس قریہ میں تھے اس قریہ سے پوچھیئے۔ (یوسف - ۸۲)

اور ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ گفتگو انہوں نے مصر کے پایہ تخت سے واپس لوٹنے اور عزیز مصر کی حکومت کی طرف سے اُن کے بھائی "بنیامین" کو مصر میں روک لینے کے واقعہ کے بعد کی تھی۔ اسی طرح قرآن میں ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

اگر وہ تمام لوگ جو روئے زمین کی آبادیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم آسمان سے اور زمین سے ان پر (اپنی) برکتوں (کے دروازوں) کو کھول دیں گے (اعراف ۹۶)

یہ بات ظاہر ہے کہ یہاں صرف بستیاں (گاؤں) مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے تمام دنیا کے رہائشی اور آباد علاقے مراد ہیں۔

دوسری طرف متعدد روایات میں ہے کہ زمین کی خشکی کے علاقے خانہ کعبہ کے نیچے سے بچھائے گئے تھے اور اسی وجہ سے دحوا لارض (زمین کا بچھانا) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ابتداء میں سیلابی بارشوں کے زیر اثر تمام کرہ زمین پانی سے ڈھکا ہوا تھا، پانی رفتہ رفتہ نیچے چلا گیا، اور زمین کے پست علاقوں میں ٹھہر گیا اور خشکیاں تدریجاً پانی کے نیچے سے سر نکالنے لگیں۔ اسلامی روایات کے مطابق زمین کا پہلا ٹکڑا جس نے پانی سے سر نکالا وہ سرزمین مکہ تھی۔

اور اگر اس زمین کی بلندی موجودہ وقت میں تمام دنیا کی زمینوں کی بلندیوں سے بلند ترین نہیں ہے تو یہ امر ہماری اس گفتگو کے منافی نہیں کیونکہ اس دن سے کئی لاکھ سال گزر چکے ہیں اور اب روئے زمین کے نقاط کی کیفیت بالکل بدل چکی ہے۔ بعض پہاڑ سمندروں کی تہوں میں چلے گئے ہیں اور بعض مقامات سمندروں کی تہوں سے نکل کر پہاڑوں کی چوٹیاں بن چکے ہیں اور یہ امر علم زمین شناسی (GEOLOGY) کے مسلمات میں سے ہے۔

۲ - لفظ "ام" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں ہر چیز کی اصل و اساس اور ابتدا و آغاز کے معنی میں ہے۔

اب تک جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس پر توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر مکہ کو ام القریٰ کہتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہ روئے زمین کی تمام خشکیوں کے پیدا ہونے کی اصل و اساس اور ابتدا و آغاز ہے۔ تو اس بنا پر "ومن حولها" (جو اس کے گرداگرد ہیں) تمام روئے زمین کے لوگوں کے لیے ہوگا۔

گذشتہ آیات بھی اسلام کے عالمی ہونے کے بارے میں اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔ اسی طرح پیغمبر اکرمؐ کے ایسے بہت سے خطوط جو انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں مثلاً کسریٰ و قیصر کے نام لکھے تھے جن کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد دوم صفحہ ۱۵۲ (اردو ترجمہ) پر گزر چکی ہے، اس امر کا ایک اور گواہ ہیں۔

۲ - قرآن پر ایمان اور آخرت پر ایمان میں ربط : مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن پر بھی ایمان لے آئیں گے یعنی وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ جہان دوسرے جہان کے لیے ایک مقدمہ ہے اور کھیتی یا یونیورسٹی یا تجارت خانہ کی مانند ہے۔ بہرصورت ایک سلسلۂ قوانین، لائحۂ عمل، اور آئین اور دستور اس کے لیے ناگزیر ہے اور انبیاءؑ کے آئے بغیر یہ ممکن نہیں کہ اس ہدف عالی تک پہنچ سکیں اور اس دارِ دوم (آخرت) کے لیے تیاری کر سکیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ بات مدنظر رکھتے ہوئے کہ خدا نے انسان کو اس دنیا میں تکامل وارتقا کے لیے پیدا کیا ہے اور اس کی اصلی منزل دوسرا جہان ہے اگر وہ انبیاء اور آسمانی کتب اس کے لیے نہ بھیجے تو اس نے مقصد کو نقض کیا ہے اور اس طرح سے خدا و معاد پر ایمان سے نبوتِ انبیاء اور کتب آسمانی پر ایمان کا نتیجہ نکالا جاتا ہے (غور کیجئے)۔

۳ - نماز کی اہمیت : مندرجہ بالا آیت میں تمام دینی احکام میں سے صرف نماز کی طرف اشارہ ہوا ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ نماز خدا سے رشتہ جوڑنے اور اس کے ساتھ ربط کا مظہر ہے اور اسی سبب سے تمام عبادات سے برتر و بالاتر ہے۔ بعض کے عقیدہ کے مطابق ان آیات کے نزول کے وقت اسلامی فریضہ فقط نماز ہی تھا[۱]

۹۳- وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ○

## ترجمہ

۹۳- اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا کہ جو خدا پر جھوٹ باندھے، یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی نازل کی گئی ہے حالانکہ اس پر وحی نازل نہ ہوئی ہو اور وہ شخص کہ جو یہ کہے کہ میں بھی ایسا ہی کلام جیسا کہ اللہ نے نازل کیا ہے نازل کروں گا اور اگر تم ان ظالموں کو اس وقت دیکھو جب کہ یہ موت کے شدائد میں گھرے ہوں گے

---

۱ تفسیر المنار جلد ۷ صفحہ ۶۲۲۔

اور فرشتے ہاتھ پھیلائے انہیں کہہ رہے ہوں گے کہ اپنی جان (اور روح) کو باہر نکالو۔ آج تم اُن دروغ گوئیوں کے بدلے جو تم نے خدا پر باندھی تھیں اور اس کی آیات کے سامنے جو تکبر تم کیا کرتے تھے اس کے بدلے ذلیل کرنے والے عذاب دیکھو گے (اور اس دن ان کی حالت پر تمہیں افسوس ہوگا)۔

## شانِ نزول

اس آیت کی شانِ نزول کے سلسلہ میں منابع حدیث اور کتب تفاسیر میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن سعد نامی ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جو کاتب وحی تھا، پھر اس نے خیانت کی تو پیغمبرؐ نے اسے دھتکار دیا (اور اپنے پاس سے نکال دیا) اس کے بعد اس نے یہ دعویٰ کیا کہ میں بھی قرآنی آیات جیسی آیات لا سکتا ہوں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت یا اس کا کچھ حصہ مسیلمہ کذاب کے بارے میں نازل ہوا ہے کہ جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں میں سے تھا۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مسیلمہ کا قصہ پیغمبر اکرمؐ کی عمر کے آخری زمانے کا ہے اور یہ سورہ مکی سورتوں میں سے ہے، اس شانِ نزول کے طرفدار یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ یہ آیت اس سورہ کی چند دوسری آیات کی طرح مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے اس سورہ کی آیات کے درمیان قرار دے دی گئی ہے۔

لیکن ہر صورت میں قرآن کی دوسری تمام آیات کی مانند کہ جو خاص حالات میں نازل ہوئی ہیں اور ان کا مضمون و مطلب کلی اور عمومی ہے اس آیت کا مضمون و مطلب بھی کلی و عمومی ہے، اور ایسے تمام مدعیان نبوت اور ان جیسے تمام لوگوں پر محیط ہے۔

## تفسیر

گذشتہ آیات کے بعد کہ جن میں کسی بھی شخص پر کتب آسمانی کے نزول کی نفی کے بارے میں یہود کی گفتگو کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، اس آیت میں دوسرے ایسے گنہگاروں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو ان کے نقطۂ مقابل میں ہیں اور اپنے اوپر وحی آسمانی کے نزول کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ وہ بالکل جھوٹ بولتے ہیں۔

حقیقت میں زیر بحث آیت میں اس قسم کے افراد کے تین گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن پہلے کہتا ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا کہ جو خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں کسی آیت کی تحریف کرتے ہیں، اور خدا کے کلاموں میں سے کسی کو بدل دیتے ہیں (ومن اظلم ممن افترى على الله كذبًا)۔

دوسرا گروہ ان کا ہے جو نبوت اور وحی کا دعویٰ کرتے ہیں جب کہ نہ وہ پیغمبر ہیں اور نہ ہی اُن پر وحی نازل

ہوتی ہے، ( او قال اوحی الی ولم یوح الیه شیءٌ )۔

تیسرا گروہ ان کا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے انکار کے طور پر یا تمسخر اور استہزاء سے کہتے ہیں کہ ہم بھی اس قسم کی آیات نازل کر سکتے ہیں حالانکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں اور وہ اس کام کی کوئی قدرت و طاقت نہیں رکھتے ( ومن قال سانزل مثل ما انزل الله )۔

ہاں یہ سب کے سب ستم گر ہیں اور ان سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہے کیونکہ وہ خدا کے بندوں پر راہ حق کو بند کر دیتے ہیں اور انہیں راستے سے ہٹا کر سرگرداں کر دیتے ہیں، اور سچے رہبروں کی ہدایت کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوگا کہ ایسے افراد جو رہبری کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتے وہ رہبری کا دعویٰ کریں۔ وہ بھی خدائی اور آسمانی رہبری کا۔

اگرچہ آیت مدعیان نبوت و وحی سے ربط رکھتی ہے، لیکن اس کی روح ان تمام افراد پر محیط ہے جو جھوٹے طریقہ سے کسی ایسے مقام کا دعویٰ کریں کہ جس کے وہ اہل نہیں ہیں۔

اس کے بعد اس قسم کے افراد کی دردناک سزائیں بیان کی گئی ہے: اے پیغمبر! اگر تم ان ظالموں کو اُس وقت میں دیکھو جب کہ یہ موت اور جان کنی کے شدائد میں غرق ہوں گے اور روح قبض کرنے والے فرشتے ہاتھ پھیلائے ہوئے ان سے کہہ رہے ہوں گے کہ اپنی جان کو باہر نکالو، تو تم دیکھو گے کہ ان کی حالت بہت ہی دردناک اور افسوس ناک ہے ( ولو تری اذ الظّٰلمون فی غمرات[1] الموت والملائكة باسطوا ایدیهم اخرجوا انفسكم )۔

اس حالت میں عذاب کے فرشتے اُن سے کہتے ہیں: آج تم دو کاموں کی وجہ سے ذلیل و خوار کرنے والے عذاب میں گرفتار ہو گے، پہلا یہ کہ تم خدا پر جھوٹ باندھتے تھے اور دوسرا یہ کہ اس کی آیات کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے ( الیوم تجزون عذاب الهون بما كنتم تقولون علی الله غیر الحق وكنتم عن اٰیاته تستكبرون )۔

## چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ نبوت کے جھوٹے دعویداروں اور بناوٹی رہنماؤں اور رہبروں کا جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں آیت میں بدترین ظالم کی حیثیت سے تعارف کرایا گیا ہے اور حقیقت میں اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم نہیں ہے کہ کسی کی فکر کو چرالیا جائے اور اُس کے عقیدے کو خراب کر دیا جائے اور راہ سعادت اس پر بند کر دی جائے اور اُسے اپنی فکری نوآبادی بنا لیا جائے۔

۲۔ باسطوا ایدیهم کا جملہ ممکن ہے اس معنی میں ہو کہ قبض روح کرنے والے فرشتے ہاتھ پھیلاتے ہی ان کی روح

---

[1] "غمرات" جمع ہے "غمرة" (بروزن "ضربه") کی، جو اصل میں کسی چیز کے آثار کو ختم کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد اس کثیر پانی کو جو کسی چیز کے تمام چہرہ کو چھپا دے، نیز ان شدائد، مشکلات اور مصائب کو بھی غمرہ کہا جانے لگا جو انسان کو اپنے حلق کی طرف کھینچیں۔

کو قبض کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں سزا دینے کی ابتدا کرنے کے لیے ہاتھ پھیلانے کے معنی میں ہو۔

۳۔ اخرجوا انفسکم (اپنی جان اور روح کو باہر نکالو) حقیقت میں یہ قبض روح کرنے والے فرشتوں کی طرف سے اس قسم کے ظالموں کے لیے ایک قسم کی تحقیر و تذلیل ہے۔ ورنہ روح و جان کا دینا خود ظالموں کا اپنا کام نہیں ہے، بلکہ یہاں فرشتوں ہی کا کام ہے، جیسا کہ کسی قاتل کو موت کے گھاٹ اتارتے وقت کہتے ہیں کہ اب موت کا مزہ چکھ۔ بہرحال ان کی یہ تحقیر و تذلیل اس تحقیر کے مقابلہ میں ہے کہ جو انہوں نے آیات خدا، انبیاء اور بندگان خدا کے بارے میں کی تھی۔

ضمنی طور پر یہ آیت روح کے استقلال اور جسموں سے ایک جداگانہ شئے ہونے پر ایک اور گواہ بھی ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے گنہگاروں کی سزا جان دینے اور موت کے وقت سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔

۹۴۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ ۖ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ ۚ لَقَد تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ۝

## ترجمہ

۹۴۔ تم سب ہماری بارگاہ میں اکیلے لوٹ کر آئے ہو اسی طرح جیسا کہ پہلے دن ہم نے تمہیں خلق کیا تھا اور جو کچھ ہم نے (دنیا میں) تمہیں عطا کیا تھا اُسے (وہیں دنیا میں ہی) اپنے پس پشت ڈال آئے ہو اور وہ شفاعت کرنے والے کو جنہیں تم اپنی شفاعت میں شریک سمجھتے تھے انہیں ہم تمہارے ساتھ نہیں دیکھتے۔ تمہارے پیوند اور رشتے قطع ہو گئے ہیں اور وہ تمام چیزیں کہ جنہیں تم اپنا سہارا خیال کرتے تھے وہ تم سے دور اور گم ہو گئی ہیں۔

## شان نزول

تفسیر مجمع البیان، تفسیر طبری اور تفسیر آلوسی میں منقول ہے کہ مشرکین میں سے نضر بن حارث نامی ایک شخص نے

کہا کہ لات اور عزیٰ (عربوں کے دو مشہور بت) قیامت کے دن میری شفاعت کریں گے، تو اُوپر والی آیت نازل ہوئی اور اُسے اور اُس جیسے لوگوں کو جواب دیا گیا۔

# تفسیر

## گمشدہ لوگ

گذشتہ آیت میں موت کے آستانے پر ظالموں کے کچھ حالات کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ اس آیت میں وہ گفتگو جو خدا موت کے وقت یا میدانِ قیامت میں ورود کے وقت اُن سے کرے گا منعکس کی گئی ہے۔

ابتداء میں ارشاد ہوتا ہے: آج سب اکیلے ہی اسی طرح جیسا کہ ہم نے تمہیں پہلے دن پیدا کیا تھا ہماری طرف لوٹ رہے ہو (ولقد جئتمونا فرادیٰ کما خلقناکم اول مرۃ)۔

"اور جو مال ہم نے تمہیں (دنیا میں) بخشا تھا اور وہ زندگی میں تمہارا سہارا تھا، سب کا سب پس پشت ڈال کر خالی ہاتھ آئے ہو" (وترکتم ما خولناکم وراء ظھورکم)۔[1]

اسی طرح "وہ بت کہ جنہیں تم اپنے شفیع خیال کرتے تھے، اور انہیں اپنی سرنوشت میں شریک سمجھتے تھے ان میں سے کسی کو ہم تمہارے ساتھ نہیں دیکھ رہے" (وما نریٰ معکم شفعاءکم الذین زعمتم انھم فیکم شرکاء)۔

حقیقت میں تمہارا اجتماع پراگندگی سے دوچار ہوگیا اور تمام رشتے تم سے ٹوٹ گئے (لقد تقطع بینکم) اور وہ تمام سہارے جن پر تم بھروسہ کیے ہوئے تھے نابود ہوگئے اور کھو گئے (وضل عنکم ما کنتم تزعمون)۔

عرب کے مشرک اور بت پرست تین چیزوں پر تکیہ کرتے تھے۔

۱۔ وہ قبیلہ و عشیرہ کہ جس کے ساتھ وہ وابستہ ہوتے تھے۔

۲۔ وہ مال و دولت کہ جو انہوں نے اپنے لیے اکٹھا کر رکھا تھا اور

۳۔ وہ بت کہ جنہیں وہ انسان کی سرنوشت کے تعین میں خدا کا شریک اور خدا کی بارگاہ میں شفیع سمجھتے تھے۔ آیت کے تینوں جملوں میں سے ہر ایک میں ان تینوں میں سے ایک ایک بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ وہ سب موت کے وقت کس طرح انسان سے الوداع ہوتے ہیں اور اُسے تن تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔

## دو اہم نکات

۱۔ اِس آیت کا اُس آیت کے بعد کہ جس میں موت کے وقت روح قبض کرنے والے فرشتوں کی گفتگو بیان کی گئی

---

[1] خولناکم "خول" (بروزن "عمل") کے مادہ سے اصل میں ایسی چیز کے معنی میں ہے جو سرپرستی، تدبیر اور ادارت کی محتاج ہو اور عام طور پر اموال اور ایسی مختلف نعمتوں کے لیے بولا جاتا ہے جو خدا انسان کو بخشتا ہے۔

تھی قرار پاتا اور اسی طرح "تم نے اپنے اموال پس پشت ڈال دیئے" کے جملے کی طرف توجہ کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب بھی موت کے وقت ان سے ہوگا لیکن یہ خطاب خدا کی طرف سے ہوگا۔ البتہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب میدان قیامت میں وارد ہونے کے بعد ہوگا۔ تاہم (اس سے) آیت کے مقصد اور ہدف اصلی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔

۲۔ یہ آیت اگرچہ مشرکین عرب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن حقیقت میں یہ ان کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتی۔

اس دن تمام رشتے، مادی تعلقات، تمام خیالی اور بناوٹی معبود، تمام سہارے جو انسان اس جہان میں اپنے لیے بنائے ہوئے تھا اور انہیں اپنی بدبختی کے دن کے لیے دوست اور مددگار خیال کرتا تھا کلی طور پر اس سے جدا ہو جائیں گے، وہ خود رہ جائیں گے اور اس کے اعمال، وہ ہوگا اور اس کا خدا، اور باقی سب درمیان سے چلے جائیں گے اور قرآن کی تعبیر کے مطابق وہ سب کے سب گم ہو جائیں گے۔ یعنی وہ اس طرح سے حقیر و پست اور ناشناس ہو جائیں گے کہ نگاہ میں ہی نہیں آئیں گے۔

۹۵۔ اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ؕ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ ○

۹۶۔ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ○

## ترجمہ

۹۵۔ خدا دانے اور گٹھلی کو چیرنے والا ہے اور زندہ کو مردہ سے پیدا کرتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے۔ یہ ہے تمہارا خدا، پس تم حق سے کیسے منحرف ہوتے ہو۔

۹۶۔ وہ صبح کو شگافتہ کرنے والا ہے، اور اس نے رات کو سکون کا باعث اور آفتاب و ماہتاب کو حساب کا ذریعہ قرار دیا ہے، یہ دانا و توانا خدا کی تقدیر ہے۔

---

# تفسیر

## طلوعِ صبح کرنے والا

دوبارہ روئے سخن مشرکین کی طرف کرتے ہوئے قرآن توحید کے دلائل کو اسرار کائنات، نظام آفرینش اور خلقت کی تعجب خیزیوں کے زندہ نمونوں اور پرکشش عبارتوں کے ساتھ تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

پہلی آیت میں زمین کے تین قسم کے عجیب و غریب شاہکاروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں آسمان میں ظاہر ہونے والی تین قسموں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پہلے کہتا ہے: خدا دانے اور گٹھلی کا چیرنے والا ہے (ان اللہ فالق الحب والنوی) "فالق" "فلق" کے مادہ سے (بروزن "فرق") کسی چیز کو شگافتہ کرنے اور اس کے ایک حصے کو دوسرے سے جدا کرنے کے معنی میں ہے[1]

"حب" "دحبۃ" غذائی دانوں کے معنی میں ہے، مثلاً گندم، جو اور وہ چیزیں جو کاٹنے کے قابل ہیں[2]

البتہ بعض اوقات دوسرے گھاس پھوس کے دانوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

"نوی" گٹھلی کے معنی میں ہے اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ یہ کھجور کی گٹھلی کے ساتھ مخصوص ہے، شاید اس بنا پر ہو کہ عرب اپنے ماحول کے مخصوص حالات کی بنا پر جب یہ کلمہ استعمال کرتے تھے تو ان کی توجہ کھجور کی گٹھلی کی طرف ہوتی تھی۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تعبیر میں کونسا نکتہ پوشیدہ ہے۔

اس بات پر خاص طور سے توجہ رکھنا چاہیے کہ ایک کسی پودے کی زندگی میں اہم ترین لحظہ وہی ہے جب دانہ اور گٹھلی شگافتہ ہو رہی ہو کہ جو ایک بچہ کی پیدائش کی طرح ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے کا زمانہ شمار ہوتا ہے اور اس لمحے اس کی زندگی میں ایک اہم ترین انقلاب رونما ہوتا ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ہری گھاس اور نباتات کے دانے اور گٹھلیاں اکثر بہت ہی زیادہ محکم اور مضبوط ہوتی ہیں۔

اگر کھجور کی گٹھلی اور دوسرے پھلوں مثلاً آڑو اور بعض جو بات کی گٹھلیوں پر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ نطفۂ حیاتی کہ جو حقیقت میں ایک پودا اور ایک چھوٹا سا درخت ہے بہت ہی محکم قلعہ میں محصور ہے۔ لیکن کارخانۂ آفرینش اس ناقابلِ نفوذ قلعہ کو تسلیم و رضا کی ایسی خاصیت عطا کرتا ہے اور اس نرم و نازک کونپل کو جو گٹھلی اور دانے کے اندر پرورش پاتی ہے ایسی قدرت و طاقت بخشتا ہے کہ وہ اس کی دیواروں

---

[1] و [2] مفردات راغب صفحہ ۳۸۵ اور ۱۰۵۔

کو چیر کر اس کے اندر سے سر باہر نکال کر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ واقعاً یہ عالم نباتات میں ایک عجیب و غریب قسم کا حادثہ ہے کہ قرآن جس کی طرف توحید کی ایک نشانی کے طور پر اشارہ کر رہا ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ زندہ موجودات کو وہ مردہ سے باہر لاتا ہے اور مردہ موجودات کو زندہ سے (یخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی)۔

حقیقت میں یہ جملہ کہ جس کی نظیر قرآن میں بارہا نظر سے گزری ہے، موت و حیات کے نظام اور ان کے ایک سے دوسرے میں تبدیل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ بعض اوقات سمندروں کی تہ میں اور جنگلوں، صحراؤں اور بیابانوں کی گہرائیوں میں بے جان خشک مواد سے زندگی کے طرح طرح کے چہرے تیار کر کے باہر بھیجتا ہے۔ ایسا ایسے مواد کو جن میں سے ہر ایک زہر قاتل کا کام کرتا ہے ترکیب دے کر حیات بخش مواد تیار کر لیتا ہے اور بعض اوقات اس کے برعکس طاقتور زندہ موجودات کو معمولی سی تبدیلی کے ساتھ ایک بے جان موجود میں تبدیل کر دیتا ہے۔ زندہ موجودات کی زندگی کا مسئلہ خواہ وہ موجودات نباتات سے ہوں یا حیوانات میں سے، پیچیدہ ترین مسائل میں سے ہے ابھی تک انسانی علم و دانش اس کے اسرار سے پردہ نہیں اٹھا سکے اور نہ ہی اس کے پوشیدہ رازوں کو معلوم کر سکے کہ کس طرح سے طبیعی عناصر اور خشک مواد ایک عظیم حرکت کے ساتھ زندہ موجود میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ کسی دن انسان جیسے کہ ایک مشین کے پرزوں کو جوڑ کر جو پہلے سے بنے ہوئے ہوتے ہیں مشین بنا لیتا ہے اسی طرح سے مختلف طبیعی تراکیب سے استفادہ کرتے ہوئے بہت ہی پیچیدہ طریقوں کے ساتھ کوئی زندہ موجود بنا ڈالے لیکن نہ تو آج بشر کا عجز و ناتوانی اور نہ ہی آئندہ زمانے میں اس کام پر قادر ہونے کا احتمال، زندگی اور اس کے پیچیدہ نظام کے ایک عالم و قادر مبداء کی طرف سے ہونے کی بات کی اہمیت کو کم کر سکتی ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن وجود خدا کے اثبات کے لیے بارہا اسی مسئلہ کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ جیسے عظیم و بزرگ پیغمبر بھی نمرود اور فرعون جیسے سرکشوں کے مقابلے میں زندگی کے ظہور اور اس کی حکایت کے ذریعہ قادر و حکیم مبداء عالم کے وجود پر استدلال کرتے تھے۔

ابراہیمؑ نمرود سے کہتے ہیں:

رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ۔

میرا خدا وہ ہے کہ جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ (بقرہ - ۲۵۸)

حضرت موسیٰؑ فرعون کے مقابلہ میں کہتے ہیں:

وَ اَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخرَجنَا بِهٖۤ اَزوَاجًا مِّن نَّبَاتٍ شَتّٰى

میرا پروردگار وہ ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا اور نباتات کے طرح طرح کے جوڑے وجود میں لایا۔ (طٰہٰ - ۵۳)

البتہ اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ صرف بے جان مواد سے زندہ موجودات کی پیدائش روئے زمین پر

زندگی کی پیدائش کے آغاز میں نہیں تھی۔ بلکہ اب بھی پانی اور دیگر مواد کو زندہ موجودات کے خلیوں کے ساتھ جذب کر کے حقیقت میں ان بے جان موجودات کے جسم پر لباس حیات پہنایا جاتا ہے۔ اس بناء پر وہ قانون جو آج کے علوم طبیعی کی رو سے مسلم ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ زمین کے موجودہ حالات و کوائف میں کوئی بے جان موجود جاندار موجود میں تبدیل نہیں ہو سکتا، اور جہاں کہیں بھی کوئی زندہ موجود پیدا ہوگا وہ حتماً اور یقیناً کسی دوسرے زندہ موجود کے تخم سے ہوگا، یہ نظریہ اس سے جو کچھ ہم نے کہا ہے کوئی اختلاف نہیں رکھتا۔ (غور کیجیے گا)

ان روایات سے جو اس آیت کی تفسیر میں یا اس کی مشابہ دوسری آیات کی تفسیر میں آئمہ اہل بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد صرف مادی حیات و موت ہی نہیں ہے بلکہ یہ معنوی موت و حیات کو بھی اپنے دامنِ مفہوم میں لیے ہوتے ہے۔[1]

ہم صاحب ایمان افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ بے ایمان آباؤ اجداد سے وجود میں آتے ہیں، اور شریر، آلودہ گناہ و بے ایمان افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ پاک افراد کی نسل میں سے ہیں اور وہ قانون وراثت کو اپنے ارادہ و اختیار سے توڑ رہے ہیں، جو کہ خالق کائنات کی عظمت کی ایک اور نشانی ہے کہ اس نے اس قسم کی قدرت و ارادہ انسان کو بخشا ہے۔

ایک اور نکتہ کہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ "یخرج" جو کہ فعل مضارع ہے "مخرج" کی طرح جو کہ اسم فاعل ہے استمرار پر دلالت کرتا ہے یعنی مردہ موجودات سے حیات کی پیدائش اور زندہ موجودات سے مُردوں کا پیدا ہونا جہانِ آفرینش کا ایک دائمی اور عمومی نظام ہے۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر اور مطلب کو محکم بنانے کے لیے کہا گیا ہے: یہ ہے تمہارا خدا، اور یہ ہیں اس کی لامتناہی علم و قدرت کے آثار، تو ان حالات میں تم حق سے کس طرح منحرف ہوتے ہو اور وہ تمہیں باطل کی راہ کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں (ذالکم اللہ فانی تؤفکون)۔

دوسری آیت میں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تین نجومی و آسمانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، پہلے کہا گیا ہے، خدا صبح کا شگافتہ کرنے والا اور طلوعِ صبح کرنے والا ہے (فالق الاصباح)۔

"فلق" (بروزن خلق) اصل میں شگاف ڈالنے کے معنی میں ہے اور یہ جو صبح کو فلق کہتے ہیں تو یہ بھی اسی مناسبت سے ہے، "اصباح" و "صبح" دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔

مندرجہ بالا تعبیر بہت ہی موزوں اور خوبصورت تعبیر ہے جو یہاں استعمال ہوئی ہے۔ کیونکہ رات کی تاریکی کو ایک موٹے پردے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس کو سفید دم کی طرح کی روشنی چاک کر کے علیحدہ کر دیتی ہے اور یہ صورت صبح صادق پر بھی منطبق ہوتی ہے اور صبح کاذب پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ صبح کاذب

---

[1] اصول کافی جلد دوم باب طینۃ المؤمن والکافر، تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۵۴۴۔

کم رنگ روشنی کو کہا جاتا ہے جو رات کے آخری حصہ میں ایک عمودی شکل میں مشرق کی جانب آسمان پر پھیل جاتی ہے اور وہ ایک شگاف سا ہوتا ہے۔ جو مشرق سے مغرب کی طرف رات کے تاریک و سیاہ پردے میں ظاہر ہوتا ہے اور صبح صادق کہ جو اس کے بعد طلوع کرتی ہے ایک سفید و درخشاں اور خوبصورت جھالر کی شکل میں ہوتی ہے جو ابتدا میں اُفقِ مشرق کے عرض میں آشکار ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رات کی سیاہ چادر کو نیچے کی طرف سے شمالاً جنوباً پھاڑتی ہوئی دور تک بڑھتی چلی جا رہی ہے اور اوپر کی طرف تدریجاً بڑھتے ہوئے سارے آسمان پر پھیل جاتی ہے۔

قرآن نے علاوہ اس کے کہ بارہا نعمتِ نور و ظلمت اور نعمت شب و روز کا ذکر کیا ہے یہاں طلوعِ صبح کے مسئلہ کا حوالہ دیا ہے کہ جو خداوند تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ آسمان میں ظاہر ہونے والی روشنی زمین کی فضا کے وجود کا نتیجہ ہے (یعنی ہوا کی وہ ضخیم و دبیز تہ کہ جس نے اس کرۂ ارض کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے) کیونکہ اگر کرۂ زمین کے اطراف میں کرۂ ماہ کی طرح یہ فضا موجود نہ ہوتی تو نہ بین الطلوعین و فلق کا وجود ہوتا اور نہ ہی آغاز شب کی سفیدی اور شفق ہوتی، بلکہ آفتاب ایک ناخواندہ مہمان کی طرح بغیر کسی اطلاع اور تمہید کے افق مشرق سے سر نکالتا اور اپنا خیرہ کرنے والا نور ان آنکھوں میں جو تاریکی شب کی عادی ہو چکی ہوتیں فوراً اور ایک دم چھڑک دیتا اور غروب کے وقت ایک فراری مجرم کی طرح اچانک نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اور ایک ہی لمحہ میں تاریکی اور وحشت ناک ظلمت تمام جگہوں کو گھیر لیتی۔ لیکن فضائے زمین کا وجود اور وہ فاصلہ جو رات کی تاریکی اور دن کی روشنی کے درمیان طلوع و غروبِ آفتاب کے وقت ہوتا ہے انسان کو تدریجاً ان دو متضاد ظاہر ہونے والی چیزوں میں سے ہر ایک کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے اور نور سے ظلمت میں تبدیلی اور ظلمت سے نور میں تبدیل تدریجاً اور آہستہ آہستہ بالکل پسندیدہ اور قابل برداشت صورت میں انجام پاتی ہے۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ رات کے وقت ایک روشن اور پر نور کمرے میں جب اچانک بلب بجھ جاتا ہے تو سب کے لیے کیسی تکلیف دہ حالت ہوتی ہے۔ پھر گھنٹہ بھر بجلی نہ آئے اور پھر بغیر کسی تمہید کے بلب روشن ہو جائے تو پھر بھی ایک نئی قسم کی تکلیف سب کو لاحق ہو جاتی ہے۔ بلب کی خیرہ کرنے والی روشنی آنکھوں کو تکلیف دیتی ہے اور ہم اطراف کی چیزوں کو دیکھنے کے لیے زحمت سے دوچار ہو جاتے ہیں اور اگر ایسا ہی بار بار ہوتا رہے تو یقیناً آنکھوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ طلوع صبح کرنے والے نے اس مشکل کو نوع بشر کے لیے بہت ہی بہترین طریقے سے حل کر دیا ہے[1]

لیکن اس بنا پر کہ کہیں یہ خیال نہ پیدا ہو کہ طلوعِ صبح اس بات کی دلیل ہے کہ تاریکی و ظلمت ایک نامطلوب چیز ہے اور یا یہ سزا اور سلبِ نعمت ہے لہٰذا بلا فاصلہ قرآن فرماتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے "رات کو سکون و آرام کا باعث قرار دیا ہے" (وجعل اللیل سکناً)۔

---

[1] علماء ہیئت کہتے ہیں کہ طلوع صبح اس وقت شروع ہوتا ہے جب آفتاب مشرق کی طرف ۱۸ درجہ فاصلہ پر افق پر پہنچ جائے اور رات کی تاریکی اسی وقت تمام جگہوں کو گھیر لیتی ہے اور شفق گم ہو جاتی ہے جب سورج مغرب کی طرف ۱۸ درجہ افق میں نیچے کی طرف چلا جاتا ہے۔

یہ ایک مسلّہ حقیقت ہے کہ انسان نور اور روشنی میں جستجو اور کوشش کی طرف مائل ہوتا ہے، خون سطح بدن کی طرف رواں دواں ہوتا ہے اور تمام خلیے آمادۂ عمل ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ روشنی میں نیند اتنی آرام دہ نہیں ہوتی لیکن ماحول جتنا تاریک ہوگا نیند اتنی ہی گہری اور آرام دہ ہوگی۔ کیونکہ تاریکی میں خون بدن کے اندر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور خلیے ایک طرح کے آرام و استراحت میں ڈوب جاتے ہیں۔ اسی سبب سے دنیائے طبیعت میں نہ صرف حیوانات بلکہ نباتات بھی رات کی تاریکی میں سو جاتے ہیں اور صبح کی پہلی شعاع کے ظاہر ہوتے ہی جنبش اور فعالیت شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مشینی دنیا کے لوگ آدھی رات کے بعد تک بیدار رہتے ہیں اور دن کو طلوع آفتاب کے بہت دیر بعد تک سوئے رہتے ہیں اور بدن کی صحت و سلامتی کو ضائع کر دیتے ہیں۔

اُن احادیث میں جو اہلِ بیت علیہم السلام کے طریقوں سے وارد ہوئی ہیں، ہم ایسے دستور العمل پڑھتے ہیں جو سب کے سب یہی مفہوم لیے ہوئے ہیں۔ منجملہ ان کے نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے اپنے ایک موالی کو حکم دیا کہ رات کے ابتدائی حصّہ میں اپنا سفر جاری نہ رکھو کیونکہ خدا نے رات کو سکون و آرام کے لیے قرار دیا ہے اور اسے قیام کا وقت قرار دیا ہے نہ کہ کوچ کرنے کا۔ رات کے وقت اپنے بدن کو آرام پہنچاؤ اور استراحت کرو۔[1]

ایک حدیث میں جو کتاب کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے آپ نے فرمایا:

تزوج باللیل فانہ جعل اللیل سکنًا

مراسم ازدواج کو رات کے وقت قرار دے کیونکہ رات باعث سکون و آرام ہے۔[2]

(جیسا کہ ازدواج اور صحیح طور پر جنسی آمیزش بھی آرام بخش ہے)۔

اور کتاب کافی ہی میں ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ امام علی بن الحسین علیہ السلام اپنے غلاموں کو یہ حکم دیا کرتے تھے کہ وہ رات کے وقت اور طلوع فجر سے پہلے کبھی بھی جانوروں کو ذبح نہ کریں اور فرماتے تھے:

ان اللہ جعل اللیل سکنا لکل شیء

خدا نے رات کو ہر چیز کے لیے راحت و آرام کا سبب قرار دیا ہے۔[3]

اس کے بعد خداوند تعالیٰ نے اپنی تیسری نعمت اور اپنی عظمت کی نشانی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ: آفتاب و ماہتاب کو تمہاری زندگی میں حساب و کتاب کا ذریعہ قرار دیا ہے (و الشمس و القمر حسبانًا)۔

"حسبان" (بروزن "نقصان") مصدر ہے مادہ "حساب" سے اور حساب کرنے کے معنی میں ہے۔ یہاں ممکن ہے یہ مراد ہو کہ ان دو آسمانی کرّوں کی منظم گردش اور سیر مرتب (البتہ ان کی حرکت سے مراد وہ حرکت ہے جو ہمیں نظر آتی ہے جو زمین کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے) اس بات کا سبب بنتی ہے کہ تم ا[illegible]گی کے مختلف پروگراموں کو نظام و حساب کے ماتحت کر لو۔ جیسا کہ ہم اُوپر والی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

---

[1] و [2] و [3] تفسیر صافی ذیل آیہ۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ شاید اس جملے سے یہ مراد ہو کہ خود یہ دونوں آسمانی کرے ایک نظام کے ماتحت اور ایک حساب سے رواں دواں ہیں۔

اس بنا پر پہلی صورت میں خداوند تعالیٰ کی ایک نعمت کی طرف اشارہ ہے جو اس نے انسانوں کو دی ہے اور دوسری صورت میں توحید کی ایک نشانی اور وجودِ خدا کے اثبات کی ایک دلیل کی طرف اشارہ ہے اور ممکن ہے کہ دونوں معانی کی طرف اشارہ ہو۔

بہرصورت یہ بات بہت ہی جاذب توجہ ہے کہ لاکھوں سال سے کرۂ زمین آفتاب کے گرد اور ماہتاب زمین کے گرد گردش کر رہا ہے اور اس کے زیر اثر ہم اہلِ زمین کی نظر میں آفتاب کی ٹکیہ فلک کے بارہ برجوں کے سامنے گردش کر رہی ہے، اور چاند کی ٹکیہ اپنے منظم ہلال کے ساتھ اور تدریجی تغیر پذیری کے ساتھ اور ہر دفعہ ایک ترتیب سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ گردش اس قدر حساب شدہ ہے کہ ایک لمحہ بھر کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم سورج کے گرد گردشِ زمین کی مسافت پر غور کریں جو ایک بیضوی شکل کے مدار میں گردش کرتی ہے جس کی شعاع متوسط ۱۵۰ لاکھ کیلومیٹر ہے، حالانکہ آفتاب کی عظیم قوتِ جاذبہ اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور اسی طرح کرہ ماہ کہ جو خود اپنے دائرے جتنی مسافت کو شعاع متوسط کے ۳۸۴ ہزار کلومیٹر کے ساتھ طے کرتا ہے، جب کہ زمین کی عظیم قوتِ جاذبہ اسے ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ تو اس وقت ہم اس بات کی طرف متوجہ ہوں گے کہ ایک طرف سے ان کرات کی قوتِ جاذبہ میں اور دوسری طرف سے ان کرات کے درمیان مرکز سے گریز کی قوت میں کس قدر دقیق تعادل اور برابری برقرار ہے کہ جس سے ان کی سیرِ منظم میں ایک لحظہ کا وقفہ یا کوئی کمی زیادتی پیدا نہیں ہوتی اور ایسا ایک لامتناہی علم و قدرت کے بغیر ممکن نہیں کہ جو اس کی نقشہ کشی بھی کرے اور اسے باریک بینی کے ساتھ جاری بھی کرے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ خدا کی اندازہ گیری ہے جو توانا بھی ہے اور دانا بھی ہے (ذالك تقدير العزيز العليم)۔

۹۷۔ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۗ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○

## ترجمہ

۹۷۔ اور وہی ہے وہ ذات کہ جس نے تمہارے لیے ستارے قرار دیئے تاکہ تم خشکی اور دریا کی تاریکی میں ان کے ذریعہ ہدایت حاصل کرو۔ ہم نے ان لوگوں کے لیے کہ جو جانتے ہیں (اور جو اہل فکر و نظر ہیں) اپنی نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں۔

# تفسیر

گذشتہ آیت کے بعد کہ جس میں آفتاب و ماہتاب کی گردش کی طرف اشارہ ہوا تھا، یہاں پروردگار عالم کی ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہی ہے وہ ذات کہ جس نے تمہارے لیے ستارے قرار دیئے ہیں تاکہ تم ان کے ذریعے صحرا اور دریا کی تاریکی میں اپنے راستوں کو اندھیری راتوں میں پالو:

(وھو الذی جعل لکم النجوم لتھتدوا بھا فی ظلمات البر والبحر)۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ہم نے اپنی نشانیاں اور دلائل اہلِ فکر و نظر اور اہلِ فہم و فراست کے لیے کھول کر بیان کردی ہیں (قد فصلنا الآیٰت لقوم یعلمون)۔

انسان ہزارہا سال سے آسمان کے ستاروں اور ان کے نظام سے آشنا ہے۔ اگرچہ جس قدر انسانی علم و دانش بڑھتا جارہا ہے اسی قدر وہ اس نظام کی گہرائی میں زیادہ داخل ہوتا جارہا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ ہر زمانے میں اس کی وضع و کیفیت سے کم و بیش آشنا تھا۔ لہٰذا دریائی اور خشکی کے سفروں میں سمت کے تعین کا بہترین ذریعہ یہی ستارے تھے۔

خصوصاً وسیع و عریض سمندروں میں جہاں راستے اور منزل کے تعین کی کوئی نشانی اس کے پاس نہ ہوتی تھی، قطب نما بھی اُس زمانے میں ایجاد نہیں ہوا تھا، آسمانی ستاروں کے سوا اور کوئی قابلِ اعتماد ذریعہ بھی موجود نہیں تھا یہی ستارے تھے جو لاکھوں کروڑوں انسانوں کو گمراہی اور غرقاب سے نجات دیتے تھے اور انہیں منزل مقصود تک پہنچاتے تھے۔

صفحۂ آسمان پر چند رات پے در پے متواتر نگاہ کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ستاروں کی حالت و کیفیت ہر مقام پر ایک ہی جیسی ہے گویا کہ ستارے موتیوں کے دانوں کی طرح ہیں کہ جو ایک سیاہ کپڑے کے اُوپر ٹکے ہوئے ہیں اور آغازِ شب سے ہی اس کپڑے کو مشرق کی طرف سے مغرب کی طرف کھینچ دیا جاتا ہے اور وہ سب کے سب اس کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں اور زمین کے محور کے گرد گھوم رہے ہیں۔ جب کہ ان کے درمیانی فاصلوں میں بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ صرف ایک استثنا جو اس قانون کلی میں دکھائی دیتا ہے یہ ہے کہ کچھ ایسے ستارے بھی ہیں کہ جنہیں سیارہ کہتے ہیں اور ان کی اپنی مستقل اور مخصوص حرکات ہیں ان کی تعداد ۸ سے زیادہ نہیں ہے۔ ان میں سے ۵ آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں (عطارد، زہرہ، زحل، مریخ اور مشتری) لیکن باقی تین سیاروں (اورانوس، نپٹون اور پلوٹون) کو صرف دوربین کے ساتھ ہی دیکھا جا سکتا ہے (البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زمین بھی ایک سیارہ ہی ہے جو آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے تو ان کی مجموعی تعداد ۹ تک پہنچ جاتی ہے)۔

شاید قبل از تاریخ کے انسان بھی "ثوابت" اور "سیارات" کی وضع سے آشنا تھے کیونکہ انسان کے لیے

تاریک اور ستاروں بھری رات میں آسمان سے زیادہ دل کو لبھانے والا اور جاذب نظر کوئی منظر نہیں ہے۔ اسی بنا پر بعید نہیں کہ وہ بھی اپنے راستوں کو معلوم کرنے کے لیے ستاروں سے استفادہ کرتے ہوں۔

بعض روایات سے جو اہل بیت علیہم السلام کے طریق سے وارد ہوئی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت کی ایک اور تفسیر بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ستاروں سے مراد خدائی رہبر اور ہادیانِ راہ سعادت یعنی آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں کہ جن کے وسیلے سے لوگ زندگی کی تاریکیوں میں گمراہی سے نجات پاتے ہیں اور جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کی معنوی تفسیر آیت کی ظاہری اور جسمانی تفسیر کے منافی نہیں اور ہو سکتا ہے کہ آیت کی نظر دونوں ہی باتوں کی طرف ہو[1]

۹۸۔ وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ○

۹۹۔ وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

## ترجمہ

۹۸۔ اور وہی ہے وہ ذات کہ جس نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا حالانکہ بعض انسان پائیدار ہیں (ایمان یا خلقت کامل کے لحاظ سے) اور بعض ناپائیدار ہم نے اپنی آیات اُن لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں بیان کر دی ہیں۔

۹۹۔ اور وہی وہ ذات ہے کہ جس نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے طرح طرح کے نباتات

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۵۰۔

اُگائے۔ اُن سے سبز تنے اور شاخیں نکالیں اور اُن سے ترتیب کے ساتھ چنے ہوئے دانے اور کھجور کے گچھوں سے باریک دھاگوں کے ساتھ جڑے ہوئے خوشے باہر نکالے اور طرح طرح کے انگور، زیتون، اور انار کے باغ (پیدا کیے) جو ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں اور (بعض) غیر مشابہ (ہیں) جب اُن میں پھل آتا ہے تو تم اُس میں پھل لگنے اور اُس کے پکنے کی طرف نگاہ کرو کہ اس میں صاحبانِ ایمان کے لیے نشانیاں ہیں۔

# تفسیر

ان آیات میں بھی توحید اور خدا شناسی کے دلائل ہی بیان ہوئے ہیں۔ کیونکہ قرآن انسان کو اس ہدف کے لیے کبھی آفاق اور دور دراز کے جہانوں کی سیر کراتا ہے اور کبھی اُسے اپنے وجود کے اندر سیر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اسی کے جسم و جان میں موجود خدا کی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے۔ تاکہ وہ خدا کو ہر جگہ اور ہر چیز میں دیکھ لے۔

پہلے کہتا ہے: وہی وہ ذات ہے کہ جس نے تمہیں ایک انسان سے پیدا کیا ہے (وھو الذی انشأکم من نفس واحدۃ)۔

یعنی تم ان گوناگوں چہروں، مختلف ذوق و افکار اور تمام جذبہ ہائے وجودی میں وسیع تنوع کے باوجود ایک ہی فرد سے پیدا ہوتے ہو۔ اور اس سے خالق و آفریدگار کی انتہائی عظمت کا اظہار ہوتا ہے کہ اس نے ایک ہی مبداء سے یہ مختلف چہرے کس طرح پیدا کیے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس جملہ میں خلقت انسان کو "انشاء" سے تعبیر کیا ہے اور یہ لفظ جیسا کہ متون لغت سے معلوم ہوتا ہے ایسے ایجاد و ابداع کے معنی میں ہے کہ جس میں ترتیب و پرورش کی آمیزش ہو۔ یعنی نہ صرف یہ کہ خداوند تعالیٰ نے تمہیں بغیر کسی سابقہ تجربے کے پیدا کیا ہے بلکہ اُس نے تمہاری تربیت و پرورش کی ذمہ داری بھی اٹھائی ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ اگر کوئی پیدا کرنے والا کسی چیز کو پیدا کرکے پھر اُسے (بے سہارا) چھوڑ دے تو اس نے کوئی زیادہ قدرت نمائی نہیں کی۔ لیکن اگر وہ ہمیشہ کے لیے اُسے اپنی حمایت میں لے لے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی پرورش و تربیت سے غافل نہ ہو تو اس نے اپنی عظمت و رحمت کی مکمل نشاندہی کی ہے۔

ضمنی طور پر مندرجہ بالا جملے سے یہ توہم پیدا نہیں ہونا چاہیے، کہ جناب حوا ہماری پہلی ماں (بھی) آدمؑ سے پیدا ہوئی ہیں (جیسا کہ تورات کی فصل دوم سفر تکوین میں آیا ہے) لیکن چونکہ آدم و حوا روایات اسلامی کے مطابق ایک ہی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور دونوں ایک ہی جنس اور ایک ہی نوع ہیں لہٰذا نفس واحدۃ کے الفاظ آدم پر بولے گئے ہیں (ہم سورۂ نساء کی ابتدا میں بھی اس بارے میں بحث کر چکے ہیں)۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: افراد بشر کی ایک جماعت مستقر ہے اور ایک جماعت مستودع (فمستقر و مستودع)۔

"مستقر"، مادہ "قر" (بروزن "حر") سے سردی کے معنی میں ہے اور چونکہ ایسی سردی کہ جس کی ہوا تیز اور سخت ہو وہ انسان اور دوسرے موجودات کو خانہ نشین کر دیتی ہے۔ تو یہ لفظ سکون و توقف اور کسی جگہ قرار پانے کے معنی میں آیا ہے اور "مستقر" ثابت اور پائیدار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

"مستودع"، "ودع" (بروزن "منع") کے مادہ سے ترک کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ اس بنا پر کہ ناپائیدار امور بہت جلد اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں لہٰذا یہ لفظ ناپائیدار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور ودیعۃ (امانت) کو اس لیے ودیعہ کہتے ہیں کہ اُسے اپنی جگہ ترک کرنا چاہیے اور اصلی مالک کی طرف پلٹ جانا چاہیے۔

مندرجہ بالا گفتگو سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بعض انسان پائیدار ہیں اور بعض ناپائیدار اور اس بارے میں کہ یہاں ان دونوں تعبیرات سے کیا مراد ہے مفسرین کے درمیان بہت اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن اُن میں سے چند تفاسیر جو اپنی اصل حالت پر رہتے ہوئے بھی آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تضاد نہیں رکھتیں اور اُن سب کو ہی آیت کی تفسیر کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے اور وہ حقیقت سے قریب تر ہیں۔ ان میں سے پہلی یہ ہے کہ "مستقر" سے مراد وہ انسان ہیں کہ جن کی خلقت کامل ہوئی ہے اور وہ رحم مادر میں رہے ہیں یا روئے زمین پر قدم رکھا ہے۔ اور "مستودع" ان افراد کی طرف اشارہ ہے جن کی خلقت ابھی تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی اور وہ نطفہ کی صورت میں آباؤ اجداد کے صلب میں ہی ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "مستقر" روح انسان کی طرف اشارہ ہے کہ جو ایک پائیدار و برقرار چیز ہے اور "مستودع" جسم انسانی کی طرف اشارہ ہے جو ناپائیدار اور فانی ہے۔

بعض روایات میں ان دونوں تعبیرات کے لیے ایک معنوی تفسیر بھی بیان ہوئی ہے کہ "مستقر" ان انسانوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو پائیدار ایمان کے حامل ہیں اور "مستودع" ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو ناپائیدار ایمان رکھتے ہیں[1]

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ مذکورہ بالا دونوں تعبیریں نطفۂ انسان کو تشکیل دینے والے اجزائے اولیہ کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ نطفۂ انسان دو اجزاء ایک نطفہ مادہ (OVUM) اور دوسرا نطفہ نر (SPERM) سے تشکیل پاتا ہے، مادہ کا نطفہ تو رحم میں تقریباً ثابت اور مستقر ہے، لیکن نر کے نطفے متحرک جانداروں کی شکل میں اس کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کرتے ہیں اور (SPERM) کا پہلا فرد جو (OVUM) تک پہنچتا ہے وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے اور باقی کو پیچھے کی طرف دھکیل دیتا ہے اور یوں انسان کے تخم اوّل کی تشکیل ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں دوبارہ کہا گیا ہے: ہم نے اپنی نشانیوں کو ایک ایک کر کے تفصیل سے بیان کر دیا ہے تاکہ جو لوگ سمجھدار اور صاحب ادراک ہیں وہ سمجھ لیں (قد فصلنا الآیات لقوم یفقهون)۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۷۵۰۔

لغت کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "فقہ" ہر قسم کے علم و فہم کو نہیں کہتے بلکہ موجودہ معلومات سے غائب کی معلومات کا کھوج نکالنے کو کہتے ہیں [1] اس بنا پر ان طرح طرح کے چہروں اور مختلف جسمانی و روحانی قیافوں کے ساتھ انسان کی خلقت کی طرف توجہ کرنا اس لائق ہے کہ نکتہ سنج افراد اس میں غور کریں اور اپنے خدا کو پہچانیں۔

دوسری آیت وہ آخری آیت ہے جو ان سطروں کے سلسلے میں ہے یہ جہانِ خلقت کے عجائبات کے ذریعے خدا شناسی کی دعوت دیتی ہے۔

شروع میں پروردگارِ عالم کی اہم ترین اور بنیادی ترین نعمتوں میں سے ایک نعمت کی طرف کہ جسے تمام نعمتوں کی اصل، جڑ، بنیاد اور ماں سمجھا جا سکتا ہے اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ نباتات (سرسبز پودے) اور درختوں کا بننا اور رشد و نمو کرنا ہے، چنانچہ یہ آیت کہتی ہے وہی وہ ذات ہے جس نے (تمہارے لیے) آسمان سے پانی نازل کیا (وھو الذی انزل من السماء ماء)۔

یہ جو کہتا ہے کہ آسمان کی طرف سے (یعنی اُوپر کی طرف سے، کیونکہ لغت عرب میں آسمان ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو اُوپر کی طرف قرار پاتی ہو) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ روئے زمین میں پانی کے جتنے بھی منابع ہیں چاہے وہ چشمے ہوں یا دریا، نہریں ہوں یا گہرے کنویں، سب کے سب آخرکار بارش کے پانی کے محتاج ہیں۔ اسی لیے بارش کی کمی ان سب پر اثر انداز ہوتی ہے اور اگر خشک سالی طول پکڑ لے تو وہ سب کے سب خشک ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد بارش کے ایک واضح اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ: اسی کے ذریعے سے تمام اُگنے والی چیزوں کو ہم نے زمین سے نکالا ہے (فاخرجنا بہ نبات کل شیء)۔

مفسرین نے "نبات کل شیء" (ہر چیز کی گھاس) کی تفسیر میں دو احتمال کا ذکر کیا ہے۔ پہلا یہ کہ اس سے مراد ہر نوع اور ہر قسم کی ایسی نباتات ہیں جو ایک ہی پانی سے سیراب ہوتی ہیں اور ایک ہی زمین اور ایک ہی قسم کی مٹی میں پرورش پاتی ہیں اور یہ چیز آفرینش کے عجائبات میں سے ہے کہ یہ تمام قسم قسم کی نباتات اپنے خواص میں مکمل طور پر مختلف ہونے اور بعض اوقات متضاد ہونے اور مختلف شکلوں میں ہونے کے باوجود سب کی سب ایک ہی زمین میں اور ایک ہی پانی سے کیسے پرورش پاتی ہیں۔

دوسرا یہ کہ اس سے مراد وہ نباتات ہیں جن کی ہر کسی کو حاجت اور ضرورت ہے۔ یعنی پرندوں، چوپایوں، حشرات اور دریائی و صحرائی جانوروں میں سے ہر ایک ان نباتات سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ اور یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ایک ہی زمین سے اور ایک ہی پانی سے ہر ایک کی ضرورت کے مطابق غذا مہیا کی ہے اور یہ قدرت کا ایک عظیم شاہکار ہے کہ جو مثل ایک ہی معین مادے سے ایک باورچی خانہ میں ہزاروں قسم کی

---

[1] مفردات راغب صفحہ ۳۸۴۔

غذا مختلف سلیقہ اور مزاجوں کے لوگوں کے لیے مہیا کرتی ہے۔

اور اس سے بھی بڑھ کر لائق توجہ بات یہ ہے کہ نہ صرف صحراؤں کی اور خشکیوں کی گھاس اور سبزے بارش کے پانی کی برکت سے پرورش پاتے ہیں بلکہ بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی نباتات جو سمندر کے پانی کی موجوں کے درمیان اگتی ہیں اور سمندر میں رہنے والی مچھلیوں کی عمدہ خوراک بنتی ہیں، وہ بھی نور آفتاب اور بارش کے قطروں کے اثر سے رشد و نمو حاصل کرتی ہیں۔ میں یہ بات بھولتا نہیں ہوں کہ خلیج فارس کے جزائر کا رہنے والا ایک شخص جو شکار کی کمی کی شکایت کر رہا تھا اس کی علت و سبب کے بارے میں یہ کہہ رہا تھا کہ مچھلی کے شکار کی کمی خشک سالی کے سبب سے ہے اور وہ اس بات کا معتقد تھا کہ سمندر کے اندر بارش کے قطروں کا حیات بخش اثر خشکیوں میں بارش کے اثر سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

اس کے بعد اس جملے کی شرح کرتے ہوئے قرآن گیہوں اور درختوں کے ایسے اہم مواقع کی نشاندہی کرتا ہے کہ جو بارش کے پانی کے ذریعہ پرورش پاتے ہیں پہلے کہتا ہے: ہم نے اس (بارش کے پانی) کے ذریعہ گیہوں اور نباتات کے سبز تنوں کو زمین سے نکالا ہے اور چھوٹے سے خشک دانے سے ایسا ترو تازہ اور سرسبز تنا پیدا کیا ہے کہ جس کی لطافت (و نزاکت) اور زیبائی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے (فاخرجنا منه خضرًا)۔[1]

" اور ان سبز ڈنٹھلوں اور تنوں سے ایسے دانے کہ جو ایک دوسرے کے اوپر (موتیوں کی طرح) جڑے ہوئے ہوتے ہیں (جیسے مکئی اور گندم کے خوشوں میں) باہر نکالتے ہیں (نخرج منه حبًا متراكبًا)۔[2]

اسی طرح اس کے ذریعے کھجور کے درختوں سے سربستہ خوشے باہر نکالتے ہیں جن کے شگافتہ ہونے کے بعد باریک اور خوبصورت دھاگے جو خرما (کھجور) کے دانوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں اور بوجھ کی وجہ سے نیچے کی طرف کو جھکے ہوئے ہوتے ہیں، باہر نکلتے ہیں (ومن النخل من طلعها قنوان دانية)۔

" طلع " کا معنی کھجور کا سربستہ خوشہ ہے جو ایک خوبصورت سبز رنگ کے غلاف میں لپٹا ہوتا ہے، اور اس کے شگافتہ ہونے اور پھٹ جانے سے اس کے درمیان سے باریک سے دھاگے باہر نکل آتے ہیں اور وہی دھاگے بعد میں کھجور کے خوشوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ " قنوان " جمع ہے " قنو " (بروزن " صنف ") کی جو انہی باریک اور لطیف دھاریوں اور دھاگوں کی طرف اشارہ ہے۔

" دانية " نزدیک کے معنی میں ہے اور ہوسکتا ہے کہ ان دھاگوں کے ایک دوسرے کے قریب ہونے

---

[1] " خضر " بمعنی " اخضر " یعنی " سبز رنگ " ہے اس بنا پر تمام سبزوں کو یہاں تک کہ درختوں کی کونپلوں کو بھی شامل ہے لیکن اوپر والی آیت سے چونکہ اس میں غذائی دانوں کی طرف اشارہ ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خصوصیت سے زراعت مراد ہے۔

[2] " ترکب " کے مادہ سے " سواری " کے معنی میں ہے یعنی ایسے دانے جو ایک دوسرے پر سوار ہیں، اور زیادہ تر غذائی دانے ایسے ہی ہیں۔

کی طرف اشارہ ہو، یا زیادہ بوجھ کی وجہ سے ان کا جھکنا مراد ہو۔
اسی طرح ہم نے انگور، زیتون اور انار کے باغوں کی پرورش کی ہے (وجنات من اعناب والزیتون والرمان)۔
اس کے بعد عالم آفرینش کے ایک اور شاہکار کی طرف جس کا تعلق انہی درختوں کے ساتھ ہے اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، وہ ایک دوسرے کے ساتھ شباہت رکھتے بھی ہیں اور نہیں بھی رکھتے (مشتبھا وغیر متشابہ)۔
اسی سورہ کی آیہ ۱۴۱ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جس میں متشابہ اور غیر متشابہ کے وصف کا ذکر زیتون اور انار کے لیے کیا گیا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیہ میں بھی مذکورہ صفت انہی دو درختوں کے بارے میں ہے[1]
یہ دونوں درخت ظاہری شکل نیز شاخوں اور پتوں کی ساخت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ شباہت رکھتے ہیں۔ جب کہ پھل، ذائقہ اور خاصیت کے لحاظ سے ان میں بہت فرق ہے۔ ان میں سے ایک مؤثر اور قوی روغنی مادہ رکھتا ہے اور دوسرے میں ترش یا میٹھا مادہ ہوتا ہے جو بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ علاوہ ازیں بعض اوقات یہ دونوں درخت ایک ہی زمین میں پرورش پاتے ہیں اور ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں یعنی ایک دوسرے سے بہت زیادہ فرق بھی رکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں۔
یہ احتمال بھی اس آیت کی تفسیر میں موجود ہے کہ مندرجہ بالا عبارت میں درختوں اور پھلوں کی مختلف انواع واصناف کی طرف اشارہ ہو کہ بعض پھل اور درخت ایک دوسرے سے شباہت رکھتے ہیں اور بعض ایک دوسرے سے مختلف ہیں (یعنی ان دونوں صفات میں سے ہر ایک درختوں اور پھلوں کے ایک گروہ کے لیے ہے، لیکن پہلی تفسیر کے مطابق دونوں صفات ایک ہی چیز کے لیے تھیں)۔
اس کے بعد بحث کو پیکر درخت کے اعضاء سے موڑتے ہوئے اُن کے پھلوں سے متعلق بحث کرتے ہوئے کہتا ہے، ایک نظر درخت کے پھل کی طرف کرو جب کہ وہ ثمر آور ہوتے، اور اسی طرح اس کے پکنے کی کیفیت کی طرف نگاہ کرو کہ ان میں ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں خدا کی قدرت و حکمت کی واضح نشانیاں موجود ہیں (انظروا الی ثمرہ اذا اثمر وینعہ ان فی ذالکم لأیات لقوم یؤمنون)۔
اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو آج کے زمانے میں نباتات کی تحقیق کے بارے میں پھلوں کی پیدائش کی کیفیت اور ان کے پکنے کے سلسلہ میں کہا گیا ہے، وہ خاص نکتہ جس کا قرآن پھل کے بارے میں ذکر کرتا ہے واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پھلوں کا پیدا ہونا بعینہ جانداروں میں بچہ پیدا ہونے کی طرح ہے۔ زنطفے مخصوص ذرائع سے (ہوا کے چلنے یا حشرات وغیرہ کے سبب سے) مخصوص تھیلیوں سے جدا ہوتے ہیں اور نبات کے مادہ حصہ پر جا پڑتے ہیں۔ عمل تلقیح انجام پانے اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ ترکیب پانے کے بعد پہلا بیج تشکیل پاتا ہے

---

[1] راغب کتاب "مفردات" میں کہتا ہے "مشتبھا وغیر متشابہ، متشابھا وغیر متشابہ" تقریباً ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔

اور کئی قسم کے مواد غذائی اسے اطراف میں گوشت کی طرح آغوش میں لے لیتے ہیں ۔ یہ مواد غذائی ساخت کے لحاظ سے بہت ہی متنوع اور مختلف ہیں ۔ اسی طرح ذائقہ اور غذائی وطبی خواص کے لحاظ سے بھی بہت مختلف ہیں کبھی ایک پھل (مثلاً انار اور انگور) میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں کہ جن میں سے ہر دانہ خود جنین اور ایک درخت کا بیج شمار ہوتا ہے اور اس کی ساخت بہت ہی پیچیدہ اور اسرار انگیز ہوتی ہے ۔

## انار کی ساخت

تمام پھلوں کی ساخت اور ان کے غذائی و دوائی مواد اس بحث کی گنجائش سے خارج ہیں ۔ لیکن کوئی حرج نہیں ہے کہ نمونے کے طور پر انار کے پھل کی ساخت کی طرف اشارہ کیا جائے کہ جس کی طرف قرآن نے مندرجہ بالا آیت میں اشارہ کیا ہے ۔

اگر ہم انار کو چھیلیں اور اس کا ایک چھوٹا سا دانہ ہاتھ میں لے کر اسے آفتاب یا چراغ کے سامنے رکھیں اور صحیح طور پر اس میں غور وفکر کریں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ چھوٹے چھوٹے حصوں سے بنا ہوا ہے کہ جو انتہائی چھوٹی چھوٹی شیشیوں کی مانند، انار کے پانی کی ایک خاص مقدار لیے، ایک دوسرے کے پاس چن دی گئی ہیں ۔ انار کے ایک چھوٹے سے دانے میں شاید اس قسم کی سینکڑوں چھوٹی چھوٹی شیشیاں موجود ہیں ۔ پھر ان کے اطراف کو ایک باریک چھلکے کے ساتھ جو انار کے ایک دانے کا چھلکا ہے گھیرا ہوا ہے ۔ پھر اس غرض سے کہ یہ بستہ بندی کامل تر، محکم تر اور خطرے سے دور تر ہے، انار کے دانوں کی ایک خاص تعداد کو ایک ستون پر ایک خاص نظام کے ساتھ چن دیا گیا ہے اور ایک سفید رنگ کا پردہ جو نسبتاً موٹا ہے اس کے اطراف میں لپیٹ دیا گیا ہے اور اس کے بعد ایک موٹا اور محکم چھلکا جو دونوں طرف سے خاص قسم کا لعاب رکھتا ہے ان سب کے اوپر کھینچ دیا گیا ہے تاکہ وہ ہوا اور جراثیم کے نفوذ کو بھی روکے اور ضربات سے بھی ان کی حفاظت کرے اور دانوں کے اندر موجود پانی کے بخارات بننے کے امکانات کو زیادہ سے زیادہ کم کرے ۔ یہ نازک اور عمدہ بستہ بندی انار کے دانوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ دوسرے پھلوں مثلاً مالٹا اور لیموں وغیرہ میں بھی نظر آتی ہے لیکن انار اور انگور میں زیادہ عمدہ اور جاذب نظر ہے ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوع بشر نے بھی سیال چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے اسی سے سبق سیکھا ہے کہ وہ پہلے چھوٹی چھوٹی شیشیوں کو ایک چھوٹے سے ڈبے میں جوڑ دیتے ہیں اور ان کے درمیانی حصے کو ایک نرم مادہ کے ساتھ پُر کر دیتے ہیں ۔ پھر ان چھوٹے ڈبوں کو ایک بڑے کارٹون میں رکھ دیتے ہیں، اور ان کے مجموعے کو ایک بڑے بنڈل کی صورت میں منزل مقصود کی طرف اٹھا کر لے جاتے ہیں ۔

انار کے دانوں کے داخلی ستونوں پر قرار پکڑنے کی طرز اور اپنے حصہ کا پانی اور مواد غذائی اُن سے حاصل کرنا اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز ہے ۔ سب سے انوکھی بات یہ ہے کہ یہ تو وہ چیزیں ہیں کہ جنہیں ہم اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ لیتے ہیں ۔ لیکن اگر ہم ان پھلوں کے ذرات کو (مائیکرو سکوپ) دوربین کے نیچے رکھ کر دیکھیں تو اس وقت ایک پُر غوغا جہاں عجیب و غریب اور حیرت انگیز بنیادوں اور تعمیرات کے ساتھ حد سے زیادہ منظم طریقے

پر ہماری نظروں کے سامنے مجسم ہو جاتا ہے۔ تو کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص چشم حقیقت بین کے ساتھ ایک پھل کی طرف نگاہ کرے اور پھر یہ عقیدہ رکھے کہ اس کو بنانے والا علم و دانش نہیں رکھتا؟ اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں قرآن " انظروا " (نگاہ کرو) کے لفظ کے ساتھ اس قسم کے نباتات کے بارے میں دقت نظر اور غور و فکر کرنے کا حکم دیتا ہے، انہی حقائق کی طرف توجہ کرنے کے لیے ہے۔

ایک طرف سے تو یہ حقائق اور دوسری طرف سے وہ مختلف مراحل جو ایک پھل کچی حالت سے لے کر پکنے کے موقع تک طے کرتا ہے، بہت ہی قابل ملاحظہ ہے، کیونکہ پھلوں کے اندر کی لیبارٹریاں ہمیشہ کام میں مشغول رہتی ہیں اور ترتیب وار اس کی کیمیائی ترکیب میں تبدیلی کرتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آخری مرحلہ تک جا پہنچے اور اس کی کیمیائی ترکیب صحیح صورت اختیار کرلے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مقام پر خالق کائنات کی عظمت و قدرت کی ایک نشانی ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیے کہ قرآن کی تعبیر کے مطابق صرف صاحب ایمان افراد یعنی حق بین اور حقیقت نجو ہی ان مسائل کو دیکھتے ہیں۔ ورنہ چشم عناد اور ہٹ دھرمی یا بے اعتنائی اور سہل انگاری کے ساتھ یہ ممکن نہیں ہے کہ ان حقائق میں سے کسی ایک کو بھی دیکھ سکیں۔

۱۰۰۔ وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ○

۱۰۱۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

۱۰۲۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ○

۱۰۳۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○

## ترجمہ

۱۰۰۔ انہوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک قرار دیے ہیں، حالانکہ خدا نے ان سب کو پیدا کیا ہے، اور انہوں

نے خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں جھوٹ اور جہالت سے بنا رکھے ہیں۔ خدا اس بات سے منزہ و برتر ہے جو یہ اس کی توصیف (میں بیان) کرتے ہیں۔

۱۰۱۔ آسمانوں اور زمین کی ابداع کرنے والا (اور انہیں تازہ اور نیا وجود عطا کرنے والا) وہی ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو حالانکہ اس کی کوئی بیوی نہیں ہے اور سب چیزوں کو اسی نے پیدا کیا ہے اور وہ سب چیزوں کو جانتا ہے۔

۱۰۲۔ ہاں! ایسا ہی ہے تمہارا خدا، تمہارا پروردگار، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، وہ تمام چیزوں کا خالق ہے (تم صرف) اسی کی عبادت کرو، اور وہ تمام موجودات کا حافظ اور مدبر ہے۔

۱۰۳۔ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں، لیکن وہ سب آنکھوں کا ادراک رکھتا ہے، اور وہ (طرح طرح کی نعمتوں کا) عطا کرنے والا ہے (اور چھوٹے چھوٹے کاموں سے باخبر ہے اور (تمام چیزوں سے) آگاہ ہے۔

# تفسیر

## تمام چیزوں کا خالق وہی ہے

ان آیات میں مشرکین اور باطل مذاہب رکھنے والوں کے کچھ غلط اور بیہودہ عقائد بیان کیے گئے ہیں اور ان کے منطقی جواب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ جنوں میں سے خدا کے لیے شرکاء کے قائل ہو گئے ہیں (وجعلوا للّٰہ شرکاء الجن)۔

اس بارے میں کہ یہاں پر جن سے مراد اس کا لغوی معنی یعنی حس انسانی سے غائب اور پوشیدہ موجودات ہیں یا عام طور پر وہ جنات مراد ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن نے بارہا گفتگو کی ہے اور ہم اس کی طرف عنقریب اشارہ کریں گے۔ مفسرین نے اس سلسلہ میں دو احتمال بیان کیے ہیں۔

پہلے احتمال کی بنا پر ممکن ہے کہ آیت ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہو جو فرشتوں اور ہر وکھائی نہ دینے والی چیز کی پرستش کرتے تھے۔ لیکن دوسرے احتمال کی بنا پر آیت ان لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو گروہ جنات کو خدا کا شریک یا اس کی بیوی سمجھتے تھے۔

"کلبی"، کتاب "الاصنام" میں نقل کرتا ہے کہ عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلہ جس کا نام "بنو ملیح" تھا کہ جو قبیلہ

"خزاعہ" کی شاخ تھا جن کی پرستش کرتا تھا[1] کہا جاتا ہے کہ "جن" کی عبادت اور اس کی الوہیت کا عقیدہ قدیم یونان اور ہندوستان کے بیہودہ اور فضول مذاہب میں بھی پایا جاتا تھا[2]

جیسا کہ سورہ صافات کی آیہ ۱۵۸ ہے:

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا

وہ خدا اور جنات کے درمیان رشتہ داری کے قائل ہو گئے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے درمیان کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو جنوں کی خدا کے ساتھ ایک قسم کی رشتہ داری کے قائل تھے۔

اور جیسا کہ بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ قریش کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے جنات کے ساتھ شادی کی ہے اور فرشتے اس شادی کا نتیجہ اور ثمر ہیں[3]

اس کے بعد اس فضول اور بیہودہ خیال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: حالانکہ خدا نے تو انہیں (یعنی جنات کو) پیدا کیا ہے (وخلقهم)۔ یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کی مخلوق اسی کی شریک ہو جائے کیونکہ شرکت ہم جنس اور ہم رتبہ ہونے کی علامت ہے حالانکہ مخلوق ہرگز خالق کی ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔

دوسری بیہودہ بات یہ تھی کہ وہ خدا کے لیے نادانی سے بیٹوں اور بیٹیوں کے قائل ہو گئے تھے (وخرقوا له بنين وبنات بغير علم)۔

حقیقت میں ان بیہودہ عقائد کے باطل ہونے کی بہترین دلیل وہی ہے جو "بغیر علم" کے الفاظ سے معلوم ہوتی ہے یعنی کسی قسم کی کوئی دلیل اور نشانی ان خرافات و موہومات کے لیے ان کے پاس موجود نہیں تھی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "خرقوا" "خرق" (بروزن فرق) کے مادہ سے لیا گیا ہے، جو اصل میں کسی چیز کو بے سوچے سمجھے اور بلاوجہ پارہ پارہ کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ ٹھیک لفظ "خلق" کے بالمقابل ہے جو کسی چیز کو سوچ سمجھ کر کسی حساب سے ایجاد کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ دونوں لفظ (خلق اور خرق) کبھی کبھار گھڑے ہوئے اور جھوٹے مطالب کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ جھوٹ جو سوچ سمجھ کر کسی حساب سے گھڑے گئے ہوں وہ تو خلق و اختلاق کہلاتے ہیں اور وہ جھوٹ جو بغیر کسی حساب اور اندازے کے اور اصطلاح کے مطابق شاخدار جھوٹ ہوں انہیں "خرق و اختراق" کہا جاتا ہے۔

یعنی انہوں نے یہ جھوٹ اس کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیے بغیر اور اس کے لوازم پر نظر کیے بغیر گھڑا ہے۔

---

[1] تفسیر فی ظلال جلد سوم صفحہ ۳۲۶ (پاورقی) (حاشیہ)۔

[2] تفسیر المنار جلد ہفتم صفحہ ۶۴۸۔

[3] تفسیر مجمع البیان اور دیگر تفاسیر زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

اب رہی یہ بات کہ وہ کونسے گروہ تھے جو خدا کے بیٹوں کے قائل تھے، قرآن نے دوسری آیات میں دو گروہوں کے نام لیے ہیں۔ ایک عیسائی جو حضرت عیسیٰؑ کے خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے اور دوسرے یہودی جو عزیرؑ کو خدا کا بیٹا سمجھتے تھے اور جیسا کہ سورہ توبہ کی آیہ ۳۰ سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے اور محققین معاصر کی ایک جماعت نے بھی عیسائیت اور بدھ مذہب کے مشترک اصولوں کا خصوصاً مسئلہ تثلیث میں مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم کیا ہے کہ خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ عیسائیوں اور یہودیوں میں ہی منحصر نہیں تھا بلکہ ان سے پہلے کے فضول و بیہودہ قسم کے مذاہب میں بھی موجود تھا۔

باقی رہا خدا کی بیٹیوں کے وجود کا عقیدہ تو خود قرآن نے دوسری آیات میں اس مطلب کو واضح کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا

وہ فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں اس کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں (زخرف - ۱۹)۔

جیسا کہ ہم سطور بالا میں بھی اشارہ کر چکے ہیں تفاسیر اور تواریخ میں یہ ہے کہ قریش کا ایک گروہ اس بات کا معتقد تھا کہ فرشتے خدا کی وہ اولاد ہیں جو خدا کے جنیات سے شادی کرنے کے نتیجہ میں وجود میں آئے ہیں۔

لیکن اس آیت کے آخر میں قرآن نے ان تمام بیہودہ مطالب اور موہوم و بے بنیاد خیالات پر قلم سرخ کھینچ دیا ہے اور ایک عمدہ اور بیدار کرنے والے جملے کے ساتھ ان تمام باطل باتوں کی نفی کر دی ہے اور فرمایا ہے کہ: خدا (ان خرافات سے) منزہ ہے اور ان اوصاف سے برتر و بالاتر ہے جو وہ اس کے لیے بیان کرتے ہیں (سبحانه وتعالیٰ عما یصفون)۔

بعد والی آیت میں ان بیہودہ عقائد کا جواب دیتے ہوئے پہلے کہا گیا ہے، خدا وہ ہستی ہے کہ جس نے آسمان اور زمین کو ایجاد کیا (بدیع السمٰوات والارض)۔

آیا کوئی اور بھی ایسا ہے کہ جس نے ایسا کام کیا ہو، یا ایسا کرنے کی قدرت ہی رکھتا ہو۔ جس کی بنا پر وہ عبودیت میں اس کا شریک سمجھا جائے؟۔ نہیں؛ ایسا نہیں ہے، بلکہ سب اس کی مخلوق ہیں اور اسی کے تابع فرمان ہیں اور اسی کی ذات پاک کے سب محتاج ہیں۔

علاوہ ازیں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو جب کہ اس کی بیوی ہی نہیں ہے (انّی یکون له ولد ولم تکن له صاحبة)۔

اصولی طور پر اُسے بیوی کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر یہ بات کس کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس کی (بیوی یا) ہمسر ہو سکے جب کہ سب اس کی مخلوق ہیں۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر اس کی ذاتِ مقدس عوارض جسمانی سے پاک و منزہ ہے اور بیوی اور اولاد کا ہونا واضح طور پر جسمانی اور مادی عوارض میں سے ہیں۔

دوسری مرتبہ پھر تمام چیزوں اور تمام افراد کے بارے میں اسی کے خالق ہونے اور ان تمام کے متعلق اس کے

احاطۂ علمی کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے: اسی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے، اور وہ ہر چیز کا عالم ہے (وخلق کل شیء وھو بکل شیء علیم)۔

تیسری زیرِ بحث آیت میں تمام چیزوں کا خالق ہونے، آسمان اور زمین کو ایجاد کرنے، اور اس کے عوارضِ جسم و جسمانی اور بیوی اور اولاد سے منزہ ہونے اور ہر کام اور ہر چیز پر اس کے احاطۂ علمی کا ذکر کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ "تمہارا خدا اور پروردگار ایسی ذات ہے اور چونکہ اور کوئی ان صفات کا حامل نہیں ہے لہٰذا اُس کے سوا اور کوئی بھی معبودیت کے لائق نہیں ہو سکتا۔ پروردگار بھی وہی ہے اور خالق و آفریدگار بھی وہی ہے اس بنا پر معبود بھی صرف وہی ہو سکتا ہے لہٰذا اسی کی پرستش اور عبادت کرو (ذٰلکم اللہ ربکم لا الٰہ الا ھو خالق کل شیء فاعبدوہ)۔

آیت کے آخر میں اس مقصد کے پیشِ نظر اور اس غرض سے کہ غیر خدا سے ہر قسم کی اُمید کو قطع کر دے اور ہر قسم کے شرک کی جڑ کو اور خدا کے سوا اور کسی پر بھی بھروسہ کرنے کو کلی طور پر ختم کر دے قرآن کہتا ہے: اور وہی تمام چیزوں کا حافظ و نگہبان اور مدبر ہے (وھو علیٰ کل شیء وکیل)۔

اس بنا پر تمہاری مشکلات کے حل کی چابیاں صرف اسی کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے سوا کوئی بھی شخص اس کام کی توانائی نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کے سوا جو بھی ہیں وہ سب اس کے محتاج اور نیازمند ہیں اور اُس کے احسان کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ تو ان حالات میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنی مشکلات کسی اور کے پاس لے جائے اور ان کا حل اُس سے چاہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں "علیٰ کل شیء وکیل" کہا گیا ہے نہ کہ "لکل شیء وکیل" اور ان دونوں کے درمیان فرق واضح ہے، کیونکہ لفظ "علیٰ" کا ذکر اس کے تسلط اور نفوذِ امر کی دلیل ہے جب کہ لفظ "لام" کا استعمال تابع ہونے کی نشانی ہے۔

دوسرے لفظوں میں تعبیرِ اول ولایت اور حافظ ہونے کے معنی میں ہے اور دوسری تعبیر نمائندگی کے معنی میں ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں تمام چیزوں پر اس کی حاکمیت اور نگہبانی کو ثابت کرنے کے لیے اور اسی طرح تمام موجودات سے اس کے فرق کو ثابت کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: آنکھیں اُسے نہیں دیکھ سکتیں لیکن وہ تمام آنکھوں کا ادراک کرتا ہے وہ طرح طرح کی نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اور ہر چھوٹے سے چھوٹے کام سے باخبر اور تمام چیزوں سے آگاہ ہے، وہ بندوں کے مصالح کو جانتا ہے اور ان کی حاجات و ضروریات سے باخبر ہے اور اپنے لطف و کرم کے مطابق اُن کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے (لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر)۔

حقیقت میں جو یہ چاہتا ہو کہ وہ تمام چیزوں کا محافظ و مربی اور سہارا ہو اسے ان صفات کا حامل ہونا چاہیے۔

علاوہ ازیں یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تمام موجوداتِ جہاں سے مختلف و متفاوت ہے، کیونکہ ان میں سے کچھ چیزیں تو ایسی ہیں کہ جو دیکھتی بھی ہیں اور خود بھی دیکھی جاتی ہیں، جیسے انسان ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو نہ خود دیکھتی ہیں اور نہ ہی دیکھی جاتی ہیں، جیسے ہماری اندرونی صفات، اور بعض ایسی ہیں کہ جنہیں دیکھا تو جا سکتا ہے

لیکن وہ کسی کو نہیں دیکھتیں، جیسے جمادات۔ تنہا وہ ہستی کہ جسے دیکھا تو نہیں جا سکتا لیکن وہ ہر چیز اور ہر شخص کو دیکھتی ہے صرف اسی کی ذات پاک ہے۔

## چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ آنکھیں خدا کو نہیں دیکھ سکتیں: عقلی دلائل گواہی دیتے ہیں کہ خدا کو آنکھوں کے ساتھ ہرگز نہیں دیکھا جا سکتا۔ کیونکہ آنکھیں صرف اجسام کو یا دوسرے طور پر یہ کہ وہ ان کی بعض کیفیات کو ہی دیکھ سکتی ہیں اور وہ چیز کہ جو نہ جسم ہے اور نہ ہی جسم کی کوئی کیفیت، ہرگز آنکھ سے نظر نہیں آسکتی۔ دوسرے الفاظ میں اگر کوئی چیز آنکھ سے دیکھی جاسکے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی مکان میں ہو اور کسی جہت میں ہو اور مادہ رکھتی ہو جب کہ وہ ان تمام باتوں سے (پاک اور) برتر ہے۔ وہ ایک ایسا وجود ہے جو نامحدود ہے اور وہ اسی دلیل سے جہانِ مادہ سے بالاتر ہے، کیونکہ جہانِ مادہ میں تمام چیزیں محدود ہیں۔

قرآن کی بہت سی آیات میں جن میں سے وہ آیات ہیں کہ جو بنی اسرائیل کے بارے میں ہیں، اور ان کی طرف سے خداوند تعالیٰ کی رویت کا تقاضا کرنے کے متعلق گفتگو کرتی ہیں، وہ کامل صراحت کے ساتھ خدا کی رویت کے امکان کی نفی کرتی ہیں (جیسا کہ انشاء اللہ اس کی تفصیل سورۂ اعراف کی آیہ ۱۴۳ کی تفسیر میں آئے گی)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بہت سے اہلِ سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا اگر اس جہان میں نظر نہ آئے تو عالمِ آخرت میں اس کا دیدار ہو سکے گا۔ تفسیر المنار کے مؤلف کے بقول:

هذا مذهب اهل السنة والعلم بالحديث

یہ عقیدہ اہلِ سنت اور علماءِ حدیث کا ہے[1]

اور اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ محققین معاصر تک بھی یعنی ان کے روشن فکر حضرات بھی اسی نظریہ کی طرف مائل نظر آتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات تو وہ بڑی سختی کے ساتھ اس عقیدہ پر جم جاتے ہیں۔

حالانکہ اس عقیدہ کا باطل ہونا اس حد واضح ہے کہ بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا و آخرت میں (معاد جسمانی کی طرف توجہ کرتے ہوئے) اس مسئلہ میں کوئی فرق نہیں۔ کیا وہ خدا جو ایک ماورائے مادہ وجود ہے قیامت کے دن ایک مادی وجود میں تبدیل ہو جائے گا؟ اور اس نامحدود مقام سے محدود مقام میں تبدیل ہو جائے گا؟ کیا وہ اس دن جسم یا عوارضِ جسم میں بدل جائے گا؟ کیا خدا کی رویت کے عدم امکان کے بارے میں دلائلِ عقلی دنیا و آخرت کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق ظاہر کرتے ہیں؟ دراں حالیکہ عقل کا حکم بھلا اس بارے میں ناقابلِ تبدیل ہے۔

اور یہ عذر جو ان میں سے بعض نے اختیار کیا ہے کہ ممکن ہے کہ انسان دوسرے جہان میں ایک دوسرا ادراک

---

[1] تفسیر المنار جلد ۷، صفحہ ۶۵۳۔

اور تفکر پیدا کرے، ایک ایسا عذر ہے کہ جو کامل طور پر بلا دلیل ہے کیونکہ اگر اس ادراک و نظر سے مراد فکری و عقلی نظر ہے، تو وہ تو اس جہان میں بھی وجود رکھتی ہے اور ہم دل کی آنکھ اور عقل کی قوت سے خدا کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور اگر اس سے مراد کوئی ایسی چیز ہے کہ جس سے جسم کو دیکھا جا سکتا ہے تو ایسی چیز خدا کے بارے میں محال ہے چاہے وہ اس دنیا میں ہو یا دوسرے جہان میں۔ اس بنا پر مذکورہ گفتگو کہ انسان اس جہان میں تو خدا کو نہیں دیکھتا لیکن مومنین قیامت کے دن خدا کو دیکھیں گے، ایک غیر منطقی اور ناقابل قبول گفتگو ہے۔ غالباً تنہا ایک چیز جو اس بات کا سبب بنی ہے کہ وہ اس عقیدہ کا دفاع کریں، یہ ہے کہ کچھ احادیث میں جو ان کی معروف کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، قیامت میں خدا کی رویت کا امکان بیان ہوا ہے۔ لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ عقل کے فیصلہ کی رو سے اس موضوع کے باطل ہونے کو ان روایات کے جعلی ہونے اور ان کتابوں کے غیر معتبر ہونے کی دلیل سمجھیں کہ جن میں اس قسم کی روایات نقل کی گئی ہیں، سوائے اس صورت کے کہ ان روایات کا معنی دل کی آنکھ سے مشاہدہ کرنا ہو؟ کیا یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی احادیث کی وجہ سے عقل وخرد کے فیصلہ کو چھوڑ دیں اور اگر قرآن کی بعض آیات میں ایسی تعبیرات موجود ہیں جن سے ابتدائی نظر میں رویت خدا کے مسئلہ کا اظہار ہوتا ہے جیسے:

وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ

اس دن کچھ چہرے پرطراوت اور پررونق ہوں گے اور وہ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے[1]

یہ تعبیرات ایسی ہیں جیسے:

يَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَيۡدِيۡهِمۡ

خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے[2]

یہ تعبیرات کنایہ کا پہلو رکھتی ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی کوئی آیت کبھی بھی عقل وخرد کے حکم و فرمان کے خلاف نہیں ہو سکتی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات میں اس فضول عقیدہ کی شدت کے ساتھ نفی کی گئی ہے اور ایسے عقائد رکھنے والوں پر دنداں شکن تعبیرات کے ساتھ تنقید کی گئی ہے۔ منجملہ ان کے امام صادقؑ کے مشہور اصحاب میں سے ایک صحابی جن کا نام ہشام ہے، فرماتے ہیں:

میں حضرت صادقؑ کے پاس موجود تھا کہ معاویہ بن وہب (آپ کے ایک اور صحابی) وارد ہوئے اور کہنے لگے: اے فرزند رسول! آپ اس حدیث کے متعلق کیا فرماتے ہیں کہ جو رسول خدا کے بارے میں

---

[1] قیامت۔ ۲۳ و ۲۴۔

[2] فتح۔ ۱۰۔

وارد ہوئی ہے کہ انہوں نے خدا کو دیکھا ، تو آپ نے خدا کو کس طرح دیکھا ؟ اور اسی طرح ایک دوسری حدیث کے بارے میں کہ جو آنحضرت سے نقل ہوئی ہے کہ مومنین بہشت میں اپنے پروردگار کو دیکھیں گے ۔ تو وہ کس طرح سے دیکھیں گے ؟

امام صادق علیہ السلام نے ایک (تلخ) تبسم کیا اور فرمایا : اے معاویہ بن وہب ! یہ بات کتنی بری ہے کہ انسان ستر ، اسی سال عمر گزارے ، خدا کے ملک میں زندگی بسر کرے اور اس کی نعمت کھاتا رہے لیکن اس کو صحیح طرح سے نہ پہچانے ۔ اے معاویہ ! پیغمبر نے ہرگز خدا کو اس آنکھ سے نہیں دیکھا ۔ مشاہدہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک دل کی آنکھ سے دیکھنا اور (دوسرے) ظاہری آنکھ سے دیکھنا ۔ جو شخص دل کی آنکھ سے مشاہدہ کی بات کہتا ہے وہ تو صحیح کہتا ہے اور جو شخص ظاہری آنکھ سے خدا کے مشاہدہ کی بات کرتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے اور خدا اور اس کی آیات کا کافر و منکر ہے کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص خدا کو مخلوق کے مشابہ سمجھے وہ کافر ہے[1]۔

ایک اور روایت توحید صدوق میں اسماعیل بن فضل سے منقول ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا خدا قیامت کے دن نظر آئے گا ؟ آپ نے فرمایا :

خداوند ایسی چیز سے منزہ ہے ، اور بہت ہی منزہ ہے ...... ( ان الابصار لا تدرك الا ماله لون والكيفية والله خالق الالوان والكيفيات ) ۔ آنکھیں نہیں دیکھتیں مگر ایسی چیزوں کو کہ جو رنگ و کیفیت رکھتی ہیں جب کہ خدا رنگوں اور کیفیتوں کا خالق ہے[2]

توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس حدیث میں خصوصیت کے ساتھ " لون " (رنگ) کا ذکر کیا گیا ہے اور آج کی دنیا میں ہم پر یہ مطلب واضح ہو چکا ہے کہ خود جسم نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس کا رنگ دیکھا جاتا ہے ، اور اگر کوئی جسم کسی قسم کا رنگ نہ رکھتا ہو تو وہ ہرگز دیکھا نہیں جائے گا (تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں سورہ بقرہ کی آیہ ۵۵ کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلہ میں ایک بحث کر چکے ہیں[3]

۲ ۔ خدا ہی تمام چیزوں کا خالق ہے : بعض مفسرینِ اہل سنت نے جو عقیدہ کے لحاظ سے مذہب جبر کے قائل ہیں اوپر والی آیت کے ساتھ جو خدا کے تمام چیزوں کے خالق ہونے کو بیان کرتی ہے مسلک جبر پر استدلال کیا ہے ، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال و افعال بھی اس جہان کی اشیاء میں سے ہیں ، کیونکہ " شئ " (چیز) ہر قسم کے وجود کو کہا جاتا ہے ، خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی ، خواہ ذات ہو یا صفت ، اس بنا پر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا ہر چیز کا خالق ہے تو ہمیں قبول کرنا چاہیے کہ وہ ہمارے افعال کا بھی خالق ہے اور یہ جبر کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔

---

[1] معانی الاخبار بنا بر نقل المیزان جلد ۸ صفحہ ۲۶۸ ۔

[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۵۳ ۔

[3] دیکھئے اردو ترجمہ صفحہ ۱۸۳ ۔

لیکن آزادیٔ ارادہ واختیار کے طرفدار اس قسم کے استدلال کا روشن اور واضح جواب رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی خالقیت ہمارے افعال کے بارے میں بھی ہمارے مختار ہونے کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں رکھتی۔ کیونکہ ہمارے افعال کو ہماری طرف بھی منسوب کیا جاسکتا ہے اور خدا کی طرف بھی۔ اگر ہم ان کی خدا کی طرف نسبت دیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے اس کام کے تمام مقدمات ہمارے اختیار میں دے دیئے ہیں، وہی ذات ہے جس نے ہمیں قدرت وطاقت اور ارادہ واختیار دیا ہے۔ اس بنا پر چونکہ تمام مقدمات اسی کی طرف سے ہیں لہٰذا ہمارے اعمال اس کی طرف بھی منسوب کیے جاسکتے ہیں اور اسے ان کا خالق جان سکتے ہیں، لیکن اس نظر سے کہ آخری ارادہ ہماری ہی طرف سے ہے۔ وہ ہم ہی ہیں کہ جو خدا کی دی ہوئی قدرت واختیار سے استفادہ کرتے ہیں اور فعل یا ترک میں سے کسی ایک کا انتخاب ہم ہی کرتے ہیں تو اس سبب سے افعال کی نسبت ہماری طرف دی جاتی ہے اور ہم ان کے لیے جوابدہ ہیں۔

فلسفی تعبیر کے مطابق یہاں دو خالق اور دو علتیں ایک دوسرے کے عرض میں نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے طول میں ہیں، دو علت تامہ کا ایک ہی عرض میں ہونا کوئی مفہوم نہیں رکھتا، لیکن اگر طولی ہوں تو کوئی مانع نہیں ہے، چونکہ ہمارے افعال ان مقدمات کا لازمہ ہیں جو خدا نے ہمیں دیئے ہیں، تو ان لوازم کی اس کی طرف بھی نسبت دی جاسکتی ہے اور اس شخص کی طرف بھی کہ جس نے افعال کو انجام دیا ہے۔

اس گفتگو کی مثال ٹھیک اس طرح ہے جیسے کوئی شخص اپنے کارندوں کو آزمانے کے لیے انہیں اپنے کام میں آزاد چھوڑ دے اور انہیں مکمل اختیار دیدے اور کام کے تمام مقدمات انہیں مہیا کر دے، اب یہ بات ظاہر ہے کہ جو کام وہ انجام دیں گے ایک لحاظ سے ان کے سربراہ کا کام شمار ہوگا لیکن یہ امر کارکنوں سے آزادی واختیار کو سلب نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنے کام کے بارے میں جوابدہ ہیں۔ عقیدہ جبر واختیار کے بارے میں ہم انشاء اللہ متعلقہ آیات کے ذیل میں بحث کریں گے[1]

۳۔ بدیع کا کیا معنی ہے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے لفظ "بدیع" کا معنی کسی چیز کو بغیر سابقہ کے وجود میں لانے والے کے ہیں۔ یعنی خداوند تعالیٰ نے آسمان وزمین کو کسی پہلے سے موجود مادہ یا بنیادی نقشہ ومنصوبہ کے بغیر ایجاد کیا ہے۔

یہاں بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں آجائے۔ ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۷ کے ذیل میں (جلد اول تفسیر نمونہ صفحہ ۱۰۸ اردو ترجمہ پر) تفصیل سے اس سوال کے جواب میں بحث کرچکے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ جو ہم یہ کہتے ہیں کہ تمام موجودات کو خدا عدم سے وجود میں لایا ہے اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ "عدم" وہ مادہ ہے کہ جو موجودات عالم کو تشکیل دینے والا ہے۔ جس طرح سے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ بڑھئی

---

[1] کتاب "خدارا چگونہ بشناسیم" کی فصل جبر واختیار کی طرف بھی رجوع فرما سکتے ہیں۔

نے میز کو لکڑی سے بنایا ہے ۔ ایسی چیز یقیناً محال ہے ۔ کیونکہ عدم وجود کا مادہ نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس جہان کی یہ تمام موجودات پہلے موجود نہیں تھیں اس کے بعد وجود میں آئی ہیں ۔ یہ امر کسی قسم کا کوئی اشکال نہیں رکھتا اور اس سلسلے میں ہم نے جلد اول میں بھی کچھ مثالیں بیان کی ہیں اور یہاں پر مزید بیان کرتے ہیں ، کہ ہم اپنے فکر و ذہن میں کچھ ایسی موجودات کو پیدا کر سکتے ہیں جو پہلے کسی صورت میں بھی ہمارے ذہن میں نہیں تھیں ، اس میں شک نہیں کہ یہ ذہنی موجودات اپنے لیے ایک قسم کا وجود و ہستی رکھتی ہیں ۔ اگرچہ وہ وجود خارجی کی طرح نہیں ہیں لیکن پھر بھی وہ ہمارے ذہنی افق میں موجود ہوتی ہیں ۔ اگر کسی چیز کا وجود عدم کے بعد محال ہو تو وجود ذہنی اور وجود خارجی کے درمیان کیا فرق ہے ، اس بنا پر جس طرح ہم اپنے ذہن میں کئی موجودات کو ایجاد و خلق کر لیتے ہیں جو پہلے موجود نہیں تھیں ، خداوند تعالیٰ بھی عالم خارج میں ایسا ہی کام کرتا ہے ، اس مثال میں اور اُن مثالوں میں جو ہم جلد اول میں بیان کر چکے ہیں تھوڑا سا غور کرنے سے یہ مشکل حل ہو جاتی ہے ۔

۴ ۔ لطیف کا معنی کیا ہے : اوپر والی آیات میں خداوند تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت "لطیف" کا ذکر ہوا ہے اور وہ مادہ لطف سے ہے جب وہ اجسام کے بارے میں استعمال ہو تو وہ ہلکا ہونے کے معنی میں ہے ۔ جو بوجھل کے مقابلہ میں ہے ، اور جس وقت حرکات کے بارے میں (حرکت لطیفہ) استعمال ہو تو ایک چھوٹی سی جلد گزر جانے والی حرکت مراد ہوتی ہے ، اور کبھی ایسے موجودات اور کاموں پر بھی جو بہت دقیق اور باریک ہوتے ہیں اور جو قوت حس سے قابل ادراک نہیں ہوتے یہ لفظ بولا جاتا ہے ، اور اگر ہم خدا کی لطیف کے نام سے توصیف کرتے ہیں تو وہ بھی اسی معنی میں ہے یعنی وہ ایسی نظر نہ آنے والی اشیاء کا خالق اور ایسے افعال کا موجد ہے کہ جو قوت سماعت کے دائرے سے باہر ہے ، بہت ہی باریک بین اور حد سے زیادہ دقیق ہے ۔

اس سلسلے میں ایک قابل توجہ حدیث فتح بن یزید جرجانی کے واسطے سے امام علی بن موسیٰ رضا سے نقل ہوئی ہے جو ایک علمی معجزہ شمار ہوتی ہے حدیث اس طرح ہے کہ امامؑ فرماتے ہیں :

> یہ جو ہم کہتے ہیں کہ خدا لطیف ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے لطیف مخلوقات کو پیدا کیا ہے اور اس سبب سے ہے کہ وہ لطیف و ظریف اور نظر نہ آنے والی اشیاء سے آگاہ ہے ۔ کیا تم اس کی صنعت کے آثار کو لطیف و غیر لطیف نباتات میں دیکھتے نہیں ہو ؟ اور اسی طرح چھوٹی چھوٹی مخلوقات و حیوانات اور باریک باریک حشرات اور اُن چیزوں میں جو اُن سے بھی چھوٹی ہیں ۔ ایسی موجودات کہ جو ہرگز آنکھوں سے دیکھی نہیں جا سکتیں ، اور اس قدر چھوٹی ہیں کہ ان کے نر و مادہ اور نئے اور پرانے بھی پہچانے نہیں جاتے ۔ جب ہم اس قسم کے موضوعات کا مشاہدہ کرتے ہیں ...... اور جو کچھ گہرے سمندروں میں ، اور درختوں کی چھال کے نیچے اور بیابانوں اور صحراؤں میں موجود ہیں اُن پر نظر کرتے ہیں ...... اور یہ کہ ایسی ایسی موجودات بھی ہیں کہ جنہیں ہرگز ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور اپنے ہاتھوں سے انہیں ہم چھو بھی نہیں سکتے ۔ تو ان تمام چیزوں سے ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا پیدا کرنے والا لطیف ہے[1]

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

اُوپر والی حدیث جو جراثیم اور خورد بینی حیوانات کی طرف اشارہ ہے اور پاسٹور کی پیدائش سے کئی صدیوں پہلے بیان ہوئی ہے لطیف کی تفسیر کو واضح کرتی ہے۔

اس لفظ کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ خدا کے لطیف ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کی ذات پاک ایسی ہے جو ہرگز کسی کے بھی حس سے ادراک نہیں ہو سکتی اس بنا پر وہ لطیف ہے کیونکہ کوئی شخص بھی اس کی ذات سے آگاہ نہیں ہے اور خبیر ہے چونکہ وہ تمام چیزوں سے آگاہ ہے۔ اس معنی کی طرف بھی بعض روایات اہل بیت علیہم السلام میں اشارہ ہوا ہے[1] اور اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ اس لفظ کے دونوں ہی معنی مراد لینے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے۔

۱۰۴۔ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ۝

۱۰۵۔ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَیِّنَهٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝

۱۰۶۔ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ ۝

۱۰۷۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَكِیْلٍ ۝

## ترجمہ

۱۰۴۔ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے واضح دلیلیں آئی ہیں۔ جو شخص (اس کے ذریعہ سے حق کو) دیکھے تو یہ اسی کے فائدہ میں ہے اور جو شخص ان کو دیکھنے سے آنکھیں بند کرلے تو خود اسی کا نقصان ہے اور میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔

---

حاشیہ صفحہ سابقہ، اصول کافی جلد اول صفحہ ۹۳۔

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۵۴۸۔

۱۰۵۔ اور ہم آیات کو اس طرح مختلف شکلوں میں بیان کرتے ہیں، اور انہیں کہنے دو کہ تو نے سبق پڑھا ہے (اور تو نے ان کو کسی دوسرے سے سیکھا ہے) ہمارا ہدف یہ ہے کہ ہم علم و آگاہی رکھنے والوں کے لیے اسے واضح کر دیں۔

۱۰۶۔ جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر وحی ہوئی ہے اس کی پیروی کر اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، اور مشرکین سے منہ پھیر لو۔

۱۰۷۔ اگر خدا چاہتا (تو سب جبری طور پر ایمان لے آتے اور کوئی بھی) مشرک نہ ہوتا، اور ہم نے تجھے ان کے اعمال کا جوابدہ قرار نہیں دیا، اور تیری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ انہیں (ایمان لانے پر) مجبور کرتے۔

# تفسیر

## پیغمبر مجبور نہیں کرتے

درحقیقت ان آیات میں گذشتہ آیات کا ایک طرح سے خلاصہ اور نتیجہ پیش کیا گیا ہے، پہلے کہا گیا ہے، تمہارے پاس توحید، خداشناسی اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے بارے میں ایسی واضح و روشن دلائل اور نشانیاں آچکی ہیں جو بصیرت و بینائی کا سبب ہیں (قد جاءکم بصائر من ربکم)۔

"بصائر" جمع ہے "بصیرت" کی "بصر" کے مادہ سے دیکھنے کے معنی میں لیکن عام طور پر یہ لفظ فکری و عقلی بصیرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض اوقات ان تمام امور پر اس کا اطلاق ہوتا ہے کہ جو کسی مطلب کے ادراک و فہم کا باعث ہوں۔ زیر نظر آیت میں یہ لفظ دلیل، شاہد اور گواہ کے معنی میں آیا ہے، اور ان تمام دلائل کو جو گذشتہ آیات میں خداشناسی کے سلسلہ میں بیان کی جاچکی ہیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے بلکہ سارا قرآن اس کے مفہوم میں موجود ہے۔

اس کے بعد یہ حقیقت واضح کرنے کے لیے کہ یہ دلائل حقیقت کو آشکار کرنے کے لیے کافی ہیں اور منطقی پہلو رکھتے ہیں، کہا گیا ہے: وہ لوگ جو ان دلائل کے ذریعہ حقیقت کے چہرے کو دیکھ لیں تو انہوں نے خود اپنے ہی نفع کی طرف قدم بڑھایا ہے اور وہ لوگ جو اندھوں کی طرح ان کے مشاہدہ سے اپنے آپ کو محروم رکھیں انہوں نے اپنے ہی نقصان میں کام کیا ہے (فمن ابصر فلنفسہ و من عمی فعلیھا)۔

اور آیت کے آخر میں پیغمبر کی زبانی کہا گیا ہے: میں تمہارا نگہبان اور محافظ نہیں ہوں (وما انا علیکم بحفیظ)۔

اس بارے میں کہ اس جملے سے مراد کیا ہے، مفسرین نے دو احتمال ظاہر کیے ہیں۔

پہلا یہ کہ میں تمہارے کاموں کا محافظ و نگہبان اور جوابدہ نہیں ہوں، بلکہ خدا ہی سب کی نگہداری کرنے والا ہے اور وہی ہر شخص کو جزا و سزا دے گا، میرا فریضہ تو صرف رسالت کو پہنچانا اور لوگوں کی ہدایت کے لیے جتنی زیادہ سے زیادہ سعی و کوشش ہو سکتی ہے، کرنا ہے۔

دوسرا یہ کہ میں اس بات پر مامور اور تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں کہ میں تمہیں جبر و اکراہ سے طاقت سے اور زبردستی ایمان کی دعوت دوں۔ بلکہ میرا فریضہ تو صرف منطقی حقائق بیان کرنا ہے اور آخری تصمیم و ارادہ خود تمہارا اپنا کام ہے۔

اس امر میں کوئی بات مانع نہیں ہے کہ اس لفظ سے دونوں ہی معانی مراد لیے گئے ہوں۔

بعد والی آیت میں اس امر کی تاکید کے لیے کہ حق و باطل کے انتخاب کی راہ میں آخری ارادہ خود لوگوں کے اپنے اختیار میں ہے فرمایا گیا ہے: ہم آیات و دلائل کو اس طرح سے مختلف شکلوں، مختلف قیافوں اور مختلف صورتوں میں بیان کرتے ہیں (وکذٰلک نصرف الاٰیات)[1]۔

لیکن ایک جماعت مخالفت پر کھڑی ہو گئی، اور بغیر مطالعہ اور بغیر کسی قسم کی دلیل کے کہنے لگی، تو نے یہ درس دوسروں (یہود و نصاریٰ اور ان کی کتب) سے لیے ہیں (ولیقولوا درست)[2]۔

لیکن ایک اور دوسرا گروہ کہ جو حق کو قبول کرنے کی آمادگی رکھتا ہے اور جس کے افراد صاحب بصیرت، عالم آگاہ ہیں، وہ اس کے ذریعہ حقیقت کے چہرے کو دیکھ لیتے ہیں اور اسے قبول کر لیتے ہیں (ولنبینہ لقوم یعلمون)۔

پیغمبر پر اس نظر سے تہمت کہ آپ نے اپنی تعلیمات یہود و نصاریٰ سے حاصل کی ہیں، ایک ایسی بات ہے جو مشرکین کی طرف سے بارہا کہی گئی ہے اور ہٹ دھرم مخالفین اب بھی ایسا کہتے رہتے ہیں حالانکہ اصولاً پورے جزیرہ نمائے عرب میں کوئی درس، مکتب اور علم تھا ہی نہیں کہ پیغمبر اسے حاصل کرتے اور جزیرہ نمائے عرب سے باہر پیغمبر کے سفر اس قدر کم تھے کہ جن میں اس قسم کے احتمال کی گنجائش ہی نہیں ہے، پورے حجاز کے اندر رہنے والے یہودیوں اور عیسائیوں کی معلومات بھی اس قدر کم اور خرافات سے مخلوط تھیں کہ وہ اصلاً اس قابل ہی نہ تھیں کہ ان کا قرآن اور تعلیمات پیغمبر سے موازنہ کیا جائے۔ اس موضوع کے بارے میں ہم انشاء اللہ مزید وضاحت

---

[1] "نصرف" "تصریف" کے مادہ سے دگرگوں کرنے اور مختلف شکلوں میں لانے کے معنی میں ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کی آیات مختلف لب و لہجہ میں، اور دل میں اتر جانے والے تمام وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے، ایسے اشخاص کے لیے جو فکر و عقیدہ اور تمام معاشرتی اور نفسیاتی پہلوؤں سے مختلف سطح پر ہوتے ہیں، نازل ہوئی ہیں۔

[2] لام لیقولوا، اصطلاح کے مطابق (لام عاقبت) ہے، جو کسی چیز کے سرانجام اور عاقبت کو بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے لیکن وہ اس کا اصلی ہدف نہیں ہوتا اور "درست" مادہ "درس" سے حاصل کرنے اور سیکھنے کے معنی میں ہے، اور یہ ایک تہمت تھی جو مشرک پیغمبر اکرم پر لگایا کرتے تھے۔

سورۂ نحل کی آیت ۱۰۳ میں بیان کریں گے۔

اس کے بعد مخالفین کی ہٹ دھرمیوں، کینہ پروریوں اور تہمتوں کے مقابلے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فریضہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تیرا فریضہ یہ ہے کہ تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تجھ پر وحی ہوتی ہے اس کی پیروی کر، وہ خدا کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے (اتبع ما اوحی الیک من ربک لا الٰه الا هو)۔

نیز تیرا فرض یہ ہے کہ "مشرکین اور ان کی ناروا تہمتوں اور بے بنیاد باتوں کی پرواہ نہ کر" (واعرض عن المشرکین)۔

حقیقت میں یہ آیت پیغمبر اکرمؐ کے لیے ایک قسم کی تسلی اور روحانی تقویت ہے تاکہ اس قسم کے مخالفین کے مقابلہ میں آپؐ کے عزم راسخ اور آہنی ارادہ میں ذرا سی بھی کمزوری واقع نہ ہو۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے اچھی طرح واضح اور روشن ہو جاتا ہے کہ "واعرض عن المشرکین" (مشرکین سے منہ پھیر لو اور ان کی پرواہ نہ کرو) کا جملہ انہیں اسلام کی طرف دعوت دینے کے حکم اور ان کے مقابلے میں جہاد کرنے سے کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتا، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی بے بنیاد باتوں اور تہمتوں کی پرواہ نہ کرو اور اپنی راہ حق پر ثابت قدم رہو۔

آخری زیر بحث آیت میں اس حقیقت کی دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ خداوند تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ انہیں جبراً ایمان پر آمادہ کرے، اور اگر وہ یہ چاہتا تو سب کے سب ایمان لے آتے اور کوئی مشرک نہ ہوتا (ولو شاء الله ما اشرکوا)۔

اور یہ بھی تاکید کرتا ہے کہ تم ان کے اعمال کے لیے جوابدہ نہیں ہو اور تم انہیں ایمان پر مجبور کرنے کے لیے بھی مبعوث نہیں ہوئے ہو (وما جعلناک علیهم حفیظا)۔

جیسا کہ تمہارا یہ فرض بھی نہیں کہ تم انہیں کار خیر پر مجبور کرو (وما انت علیهم بوکیل)۔

"حفیظ" اور "وکیل" میں فرق یہ ہے کہ حفیظ تو اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو کسی شخص یا چیز کی نگہبانی کرے اور اُسے زیان و ضرر پہنچنے سے محفوظ رکھے، لیکن وکیل اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے لیے منافع کے حصول کے لیے جستجو اور کوشش کرے۔

شاید یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان دو صفات (حفیظ و وکیل) کی نفی دفع ضرر اور جلب منفعت پر مجبور کرنے کی نفی کے معنی میں ہے، ورنہ پیغمبرؐ تبلیغ کے طریقے سے اور نیک کاموں کے بجالانے اور بُرے کاموں کے ترک کرنے کی دعوت کے ذریعہ ان دونوں فرائض کو ان کے موقع و محل پر اختیاری صورت میں انجام دیتے ہیں۔

ان آیات کا لب و لہجہ اس نظر سے بہت ہی قابل ملاحظہ ہے کہ خدا پر اور مبانیٔ اسلام پر ایمان لانا کسی قسم کا بھی جبری پہلو نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ ان امور کو منطق و استدلال اور افراد بشر کی فکر و روح میں نفوذ کے طریق سے پیش رفت کرنا چاہیے۔ کیونکہ جبری ایمان کی تو کوئی بھی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ لوگ حقائق کو سمجھیں اور اپنے ارادہ و انتخاب

کے ساتھ انہیں قبول کریں۔

قرآن نے بارہا مختلف آیات میں اس حقیقت پرتاکید کی ہے اور وہ ایسے سخت گیر اعمال سے جیسے کہ قرون وسطیٰ[1] میں کلیسا کے اعمال اور محکمہ تفتیش عقائد وغیرہ کے اعمال تھے اسلام کی بیگانگی کا اعلان کررہا ہے۔ اور ان شاء اللہ سورۂ برائت کی ابتداء میں مشرکین کے مقابلہ میں اسلام کی سخت گیری کے علل و اسباب کو زیر بحث لایا جائے گا۔

۱۰۸۔ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

## ترجمہ

۱۰۸۔ ایسے لوگوں (کے معبود) کو جو خدا کے علاوہ کسی کو پکارتے ہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ (بھی) ظلم و جہالت کی وجہ سے خدا کو گالیاں دینے لگ جائیں، ہم نے ہر امت کے لیے ان کے عمل کو اسی طرح زینت دی ہے اس کے بعد ان کی بازگشت تو ان کے پروردگار کی طرف ہی ہے، اور وہ انہیں ان کے اس عمل سے جو وہ کیا کرتے تھے آگاہ کرے گا (اور اس کی جزا یا سزا دے گا)۔

## تفسیر

اس بحث کے بعد جو تعلیمات اسلام کے منطقی ہونے، اور دعوت کے استدلال کے ذریعہ لازم ہونے اور جبری طریقہ سے نہ ہونے کے بارے میں گذشتہ آیات میں گذری ہے، ان آیات میں تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، تم مشرکین کے بتوں اور معبودوں کو کبھی گالیاں نہ دو کیونکہ یہ عمل سبب بن جاتے گا کہ وہ بھی یہی کام خداوند تعالیٰ کی شان اقدس میں ظلم و ستم اور جہل و نادانی کی وجہ سے انجام دینے لگیں (ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم)۔

جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کا ایک گروہ مشرکین بت پرستی پر سخت برہمی کی بنا پر بعض اوقات

---

[1] قرون وسطیٰ ایک ہزار سالہ دور کو کہتے ہیں جو پانچویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر پندرھویں صدی عیسوی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ مغرب اور عیسائیت کا ایک تاریک ترین دور تھا، اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسلام کا سنہری دور ٹھیک قرون وسطیٰ کے وسط میں ہوا ہے۔

مشرکین کے بتوں کو بُرا بھلا کہتے ہوئے انہیں گالیاں دیتا تھا۔ قرآن نے صراحت سے انہیں اس بات سے منع کیا، اور اصولِ ادب وعفت اور شیریں بیانی کو بیہودہ ترین اور بدترین مذاہب وادیان کے مقابلہ میں بھی لازم وضروری قرار دیا۔

اس موضوع کی دلیل واضح ہے، کیونکہ گالی دینے اور بُرا بھلا کہنے سے کسی کو غلط راستے سے نہیں پھیرا جاسکتا، بلکہ اس کے برعکس جہالت آمیز شدید تعصب جو اس قسم کے افراد میں ہوتا ہے اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ بقول ے: زدی دندہ لجاجت افتادہ (یعنی اپنی ہٹ دھرمی پر اڑ جانا) کے مطابق اپنے باطل دین میں اور زیادہ راسخ ہوجائیں، اس صورت میں یہ بات آسان ہوجائے گی کہ خداوند تعالیٰ کی شان اقدس میں بدگوئی اور توہین کے لیے زبان کھولیں۔ کیونکہ ہرگروہ اور ہرمذہب کے لوگ اپنے عقائد واعمال میں متعصب ہوتے ہیں، جیساکہ قرآن بعد والے جملے میں کہتا ہے:

ہم نے اس طرح ہرگروہ کے لیے اُن کے عمل کو زینت دے دی ہے" (کذالک زینا لکل امة عملهم)۔

اور آیت کے آخر میں کہتا ہے کہ: اُن سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے اور وہ انہیں خبر دے گا کہ انہوں نے کون سے عمل انجام دیئے ہیں (ثم الی ربهم مرجعهم فینبئهم بما کانوا یعملون)۔

## قابلِ توجہ نکات

۱۔ خدا زینت دیتا ہے؟ اُوپر والی آیت میں ہرشخص کے اچھے اور بُرے اعمال کو اس کی نظر میں زینت دینے کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ بات بعض لوگوں کے لیے تعجب کا باعث ہو کہ کیا یہ بات ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ کسی کے عمل بد کو اس کی نظر میں زینت دے۔

اس سوال کا جواب وہی ہے جو ہم بارہا بیان کرچکے ہیں کہ اس قسم کی تعبیرات عمل کی خاصیت اور اثر کی طرف اشارہ ہوتی ہیں۔ یعنی جس وقت انسان کسی کام کو بار بار انجام دے تو آہستہ آہستہ اس کی قباحت اور بدی اس کی نگاہ میں ختم ہوجاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اس کی نظر میں ایک عمدہ صورت اختیار کرلیتا ہے اور چونکہ علت العلل اور مسبب الاسباب اور ہرچیز کا خالق خدا ہے اور تمام تاثیرات خدا ہی کی طرف منتہی ہوتی ہیں لہٰذا قرآن کی زبان میں اس قسم کے آثار کی بعض اوقات اس کی طرف نسبت دے دی جاتی ہے (غور کیجئے گا)۔

زیادہ واضح تعبیر میں " زینا لکل امة عملهم " کا معنی یہ ہے کہ ہم نے انہیں ان کے بُرے اعمال کے نتیجے میں گرفتار کردیا ہے یہاں تک کہ برائیاں ان کی نظر میں اچھائیاں معلوم ہونے لگیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ یہ جو بعض آیات قرآن میں عمل کو زینت دینے کی نسبت شیطان کی طرف دی گئی ہے وہ بھی اس بات سے اختلاف نہیں رکھتی کیونکہ شیطان انہیں بُرے عمل کے انجام دینے کا وسوسہ کرتا ہے اور وہ شیطان کے وسوسے کے سامنے جھک جاتے ہیں آخرکار وہ اپنے عمل کے نتائج بد میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ علمی تعبیر کے لحاظ سے سببیت تو خدا کی طرف سے ہے لیکن ایجاد وسبب اُن افراد اور شیطانی وسوسوں کے ذریعے ہوتا ہے[1]

[1] حاشیہ بر صفحہ آئندہ

۲ ۔ گالیاں نہ دینے کا حکم : اسلامی روایات میں بھی گمراہ اور منحرف لوگوں کو گالیاں نہ دینے کی قرآنی منطق کی پیروی کی گئی ہے اسلام کے بزرگ پیشواؤں اور رہنماؤں نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ ہمیشہ منطق و استدلال کا سہارا لیں اور مخالفین کے اعتقادات کے بارے میں گالی دینے کے لاحاصل حربے کو وسیلہ نہ بنائیں ۔ ہم نہج البلاغہ میں پڑھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اپنے اصحاب کی ایک جماعت کو جو جنگِ صفین کے دنوں میں معاویہ کے پیروکاروں کو گالیاں دے رہی تھی ، فرماتے ہیں :

انی اکرہ ان تکونوا سبابین ولکنکم لو وصفتم اعمالھم وذکرتم حالھم کان اصوب فی القول و ابلغ فی العذر ۔

مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ تم فحش گوئی کرنے والے اور گالیاں دینے والے ہو ، اگر تم گالیاں دینے کے بجائے ، ان کی کارگزاریوں کو بیان کرو اور ان کے حالات کا تذکرہ کرو ( اور ان کے اعمال کا تجزیہ و تحلیل کرو ) تو یہ بات حق و راستی کے زیادہ قریب ہے اور اتمام حجت کے لیے بہتر ہے[1]

۳ ۔ بت پرست اور خدا کے بارے میں بدگوئی : بعض اوقات یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بت پرست خدا کے بارے میں بدگوئی کریں ، جب کہ ان کی اکثریت اللہ کا اعتقاد رکھتی تھی اور بتوں کو اس کی بارگاہ میں شفیع قرار دیتی تھی ۔

لیکن اگر ہم ہٹ دھرم اور متعصب عوام کی وضع و کیفیت میں غور و فکر کریں تو ہم دیکھیں گے کہ یہ بات کوئی زیادہ تعجب کا باعث نہیں ہے اس قسم کے لوگ جب غصہ میں آجاتے ہیں تو پھر کوشش کرتے ہیں کہ وہ مد مقابل کو جس طرح بھی ممکن ہو تکلیف اور دکھ پہنچائیں ، چاہے اس کے لیے طرفین کے مشترک عقائد کی ہی بدگوئی کرنی پڑے مشہور سنی عالم آلوسی تفسیر روح المعانی میں نقل کرتے ہیں کہ جاہل عوام میں سے بعض نے جب یہ دیکھا کہ شیعہ شیخین کو برا بھلا کہتے ہیں تو انہیں غصہ آگیا اور انہوں نے حضرت علیؑ کی شان میں گستاخی اور اہانت شروع کردی ۔ ایسے ایک شخص سے جب یہ پوچھا گیا کہ تو حضرت علیؑ کی جو تیرے نزدیک بھی قابلِ احترام ہیں کیوں اہانت کرتا ہے ؟ تو وہ کہنے لگا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ شیعوں کو اس طرح سے تکلیف اور دکھ پہنچاؤں ، کیونکہ میں نے انہیں اس چیز سے زیادہ اور کسی چیز کو دکھ دینے والا نہیں دیکھا اور بعد میں اُسے اس عمل سے توبہ کرنے پر آمادہ کیا[2]

---

حاشیہ بر صفحہ سابق : آیات قرآن میں ۸ مقامات پر بُرے اعمال کے زینت دینے کی نسبت شیطان کی طرف دی گئی ہے اور دس مقامات پر فعل مجہول کی شکل میں ( زیّن ) آیا ہے اور دو مقامات پر خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے ۔ اوپر جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر توجہ کرتے ہوئے تینوں مقامات کا معنی واضح ہو جاتا ہے ۔

[1] نہج البلاغہ کلام ۲۰۶ صبحی صالح ۔

[2] تفسیر روح المعانی آلوسی جلد ۷ ، صفحہ ۲۱۸ ۔

۱۰۹۔ وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ لَّيُؤۡمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰيٰتُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَمَا يُشۡعِرُكُمۡ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝

۱۱۰۔ وَنُقَلِّبُ اَفۡـئِدَتَهُمۡ وَاَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۝

## ترجمہ

۱۰۹۔ انہوں نے بہت ہی اصرار سے اللہ کی قسم کھائی کہ اگر کوئی نشانی (معجزہ) ان کے لیے آجائے تو وہ یقیناً اس پر ایمان لے آئیں گے (اے رسول تم ان سے) کہہ دو کہ معجزات خدا کی طرف سے ہوتے ہیں (اور یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں تمہاری خواہش پر معجزہ لے آؤں) اور تم نہیں جانتے کہ وہ معجزات کے آجانے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے۔

۱۱۰۔ اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو اندھا کردیں گے کیونکہ وہ ابتدا میں ایمان نہیں لائے تھے اور انہیں طغیان و سرکشی کے عالم میں خود ان کی حالت میں چھوڑ دیں گے تاکہ وہ سرگرداں ہو جائیں۔

## شان نزول

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کی شان نزول کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ قریش کا ایک گروہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ تم موسیٰ اور عیسیٰ کے بڑے بڑے معجزات بیان کرتے ہو اور اسی طرح دوسرے انبیاء کے بھی، تم بھی ہمیں کوئی ایسا ہی کام کرکے دکھاؤ تاکہ ہم ایمان لائیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم کونسا کام چاہتے ہو کہ میں اسے تمہارے لیے انجام دوں۔ انہوں نے کہا کہ تم خدا سے درخواست کرو کہ وہ کوہ صفا کو سونے میں تبدیل کر دے اور ہمارے بعض پہلے کے مرے ہوئے مردے زندہ ہو جائیں اور ہم ان سے تیری حقانیت کے بارے میں سوال کریں اور ہمیں فرشتے بھی دکھا جو تیرے بارے میں گواہی دیں یا خدا اور فرشتوں کو اکٹھا اپنے ساتھ لے آ۔

پیغمبرؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں ان میں سے بعض کام انجام دے دوں تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہم ایسا کریں گے (یعنی ایمان لے آئیں گے) مسلمانوں نے جب مشرکین کا اس سلسلہ میں اصرار دیکھا تو پیغمبرؐ سے تقاضا کیا کہ آپ ایسا کریں شاید یہ ایمان لے آئیں، جونہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا کرنے کے لیے آمادہ ہوئے کہ ان میں سے بعض مطالبات کے لیے خدا سے دعا کریں (کیونکہ ان میں سے بعض تو نامعقول اور محال تھے) کہ امین وحی خدا نازل ہوئے اور یہ پیغام لائے کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کی دعا قبول ہو جائے گی لیکن اس صورت میں (چونکہ ہر لحاظ سے اتمام حجت ہو جائے گا اور یہ حسی طور پر ظاہر بظاہر کھل کر سامنے آجائے گا) اگر پھر بھی یہ ایمان نہ لائے تو سب کو سخت عذاب ہو گا (اور نیست و نابود ہو جائیں گے) لیکن اگر ان کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے اور تم انہیں ان کی اپنی اسی حالت پر چھوڑ دو تو ممکن ہے کہ ان میں سے بعض آئندہ توبہ کریں اور راہ حق اختیار کر لیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قبول کر لیا اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

## تفسیر

گذشتہ آیات میں توحید کے بارے میں متعدد منطقی دلیلیں بیان ہوئی ہیں کہ جو خدا کی وحدانیت کے اثبات اور شرک و بت پرستی کی نفی کے لیے کافی تھیں لیکن اس کے باوجود ہٹ دھرم اور متعصب مشرکین کی ایک جماعت نے سر تسلیم خم نہ کیا اور وہ بہانے تراشنے لگے اور منجملہ ان کے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عجیب و غریب خارق عادات کے لیے کہ جن میں سے بعض تو بنیادی طور پر محال تھے، مطالبہ کرنے لگے اور دروغ بیانی کے ساتھ یہ دعویٰ کرنے لگے کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کے معجزات دیکھ کر ایمان لے آئیں۔ قرآن پہلی آیت میں ان کی کیفیت اور وضع کو اس طرح بیان کرتا ہے: انہوں نے انتہائی اصرار کے ساتھ یہ قسم کھائی کہ اگر ان کے لیے معجزہ آجائے تو وہ ایمان لے آئیں گے (واقسموا باللہ جھد ایمانھم لئن جائتھم اٰیة لیؤمنن بھا)۔[1]

قرآن ان کے جواب میں دو حقیقتوں کو بیان کرتا ہے: پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ تو ان سے یہ کہہ دے کہ یہ کام میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں تمہارے ہر مطالبے اور ہر تقاضے کو پورا کر دوں، بلکہ معجزات تو صرف خدا ہی کی طرف سے (ہوتے) ہیں، اور اسی کے فرمان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں (قل انما الاٰیات عند اللہ)۔

اس کے بعد روئے سخن ان سادہ لوح مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے کہ جو ان کی سخت اور شدید قسموں سے متاثر ہو گئے تھے کہتا ہے: تم نہیں جانتے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور اگر یہ معجزات اور ان کی درخواستوں کے مطابق نشانیاں دکھا بھی دی جائیں تب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے (وما یشعرکم انھا اذا جاء

---

[1] "جھد" کسی بھی کام کرنے کے لیے سعی و کوشش کرنے کو کہتے ہیں اور یہاں تاکیدی قسموں کے لیے کوشش کرنا مراد ہے

لا یؤمنون)[1]۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُن کے ساتھ ٹکراؤ کے مختلف مناظر اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ یہ گروہ حق کی جستجو میں نہیں تھا بلکہ ان کا ہدف اور مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بہانہ تراشیوں میں لگائے رکھیں اور شک وشبہ کے بیج ان کے دلوں میں بکھیرتے رہیں۔

بعد والی آیت میں ان کی ہٹ دھرمی کی علت کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے کہ وہ کجروی، جاہلانہ تعصبات اور حق کے مقابلہ میں سر تسلیم خم نہ کرنے پر اصرار کی وجہ سے قوتِ ادراک اور صحیح نظر کھو بیٹھے ہیں۔ اور حیران و پریشان اور گمراہ ہو کر سرگردانی کے عالم میں پھر رہے ہیں چنانچہ قرآن اس طرح کہتا ہے: ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو دگرگوں کر دیں گے جیسا کہ وہ آغاز میں اور دعوت کی ابتداء میں ایمان نہیں لاتے تھے (ونقلب افئدتھم و ابصارھم کمالم یؤمنوا بہ اول مرۃ)۔

یہاں بھی اس کام کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے جس کی ایک نظیر قبل کی آیات میں گذر چکی ہے۔ یہ حقیقت میں خود انہی کے اعمال کا نتیجہ اور عکس العمل ہے۔ اس کی خدا کی طرف نسبت اس عنوان سے ہے کہ وہ علت العلل اور عالم ہستی کا سرچشمہ ہے اور ہر چیز میں جو بھی خاصیت ہے وہ اسی کے ارادہ سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں خداوند تعالیٰ نے ہٹ دھرمی، کجروی اور اندھے تعصبات میں یہ اثر پیدا کیا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ انسان کے ادراک اور فکر و نظر کو بے کار کر دیتے ہیں۔

آیت کے آخر میں کہتا ہے: ہم انہیں طغیان وسرکشی کی حالت میں ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ سرگرداں پھرتے رہیں (ونذرھم فی طغیانھم یعمھون)[2]۔

خداوند تعالیٰ ہم سب کو اس قسم کی سرگردانی سے جو ہمارے بے سوچے سمجھے اعمال کا نتیجہ ہے محفوظ رکھے اور ہمیں قوتِ ادراک اور ایسی کامل نظر مرحمت فرمائے کہ ہم حقیقت کے چہرے کو اس کی اصلی ہیئت وصورت میں دیکھ لیں۔

---

[1] اس بارے میں کہ اوپر والے جملے میں "ما" استفہامیہ ہے یا نافیہ اور اسی طرح جملے کی ترکیب کی کیفیت میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف پایا جاتا ہے، بعض نے "ما" کو استفہام انکاری قرار دیا ہے، حالانکہ اگر ایسا ہو تو جملہ کا معنی یہ ہوگا کہ: تم کہاں سے جانتے ہو کہ اگر معجزہ آگیا تو یہ ایمان نہیں لائیں گے، یعنی ہوسکتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور یہ مفہوم مقصودِ آیت کے بالکل برخلاف ہے، لہٰذا بعض نے "ما" کو نافیہ قرار دیا ہے (اور ذہن سے زیادہ نزدیک بھی یہی ہے) تو اس بناء پر جملے کا معنی اس طرح ہوگا: تم نہیں جانتے کہ اگر یہ معجزات دکھا بھی دیئے جائیں تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس صورت میں "یشعر" کا فاعل لفظ "شیئ" ہے جو مقدر ہے اور "یشعر" کے دو مفعول ہیں پہلا مفعول "کم" اور دوسرا "انھا"۔ (غور کیجئے گا)

[2] "یعمھون" "عمہ" (بروزن "قدح") کے مادہ سے سرگردانی اور تحیر کے معنی میں ہے۔

۱۱۱۔ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ○

## ترجمہ

۱۱۱۔ اور اگر ہم ان پر فرشتوں کو نازل کر دیتے اور مردے اُن سے باتیں کرتے اور تمام چیزوں کو ان کے سامنے جمع کر دیتے تو بھی وہ ہرگز ایمان نہ لاتے، مگر یہ کہ خدا چاہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

## تفسیر

### ہٹ دھرم لوگ راہِ راست پر کیوں نہیں آتے؟

یہ آیت گذشتہ آیات کے ساتھ مربوط ہے۔ یہ سب آیات ایک ہی حقیقت کو بیان کرتی ہیں، ان چند آیات کا مفہوم یہ ہے کہ ان عجیب و غریب معجزات کا تقاضا کرنے والوں میں سے بہت سے اپنے تقاضوں میں سچے نہیں ہیں اور ان کا ہدف حق کو قبول کرنا نہیں ہے لہٰذا ان کے مطالبات میں سے بعض (مثلاً خدا کا ان کے سامنے آنا) اصولاً محال ہیں۔

وہ اپنے گمان کے مطابق چاہتے یہ ہیں کہ ان عجیب و غریب معجزات کا تقاضا کر کے مومنین کے افکار کو متزلزل کر دیں اور حق طلب لوگوں کے نظریے غلط ملط ہوں اور یہ انہیں اپنی طرف مشغول کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن زیر نظر آیت میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے: اگر ہم (جس طرح انہوں نے درخواست کی تھی) فرشتوں کو ان پر نازل کر دیتے، اور مردے بھی آ جاتے اور اُن سے باتیں کرتے اور خلاصہ یہ کہ جو جو مطالبات اور تقاضے وہ کر رہے تھے ان سب کو جمع کر دیتے تو پھر بھی وہ ایمان نہ لاتے (ولو اننا نزلنا الیھم الملائکۃ وکلمھم الموتٰی وحشرنا علیھم کل شیء قبلاً ما کانوا لیؤمنوا)[1]۔

---

[1] "حشرنا علیھم کل شیء" سے مراد یہ ہے کہ تمام چیزیں اور اُن کے تمام مطالبات پورے کر دیئے جائیں، کیونکہ "حشر" اصل میں جمع کرنے اور ایک دوسرے کے گرد لانے کے معنی میں ہے۔ اور قبلا کا معنی روبرو اور مدمقابل ہونا ہے، یہ احتمال بھی ہے کہ "قبلا" قبیل کی جمع ہو، یعنی گروہ در گروہ فرشتے اور مردے اور ......... ان کے سامنے آ حاضر ہوں۔

اس کے بعد تائید مطلب کے لیے فرماتا ہے: صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنی جبری مشیت کے ذریعہ انہیں ایمان کے قبول کرنے پر آمادہ کر دے اور یہ بات ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایمان کوئی تربیتی فائدہ اور تکاملی اور ارتقائی اثر نہیں رکھتا (الا ان یشاء اللہ)۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے کہ ان میں سے اکثر جاہل اور بے خبر ہیں (ولکن اکثرھم یجھلون)۔

اس بارے میں کہ اس جملے میں ضمیر "ھم" سے کون سے اشخاص مراد ہیں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ممکن ہے یہ اشارہ اُن مومنین کی طرف ہو جو یہ اصرار کر رہے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار کے اس گروہ کے مطالبات پورا کر دیں اور جس جس معجزہ کے لیے وہ تقاضا کر رہے ہیں اُسے لے آئیں۔

ان مومنین میں سے کیونکہ بہت سے اس واقعیت سے بے خبر تھے اور اس بات کی طرف متوجہ نہیں تھے کہ وہ اپنے تقاضے میں سچے نہیں ہیں، لیکن خدا جانتا تھا کہ یہ مدعی جھوٹ بول رہے ہیں، اسی بنا پر ان کے مطالبات کو پورا نہ کیا، لیکن اس بنا پر کہ دعوت پیغمبر معجزہ کے بغیر نہیں ہو سکتی لہٰذا خاص مواقع پر ان کے ہاتھ پر مختلف معجزات ظاہر کیے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ضمیر "ھم" کا مرجع اور بازگشت تقاضا کرنے والے کفار ہوں۔ یعنی اُن میں سے بیشتر اس واقعیت سے بے خبر ہیں کہ خدا ہر قسم کے خارق العادۃ فعل پر قدرت رکھتا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی قدرت کو محدود جانتے ہیں۔ لہٰذا جب بھی پیغمبر کوئی معجزہ دکھاتے تھے تو وہ اُسے جادو یا نظر فریبی پر محمول کرتے تھے جیسا کہ ہم دوسری آیت میں پڑھتے ہیں:

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ۝

اگر ہم آسمان سے کوئی دروازہ ان کے اوپر کھول دیتے اور وہ اس کے ذریعے اُوپر چڑھ جاتے تو کہتے کہ ہماری تو نظروں کو دھوکا دیا گیا ہے اور ہمارے اُوپر جادو کر دیا گیا ہے۔ (حجر ۱۴-۱۵)۔

اس بنا پر وہ ایک نادان اور ہٹ دھرم گروہ ہے، لہٰذا ان کی اور ان کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرنا چاہیے۔

۱۱۲۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝

تَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـــِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ۝

## ترجمہ

۱۱۲۔ اس طرح ہم نے ہر نبی کے مقابلے میں شیاطینِ جن وانس سے کچھ دشمن قرار دیئے ہیں کہ جو پُرفریب اور بے بنیاد باتیں (لوگوں کو غافل رکھنے کے لیے مخفی طور پر (اور کانوں میں) ایک دوسرے سے کہتے تھے۔ اور اگر تیرا پروردگار چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے (اور وہ انہیں جبری طور پر روک سکتا تھا لیکن اجبار واکراہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے) اس بناء پر انہیں اور ان کی تہمتوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دو۔

۱۱۳۔ اور (شیطانی وسوسوں اور شیطان صفت افراد کی تبلیغات کا) نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن لوگوں کے دل جو روزِ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ان کی طرف مائل ہو جائیں گے اور وہ اس پر راضی ہو جائیں گے اور جو گناہ بھی وہ انجام دینا چاہیں گے، دیں گے۔

## تفسیر

### شیطانی وسوسے

اس آیت میں اس بات کی وضاحت کی جا رہی ہے کہ اس قسم کے سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں کا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں وجود کہ جس کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے صرف آنحضرتؐ کی ذات کے لیے ہی منحصر نہیں تھا بلکہ تمام انبیاء ہی کے مقابلہ میں شیاطینِ جن وانس میں سے دشمن موجود تھے (وکذٰلك جعلنا لکل نبی عدوًا شیاطین الانس والجن) اور ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ پُرفریب باتیں ایک دوسرے کو غافل کرنے کے لیے پُراسرار طریقے پر بھی اور ظاہر بظاہر بھی ایک دوسرے کے کان میں کہتے تھے" (یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورًا)۔

لیکن اشتباہ نہیں ہونا چاہیے کہ اگر خدا چاہتا تو وہ جبراً سب کو روک سکتا تھا، تاکہ کوئی شیطان یا شیطان صفت انبیاء اور ان کی دعوت کے راستے میں کوئی معمولی سے معمولی رکاوٹ بھی نہ ڈال سکے (ولو شاء ربك ما فعلوہ)۔

لیکن خداوند تعالیٰ نے یہ کام نہیں کیا کیونکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ لوگ آزاد رہیں تاکہ ان کی آزمائش اور ارتقا و پرورش کے لیے میدان موجود رہے۔ جب کہ جبر اور سلبِ آزادی اس ہدف کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ اس قسم کے سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں کا وجود (اگرچہ ان کے اعمال خود ان کی خواہش وارادہ کے ماتحت تھے) نہ صرف یہ کہ وہ سچے مومنین کے لیے کوئی ضرر نہیں رکھتا، بلکہ غیر مستقیم طریقہ سے ان کے تکامل میں مدد کرتا ہے

چونکہ ہمیشہ تکامل وارتقا تضادات میں پنہاں ہوتا ہے اور ایک طاقتور دشمن کا ہونا انسان کی قوتوں کے اجتماع اور اس کے ارادوں کی تقویت کے لیے موثر ہے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں خدا تعالیٰ پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ تم اس قسم کی شیطنتوں کی کسی طرح بھی پرواہ نہ کرو اور انہیں اور ان کی تہمتوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دو (فذرھم وما یفترون)۔

## چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ مندرجہ بالا آیت میں خداوند تعالیٰ شیاطین جن وانس کے وجود کی نسبت اپنی طرف دے رہا ہے اور کہتا ہے "وکذلک جعلنا" (ہم نے ایسا قرار دیا)۔ اس جملے کے معنی کے بارے میں اختلاف ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ انسانوں کے تمام اعمال ایک لحاظ سے خدا کی طرف بھی منسوب کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ ہر شخص جو کچھ بھی رکھتا ہے وہ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ اس کی قدرت اسی کی طرف سے ہے جیسا کہ اس کا اختیار اور اس کے ارادے کی آزادی بھی اسی کی طرف سے ہے، لیکن ایسی تعبیرات کا مفہوم ہرگز جبر اور سلب اختیار نہیں ہے کہ خدا نے کچھ لوگوں کو اس طرح سے پیدا کیا ہو کہ وہ انبیاء کے مقابلے میں دشمنی کے لیے کھڑے ہو جائیں۔

کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ضروری تھا کہ وہ اپنی عداوت ودشمنی میں کسی قسم کی کوئی مسئولیت اور جوابدہی نہ رکھتے ہوتے بلکہ ان کا کام ایک رسالت کی انجام دہی شمار ہوتا۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔

البتہ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کے دشمنوں کا وجود چاہے وہ خود ان کے اپنے اختیار سے ہی ہو، مومنین کے لیے بالواسطہ طور پر اصلاح کنندہ اثر رکھتا ہے، اور بہتر لفظوں میں سچے مومنین ہر قسم کے دشمن کے وجود سے مثبت اثر لے سکتے ہیں اور اُسے اپنی آگاہی وآمادگی اور مقاومت کی سطح بلند کرنے کا وسیلہ بنا سکتے ہیں کیونکہ دشمن کا وجود انسان کی قوتوں کے اجتماع کا سبب اور باعث ہوتا ہے۔

۲۔ لفظ "شیاطین" "شیطان" کی جمع ہے اور یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور وہ ہر سرکش باغی اور موذی موجود کے معنی میں ہے، لہٰذا قرآن میں پست، خبیث اور سرکش انسانوں پر بھی لفظ شیطان بولا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر والی آیت میں لفظ شیطان کا انسانی شیطانوں پر بھی اور ایسے غیر انسانی شیطانوں پر بھی جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں، اطلاق ہوا ... ... ، "اس شیطان کا اسم خاص ہے کہ جو حضرت آدم علیہ السلام کے مقابل میں آیا تھا اور حقیقت میں و... شیاطین کا رئیس وسردار ہے۔ اس بنا پر شیطان اسم جنس ہے اور ابلیس اسم خاص [1]

۳۔ "زخرف القول" پر فریب باتوں کو کہتے ہیں، جن کا ظاہر خوشنما اور باطن قبیح اور برا ہوتا ہے اور غرور کا معنی غفلت میں رکھنا ہے [2]

---

[1] اس سلسلہ میں ہم تفسیر نمونہ کی پہلی جلد ص ۱۶۴ پر بھی بحث کر چکے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر

۴۔ زیرِ نظر آیت میں وحی کی تعبیر اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ اپنے شیطانی گفتار و اعمال میں ایسے اسرار آمیز پروگرام رکھتے ہیں کہ جن کو وہ رازدارانہ طریقے سے ایک دوسرے کی طرف القا کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ اُن کے کاموں سے آگاہ نہ ہوں اور ان کی سازشیں کامل طور پر کامیابی سے ہمکنار ہو جائیں۔ کیونکہ "وحی" کے معانی میں سے ایک معنی لغت میں آہستہ اور کان میں بات کرنا بھی ہے۔

بعد والی آیت میں شیاطین کی پُرفریب تلقینات و تبلیغات کے نتیجے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ان کے کام کا سرانجام یہ ہوگا کہ بے ایمان افراد یعنی وہ جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کی باتوں کو کان لگا کر سنیں گے اور ان کے دل ان کی طرف مائل ہوں گے (ولتصغی الیہ افئدۃ الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ)[1]۔

"لتصغی" "صغو" (بروزن سرو) کے مادہ سے کسی چیز کی طرف میلان پیدا کرنے کے معنی میں ہے، لیکن زیادہ تر اس میلان و رغبت پر بولا جاتا ہے کہ جو سماعت اور کان کے وسیلہ سے حاصل ہو اور اگر کوئی شخص کسی کی بات پر موافقت کی نظر سے کان دھرے تو اس کو "صغو" اور "اصغاء" کہتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس میلان کا انجام شیطانی پروگراموں پر کامل طور پر راضی ہونے کی صورت میں نکلے گا (ولیرضوہ)۔

اور اُن سب کا نتیجہ مختلف قسم کے گناہوں کے ارتکاب اور برے اور ناپسندیدہ اعمال کی صورت میں رونما ہوگا (ولیقترفوا ما ھم مقترفون)۔

۱۱۴۔ اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡتَغِیۡ حَکَمًا وَّ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ○

---

حاشیہ صفحہ سابقہ: اس طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ زخرف اصل میں "زینت" کے معنی میں ہے، اور اسی طرح "سونے" کے معنی میں بھی کہ جو زینت کا ایک ذریعہ ہے۔ بعد ازاں دھوکا اور فریب دینے والی باتوں پر بھی کہ جن کا ظاہر زیبا اور خوبصورت ہو "زخرف" اور "مزخرف" بولا جانے لگا۔

[1] آیت کی ترکیب کے بارے میں اور یہ کہ لفظ "ولتصغی" کا عطف کس پر ہے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ آیت کے ساتھ جو بات زیادہ مناسب ہے وہ یہ ہے کہ اس کا عطف "یوحی" پر ہونا چاہیے اور اس کی "لام" "عاقبت کی لام" ہے۔ یعنی شیاطین کے کام کا انجام یہ ہوگا کہ وہ پُرفریب باتیں ایک دوسرے سے کہیں گے، اور بے ایمان افراد ان کی طرف مائل ہو جائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ "غرورا" کے اوپر عطف ہو جو "مفعول لاجلہ" ہے۔ یعنی "لیغتروا ولتصغی" کیونکہ انسان مرحلہ اول میں فریب کھاتا ہے اور پھر میلان پیدا کرتا ہے (غور کیجیے گا)۔

۱۱۵۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

## ترجمہ

۱۱۴۔ کیا میں (اس حال میں) غیر خدا کو منصف کے طور پر اپناؤں حالانکہ وہی وہ ہستی ہے کہ جس نے اس آسمانی کتاب کو جس میں ہر چیز کا تفصیلی بیان ہے نازل کیا ہے، اور وہ لوگ کہ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تیرے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اس بناء پر تم ہرگز شک و تردد کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔

۱۱۵۔ اور تیرے پروردگار کا کلام صدق و عدل کے ساتھ انجام کو پہنچا۔ کوئی شخص اس کے کلمات کو دگرگوں نہیں کر سکتا اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

## تفسیر

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیات کا نتیجہ ہے اور یہ آیت کہتی ہے کہ ان واضح آیات کے باوجود جو توحید کے سلسلے میں گزر چکی ہیں کیا کسی شخص کو منصف اور حکم کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ کیا میں غیر خدا کو منصف اور حکم کے طور پر قبول کر لوں (افغیر الله ابتغی حکما)[1]۔

جب کہ وہی ذات ہے کہ جس نے یہ عظیم آسمانی کتاب نازل کی ہے جس میں انسان کی تمام تربیتی ضروریات آچکی ہیں اور جس نے حق و باطل، نور و ظلمت اور کفر و ایمان کے درمیان فرق ظاہر کر دیا ہے (وھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلا)۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے نہ صرف تم اور تمام مسلمان اس بات کو جانتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے

---

[1] "حکم" (بر وزن قلم) کا معنی فیصلہ کرنے والا، قاضی اور حاکم ہے اور بعض نے اسے معنی کے لحاظ سے حاکم کے مساوی جانا ہے لیکن مفسرین کی ایک جماعت کہ جن میں ایک شیخ طوسی بھی ہیں، کتاب "تبیان" میں انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ "حکم" اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جو حق کے علاوہ فیصلہ نہ کرتا ہو لیکن دونوں کے لیے بولا جاتا ہے بعض دوسرے کہ جن میں "المنار" کا مؤلف بھی ہے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ "حکم" وہ شخص ہے جسے طرفین دعویٰ نے انتخاب کیا ہو۔ جبکہ حاکم ہر قسم کے فیصلہ کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔

ہے ، بلکہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کہ جنہوں نے اس آسمانی کتاب کی نشانیاں اپنی کتابوں میں دیکھی ہیں ، وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے (والذین اٰتینٰھم الکتٰب یعلمون انه منزل من ربك بالحق) ۔ اس بنا پر اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے "اور اے پیغمبر تم ہرگز اس بارے میں تردد کرنے والوں میں سے نہ ہونا (فلا تکونن من الممترین)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس بارے میں کچھ شک تھا کہ اس قسم کا خطاب آپ سے ہو رہا ہے ؟

اس سوال کا جواب وہی ہے جو ہم نے اس کے مشابہ اور اس سے ملتے جلتے مواقع پر دیا ہے اور وہ یہ کہ اس میں درحقیقت مخاطب تو عام لوگ ہیں لیکن خداوند تعالیٰ تاکید اور تحکیم مطلب کے لیے اپنے پیغمبر کو مخاطب کرتا ہے تاکہ دوسرے لوگ اپنے بارے میں جان لیں۔

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: تیرے پروردگار کا کلام صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہوگیا اور کوئی بھی شخص اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اس کے کلمات کو دگرگوں کردے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے (وتمت کلمة ربك صدقا وعدلا لا مبدل لکلماته وهو السمیع العلیم)۔ "کلمة" لغت عرب میں گفتگو اور ہر قسم کے جملے کے معنی میں ہے یہاں تک کہ مفصل اور طولانی گفتگو کو بھی کہا جاتا ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ بعض اوقات وعدہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا

تیرے پروردگار کا وعدہ بنی اسرائیل کے بارے میں اس صبر و استقامت کے مقابلے میں جو انہوں نے کیا انجام پاگیا۔ (سورہ اعراف ۔ ۱۳۷)

یہ بھی اسی لحاظ سے ہے کیونکہ انسان وعدہ کرتے وقت ایسا جملہ کہتا ہے جو وعدہ کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہوتا ہے۔

بعض اوقات "کلمہ" دین و آئین اور حکم و دستور کے معنی میں بھی آتا ہے اور وہ بھی اسی اصل کی طرف لوٹتا ہے۔

اس بارے میں کہ زیر بحث آیت میں لفظ "کلمہ" سے مراد قرآن ہے یا خدا کا دین و آئین ہے یا کامیابی کے وہ وعدے جو پیغمبرؐ سے کیے گئے تھے مختلف احتمالات ہیں کہ جن میں مختلف ہونے کے باوجود کوئی تضاد نہیں ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آیت میں تمام احتمالات کو مدنظر رکھا گیا ہو لیکن اس لحاظ سے کہ گذشتہ آیات میں گفتگو قرآن کے بارے میں تھی، معنی زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

حقیقت میں آیت یہ بیان کر رہی ہے کہ کسی طرح سے بھی قرآن میں کوئی شک اور تردد کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ہر لحاظ سے کامل اور بے عیب ہے ، اس کی تواریخ اور اخبار سب کے سب صدق ہیں اور اس کے احکام و قوانین سب کے سب عدل ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ " کلمہ " سے مراد وہی " وعدہ " ہو جو بعد والے جملہ میں یعنی " لامبدل لکلماتہ " (کوئی شخص کلمات خدا میں تغیر اور تبدیل نہیں کر سکتا) کے جملہ میں آیا ہے کیونکہ اس جملہ کی نظیر دوسری آیات قرآنی میں بھی نظر آتی ہے مثلاً:
وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ (ھود : ۱۱۹)
یا دوسری آیات میں ہم پڑھتے ہیں :- (وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ) پیغمبروں کے بارے میں ہمارا پہلے سے یہ وعدہ تھا کہ مظفر و منصور تو وہی ہوں گے (سورہ صافات آیہ ۱۷۱، ۱۷۲)
اس قسم کی آیات میں بعد کا جملہ اس وعدہ کی وضاحت ہے کہ جس کی طرف قبل کے جملہ میں لفظ " کلمہ " کے ذکر سے اشارہ ہوا ہے۔ اس بنا پر آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی " ہمارا وعدہ صدق و عدالت کے ساتھ انجام پذیر ہوا کوئی شخص پروردگار کے احکام اور فرائض میں تبدیلی کی طاقت نہیں رکھتا "
اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے یہ ہو سکتا ہے کہ یہ آیت ان تمام معانی کی طرف اشارہ کرتی ہو۔
اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ آیت اگر قرآن کی طرف اشارہ کر رہی ہو تو یہ بات اس امر سے کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتی کہ اس وقت تک سارا قرآن نازل نہیں ہوا تھا کیونکہ آیات قرآن کے کامل ہونے سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ نازل ہو چکا تھا اس میں کوئی عیب اور نقص نہیں اور وہ ہر لحاظ سے کامل ہے۔
بعض مفسرین نے اس آیت سے قرآن میں تحریف کے بارے میں عدم امکان پر استدلال کیا ہے۔ کیونکہ " لا مبدل لکلماتہ " کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی شخص لفظ کے لحاظ سے، اخبار کے لحاظ سے اور احکام کے لحاظ سے قرآن میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتا اور یہ آسمانی کتاب جسے آخر دنیا تک عالمین کا رہنما ہونا چاہیے خیانت کرنے والوں اور تحریف کرنے والوں کی دستبرد سے مصون و محفوظ رہے گی۔

۱۱۶۔ وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝

۱۱۷۔ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝

## ترجمہ

۱۱۶۔ اور اگر تم زمین پر رہنے والے لوگوں میں سے اکثر لوگوں کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں راہ خدا سے گمراہ کر دیں گے، وہ تو صرف ظن اور گمان کی پیروی کرتے ہیں اور وہ اٹکل پچو لڑاتے رہتے ہیں۔

۱۱۷۔ تیرا پروردگار اُن لوگوں سے بھی خوب اچھی طرح آگاہ ہے جو اُس کی راہ سے گمراہ ہو گئے ہیں اور اُن لوگوں سے بھی کہ جو ہدایت یافتہ ہیں۔

## تفسیر

ہم جانتے ہیں کہ اس سورہ کی آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور اس زمانے میں مسلمان انتہائی اقلیت میں تھے۔ یہ ممکن تھا کہ اُن کی اقلیت اور بت پرستوں اور مخالفین اسلام کی قطعی اکثریت بعض لوگوں کے لیے یہ توہم پیدا کر دے کہ اگر ان کا دین و آئین باطل اور بے اساس ہے تو ان کی پیروی کرنے والے اتنی اکثریت میں کیوں ہیں اور اگر ہم حق پر ہیں تو اسس قدر کم تعداد میں کیوں ہیں۔

اس آیت میں اس توہم کو دفع کرنے کے لیے کہ جو ممکن تھا کہ قبل کی آیات میں قرآن کی حقانیت کے ذکر کے بعد پیدا ہو جائے، اپنے پیغمبر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے، اگر تم زمین میں رہنے والے اکثر لوگوں کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں راہِ حق سے گمراہ اور منحرف کر دیں گے (وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللّٰہ)۔

بعد والے جملے میں اس امر کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، اس کی علت اور سبب یہ ہے کہ وہ منطق اور فکرِ صحیح کی بنیاد پر کام نہیں کرتے "ان کے راہنما ہوا و ہوس سے آلودہ گمان ہیں اور کچھ جھوٹ، فریب اور تخمینے ہیں (ان یتبعون الا الظن و ان ھم الا یخرصون)[1]۔

چونکہ قبل والی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ محض اکثریت تمہارا راہِ حق کی نشاندہی نہیں کر سکتی، تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ راہِ حق صرف خدا سے حاصل کرنا چاہیے چاہے حق کے طرفدار اقلیت میں ہی کیوں نہ ہوں۔ لہٰذا دوسری آیت میں اس امر کی دلیل واضح کرتا ہے کہ تیرا پروردگار کہ جو تمام چیزوں سے باخبر اور آگاہ ہے اور اس کے علم غیر متناہی میں ذرہ بھر اشتباہ بھی نہیں ہے وہ بہتر طور پر جانتا ہے کہ راہِ ضلالت کونسی ہے اور راہِ ہدایت کونسی، اور وہ گمراہوں اور ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی بہتر طور پر پہچانتا ہے (ان ربک ھو اعلم من یضل عن سبیلہ و ھو اعلم بالمھتدین)[2]۔

---

[1] "خرص" (بروزن ترس) اصل میں تخمین کے معنی میں ہے، پہلے پہل تو باغ وغیرہ کو کرایہ پر دینے کے وقت درختوں پر پھلوں کی مقدار کے تخمینے اور اندازے کے لیے استعمال ہوتا تھا، بعد از اں ہر قسم کے حدس و تخمین کے لیے یہ لفظ بولا جانے لگا اور چونکہ تخمینہ اور اندازہ بعض اوقات واقع کے مطابق اور بعض اوقات اس کے خلاف ہوتا ہے لہٰذا یہ لفظ جھوٹ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور مندرجہ بالا آیت میں ہو سکتا ہے دونوں معانی کے لیے ہو۔

[2] عموماً "افعل تفضیل" "با" کے ذریعہ متعدی ہو جاتا ہے لہٰذا یہاں یہ کہنا چاہیے "اعلم بمن" لیکن "با" محذوف ہے اور "من یضل" اصطلاح کے مطابق منصوب بنزع خافض ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دوسرے لوگ راہِ ہدایت وضلالت کو خدا کی رہنمائی کے بغیر بھی پہچان لیتے ہیں، کہ آیت یہ کہہ رہی ہے کہ خدا دوسروں سے بہتر طور پر پہچانتا اور بہتر طور پر جانتا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ انسان اپنی عقل کے ذریعے حقائق کا ادراک کرتا ہے اور راہِ ہدایت وضلالت کو کسی حد تک سمجھ لیتا ہے لیکن یہ بات مسلم ہے کہ چراغِ عقل کی روشنی اور اس کی شعاع محدود ہے، اور ممکن ہے کہ بہت سے مطالب نگاہِ عقل سے مخفی رہ جائیں۔ علاوہ ازیں انسان اپنی معلومات میں اشتباہ میں بھی گرفتار ہو جاتا ہے اور اسی بنا پر وہ خدائی رہبروں اور رہنماؤں کا محتاج ہے۔ اس لیے یہ جملہ کہ "خدا زیادہ جانتا ہے" صحیح ہے۔ اگرچہ انسان کا علم خدا کے علم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

## عددی اکثریت کچھ اہمیت نہیں رکھتی

بعض لوگوں کی نظر میں یہ بات مسلم ہے کہ عددی اکثریتیں ہمیشہ صحیح راستہ پر گامزن ہوتی ہیں لیکن قرآن اس کے برخلاف متعدد آیات میں اس کی نفی کرتا ہے اور وہ عددی اکثریت کے لیے کسی اہمیت کا قائل نہیں ہے اور حقیقت میں وہ اکثریت "کیفی" کو معیار سمجھتا ہے نہ کہ اکثریت "کمی" کو۔ اس امر کی دلیل واضح ہے، کیونکہ آج کے معاشروں میں اگرچہ معاشرے کے امور میں لوگوں کو اکثریت پر بھروسہ کرنے کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں سوجھا لیکن یہ بات بھولنا نہیں چاہیے کہ یہ بات جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ایک طرح سے مجبوری کے باعث قبول کرنا پڑتی ہے، کیونکہ ایک مادی معاشرے میں اصلاحات کرنے اور درست قوانین بنانے کا کوئی ایسا ضابطہ موجود نہیں جو اشکال اور عیب سے خالی ہو لہٰذا بہت سے علماء اور ماہرین اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے ساتھ کہ افراد معاشرہ کی اکثریت کی نظر اکثر اوقات اشتباہ آمیز ہوتی ہے اس بات کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ دوسرے راستوں کے عیوب اس سے زیادہ ہیں۔

لیکن ایک ایسا معاشرہ جو انبیاء علیہم السلام کی رسالت پر ایمان رکھتا ہو وہ قوانین کے نفاذ اور برپا کرنے کے لیے اکثریت کی پیروی کی کوئی مجبوری نہیں رکھتا۔ کیونکہ سچے انبیاء کے پروگرام اور قوانین ہر قسم کے نقص، عیب اور اشتباہ سے خالی ہوتے ہیں اور جن قوانین کی جائز الخطا اکثریت تصویب وتصدیق کرتی ہے ان کا ان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

آج کی دنیا کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالنے اور ان حکومتوں پر جو اکثریت کی بنیاد پر قائم ہوئی ہیں نظر کرنے اور ان نادرست اور ہوس آمیز قوانین کو جو بعض اوقات اکثریتوں کی طرف سے تائید وتصویب شدہ ہوتے ہیں دیکھنے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اکثریت عددی نے کسی درد کی دوا نہیں کی ہے۔ بہت سی جنگوں کی اکثریت نے تصویب کی تھی اور بہت سے مفاسد کو اکثریت نے ہی چاہا تھا۔

استعمار واستثمار، جنگیں اور خونریزیاں، شراب نوشی کی آزادی، قمار بازی، اسقاطِ حمل، فشارِ منکر یہاں تک کہ بعض ایسے قبیح وشنیع اعمال کہ جن کا ذکر باعث شرم ہے بہت سے ایسے ممالک جو اصطلاح میں ترقی یافتہ کہلاتے ہیں کے نمائندوں کی اکثریت کی طرف سے ہیں جو ان ممالک کے عوام کی اکثریت کے نظریہ کو منعکس کرتے تھے، اس حقیقت پر

۱۱۹۔ تم اُن چیزوں میں سے کیوں نہیں کھاتے کہ جن پر خدا کا نام لیا گیا ہے۔ حالانکہ (خداوند تعالیٰ نے) جو کچھ تم پر حرام تھا اُسے بیان کر دیا ہے۔ مگر یہ کہ تم مجبور ہو جاؤ، (کہ اس صورت میں اس قسم کے جانور کا گوشت کھانا جائز ہے) اور بہت سے لوگ (دوسروں کو) ہوا و ہوس اور بے علمی کی وجہ سے گمراہ کر دیتے ہیں اور تیرا پروردگار تجاوز کرنے والوں کو بہتر طور پر پہچانتا ہے۔

۱۲۰۔ آشکارا اور مخفی گناہوں کو چھوڑ دو کیونکہ جو لوگ گناہ کماتے ہیں انہیں اُن کے بدلے میں سزا دی جائے گی۔

# تفسیر

## شرک کے تمام آثار مٹ جانے چاہئیں

یہ آیات حقیقت میں توحید و شرک کے بارے میں گذشتہ مباحث کے نتائج میں سے ایک ہیں۔ لہٰذا پہلی آیت " فاء " تفریع کے ساتھ آئی ہے جو عام طور پر نتیجہ کے بیان کے لیے ہوتی ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ گذشتہ آیات میں مختلف بیانات کے ساتھ حقیقتِ توحید کا اثبات اور شرک و بت پرستی کا بطلان واضح ہوا ہے۔ اس مسئلہ کے نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اُن جانوروں کے گوشت کھانے سے جو " بتوں " کے نام پر ذبح ہوتے ہیں احتراز کریں اور صرف ان جانوروں کے گوشت سے استفادہ کریں کہ جو خدا کے نام پر ذبح ہوتے ہیں۔ کیونکہ مشرکین عرب کی ایک عبادت یہ تھی کہ وہ بتوں کے لیے قربانی کرتے تھے اور اُن کے گوشت سے تبرک کے طور پر کھاتے تھے اور یہ کام ایک قسم کی بت پرستی ہی تھا۔

لہٰذا پہلے کہا گیا ہے: ان چیزوں سے کھاؤ کہ جن پر اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو (فکلوا مما ذکر اسم الله علیه ان کنتم بایاته مؤمنین)۔

یعنی ایمان محض دعوے، گفتار اور عقیدے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کا اظہار عمل سے بھی ہونا چاہیے۔ جو شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے وہ صرف اسی قسم کے گوشت میں سے کھاتا ہے۔ البتہ امر " کُلُوْا " (کھاؤ) یہاں اس قسم کے گوشت کے کھانے کے وجوب کے لیے نہیں ہے بلکہ حقیقت میں اس سے مراد اس کا مباح ہونا اور اس کے غیر کا حرام ہونا ہے۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس گوشت کا حرام ہونا کہ جس کے ذبح کے وقت اس پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا، اس نکتہ نظر سے نہیں ہے کہ یہ بات صحت عامہ کے پہلو سے ہے کہ یہ کہا جائے کہ نام لینے سے کیا اثر ہوتا ہے، بلکہ اس کا ربط معنوی و اخلاقی پہلوؤں اور توحید پرستی کی بنیادوں کو محکم کرنے کے ساتھ ہے۔

گواہ ہیں۔

علمی نکتۂ نظر سے کیا عوام کی اکثریت سچ ہی بولتی ہے؟ کیا اکثریت امین ہوتی ہے؟ کیا اکثریت دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے سے اگر وہ کر سکے تو اجتناب کرتی ہے؟ کیا اکثریت اپنے اور دوسروں کے منافع کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے؟

ان سوالات کے جواب بغیر کہے ظاہر ہیں۔ اس بناء پر اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ آج کی دنیا کا اکثریت پر اعتبار اور بھروسہ کرنا حقیقت میں ایک قسم کی مجبوری اور ماحول کی ضرورت ہے اور ایک ایسی ہڈی ہے کہ جو معاشروں کے گلے میں پھنسی ہوئی ہے۔

ہاں انسانی معاشروں کے صاحبان فکر و نظر اور دل سوز مصلحین اور با مقصد سوچ رکھنے والے جو ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں اگر عوام الناس کو روشنی بخشنے کے لیے ہمہ جہتی تلاش و کوشش کریں اور انسانی معاشرے کافی حد تک فکری، اخلاقی اور اجتماعی رشد پالیں تو مسلّم طور پر اس قسم کی اکثریت کے نظریات حقیقت کے بہت قریب ہوں گے۔ لیکن غیر رشید اور ناآگاہ یا فاسد، منحرف اور گمراہ اکثریت کونسی شکل اپنے اور دوسروں کے راستوں سے ہٹا سکے گی۔ اس بناء پر محض اکثریت اکیلی کافی نہیں ہے بلکہ صرف وہی اکثریت کہ جو ہدایت یافتہ ہو اپنے معاشرے کی مشکلات کو اس حد تک کہ جو امکان بشر میں ہے حل کر سکتی ہے۔

اگر قرآن مختلف آیات میں اکثریت کے بارے میں اعتراض کرتا ہے تو اس میں شک نہیں ہے کہ اس کی مراد ایسی اکثریت ہے کہ جو غیر رشید ہو اور ہدایت یافتہ نہ ہو۔

۱۱۸۔ فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ○

۱۱۹۔ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ○

۱۲۰۔ وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ ○

## ترجمہ

۱۱۸۔ اور جس (ذبیحہ) پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اس سے کھاؤ۔ (لیکن ان جانوروں کے گوشت سے کہ جن کو ذبح کرتے وقت ان پر خدا کا نام نہیں لیا گیا نہ کھاؤ) اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو۔

بعد والی آیت میں یہی بات دوسری عبارت سے بیان کی گئی ہے جو اور زیادہ استدلال کے ساتھ ہے، فرمایا ہے، تم اُن جانوروں سے کیوں نہیں کھاتے کہ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہے، حالانکہ جو کچھ تم پر حرام ہے خدا نے اس کی تشریح کر دی ہے (ومالکم الا تاکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ وقد فصل لکم ما حرم علیکم)۔

ہم یہ بات دوبارہ دل نشین کراتے ہیں کہ یہ توبیخ و تاکید حلال گوشت کے کھانے کو ترک کرنے کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ صرف ان گوشتوں سے کھانا چاہیے اور ان کے سوا دوسرے گوشتوں سے استفادہ نہیں کرنا چاہیے اور دوسرے لفظوں میں نظر نقطہ مقابل اور مفہوم جملہ پر ہے۔ اسی لیے "قد فصل لکم ما حرم علیکم" (خدا نے اس کی تشریح کر دی ہے جو تم پر حرام ہے) کے جملے سے استدلال کیا گیا ہے۔

اس بارے میں کہ یہ بات کس سورۃ اور کس آیت میں آئی ہے کہ جس میں حلال حرام گوشت کی وضاحت کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تصور کیا جائے کہ اس سے مراد سورۂ مائدہ ہے یا اسی سورہ کی بعض آیات ہیں جو آئندہ آئیں گی (مثلاً آیہ ۱۴۵) لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور سورہ مائدہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور اس سورت کی آئندہ آنے والی آیات بھی ان آیات کے نزول کے وقت ابھی تک نازل نہیں ہوئی تھیں، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں احتمالات میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد یا تو سورہ نحل کی آیہ ۱۱۵ ہے کہ جس میں صراحت کے ساتھ حرام گوشتوں کی بعض اقسام کا بیان آیا ہے اور خصوصاً وہ جانور جو غیر خدا کے لیے ذبح ہوئے ہوں اور یا اس سے مراد ان گوشتوں کے بارے میں حکم ہے جو پیغمبر کے وسیلے سے دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ وہ کوئی حکم وحی الٰہی کے بغیر نہیں دیتے تھے۔

پھر ایک صورت کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، مگر اس صورت میں کہ تم مجبور ہو جاؤ (الا ما اضطررتم الیہ)۔ چاہے یہ اضطرار بیابان میں گرفتار ہو جانے اور شدید بھوک کی وجہ سے ہو یا مشرکین کے چنگل میں گرفتار ہونے اور ان کے اس امر پر مجبور کرنے کی وجہ سے ہو۔

اس کے بعد مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے، بہت سے لوگ دوسروں کو جہل و نادانی اور ہوا و ہوس کی بناء پر گمراہ کرتے ہیں (وان کثیرًا لیضلون باھوائھم بغیر علم)۔

اگرچہ ہوا پرستی اور جہل و نادانی اکثر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان دونوں کا ذکر زیادہ تاکید کے لیے اکٹھا کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے " باھوائھم بغیر علم "

ضمنی طور پر اس تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ علم حقیقی ہرگز ہوا پرستی اور خیال آرائی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا اور جہاں یہ ان سے جا ملے وہ جہالت ہے نہ کہ علم و دانش۔

اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ہو سکتا ہے مندرجہ بالا جملہ اس خیال و تصور کی طرف اشارہ ہو جو مشرکین عرب میں موجود تھا کہ وہ مردہ جانوروں کا گوشت کھانے کے لیے اس طرح کا استدلال کیا کرتے تھے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ جانور جنہیں ہم خود ذبح کریں انہیں تو ہم حلال سمجھیں لیکن جنہیں ہمارے خدا نے مارا ہے اسے ہم حرام شمار کریں؟ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ سفسطہ ایک بیہودہ خیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ خدا نے مردہ جانور کو ذبح نہیں

کیا اور اس کا سر نہیں کاٹا کہ ان جانوروں کے ساتھ قیاس کریں جنہیں ہم نے ذبح کیا ہے اور اسی دلیل سے وہ قسم قسم کی بیماریوں کا مرکز ہے اور اس کا گوشت فاسد اور خراب ہے، لہٰذا خداوند تعالیٰ نے اس کے کھانے کی اجازت نہیں دی ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تیرا پروردگار ان لوگوں کے بارے میں کہ جو تجاوزکار اور زیادتی کرنے والے ہیں زیادہ آگاہ ہے (ان ربک ھو اعلم بالمعتدین)۔

ایسے ہی لوگ فضول اور بودی دلیلوں کے ذریعے نہ صرف یہ کہ راہ حق سے منحرف ہو جاتے ہیں بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی منحرف کر دیں۔

چونکہ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس فعل حرام کا چھپ کر اور پوشیدہ طور پر انجام دیں لہٰذا اس کے ساتھ ہی اگلی آیت میں ایک قانون کلی کے طور پر کہا گیا ہے: آشکار اور پنہاں گناہ چھوڑ دو (وذروا ظاھر الاثم و باطنہ)۔

کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ منافی عفت عمل (زنا) اگر چھپ کر کیا جائے تو کوئی عیب نہیں ہے وہ صرف اس صورت میں گناہ ہے کہ اگر اُسے آشکار اور ظاہر بظاہر کیا جائے۔ آج بھی کچھ لوگوں نے عملی طور پر اسی جاہلانہ خلق کو اپنایا ہوا ہے اور صرف آشکار اور ظاہر بظاہر گناہوں سے پریشان اور وحشت زدہ ہوتے ہیں لیکن چھپ کر گناہ کا ارتکاب کسی پریشانی کے بغیر کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت نہ صرف مذکورہ بالا منطق کی مذمت کرتی ہے بلکہ یہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو اس کے علاوہ کہ جو بیان کیا جا چکا ہے، دوسرے مفاہیم و تفاسیر کو بھی، جو "ظاہر" اور "باطن" گناہ کے سلسلے میں بیان ہوئے ہیں، اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ ظاہری گناہوں سے مراد وہ گناہ ہیں جو اعضاء بدن کے ساتھ انجام پاتے ہیں اور باطنی گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو دل، نیت اور تصمیم و ارادہ کے ذریعہ صورت پذیر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد یاد دہانی اور گنہگاروں کو تہدید کے طور پر اس بدبختی کے بارے میں جس کا وہ انتظار کر رہے ہیں قرآن یوں کہتا ہے: وہ لوگ کہ جو گناہوں کا ارتکاب کر رہے ہیں بہت جلد اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھ لیں گے (ان الذین یکسبون الاثم سیجزون بما کانوا یقترفون)۔

"کسب گناہ" کی تعبیر (یکسبون الاثم) ایک عمدہ اور جالب نظر تعبیر ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ افراد انسانی اس جہان میں اُن سرمایہ داروں کی طرح ہیں جو ایک بہت بڑے بازار میں قدم رکھتے ہیں اُن کا سرمایہ ہوش، عقل، عمر، اور جوانی اور قسم قسم کی خداداد توانیاں ہیں وہ لوگ کتنے بدبخت ہیں جو سعادت، افتخار، مقام، تقویٰ اور قرب خدا کے حصول کی بجائے گناہ کمانے میں لگے رہیں۔

"سیجزون" (عنقریب اپنی جزا دیکھیں گے) کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اگرچہ بعض کی نظر میں قیامت دور ہے لیکن حقیقت میں وہ بہت قریب ہے اور یہ جہان بہت تیزی کے ساتھ ختم ہو جائے گا اور قیامت آ جائے گی، یا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ زیادہ تر افراد اس دنیاوی زندگی میں ہی اپنے بُرے اعمال کے نتائج انفرادی اور

اجتماعی ردعمل کے طور پر دیکھیں گے۔

۱۲۱۔ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ۝

## ترجمہ

۱۲۱۔ وراس (ذبیحہ) سے کہ جس پر خدا کا نام نہیں لیا گیا، نہ کھاؤ، اور یہ فعل گناہ ہے اور شیاطین اپنے دوستوں کو مخفی طور پر کچھ مطالب القا کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے مجادلے اور جھگڑے کے لیے کھڑے ہو جائیں اور اگر تم ان کی اطاعت کروگے تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔

## تفسیر

گذشتہ آیات میں مسئلہ کے مثبت پہلو یعنی حلال گوشت کھانے کا ذکر کیا گیا تھا لیکن اس آیت میں زیادہ سے زیادہ تاکید کے لیے منفی پہلو اور اس کے مفہوم کا سہارا لیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان گوشتوں میں سے کہ جن پر خدا کا نام ان کے ذبح کے وقت نہیں لیا گیا نہ کھاؤ (ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ)۔

اس کے بعد نئے سرے سے ایک مختصر سے جملے کے ساتھ اس عمل کو جرم قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ کام فسق و گناہ ہے اور راہ و رسم بندگی اور فرمان خدا کی اطاعت سے خروج ہے (وانہ لفسق)۔

نیز اس غرض سے کہ بعض سادہ لوح مسلمان ان کے شیطانی وسوسوں کا اثر قبول نہ کرلیں یہ اضافہ کیا گیا ہے: شیاطین وسوسہ انگیز مطالب مخفی طور پر اپنے دوستوں کو القا کرتے ہیں تاکہ وہ تمہارے ساتھ مجادلہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں (وان الشیاطین لیوحون الی اولیائھم لیجادلوکم)۔

لیکن تم ہوش و حواس کے ساتھ رہو کیونکہ "اگر تم نے ان کے وسوسوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو تم بھی مشرکین کی صف میں شامل ہو جاؤ گے (وان اطعتموھم انکم لمشرکون)۔

یہ مجادلہ اور وسوسہ شاید اسی منطق کی طرف اشارہ ہو جو مشرکین ایک دوسرے کی طرف القا کیا کرتے تھے (اور بعض نے کہا ہے کہ مشرکین عرب نے اسے مجوسیوں سے سیکھا تھا) کہ اگر ہم مردہ جانور کا گوشت کھاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اُسے خدا نے مارا ہے لہٰذا وہ اُس جانور سے بہتر ہے جسے ہم مارتے ہیں، یعنی مردار نہ کھانا خدا کے کام سے ایک قسم کی بے اعتنائی ہے۔

وہ اس (حقیقت) سے غافل ہیں کہ جو اپنی طبیعی موت مرتا ہے وہ اس بات کے علاوہ کہ اکثر بیمار ہوتا ہے اس کا سر نہیں کاٹا جاتا اور گندہ اور گاڑھا خون اس کے گوشت کے اندر ہی رہ جاتا ہے اور وہ مر جاتا ہے اور فاسد اور خراب ہو جاتا ہے اور وہ گوشت کو بھی آلودہ اور فاسد کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ صرف اس جانور کا گوشت کھاؤ جو مخصوص شرائط کے ساتھ ذبح ہوا ہے اور اس کا خون باہر گرا ہے۔

ضمنی طور پر ان آیات سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ غیر اسلامی ذبیحہ حرام ہے کیونکہ دیگر جہات کے علاوہ اس کے ذبح کے وقت غیر مسلم خدا کا نام لینے کے پابند نہیں ہوتے۔

۱۲۲۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

۱۲۳۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

## ترجمہ

۱۲۲۔ وہ جو کہ مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لیے ایک نور قرار دیا کہ جس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، کیا اس شخص کی مانند ہے کہ جو تاریکیوں میں ہو اور اس سے باہر نہ نکلے، اس طرح کفار کے لیے وہ (برے) اعمال جو وہ انجام دیتے تھے زینت دیئے گئے ہیں (اور خوبصورت دکھائی دیتے ہیں)۔

۱۲۳۔ اور ہم نے اسی طرح سے ہر ہر شہر اور ہر ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم قرار دیئے ہیں، (ایسے افراد کہ ہم نے جن کے اختیار میں ہر قسم کی قدرت دے دی تھی لیکن انہوں نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا اور غلط راستے پر چل پڑے) اور آخر کار ان کا معاملہ اس حد کو پہنچ گیا کہ وہ مکر (کرنے اور لوگوں کو دھوکا دینے) میں مشغول ہو گئے لیکن (فی الحقیقت) وہ صرف اپنے آپ کو ہی (دھوکا اور) فریب دیتے ہیں اور سمجھتے نہیں ہیں۔

## شان نزول

پہلی آیت کی شان نزول کے بارے میں یوں نقل ہوا ہے:

ابوجہل جو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت ہی سخت دشمنوں میں سے تھا، ایک دن اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت تکلیف پہنچائی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہادر چچا حضرت حمزہ جو اس دن تک ایمان نہیں لائے تھے اور اسی طرح آپ کے دین کے بارے میں مطالعہ اور سوچ بچار کر رہے تھے اور اس دن اپنے معمول کے مطابق شکار کے لیے بیابان میں گئے ہوئے تھے، جب بیابان سے واپس آئے تو ابوجہل اور اپنے بھتیجے کے مابین ہونے والے ماجرے سے باخبر ہوئے۔ انہیں بہت غصہ آیا۔ وہ فوراً ابوجہل کی تلاش میں نکل پڑے۔ وہ ملا تو اس کے سر یا ناک پر اس طرح مارا کہ خون جاری ہو گیا۔ ابوجہل نے اس تمام نفوذ و اقتدار کے باوجود جو وہ اپنی قوم و قبیلہ، بلکہ مکہ کے لوگوں کے درمیان رکھتا تھا حضرت حمزہ کی بہت زیادہ شجاعت کو دیکھتے ہوئے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔

اس کے بعد حمزہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں نکلے اور اسلام قبول کر لیا۔ اس دن سے باقاعدہ اسلام کے ایک افسر رشید کے طور پر آخر عمر تک اس آسمانی دین کا دفاع اور اس کی حفاظت کرتے رہے۔

اوپر والی آیت اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس میں حمزہ کے ایمان اور ابوجہل کے کفر و فساد میں پائیداری کو مشخص کیا گیا ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت عمار یاسر کے ایمان لانے اور ابوجہل کے کفر پر اصرار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

بہر حال یہ آیت بھی قرآن کی دوسری آیات کی طرح ہی اپنے محلِ نزول کے ساتھ ہی اختصاص نہیں رکھتی اور ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ہر سچے مومن اور ہر بے ایمان اور ہٹ دھرم پر صادق آتی ہے۔

## تفسیر

### ایمان اور نورِ نظر

ان آیات کا قبل کی آیات کے ساتھ ربط اس لحاظ سے ہے کہ گذشتہ آیات میں دو گروہوں کی طرف اشارہ ہے، مومن خالص اور ہٹ دھرم کافر جو نہ صرف یہ کہ خود ایمان نہیں لاتا بلکہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی سعی سے کوشش بھی کرتا ہے، یہاں بھی دو جالب اور عمدہ مثالیں ذکر کر کے ان دونوں گروہوں کی کیفیت کو مجسم کیا گیا ہے۔

پہلے اُن افراد کو جو گمراہی میں تھے پھر انھوں نے حق اور ایمان کو قبول کر کے اپنے راستے کو بدل لیا انہیں اس مردہ

سے تشبیہ دی ہے کہ جو خدا کے ارادہ اور فرمان سے زندہ ہوگیا ہو (او من کان میتاً فاحییناہ)۔

قرآن میں بارہا "موت" اور "حیات" معنوی موت وحیات اور کفر و ایمان کے معنی میں آئی ہے اور یہ تعبیر اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے کہ ایمان ایک خشک اور خالی عقیدہ یا کوئی تکلفاتی الفاظ نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک ایسی روح کی مانند ہے کہ جو بے ایمان افراد کے بے جان جسم میں پھونکی جاتی ہے اور وہ اُن کے تمام وجود میں اثر کرتی ہے، اُن کی آنکھوں میں بینائی اور روشنی آجاتی ہے، اُن کے کانوں میں سننے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے، زبان میں طاقت گویائی اور ہاتھ پاؤں میں ہر قسم کے مثبت کام انجام دینے کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایمان افراد کو دگرگوں کر دیتا ہے اور اُن کی ساری زندگی میں اثر انداز ہوتا ہے اور زندگی کے آثار کو اُن کے تمام حالاتِ زندگی میں آشکار و واضح کرتا ہے۔

"فاحییناہ" (ہم نے اُسے زندہ کیا) کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اگرچہ خود انسان کی اپنی سعی و کوشش سے صورت پذیر ہونا چاہیے لیکن جب تک خدا کی طرف سے کشش نہ ہو یہ کوششیں انجام کو نہیں پہنچتی۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: ہم نے ایسے افراد کے لیے نور قرار دیا ہے کہ جس کی روشنی میں وہ لوگوں کے درمیان چلیں پھریں (وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی الناس)۔

اگرچہ مفسرین نے اس بارے میں کئی احتمال ذکر کیے ہیں کہ اس "نور" سے کیا مراد ہے لیکن ظاہری طور پر اس سے صرف قرآن اور تعلیمات پیغمبر ہی مراد نہیں ہیں بلکہ اس کے علاوہ خدا پر ایمان انسان کو نور بصیرت اور ایک نیا ادراک بخشتا ہے اور ایک خاص قسم کا نور بصیرت اس کو عطا کرتا ہے، اس کی نگاہ کے افق کو مادی محدود زندگی اور عالم مادہ کی چہار دیواری سے نکال کر ایک بہت ہی وسیع عالم میں لے جاتا ہے۔

اور چونکہ وہ انسان کو خود سازی کی دعوت دیتا ہے تو خود خواہی، خود بینی، تعصب، ہٹ دھرمی اور ہوا و ہوس کے پردے اس کی روح کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیتا ہے اور وہ ایسے حقائق دیکھنے لگ جاتا ہے کہ جن کے ادراک کی اس سے قبل ہرگز قدرت نہیں رکھتا تھا۔

اس نور کے پرتو میں وہ لوگوں کے درمیان اپنی زندگی کی راہ تلاش کر سکتا ہے اور وہ بہت سے ایسے اشتباہات سے کہ جن میں دوسرے لوگ طمع اور لالچ کی خاطر اور مادی محدود فکر کی وجہ سے یا خود خواہی اور ہوا و ہوس کے غلبہ کے باعث گرفتار ہو جاتے ہیں مامون و محفوظ رہ جاتا ہے۔ نیز یہ جو اسلامی روایات میں ہے کہ:

المؤمن ینظر بنور اللہ

مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اگرچہ ان تمام باتوں کے باوجود اس خاص نور بصیرت کی کہ جو صاحب ایمان انسان میں پیدا ہو جاتا ہے بیان و قلم سے پھر بھی توصیف نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس کا ذائقہ چکھنا چاہیے اور اس کے وجود کو محسوس کرنا چاہیے۔

اس کے بعد ایسے زندہ، فعال، نورانی اور موثر افراد کا ہٹ دھرم بے ایمان افراد کے ساتھ مقابلہ و موازنہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کیا ایسا شخص اُس شخص کی مانند ہے کہ جو ظلمتوں اور تاریکیوں کی امواج میں ڈوبا ہوا ہے اور ہرگز اس سے

باہر نہیں نکل سکتا (کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منھا)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ نہیں کہتا کہ "کمن فی الظلمات" (اس شخص کی طرح جو ظلمات میں ہے) بلکہ یوں کہتا ہے "کمن مثلہ فی الظلمات" اس شخص کی طرح کہ جس کی مثل ظلمات میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس تعبیر سے ہدف و مقصد یہ تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اس قسم کے افراد اس قدر تاریکی اور بدبختی میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ ان کی وضع و کیفیت ایک ضرب المثل بن گئی ہے کہ جس سے تمام باسمجھ افراد آگاہ ہیں۔

لیکن ممکن ہے کہ یہ تعبیر ایک لطیف تر معنی کی طرف اشارہ ہو اور وہ یہ کہ: ایسے افراد کی ہستی اور وجود سے حقیقت میں ایک قالب اور ایک جسم کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے، وہ ایک ایسا ہیکل رکھتے ہیں کہ جو روح کے بغیر ہے اور ایسا دماغ اور فکر رکھتے ہیں جو بے کار ہو چکی ہے۔

اس نکتہ کی یاد دہانی بھی لازمی ہے کہ مومنین کا راہنما "نور" (صیغہ مفرد کے ساتھ) اور کفار کا محیط "ظلمات" (صیغہ جمع کے ساتھ) بیان کیا گیا ہے، کیونکہ ایمان صرف ایک ہی حقیقت ہے اور وحدت و یگانگی کی رمز ہے اور کفر و بے ایمانی، پراگندگی تفرقہ اور پھوٹ کا سرچشمہ ہے۔

آیت کے آخر میں اس بدبختی کی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کفار کے اعمال کو ان کی نظروں میں اسی طرح سے زینت دے دی گئی ہے (کذالک زین للکفرین ما کانوا یعملون)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ بُرے عمل کے تکرار کی خاصیت ہے کہ آہستہ آہستہ اس کی بُرائی نظر میں کم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ اس کی نظروں میں ایک اچھا کام معلوم ہونے لگتا ہے اور ایک زنجیر کی مانند اس کے ہاتھ پاؤں میں پڑ جاتا ہے اور اپنے جال سے نکلنے کی اُسے اجازت نہیں دیتا، تباہ کاروں کے حالات کا ایک سرسری مطالعہ اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے۔

اور چونکہ منفی جہت سے اس ماجرے کا ہیرو ابوجہل تھا اور وہ مشرکین مکہ اور قریش کے سرداروں میں شمار ہوتا تھا لہٰذا دوسری آیت میں ان گمراہ رہبروں اور کفر و فساد کے زعماء کی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے ہر شہر اور آبادی میں اسی طرح سے ایسے بڑے بڑے لوگ قرار دیئے ہیں کہ جنہوں نے گناہ کا راستہ اختیار کر لیا اور مکر و فریب اور دھوکا بازی کے ذریعے لوگوں کو راستے سے منحرف کر دیا (وکذالک جعلنا فی کل قریۃ اکابر مجرمیھا لیمکروا فیھا)۔

ہم نے بارہا یہ کہا ہے کہ اس قسم کے افعال کی خدا کی طرف نسبت اس بناء پر ہے کہ وہ مسبب الاسباب اور تمام قدرتوں کا سرچشمہ ہے اور جو شخص جس کام کو سرانجام دیتا ہے وہ ان امکانات و وسائل کے ساتھ سرانجام دیتا ہے کہ جو خدا نے اس کے اختیار میں دیئے ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ اُن سے اچھا فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض لوگ ان ہی وسائل سے بُرے کام انجام دیتے ہیں۔

"لیمکروا" (تاکہ وہ مکر و فریب کو کام میں لائیں)، کا جملہ ان کے سرانجام کے معنی میں ہے۔ یہ ان کی خلقت کا

ہدف نہیں ہے[1] یعنی نافرمانی اور بکثرت گناہوں کا انجام یہ ہوا کہ وہ راہ حق کے رہزن بن گئے اور بندگان خدا کو راہ سے منحرف کر دیا۔ کیونکہ "مکر" اصل میں گرم کرنے اور مروڑنے کے معنی میں ہے بعد ازاں ہر اُس انحرافی کام کے لیے کہ جو خفیہ اور چھپ چھپا کر کیا جائے استعمال ہونے لگا۔

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے: وہ اپنے سوا کسی کو بھی فریب اور دھوکا نہیں دیتے، لیکن وہ سمجھتے نہیں ہیں اور متوجہ نہیں ہیں (وما یمکرون الا بانفسھم وما یشعرون)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا مکر و فریب ہو گا کہ وہ اپنے وجود کا تمام سرمایہ چاہے وہ فکر، ہوش، عقل، عمر اور وقت ہو یا مال و دولت ایسی راہ میں استعمال کرتے ہیں کہ جو نہ صرف یہ کہ اُن کے لیے سودمند نہیں بلکہ ان کی پشت کو بار مسئولیت اور گناہ سے بھی بوجھل کر دیتا ہے جب کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کامیابیوں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

ضمنی طور پر اس آیت سے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ مفاسد اور بدبختیاں جو معاشروں کو دامن گیر ہوتی ہیں ان کا سرچشمہ قوموں کے بڑے اور سرداری ہوتے ہیں اور وہی لوگ ہوتے ہیں جو قسم قسم کے حیلوں اور فریب کاریوں کے ذریعہ راہ حق کو دگرگوں کر کے حق کے چہرے کو لوگوں پر پوشیدہ کر دیتے ہیں۔

۱۲۴۔ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ○

## ترجمہ

۱۲۴۔ اور جس وقت کوئی آیت ان کے لیے آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہمیں بھی ویسی ہی چیز نہ دی جائے جیسی کہ خدا کے پیغمبروں کو دی گئی ہے۔ خدا ہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے، وہ لوگ کہ جو گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں (اور انہوں نے اپنی حیثیت و مقام کو بچانے کے لیے لوگوں کو راہِ حق سے منحرف کیا ہے) وہ بہت جلدی اپنے مکر (اور فریب اور چالبازی) کے بدلے میں جو وہ کیا کرتے تھے، بارگاہ خداوندی میں ذلیل ہوں گے اور عذاب شدید میں گرفتار ہوں گے۔

---

[1] اصطلاح کے مطابق "لام" غایت کا "لام" ہے بلکہ عاقبت کا لام ہے کہ جس کے قرآن میں متعدد نمونے موجود ہیں۔

## شانِ نزول

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں ذکر جو بت پرستوں کے مشہور سرداروں میں سے تھا اور (اصطلاح کے مطابق ان کا دماغ سمجھا جاتا تھا) نازل ہوئی ہے۔ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتا تھا کہ اگر نبوت سچی بات ہے تو میں یہ مقام حاصل کرنے کو آپ سے زیادہ حقدار ہوں، کیونکہ ایک تو میرا سن آپ سے زیادہ ہے اور دوسرے میرے پاس مال و دولت بھی آپ سے زیادہ ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ یہ خیال کرتا تھا کہ مسئلہ نبوت بھی رقابتوں کا مرکز بنے، وہ کہتا تھا کہ ہم اور قبیلہ بنی عبد مناف (پیغمبر کا قبیلہ) ہر چیز میں ایک دوسرے کے رقیب تھے اور گھوڑ دوڑ کے دو گھوڑوں کی طرح ایک دوسرے کے دوش بدوش جا رہے تھے یہاں تک کہ انہوں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ ہمارے درمیان میں سے ایک پیغمبر مبعوث ہوا ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہے لیکن یہ بات ممکن نہیں کہ ہم اس پر ایمان لے آئیں مگر یہ کہ ہم پر بھی وحی اترے جس طرح اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔

## تفسیر

### پیغمبر کا انتخاب خدا کے ہاتھ میں ہے

اس آیت میں ان باطل گدی نشینوں اور سرداروں اور "اکابر مجرمیھا" کے طرز فکر اور مضحکہ خیز دعوے کی طرف ایک مختصر اور پر معنی اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: جب خدا کی طرف سے کوئی آیت ان کی ہدایت کے لیے بھیجی گئی تو انہوں نے کہا: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے مگر یہ کہ ہمیں بھی وہی مقامات اور آیات جو خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کو عطا ہوئی ہیں دی جائیں (و اذا جاءتھم ایۃ قالوا لن نؤمن حتّٰی نؤتی مثل ما اوتی رسل اللہ)۔

ان کے خیال میں جیسے مقام رسالت اور خلق کی رہبری کا حصول سن و سال اور مال و دولت پر موقوف ہے یا قبائل کی بچگانہ رقابتوں پر اور گویا خدا بھی اس بات کا پابند ہے کہ وہ ان بے بنیاد اور مضحکہ خیز رقابتوں کا خیال کرے اور انہیں صحیح قرار دے۔ ایسی رقابتیں کہ جن کا سرچشمہ انحطاط فکری ہو، جو مفہوم نبوت اور انسانوں کی رہبری کی فکر سے دور ہوں۔

قرآن انہیں واضح جواب دیتا ہے اور کہتا ہے: اس کی ضرورت نہیں کہ تم خدا کو سبق دو کہ وہ اپنے پیغمبروں اور رسولوں کو کس طرح بنائے اور کن لوگوں میں سے ان کا انتخاب کرے کیونکہ "خدا سب سے بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے" (اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ)۔

یہ بات صاف ظاہر اور بالکل واضح ہے کہ رسالت نہ تو سن و سال اور مال و دولت سے کوئی ربط رکھتی ہے اور نہ

ان قبائل کی حیثیت ہے۔ بلکہ ہر چیز سے پہلے اس کی شرط روح کی آمادگی ، ضمیر کی پاکیزگی ، اصل انسانی خصائل و صفات ، فکرِ بلند ، قوتِ نظر اور آخری طور پر غیر معمولی تقویٰ و پرہیزگاری کا مرحلہ عصمت میں ہوتا ہے اور ان صفات کا موجود ہونا خصوصاً مقام عصمت کے لیے آمادگی ایسی چیز ہے جسے خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ ان شرائط اور ان کی سوچ کے درمیان کس قدر فرق ہے۔

جانشین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی سوائے وحی و تشریع کے نبی کی تمام صفات اور پروگراموں کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی وہ محافظ شرع و شریعت بھی ہے ، اس کے مکتب و قوانین کا پاسدار بھی ہے اور لوگوں کا روحانی اور دنیا کا رہبر بھی ہے۔ لہٰذا اُسے بھی مقامِ عصمت پر فائز اور خطا و گناہ سے مامون و محفوظ ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی پیغام رسانی کو بار آور کر سکے اور رہبر مطاع اور قابلِ اعتماد نمونہ ہو۔ اسی دلیل سے اس کا انتخاب بھی خدا ہی کے اختیار میں ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ اس مقام کو وہ کہاں قرار دے نہ کہ خلق خدا۔ نہ ہی لوگوں کے انتخاب اور شوریٰ سے یہ ہوتا ہے۔

آیت کے آخر میں اس قسم کے مجرموں اور باطل دعوے کرنے والے رہبروں کے اس انجام کا ذکر کیا گیا ہے جو ان کے انتظار میں ہے ارشاد ہوتا ہے ، عنقریب یہ گنہگار لوگ اس مکر و فریب کی وجہ سے جو وہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کرتے تھے ذلت و حقارت اور عذاب شدید میں گرفتار ہوں گے ( سیصیب الذین اجرموا صغار عند اللہ وعذاب شدید بما کانوا یمکرون )[1]

یہ خود خواہ لوگ چاہتے تھے کہ اپنے غلط کاموں کے ذریعہ اپنی حیثیت ، مقام اور مرتبے کی حفاظت کریں لیکن خدا انہیں اس طرح حقیر کرے گا کہ وہ دردناک روحانی گرفت کا احساس کریں گے ، علاوہ ازیں چونکہ راہِ باطل میں ان کی بھاگ دوڑ زیادہ اور ان کی سعی و کوشش سخت تھی لہٰذا ان کی سزا اور عذاب بھی "شدید" اور پر سر و صدا ہو گا۔

۱۲۵۔ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

۱۲۶۔ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ

---

[1] "اجرام" مادہ "جرم" سے اصل میں قطع کرنے کے معنی میں ہے اور چونکہ گنہگار افراد رشتوں اور ناتوں کو قطع کر دیتے ہیں اور اپنے آپ کو فرمانِ خدا کی اطاعت سے الگ کر لیتے ہیں لہٰذا یہ لفظ گناہ کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور اس میں اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ ہر شخص اپنی ذات میں حق و پاکیزگی اور عدالت کے ساتھ ایک رشتہ رکھتا ہے اور گناہ سے آلودگی فی الواقع فطرتِ الٰہیہ سے علیحدگی ہے۔

لِقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ ○

۱۲۷۔ لَهُمۡ دَارُ السَّلٰمِ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَهُوَ وَلِیُّهُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ○

## ترجمہ

۱۲۵۔ جس شخص کے لیے خدا چاہتا ہے کہ ہدایت کرے اس کے سینہ کو (قبول کرنے کے لیے) کشادہ کر دیتا ہے اور جس شخص کو (اس کے بُرے اعمال کی وجہ سے) گمراہ کرنا چاہے اُس کے سینہ کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے، اس طرح خدا پلیدی ایسے افراد کے لیے قرار دے دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

۱۲۶۔ اور یہ صراط مستقیم (اور ہمیشہ کی سنت) تیرے پروردگار کی ہے ہم ایسے افراد کے لیے کہ جو پند و نصیحت حاصل کرتے ہیں اپنی آیات کو کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔

۱۲۷۔ اُن کے لیے ان کے پروردگار کے پاس امن و امان کا گھر ہو گا اور وہ ان کا ولی، دوست اور مددگار ہے اُن (نیک) اعمال کی وجہ سے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

## تفسیر

### خدائی امداد

گذشتہ آیات کہ جو سچے مومنین اور ہٹ دھرم کفار کے بارے میں بحث کر رہی تھیں، کے بعد ان آیات میں اُن عظیم نعمتوں کو جو پہلے گروہ کے لیے ہیں اور وہ بے توفیقیاں جو دوسرے گروہ کے دامن گیر ہوں گی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جس شخص کو خدا ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ حق قبول کرنے کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے وہ گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ اس طرح تنگ اور محدود کر دیتا ہے کہ گویا وہ چاہتا ہے کہ آسمان کی طرف چڑھ جائے (فمن یرد اللّٰہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا کانما یصعد فی السماء)۔

اس امر کی تاکید کے لیے مزید کہا گیا ہے، خدا اس طرح سے پلیدی اور رجس کو بے ایمان افراد کے لیے قرار دے دیتا ہے اور ان کے سراپا کو نحوست اور سلب توفیق گھیرے گی (کذٰلک یجعل اللہ الرجس علی الذین لا یؤمنون)۔

## چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ ہم بارہا بیان کر چکے ہیں کہ خدائی "ہدایت" اور "ضلالت" سے مراد، ایسے اشخاص کے لیے کہ جنہوں نے حق قبول کرنے کے لیے اپنے اعمال و کردار سے آمادگی یا عدم آمادگی کو ثابت کر دیا ہے، ہدایت کی بنیادیں فراہم کرنا یا فراہم شدہ ہدایت کی بنیادوں کو برطرف کرنا ہے۔

وہ لوگ کہ جو راہ حق پر رواں دواں ہیں اور ایمان کے آب زلال کے متلاشی اور پیاسے ہیں، خدا ان کے ہاتھوں میں ایسے ضیا بخش چراغ روشن کر دیتا ہے تاکہ وہ اس آب حیات کو حاصل کرنے کے لیے تاریکیوں میں گم نہ ہو جائیں لیکن وہ لوگ کہ جنہوں نے ان حقائق کے بارے میں اپنی بے اعتنائی ثابت کر دی ہے وہ اس خدائی امداد سے محروم اور اپنی راہ میں انبوہِ مشکلات سے دوچار ہو جاتے ہیں اور ان سے توفیق ہدایت سلب ہو جاتی ہے۔

۲۔ یہاں "صدر" (سینہ) سے مراد روح اور فکر ہے اور یہ کنایہ بہت سے مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔ نیز "یشرح" (کشادہ کرنا) سے مراد وہی وسعتِ روح، بلندئ فکر اور انسان کی عقل کے افق کا پھیلاؤ ہے۔ کیونکہ حق کو قبول کرنے کے لیے بہت سے ذاتی منافع چھوڑنے پڑتے ہیں کہ جس کے لیے وسعتِ روح رکھنے والے اور بلند افکار افراد کے سوا اور کوئی آمادہ نہیں ہوگا۔

۳۔ "حرج" (بروزن حرم) حد سے زیادہ تنگی اور شدید محدودیت کے معنی میں ہے۔ یہ ہٹ دھرم اور بے ایمان افراد کا حال ہے، کہ جن کی فکر بہت کوتاہ اور ان کی روح حد سے زیادہ چھوٹی اور ناتواں ہے اور جو معمولی سی گنجائش بھی زندگی میں نہیں رکھتے۔

۴۔ قرآن کا ایک علمی معجزہ: اس قسم کے افراد کو ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ دینا کہ جو یہ چاہتا ہے کہ آسمان پر چڑھ جائے اس لحاظ سے ہے کہ آسمان کی طرف صعود کرنا (چڑھنا) حد سے زیادہ مشکل کام ہے اور ان کے لیے حق کو قبول کرنا بھی اسی طرح ہے جیسا کہ ہم روزمرہ کی گفتگو میں کہتے ہیں کہ یہ کام فلاں شخص کے لیے اتنا مشکل ہے کہ گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ میں آسمان کی طرف چڑھ جاؤں۔ یا جیسا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ کام کرنے کی بجائے آسمان پر چڑھ جاؤ تو وہ زیادہ آسان ہے۔

البتہ اس زمانے میں آسمان کی طرف پرواز کرنا انسان کے لیے ایک تصور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا لیکن آج بھی جبکہ فضا میں سیر کرنا ایک عملی شکل اختیار کر چکا ہے پھر بھی وہ ایک طاقت فرسا اور مشکل کاموں میں سے ہے اور فضا نوردوں کو مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔

اس آیت کے لیے ایک لطیف تر معنی بھی نظر میں آتا ہے جو گذشتہ بحث کی تکمیل کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آج ثابت ہو چکا ہے کہ کرۂ زمین کے اطراف کی ہوا اس زمین کے قرب و جوار میں تو بالکل بھری ہوئی اور انسانی تنفس کے لیے

آمادہ ہے، لیکن ہم جتنا اُوپر کی طرف چڑھتے چلے جائیں ہوا اتنی ہی زیادہ رقیق اور کم ہوتی جاتی ہے اور اس کی آکسیجن کی مقدار کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے، اس حد تک کہ اگر ہم (آکسیجن کے ماسک کے بغیر) زمین کی سطح سے چند کو میٹر اُوپر کی طرف چلے جائیں تو ہمارے لیے سانس لینا ہر لحظہ مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا اور اگر ہم برابر اُوپر کی طرف بڑھتے رہیں تو تنگی تنفس اور آکسیجن کی کمی ہماری بے ہوشی کا سبب بن جائے گی، اس دن جب کہ یہ واقعیتِ علمی ثابت نہیں ہوئی تھی اس تشبیہ کا بیان کرنا حقیقت میں قرآن کے علمی معجزات میں شمار ہوگا۔

۵۔ شرح صدر کیا ہے: آیت میں شرح صدر (سینہ کی کشادگی) ایک عظیم نعمت اور ضیق صدر (سینہ کی تنگی) ایک خدائی سزا شمار کی گئی ہے۔ جیسا کہ خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ سے ایک عظیم نعمت کا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

الم نشرح لك صدرك

کیا ہم نے تیرے سینہ کو وسیع اور کشادہ نہیں کیا [۱]

یہ ایک ایسا امر ہے کہ جو افراد کے حالات کا مشاہدہ کرنے سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے۔ بعض کی روح تو اس قدر بلند اور کشادہ ہوتی ہے جو ہر حقیقت کو قبول کرنے کے لیے۔ چاہے وہ کتنی بڑی کیوں نہ ہو۔ آمادہ اور تیار ہوتی ہے لیکن کے برعکس بعض کی روح اتنی تنگ اور محدود ہوتی ہے جیسے کسی بھی حقیقت کے نفوذ کے لیے اس میں کوئی راہ اور جگہ نہیں ہے ان کی فکری نگاہ کی حد روزمرہ کی زندگی اور کھانے پینے تک ہی محدود ہوتی ہے۔ اگر وہ انہیں مل جائے تو ہر چیز اچھی ہے اور اگر اس میں تھوڑا سا بھی تغیر پیدا ہو جائے تو گویا سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور دنیا خراب ہو گئی ہے۔

جس وقت اُوپر والی آیت نازل ہوئی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں نے پوچھا کہ شرح صدر کیا ہے تو آپ نے فرمایا:

نور يقذفه الله في قلب من يشاء فينشرح له صدره وينفسح

ایک نور ہے کہ جسے خدا جس شخص کے دل میں چاہے ڈال دے تو اُس کے سائے میں اس کی روح وسیع و کشادہ ہو جاتی ہے۔

لوگوں نے پوچھا کہ کیا اس کی کوئی نشانی بھی ہے کہ جس سے اُسے پہچانا جائے تو آپ نے فرمایا:

نعم الانابة الى دار الخلود والتجافي عن دار الغرور والاستعداد للموت قبل نزول الموت۔ [۲]

ہاں! اس کی نشانی ہمیشہ کے گھر کی طرف توجہ کرنا، اور دنیا کے زرق و برق سے دامن سمیٹنا، اور موت کے لیے آمادہ ہونا ہے (ایمان و عمل صالح اور راہ حق میں کوشش کرنے کے ساتھ) قبل اس کے کہ موت آجائے

---

[۱] سورہ الم نشرح آیہ ۱۔

[۲] مجمع البیان جلد ۴ صفحہ ۳۶۳۔

بعد والی آیت میں گذشتہ بحث کی تاکید کے عنوان سے کہتا ہے، یہ مطلب کہ خدائی مدد حق طلب لوگوں کے شاملِ حال ہوتی ہے اور سلبِ توفیق دشمنانِ حق کی تلاش میں جاتی ہے، ایک مستقیم و ثابت اور ناقابلِ تغیر سنتِ الٰہی ہے (وھذا صراط ربک مستقیماً)۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ "ھذا" کا اشارہ اسلام اور قرآن کی طرف ہو، کیونکہ وہی صراطِ مستقیم اور راست و معتدل راستہ ہے۔

آیت کے آخر میں دوبارہ تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے اپنی نشانیوں اور آیات کو اُن لوگوں کے لیے جو قبول کرنے والا دل اور سننے والا کان رکھتے ہیں تفصیل کے ساتھ بیان کردیا ہے (قد فصلنا الآیات لقوم یذکرون)۔

بعد والی آیت میں خدا تعالیٰ اپنی نعمتوں کے اُن دو عظیم حصّوں کو جو وہ بیدار افراد اور حق طلب لوگوں کو عطا کرتا ہے بیان کرتا ہے، پہلی یہ کہ: ان کے پروردگار کے پاس ان کے لیے امن و امان کا گھر ہے (لھم دار السلام عند ربھم)۔

اور دوسری یہ کہ: اُن کا ولی و سرپرست اور حافظ و ناصر خدا ہے (وھو ولیھم)۔

"اور یہ سب کچھ ان نیک اعمال کی وجہ سے ہے جو وہ انجام دیتے تھے" (بما کانوا یعملون)۔

اس سے بڑھ کر اور کونسی چیز باعثِ افتخار ہوگی کہ انسان کی سرپرستی اور کفالتِ امور خداوند تعالیٰ اپنے ذمے لے، اور وہ اس کا حافظ، دوست اور یاور ہو جائے۔

اور کونسی نعمت اس سے عظیم تر ہے کہ دار السلام یعنی امن و امان کا گھر وہ جگہ کہ جس میں نہ جنگ ہے نہ خونریزی، نہ نزاع ہے نہ جھگڑا، نہ خشونت و سختی ہے نہ مارنے والی اور طاقت صرف کرنے والی رقابتیں، نہ مفادات کا تصادم ہے نہ جھوٹ اور افترا، نہ تہمت، حسد اور کینہ ہے اور نہ غم و اندوہ۔ ایسا گھر جو ہر لحاظ سے راحت و آرام کی جگہ ہے، انسان کے انتظار میں ہے۔

لیکن آیت یہ کہتی ہے کہ یہ چیزیں وہ زبانی جمع خرچ سے کسی کو نہیں دیتا بلکہ عمل کے بدلے میں دیتا ہے۔ ہاں! ہاں! عمل ہی کے بدلے میں۔

۱۲۸۔ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُم مِّنَ الْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَاؤُهُم مِّنَ الْإِنسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا ۚ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ○

۱۲۹۔ وَكَذَٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظَّالِمِينَ بَعْضًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○

## ترجمہ

۱۲۸۔ اور اس دن کہ جس میں اُن سب کو جمع اور محشور کرے گا تو اُن سے کہے گا کہ اے گروہ شیاطین و جن تم نے بہت سے انسانوں کو گمراہ کیا ہے، تو انسانوں میں سے اُن کے دوست اور پیروکار کہیں گے اے ہمارے پروردگار ہم دونوں (گمراہ پیشواؤں اور گمراہ پیروکاروں) میں سے ہر ایک نے دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے (ہم ہوس آلود اور زود گزر لذات تک پہنچے اور انہوں نے ہم پر حکومت کی) اور جو اجل تو نے ہمارے لیے مقرر کردی تھی ہم اس تک پہنچ گئے۔ (خدا) کہے گا: تمہارے رہنے کی جگہ آگ ہے تم ہمیشہ کے لیے اسی میں رہو گے، مگر جو کچھ خدا چاہے، تیرا پروردگار حکیم اور دانا ہے۔

۱۲۹۔ اور اس طرح سے ہم بعض ستم گروں کو بعض (دوسرے ظالموں) کے سپرد کر دیتے ہیں یہ اُن اعمال کی وجہ سے ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

## تفسیر

ان آیات میں قرآن نئے سرے سے گمراہ اور گمراہ کرنے والے مجرمین کی سرنوشت کی طرف لوٹتا ہے، اور گذشتہ آیات کے مباحث کی اس سے تکمیل کرتا ہے۔

انہیں اس دن کی یاد دلاتا ہے کہ جس دن وہ اُن شیاطین کے آمنے سامنے کھڑے ہوں گے کہ جن سے انہوں نے الہام لیا ہے، اور ان پیروکاروں اور اُن پیشواؤں سے سوال ہوگا، ایسا سوال کہ جس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکیں گے اور حسرت واندوہ کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ کریں گے۔ یہ تنبیہیں اس مقصد کے لیے ہیں کہ صرف اس چند روزہ زندگی پر نگاہ نہ رکھیں اور انجام کار کی بھی فکر کریں۔

قرآن پہلے کہتا ہے: اس دن کہ جس میں اُن سب کو جمع و محشور کرے گا تو ابتدا میں کہے گا کہ اے گمراہ کرنے والے جن و شیاطین تم نے بہت سے افراد انسانی کو گمراہ کیا ہے (ویوم یحشرھم جمیعًا یا معشر الجن قد استکثرتم من الانس)[1]۔

لفظ "جن" سے مراد یہاں وہی شیاطین ہیں، کیونکہ جن اصل لغت میں، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، ہر مخفی مخلوق کے معنی میں ہے۔ سورہ کہف کی آیہ ۵۰ میں ہم شیاطین کے سردار ابلیس کے بارے میں پڑھیں گے۔

---

[1] "یوم" ظرف ہے اور "یقول" سے متعلق ہے جو کہ محذوف ہے اور اصل میں جملہ یوں تھا: یوم یحشرھم جمیعًا یقول۔

"کان من الجن"

یعنی وہ جنوں میں سے تھا۔

آیات گذشتہ کہ جن میں شیاطین کے رمزی وسوسوں کے بارے میں گفتگو تھی اور فرمایا گیا تھا ان الشیطین لیوحون الی اولیائھم" اسی طرح بعد والی آیت کہ اور لوگوں کے بارے میں بعض ستم گروں کی رہبری کی بات کر رہی ہے ہو سکتا ہے کہ وہ اسی امر کی طرف اشارہ ہو۔

لیکن گمراہ کرنے والے شیاطین کے پاس اس گفتگو کا کوئی جواب نہیں ہے اور وہ خاموش ہو جاتے ہیں لیکن وہ انسانوں میں سے ان کی پیروی کرنے والے اس طرح کہیں گے کہ پروردگارا! انہوں نے ہم سے فائدہ اٹھایا اور ہم نے اُن سے فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ ہماری اجل آگئی" (وقال اولیائھم من الانس ربنا استمتع بعضنا ببعض وبلغنا اجلنا الذی اجلت لنا)۔

وہ اسی بات پر خوش تھے کہ انہیں فرمانبردار پیروکار مل گئے ہیں اور ان پر حکومت کر رہے ہیں، اور ہم بھی دنیا کے زرق و برق اور اس کی بے لگام وقتی لذات سے کہ جو شیاطین کے وسوسوں کی وجہ سے دلفریب اور دلچسپ دکھائی دیتی تھیں، خوش تھے۔

اس بارے میں کہ اس آیت میں اجل سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد زندگی کا اختتام ہے؟ یا قیامت کا دن ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن ظاہراً زندگی کا اختتام مراد ہے، کیونکہ لفظ "اجل" اس معنی میں قرآن کی بہت سی آیات میں استعمال ہوا ہے۔

لیکن خدا ان سب فاسد و مفسد پیشواؤں اور پیروکاروں کو مخاطب کر کے کہتا ہے، تم سب کے رہنے کی جگہ آگ ہے اور تم ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہو گے، مگر جو کچھ خدا چاہے (قال النار مثواکم خالدین فیھا الا ماشاء اللہ)۔

جملہ "الا ماشاء اللہ" (مگر جو خدا چاہے) کے ساتھ استثنا یا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے لوگوں پر عذاب و سزا کا ابدی ہونا پروردگار عالم سے اس کی قدرت کو سلب نہیں کرتا۔ بلکہ وہ جب چاہے اسے بدل سکتا ہے، اگرچہ ایک گروہ کے لیے قائم رہنے دیتا ہے۔

یا یہ اُن افراد کی طرف اشارہ ہے کہ جو ابدی عذاب کے مستحق نہیں ہیں۔ یا وہ عفو الٰہی کے شامل حال ہونے کی قابلیت رکھتے ہیں کہ جنہیں سزا کے جاودانی ہونے اور ہمیشگی کے حکم سے مستثنیٰ ہونا چاہیے۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، تیرا پروردگار حکیم و دانا ہے (ان ربک حکیم علیم)۔

اس کی سزا بھی حساب و کتاب کے ماتحت ہے اور اس کی بخشش بھی حساب و کتاب کی رو سے ہے اور وہ ان کے مواقع کو اچھی طرح جانتا ہے۔

اگلی آیت میں اس قسم کے افراد کے بارے میں ایک دائمی قانونِ الٰہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جس طرح ستم گر اور طاغی لوگ اس دنیا میں ایک دوسرے کے حامی اور معاون تھے، وہ آپس میں رہبر و رہنما بھی تھے،

اور غلط راستوں پر چلنے میں ایک دوسرے کے قریبی ہمکار بھی تھے ، دوسرے جہان میں بھی ہم انہیں ایک دوسرے کے ساتھ چھوڑ دیں گے ، اور یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے کہ جنہیں وہ اس جہان میں انجام دیتے تھے "وکذٰلک نولی بعض الظٰلمین بعضا بما کانوا یکسبون)۔

کیونکہ جیسا کہ ہم نے معاد سے مربوط مباحث میں بیان کیا ہے قیامت کا منظر بہت بڑے پیمانے پر عکس العمل اور ردِ عمل کا منظر ہے اور وہاں پر جو کچھ ہوگا وہ اس دنیا میں ہمارے اعمال کا پرتو اور انعکاس ہے[1]

تفسیر علی بن ابراہیم قمی میں بھی امام علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

نولی کل من تولی اولیائهم فیکونون معهم یوم القیٰمة

قیامت کے دن ہر شخص اپنے اولیا کے ساتھ ہوگا ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت میں ان تمام گروہوں کا "ظالم" کے عنوان سے تعارف کرایا گیا ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ "ظلم" اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے ان سب پر محیط ہے ۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوگا کہ انسان اپنے جیسے شیطان صفت لوگوں کی رہبری کو قبول کر کے اپنے آپ کو خدا کی ولایت سے خارج کرلے ، اور دوسرے جہان میں بھی انہی کی ولایت کے ماتحت قرار پائے ۔

نیز یہ تعبیر اور " بما کانوا یکسبون " سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ سیاہ روزی اور بدبختی خود ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہے اور یہ ایک سنت الٰہی اور قانون فطرت ہے کہ تاریک راستوں کے راہی بدبختی کے کنویں اور درّے میں گرنے کے سوا اور کوئی انجام و عاقبت نہیں پائیں گے ۔

۱۳۰۔ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَشَهِدُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ کَانُوْا کٰفِرِیْنَ ○

۱۳۱۔ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ یَکُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ○

۱۳۲۔ وَلِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ

---

[1] مزید وضاحت کے لیے "معاد و جہان پس از مرگ" نامی قیمتی کتاب کی طرف رجوع کریں ۔

عَمَّا يَعْمَلُونَ ○

## ترجمہ

۱۳۰- (اس دن اُن سے کہے گا) اے گروہ جن وانس! کیا تم ہی میں سے (ہمارے بھیجے ہوئے) رسول تمہارے پاس نہیں آتے تھے، جو ہماری آیات تمہارے سامنے بیان کیا کرتے تھے، اور اس قسم کے دن کی ملاقات سے تمہیں ڈراتے تھے، وہ کہیں گے کہ ہم خود اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں (ہاں ہم نے بُرا کیا) اور انہیں دنیا کی (زرق و برق) زندگی نے فریب دیا، اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں کہ وہ کافر تھے۔

۱۳۱- یہ اس بنا پر ہے کہ تیرا پروردگار کبھی بھی شہر اور آبادیوں (کے لوگوں) کو ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے غفلت اور بے خبری کی حالت میں ہلاک نہیں کرتا (بلکہ پہلے کچھ رسولوں کو اُن کے پاس بھیجتا ہے)۔

۱۳۲- اور (ان دونوں گروہوں میں سے) ہر ایک کے لیے درجات (اور مراتب) ہیں ہر اس عمل کے بدلے میں جو انہوں نے انجام دیا ہے اور تیرا پروردگار اُن اعمال سے جو اُنہوں نے انجام دیئے ہیں غافل نہیں ہے۔

## تفسیر

### اِتمام حجت

گذشتہ آیات میں شیطان صفت ستم گروں کی قیامت کے دن کی سرنوشت بیان ہوئی ہے، اس غرض سے کہیں یہ تصور نہ کر لیا جائے کہ انہوں نے غفلت کی حالت میں یہ کام انجام دیئے ہوں گے اب ان آیات میں واضح کرتا ہے کہ انہیں کافی تنبیہ کی گئی ہے اور ان پر اتمامِ حجت کی گئی ہے، لہٰذا قیامت کے دن وہ ان سے کہے گا: اے گروہ جن وانس! کیا تم ہی میں سے رسول تمہارے پاس نہیں آئے تھے اور ہماری آیات بیان نہیں کی تھیں اور قسم کے دن کی ملاقات سے تمہیں ڈرایا نہیں تھا (یا معشر الجن والانس الم یأتکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیاتی وینذرونکم لقاء یومکم ھٰذا)۔

"معشر" اصل میں "عشرۃ" سے جو دس کے عدد کے معنی میں ہے لیا گیا ہے اور چونکہ دس کا عدد ایک کامل عدد ہے، لہٰذا معشر کا لفظ ایک کامل جماعت پر جو مختلف اصناف اور طبقوں پر مشتمل ہو، بولا جاتا ہے، اس بارے میں کہ آیا جنوں کی طرف بھیجے گئے رہنما خود انہی کی جنس و نوع سے تھے یا نوعِ بشر میں سے مفسرین کے درمیان اختلاف

ہے۔ لیکن سورۂ جن کی آیات سے جو کچھ اچھی طرح سے استفادہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ، قرآن اور اسلام سب کے لیے ہے حتیٰ کہ جنوں کے لیے بھی نازل ہوا ہے، اور پیغمبر اسلام سب کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے ان کو دعوت دینے کے لیے خود انہی میں سے پیغام دینے والے اور نمائندے مامور ہوں اس بارے میں مزید تشریح اور "جن" کے علمی معنی کے بارے میں بھی انشاء اللہ قرآن مجید کے پارہ ۲۹ میں سورہ جن کی تفسیر میں آئے گی۔

لیکن اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ لفظ "منکم" (تم میں سے) اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہر گروہ کے رسول خود ا[illegible] کی جنس اور نوع سے ہوں گے کیونکہ جب ایک گروہ سے یہ کہا جائے کہ "تم میں سے چند نفر" تو یہ نفر ممکن ہے کہ ایک [illegible] گروہ سے ہوں یا تمام گروہوں میں سے ہوں۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ قیامت کے دن کچھ بھی چھپایا نہیں جا سکے گا اور اس روز سب چیزوں کی نشانیاں آشکار ہوں گی اور کوئی شخص کسی چیز کو چھپا نہیں سکے گا۔ سب کے سب خدا کی اس پرسش کے سامنے اظہار کرتے ہوتے کہیں گے ہم خود اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایسے رسول آئے تھے اور انہوں نے تیرے پیغام ہمیں پہنچائے تھے، مگر ہم نے ان کی مخالفت کی تھی (قالوا شهدنا علیٰ انفسنا)۔

ہاں! ان کے پاس پروردگار کی طرف سے کافی دلائل موجود تھے اور وہ راہ اور چاہ میں تمیز کرتے تھے "لیکن دنیا کی پُر فریب زندگی اور اس کے وسوسہ انگیز زرق و برق نے انہیں دھوکا دیا" (وغرتهم الحیٰوة الدنیا)۔

یہ جملہ اچھی طرح سے واضح کر رہا ہے کہ انسانوں کے لیے راہِ سعادت میں سب سے بڑی رکاوٹ، جہانِ مادہ کے مظاہر کے سامنے بے لگام ہو کر سرِ تسلیم خم کرنا اور بے حد و حساب دلبستگی ہے، ایسی دلبستگیاں کہ جو انسان کو زنجیر غلامی کی طرف کھینچ لے جاتی ہیں اور اسے ہر قسم کے ظلم و ستم، تعدی و انحراف اور خود خواہی و طغیان کی دعوت دیتی ہیں۔

قرآن دوبارہ تاکید کرتا ہے: وہ صراحت کے ساتھ اپنے ضرر میں اور اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کفر کی راہ پر چلے تھے اور منکرین حق کی صف میں شامل ہوئے تھے (وشهدوا علیٰ انفسهم انهم کانوا کافرین)۔

بعد والی آیت میں گذشتہ آیت کے اسی مضمون کو دہرایا گیا ہے لیکن ایک قانونِ کلی اور دوامی سنت الٰہیہ کی صورت میں بیان کیا گیا ہے کہ "یہ اس بناء پر کہ تیرا پروردگار کبھی بھی شہروں اور بستیوں کے لوگوں کو ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے غفلت کی حالت میں ہلاک نہیں کیا کرتا، مگر یہ کہ ان کی طرف انبیا و رسل کو بھیجے اور انہیں ان کے بُرے اعمال کی بُرائی کی طرف متوجہ کرے اور جو کہنے کی باتیں ہیں وہ ان سے کہے (ذٰلك ان لم یکن ربك مهلك القریٰ بظلم واهلها غافلون)۔

لفظ "بظلم" اس معنی میں بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کسی کو اس کے مظالم کی بناء پر غفلت کی حالت میں پیغمبروں کے بھیجنے سے پہلے عذاب اور سزا نہیں دیتا اور اس معنی میں بھی ہو سکتا ہے کہ خدا افرادِ غافل کو ظلم و ستم سے عذاب و سزا نہیں دیتا، کیونکہ انہیں اس حالت میں سزا دینا ظلم و ستم ہے اور خداوند تعالیٰ اس سے بالا و برتر ہے کہ وہ کسی پر ظلم و ستم

کرے[1]

ان کے سرانجام کا بعد کی آیت میں خلاصہ کرتے ہوئے یوں فرمایا گیا ہے: ان گروہوں میں سے ہر ایک، نیکوکار، بدکار، فرمانبردار و قانون شکن، حق طلب و ستم گر وہاں پر اپنے اعمال کے مطابق درجات و مراتب کے حامل ہوں گے اور تیرا پروردگار کبھی بھی ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ بلکہ وہ سب کو جانتا ہے اور وہ ہر شخص کو اس کی لیاقت کے مطابق دے گا (ولکل درجات مما عملوا وما ربك بغافل عما یعملون)۔

یہ آیت دوبارہ اس حقیقت کو تاکید کے ساتھ بیان کر رہی ہے کہ تمام مراتب، درجات اور درکات خود انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں نہ کہ کسی اور چیز کا۔

۱۳۳ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ○

۱۳۴۔ إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ○

۱۳۵۔ قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ○

## ترجمہ

۱۳۳۔ اور تیرا پروردگار بے نیاز اور مہربان ہے (لہٰذا وہ کسی کے بارے میں ظلم و ستم نہیں کرتا بلکہ یہ اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتتے ہیں) اگر وہ چاہے تو تم سب کو لے جائے اور تمہارے بعد تمہاری بجائے جو کچھ چاہے اور جسے چاہے) تمہارا جانشین بنا دے جیسا کہ تمہیں دوسری اقوام کی نسل سے وجود میں لایا ہے۔

۱۳۴۔ جو کچھ تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ آکر رہے گا اور تم (خدا کو) عاجز و ناتواں نہیں کر سکتے (کہ اس کی عدالت

---

[1] پہلی صورت میں "ظلم" کا فاعل کافر ہیں اور دوسری صورت میں کہ جس میں ظلم کی نفی ہوئی ہے اس کا اشارہ خدا کی طرف ہے۔

سزا سے بچ، بھاگ جاؤ)۔

۱۳۵۔ کہہ دو اے قوم! جو کام (تم سے ہو سکتا ہے اور) تمہاری قدرت میں ہے کر گذرو۔ میں (بھی اپنے فریضہ پر) عمل کروں گا، لیکن بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کونسا شخص نیک انجام رکھتا ہے (اور کامیابی کس کے لیے۔ ہے لیکن) یہ بات مسلم ہے کہ ظالم فلاح و نجات حاصل نہیں کریں گے۔

## تفسیر

پہلی آیت درحقیقت اس پر ایک استدلال ہے جو گذشتہ آیات میں پروردگار کے ظلم نہ کرنے کے بارے میں بیان ہوا ہے۔ آیت کہتی ہے: تیرا پروردگار بے نیاز بھی ہے اور رحیم و مہربان بھی ہے، اس بناء پر کوئی وجہ نہیں کہ کسی پر چھوٹے سے چھوٹا ظلم بھی روا رکھے کیونکہ ظلم تو وہ کرتا ہے کہ جو یا تو نیازمند ہو یا سخت مزاج اور سنگدل ہو (وربك الغنی ذو الرحمة)۔

علاوہ ازیں اُسے نہ تو تمہاری اطاعت کی ضرورت ہے اور نہ ہی اسے تمہارے گناہوں کا خوف ہے کیونکہ "اگر وہ چاہے تو تم سب کو لے جائے اور تمہاری جگہ پر دوسرے لوگوں کو جنہیں وہ چاہے تمہارا جانشین بنا دے جیسا کہ اس نے تمہیں ایسے انسانوں کی نسل میں سے پیدا کیا جو تم سے بہت سی صفات میں مختلف تھے (ان یشأ یذھبکم ویستخلف من بعدکم ما یشاء کما انشأکم من ذریة قوم اٰخرین)۔

اس بناء پر وہ بے نیاز بھی ہے اور مہربان بھی اور ہر چیز پر قدرت بھی رکھتا ہے، اس حالت میں اس کے بارے میں ظلم کا تصور ممکن نہیں ہے۔

اور اس کی لامتناہی قدرت پر توجہ رکھتے ہوئے یہ بات واضح اور روشن ہے کہ "اُس نے تم سے جو قیامت اور جزا و سزا کے بارے میں وعدہ کیا ہے وہ ہو کے رہے گا اور اس کی تھوڑی سی بھی خلاف ورزی نہیں ہوگی" (ان ما توعدون لاٰت)۔

"اور تم ہرگز اس کی حکومت سے باہر نہیں نکل سکتے اور اس کے پنجہ عدالت سے فرار نہیں کر سکتے" (وما انتم بمعجزین)[1]۔

اس کے بعد پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا ہے: انہیں تہدید کرتے اور دھمکی دیتے ہوئے کہو کہ اے قوم! تم سے جو کچھ ہو سکتا

---

[1] "معجزین" "اعجاز" کے مادہ سے ہے یعنی دوسرے کو ناتوان و عاجز کر دینا۔ آیت کہتی ہے کہ تم خدا کو قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرکے اٹھانے اور عدالت کے جاری کرنے سے عاجز نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں تم اس کی قدرت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ہے وہ کر گزرو، میں بھی وہ کام جس کا خدا نے مجھے حکم دیا ہے انجام دوں گا۔ مگر تمہیں بہت ہی جلد معلوم ہو جائے گا کہ نیک انجام اور آخری کامیابی کسے نصیب ہوتی ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ ظالم و ستمگر کامیاب نہیں ہوں گے اور سعادت و نیک بختی کا منہ نہیں دیکھیں گے (قل یا قوم اعملوا علی مکانتکم انی عامل فسوف تعلمون من تکون لہ عاقبۃ الدار انہ لا یفلح الظالمون)۔

یہاں ہم دوبارہ دیکھ رہے ہیں کہ "کفر" کی بجائے "ظلم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کفر اور انکار حق ایک قسم کا واضح و آشکار ظلم ہے، اپنے اوپر بھی ظلم ہے اور معاشرے پر بھی ظلم ہے اور چونکہ ظلم جہان آفرینش کی عمومی عدالت کے برخلاف ہے لہٰذا آخر کار اسے شکست ہوگی۔

۱۳۶۔ وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

## ترجمہ

۱۳۶۔ اور (مشرکین نے) ان چیزوں میں سے جو خدا نے پیدا کی ہیں (یعنی) زراعت اور چوپایوں میں سے کچھ حصّہ خدا کے لیے (بھی) قرار دیا ہے اور انہوں نے یہ کہا کہ (ان کے گمان کے مطابق) یہ خدا کا مال ہے اور یہ ہمارے شرکاء (یعنی بتوں) کا مال ہے۔ جو ان کے شرکاء کا مال تھا وہ تو خدا تک نہیں پہنچتا تھا لیکن جو خدا کا مال تھا وہ ان کے شرکاء تک پہنچ جاتا تھا۔ (اور اگر بتوں کا حصہ کم ہو جاتا تھا تو خدا کا مال انہیں دے دیتے تھے لیکن اس کے برعکس کو جائز نہیں سمجھتے تھے یعنی خدا کا حصہ کم ہو جانے کی صورت میں بتوں کے مال میں سے خدا کو نہیں دیتے تھے) وہ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں (کہ شرک کے علاوہ خدا کو بتوں سے بھی کمتر سمجھتے تھے)

## تفسیر

ان کے دماغوں سے بت پرستی کے افکار کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے مشرکین کے بیہودہ عقائد و رسوم اور آداب و عبادات کا دوبارہ ذکر شروع کیا گیا ہے اور بیان رسا کے ذریعے ان کے بیہودہ ہونے کو واضح کیا گیا ہے۔

قرآن پہلے کہتا ہے، کفار مکہ اور تمام مشرکین اپنی زراعت اور چوپایوں میں سے ایک حصّہ تو خدا کے لیے اور ایک حصّہ اپنے بتوں کے لیے بھی قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ حصّہ تو خدا کا ہے اور یہ ہمارے شرکاء یعنی بتوں کا مال ہے (وجعلوا للّٰہ مما ذرأ من الحرث والانعام نصیبًا فقالوا ھٰذا للّٰہ بزعمھم وھٰذا لشرکائنا)۔

اگرچہ آیت میں صرف خدا کے حصہ کی طرف اشارہ ہوا ہے لیکن بعد کے جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک حصّہ خدا کا اور ایک حصّہ بتوں کا قرار دیتے تھے۔ روایات میں آیا ہے کہ اس حصہ کو تو جسے وہ خدا کے لیے قرار دیتے تھے بچوں اور مہمانوں میں صرف کرتے، اور اس سے اس کام کے لیے استفادہ کرتے تھے لیکن زراعت اور چوپایوں کا وہ حصّہ جو وہ بتوں کے لیے قرار دیتے تھے بتوں اور بت خانہ کے خادموں اور متولیوں اور مراسم قربانی اور خود ان کے اپنے لیے مخصوص تھا۔[1]

"شرکائنا" (ہمارے شریک) کی تعبیر بتوں کے لیے اس بناء پر تھی کہ وہ انہیں اپنے اموال، سرمائے اور زندگی میں شریک سمجھتے تھے۔

"مما ذرأ" (اس میں سے جو خدا نے خلق کیا ہے) کی تعبیر درحقیقت ان کے عقیدہ کے ابطال کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ تمام اموال سب کے سب خدا کی مخلوق تھے تو پھر ان میں سے ایک حصّہ خدا کے لیے اور ایک حصہ بتوں کے لیے کیسے مقرر کرتے تھے۔

اس کے بعد اس بارے میں ان کے ایک عجیب و غریب فیصلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ حصّہ جو انہوں نے بتوں کے لیے مقرر کیا تھا وہ تو ہرگز خدا کو نہیں مل سکتا تھا (اور خدا کے نام پر کسی کو نہیں دیا جا سکتا تھا) لیکن وہ حصّہ جو انہوں نے خدا کے لیے قرار دیا تھا وہ بتوں کو پہنچ جاتا تھا (فما کان لشرکائھم فلا یصل الی اللّٰہ وما کان للّٰہ فھو یصل الی شرکائھم)۔

اس بارے میں کہ اس جملے سے کیا مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن تقریبًا وہ سب کے سب ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب کسی حادثہ کی وجہ سے زراعت یا چوپایوں میں سے مقرر کیے ہوئے خدا کے سہم کا کچھ حصّہ خراب ہو جاتا تھا اور نابود ہو جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ یہ کوئی اہم بات نہیں ہے خدا بے نیاز ہے لیکن اگر بتوں کے حصّہ میں سے کچھ ضائع ہو جاتا تو سہم خدا کو اس کی جگہ قرار دے لیتے تھے اور کہتے تھے کہ بتوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

اسی طرح اگر اس کھیت کا پانی جو خدا کے حصّہ میں تھا بتوں کے حصّہ والے کھیت میں چلا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ کوئی حرج نہیں ہے، خدا تو بے نیاز ہے۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو جاتا تو اس کو روک دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بتوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

آیت کے آخر میں خدا تعالےٰ ایک مختصر سے جملے کے ذریعے اس بے ہودہ عقیدے کو جرم قرار دے کر اس کے

---

[1] تفسیر المنار جلد ہشتم صفحہ ۱۲۲۔

خلاف فیصلہ کرتا ہے اور کہتا ہے یہ کیسا بُرا فیصلہ کرتے ہیں (ساء ما یحکمون)۔

اس بات کے علاوہ کہ بت پرستی خود ایک فاسد اور بے اساس چیز ہے ان کے فعل کی برائی کے کچھ اور پہلو بھی ہیں:

۱۔ باوجود اس کے کہ تمام چیزیں خدا کی مخلوق ہیں اور اس کی مسلّم ملکیت ہیں اور تمام موجودات کا حاکم و مدبر و محافظ وہی ہے، وہ اس میں سے صرف ایک ہی حصّہ کو خدا کے ساتھ مخصوص قرار دیتے تھے، گویا اصلی مالک وہ خود تھے، لہٰذا تقسیم کا حق بھی صرف انہی کو حاصل تھا (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ "هٰذا" کا جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے)۔

۲۔ وہ اس تقسیم میں بتوں کی طرف داری کو مقدم رکھتے تھے لہٰذا ہر وہ نقصان جو خدا کے حصہ میں واقع ہوتا تھا اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن جو نقصان بتوں کے حصّہ میں ہو جاتا اس کی خدا کے حصّہ میں سے تلافی کیا کرتے تھے اور خدا کے حصّہ میں سے لے کر بتوں کو دے دیتے۔ آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہوا ہے، اور یہ بتوں کے لیے خدا کی نسبت ایک قسم کی برتری اور امتیاز کا اظہار تھا۔

۳۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بتوں کے حصہ کے لیے ایک خاص اہمیت کے قائل تھے۔ لہٰذا ان کے حصّہ میں سے متولیان، بتوں کے خادم اور خود بت پرست کھاتے تھے اور خدا کے حصّہ کو صرف بچوں اور مہمانوں کو دیتے تھے۔ قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ موٹے تازے گوسفند اور اچھی قسم کا اناج بتوں کا مال تھے تاکہ بھولے "حاتم کے بعد پیٹ بھر کر کھا سکیں"۔

یہ سب چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ تقسیم کے سلسلے میں خدا کے لیے بتوں جتنی قدر و قیمت کے بھی قائل نہیں تھے۔ اس سے بڑھ کر قبیح اور زیادہ سنگین اور کیا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ انسان پتھر یا لکڑی کے ایک بے قدر و قیمت ٹکڑے کو عالم ہستی کے خالق و مالک سے بلند تر خیال کرے۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی انحطاطِ فکری تصور کیا جا سکتا ہے۔

۱۳۷۔ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ○

## ترجمہ

۱۳۷۔ اور اسی طرح ان کے شرکاء (یعنی بتوں) نے ان کی اولاد کے قتل کو ان کی نظروں میں پسندیدہ کر رکھا تھا (وہ اپنے بچوں کو بتوں پر قربان کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے) اور اس کام کا انجام یہ ہوا کہ بتوں نے انہیں ہلاکت میں ڈال دیا اور ان کے دین کو دگرگوں کر دیا اور اگر خدا چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے

(کیونکہ خدا جبراً انہیں ایسا کرنے سے روک سکتا تھا لیکن جبر کا کوئی فائدہ نہیں ہے) اس بناء پر انہیں اور ان کی تہمتوں کو بھی چھوڑ دو (اور ان کے اعمال کی پرواہ نہ کرو)۔

## تفسیر

قرآن اس آیت میں بت پرستوں کی ایک اور بدکاری اور اُن کے شرمناک جرائم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، جس طرح خدا اور بتوں کے بارے میں ان کی تقسیم ان کی نظروں میں بھلی تھی اور اس بُرے، بے ہودہ اور مضحکہ خیز عمل کو وہ پسندیدہ خیال کرتے تھے، اسی طرح ان کے شرکاء نے اولاد کے قتل کو بہت سے بت پرستوں کی نگاہ میں پسندیدہ بنا رکھا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے بچوں کو قتل کرنا ایک قسم کا افتخار یا عبادت شمار کرتے تھے (و کذالک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاؤھم)۔

یہاں "شرکاء" سے مراد بت ہیں کہ جن کی خاطر وہ بعض اوقات اپنے بیٹوں کو بھی قربان کر دیتے تھے یا نذر کرتے تھے کہ اگر انہیں بیٹا نصیب ہوگا تو اُسے بت کے لیے قربان کریں گے۔ جیسا کہ قدیم بت پرستوں کی تاریخ میں بیان کیا گیا ہے اور اس بناء پر بتوں کی طرف "زینت دینے" کی نسبت اس سبب سے ہے کیونکہ بتوں کے ساتھ تعلق اور عشق انہیں اس مجرمانہ عمل پر آمادہ کرتا تھا۔ اس تفسیر کی رو سے مذکورہ بالا آیت میں قتل کرنے کا بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے یا فقر و فاقہ کے خوف سے بیٹوں کو قتل کرنے کے مسئلہ کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ بتوں کے وسیلہ سے اس جرم کی تزئین سے مراد یہ ہو کہ بت کدوں کے خدام اور متولی لوگوں کو یہ کام کرنے کا شوق دلاتے تھے اور خود کو بتوں کی زبان سمجھتے تھے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب اہم سفروں اور دوسرے کاموں کے انجام دینے کے لیے "ھبل" (اُن کا بڑا بت تھا) سے اجازت لیتے تھے، ان کے اجازت لینے کا طریقہ یہ تھا کہ تیر کی وہ لکڑیاں جو ایک مخصوص تھیلے میں "ھبل" کے پہلو میں ہوا کرتی تھیں اور اُن میں سے بعض کے اُوپر "افعل" (یہ کام انجام دو) اور بعض کے اُوپر "لا تفعل" (یہ کام انجام نہ دو) لکھا ہوا ہوتا تھا، وہ تھیلے کو ہلاتے تھے اور اُن میں سے ایک تیر کی لکڑی نکال لیتے تھے اور جو کچھ اس کے اُوپر لکھا ہوا ہوتا تھا، اُسے "ھبل" کا پیغام سمجھتے تھے اور یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اس طریقے سے بتوں کا منشاء معلوم کرنا چاہتے تھے اور کچھ بعید نہیں کہ بت کے لیے قربانی کا مسئلہ بھی خدام کے ذریعہ بت کے ایک پیغام کے طور پر متعارف ہوا ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ بیٹیوں کا زندہ درگور کرنا اُن لوگوں کے درمیان کہ جو تاریخ کے بیان کے مطابق بدنامی اور ننگ و عار کا داغ مٹانے کے نام پر قبیلہ بنی تمیم کے درمیان رائج تھا، وہ بھی بت کے پیغام کے طور پر ہی متعارف ہوا ہو۔ کیونکہ تاریخ میں ہے کہ نعمان بن منذر نے عرب کی ایک جماعت پر حملہ کیا اور ان کی عورتوں کو اسیر کر لیا اور

ان کے درمیان "قیس بن عاصم" کی بیٹی بھی تھی، اس کے بعد ان کے درمیان صلح ہوگئی، اور ہر عورت اپنے قبیلے کی طرف پلٹ آئی۔ سوائے قیس کی بیٹی کے کہ اس نے اس بات کو ترجیح دی کہ وہ دشمن کی قوم کے درمیان رہ جائے اور شاید ان کے کسی جوان سے شادی کرلے۔ یہ مطلب قیس پر گراں گزرا اور اس نے بتوں کے نام کی قسم کھائی کہ جب میری دوسری لڑکی پیدا ہوگی تو میں اُسے زندہ درگور کردوں گا۔ پھر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ یہ عمل بطور سنت ان کے درمیان رائج ہوگیا کہ انہوں نے ناموس کے دفاع کے نام پر ایک بہت بڑے جرم یعنی بے گناہ اولاد کو قتل کرنے کا ارتکاب کرنا شروع کردیا[1]۔

اس بنا پر ممکن ہے کہ بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا بھی زیرِ نظر آیت میں داخل ہو۔

ایک اور احتمال بھی زیرِ بحث آیت کی تفسیر میں نظر آتا ہے۔ اگرچہ مفسرین نے اُسے ذکر نہیں کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عرب بتوں کے لیے اس قسم کی اہمیت کے قائل تھے کہ اپنے نفیس اور عمدہ اموال تو بتوں اور ان کے طاقتور اور مالدار متولیوں اور خدام پر خرچ کردیا کرتے تھے، اور خود فقیر اور تنگ دست ہوجاتے تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات بھوک اور فقر و فاقہ کی وجہ سے اپنے بچوں کو ذبح کردیتے تھے، بتوں کے ساتھ ان کے اس عشق نے ایسے بُرے عمل کو ان کی نظروں میں مزین کردیا تھا۔

لیکن پہلی تفسیر یعنی بتوں کے لیے اولاد کو قربان کرنا آیت کے متن کے ساتھ سب سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے
اس کے بعد قرآن کہتا ہے: اس قسم کے قبیح اور بداعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ بت اور بتوں کے خدام، مشرکین کو ہلاکت میں ڈال دیں، اور دین آئینِ حق کو ان پر مشتبہ کردیں اور انہیں ایک پاک و پاکیزہ دین تک پہنچنے سے محروم کردیں (لیردوھم ولیلبسوا علیھم دینھم)۔

قرآن کہتا ہے: ان تمام باتوں کے باوجود اگر خدا چاہتا تو جبراً انہیں اس کام سے روک دیتا، مگر جبر کرنا سنتِ الٰہی کے برخلاف ہے، خدا چاہتا ہے کہ بندے آزاد رہیں، تاکہ تربیت اور تکامل وارتقا کی راہ ہموار ہو۔ کیونکہ جبر میں نہ تربیت ہے نہ تکامل وارتقا (ولو شاء اللہ ما فعلوہ)۔

اور آخر میں فرماتا ہے: اب جبکہ یہ حال ہے اور وہ اس قسم کے بیہودہ، پست اور شرمناک اعمال میں غوطہ زن ہیں یہاں تک کہ اس کی قباحت کو بھی نہیں سمجھتے اور سب سے بدتر یہ کہ وہ کبھی اسے خدا کی طرف بھی منسوب کردیتے ہیں لہٰذا تم انہیں اور ان کی تہمتوں کو چھوڑ دو اور آمادہ و مستعد دلوں کی تربیت کرو (فذرھم وما یفترون)۔

---

[1] بعض خیال کرتے ہیں کہ لفظ اولاد زیرِ نظر آیت میں اس تفسیر کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ لفظ اولاد ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو بیٹا اور بیٹی دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۳ میں ہے:

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین

مائیں اپنی اولاد کو مکمل دو سال دودھ پلائیں گی۔

۱۳۸۔ وَقَالُوا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۗ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○

۱۳۹۔ وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۚ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۗ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○

## ترجمہ

۱۳۸۔ اور انہوں نے کہا کہ چوپایوں اور زراعت کا یہ حصہ (جو بتوں کے ساتھ مخصوص ہے یہ سب کے لیے) ممنوع ہے اور سوائے اُن لوگوں کے جنہیں ہم چاہیں ۔ ان کے گمان کے مطابق ۔ اس سے کسی کو نہیں کھانا چاہیے۔ اور (وہ یہ کہتے تھے کہ یہ) ایسے چوپائے ہیں کہ جن پر سوار ہونا حرام قرار دے دیا گیا ہے اور وہ چوپائے کہ جن پر خدا کا نام نہیں لیتے تھے اور خدا پر جھوٹ بولتے تھے (اور یہ کہتے تھے کہ یہ احکام خدا کی طرف سے ہیں) عنقریب ان کے افتراء کی سزا انہیں دے گا۔

۱۳۹۔ اور انہوں نے کہا کہ جو کچھ ان حیوانات کے شکم میں (جنین اور بچہ میں سے) موجود ہے وہ تو ہمارے مردوں کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ ہماری بیویوں پر حرام ہے لیکن اگر وہ مردہ ہو (یعنی مردہ پیدا ہو) تو پھر سب اس میں شریک ہیں اور عنقریب (خدا) اس توصیف (اور جھوٹے احکام) کی سزا انہیں دے گا، وہ حکیم و دانا ہے۔

## تفسیر

ان آیات میں بت پرستوں کے بے ہودہ احکام کے کچھ حصوں کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو ان کی کوتاہ فکری کی حکایت و ترجمانی کرتے ہیں اور گذشتہ آیات کی بحث کی تکمیل کرتے ہیں۔

قرآن پہلے کہتا ہے کہ بت پرست کہتے تھے کہ چوپایوں اور زراعت کا یہ حصہ جو بتوں کے ساتھ مخصوص ہے اور خاص انہی کا حصہ ہے کلی طور پر سب کے لیے ممنوع ہے سوائے ان لوگوں کے جن کو ہم چاہیں۔ ان کے خیال کے مطابق صرف اسی گروہ کے لیے حلال تھا دوسروں کے لیے نہیں (وقالوا هٰذه انعام وحرث حجر لا يطعمها الا من نشاء بزعمهم)۔

ان کی اس سے مراد وہی بت اور بت خانہ کے متولی اور خدام تھے، صرف وہی گروہ تھا کہ جو ان کے خیال کے مطابق بتوں کے حصہ میں سے کھانے کا حق رکھتے تھے۔

اس بیان سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آیت کا یہ حصہ حقیقت میں اس حصہ کے مصرف کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے، جو انہوں نے زراعت اور چوپایوں میں سے بتوں کے لیے مقرر کیا تھا، جس کی تفصیل گذشتہ آیات میں گذر چکی ہے۔

لفظ "حجر" (بروزن "شعر") اصل میں ممنوع قرار دینے کے معنی میں ہے اور جیسا کہ راغب نے کتاب مفردات میں کہا ہے بعید نہیں کہ "حجارة" کے مادہ سے پتھر کے معنی میں لیا گیا ہو۔ کیونکہ جب وہ یہ چاہتے تھے کہ کسی احاطے میں داخلہ ممنوع قرار دیں تو اس کے گرد پتھر چن دیتے تھے اور یہ جو "حجر اسماعیل" پر اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مخصوص پتھر کی دیوار کے ذریعے اسے مسجد الحرام کے دوسرے حصوں سے الگ کیا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے عقل کو بھی کبھی کبھی "حجر" کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ انسان کو برے کاموں سے روکتی ہے، اور اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی نگرانی اور حمایت میں آجائے تو کہتے ہیں کہ یہ اس کی حجر (حفاظت) میں ہے، اور "محجور" اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جو اپنے اموال میں تصرف کرنے سے رکا ہوا ہے[1]

اس کے بعد دوسری چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جسے انہوں نے حرام کر رکھا تھا اور فرمایا گیا ہے: وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ کچھ جانور ایسے ہیں کہ جن پر سوار ہونا حرام ہے (وانعام حرمت ظهورها)۔

اور ظاہراً یہ وہی جانور تھے کہ جن کی تفصیل سورہ مائدہ کی آیہ ۱۰۳ میں "سائبہ"، "بحیرہ"، اور "حام" کے عنوان سے گذر چکی ہے (مزید معلومات کے لیے مذکورہ آیت کے ذیل میں بیان کردہ تفسیر کا مطالعہ کریں)۔

اس کے بعد ان کے ناروا احکام کے تیسرے حصے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کچھ جانوروں پر خدا کا نام نہیں لیتے تھے (وانعام لا يذكرون اسم الله عليها)۔

یہ جملہ ہو سکتا ہے ایسے جانوروں کی طرف اشارہ ہو جن کو ذبح کرتے وقت صرف بت کا نام لیتے تھے یا اس سے مراد وہ جانور ہوں کہ جو پر حج کے لیے سوار ہونا انہوں نے حرام قرار دیا تھا، جیسا کہ تفسیر مجمع البیان، تفسیر کبیر، المنار

---

[1] اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیے کہ اوپر والی آیت میں "حجر" وصفی معنی رکھتا ہے اور "محجور" کے معنی میں آیا ہے اور مذکر و مونث دونوں اس میں یکساں ہیں۔

اور قرطبی میں بعض مفسرین سے نقل ہوا ہے اور دونوں صورتوں میں یہ ایک بے دلیل اور بیہودہ حکم تھا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ ان بیہودہ احکام پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ خدا پر افترا باندھتے تھے اور ان کی خدا کی طرف نسبت دیتے تھے ( افتراء علیہ )۔

آیت کے آخر میں ان بناوٹی احکام کے ذکر کے بعد قرآن کہتا ہے : خدا عنقریب ان افترات کے بدلے میں انہیں سزا اور عذاب دے گا ( سیجزیھم بما کانوا یفترون )۔

ہاں ! جب ایک انسان یہ چاہے کہ وہ اپنی ناقص فکر و عقل کے ذریعے کوئی قانون بنائے تو عین ممکن ہے کہ ہر گروہ اپنی ہوا و ہوس سے کچھ احکام و قوانین بناڈالے اور خدا کی نعمتوں کو بلا وجہ اپنے اوپر حرام قرار دے لے یا قبیح اور غلط کاموں کو اپنے لیے حلال قرار دے لے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون کا وضع کرنا صرف خدا کا کام ہے جو سب کچھ جانتا ہے اور ہر کام کی مصلحت سے آگاہ ہے اور ہر قسم کی ہوا و ہوس سے دور ہے۔

بعد والی آیت میں ان کے ایک اور بیہودہ حکم کی طرف جو جانوروں کے گوشت کے بارے میں ہے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : انہوں نے کہا ہے کہ وہ جنین ( اور بچے ) جو ان جانوروں کے شکم میں ہیں وہ ہمارے مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور ہماری بیویوں پر حرام ہیں البتہ اگر وہ مردہ پیدا ہوں تو پھر سب اس میں شریک ہیں ( وقالوا ما فی بطون ھٰذہ الانعام خالصۃ لذکورنا و محرم علی ازواجنا و ان یکن میتۃ فھم فیہ شرکاء )۔

اس بات پر توجہ رہے کہ " ھٰذہ الانعام " سے مراد وہی جانور ہیں جن کی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ ہوا ہے ۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ " ما فی بطون ھذہ الانعام " ( جو کچھ ان جانوروں کے شکم میں ہے ) کی عبارت ان جانوروں کے دودھ کے بارے میں بھی ہے لیکن " و ان یکن میتۃ " ( اگر مردہ ہوں ) کے جملے پر توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت " جنین " ( شکم مادر میں بچہ ) سے بحث کر رہی ہے کہ اگر وہ زندہ پیدا ہو تو اسے صرف مردوں کے ساتھ مخصوص جانتے تھے اور اگر مردہ پیدا ہوتا تھا کہ جو ان کے لیے زیادہ باعث رغبت و میل نہ ہوتا تھا تو پھر سب کو اس میں مساوی جانتے تھے ۔

اس حکم کا اول تو کوئی فلسفہ اور منطقی دلیل ہی نہیں اور دوسرے مردہ پیدا ہونے والے جنین کے بارے میں بہت ہی برا اور چھبنے والا تھا کیونکہ اس قسم کے جانور کا گوشت تو اکثر اوقات خراب اور مضر ہوتا ہے اور تیسرے یہ کہ یہ ایک قسم کی مردوں اور عورتوں میں واضح تفریق تھی کیونکہ جو چیز اچھی تھی وہ تو صرف مردوں کے ساتھ مخصوص تھی جو چیز بری تھی اس میں سے عورتوں کو بھی حصہ دیا جاتا تھا ۔

قرآن اس جاہلانہ حکم کا ذکر کرنے کے بعد مطلب کو اس جملے کے ساتھ ختم کرتا ہے : عنقریب خدا انہیں ان کی اس قسم کی توصیفات کی سزا دے گا ( سیجزیھم وصفھم )۔

"وصف" کی تعبیر ایسی توصیف کی طرف اشارہ ہے کہ جو وہ خدا کے لیے کرتے تھے اور اس قسم کی غذاؤں کی حرمت کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے۔ اگرچہ اس سے مراد وہ صفت اور حالت ہے کہ جو تکرار گناہ کے اثر سے گناہگار شخص کو عارض ہوتی ہے اور اُسے سزا و عذاب کا مستحق بنا دیتی ہے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: وہ حکیم اور دانا ہے (انہ حکیم علیم)۔

ان کے اعمال و گفتار اور ناروا تہمتوں سے بھی باخبر ہے، اور حساب ہی کے ساتھ انہیں سزا بھی دے گا۔

۱۴۰۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْۤا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ۠

## ترجمہ

۱۴۰۔ یقیناً جنہوں نے اپنی اولاد کو حماقت و نادانی کی بناء پر قتل کر دیا انہوں نے نقصان اٹھایا ہے، اور جو کچھ خدا نے انہیں رزق دے رکھا تھا اُسے اپنے اُوپر حرام قرار دے لیا اور خدا پر انہوں نے افترا باندھا ہے وہ گمراہ ہو گئے ہیں اور (وہ ہرگز) ہدایت نہیں پائیں گے۔

## تفسیر

گذشتہ چند آیات میں زمانہ جاہلیت کے عربوں کے فضول احکام اور قبیح اور شرمناک رسوم سے متعلق گفتگو تھی منجملہ ان کے اپنی اولاد کو بتوں کی قربانی کے طور پر قتل کرنا، اپنے قبیلہ اور خاندان کی حیثیت و عزت کو محفوظ رکھنے کے نام پر اپنی بیٹیاں کو زندہ درگور کرنا اور اسی طرح کچھ حلال نعمتوں کے حرام کر لینا تھا۔ اس آیت میں بڑی سختی کے ساتھ ان تمام اعمال و احکام کو جرم قرار دیتے ہوئے سات مختلف تعبیروں کے ساتھ جو مختصر جملوں میں ہیں لیکن وہ بہت ہی رسا اور جاذب توجہ ہیں، ان کی وضع و کیفیت کو واضح و روشن کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنی اولاد کو حماقت، بے وقوفی اور جہالت کی بناء پر قتل کیا ہے، انہوں نے نقصان اور خسارہ اُٹھایا ہے وہ انسانی اور اخلاقی نظر سے بھی اور احساس کی نظر سے بھی اور اجتماعی و معاشرتی لحاظ سے بھی خسارے اور نقصان میں گرفتار ہوئے ہیں اور سب سے زیادہ اور سب سے بڑھ کر انہوں نے دوسرے جہاں میں روحانی نقصان اٹھایا ہے (قد خسر الذین قتلوا اولادھم سفھا بغیر علم)۔ اس جملے میں ان کا یہ عمل اولاً ایک قسم کا خسارہ اور نقصان اور اس کے بعد حماقت کم عقلی اور بعد میں جاہلانہ کام کے طور پر متعارف ہوا ہے ان تینوں تعبیرات میں سے ہر ایک تنہا ان کے عمل کی برائی کے تعارف کے لیے کافی ہے۔ کونسی عقل اجازت دیتی ہے کہ انسان

اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے قتل کردے اور کیا یہ حماقت اور بے وقوفی کی انتہا نہیں ہے کہ وہ اپنے اس عمل پر شرم نہ کرے بلکہ اس پر ایک قسم کا فخر کرے اور اسے عبادت شمار کرے۔ کونسا علم و دانش اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ انسان ایسا عمل ایک سنت کے طور پر یا اپنے معاشرے میں ایک قانون کے طور پر قبول کرے۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں ہمیں ابن عباس کی گفتگو یاد آرہی ہے کہ جو کہا کرتے تھے:

جو شخص زمانہ جاہلیت کی قوموں کی پسماندگی کی میزان کو جاننا چاہے تو وہ سورۂ انعام کی آیات (یعنی زیر بحث آیات) کو پڑھے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: انہوں نے اس چیز کو جو خدا نے انہیں روزی کے طور پر دی ہوئی تھی اور ان کے لیے اُسے مباح و حلال قرار دیا تھا، اپنے اُوپر حرام قرار دے لیا اور خدا پر انہوں نے یہ افترا باندھا کہ خدا نے انہیں حرام کیا ہے (وحرموا ما رزقهم الله افتراء على الله)۔

اس جملے میں دو اور تعبیروں کے ذریعے ان کے اعمال کو جرم قرار دیا گیا ہے کیونکہ اوّل تو انہوں نے اس نعمت کو جو خدا نے انہیں بطور روزی دے رکھی تھی یہاں تک کہ وہ ان کی حیات کی بقا اور زندگی کے برقرار رہنے کے لیے بھی ضروری تھی، اُسے اپنے اُوپر حرام کرلیا اور خدا کے قانون کو پاؤں تلے روند ڈالا اور دوسرے خدا پر افترا باندھا کہ اس نے یہ حکم دیا ہے، حالانکہ ہرگز ہرگز ایسا نہیں تھا۔

آیت کے آخر میں دو اور تعبیرات کے ذریعے انہیں مجرم قرار دیا گیا ہے پہلے کہا گیا ہے: وہ یقیناً گمراہ ہو گئے (قد ضلوا)۔

اس کے بعد مزید کہا گیا ہے: وہ کبھی بھی راہِ ہدایت پر نہیں تھے (وما کانوا مھتدین)۔

---

پانچویں جلد کا ترجمہ تمام ہوا
بقلم سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی بر مکان
حقیر واقع قم المقدسہ چہار مردان سلطان محمد شریف
کوئی جمشیدی بلاک ۱۱۔ اسلامی جمہوریہ ایران
بتاریخ ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ
مطابق ۱۰ جولائی ۱۹۸۳ء
بوقت صبح ساڑھے نو بجے

(۱۴۱) وَهُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ٘ وَلَا تُسْرِفُوْاؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَۙ ۝

## ترجمہ

۱۴۱۔ (وہ خدا) وہ ہے کہ جس نے معروش باغات (جس میں درخت بیل کی شکل میں ہوتے ہیں اور ان کو مچان باندھ کر ان پر پھیلایا جاتا ہے جیسے انگور کی بیل) اور غیر معروش باغ (وہ درخت جن کو مچان کی ضرورت نہیں ہوتی) پیدا کیے، اسی طرح سے کھجور کے نخلستان اور طرح طرح کی کھیتیاں پیدا کیں جو میوہ اور مزے کے لحاظ سے آپس میں مختلف ہیں (نیز) زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جو ایک جہت سے باہم مشابہ ہیں اور دوسری جہت سے مختلف ہیں (پتوں اور ظاہری شکل میں آپس میں ملتے جلتے ہیں جبکہ ان کے میووں کا مزہ آپس میں مختلف ہے) اُن کے میووں کو جب اُن میں پھل آئیں کھاؤ اور اُن کا حق محصول لینے کے وقت ادا کردو، اسراف نہ کرو کیونکہ خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

## تفسیر

### توحید کا ایک عظیم درس

اس آیت شریفہ میں چند امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے ہر ایک دراصل دوسرے کا نتیجہ ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے :۔ اللہ وہی ذات ہے جسنے انواع و اقسام کے باغات، کھیتیاں اور طرح طرح کے درخت پیدا کیے جن میں سے بعض لکڑی کے مچانوں پر پھیلتے ہیں اور اپنے دلآویز منظر سے نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور اپنے لذیذ و بابرکت میووں سے انسان کو شیریں کام کرتے ہیں۔ بعض درخت ایسے ہیں جنہیں مچان باندھنے

کی ضرورت نہیں ہوتی اور وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر انسانوں کے سر پر اپنا سایہ بھی ڈالتے ہیں اور اپنے طرح طرح کے میووں سے انسان کی خدمت کرتے ہیں۔

(وھو الذی انشأ جنات معروشات و غیر معروشات)

مفسرین نے کلمۂ "معروشٰ" و "غیر معروش" کے سلسلے میں تین احتمالات ذکر کیے ہیں :۔

اوّل :۔ اس کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا گیا ہے، یعنی ایسے درخت جو اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہوسکتے بلکہ ان کو مچان وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے، دوسرے وہ درخت جو بغیر مچان کی احتیاج کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں (کیونکہ "عرش" کے معنی لغت میں پھیلانے اور ہر پھیلی ہوئی چیز کے ہیں، اسی بناء پر چھت یا اونچے پایوں کے تخت کو بھی عرش کہا جاتا ہے)۔

دوم :۔ عرش سے مراد گھریلو درخت ہیں جن کی دیوار وغیرہ سے باغوں میں حفاظت کی جاتی ہے اور غیر معروش سے مراد جنگلی اور کوہستانی درخت ہیں۔

سوم :۔ معروش ایسا درخت ہے جو پیروں پر کھڑا ہو، یا زمین پر اٹھا ہوا ہو جبکہ غیر معروش وہ درخت ہے جو زمین پر بچھ کر پھیلتا ہے۔

لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ شاید "معروشات" کا تذکرہ آغاز سخن میں اس طرح کے درختوں کی عجیب وحیرت انگیز ساخت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر ایک مختصر نظر انگور کی بیل، اس کے تنے اور اس کی پیچدار شاخوں پر کی جائے جو مخصوص قلابوں کے ذریعے اپنے کو اطراف کے سہاروں میں جکڑ لیتے ہیں تاکہ اپنی کمر کو سیدھا کر سکے تو اس سے ہمارے دعوے کی تائید ہوتی ہے۔

بعد ازاں دو طرح کے باغوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے (کہ اس طرح کھجور کے درخت اور کھیتیاں پیدا کیں۔ (والنخل والزرع)۔

ان دو کا ذکر خاص طور سے اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ دونوں انسانی زندگی اور خوراک میں شامل ہیں (یہ توجہ رہے کہ "جنات" باغات کو بھی کہتے ہیں اور زراعت سے ڈھکی ہوئی زمینوں کو بھی کہتے ہیں)۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوا :۔ یہ درخت میوہ اور ذائقہ کے لحاظ سے آپس میں مختلف ہیں۔ یعنی باوجود اس کے کہ یہ ایک ہی زمین سے اُگتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک الگ الگ مزہ، خوشبو اور خاصیت کا حامل ہے جو دوسرے درختوں میں نہیں پائے جاتے (مختلفا اکلہ)[1]

اس کے بعد دوسرے دو قسم کے میووں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے جو غیر معمولی مفید اور حیات بخش ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے : اسی طرح سے زیتون اور انار ہیں (والزیتون والرمان)۔

ان دو کا انتخاب بظاہر اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ دو درخت اگرچہ ظاہری نظر میں ایک دوسرے سے مشابہت

---

[1] اُکُل (بضم الف، و سکون یا ضم کاف) اس چیز کو کہتے ہیں جو کھائی جائے (اس کی اصل اَکل ہے جس کے معنی کھانے کے ہیں)۔

رکھتے ہیں لیکن میوہ اور غذائی خاصیت کی رُو سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ لہٰذا بغیر کسی دقت کے ارشاد ہوتا ہے ، یہ دونوں ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں اور غیر مشابہ بھی (متشابھا و غیر متشابہ)[1]

ان تمام طرح طرح کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد پروردگار عالم فرماتا ہے ، جب ان کے میوے تیار ہو جائیں تو ان میں سے تناول کرو لیکن بھولنا نہیں کہ میوہ چننے وقت ان کے حق کو ادا کر دینا (کلوا من ثمرہ اذآ اثمر و اٰتوا حقہ یوم حصادہ)۔

آخر میں خدا تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے ، اور اسراف نہ کرنا کیونکہ خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا (ولا تسرفوا انہ لا یحب المسرفین)۔

"اسراف" کے معنی ہیں حد اعتدال سے متجاوز ہونا۔ اس لفظ سے ہو سکتا ہے کھانے میں اسراف یا بخشنے میں اسراف کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ بعض لوگ اتنے کھلے دل کے ہیں کہ اپنا مال ادھر اُدھر لٹا دیتے ہیں اور اپنے تئیں اور اپنے بچوں کو محروم کر دیتے ہیں۔

# چند اہم نکات

## ۱۔ اس آیت کا سابقہ آیات سے ربط

اس سورہ کی گزشتہ آیات میں بت پرستوں کے خرافاتی احکام و رسوم کے متعلق گفتگو کی گئی تھی کہ وہ لوگ اپنی زراعت اور چوپایوں میں سے خدا کے لیے ایک حصہ مقرر کر دیتے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان حصوں کو خاص طریقے سے صرف کرنا چاہیئے۔ نیز بعض چوپایوں پر سواری کو بھی حرام جانتے تھے اور اپنے بچوں کو بعض بتوں کے لیے قربان کر دیتے تھے۔

آیۂ مذکورہ بالا اور وہ آیت جو بعد میں آنے والی آیتیں درحقیقت ان تمام خرافی احکام کا جواب ہے کیونکہ اس میں صاف طور پر کہا گیا ہے ،

> ان تمام نعمتوں کا خالق خدا ہے ، وہی ہے جس نے تمام درختوں ، چوپایوں اور کھیتوں کو پیدا کیا ہے اور وہی ہے جس نے حکم دیا ہے کہ ان سے فائدہ اُٹھاؤ اور اسراف نہ کرو۔ بنا بریں اس کے علاوہ کسی اور کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے۔

## ۲۔ "اذا اثمر"

(جس وقت میوہ دے) اس کا ذکر لفظ "ثمرہ" کے بعد آیا ہے۔ یہ کیا مطلب بیان کرتا ہے؟ مفسرین نے اس بارے میں گفتگو کی ہے لیکن ظاہراً اس سے یہ غرض ہے کہ جونہی درختوں پر میوہ اور زراعت میں خوشے آشکار ہو جائیں تو ان سے فائدہ اٹھانا مباح اور جائز ہے اگرچہ ان کا حق ادا نہ کیا گیا ہو اور یہ حق[2] محصول کاٹنے کے دن (یوم الحصاد) ادا کرنا چاہیئے۔

---

[1] اس بارے میں اسی سورہ کی آیت ۹۹ کے ذیل میں جلد ۵ میں ایک توضیح گزر چکی ہے ، ملاحظہ کیجئے۔

[2] اس حق سے کیا مراد ہے اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ (مترجم)

(غور کیجئے گا)۔

۳۔ یہ حق کیا ہے

جسے "یوم الحصاد" پر ادا کرنا چاہیئے اور اس سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہی زکوٰۃ واجب ہے یعنی ۱/۱۰ اور ۱/۲۰، لیکن اس بات پر نظر کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی اور زکوٰۃ کا حکم ہجرت کے دوسرے سال یا بعد ازاں مدینہ میں نازل ہوا، مذکورہ خیال بعید معلوم ہوتا ہے۔

بہت سی روایات، جو اہل بیت طاہرین علیہم السلام سے ہم تک پہنچی ہیں، اسی طرح اہل سنت کی بھی متعدد روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حق زکوٰۃ کے علاوہ ہے اور اس سے مراد وہ غلہ یا میوہ ہے جو محصول لیتے وقت جو مستحقین موجود ہوں انہیں دینا چاہیئے اور اس کی کوئی معین مقدار یا نصاب نہیں ہے۔[1]

بنا برین آیا یہ حکم واجب ہے یا مستحب؟ بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ واجب حکم ہے جو تشریع زکوٰۃ سے قبل مسلمانوں پر واجب تھا لیکن جب زکوٰۃ کی آیت نازل ہوئی تو یہ حکم منسوخ ہوگیا اور زکوٰۃ کا حکم اپنی تمام تفاصیل و کیفیات کے ساتھ اس کی جگہ مقرر ہوگیا۔

لیکن روایات اہل بیتؑ سے استفادہ ہوتا ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہوا ہے اور ایک مستحبی حکم کے طور پر اب بھی اسی طرح باقی ہے۔

۴۔ کلمۂ "یوم"

اس تعبیر سے ممکن ہے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہو کہ میوہ توڑنے اور زراعت کا محصول لینے کا کام بہتر ہے کہ دن کے وقت انجام پانا چاہیے اس طرح صاحبان احتیاج اکٹھا کیوں نہ ہو جائیں۔ یہ نہ ہو کہ بعض بخیل افراد اس خوف سے کہ لوگوں کو پتہ نہ چل جائے رات کے وقت یہ کام کریں۔ جو احادیث اہل بیتؑ کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں ان سے بھی اس بات کی تاکید و تائید ہوتی ہے۔[2]

(۱۴۲) وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۚ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ

(۱۴۳) ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ

---

[1] اس موضوع سے متعلق روایات کو صاحب وسائل نے نقل کیا ہے دیکھو وسائل الشیعہ کتاب زکوٰۃ، ابواب زکوٰۃ باب ۱۳۔ نیز بیہقی نے بھی لکھا ہے۔ دیکھو کتاب سنن جلد ۴ ص ۱۳۲۔

[2] اس موضوع سے متعلق روایات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب وسائل الشیعہ، کتاب زکوٰۃ، ابواب زکوٰۃ الغلات باب کراہۃ الحصاد والجذاذ ..... باللیل (جلد ۶ ص ۱۳۶)۔

نَبِّـُٔوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(۱۴۴) وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

## ترجمہ

(۱۴۲) (یہ خدا وہ ہے کہ جس نے) چوپایوں میں سے تمہارے لیے بوجھ اٹھانے والے حیوانات اور چھوٹے حیوانات پیدا کیے۔ اس نے تمہیں جو روزی عطا کی ہے اُس سے کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

(۱۴۳) آٹھ جوڑے چوپایوں میں سے (تمہارے لیے پیدا کیے) بھیڑ کے دو جوڑے اور بکری کے دو جوڑے، کہو کہ اللہ نے ان کے نر کو حرام کیا یا مادہ کو ؟ یا اسے جو مادہ کے رحم میں ہے، اگر تم سچ کہتے ہو (اور ان کی حرمت پر کوئی دلیل تمہارے پاس ہے) تو مجھے بتاؤ۔

(۱۴۴) اور اُونٹ کے دو جوڑے اور گائے کے بھی دو جوڑے (تمہارے لیے پیدا کیے) کہو کہ اللہ نے ان میں سے کیا حرام کیا ہے؟ نر کو یا مادہ کو؟ یا اُسے جو اُن کے رحم میں ہے اور کیا تم (اس تحریم کے) گواہ تھے جب اللہ نے تمہیں یہ حکم دیا تھا۔ بنا بریں کون شخص اس سے زیادہ ظالم ہے جو خدا پر جھوٹ باندھے، تاکہ لوگوں کو از روئے جہل گمراہ

کرے۔ اللہ کبھی بھی ستم کرنے والوں کی ہدایت نہیں کرے گا۔

## تفسیر

یہ آیت جیسا کہ پہلے بھی اشارتاً ذکر ہوا زراعت اور چوپایوں کے بارے میں ہے مشرکوں کے خرافاتی احکام کی نفی کے لیے ہے۔ اس سے قبل کی آیت میں طرح طرح کی زراعت اور خدا داد میووں کی بابت گفتگو کی گئی تھی، اور اب اس آیت میں حلال گوشت حیوانات اور ان کی خدمات کا تذکرہ ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: اللہ وہ ہستی ہے جس نے چوپایوں میں سے تمہارے لیے بڑے بڑے حیوانات اور بوجھ اٹھانے والے اور چھوٹے حیوانات پیدا کیے (ومن الانعام حمولة وفرشاً)[1]۔

جیسا کہ علماء لغت نے کہا ہے "حمولة" جمع کے لیے ہے۔ اس لفظ کا مفرد اس کی جنس سے نہیں ہے۔ یہ لفظ بوجھ اٹھانے والے بڑے حیوانات جیسے اونٹ، گھوڑا وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

"فرش" کے وہی معنی ہیں جو معروف و مشہور ہیں لیکن اس مقام پر بھیڑ اور اسی طرح کے چھوٹے جانوروں سے اس کی تفسیر کی گئی ہے اور بظاہر اس میں نکتہ یہ ہے کہ اس طرح کے جانور زمین سے زیادہ نزدیک ہیں اور بڑے جانوروں کے مقابلے میں فرش کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ کسی جنگل میں بھیڑ چر رہی ہوں اگر ہم دُور سے دیکھیں تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زمین پر فرش بچھا ہوا ہو، جبکہ اونٹوں کا گلہ دُور سے کبھی ایسا نہیں معلوم ہوتا۔

"حمولة" کے مقابلہ میں "فرش" کا ذکر کرنا اس مطلب کا مؤید ہے۔

نیز ایک اور احتمال بعض مفسرین نے یہ دیا ہے کہ اس کلمہ (فرش) سے مراد بچھانے کی ایسی چیزیں ہیں جو جانوروں کی اُون وغیرہ سے بنائی جاتی ہیں، یعنی بہت سے حیوانات سے باربرداری کا بھی کام لیا جاتا ہے اور ان کے بالوں سے فرشی چیزیں بھی تیار کی جاتی ہیں لیکن پہلا احتمال آیت کے معنی سے زیادہ نزدیک ہے۔

بعد ازاں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے — اب جبکہ یہ سب چیزیں خدا کی مخلوق ہیں اور ان کا حکم اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے تو وہ تم کو یہ فرمان دیتا ہے کہ جو روزی اس نے تم کو دی ہے اس میں سے کھاؤ (کلوا مما رزقکم اللہ)۔

وہ یہ نہیں فرماتا کہ ان حیوانات ہی میں سے کھاؤ، بلکہ فرماتا ہے کہ اس نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں سے کھاؤ۔ یہ فرمانا اس وجہ سے ہے کہ حلال گوشت صرف چوپایوں ہی میں منحصر نہیں ہیں بلکہ دوسرے حیوانات بھی حلال گوشت ہیں جن کا آیہ مذکورہ بالا میں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

اس امر کی مزید تاکید کے لیے اور مشرکوں کے خرافاتی احکام کی ردّ کے لیے ارشاد ہوتا ہے: شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (ایسا دشمن جس نے آدمی کی خلقت اوّل ہی کے وقت سے اعلان جنگ کر دیا ہے) (ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین)۔

---

[1] اس آیت کے شروع میں "واؤ" عطف کے لیے ہے۔ اس کے بعد کا لفظ "جنات" گزشتہ آیت میں جس کا ذکر ہے پر عطف کیا گیا ہے۔

یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کے بلا دلیل احکام و رسوم جو صرف خام خیالی، ہوا و ہوس اور جہل و نادانی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی حیثیت شیطانی وسوسوں کے سوا کچھ نہیں ہے جو تم کو قدم بقدم حق سے دُور کرکے گمراہی کے راستے میں سرگرداں کرتے ہیں۔

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۶۸ میں بھی اس امر کی ایک دلچسپ توضیح کی گئی ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں توضیح کے طور پر بعض حلال گوشت حیوانات، اور بعض وہ حیوانات کہ جو باربردار بھی ہیں اور انسان کے لیے غذا کے طور پر بھی قابل استفادہ ہیں کی شرح کرتے ہوئے فرماتا ہے: خداوند کریم نے چوپایوں کے آٹھ جوڑے تمہارے لیے پیدا کیے۔ بھیڑ اور مینڈھے کا ایک جوڑا (نر اور مادہ) اور بکری کا ایک جوڑا (نر اور مادہ) (ثمانیة ازواج[1] من الضأن اثنین ومن المعزاثنین)۔

ان چار جوڑوں کے تذکرے کے بعد بلا فاصلہ پیغمبر اسلامؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کافروں سے صاف صاف پوچھو کہ: آیا خدا نے ان کے نروں کو حرام کیا ہے یا ماداؤں کو (قل آالذکرین حرم ام الانثیین)۔

یا وہ حیوان جو بھیڑوں یا بکریوں کے پیٹ میں ہیں (اما اشتملت علیه ارحام الانثیین)۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: اگر تم سچ کہتے ہو، اور ان حیوانات کی تحریم پر از روئے علم و دانش کوئی دلیل رکھتے ہو تو مجھے بتلادو (نبئونی بعلم ان کنتم صادقین)۔

اس کے بعد کی آیت میں ایک اور جوڑے کا ذکر فرماتا ہے: اُونٹ کا جوڑا (نر اور مادہ) اور گائے کا بھی جوڑا (نر اور مادہ) ہم نے پیدا کیے ہیں، بتاؤ اس میں سے کسے حرام قرار دیا ہے، نروں کو یا ماداؤں کو، یا ان حیوانوں کو جو اونٹوں اور گایوں کے شکم میں ہیں؟ (ومن الابل اثنین ومن البقر اثنین قل آالذکرین حرم ام الانثیین اما اشتملت علیه ارحام الانثیین)۔

چونکہ ان حیوانات کے حلال یا حرام ہونے کا حکم صرف اس خدا کے ہاتھ میں ہے جو ان کا اور انسانوں کا بلکہ تمام نظام ہستی کا پیدا کرنے والا ہے لہٰذا جو شخص بھی ان کے حلال یا حرام ہونے کا دعوےٰ کرے تو یہ عقلی گواہی کے ذریعے ہو یا شخصاً اس پر وحی نازل ہوئی ہو یا جس وقت یہ فرمان پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا اس وقت وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود ہو۔

اس سے قبل کی آیت میں اس بات کی تصریح کی گئی تھی کہ مشرکین کے پاس ان حیوانات کے حرام ہونے

---

[1] ازواج - زوج کی جمع ہے اور لغت میں جوڑے کے معنی میں ہے لیکن یہ توجہ رکھنا چاہیئے کہ کبھی وہ حیوانوں کے مجموعے نر اور مادہ کیلئے بولا جاتا ہے اور کبھی دو زوجوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے (زوج کا لفظ حیوانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے: فیهما من کل فاکهة زوجان سورہ رحمٰن۔ مترجم) لہٰذا ان کے مجموعے کو زوجین کہتے ہیں، لہٰذا یہ کہ آیہ مذکورہ بالا میں جن آٹھ جوڑوں کی طرف اشارہ ہوا ہے ان سے چار قسم کے نر حیوان اور چار قسم کے مادہ حیوان مراد ہیں۔ اس آیت میں یہ احتمال بھی بیان کیا گیا ہے کہ شاید اس سے مراد گھریلو اور وحشی حیوانوں کے جوڑے ہوں۔ یعنی نر اور مادہ گھریلو بھیڑیں اور جنگلی بھیڑیں اسی طرح سے باقی کے بارے میں قیاس کرنا چاہیئے۔

کی کوئی علمی یا عقلی دلیل نہیں ہے اور چونکہ وہ دعوائے نبوّت و وحی بھی نہیں کرتے تھے بنابریں صرف یہ احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ جب پیغمبرؐ نے یہ فرمان دیا تھا اس وقت حاضر و گواہ ہوں اس لیے ارشاد ہوتا ہے : آیا جب اللہ نے اس بات کا حکم دیا تھا اس وقت کے تم گواہ ہو ( ام کنتم شھدآء اذ وصاکم اللہ بھٰذا )۔

چونکہ اس سوال کا جواب بھی نفی میں ہے اس لیے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے پاس سوائے تہمت اور افتراء کے کوئی سرمایہ نہ تھا۔

اس لیے آیت کے آخر میں اضافہ فرماتا ہے : اس شخص سے بڑھ کر کون ستمگار ہے جو خدا کی طرف جھوٹی بات کی نسبت دے تاکہ لوگوں کو از روئے جہل گمراہ کرے اور یہ بات مسلّم ہے کہ خدا ستمگاروں کو ہدایت نہیں کرے گا ( فمن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبا لیضل الناس بغیر علم ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین )[1]۔

مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھنا بزرگ ترین ظلموں میں سے ایک ہے ، مقام مقدس الٰہی پر ظلم ، بندگانِ خدا پر ظلم ، اپنی ذات پر ظلم ، جیسا کہ ہم نے سابقا بیان کیا ۔ ظالم ترین "کا جملہ نسبی پہلو کا حامل ہے" بنابریں کوئی حرج نہیں اگر بالکل یہی تعبیر بعض گناہان کبیرہ کے لیے بھی استعمال کی گئی ہو۔

نیز اس آیت سے یہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ ہدایت و گمراہ کرنا ایک اجباری چیز نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب مقدمات کو خود انسان اختیار کرتا ہے ، جس وقت کوئی ظلم کرنا شروع کرتا ہے خدا اس سے اپنی حمایت و ہدایت روک دیتا ہے نتیجہ میں وہ غلط راستہ پر بھٹکتا رہتا ہے۔

(۱۴۵) قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

## ترجمہ

(۱۴۵) کہیے : مجھ پر جو وحی آئی ہے اس میں کسی غذا کھانے والے کے لیے کوئی چیز حرام نہیں پاتا سوائے اس کے کہ وہ چیز مُردار ہو یا خُون ہو جو (حیوان یا انسان کے بدن سے) باہر نکلے ، یا سُور

---

[1] بغیر علم ۔ یا اصطلاحاً یوں کہا جائے کہ ۔ جار و مجرور ۔ کس چیز سے متعلق ہے ؟ اس بارے میں متعدد احتمال پیش کیے گئے ہیں لیکن یہ بعید نہیں کہ یضل سے متعلق ہو یعنی وہ لوگ اپنی نادانی اور جہل کی وجہ سے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کیے ہوئے تھے۔

کا گوشت ہو کہ یہ سب چیزیں گندی ہیں، یا وہ حیوان جن پر بطور گناہ سر جُدا کرتے وقت غیر خدا (بتوں) کا نام لیا گیا ہو، لیکن وہ لوگ جن کا مقصود لذّت نہ ہو اور نہ وہ حد سے تجاوز چاہتے ہوں مجبور ہو کر کچھ کھا لیں تو (اُن پر کوئی گناہ نہیں ہے) تیرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔

## تفسیر

### بعض حرام جانوروں کا ذکر

بعد ازیں خداوند کریم، محرماتِ الٰہی کو ان بدعتوں سے الگ کرنے کے لیے جنہیں مشرکوں نے حقیقی قانون میں داخل کر دیا تھا اس آیت میں اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ ان لوگوں سے صاف طور سے کہہ دیجئے، مجھ پر جو وحی ہوئی ہے اس میں کسی شخص (وہ عورت ہو یا مرد، چھوٹا ہو یا بڑا) کے لیے مجھے تو کوئی غذا حرام قرار دی ہوئی نہیں ملتی (قل لاۤ اجد فیمآ اوحی الی محرّما علی طاعم یطعمہٗ)۔

سوائے چند چیزوں کے، پہلی یہ کہ وہ مُردار ہو (الا ان یکون میتۃ) یا وہ خون ہو جو کسی جاندار کے بدن سے نکلے (او دمًا مسفوحًا) اس سے وہ خون خارج ہے جو حیوان کی رگوں کو کاٹنے کے بعد، اور خون کی بڑی تعداد بہہ جانے کے بعد گوشت کے اندر کی باریک رگوں میں رہ جاتا ہے۔

"یا سُور کا گوشت" (او لحم خنزیر)۔

کیونکہ "یہ سب نجاست اور گندگی ہے" اور انسان کی صحیح سالم طبیعت کو ناپسند ہے۔ طرح طرح کی آلائشوں کا سرچشمہ ہے اور مختلف طرح کے نقصانات کا سبب ہے (فانہ رجس)۔

"انّہ" کی ضمیر اگرچہ مفرد ہے لیکن بہت سے مفسرین کے خیال کے مطابق یہ تینوں قسم کی نجاستوں (مُردار کا گوشت، خون، سُور کا گوشت) کی طرف پلٹتی ہے، اور اس جملہ کے معنی اس طرح ہیں "یہ سب جو بیان کیا گیا گندگی ہے"[1] اور آیت کے ظاہر سے جو معنی مناسبت رکھتے ہیں وہ بھی یہی ہیں کہ ضمیر تینوں کی طرف پلٹے کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مُردار اور خون بھی سُور کے گوشت کی طرح پلید ہیں۔

اس کے بعد نجاست کی چوتھی قسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے "یا وہ حیوان جن پر ذبح کے وقت غیر خدا کا نام لیا گیا ہو" (او فسقًا اھلّ لغیر اللہ بہٖ)[2]

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ بجائے لفظ "حیوان" کے لفظ "فسق" استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سابقاً بھی اشارہ ہوا ہے۔

---

[1] درحقیقت کلمہ "اَنَّہٗ" بہ معنی "اشاذکرہ" ہے۔

[2] "اہل" کی اصل "اہلال" سے ہے اور یہ ہلال سے لیا گیا ہے جس کے معنی رویت ہلال کے وقت صدا بلند کرنے کے ہیں اس کے بعد ہر صدائے بلند کو "اہلال" کہا جانے لگا، نیز نومولود کے رونے کی سب سے پہلی آواز کو بھی اہلال کہتے ہیں۔ کفار جانور کو ذبح کرتے وقت چونکہ بآواز بلند بتوں کے نام لیتے تھے اس لیے اسے بھی "اہل" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کہ "فسق" کے معنی ہیں "راہ و رسم بندگی اور طاعت فرمانِ الٰہی سے خارج ہو جانا" لہٰذا ہر قسم کے گناہ کو فسق کہتے ہیں۔ لیکن "رجس" جس کا تذکرہ تین قسم کے حرام گوشت کے سلسلہ میں ہوا، اس کے مقابلہ میں "فسق" کا ذکر ممکن ہے اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ حرام گوشت اصولی حیثیت سے دو قسم کے ہیں، ایک تو اس قسم کے گوشت، جن کی تحریم ان کی پلیدگی، تنفرِ طبع و جسمانی نقصانات کی وجہ سے عمل میں آئی ہے اور ان پر "رجس" کا اطلاق ہوا ہے، دوسرے وہ گوشت جو نہ تو پلید ہیں، نہ حفظانِ صحت کی رُو سے زیاں بخش، لیکن اخلاقی و معنوی حیثیت سے خدا سے بیگانگی اور مکتب توحید سے دُوری کا باعث ہیں اور اسی وجہ سے حرام قرار پاتے ہیں۔

بنا بریں یہ توقع نہیں رکھنا چاہیئے کہ تمام حرام گوشت ہمیشہ زیاں بخش ہی ہوں گے بلکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معنوی یا اخلاقی قدر کی وجہ سے بھی چیز حرام ہوتی ہے۔ یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذبح اسلامی کے شرائط دو طرح کے ہیں، بعض میں مثلاً کہا گیا ہے کہ چاروں رگیں کاٹی جائیں اور حیوان کا خون بہلیا جائے۔ ایسے احکام میں حفظانِ صحت کا پہلو مضمر ہے اور بعض احکام مثلاً قبلہ رُو کرنا، بسم اللہ کہنا اور ذبح کرنے والے کا مسلمان ہونا یہ سب معنوی حیثیت کے حامل ہیں۔

آخر آیت میں بھی ان لوگوں کے لیے حرمت سے استثناء ہوا ہے جو ناچار و مجبور ہو جائیں اور کوئی ایسی غذا ان کو نہ مل سکے جس سے اُن کی جان بچے تو ایسی صورت میں وہ ان گوشتوں کو (بقدرِ ضرورت) اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو بالکل مجبور ہو جائیں ان پر کوئی گناہ نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ صرف حفظِ جان کے لیے ہو، لذت کے لیے نہ ہو، اسے حلال سمجھتے ہوئے نہ ہو اور نہ ضرورت سے زائد کھائیں۔ ان حالات میں خدائے غفور و رحیم ایسے افراد کو معاف کر دے گا (فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فان ربك غفور رحیم)[1]

درحقیقت یہ دو شرطیں (حالتِ اضطرار کا ہونا اور حد سے تجاوز نہ کرنا) اس لیے ہیں کہ بعض افراد اضطرار کو قوانینِ الٰہی کے توڑنے کی سند نہ سمجھ بیٹھیں اور ضرورت کو بہانہ بنا کر حکمِ خدا کے دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ لیکن اہل بیت طاہرین علیہم السلام سے بہ قول بعض روایات میں کچھ اور مفاہیم بھی ہیں جیسے تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

الباغی الظالم والعادی الغاصب۔

باغی سے مراد ظالم اور عادی سے مراد غاصب ہے۔

نیز ایک دوسری روایت میں امام علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

الباغی الخارج علی الامام والعادی اللص۔

باغی سے وہ شخص مراد ہے جو امام عادل اور حکومتِ اسلامی کے خلاف خروج کرے اور عادی سے مراد چور ہے۔

اس طرح کی روایات سے اس امر کی طرف اشارہ منظور ہے کہ گوشت حرام کھانے کی مجبوری بالعموم سفر میں درپیش ہوتی ہے لہٰذا اگر کوئی شخص ظلم و ستم یا غصب و چوری کے مقصد سے سفر کرے اور حلال غذا کمیاب ہو جائے

---

[1] "باغ" یا "باغی" کا مادہ "بغی" ہے۔ اس کا معنی طلب ہے اور "عاد" یا "عادی" کا مادہ "عدو" ہے اس کا معنی "تجاوز" ہے۔

تو ایسی صورتوں میں حرام گوشتوں کا کھانا اس کے لیے جائز نہیں ہوگا، اگرچہ اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ان گوشتوں کو کام میں لائے لیکن اس گناہ کی سزا بھی اسے بھگتنا پڑے گی کیونکہ اس حرام سفر کے مقدمات کو اُس نے خود فراہم کیا ہے بہرحال یہ روایات مذکورہ آیت کے عمومی مفہوم سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

## ایک سوال کا جواب

یہاں پر ایک سوال یہ درپیش ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ غذاؤں کے بارے میں تمام محرمات الٰہی چار اقسام میں منحصر ہوگئے ہیں جبکہ ہمیں علم ہے کہ حرام غذائیں انہی چار چیزوں میں منحصر نہیں ہیں۔ درندوں کا گوشت، دریائی حیوانات (چھلکے دار مچھلی کے علاوہ)، کا گوشت اور اسی طرح کے دوسرے حرام جانوروں کا گوشت، یہ سب حرام ہیں لیکن آیۂ مذکورہ میں ان میں سے کسی کا نام نہیں لیا گیا اور محرمات کو صرف چار چیزوں میں منحصر کر دیا گیا ہے؟

بعض حضرات نے اس سوال کے جواب میں یہ کہا ہے کہ یہ آیت مکہ میں اتری اور اس وقت تک دوسری چیزیں حرام نہیں ہوئی تھیں۔

یہ جواب صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ بعینہٖ یہی عبارت یا اس جیسی عبارتیں بعض مدنی سورتوں میں بھی ملتی ہیں جیسے بقرہ کی آیت ۱۷۳۔ بظاہر اس کا جواب اس طرح سے دیا جا سکتا ہے کہ اس آیت کی نظر صرف مشرکوں کے خرافاتی احکام پر ہے اور اصطلاحاً یوں کہنا چاہیئے کہ یہاں پر "حصر اضافی" ہے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "محرمات الٰہی یہ چیزیں ہیں نہ کہ وہ جنہیں تم نے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے۔"

اس بات کی مزید توضیح کے لیے بے جا نہ ہوگا اگر ہم ایک مثال پیش کریں۔ وہ یہ کہ اگر کوئی ہم سے یہ سوال کرے کہ آیا حسن اور حسین دونوں آئے تھے؟ ہم جواب میں یہ کہیں گے: نہیں، صرف حسن آئے تھے، یہاں پر ہماری غرض صرف یہ ہے کہ دوسرے شخص (حسین) کے آنے کی نفی ہو جائے، اس سے کوئی بحث نہیں کہ دوسرے افراد جو سوال کے دائرے سے خارج تھے وہ آئے کہ نہیں۔ وہ چاہے آئے بھی ہوں تب بھی ہمارا مذکورہ جواب صحیح ہوگا۔ اس طرح کے حصر کو حصر اضافی (یا نسبی) کہتے ہیں۔

لیکن یہ ملحوظ رہے کہ ہر حصر عام طور سے حقیقی ہی ہوتا ہے، الا یہ کہ اس کے خلاف کوئی قرینہ موجود ہو جیسے زیر بحث آیت۔

(۱۴۶) وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ ۖ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۚ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ

۱۴۷ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ○

## ترجمہ

۱۴۶۔ اور ہم نے یہودیوں پر ہر ناخن دار (حیوان جس کے کُھر بغیر شگاف کے ہوتے ہیں) کو حرام کیا، اور گائے بھیڑ میں سے ان کی چکنی اور چربی کو حرام کیا، سوائے اس چربی کے جو ان کی پیٹھ پر، یا آنتوں کے تہوں میں اور دونوں پہلوؤں میں ہو یا وہ چربی جو ہڈیوں میں ملی ہوئی ہو، یہ حکم بطور سزا کے اس ظلم وستم کی وجہ سے تھا جو وہ کیا کرتے تھے اور ہم سچ کہتے ہیں۔

۱۴۷۔ اگر یہ تیری تکذیب کریں (اور ان حقائق کو نہ مانیں) تو ان سے کہہ دو کہ تمہارا پروردگار بڑی رحمت والا ہے لیکن اس کے باوجود مجرموں سے اس کی سزا دُور ہونے والی نہیں (پلٹنے کا راستہ تمہارے لیے کُھلا ہوا ہے اور وہ تمہیں فوراً سزا نہیں دیتا لیکن اگر اسی طرح سے اس کے احکام کی خلاف ورزیاں کرتے رہے تو تمہاری سزا حتمی ہے)۔

## تفسیر

### وہ چیزیں جو یہودیوں پر حرام ہوئیں

قبل کی آیات میں حرام حیوانات کی چار قسمیں ہی بیان کی گئی تھیں لیکن ان آیتوں میں یہودیوں پر جو چیزیں حرام تھیں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ بُت پرستوں کے مہمل و خرافاتی احکام نہ تو آئین اسلام سے ہم آہنگ ہیں، نہ آئین یہود سے (اور نہ ہی آئین مسیح سے جس میں عموماً آئین یہود کی پیروی کی گئی ہے) اس پر مستزاد یہ کہ ان آیات میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اس قسم کے محرمات بھی یہودیوں کے لیے سزا و عذاب کا پہلو لیے ہوئے تھے۔ اگر انہوں نے احکام الٰہی کی خلاف ورزیاں نہ کی ہوتیں تو یہ چیزیں بھی ان پر حرام نہ کی جاتیں۔ بنا بریں اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ بُت پرستوں سے سوال کیا جائے کہ اس طرح کے احکام

تم کہاں سے لے آئے ؟

لہٰذا پہلے ارشاد ہوتا ہے : یہودیوں پر ہم نے ناخن دار ہر جانور کو حرام کیا ۔ ( وعلی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر ) ۔

"ظفر" ( بروزن شتر ) دراصل ناخن کے معنی میں ہے لیکن اس لفظ کا استعمال سُمدار حیوانات ( یعنی وہ حیوانات جن کا سُم گھوڑے کی طرح پھٹا ہوا نہیں ہے ، نہ کہ بھیڑ گائے وغیرہ کی طرح جن کا کُھر بیچ سے پھٹا ہوا ہوتا ہے ) کے سُم پر بھی ہوا ہے کیونکہ ان کے سُم ناخن کی طرح کے ہوتے ہیں ، اسی طرح اونٹ کا پاؤں جس کی نوک یکپارچہ ہوتی ہے اور اس میں شگاف نہیں ہوتا اس کے لیے بھی یہ لفظ "ظفر" بولا جاتا ہے ۔

اس بنا پر آیہ فوق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام حیوانات جن کے سُم بیچ سے شگافتہ نہیں ہیں یا وہ ناخن والے ہیں چاہے وہ چوپائے ہوں یا پرندے ، یہودیوں پر حرام کر دیئے گئے تھے ۔

موجودہ توریت کے "سفر لاویان" فصل ۱۱ سے بھی اجمالاً یہی مفہوم حاصل ہوتا ہے جیسا کہ اس میں تحریر ہے ۔

"بہائم میں سے شگافتہ کُھر رکھنے والا جس میں پورا شگاف ہو اور جگالی کرتا ہو کھاؤ ، لیکن وہ جگالی کرنے والا جس کا کُھر پھٹا ہوا نہیں ہے ، مت کھاؤ ، اونٹ باوجودیکہ وہ جگالی کرتا ہے چونکہ اس کا پورا کُھر چاک نہیں اس لیے وہ تمہارے لیے ناپاک ہے " ۔

آیہ مذکورہ میں بعد کے جملے سے ( جس میں صرف گائے بھیڑ کا ذکر کیا گیا ہے ) بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ اونٹ یہودیوں پر بالکل حرام تھا ، ( ذرا غور کیجئے ) ۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے : گائے بھیڑ کے جسم پر موجود چربی کو ہم نے ان پر حرام کر دیا تھا ۔ ( و من البقر والغنم حرمنا علیھم شحومھما ) ۔

اسی کے ذیل میں تین چیزوں کا استثناء فرماتا ہے : پہلے وہ چربی جو اُن کی پشت پر ہوتی ہے ( الا ما حملت ظھورھما ) ۔

دوسرے وہ چربی جو پہلوؤں میں اور آنتوں کی تہوں میں پائی جاتی ہے ( او الحوایا )[1]

تیسرے وہ چربی جو ہڈیوں میں لتھڑی ہوتی ہے ( او ما اختلط بعظم ) ۔

لیکن آیت کے آخر میں اس بات کی تصریح ہے کہ یہ چیزیں یہودیوں پر درحقیقت حرام نہ تھیں لیکن چونکہ وہ ظلم و ستم کرتے تھے اس لیے بحکم خدا وہ اس طرح کے گوشت اور چربی سے محروم کر دیئے گئے جسے وہ پسند کرتے تھے ( ذالک جزینٰھم ببغیھم ) ۔

---

[1] "حوایا" جمع ہے "حاویہ" ( بروزن زاویہ ) کی ۔ یہ ایسی چیز کو کہتے ہیں جس میں شکم کی تمام چیزیں شامل ہیں یہ گرہ کی شکل کی ہوتی ہے اور آنتیں بھی اسی کے اندر ہوتی ہیں ۔

تاکید کے لیے اضافہ فرماتا ہے : یہ ایک حقیقت ہے اور ہم سچ کہتے ہیں ( وانا لصادقون )۔

# چند اہم نکات

۱۔ بنی اسرائیل نے وہ کیا ظلم وستم کیے تھے جس کی سزا میں اللہ نے اپنی بعض ایسی نعمتیں جو انہیں پسند تھیں ان پر حرام کر دی تھیں۔ مفسرین کے درمیان اس بارے میں ایک بحث ہے لیکن سورہ نساء کی آیت ۱۶۰ اور ۱۶۱ سے جو ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ اس تحریم کا باعث چند امور تھے۔

کمزور طبقہ پر ظلم وستم اور انہیں انبیائے الٰہی کی ہدایت سے روکنا ، سود خوری اور لوگوں کے اموال کو ناحق کھانا۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے :

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۙ وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ (النساء۔ ۱۶۰)

۲۔ جملہ " وانا لصادقون " جو آیت کے آخر میں آیا ہے ، ممکن ہے کہ اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ ان غذاؤں کی تحریم کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے وہی حقیقت ہے نہ وہ کہ جو یہودی کہتے ہیں اور اپنے ان گناہوں کو حضرت یعقوبؑ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس بات کا تذکرہ سورۂ آل عمران کی آیت ۹۳ میں گزر چکا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے انہیں ان چیزوں کے حرام ہونے کا حکم ہرگز نہیں دیا تھا بلکہ یہ ایک تہمت ہے جو یہودی ان پر لگاتے ہیں۔[1]

چونکہ یہودیوں اور مشرکوں کی ہٹ دھرمی نمایاں تھی اور اس بات کا امکان تھا کہ وہ اپنی بات پر اڑے رہیں گے اور پیغمبرؐ کی تکذیب کریں گے لہٰذا بعد کی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو حکم دیتا ہے : اگر یہ تم کو جھٹلائیں تو ان سے کہہ دو کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت رکھتا ہے اور تم کو جلدی سزا نہیں دیتا بلکہ مہلت دیتا ہے کہ شاید تم اپنی غلطیوں سے پلٹ جاؤ اور اپنے کیے پر پشیمان ہو جاؤ اور خدا کی طرف پلٹ آؤ ( فان کذبوك فقل ربکم ذو رحمة واسعة )۔

لیکن اگر خدا کی دی گئی مہلت سے پھر بھی ناجائز فائدہ اٹھاؤ اور اپنی ناروا تہمتوں پر باقی رہو تو جان لو کہ خدا تمہیں کیفر کردار تک ضرور پہنچائے گا کیونکہ اس کی سزائیں اور مجازات مجرموں کے گروہ سے دور ہونے والی نہیں ( ولا یرد بأسه عن القوم المجرمین )۔

یہ آیت بخوبی تعلیماتِ قرآنی کی عظمت کو واضح کرتی ہے کہ یہودیوں اور مشرکوں کی اتنی نافرمانیوں کی وضاحت کرنے کے بعد بھی خدا تعالیٰ انہیں فوراً اپنے عذاب کی تہدید نہیں کرتا بلکہ پہلے اپنی پُر محبت

[1] مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ ، سورہ آل عمران آیت ۹۳ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

تعبیروں سے، جیسے ربکم (تمہارا پروردگار)، ذو رحمة واسعة (وسیع رحمت والا) ان کے لیے لوٹ آنے کے راستے کھولتا ہے تاکہ اگر ذرا بھی ان میں پشیمان ہونے کی گنجائش ہے تو ان کی تشویق ہو جائے اور وہ حق کی طرف پلٹ آئیں۔ ساتھ ہی انہیں اپنے قطعی عذاب سے ڈراتا بھی ہے تاکہ اللہ کی ناپیدا کنار رحمت ان کی جسارت و سرکشی کا باعث نہ بن جائے۔

(۱۴۸) سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ۝

(۱۴۹) قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ۝

(۱۵۰) قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاءَكُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ حَرَّمَ هَٰذَا ۖ فَإِنْ شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ۝

## ترجمہ

(۱۴۸) عنقریب مشرک لوگ (اپنی برأت کے لیے) یہ کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم مشرک ہوتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام کرتے۔ ان سے قبل جو لوگ تھے وہ بھی اسی طرح کے جھوٹ بولتے تھے اور بالآخر انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا۔ ان سے کہیے اس بارے میں تم کوئی یقینی دلیل رکھتے ہو؟ اگر ہو تو ہمیں بھی دکھلاؤ۔ تم فقط بے بنیاد خیالات کی پیروی کرتے ہو اور بے جا اندازے قائم کرتے ہو۔

(۱۴۹) کہیے، کہ خدا کے لیے (دعوے کو) ثابت کرنے والی (یقینی) دلیل ہے (ایسی کہ جس کے بعد کسی کو بہانہ تراشی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی) اگر وہ چاہے تم سب کو (اجباری طور پر) ہدایت کردے (لیکن جبراً ہدایت کا کوئی نتیجہ نہیں اس لیے وہ یہ کام نہیں کرتا)۔

(۱۵۰) کہہ دو کہ تم اپنے گواہوں کو جو اس بات کی گواہی دے سکیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے، لے آؤ، اگر وہ (جھوٹی) گواہی دے بھی دیں تو تم ان کے ساتھ (ہم آواز نہ ہونا)۔ گواہی نہ دینا، اور ان لوگوں کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرنا جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اور خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

## تفسیر

### "جبر" کا بہانہ کر کے ذمہ داری سے فرار

گزشتہ آیات میں مشرکوں کی جو باتیں ذکر ہوئیں ان کے ذیل میں ان کے کمزور استدلالوں اور ان کے جوابات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ابتدا میں فرماتا ہے: شرک اور رزقِ حلال کی حرمت کے بارے میں تم نے جو مشرکوں پر اعتراضات کیے ان کے جواب میں عنقریب وہ تم سے کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم بت پرست ہوتے نہ ہمارے آباؤ اجداد اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے۔ پس جو کچھ ہم کہتے ہیں یا کرتے ہیں وہ سب خدا کی مرضی سے ہے اور وہ یہی چاہتا ہے (سیقول الذین اشرکوا لو شآء اللہ مآ اشرکنا ولآ اباؤنا ولا حرمنا من شیء)۔

اسی طرح کی تعبیر قرآن کی ایک اور آیت میں بھی نظر آتی ہے جیسا کہ سورہ نحل آیت ۳۵ میں ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ

اور سورہ زخرف آیت ۲۰ میں ہے:

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک افراد بہت سے دیگر گناہگاروں کی طرح مسئلہ جبر کے سہارے اپنی ذمہ داریوں سے فرار چاہتے ہیں اور اپنی نافرمانیوں کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

یہ بھی در اصل جبر کے معتقد تھے، اور کہتے تھے : ہم جو بھی کام کرتے ہیں وہ اللہ کی مرضی سے اور اسی کے ارادہ کے مطابق ہے۔ وہ اگر نہ چاہتا تو یہ اعمال ہم سے سرزد نہ ہوتے۔ وہ دراصل یہ کہہ کر چاہتے تھے کہ اپنے آپ کو ان تمام گناہوں سے بری کر دیں، ورنہ ہر انسان کا ضمیر خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ انسان اپنے اعمال میں آزاد ہے مجبور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے حق میں ظلم کرے تو وہ ناراحت ہوتا ہے اور اس سے مواخذہ کرتا ہے اور صاحب اقتدار ہونے کی صورت میں اس سے انتقام بھی لے لیتا ہے۔ یہ تمام چیزیں اس بات کی مظہر ہیں کہ وہ مجرم کو اس کے عمل میں آزاد اور بااختیار سمجھتا ہے نہ کہ مجبور۔ اس بناء پر کہ اس کا عمل خدا کے چاہنے کے مطابق ہے اور اللہ نے یہ کام اس سے کروایا ہے اس جرم کی سزا دینے سے چشم پوشی نہیں کرتا (اس بات پر خوب غور کرنا چاہیئے)۔

لیکن یہ احتمال بھی اس آیت کے معنی میں ہے کہ وہ (مشرک) اس بات کے مدعی تھے کہ بت پرستی اور تحریم حیوانات کے مقابلہ میں خدا کا سکوت اس کی رضامندی کی دلیل ہے کیونکہ اگر وہ راضی نہ ہوتا تو وہ کسی بھی طریقہ سے ہمیں اس کار زشت سے روک سکتا تھا۔

" ولا آباؤنا " کہہ کر انہوں نے یہ چاہا ہے کہ اپنے ان غلط عقائد کو قدامت و دوام کا رنگ دیں اور کہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ایسا تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

لیکن قرآن کریم نے ان کے جواب میں قاطعانہ بحث کی ہے۔ پہلے وہ کہتا ہے کہ اکیلے یہ نہیں ہیں جو اس طرح کی جھوٹی باتیں خدا پر باندھتے ہیں بلکہ گزشتہ قوموں میں سے اور لوگ بھی ایسی ہی جھوٹی باتوں کے قائل تھے۔ لیکن ان کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ بھی آخرکار اپنی بدکرداریوں کے نتائج میں گرفتار ہوئے اور انہوں نے ہماری سزا کا مزہ چکھا۔

کذالک کذب الذین من قبلھم حتیٰ ذاقوا بأسنا[1]

وہ درحقیقت اپنے ان اقوال سے جھوٹ بھی بولتے تھے اور انبیاء کی تکذیب بھی کرتے تھے کیونکہ پیغمبرانِ الٰہی نے صریحی طور پر ہر دور کے بشر کو بت پرستی، شرک اور حلالِ خدا کو حرام قرار دینے سے روکا ہے لیکن ان کے بزرگوں نے اس پر کان دھرا نہ انہوں نے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو کس طرح ممکن ہے کہ خدا ان کے کرتوتوں پر راضی ہو۔ اگر خدا ان پر راضی ہوتا تو کس لیے اپنے پیغمبروں کو توحید کی دعوت کے لیے بھیجتا دراصل دعوتِ انبیاء خود اس بات کی ایک اہم ترین دلیل ہے کہ انسان اپنے ارادہ میں آزاد و خود مختار ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے " ان سے کہو : آیا واقعی کوئی قطعی اور مسلّم دلیل تمہارے پاس اس دعوے کی ہے؟ اگر ہے تو اسے پیش کیوں نہیں کرتے ( قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا )۔

آخر میں مزید فرماتا ہے : تم یقینی طور پر کوئی دلیل اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے نہیں رکھتے

---

[1] کذب - لغتِ عرب میں دو معنی کو جھٹلانے اور جھوٹ بولنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔

صرف اپنے خام خیالات کی پیروی کرتے ہو ( ان تتبعون الا الظن و ان انتم الا تخرصون )۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد کی آیت میں مشرکوں کے دعوے کو باطل کرنے کے لیے ایک اور دلیل کا ذکر فرماتا ہے؛ کہو : خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے بھی اور عقل بشری کے ذریعے بھی توحید اور اپنی یکتائی پر اسی طرح حلال و حرام کے احکام کے بارے میں صحیح اور روشن دلیلیں بیان کی ہیں اور یہ دلیلیں اس طرح کی ہیں کہ ان کے بعد کسی کو عذر کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ( قل فللّٰه الحجة البالغة )۔

بنا بریں وہ لوگ یہ دعوے ہرگز نہیں کر سکتے کہ خدا نے اپنے سکوت سے ان کے ناروا عقائد و اعمال پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے نہ ہی وہ یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال میں مجبور ہیں کیونکہ اگر مجبور ہوتے تو دلیل قائم کرنا، پیغمبروں کا بھیجنا اور ان کی دعوتیں اور تبلیغیں یہ سب بیکار ہو جاتی ہیں۔ دلیل کا قائم کرنا خود آزادیٔ ارادہ کی دلیل ہے۔

ضمناً اس امر کی جانب بھی توجہ مبذول کرنا چاہیئے کہ "حجت" دراصل "حج" سے ماخوذ ہے جس کے معنی قصد کے ہیں۔ وہ جادہ و راستہ جس پر انسان کو چلنا مقصود ہو اسے "محجة" کہتے ہیں۔ اسی بنا پر دلیل و برہان کو بھی "حجت" کہا جاتا ہے کیونکہ اس دلیل کے پیش کرنے والے کا یہ قصد ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے اپنے مطلب کو دوسروں پر ثابت کرے۔

اگر لفظ "بالغہ" (آخر تک پہنچنے والی) پر توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ خدا تعالےٰ نے تمام انسانوں کے لیے عقل و نقل کے ذریعے، علم و ذہن کے ذریعے اور اسی طرح رسولوں کے ذریعے ہر حیثیت سے روشن اور ہر ذہن میں اتر جانے والے دلائل پیش کیے ہیں تاکہ لوگوں کے لیے کسی تردید کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ اسی بنا پر خدا نے اپنے پیغمبروں کو ہر طرح کے گناہ و اشتباہ سے معصوم قرار دیا ہے تاکہ ان کے لائے ہوئے پیغاموں سے ہر طرح کے شک و شبہ کو دور کر دے۔

آخر آیت میں فرماتا ہے : اگر خدا چاہے تو تم سب کو زبردستی ہدایت کر سکتا ہے ( فلو شآء لهدٰكم اجمعين )۔

دراصل یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کے لیے یہ بات بالکل ممکن ہے کہ تمام انسانوں کی بالجبر ایسی ہدایت کر دے کہ کسی بندے میں اس کی مخالفت کرنے کی طاقت نہ ہو لیکن ظاہر ہے اس صورت میں ایسے ایمان کی کوئی قیمت باقی نہ رہ جاتی نہ ان اعمال کی جو جبریہ ایمان کے زیر سایہ پروان چڑھیں بلکہ فضیلت اور انسانی ترقی کا راز یہ ہے کہ انسان ہدایت اور پرہیزگاری کے جادہ پر اپنے قدموں سے چلے اور یہ سفر اپنے ارادہ و اختیار سے طے کرے۔

اس بنا پر اس جملے میں اور قبل کی آیت میں جس میں جبر کی نفی ہوئی ہے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ جملہ

کہتا ہے : بندوں کو ان کے اعمال میں مجبور کرنا جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو خدا کے امکان میں ہے لیکن خدا ہرگز ایسا نہیں کرے گا کیونکہ ایسا کرنا خدا کی حکمت اور انسانوں کے مفاد کے خلاف ہے۔

بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے قدرت و مشیت الٰہی کو ۔ مذہب جبر۔ اختیار کرنے کا ایک بہانہ بنا لیا تھا حالانکہ اللہ کی مشیت و قدرت دونوں برحق ہیں لیکن ان کا لازمہ جبر نہیں ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم آزاد رہیں اور حق کا راستہ اپنے اختیار سے طے کریں۔

کتاب کافی میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :

ان للّٰہ علی الناس حجتین حجة ظاھرة و حجة باطنة فاما الظاھرة فالرسل والانبیآء والائمة واما الباطنة فالعقول۔

خداوندکریم نے لوگوں کے لیے اپنی دو حجتیں قرار دی ہیں ، ایک حجت ظاہری دوسری باطنی ظاہری حجت انبیاء ورسل و آئمہ ہیں اور باطنی حجت انسان کی عقل ہے [1]

امالی شیخ طوسی علیہ الرحمۃ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے آپؑ سے کسی نے آیہ مذکورہ (فللّٰہ الحجة البالغة) کے بارے میں دریافت کیا کہ اس سے کیا مراد ہے تو حضرتؑ نے ارشاد فرمایا :

ان اللّٰہ تعالیٰ یقول للعبد یوم القیامة عبدی أکنت عالما فان قال نعم، قال له أفلا عملت بما علمت ؟ وان قال کنت جاهلا قال له أفلا تعلمت حتی تعمل؟ فیخصمه فتلک الحجة البالغة۔

خدائے تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندے سے کہے گا کہ اے میرے بندے ! آیا تجھے علم تھا اور تُو نے گناہ کیا ؟) اگر اس نے کہا ہاں ، تو فرمائے گا کہ تُو نے اپنے علم پر عمل کیوں نہ کیا ؟ اور اگر وہ کہے گا کہ مجھے علم نہ تھا تو ارشاد ہوگا کہ تُو نے علم کیوں نہ حاصل کیا تاکہ اس پر عمل کرتا۔ یہ سن کر بندہ لاجواب ہو جائے گا اور یہ معنی ہیں حجۃ بالغہ کے۔

یہ بات بدیہی ہے کہ مذکورہ بالا روایت کا یہ مقصد نہیں کہ حجت بالغہ سے صرف یہی گفتگو مراد ہے جو قیامت میں خدا اپنے بندوں سے کرے گا، خدائے متعال کی بہت سی حجتہائے بالغہ ہیں جن میں سے ایک کا مصداق وہی ہے جس کا ذکر حدیث فوق میں آیا ہے کیونکہ اللہ کی حجت بالغہ کا دامن بہت وسیع ہے ، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اس کے بعد کی آیت میں ان مشرکوں کی باتوں کے بطلان کو واضح تر کرنے اور فیصلہ کرنے کے لیے صحیح اصول کا لحاظ رکھنے کے لیے انہیں دعوت دیتا ہے کہ اگر ان کے پاس اس بات کے معتبر گواہ ہیں کہ خدا نے ان

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل ص ۷۷۶ ۔

حیوانات اور زراعتوں کو جن کی تحریم کے وہ مدعی ہیں واقعاً حرام کیا ہے تو ان کو پیش کریں، لہٰذا فرماتا ہے:
اسے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ اپنے گواہوں کو جو ان چیزوں کی تحریم کی گواہی دیں لے آؤ (قل ھلم شہدآءکم الذین یشھدون ان اللہ حرم ھذا)۔

پھر اس پر اضافہ ہوتا ہے: اگر انہیں ایسے گواہ نہ مل سکیں اور وہ انہیں نہ پا سکیں (جیسا کہ ہرگز نہ پا سکیں گے) اور صرف اپنی ہی گواہی اور دعوے پر اکتفا کریں تو ہرگز ان کے ہم صدا نہ ہونا اور ان کی گواہی اور دعوے کے مطابق گواہی نہ دینا (فان شھدوا فلا تشھد معھم)۔

جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ پوری آیت میں کسی قسم کا اختلاف یا تضاد موجود نہیں ہے اور یہ بات کہ ابتداء میں ان سے گواہ طلب کیے، اس کے بعد فرمایا کہ "ان کے گواہوں کی گواہی کو قبول نہ کرنا" اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مقصد یہ ہے کہ وہ[1] لوگ قطعی اور معتبر گواہوں کو لانے سے قاصر ہیں کیونکہ انبیائے الٰہی سے اور کتب آسمانی سے یہ امور ثابت کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی سند یا ثبوت موجود نہیں ہے، بنا بریں یہ خود ہی جو مدعی ہیں گواہی دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی گواہی قابل قبول نہیں۔

ان تمام امور کے علاوہ دیگر قرائن اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ یہ تمام خود ساختہ احکام ان لوگوں نے محض اپنی ہوا و ہوس کے ماتحت اور کورانہ تقلید کی بنا پر گھڑ لیے تھے لہٰذا ان کا کوئی اعتبار نہ تھا۔

اس بنا پر اس کے بعد کے جملے میں ارشاد فرمایا: جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے اور جن کا آخرت پر ایمان نہیں ہے اور جنہوں نے خدا کا شریک قرار دیا ہے ان کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرنا (ولا تتبع اھوآء الذین کذبوا باٰیٰتنا والذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ وھم بربھم یعدلون[1])۔

یعنی ان لوگوں کی بت پرستی، قیامت کا انکار، خرافاتی رسوم و رواج اور ان کی ہوس پرستیاں اس بات کی زندہ گواہ ہیں کہ ان کے یہ احکام بھی خود ساختہ ہیں اور ان چیزوں کی تحریم جس کی نسبت یہ خدا کی طرف دیتے ہیں بالکل بے بنیاد اور بے اہمیت ہے۔

(۱۵۱) قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ

---

[1] "یعدلون" مادّہ "عدل" (بروزن کذب) سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ہم رتبہ، شریک اور شبیہ، بنا بریں یہ جملہ "وھم بربھم یعدلون" اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کے لیے شریک و شبیہ قرار دیتے ہیں۔

وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

(۱۵۲) وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۗ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○

(۱۵۳) وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○

## ترجمہ

(۱۵۱) کہو کہ آؤ جس چیز کو تمہارے پروردگار نے تمہارے اوپر حرام قرار دیا ہے میں تمہیں پڑھ کر سناؤں اور وہ یہ کہ کسی چیز کو خدا کا شریک نہ ٹھہرانا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، اور اپنی اولاد کو تنگدستی (کے خوف) سے ہلاک نہ کرنا، ہم تمہیں اور انہیں دونوں کو روزی دیتے ہیں اور بُرے کاموں کے پاس بھی نہ جانا، چاہے وہ نمایاں ہوں یا چھپے ہوئے، جس جان کو اللہ نے محترم قرار دیا ہے اسے نہ مارنا، الا یہ کہ حق (استحقاق کی بنا پر) ہو، یہ وہ (حکم) ہے جس کی اللہ نے تمہیں تاکید کی ہے، تاکہ تم اسے سمجھو۔

(۱۵۲) اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جانا اِلّا یہ کہ بطریقِ احسن (اصلاح کے لیے) ہو، یہاں تک کہ وہ سن تمیز کو پہنچ جائے اور انصاف کے ساتھ ناپ تول کو پورا کرنا، ہم کسی (بندے) پر اس کی استطاعت سے زیادہ ذمہ داری عائد نہیں کرتے، اور جس وقت کوئی بات کرنا تو

عدالت کا خیال رکھنا چاہیے وہ عزیز و اقربا کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو، اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو، یہ وہ چیز ہے جس کی خدا تمہیں تاکید کرتا ہے تاکہ تم اسے یاد رکھو۔

(۱۵۳) اور یہ کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس کی پیروی کرو اور دوسرے مختلف (ٹیڑھے) راستوں کی پیروی مت کرو کیونکہ وہ تمہیں راہِ حق سے ہٹا دیں گے یہ وہ بات ہے جس کی خدا نہیں تاکید کرتا ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

# تفسیر

## خدا کے دس فرمان

مشرکوں کے خود ساختہ احکام جو گزشتہ آیات میں بیان ہوئے ان کی نفی کرنے کے بعد ان تین آیتوں میں اسلام کے اصول محرمات اور صفِ اوّل کے گناہانِ کبیرہ کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ان امور کو مختصر، پُرمغز اور جاذب عبارت کے ساتھ دس حصّوں میں بیان فرمایا گیا ہے، اور ان (مشرکوں) کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ آئیں اور واقعی محرماتِ الٰہی کو سُنیں اور جھوٹے محرمات کو چھوڑ دیں۔

پہلے فرماتا ہے: ان سے کہو کہ آؤ تاکہ وہ چیزیں جو اللہ نے تمہارے اوپر حرام کی ہیں میں تمہارے سامنے پڑھ کے سناؤں اور ان کی تعداد بیان کروں (قل تعالوا أتل ما حرم ربکم علیکم)۔

اور وہ یہ کہ:

۱۔ کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہ دینا (الا تشرکوا به شیئا)۔

۲۔ باپ ماں کے ساتھ نیکی کرنا (و بالوالدین احسانا)۔

۳۔ اپنی اولاد کو تنگدستی کی وجہ سے ہلاک نہ کرو (ولا تقتلوآ اولادکم من املاق)۔
کیونکہ تمہاری اور ان کی روزی ہمارے ہاتھ میں ہے اور تمام افراد کو ہم ہی روزی دیتے ہیں (نحن نرزقکم و ایاهم)۔

۴۔ بد اعمالیوں اور سیاہ کاریوں کے پاس نہ جانا چاہے وہ اعلانیہ ہوں یا پوشیدہ یعنی نہ صرف یہ کہ ایسے کاموں کو نہ کرنا بلکہ ان کے پاس بھی نہ پھٹکنا (ولا تقربوا الفواحش ما ظهر منها وما بطن)۔

۵۔ بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہ کرنا، اور وہ اشخاص جن کی جانوں کو اللہ نے محترم قرار دیا ہے اور ان کے قتل سے منع کیا ہے، انہیں نہ مارنا، إلاّ یہ کہ قانونِ الٰہی کے مطابق ان کے قتل کی

اجازت دی گئی ہو (مثلاً کوئی شخص قاتل ہو) (ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق)۔

ان پانچ قسم کی حرمتوں کو بیان کرنے کے بعد مزید تاکید کے لیے ارشاد ہوتا ہے: یہ وہ امور ہیں جن کی اللہ نے تاکید کی ہے، تاکہ تم اسے خوب اچھی طرح سے سمجھ لو اور ان کے ارتکاب سے اجتناب کرو (ذالکم وصاکم بہ لعلکم تعقلون)۔

۶۔ کبھی بھی بغیر ارادہٗ اصلاح کے یتیم کے مال کے پاس نہ جانا حتیٰ کہ وہ سن تمیز کو پہنچ جائیں (ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن حتیٰ یبلغ اشدہ)۔

۷۔ کم فروشی نہ کرنا اور پیمانہ و ترازو کے حق کو عدالت کے ساتھ ادا کرنا (واوفوا الکیل والمیزان بالقسط)۔

چونکہ ترازو اور پیمانہ کے بارے میں یہ اندیشہ تھا کہ باوجود احتیاط کرنے کے پھر بھی کچھ فرق باقی رہ جائے جیسا کہ ایسا ہوتا ہے کہ توجہ کے باوجود تھوڑا فرق پھر بھی باقی رہ جاتا ہے جس کی شناخت عام ترازوؤں اور پیمانوں سے ممکن نہیں اس لیے مذکورہ بالا جملہ کے ساتھ ہی فرما دیا: ہم کسی شخص پہ اس کی قدرت و استطاعت سے زیادہ ذمہ داری عائد نہیں کرتے (لا نکلف نفسا الا وسعھا)۔

۸۔ فیصلہ کرتے وقت یا گواہی دینے کے موقع پر یا جب بھی کوئی بات کہو تو حق و عدالت کو پیش نگاہ رکھو اور حق کی راہ سے باہر نہ جاؤ چاہے وہ تمہارے عزیزوں کے بارے میں ہو اور حق کہنے سے انہیں نقصان پہنچ جائے (واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربیٰ)۔

۹۔ اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو اور اسے مت توڑو (وبعھد اللہ اوفوا)۔

عہدِ الٰہی سے کیا مراد ہے، اس بارے میں مفسرین نے متعدد احتمالات بیان کیے ہیں لیکن آیت کا مفہوم عام ہے جو تمام الٰہی عہدوں پر محیط ہے چاہے وہ تکوینی ہوں یا تشریعی نیز تکالیف الٰہی اور ہر قسم کا عہد، نذر اور قسم بھی اس میں شامل ہے۔

مزید تاکید کے لیے ان چار قسموں کے آخر میں فرماتا ہے: یہ وہ امور ہیں جن کی خدا تمہیں تاکید کرتا ہے تاکہ تمہیں یاد رہے (ذٰلکم وصاکم بہ لعلکم تذکرون)۔

۱۰۔ یہ میرا سیدھا راستہ۔ توحید کا راستہ ہے، حق و عدالت کا راستہ ہے، پاکیزگی اور تقویٰ کا راستہ ہے، اس کی پیروی کرو اور ٹیڑھے راستے اور افتراق کے راستوں پر ہرگز نہ جاؤ کیونکہ یہ تمہیں خدا کے راستے سے ہٹا دیں گے اور تمہارے درمیان نفاق اور اختلافات کے بیج بو دیں گے (وان ھٰذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ)۔

اس سب کے آخر میں تیسری بار تاکید فرماتا ہے کہ یہ وہ امور ہیں جن کی خدا تمہیں تاکید کرتا ہے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ (ذٰلکم وصاکم بہ لعلکم تتقون)۔

## چند اہم نکات

۱۔ **توحید سے ابتداء، نفیٔ اختلاف پر انتہا:** یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ان دس فرمانوں میں سب سے پہلے تحریمِ شرک سے ابتداء کی گئی ہے جو تمام محرماتِ الٰہی اور معاشرے کی تمام بُرائیوں کی جڑ ہے اور نفیٔ اختلاف پر خاتمہ کیا گیا ہے جو ایک طرح کا عملی شرک محسوب ہوتا ہے۔

یہ امر ظاہر کرتا ہے کہ مسئلہ توحید تمام اصول و فروعِ اسلامی میں کافی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ توحید صرف ایک دینی اصل ہی نہیں بلکہ تمام تعلیماتِ اسلامی کی رُوح رواں ہے۔

۲۔ **پے در پے تاکیدیں:** ان تینوں آیتوں کے آخر میں تاکید کے طور پر "ذالکم وصاکم بہ" (یہ وہ چیز ہے جس کی خدا تمہیں تاکید کرتا ہے) کا جملہ آیا ہے۔ اتنا فرق ہے کہ پہلی آیت میں "لعلکم تعقلون" دوسری میں "لعلکم تذکرون" تیسری میں "لعلکم تتقون" پر آیت کا خاتمہ ہوا ہے۔

یہ مختلف تعبیریں جو اپنی جگہ معنی خیز ہیں گویا اس نقطہ کی طرف اشارہ ہیں کہ کسی حکم کو قبول کرنے کا پہلا مرحلہ "تعقل" اور اس کا فہم ہے، اس کے بعد کا مرحلہ "تذکر" اور اس کے جذب کرنے کا ہے اور تیسرا مرحلہ عمل، تقویٰ اور پرہیزگاری کا ہے اور یہ آخری مرحلہ ہے۔

یہ درست ہے کہ ان تینوں جملوں میں سے ہر ایک مذکورہ دس فرامین میں سے چند کو ذکر کرنے کے بعد آیا ہے لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ مذکورہ تین مرحلے معینہ احکام کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں کیونکہ ہر حکم تعقل، تذکر اور تقوے و عمل چاہتا ہے، بلکہ دراصل فصاحت و بلاغت کے قواعد و قوانین اس امر کا موجب بنے ہیں کہ ان تاکیدی جملوں کو ان دس احکام کے درمیان پھیلا دیا ہے۔

۳۔ **دائمی احکام:** شاید اس امر کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت نہ ہو گی کہ مذکورہ دس احکام صرف آئینِ اسلام ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ یہ تمام ادیان میں تھے۔ اگرچہ اسلام میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ان سے بحث کی گئی ہے۔ درحقیقت یہ وہ ارشادات ہیں جن کی افادیت کو عقل و منطق بخوبی سمجھتے ہیں۔ اصطلاحاً یوں کہا جائے کہ یہ احکام "مستقلاتِ عقلیہ" میں سے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم میں دیگر انبیاء کے جو بعض آئین بیان ہوئے ہیں ان میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے[1]

۴۔ **ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کی اہمیت:** شرک کی قباحتوں کے بیان کرنے کے بعد فوراً ہی اور دیگر احکام جیسے تحریمِ قتلِ نفس، دبیانِ اصولِ عقائد سے پہلے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کا ذکر کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی دستور میں ماں باپ کے حق کو نہایت درجہ اہمیت دی گئی ہے۔

یہ امر اس وقت اور واضح ہو گا، جب ہم اس بات پر توجہ کریں کہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ ماں باپ کو آزار پہنچانا

---

[1] شوریٰ، آیہ ۱۳۔

حرام ہے حالانکہ یہ اس آیت میں ذکر ہونے والے دیگر محرمات سے ہم آہنگ بھی تھا، بلکہ "احسان و نیکی" کے عنوان سے ذکر فرمایا ہے، یعنی نہ صرف یہ کہ انہیں تکلیف پہنچانا حرام ہے بلکہ اس کے علاوہ ان پر نیکی کرنا بھی لازم و ضروری ہے۔

یہاں پر یہ نکتہ بھی جاذب نظر ہے کہ کلمہ "احسان" کو "ب" کے ذریعہ متعدی کیا ہے اور فرمایا ہے کہ "وبالوالدین احسانا" "الی" کے ساتھ متعدی نہیں کیا کیونکہ "احسان" اگر "الی" کے ساتھ متعدی ہو تو اس کے معنی نیکی کرنے کے ہوں گے چاہے بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ، لیکن اگر "احسان" کا تعدیہ "ب" کے ذریعہ کیا جائے تو اس کے معنی بلا واسطہ اور بطور مستقیم نیکی کرنے کے ہیں، بنا بریں آیت اس بات کی تاکید کر رہی ہے کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کے مسئلے کو اس قدر اہمیت دینا چاہیئے کہ شخصاً اور بغیر کسی واسطے کے اسے انجام دینا چاہیئے۔[1]

۵۔ **گرسنگی کی وجہ سے اولاد کا قتل:۔** اس آیت سے مفہوم یہ نکلتا ہے کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں بے جا تعصب و غیرت کی وجہ سے اپنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے، بلکہ لڑکوں کو (جو اس دور میں بزرگی و شرف کا سرمایہ سمجھے جاتے تھے) بھی فقر و تنگدستی کے خوف سے قتل کر دیتے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے وسیع خوانِ نعمت، کہ جس سے ضعیف ترین موجودات بھی بہرہ در ہوتے ہیں، کی طرف توجہ دلا کر اس بُرے کام سے روکا ہے۔

بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ "زمانۂ جاہلیت کا عمل" ہمارے زمانہ میں بھی پایا جاتا ہے اور ایک دوسرے انداز سے اس کی تکرار کی جاتی ہے کیونکہ بعض افراد غذا کی کمی کے خوف سے بے گناہ بچوں کو حالتِ جنین میں "ضائع" کر کے رحمِ مادر ہی میں قتل کر دیتے ہیں۔

اگرچہ آج کل اسقاطِ حمل کے جواز پر کچھ دیگر بے اساس دلیلیں بھی بیان کی جاتی ہیں لیکن فقر اور خوراک کی کمی ان دلیلوں میں نمایاں تر ہے۔

یہ بات اور دیگر امور جو اس سے مشابہت رکھتے ہیں اس بات کے مظہر ہیں کہ عصرِ جاہلیت کی ہمارے زمانہ میں بھی تکرار ہوتی رہتی ہے بلکہ "بیسویں صدی کی جاہلیت" قبل از اسلام کی جاہلیت سے بھی زیادہ وحشتناک اور وسیع تر ہے۔

۶۔ **فواحش سے کیا مراد ہے؟:۔** "فواحش" جمع ہے "فاحشۃ" کی اس کے معنی اس گناہ کے ہیں جو غیر معمولی اور نفرت آمیز ہو۔ بنا بریں عہد شکنی، کم فروشی، شرک اور اسی طرح کے دوسرے گناہ اگرچہ گناہ کبیرہ میں سے ہیں لیکن فواحش کے

[1] تفسیر المنار ج ۸ ص ۱۸۵۔

مقابلہ میں ان کا ذکر مفہوم کے اسی فرق کے لحاظ سے ہے ۔

۷۔ **ان گناہوں کے پاس نہ جانا :-** مذکورہ بالا آیات میں دو جگہ لا تقربوا ( نزدیک نہ جانا) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے ۔ اس بات کی قرآن کریم میں بعض دیگر گناہوں کے لیے بھی تکرار ہوئی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعبیر ان گناہوں کے لیے ہے جو جذبات کو برانگیختہ کرنے والے اور عام افراد کو اپنی طرف لبھانے والے ہیں ۔ جیسے " زنا و فحشاء " اور کمزور یتیموں کا مال کھانا ۔ اسی طرح دیگر گناہ ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو خبردار کیا ہے کہ ان گناہوں کے پاس نہ جانا کہ ان کی دل لبھانے والی تاثیروں کی زد میں نہ آسکو ۔

۸۔ **نمایاں و پنہاں گناہ :-** اس میں شک نہیں کہ جملہ " نمایاں و پنہاں " کے الفاظ میں ہر قسم کے گناہ شامل ہیں لیکن بعض احادیث میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا :-

ما ظهر هو الزنا و ما بطن هو المخالة ۔

نمایاں گناہ سے مراد زنا ہے، اور پنہاں گناہ سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص خفیہ طور پر داشتہ رکھ لے ۔

یہ بات واضح ہے کہ اس طرح کے موارد کا ذکر ایک مصداق کے طور پر ہے نہ یہ کہ مذکورہ عنوان اسی میں منحصر ہے ۔

۹۔ **یہودیوں کے دس گناہ :-** توریت فصل ۲۰ " سفر خروج " میں یہودیوں کے احکام دہگانہ پر نظر پڑتی ہے جو یہودیوں میں " دس فرمان " کے نام سے مشہور ہیں وہ اس فصل کے دوسرے جملہ سے شروع ہوتے ہیں اور ساتویں پر ختم ہوتے ہیں ۔

اگر ان دس فرمانوں اور قرآن کے مذکورہ بالا دس فرمانوں کا موازنہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ دونوں کے درمیان کافی فرق ہے ، البتہ یہ اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا کہ توریت کا یہ حصہ تحریف سے محفوظ رہ گیا ہے اور اس میں تغیر و تبدل نہیں کیا گیا ہے جیسا کہ اس کے بعض دوسرے حصوں میں کیا گیا ہے ، لیکن جو بات مُسلّم ہے وہ یہ ہے کہ یہ دس فرمان جو اس وقت توریت میں موجود ہیں اگرچہ ضروری مسائل پر مشتمل ہیں لیکن وسعت کے لحاظ سے اور اخلاقی و اجتماعی طور پر اور عقیدہ کی رُو سے آیات مذکورہ بالا کی سطح سے بہت پست ہیں ۔

۱۰۔ **ان چند آیتوں نے کس طرح مدینہ کی حالت بدل دی :-** کتاب بحار الانوار اور اسی طرح کتاب اعلام الوری میں ایک دلچسپ داستان اس سلسلہ میں ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیاتِ مذکورہ بالا لوگوں کے دلوں میں کس قدر اثر انداز ہوئی تھیں ! ہم بھی اس واقعہ کو خلاصہ کے طور پر علی بن ابراہیم کی روایت سے جو بحار الانوار میں موجود ہے ، نقل کرتے ہیں :-

قبیلہ خزرج کے دو آدمی اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبدالقیس ایک دفعہ مکہ میں آئے جبکہ اوس اور خزرج کے درمیان ایسی طولانی جنگ چھڑی ہوئی تھی کہ شب و روز میں کسی وقت بھی وہ لوگ اپنے ہتھیار کمر سے نہیں کھولتے تھے، ان کا آخری معرکہ "یوم بعاث" کے نام سے ہوا تھا۔ اس میں قبیلہ اوس نے قبیلہ خزرج پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اسی بنا پر اسعد اور ذکوان مکہ آئے تھے تاکہ مکہ والوں سے قبیلہ اوس کے خلاف ایک معاہدہ کریں۔ جس وقت یہ دونوں عتبہ بن ربیعہ کے گھر پہنچے اور اس سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو عتبہ نے ان کے جواب میں کہا:-

ہمارا شہر تمہارے شہر (مدینہ) سے کافی دور واقع ہے اس لیے تمہاری مدد کرنا ہمارے لیے مشکل ہے، خصوصاً ہمارے لیے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے جس نے ہمیں بُری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔

اسعد نے پوچھا: وہ کونسا مسئلہ؟ تم تو حرم کعبہ میں زندگی بسر کرتے ہو جو ایک جائے امن و امان ہے!

عتبہ نے جواب دیا: ایک انسان ہم میں ظاہر ہوا ہے جو کہتا ہے: میں خدا کا فرستادہ ہوں' وہ ہماری عقلوں کو ناچیز سمجھتا ہے اور ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے اس نے ہمارے جوانوں کو بگاڑ دیا ہے اور ہمارے اتحاد کو پراگندہ کر دیا ہے۔

اسعد نے دریافت کیا: اس شخص کی تم سے کیا نسبت ہے؟

اس نے کہا: یہ عبداللہ بن عبدالمطلب کا فرزند ہے اور ہمارے شریف خاندانوں کا ایک ممتاز فرد ہے۔

یہ سُن کر اسعد اور ذکوان کچھ سوچ میں پڑ گئے اور انہیں یاد آیا کہ وہ مدینہ کے یہودیوں سے سنتے آئے ہیں کہ عنقریب ایک نبی مکہ سے ظہور کرنے والا ہے اور وہ مدینہ کی طرف ہجرت کرے گا۔

اسعد نے اپنے دل میں کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ وہی نبی ہو جس کی پیشین گوئی یہودیوں نے کی تھی۔

اس کے بعد اس نے پوچھا: وہ ہے کہاں؟

عتبہ نے کہا: وہ اس وقت خانہ خدا کے پاس حجر اسماعیل میں بیٹھا ہے۔ آج کل اس کی جماعت کے لوگ پہاڑ کے ایک درہ میں محصور ہیں۔ انہیں صرف ماہ رجب میں جو حج و عمرہ کا زمانہ ہے آزادی دی گئی ہے تاکہ عمرہ بجا لا سکیں اور لوگوں کے درمیان آسکیں لیکن میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ کہیں اس کی باتوں میں نہ آجانا اور اس سے بالکل بات نہ کرنا کیونکہ وہ ایک عجیب جادوگر بھی ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ مشرکین مکہ نے مسلمانوں کو شعب ابو طالب میں بند کر کے گھیراؤ ڈال دیا تھا اور انہیں باہر نہیں نکلنے دیتے تھے۔

اسعد نے عتبہ سے کہا: اَب مَیں کیا کروں کیونکہ مَیں نے تو خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے لیے احرام باندھ لیا ہے لہٰذا طواف کرنا ضروری ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ اس کے نزدیک بھی نہ جانا؟

عتبہ نے جواب دیا، تھوڑی سی روئی لے کر اس سے اپنے کان بند کر لو تاکہ اس شخص کی کوئی بات نہ سُن سکو۔

اسعد مسجد الحرام میں پہنچا۔ اس نے روئی سے اپنے کانوں کو بند کر رکھا تھا۔ اس حالت میں اس نے طواف خانہ کعبہ کرنا شروع کیا۔ اس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بنی ہاشم کے لوگوں کے درمیان حجر اسماعیل میں خانہ کعبہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

اسعد نے ایک نگاہ غلط انداز پیغمبر پر ڈالی اور ان کے پاس سے جلدی سے گزر گیا۔

جب طواف کے دوسرے دَور میں پہنچا تو اس نے اپنے آپ سے کہا، مجھ سے بھی زیادہ کوئی احمق نہ ہوگا کیا یہ ممکن ہے کہ مکّہ میں اتنا بڑا واقعہ رونما ہو جائے جو اہلِ مکّہ کے زبان زد ہو اور مَیں اس سے بے خبر رہوں اور جب مدینہ واپس جاؤں تو اپنی قوم کو اس کے متعلق کچھ بھی نہ بتا سکوں۔ یہ خیال آتے ہی اس نے روئی اپنے کان سے نکال کر دور پھینک دی اور جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑا ہوگیا، پھر اس نے پوچھا: آپ ہمیں کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں؟

آنحضرتؐ نے جواب میں فرمایا: مَیں اس بات کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے اور مَیں اس کا رسول ہوں نیز مَیں تم لوگوں کو ان باتوں کی طرف دعوت دیتا ہوں .... اس کے بعد آپ نے مذکورہ تین آیتوں کی تلاوت فرمائی جو دس حکموں پر مشتمل ہیں۔

جب اسعد نے یہ پُرمعنی اور روح پرور کلام سُنا جو اس کے جان و دل سے ہم آہنگ تھا تو اس کا عالم دگرگوں ہوگیا۔ اس کی زبان پر بے ساختہ جاری ہوا۔ اشہد ان لّا الٰہ الا اللّٰہ وانک رسول اللّٰہ۔

یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ مَیں یثرب کا رہنے والا ہوں، قبیلہ "خزرج" سے میرا تعلق ہے، ہمارا تعلق ہمارے بھائیوں۔ قبیلہ اوس۔ سے طولانی جنگوں کی وجہ سے ٹوٹ گیا ہے، شاید خداوند کریم آپ کی برکت سے اس ٹوٹے ہوئے بندھن کو دوبارہ جوڑ دے۔

اے نبیٔ خدا! ہم نے آپ کے اوصاف قوم یہود سے سُنے تھے۔ وہ ہمیشہ آپ کے ظہور کی خبر دیا کرتے تھے۔ ہماری تمنا ہے کہ ہمارا شہر۔ مدینہ۔ آپ کی ہجرت گاہ بنے کیونکہ یہودیوں نے اپنی آسمانی کتابوں میں دیکھ کر ہمیں یہی بتایا ہے۔ مَیں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے آپ کی خدمت میں آنے کا موقع دیا۔ خدا کی قسم! مَیں تو یہ قصد لے کر آیا تھا کہ اہل مکّہ سے اپنے بھائیوں کے خلاف جنگ میں مدد حاصل کر سکوں لیکن خدائے کریم نے مجھے اس سے بڑی کامیابی عطا کی۔

اس کے بعد اس کا ساتھی ذکوان بھی مسلمان ہو گیا اور دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ کسی شخص کو ان کے ہمراہ مدینہ روانہ کریں تاکہ وہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دے شاید اس طرح یہ جنگ کی بھڑکتی ہوئی آگ خاموش ہوجائے چنانچہ آنحضرتؐ نے مصعب بن عمیر کو ان کے ہمراہ مدینہ بھیجا اور اس وقت سے مدینہ میں اسلام کی داغ بیل پڑی جس سے مدینہ کی صورت بدل گئی، یہ سب واقعہ مذکورہ بالا تین آیتوں کی برکت سے ہوا۔[1]

(۱۵۴) ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ تَمَامًا عَلَی الَّذِیْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ۝

(۱۵۵) وَهٰذَا کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَکٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

(۱۵۶) اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْکِتٰبُ عَلٰی طَآئِفَتَیْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ کُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِیْنَ ۝

(۱۵۷) اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْکِتٰبُ لَکُنَّآ اَهْدٰی مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَکُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَّبَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۭ سَنَجْزِی الَّذِیْنَ یَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰیٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا کَانُوْا یَصْدِفُوْنَ ۝

## ترجمہ

(۱۵۴) اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو (آسمانی) کتاب دی، جو نیک تھے ان پر (اپنی نعمت کو) تمام کیا اور تمام چیزیں (جن کی ان کو ضرورت تھی) ان پر واضح کر دیں۔ یہ کتاب ہدایت و

[1] بحار الانوار طبع جدید جلد ۱۹، ص ۸۔ ۹۔ ۱۰۔

رحمت کا سرمایہ تھی، تاکہ وہ (قیامت کے دن) اپنے پروردگار کی ملاقات پر ایمان لے آئیں۔

(۱۵۵) اور یہ ایک پر برکت کتاب ہے جو ہم نے (تجھ پر) نازل کی ہے۔ اس کی پیروی کرنا، اور پرہیزگاری کو اپنانا تاکہ اللہ کی رحمت کے مستحق ہو۔

(۱۵۶) (ہم نے ان خصوصیات کی کتاب نازل کی)، تاکہ یہ نہ کہو کہ ہم سے پہلے جو دو قومیں (یہود و نصاریٰ) تھیں ان پر کتاب آسمانی نازل ہوئی تھی اور ہم اس کے مطالعہ سے بے بہرہ تھے۔

(۱۵۷) یا یہ نہ کہو کہ اگر ہم پر بھی آسمانی کتاب نازل ہوئی ہوتی تو ہم ان لوگوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ (لو) اب یہ آیتیں اور روشن دلیلیں تمہارے پروردگار کی جانب سے آگئی ہیں۔ اسی طرح اس کی ہدایت و رحمت بھی (آگئی ہے)۔ اس صورت میں ان لوگوں سے بڑھ کر کون ستمگار ہوگا جو آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے لگیں، اور ان سے روگردانی کریں۔ لیکن عنقریب ہم ان لوگوں کو جو ہماری آیتوں سے روگردانی کرتے ہیں، ان کی اس بلا وجہ کی رُوگردانی کے سبب سخت سزا دیں گے۔

## تفسیر

### بہانہ سازوں کو ایک قطعی جواب

اس سے قبل کی آیات میں اسلام کے دس بنیادی احکام سے بحث کی گئی تھی، جو در اصل بہت سے احکام اسلامی کی اصل اصول ہیں، اور اس طرح کی تعبیر جیسے: ان ھٰذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ (یہ میرا سیدھا راستہ ہے اس کی پیروی کرتے رہنا) سے برآمد ہوتا ہے کہ یہ احکام کسی خاص مذہب سے مخصوص نہ تھے۔ خاص کر اس لیے کہ یہ سب کے سب اصولی احکام ہیں جن کی تائید عقل انسانی سے اچھی طرح ہوتی ہے۔ بنا بریں آیات گذشتہ کا مقصد ان احکام کو بیان کرنا ہے جو نہ صرف اسلام میں بلکہ ادیان ماسبق میں بھی رائج و شامل تھے۔

انہی کے ذیل میں ان آیتوں میں اللہ فرماتا ہے کہ "اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب دی" اور جو لوگ نیکوکار تھے، ہمارے فرمان کو ماننے والے تھے، اور حق کے پیروکار تھے ان کے سبب ہم نے اپنی نعمت کو کامل کر دیا (ثم اٰتینا موسی الکتاب تماما علی الذی احسن)۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے کلمہ "ثم" (جو لغت عرب میں تمام موارد میں تعقیب یا تاخیر کے لیے آتا ہے) کے

معنی واضح ہو گئے ہوں گے۔ اب آیت کے معنی یوں ہوں گے: پہلے ہم نے انبیائے ماسبق کو یہ ہمہ گیر احکام پہنچائے، اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب عطا کی اور اس میں دستور العمل اور دیگر ضروری قوانین کی توضیح کر دی۔

اس طرح ان مختلف اور ضعیف توجیہوں کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی جنہیں بعض مفسرین نے۔ ثم۔ کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

ضمناً یہ نکتہ بھی واضح ہو گیا کہ۔ الذی احسن۔ سے ان تمام افراد کی طرف اشارہ مقصود ہے جو نیکوکار ہیں اور کلمۂ حق اور فرمان الٰہی کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔

اور اُس (توریت) میں ہر اس چیز کو بیان کر دیا گیا تھا جس کی انہیں ضرورت تھی اور جو انسانی ترقی کی راہ میں کار آمد ہو سکتی تھی (و تفصیلاً لکل شیءٍ)۔

نیز یہ کتاب جو موسیٰ پر نازل ہوئی تھی سرمایہ ہدایت و رحمت تھی (و ھدی و رحمۃ)۔

یہ تمام امور اس لیے تھے کہ یہ لوگ روزِ قیامت اور ملاقات پروردگار کے دن پر ایمان لے آئیں اور روزِ معاد پر ایمان لانے کی وجہ سے ان کی گفتار و کردار پاک ہو جائے (لعلھم بلقآء ربھم یؤمنون)۔

ممکن ہے یہاں پر یہ سوال کیا جائے کہ اگر آئینِ حضرت موسیٰ ہر طرح سے کامل تھا (جیسا کہ کلمۂ۔ تماما۔ اس پر دلالت کرتا ہے)، تو پھر اس کے بعد آئینِ حضرت عیسیٰ اور پھر اُس کے بعد آئینِ اسلام کی کیا ضرورت تھی؟

لیکن اس امر کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ ہر آئین اپنے زمانے کی حدود کے اندر جامع اور کامل ہوتا ہے اور یہ امر محال ہے کہ خداوند کریم کی جانب سے کوئی ناقص آئین نازل ہو لیکن یہی آئین جو اپنے زمانہ کی رُو سے کامل تھا ممکن ہے کہ بعد میں آنے والے زمانوں کے لیے ناتمام و ناقص ہو۔ جیسا کہ وہ نصاب جو پرائمری اسکول کے لیے تو ہر طرح سے مکمل ہوتا ہے لیکن سیکنڈری اسکول کے لیے ناقص ہوتا ہے۔ یہی راز ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف پیغمبروں کو ان کی کتابوں کے ساتھ تدریجاً بھیجا یہاں تک کہ یہ سلسلہ آخری پیغمبرؐ اور آخری کتاب پر ختم ہوا۔ بیشک جب انسانوں میں آخری آئین قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی اور وہ آئین خدا کی طرف سے نازل ہو گیا تو اب کسی دوسرے آئین کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے وہ افراد جو فارغ التحصیل ہو گئے ہوں اپنی معلومات کی بنیاد پر بذریعہ مطالعہ مزید علمی ترقیاں کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ایسے مذہب کے پیروکاروں کو کسی نئے آئین کی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ وہ حرکت درعمل اور آگے بڑھنے کے کافی راستے اسی۔ آخری آئین۔ کے ذریعے تلاش کر لیں گے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت سے متعلق مسائل اصلی توریت میں کافی حد تک موجود تھے حالانکہ اب ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ توریت اور اس کی دوسری کتابوں کے اندر یہ مسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بھی ان دنیا پرست یہودیوں نے جو اس امر کی طرف مائل تھے کہ قیامت کے بارے میں کم بولیں اور کم سنیں، کافی تحریف کر ڈالی ہے۔

ہاں موجودہ توریت کے نسخوں میں چند مختصر اشارے قیامت کی جانب موجود ہیں مگر یہ اُس حد تک کم ہیں

کہ بعض افراد کو یہ کہنے کا موقع ملا ہے کہ یہودی اصولی طور پر روزِ قیامت کے معتقد ہی نہیں ہیں لیکن واقفیت کے لحاظ سے یہ نسبت مبالغے سے زیادہ نزدیک ہے۔

آخر میں ہم ایک امر کی طرف اور توجہ دلانا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ سابقاً بھی جلد اوّل[1] میں ہم نے اچھی طرح واضح کر دیا ہے کہ قرآن کریم میں پروردگارِ عالم کی جس ملاقات کا بار بار ذکر آیا ہے اس سے مراد حسّی ملاقات نہیں ہے اور نہ ہی آنکھوں سے دیکھا جانا مراد ہے بلکہ اس سے مراد ایک قسم کا شہود باطنی اور ملاقات روحانی ہے جس پر انسان روزِ قیامت تکامل و ترقی کی وجہ سے فائز ہوگا یا اس سے مراد ان پاداشوں اور سزاؤں کا سامنا کرنا ہے جو اس کے اعمال کے بدلے میں جہانِ آخرت میں اسے درپیش ہوں گی۔

اس کے بعد کی آیت میں نزولِ قرآن اور اس کی تعلیمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور گذشتہ آیت کی بحث کو مکمل کیا گیا ہے اور فرمایا ہے: یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے نازل کی ہے، ایسی کتاب جو بڑی با عظمت پُر برکت ہے اور طرح طرح کی خوبیوں اور نیکیوں کا سرچشمہ ہے (و هٰذا کتاب انزلناه مبارک)۔

اور جب یہ کتاب اس طرح کی ہے تو پھر اس کی پیروی کرو، پرہیزگاری کو اپنا شعار بناؤ اور اس کی مخالفت سے پرہیز کرو، شاید[2] خدا کی رحمت تمہارے شامل حال ہو جائے (فاتبعوه واتقوا لعلكم ترحمون)۔

اس کے بعد والی آیت میں مشرکوں پر تمام بہانہ سازیوں اور فرار کرنے کے راستوں کو بند کر دیا گیا ہے۔ پہلے ان سے یہ فرمایا۔ ہم نے یہ آسمانی کتاب ان خصوصیات کے ساتھ اس لیے نازل کی ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ کتابِ آسمانی صرف دو قوموں (یہود و نصاریٰ) پر نازل ہوئی تھی اور ہم اس میں غور و فکر کرنے سے غافل تھے لہٰذا اگر ہم نے تیرے حکم کی مخالفت کی تو وہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس کا مطالعہ نہ کر سکے کیونکہ تیرا فرمان دوسروں کے ہاتھ میں تھا اور وہ ہم تک نہ پہنچا (ان تقولوا انما انزل الکتاب علٰی طائفتین من قبلنا و ان کنا عن دراستهم لغافلین[3])۔

بعد کی آیت میں ان کافروں کی طرف سے وہی بہانہ نقل ہوا ہے مگر اس دفعہ اسے ذرا تفصیل کے ساتھ دہرایا گیا ہے جس میں خود نمائی اور زیادہ غرور کی آمیزش بھی ہے اور وہ یہ ہے: اگر ان پر قرآن نازل نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتے کہ ہم فرمانِ الٰہی کو بجا لانے کے لیے اس قدر تیار تھے جتنا دوسری قومیں

---

[1] تفسیر نمونہ، جلد اوّل اردو ترجمہ ص ۱۷۹۔

[2] قرآن کریم میں جہاں بھی لفظ "لعل" جو عام طور سے "شاید" کے معنی میں ہے، اللہ نے اپنی نسبت سے فرمایا ہے وہ "تاکہ" یعنی غایت کے لیے ہے، کیونکہ "شاید" ترجی کے لیے آتا ہے اور ترجی خدائے علام الغیوب کے لیے محال ہے۔ (مترجم)

[3] جملہ (أن تقولوا) (لئلا تقولوا، تاکہ یہ نہ کہو...) کے معنی میں ہے اور اس کی نظیر قرآن یا دیگر عبارات عربی ادب میں بہت ...

تیار نہیں ہو سکتی تھیں ، ہم پر آسمانی کتاب نازل ہوتی تو ہم سب سے زیادہ قبول کرنے والے اور ہدایت پانے والے ہوتے ( او تقولوا لو انآ انزل علینا الکتاب لکنا اھدٰی منھم ) ۔

در اصل پچھلی آیت ان کے اس بہانے کو بتانا چاہتی ہے کہ اگر ہم راہِ راست پر نہیں آئے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ ہم کتبِ آسمانی سے بے خبر رہے اور یہ بے خبری اس وجہ سے ہے کہ یہ کتابیں دوسروں پر نازل ہوئی تھیں لیکن یہ آیت ان (عربوں) کے احساس برتری اور اس بے بنیاد زعم کی حکایت کر رہی ہے جو اُن کے دماغوں میں سمایا ہوا تھا کہ نژادِ عرب کو دوسری قوموں پر امتیاز حاصل ہے ۔

اسی مطلب کی ہم معنی سورۂ فاطر کی آیت ۴۲ بھی ہے جس میں ایک یقینی مسئلہ کے طور پر ( نہ کہ قضیہ شرطیہ کے طور پر ) اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے ، جہاں کہا گیا ہے :-

مشرکوں نے بڑی تاکیدی قسم کھائی ہے کہ اگر ان کی جانب کوئی پیغمبر آجائے تو وہ تمام قوموں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو جائیں گے :

بہر حال قرآن کریم ان تمام دعووں کے جواب میں کہتا ہے : خدا نے تمام بہانہ تراشیوں کی راہوں کو تمہارے لیے بند کر دیا ہے ، کیونکہ : متعدد دلیلیں اور روشن آیتیں تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے پاس آچکی ہیں ، جو الٰہی ہدایت اور رحمتِ پروردگار کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں ( فقد جآءکم بینۃ من ربکم وھدی و رحمۃ ) ۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ کتاب آسمانی کے بدلے لفظ " بینہ " استعمال کیا گیا ہے جو اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کتابِ آسمانی ہر حیثیت سے مدلل اور اطمینان بخش ہے جو اپنے دامن میں یقین آور دلیلیں لیے ہوئے ہیں ۔

ان حالات میں بھی اگر یہ خدا کی آیتوں کی تکذیب کریں تو کیا ان سے زیادہ ظالم کوئی دوسرا ہو سکتا ہے ( فمن اظلم ممن کذب بأیات اللہ وصدف عنھا ) ۔

" صَدَفَ " مادۂ " صَدْفٌ " ( بروزن حَذْفٌ ) سے مشتق ہے ، جس کے معنی ہیں کسی چیز سے بغیر غور و فکر کے شدید روگردانی کرنا ، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان (کافروں) نے نہ صرف آیاتِ الٰہی سے روگردانی کی بلکہ بغیر غور و فکر کیے بڑی شدت سے ان سے دُوری اختیار کی ۔ بعض اوقات یہ لفظ (صدف) دوسروں کو کسی کام سے روکنے کے معنی میں بھی آتا ہے ۔

آخر میں خدا نے ایسے ضدی اور اپنی سمجھ سے کام نہ لینے والے افراد جو بغیر سوچے سمجھے سختی کے ساتھ حقائق کا انکار کر دیتے ہیں ، اور اس سے بھاگتے ہیں یہاں تک کہ دوسروں کے لیے بھی سدِ راہ ہوتے ہیں ، کی سزا کو ایک مختصر لیکن نہایت بلیغ جملے میں بیان فرمایا ہے ، ارشاد ہوتا ہے : عنقریب ہم ان لوگوں کو جو ہماری آیتوں سے روگردانی کرتے ہیں ، شدید سزاؤں میں مبتلا کریں گے اور یہ ان کی بلا وجہ اور بغیر سوچے سمجھے روگردانی کی وجہ سے ہے ( سنجزی الذین یصدفون عن أیاتنا سوٓء العذاب بما کانوا یصدفون ) ۔

کلمۂ " سوٓء العذاب " کے معنی اگرچہ " بُری سزا " ہیں لیکن چونکہ بُری سزا وہ ہوتی ہے جو ہر حیثیت سے

سخت اور معمول سے زیادہ اور دردناک ہو اسی لیے بہت سے مفسروں نے اس کا مفہوم "شدید سزا" بیان کیا ہے۔
ایسے لوگوں کی سزا بیان کرنے کے سلسلے میں کلمہ "یصدفون" کی تکرار اس مطلب کو واضح کرنے کی غرض سے ہے کہ ان کی تمام مصیبتیں اور بدبختیاں اس وجہ سے ہیں کہ انہوں نے بغیر غور و فکر کیے اور بغیر دیکھے بھالے حقائق سے روگردانی کی ہے اگر وہ کم از کم ایک ایسے شخص کی طرح جو شک کی حالت میں تلاش حق کر رہا ہو ان آیات کا مطالعہ کرتے تو اپنے اس دردناک انجام سے دوچار نہ ہوتے۔

(۱۵۸) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۗ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۗ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝

## ترجمہ

(۱۵۸) کیا انہیں صرف اس بات کا انتظار ہے کہ (موت کے) فرشتے ان کے پاس آئیں یا خدا (خود) ان کے پاس آئے (یہ توقع کیسی محال ہے!) یا خدا کی آیتوں میں سے کچھ آیتیں (جو روز قیامت کی نشانی ہوں) ان کے پاس آئیں، لیکن جس روز یہ آیتیں اور نشانیاں آجائیں گی اس روز ان لوگوں کا ایمان لانا، جو اس سے پہلے ایمان نہ لائے ہوں گے، یا انہوں نے کوئی نیک عمل نہ کیا ہوگا انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ (اے ہمارے رسول) ان سے کہہ دو کہ (اب جبکہ تم ایسا بے جا انتظار و توقع کیے بیٹھے ہو تو پھر) انتظار کرو، ہم بھی (تمہاری سزا کے وقت کا) انتظار کرتے ہیں۔

# تفسیر

## بے جا اور محال توقعات

پچھلی آیتوں میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے مشرکین پر اتمام حجت کر دیا ہے اور آسمانی کتاب یعنی قرآن کو سب کی ہدایت کے لیے بھیج دیا ہے تاکہ لوگوں کو اپنی مخالفت کی توجیہ کے لیے کسی بہانہ کا موقع نہ ملے۔

یہ آیت کہتی ہے، لیکن یہ ضدی لوگ اپنے طریقہ کار میں اس قدر سخت ہیں کہ یہ واضح دستور العمل (قرآن) بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ گویا انہیں اپنی نابودی یا آخری موقع کے کھو دینے یا محال باتوں کا انتظار ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "انہیں سوائے اس کے اور کسی چیز کا انتظار نہیں کہ موت کے فرشتے انہیں لینے آ جائیں (ھل ینظرون الآ ان تأتیھم الملآئکۃ)۔

یا یہ کہ تیرا پروردگار ان کے پاس آجائے تاکہ یہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور ایمان لے آئیں (او یأتی ربک)۔

درحقیقت یہ لوگ امر محال کی توقع کر رہے ہیں نہ یہ کہ خدا کا آنا یا اس کا دیکھا جانا ایک ممکن امر ہے۔ اس کی مثال بالکل یوں ہے کہ ایک ہٹ دھرم قاتل جسے اس کے جرم کے ثبوت کے لیے کافی دلیلیں پیش کی جائیں لیکن پھر بھی وہ قائل نہ ہو تو اس سے ہم کہیں کہ اگر یہ تمام ثبوت بھی تم قبول کرنے پر تیار نہیں ہو تو شاید تمہیں اس بات کا انتظار ہے کہ اب خود مقتول زندہ ہو کر عدالت میں آئے اور یہ گواہی دے کہ تم نے اسے قتل کیا ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے: یا تمہیں اس بات کا انتظار ہے کہ بعض وہ نشانیاں آجائیں جو روز قیامت سے کچھ پہلے ظاہر ہوں گی اور ان کے ظاہر ہونے کے بعد توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے اور اس دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا (او یأتی بعض اٰیات ربک)۔

یہاں پر کلمہ "آیاتِ ربک" اگرچہ کلی طور سے اور سربستہ استعمال ہوا ہے لیکن بعد کے جملوں کے قرینہ سے جن کی تفسیر آگے آئے گی، ان آیات کو "آیاتِ روز حشر" کے مفہوم میں لیا جا سکتا ہے جیسے وحشتناک زلزلے، سورج، چاند ستاروں کا بے نور ہو جانا اور اسی طرح کی دوسری نشانیاں جو قیامت سے پہلے ظاہر ہونے والی ہیں۔

یا اس سے مراد ان کے وہ نامعقول مطالبے ہیں جو وہ پیغمبر اسلامؐ سے کیا کرتے تھے۔ منجملہ ان کا ایک مطالبہ یہ تھا کہ ان کے سروں پر آسمانی پتھر برسیں یا یہ کہ عربستان کا خشک ریگستان بہتے ہوئے چشموں اور ہرے بھرے نخلستان سے

... ذیل میں یہ اضافہ فرمایا ہے کہ جس روز بھی یہ نشانیاں ظاہر ہوں گی اس روز بے ایمانوں کا ایمان لانا ا... لوگوں کا ایمان لانا جنہوں نے کوئی نیک کام نہ کیا ہوگا، قابلِ قبول نہ ہوگا اور توبہ کے دروازے بھی ان کے لیے بند کر دیے جائیں گے کیونکہ توبہ اور ایمان لانا ان حالات میں اجباری اور اضطراری کیفیت کا حامل ہوگا جو اختیاری توبہ اور

ایمان کے ہم پایہ نہیں ہے ( یوم یأتی بعض آیات ربک لاینفع نفسا ایمانها لم تکن آمنت من قبل او کسبت فی ایمانها خیرا)۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا اس سے معلوم ہوا کہ جملہ - او کسبت فی ایمانها خیرا - کے معنی یہ ہیں کہ اس روز فرشتہ ایمان لانا فائدہ بخش نہ ہوگا بلکہ ایسے لوگ بھی جو ایمان تو لاتے ہیں مگر انہوں نے کوئی نیک کام نہیں کیا ہے، اس روز کوئی نیک کام کرنا بھی انہیں فائدہ نہیں پہنچائے گا کیونکہ اس وقت حالات ہی ایسے ہوں گے کہ ہر شخص بے اختیارانہ طور پر یہ چاہے گا کہ بُرے کاموں کو چھوڑ دے اور نیک اعمال بجا لائے۔

آیت کے آخر میں شدید آمیز لہجہ میں ان ضدی افراد سے فرماتا ہے - اچھا اب جبکہ نہیں اس قسم کا انتظار ہے تو بھی انتظار کیے جاؤ، ہم بھی (تمہارے دردناک انجام) کے انتظار میں رہیں گے (قل انتظروا انا منتظرون)۔

## عمل صالح کے بغیر ایمان کا کوئی فائدہ نہیں

آیت مذکورہ بالا سے چند قابل توجہ نکات معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک نکتہ یہ ہے کہ یہ آیت ایسی راہ نجات کا پتہ دے رہی ہے جو ایمان کے زیر سایہ ہے، پھر ایمان بھی وہ ایمان جس کی روشنی میں بندہ اعمال نیک بجا لائے۔

ممکن ہے کوئی پوچھے کہ کیا تنہا ایمان کافی نہیں ہے چاہے وہ تمام اعمال خیر سے خالی ہو؟

اس سوال کے جواب میں ہم کہیں گے، ہم نے مانا کہ کچھ باایمان افراد ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن سے لغزشیں ہو جائیں اور وہ گناہوں کے مرتکب بھی ہو جائیں پھر اس کے بعد اپنے گناہوں پر نادم و پشیمان بھی ہوں اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں لیکن ایسا باایمان شخص جس نے اپنی عمر میں کافی مواقع کے باوجود کوئی نیک عمل نہ کیا ہو بلکہ اس کے برعکس وہ ہر طرح کے بُرے کاموں میں مشغول رہا ہو اور ہر قسم کی سیاہ کاری اس سے سرزد ہوئی ہو، بہت بعید معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص نجات یافتہ ہو جائے اور اس کا یہ عمل سے خالی ایمان اسے فائدہ پہنچائے کیونکہ اصولی طور پر یہ یقین نہیں آتا کہ کوئی شخص کسی نظریہ پر ایمان تو رکھتا ہو اس کے باوجود اپنی تمام عمر میں ایک مرتبہ بھی اس نظریہ کے قوانین پر عمل پیرا نہ ہو سکے بلکہ اس کے برعکس اس کے تمام قوانین کو ٹھکرا دے، اس کا ایسا کرنا اس بات کی کھلی دلیل ہوگا کہ اسے سرے سے اس نظریے پر ایمان و اطمینان نہ تھا۔ اس طرح سے معلوم ہوا کہ ایمان وہی ہے جو عمل نیک کے ہم پہلو ہو چاہے وہ عمل نیک تھوڑا ہی کیوں نہ ہو تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اس کے دل میں ایمان کا وجود ہے۔

(۱۵۹) إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ○

(۱۶۰) مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

## ترجمہ

(۱۵۹) وہ لوگ جنہوں نے اپنے آئین کو پراگندہ کر دیا اور وہ مختلف جتھوں (اور مختلف مذہبوں) میں بٹ گئے، تمہیں (اے رسول!) ان سے کوئی واسطہ نہیں، ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ لہٰذا خدا ہی انہیں ان کے کرتوتوں سے آگاہ کرے گا۔

(۱۶۰) جو شخص بھی کوئی نیک کام کرے گا اسے دس گنا صلہ ملے گا، اور جو شخص کوئی برا کام کرے گا اسے اتنی ہی سزا ملے گی (جتنا برا کام کیا تھا) اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔

## تفسیر

### نفاق پھیلانے والوں سے علیحدگی کا حکم

جو درس فرمان پچھلی آیتوں میں گذرے ہیں جن کے آخر میں یہ حکم تھا کہ خدا کی صراط مستقیم کی پیروی کرو اور ہر طرح کے نفاق اور اختلاف کا مقابلہ کرو، یہ آیت دراصل اسی مفہوم کی تفسیر و توضیح کے ضمن میں ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "وہ لوگ جنہوں نے اپنے آئین و مذہب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور وہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئے (اے رسول!)، تمہارا ان سے کسی معاملے میں کوئی ربط نہیں، نہ ان کا تم سے کسی چیز میں ربط ہے کیونکہ تمہارا آئین توحید اور تمہارا دین صراط مستقیم ہے اور راہِ راست ہمیشہ ایک ہی ہوتی ہے (ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیء)۱

---

۱ لغت میں لفظ "شیع" کے معنی فرقوں، گروہوں، پیروؤں کے ہیں، بنا بریں اس کا مفرد (شیعہ) کے معنی اس گروہ کے ہیں جو کسی خاص مسلک یا شخص کی پیروی کرے، یہ لفظ شیعہ کے لغوی معنی ہیں لیکن اصطلاح میں اس کے خاص معنی ہیں اور ان لوگوں کو شیعہ کہا جاتا ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلک امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے پیرو ہیں، لہٰذا اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی میں اشتباہ نہیں ہونا چاہیئے (مؤلف) مطلب یہ ہے کہ یہاں پر لفظ "شیع" اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ اصطلاحی معنی میں، لہٰذا کوئی صاحب عقل اس آیت کو مذہب شیعہ کے خلاف استعمال نہیں کر سکتا (مترجم)۔

اس کے بعد اس طرح کے تفرقہ انداز لوگوں کی تحدید و مذمت کے لیے فرماتا ہے : ان کا کام خدا کے سپرد ہے ، وہ انہیں کیفر کردار سے آگاہ کرے گا (انما امرھم الی اللہ ثم ینبئھم بما کانوا یفعلون)۔

## چند اہم نکات

۱۔ اس آیت سے کون لوگ مراد ہیں؟ :۔ مفسرین میں سے کچھ افراد کا خیال ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے اور ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے تھے۔

بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت اسی امت محمدی کے ان تفرقہ انداز افراد کی طرف اشارہ کر رہی ہے جنہوں نے مختلف تعصبات اور جذبہ تفوق طلبی اور جاہ پسندی کی وجہ سے اس امت مسلمہ کے درمیان نفاق و افتراق کا بیج بویا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس آیہ کریمہ میں عمومی طور سے ان تمام تفرقہ پسند افراد کا حکم بیان کیا گیا ہے جنہوں نے طرح طرح کی بدعتیں ایجاد کرکے بندگان خدا کے درمیان نفاق و اختلاف پھیلایا ہے چاہے وہ پچھلی امتوں میں گزرے ہوں یا ان کا تعلق اس امت سے ہو۔

لہٰذا اگر ہمیں اہلبیت طاہرین علیہم السلام کی روایات میں اور اسی طرح اہلسنت کی روایات میں بھی یہ ملتا ہے کہ اس آیت سے اس امت کے تفرقہ انداز اور بدعت پھیلانے والے لوگ مراد ہیں[1] تو یہ بیان مصداق کے طور پر ہے (نہ کہ اس سے انحصار مراد ہے) کیونکہ اگر اس مصداق کو بیان نہ کیا جاتا تو بعض کو یہ خیال گزرتا کہ اس آیت سے صرف پچھلی امتیں مراد ہے، اس طرح وہ خود کو اس آیت کی مذمت سے بری قرار دے لیتے۔

تفسیر علی بن ابراہیم قمی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے اس آیت کے ذیل میں روایت ہے :۔

فارقوا امیر المومنین علیہ السلام و صاروا احزابا۔

یعنی اس آیت میں ان لوگوں کی جانب اشارہ ہے جنہوں نے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کو چھوڑ دیا اور وہ مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے[1]

نیز وہ روایات بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں جن میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے پیشین گوئی کے طور پر فرمایا ہے :۔

"میرے بعد یہ امت مختلف گروہوں میں بٹ جائے گی"

---

۱۔ تفسیر نور الثقلین ، جلد اول ص۷۸۳۔

۲۔

## تفرقہ اور نفاق کی برائی

یہ آیت اس امر کو بڑی تاکید کے ساتھ دُہرا رہی ہے کہ اسلام آئین وحدت و یگانگی ہے اور ہر طرح کے نفاق، تفرقہ اور انتشار سے بیزار ہے۔ اسی بناء پر بڑی تاکید کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ سے ارشادِ الٰہی ہے کہ تمہارے کام کو تفرقہ انداز لوگوں سے کوئی مشابہت نہیں ہے، خدائے قہار و منتقم ان سے انتقام لے لے گا اور ان کے انجام بد کو ان کے سامنے لائے گا۔

توحید نہ صرف ایک اصل اسلام ہے بلکہ اسلام کے تمام اصول و فروع اور اس کے تمام آئین و فرامین توحید کے محور پر گھومتے ہیں۔ تمام تعلیمات اسلامی کے پیکر میں توحید روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ جسدِ اسلام میں توحید ہی کی روح پھونکی گئی ہے۔

لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ آئین اسلام جس کے تمام اصولوں کو وحدت و یگانگی نے حیات بخشی ہے آج وہی آئین، تفرقہ اندازوں اور نفاق افگنوں کے ہاتھوں کچھ اس طرح گرفتار ہوا ہے کہ اس کے اصلی خد و خال گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہر روز ایک نغمۂ شوم اس صدائے بوم کی طرح جو ویرانہ میں سنائی دے، کسی نہ کسی گوشہ سے بلند ہوتا ہے اور کوئی نہ کوئی شخص جسے ہیرو بننے کا شوق ہو یا کسی دماغی مرض میں گرفتار ہو یا کج رفتار ہو وہ کسی قانون اسلامی کے خلاف علم مخالفت اونچا کرتا ہے جس کے گرد کچھ نادان افراد جمع ہو جاتے ہیں اور اس طرح ایک نئے اختلاف کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

عام مسلمانوں کی بے خبری اور آئین اسلامی سے ان کا جہل اس تفرقہ اندازی میں وہی کردار ادا کرتا ہے جو دشمن کی بیداری اور فنِ تفرقہ سے آگاہی ادا کرتی ہے۔ یہ دونوں امور اس افتراق و اختلاف میں بہت مؤثر ہوتے ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ مسائل جو صدیوں سے موردِ بحث چلے آرہے ہیں، بعض لوگ تفرقہ ڈالنے کے لیے نئے سرے سے معرضِ بحث میں لا کر جنجال برپا کرتے ہیں تاکہ عوام کے افکار کو اپنی طرف متوجہ کریں لیکن جیسا کہ آیت مذکورہ بالا کہہ رہی ہے اسلام ایسے لوگوں سے ہے اور یہ لوگ اسلام سے بیگانہ ہیں اور آخر میں ان تفرقہ اندازوں کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی [1]

## مذہب شیعہ پر مؤلف "المنار" کے ناروا حملے

مؤلف تفسیر۔ المنار۔ جو ملت شیعہ سے بُری طرح بدظن ہیں اور جتنا بدظن ہیں اتنا ہی عقائدِ شیعہ اور تاریخِ شیعہ سے بے خبر بھی ہیں۔ اس آیت کے ذیل میں "دعوت اتحاد و اتفاق کی نقاب ڈال کر موصوف نے شیعوں پر خامہ

[1] مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد ۲۔

فرسائی کی ہے اور ان پر یہ اتہام لگایا ہے کہ شیعہ ہیں جنہوں نے اسلام میں تفرقہ ڈالا ہے، یہ اسلام کے مخالف ہیں اور مذہب کے نام پر خلافِ اسلام اعمال میں مشغول ہیں ؟ ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیہ مذکورہ میں جو لفظ "شیعاً" آیا ہے ، اور جس کو مسئلہ "تشیع یا شیعہ" سے کوئی ربط نہیں ہے اس نے اسے اپنے پوچ دعوے کے اثبات میں عنوان قرار دیا ہے !۔

ان صاحب کی عبارتیں اور ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ خود ان کے اعتراضوں کا جواب ہیں اور وہ اس بات کے زبردست شاہد ہیں کہ ان کو تاریخ و عقائد شیعہ کا کوئی علم نہیں ہے. کیونکہ :

(۱) موصوف نے پہلے تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ ملت "شیعہ" اور "عبداللہ بن سبا" یہودی کے درمیان ربطِ خاص ہے ، حالانکہ عبداللہ بن سبا کا وجود ہی مشکوک ہے[۱] اور بہ فرضِ وجود اس نے تاریخ شیعہ یا کتب شیعہ میں کوئی کردار ادا نہیں کیا ہے ، پھر یہ ادعا کیا ہے کہ "شیعہ" اور فرقہ "باطنیہ" اور فرقہ "ضالّہ" کے درمیان ارتباط ہے حالانکہ یہ دونوں فرقے شیعوں کے سخت دشمن ہیں۔ اگر کسی کو تاریخ شیعہ سے مختصر آگاہی ہو تو اسے بھی پتہ چل جائے گا کہ اس قسم کے دعوے واہی خیالات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے بلکہ یہ افترا و تہمت ہیں. سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ موصوف نے شیعوں کو "غلات" سے نسبت دی ہے (غلات وہ فرقہ ہے جس نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں غلو کیا ہے اور وہ انہیں خدا سمجھتا ہے) حالانکہ فقہ شیعہ میں انہیں ایسے کافروں کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے جن کا کفر مسلّم ہے۔ اس کے باوجود موصوف لکھتے ہیں کہ شیعہ اہل بیت علیہم السلام اور دوسری چیزوں کی پرستش کرتے ہیں۔

یہ مسلّمہ بات ہے کہ اگر مؤلف "المنار" قبل از تحقیق فیصلہ اور بے جا تعصبات سے اجتناب کرتے اور اس بات کی کوشش کرتے کہ شیعہ عقائد کو خود شیعوں سے دریافت کرتے یا ان کی کتابیں پڑھتے ، نہ کہ ان کے دشمنوں کی کتابوں کو اپنا مدرک علم و معلومات قرار دیتے، تو ان کو بخوبی معلوم ہو جاتا کہ اس قسم کی باتیں ان سے منسوب کرنا نہ صرف کذب و بہتان ہے بلکہ مضحکہ خیز اور خندہ آور بھی ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ انہوں نے مذہب شیعہ کی پیدائش کو ایرانیوں کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ ایرانیوں کے شیعہ ہونے سے کئی صدیاں قبل "مذہب تشیع" عراق حجاز اور مصر میں پھیل چکا تھا. مدارک تاریخی اس حقیقت کے زندہ گواہ ہیں[۲]

---

[۱] مصری عالم "طٰہٰ حسین" نے اپنی کتاب "عبداللہ بن سبا" میں اسی بات کو اپنی اس کتاب کا موضوع سخن بنایا ہے کہ یہ شخص کون تھا، چنانچہ انہوں نے اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ایک فرضی شخصیت ہے جسے محض شیعوں کو بدنام کرنے کے لیے تراشا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب "عبداللہ بن سبا" مطبوعہ مصر (مترجم)۔

[۲] علامہ ابوحاتم سہل بن عثمان سجستانی بصری نحوی (وفات ۲۰۵ھ) اپنی کتاب "الزینۃ" کی جلد سوم میں لفظ "شیعہ" کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں :۔

اسلام میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم کی موجودگی میں سب سے پہلے جو نام ظاہر ہوا وہ نام "شیعہ" ہے پہلے یہ چار صحابیوں کا لقب تھا : سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد بن اسود اور عمار یاسر صفین کی جنگ ہونے تک صرف ان چاروں کو لقب "شیعہ" سے پکارا جاتا تھا. جب جنگ صفین برپا ہوئی تو اس نام "شیعہ" نے تمام دوستانِ علی بن ابی طالب میں شہرت حاصل کر لی. تاسیس الشیعہ صفحہ ۲۱ (مترجم)

(۱۱) شیعوں کا ایک بڑا گناہ یہ ہے کہ انہوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قطعی فرمان پر عمل کیا ہے جو اہل سنت کے معتبر ترین مدرکوں میں بھی مذکور ہے اور وہ فرمان یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

میں تمہارے درمیان دو گراں مایہ چیزیں اپنی یادگار کے طور پر چھوڑے جا رہا ہوں، ان سے وابستہ رہنا کبھی بھی گمراہ نہ ہوگے ، خدا کی کتاب اور میری عترت ۔[1]

شیعوں کا قصور یہ ہے کہ انہوں نے مشکلات اسلامی میں اپنی پناہ گاہ ان ہستیوں کو بنایا ہے جو آئین اسلام سے سب سے زیادہ آگاہ تھیں ۔ اور وہ اہل بیت رسول علیہم السلام کی ذوات مقدسہ ہیں ۔ چنانچہ شیعوں نے انہی سے اپنے احکام دین اخذ کیے ہیں ۔

شیعوں کی خطا یہ بھی ہے کہ وہ عقل و منطق کی پیروی کرتے ہوئے قرآن و سنت کے زیر سایہ " اجتہاد " کے دروازہ کو کھلا ہوا سمجھتے ہیں اس طرح سے انہوں نے فقہ اسلامی کو حرکت بخشی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں :

اس امر کی کیا دلیل ہے کہ قرآن و سنت کو سمجھنے کی قوت کو صرف " چار افراد " میں منحصر کر دیا جائے اور ان کے علاوہ باقی تمام افراد کو ان کی پیروی کرنے پر مجبور کیا جائے ؟

کیا قرآنی خطابات کا رُخ ہر زمانے کے ایماندار افراد کی طرف نہیں ہے ؟

کیا اصحاب رسولؐ قرآن اور سنت کو سمجھنے کے لیے کچھ معین اشخاص کی پیروی کرتے تھے ؟

لہٰذا اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم اسلام کو ایک پرانی اور خشک چار دیواری جس کا نام " مذاہب اربعہ " ہے ، میں محصور کر دیں ؟ !

شیعوں کا گناہ یہ بھی ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں :

اصحاب پیغمبرؐ کو دیگر افراد کی طرح ایمان و عمل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے ، ان میں سے جن کا عمل قرآن و سنت کے مطابق ہے وہ اچھے ہیں ( اور ان سے محبت کی جاتے ) اور وہ اصحاب جنہوں نے پیغمبرؐ کے دور میں یا آنحضرتؐ کے وصال کے بعد کتاب و سنت کے خلاف عمل کیا ہے انہیں چھوڑ دینا چاہیئے اور محض لفظ " صحابی " کو فتنہ پروروں کے لیے ایک ڈھال نہ بنایا جائے اور معاویہ جیسے افراد کو محترم نہ سمجھا جائے وہ معاویہ جس نے تمام ضوابط اسلامی کو پیروں تلے روند دیا تھا اور اس نے اس امام وقت پر خروج کیا جسے تمام امت اسلامی کم از کم اس دور میں امام مانتی ہے ، اور اس نے بہت سے بے گناہوں کا خون بہایا تھا ۔ یہی حال کچھ اُن اصحاب کا ہے جو دولت کی طمع میں معاویہ کے طرفدار اور اس بغاوت میں اس کے شریک کار رہے ۔

---

[1] ملاحظہ ہو : صحیح ترمذی ۳/۱۰۰ سنن بیہقی ۱/۱۳ و ۲/۱۴۸ سنن دارمی ۲/۴۳۱ کنز العمال ۱/۱۵۴ و ۱۵۹ طبقات ابن سعد ۲/۲ وکتب دیگر اور صواعق ص ۱۰/۲۲۷ طبع لکھنؤ (مترجم) ۔

ہاں شیعہ اس طرح کے گناہوں کے مرتکب بھی ہیں اور معترف بھی ہیں لیکن ذرا بتلانا کہ شیعوں سے زیادہ مظلوم بھی کوئی ایسی قوم ہے جس کی تاریخ اور زندگی کے درخشاں و پُر وقار پہلوؤں کو تاریک کرکے پیش کیا جائے؟ دروغ و بہتان کا ایک طومار اس کے خلاف باندھ دیا جائے؟ یہاں تک کہ اسے اتنی اجازت بھی نہ ملے کہ وہ اپنی صفائی کے طور پر عام مسلمانوں میں اپنے عقائد کی تبلیغ کرسکے بلکہ یہ کہا جائے کہ اس کے عقائد کو اس کے دشمنوں سے اخذ کیا جائے نہ کہ خود اس سے!

کیا وہ گروہ جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرمان (حدیث ثقلین) پر عمل پیرا ہے (جبکہ دوسروں نے اس پر عمل نہیں کیا)، تفرقہ انداز اور نفاق پرور محسوب ہوگا؟ کیا یہ مناسب ہے کہ یہ گروہ جس راہ پر جارہا ہے اس پر چلنے سے روک دیا جائے تاکہ اتحاد و اتفاق قائم ہوجائے یا ان لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہیئے جو منزل سے بھٹک گئے ہیں؟!

(iii) علوم اسلامی کی تاریخ بتلاتی ہے کہ علوم اسلامی میں بالعموم شیعہ ہی پیشقدم تھے۔ یہاں تک کہ شیعوں کو علوم اسلامی کا موجد اور مورث اعلیٰ سمجھا جاتا ہے[1]

علمائے شیعہ نے جو گرانقدر کتابیں علم تفسیر، تاریخ، حدیث، فقہ، اصول، رجال اور فلسفہ اسلامی میں لکھی ہیں یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے چھپایا جاسکے۔ یہ کتابیں تمام عمومی کتب خانوں میں موجود ہیں جن سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں (وہاں اس سے اہلسنت کے بعض کتب خانے مستثنیٰ ہیں جہاں عام طور پر کتب شیعہ کا داخلہ ممنوع ہے۔ حالانکہ ہم نے صدیوں سے اپنے کتب خانوں میں کتب اہل سنت کے داخلے کی عام اجازت دے رکھی ہے!) اور یہ کتابیں ہمارے دعوے کی زندہ دلیل ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ تمام بیش قیمت کتابیں عظمت اسلامی اور تعلیمات اسلام کو پھیلانے کے لیے لکھی ہیں کیا یہ سب اسلام کے دشمن تھے؟

کیا کوئی ایسا دشمن تمہاری نظر میں ہے جس نے اس قدر دوستی اور محبت کی ہو؟

آیا سوائے مخلص عاشق کے کوئی ایسا شخص ہے جس نے قرآن اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے اتنی اہم خدمات انجام دی ہوں؟

آخر کلام میں ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر واقعاً آپ یہ چاہتے ہیں کہ نفاق اور تفرقہ دور ہوجائے، تو آیئے بجائے تہمت تراشیوں کے، ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اس طرح کی ناروا تہمتیں نہ صرف اتحاد اسلامی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتی ہیں بلکہ وحدتِ اسلامی پر کاری ضرب لگاتی ہیں۔

---

[1] اس امر کے مدارک سے آگاہ ہونے کے لیے ملاحظہ ہو کتاب۔ تاسیس الشیعہ لعلوم الاسلام اور کتاب۔ اصل الشیعہ و اصولہا۔ خوش قسمتی سے دونوں کتابوں کا فارسی ترجمہ ہوچکا ہے (دوسری کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے۔ مترجم)۔

## جزا بیشتر سزا کمتر!

اس کے بعد کی آیت میں اللہ کی رحمت اور اس کی وسیع جزا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس کے نیکوکار بندوں کو دی جائے گی اور پچھلی آیت میں جو تہدید کی گئی ہے اس کی تکمیل اس تشویق سے کی گئی ہے، فرماتا ہے: جس نے بھی کوئی نیک کام کیا اسے دس گنا بدلہ ملے گا (من جآء بالحسنة فله عشر امثالها)۔

اور جس نے بھی بُرا کام کیا اسے اس سے زیادہ سزا نہیں دی جائے گی (ومن جآء بالسیئة فلا یجزی الا مثلها)۔

مزید تاکید کے لیے اس جملے کا بھی اضافہ کیا ہے: ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا، وہ صرف اپنے عمل بد کے برابر سزا پائیں گے (وھم لا یظلمون)۔

یہاں پر یہ سوال ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ بالا میں "حسنة" اور "سیئة" سے کیا مراد ہے؟ آیا اس سے مراد صرف "توحید" اور "شرک" ہے یا اس سے زیادہ وسیع معنی مراد ہیں۔ اس مسئلے میں مفسرین کے مابین گفتگو ہے لیکن آیت کا ظاہر ہر قسم کے نیک عمل، نیک فکر، نیک عقیدہ یا بد عمل، بد فکر، بد عقیدہ کو اپنے دائرہ میں لیے ہوئے ہے کیونکہ "حسنة" و "سیئة" کے معنی کو محدود کرنے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

## چند مزید نکات

۱۔ "جآء بہ" سے مراد:- گزشتہ جملے کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ "جآء بہ" سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے نیک یا بد عمل کو اپنے ہمراہ لائے گا۔ یعنی جب بندہ عدل الٰہی کی عدالت میں آئے گا تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ خالی ہاتھ اور تنہا آئے بلکہ اپنے ساتھ صحیح عقیدہ اور نیک عمل لائے گا یا غلط عقیدہ اور عمل بد کے ساتھ آئے گا۔ یہ ہر حالت میں اس کے ساتھ ہیں، اس سے جدا نہ ہوں گے اور آخرت کی ابدی زندگی میں اس کے ساتھی اور ہمدم ہوں گے۔

قرآن کریم کی دوسری آیات میں بھی یہ تعبیر اسی معنی میں آئی ہے۔ چنانچہ سورۂ ق کی آیت ۳۳ میں ہم پڑھتے ہیں:

من خشی الرحمٰن بالغیب وجآء بقلب منیب۔

بہشت ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا کو ایمان بالغیب کے ذریعے پہچانیں اور اس سے ڈریں، اور توبہ کرنے والا دل جو احساس فرض سے بھرا ہوا ہو بروز حشر اپنے ساتھ لے کر آئیں۔

۲۔ جزا کے مختلف درجے:- مذکورہ آیت میں ہم نے پڑھا کہ "حسنة" کی جزا دس گنا ہے حالانکہ قرآن کی بعض دوسری آیتوں میں صرف "اضعافا کثیرۃ" (بہت زیادہ بڑھ چڑھ کر) پر اکتفا کی گئی ہے (جیسے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۴۵)، نیز بعض دوسری آیتوں میں راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کا بدلہ سات سو ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ بیان کیا گیا ہے جیسے (آیت ۲۶۱ سورہ بقرہ) ایک آیت میں تو اجر و جزا کو اللہ تعالیٰ نے بے حساب فرمایا

ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ۔

وہ لوگ جن کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی ان کو بے حساب اجر دیا جائے گا (سورۂ زمر۔۱۰)

یہ بات واضح ہے کہ ان آیتوں میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ نیکو کاروں کو کم از کم جزا اجر ملے گا وہ دس برابر ہوگا، پھر اس کے بعد اہمیتِ عمل، درجۂ اخلاص، اس عمل کے کرنے میں جو زحمتیں اٹھانا پڑی ہیں اور جو کوششیں اس نیک کام کے کرنے میں کی ہیں ان سب کا لحاظ کیا جائے گا اور اسی اعتبار سے اجر میں اضافہ ہوتا جائے گا یہاں تک کہ بندے کا یہ اجر اتنا بڑھ جائے گا کہ حساب کتاب کی سرحد سے گزر جائے گا اور سوائے خدا کے کسی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ وہ کتنا ہے۔

مثلاً انفاق (راہِ خدا میں مال خرچ کرنا) جس کی اسلام میں بہت اہمیت بیان کی گئی ہے، اس کا اجر عمل خیر کے معمولی اجر (دس گنا) سے بڑھ گیا ہے اور "اضعافاً کثیرہ" یا "سات سو گنا" بلکہ اس سے بھی بڑھ کر قرار دیا گیا ہے، اور "استقامت" (ثباتِ قدمی) کہ جو تمام کامیابیوں اور خوش بختیوں کی جڑ ہے اور کوئی عمل نیک اس کے بغیر پورا نہیں ہو سکے گا، اُن کا اجر و ثواب بے حساب مذکور ہوا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اگر بعض روایات میں نیک اعمال کے لیے اجر و ثواب دس گنا سے زیادہ بیان کیا گیا ہے تو یہ مذکورہ آیت (من جآء بالحسنة فلهٗ عشر امثالها) کے مخالف نہیں ہے۔

اسی طرح سورہ قصص کی آیت ۸۴ میں جو ہم پڑھتے ہیں:

من جآء بالحسنة فلهٗ خير منها۔

جو عمل نیک کرے گا اسے اس سے بہتر صلہ ملے گا۔

یہ آیت بھی مذکورہ بالا آیت سے اختلاف نہیں رکھتی کہ اس میں نسخ کا احتمال پیدا ہو، کیونکہ لفظ "بہتر" کے ایک وسیع معنی ہیں جو (دس گنا) پر بھی صادق آتے ہیں۔

۲۔ **ویسی ہی سزا کا مفہوم:** ممکن ہے بعض افراد یہ خیال کریں کہ ماہِ رمضان کے روزہ کو عمداً ترک کرنے کا کفارہ ساٹھ روزے قرار دیا گیا ہے اور اسی طرح کی دیگر سزائیں جو کئی گنا بڑھ چڑھ کر دنیا و آخرت میں مجرموں کو دی جائیں گی، یہ مذکورہ بالا آیت (من جآء بالسيئة فلا يجزیٰ الا مثلها) کے منافی ہیں۔

لیکن اگر ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو اس بات کا بھی جواب مل جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

مذکورہ آیت (من جآء بالسيئة ...۔۔۔) میں جس مساوات (برابری) کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد مساواتِ عددی نہیں ہے بایں معنی کہ اگر ایک گناہ کیا ہے تو ایک تازیانہ مارا جائے، دو گناہ ہوں تو دو تازیانے، بلکہ کیفیتِ عمل کا بھی لحاظ کرنا چاہیئے۔ ماہِ رمضان کے ایک روزہ کو ترک کر دینا جبکہ اس کی اتنی اہمیت بیان کی

گئی ہے، اس کی سزا صرف ایک روز کا روزہ نہیں ہوگا، بلکہ روزہ چھوڑنے والا اتنے پے در پے روزے رکھے کہ وہ ماہ مبارک رمضان کے روزے کے برابر ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ ہم بعض احادیث میں پڑھتے ہیں کہ ماہ رمضان میں گناہ کرنے کا عذاب بھی عام ایام سے زیادہ ہے جس طرح کہ ثواب زیادہ ہے، یہاں تک کہ ماہ رمضان میں ثواب ختم قرآن، دوسرے ایام میں ختم کرنے سے ستر گنا زیادہ ہے۔

۴۔ **نہایت لطف و کرم :-** ایک اور جالب نظر نکتہ یہ ہے کہ آیہ بالا خدا وند کریم کے نہایت لطف و کرم کو بیان کر رہی ہے جو اس نے اس بندۂ ناچیز کے حال پر کیا ہے۔

کیا کوئی ایسی ہستی ہے جو کام کرنے کے تمام آلات و اوزار انسان کو دے، ہر طرح کی آگاہی و علم بھی اسے عطا کرے، معصوم رہبر بھی اس کی ہدایت کے لیے بھیجے، تاکہ انسان خدا داد قوت و طاقت سے اور اسی کے فرستادہ رہبروں کی رہنمائی سے کوئی نیک کام انجام دے، پھر اس کے بعد اس عمل کا دس گنا بدلہ بھی عطا کرے لیکن اس سے جو لغزشیں اور خطائیں ہوں ان پر جو سزا دے وہ برابر کی ہو، کوئی اضافہ نہ ہو، علاوہ بریں اس کے لیے راہ توبہ اور عذر خواہی بھی ہمیشہ کے لیے کھلی ہوئی ہو۔ یعنی اگر توبہ کرے تو پھر کوئی سزا نہ ملے!

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ صادق مصدق (یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا :-

ان اللّٰہ تعالٰی قال الحسنة عشرا و ازید والسیئة واحدة او اغفر فالویل لمن غلبت آحاده اعشاره۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ نیک کاموں کا دس گنا بدلہ دوں گا یا اس سے زیادہ، اور بُرے کام کا ایک ہی بدلہ دوں گا یا بخش دوں گا، پس وائے ہو اس پر جس کی اکائیاں اس کی دہائیوں پر غالب آجائیں (یعنی اس کے گناہ اطاعتوں سے سوا ہو جائیں)[1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۴ ص ۳۹۰

(۱۶۱) قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○

(۱۶۲) قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ

(۱۶۳) لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○

# ترجمہ

(۱۶۱) (اے ہمارے نبی) کہہ دیجئے: میرے رب نے مجھے راہِ راست کی ہدایت کی ہے (وہ راہِ راست جو) ایک مضبوط اور ثابت رہنے والا آئین ہے یہ اس ابراہیم کا آئین ہے جس نے اپنے ماحول کے تمام خرافاتی آئینوں سے روگردانی کی تھی اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔

(۱۶۲) کہہ دیجئے: میری نماز، میری تمام عبادتیں، میری زندگی، میری موت' یہ سب تمام جہانوں کے پالنے والے کے لیے ہے۔

(۱۶۳) اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی طرف سے مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا مسلمان ہوں۔

# تفسیر

## یہ میری صراط مستقیم ہے

یہ چند آیات، نیز دوسری آیتیں جن کا ہم اس کے بعد مطالعہ کریں گے اور جن پر سورہ "انعام" کا اختتام ہوتا ہے، ان میں فی الحقیقت ان تمام بحثوں کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے جو شرک اور بت پرستی کے بارے میں اس سورہ میں کی گئی ہیں۔ دراصل یہ سورہ توحید کی دعوت اور شرک کے مقابلے سے شروع ہوئی ہے اور اسی بحث میں اس کا اختتام بھی کیا گیا ہے۔

خدا پہلے مشرکوں اور بُت پرستوں کے عقائد فاسدہ اور عقل و منطق سے دور دعووں کے مقابلے میں اپنے رسولؐ کو یہ حکم دیتا ہے کہ: (اے رسولؐ!) کہہ دیجئے کہ میرے پروردگار نے مجھے راہِ راست، جو نزدیک ترین راہ ہے، کی ہدایت کی ہے (یہ راہِ راست وہی راستہ ہے جس میں توحید و یگانہ پرستی کی دعوت اور آئین شرک و بُت پرستی کے مٹانے کا حکم دیا گیا ہے)۔ (قل اننی هدانی ربی الی صراط مستقیم)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ آیت اور اس سے قبل کی بہت سی آیتیں نیز بعد کی آیتیں لفظ "قل" (یعنی کہہ دیجئے) سے شروع ہوئی ہیں۔ شاید قرآن کریم میں کوئی ایسی دوسری سورہ نہیں ہے جس میں اس لفظ کی اتنی زیادہ تکرار کی گئی ہو جتنی اس میں کی گئی ہے۔ اس سے دراصل ان شدید نزاعوں کا اندازہ ہوتا ہے جو پیغمبرؐ اسلام اور مشرکوں کے درمیان وقوع پذیر ہوتے تھے۔

نیز اس تکرار لفظ (قُل) نے کافروں کے لیے ہر بہانہ تراشی کی راہ بھی بند کر دی، کیونکہ اس لفظ (قُل) کے بار بار دہرانے سے منشاء یہ ہے کہ یہ تمام باتیں بحکم خداوندی ہیں، اس میں پیغمبرؐ کی شخصی رائے کو کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ امر بھی واضح ہے کہ اس آیت میں اور اسی طرح کی دوسری آیتوں میں اس لفظ کا ذکر اس لیے ہے کہ اصالتِ قرآن محفوظ رہے اور وہ الفاظ بعینہٖ باقی رہیں جو پیغمبرؐ پر وحی کی صورت میں نازل ہوئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو وحی نازل ہوتی تھی اس کے الفاظ میں آپ کسی قسم کا تغیّر و تبدّل نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ لفظ "قل" جو آپ سے اللہ کے خطاب کو ظاہر کرتا ہے، اس تک کو باقی رکھتے تھے۔

اس کے بعد اس "صراط مستقیم" کی اس آیت میں اور بعد کی دو آیتوں میں توضیح کی گئی ہے۔ پہلے فرماتا ہے: یہ ایک سیدھا قانون ہے جو بہت سچا اور درست ہے، ابدی (ہمیشہ کے لیے) ہے، دین و دنیا، جسم و جان کے جملہ امور کا ذمہ دار ہے (دیناً قیماً)[1]

---

[1] "قیماً" کے معنی سچائی اور استقامت کے ہیں، اور ممکن ہے کہ مضبوطی اور ہمیشگی کے معنی میں ہو، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ امور دین و دنیا کے کفیل کے معنی میں ہو (اس سلسلہ آیت کے ترجمہ میں تینوں معانی کی رعایت کی گئی ہے)۔

چونکہ عرب حضرت ابراہیمؑ سے اپنا خاص ربط ظاہر کرتے تھے . بلکہ یہاں تک کہ اپنے قانون کو بھی حضرت ابراہیمؑ کا قانون کہتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس بات کا اضافہ کیا کہ : حضرت ابراہیمؑ کا حقیقی قانون یہی (اسلام) ہے جس کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں ، نہ کہ وہ قانون جس سے تم وابستہ ہو ( ملة ابراهيم ) .

وہی ابراہیمؑ جس نے اپنے زمانے اور ماحول کے خرافاتی آئین سے رُوگردانی کی اور جس نے حق یعنی آئین توحید پرستی کو قبول کیا (حنیفا) .

. حنیف . لغت میں اس شخص یا چیز کو کہتے ہیں جو کسی جانب میلان پیدا کرے لیکن اصطلاح قرآنی میں اسے کہتے ہیں جو باطل سے روگردانی کر کے آئین حق کی طرف متوجہ ہو جائے .

یہ تعبیر گویا ان مشرکوں کا جواب ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ پیغمبرؐ نے عربوں کے آباؤ اجداد کے مذہب بُت پرستی کی مخالفت کی تھی . پیغمبرؐ نے ان کے جواب میں فرمایا : مَیں نے جو تمہارے پرانے طریقے کو توڑا ہے اور تمہارے خرافاتی عقیدوں کو جو ٹھکرایا ہے یہ میرا ہی اقدام نہیں ہے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو سب کے لیے قابلِ احترام ہستی ہیں ، انہوں نے بھی ایسا کیا تھا .

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے : وہ کسی وقت بھی مشرکوں اور بُت پرستوں کے گروہ میں سے نہ تھے ( وما كان من المشركين ) .

بلکہ وہ تو ایک بُت شکن انسان تھے اور آئین شرک کو توڑنے والے تھے .

جملہ . حنيفا وما كان من المشركين . کی آیات قرآن میں تکرار ، کبھی . مسلما . کے ساتھ اور کبھی اس کے بغیر اسی مسئلے کی تاکید کے لیے ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ذات مقدس ، جس پر زمانہ جاہلیت کے عرب فخر کیا کرتے تھے ، ان کے غلط عقائد و اعمال سے منزہ تھے [1]

بعد کی آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے : نہ صرف عقیدہ کی رُو سے مَیں موحد اور یکتا پرست ہوں ، بلکہ میرا ہر عمل بھی اسی کے لیے ہے . میری نماز ، میری تمام عبادتیں ، یہاں تک کہ میری موت و حیات سب پروردگار عالم کے لیے ہے . اسی کے لیے زندہ ہوں اور اسی کے لیے جان دوں گا . اسی کے راستے میں جو کچھ بھی میرے پاس ہے قربان کر دوں گا : میری امیدوں کی آماجگاہ ، میرے عشق کی منزل ، میری ہستی کا مقصد سب کچھ وہی ہے ( قل ان صلاتی و نسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین ) .

. نسک . کے اصلی معنی عبادت کے ہیں ، اسی بنا پر عبادت کرنے والے کو . ناسک . کہتے ہیں لیکن یہ لفظ عام طور سے اعمال حج کے لیے استعمال ہوتا ہے . مناسک حج ، اسی حوالے سے کہا جاتا ہے . بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ . نسک . کے معنی یہاں پر شاید قربانی کے ہوں لیکن ظاہر یہ ہے کہ اس لفظ کے مفہوم میں ہر قسم کی عبادت شامل ہے کیونکہ پہلے نماز (صلوٰۃ) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو تمام عبادتوں میں اہمیت رکھتی ہے اس

[1] سورہ بقرہ آیت ۱۳۵ ، سورہ آلِ عمران آیت ۶۷ ، ۹۵ .

کے بعد تمام عبادتوں کا بطور عموم ذکر ہوا ہے، مطلب یہ ہے کہ میری نماز بلکہ تمام عبادتیں، میری زندگی اور موت سب کچھ اس (اللہ) کے لیے ہے۔

بعد والی آیت میں مزید تاکید کے لیے اور ہر طرح کے شرک اور بُت پرستی کے ابطال کے لیے اضافہ فرماتا ہے "وہ ایسا پروردگار ہے کہ اس کا نہ کوئی شبیہ (مثل) ہے اور نہ شریک ہے" (لا شریک لہ)۔

آخر میں فرماتا ہے: "اس بات کا مجھ کو حکم دیا گیا ہے، اور میں پہلا مسلمان ہوں" (وبذالك امرت وانا اوّل المسلمین)۔

## پیغمبرؐ کے "اوّل مسلمین" ہونے کے کیا معنی ہیں؟

آیہ مذکورہ بالا میں پیغمبرؐ کو "اوّل المسلمین" (پہلا مسلمان) کہا گیا ہے۔ اس کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ اس کا کیا مطلب ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ اگر "اسلام" کا مطلب اس کے وسیع معنی میں ہو تو یہ معنی تمام آسمانی ادیان پر محیط ہے۔ اسی وجہ سے لفظ "مسلم" انبیائے ماسبق پر بھی بولا گیا ہے۔ حضرت نوحؑ کے لیے ہم پڑھتے ہیں:

وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

"مجھے حکم دیا گیا کہ میں مسلمانوں میں سے ہو جاؤں" (یونس - ۷۲)

حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ کے بارے میں بھی ہے:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ

خداوندا ہم کو اپنا مسلمان بنا دے (بقرہ - ۱۲۸)

اور حضرت یوسفؑ کے لیے آیا ہے:

"تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا"

"مجھے مسلمان ہونے کی حالت میں موت دے" (یوسف - ۱۰۱)

اسی طرح دیگر انبیاء کے لیے بھی آیا ہے۔

یقیناً "مسلم" کے معنی اس شخص کے ہیں جو فرمان الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ یہ معنی تمام انبیاء الٰہی اور ان کی امتوں کے مومن افراد پر صادق آتے ہیں۔ اس صورت میں پیغمبرؐ کے اوّل مسلم ہونے کے معنی یا تو ان کے اسلام کی اہمیت و کیفیت کے لحاظ سے ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسلام و تسلیم کا درجہ سب سے بلند تھا، یا یہ معنی ہوں گے کہ آپؐ اس امت کے وہ پہلے فرد تھے جس نے آئین قرآن و اسلام کو قبول کیا۔[1]

---

[1] نظر حقیر میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے "اوّل مسلم" ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں، کیونکہ یہ جب صحیح ہوگا جب آپؐ وقت ولادت یا اس کے بعد اسلام سے خالی ہوں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب آپؐ پیدا ہوئے اس وقت نہ صرف مسلمان تھے بلکہ نبی بھی تھے کیونکہ ارشاد پیغمبرؐ ہے۔ (باقی صفحہ اگلے پر)

بعض روایات میں بھی وارد ہوا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپؐ وہ پہلے شخص ہیں جس نے عالم ارواح میں، جبکہ پروردگارِ عالم نے اپنی طرف بلایا اور اپنی الوہیت کے متعلق سوال کیا تو مثبت جواب دیا۔[1]

بہر حال آیت مذکورہ بالا روح اسلام اور حقیقت تعلیمات اسلامی کو واضح کر رہی ہے۔ یہ آیت دعوت ہے صراط مستقیم کی طرف، حضرت ابراہیمؑ کے آئینِ بُت شکنی کی جانب اور ہر قسم کے شرک اور دوگانہ و چندگانہ کی نفی کی طرف۔ یہ عقیدہ اور ایمان کی رُو سے تھا۔

لیکن از روئے عمل، تو یہ آیت دعوت ہے اخلاص و خلوصِ نیت کی طرف اور اس کی طرف کہ بندے کو چاہیئے کہ اپنا ہر عمل خدائے وحدہٗ لا شریک کے لیے بجا لائے۔ اس کا زندہ رہنا اور مرنا اس کے لیے ہو، جس چیز کو چاہے اس کے لیے چاہے، اپنے دل کو اسی کی محبت کے ساتھ باندھے اور اس کے غیر کی محبت سے الگ کر دے، اس کے ساتھ عشق کرے اور اس کے غیر سے بیزاری اختیار کرے۔

غور کرنا چاہیئے کہ کتنا فرق ہے اسلام کی اس کھُلی ہوئی تعلیم میں اور ان مسلمان نما انسانوں کے اعمال میں جو بجز تظاہر و بلاد نمائی کے اور کوئی بات سمجھتے ہی نہ جانتے ہیں، ہر مرحلہ میں بس ظاہر کے متعلق سوچتے ہیں، باطن و جوہر کی جانب انہیں کوئی توجہ نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے ان کی زندگی، ان کی جماعت بندیاں، ان کا فخر ان کی آزادی کے دعوے بھی سوائے ایک خول کے اور کچھ نہیں ہے۔

---

بقیہ: پچھلے صفحہ کا حاشیہ:

"کنت نبیا و آدم بین الماء و الطین"

میں اس وقت نبی تھا جب آدمؑ آب و گل کے درمیان کروٹ لے رہے تھے۔

یہ حدیث اس مطلب پر دلالت کرتی ہے، جو سنی شیعہ دونوں کی کتب میں محفوظ ہے اس کے علاوہ عالمِ ذر میں بھی آپؐ ہی نے سب سے پہلے وحدانیت کی تصدیق کی تھی جیسا کہ آگے آنے والی روایت سے ظاہر ہوتا ہے، لہٰذا اس معنی سے بھی آپؐ "اوّل مسلم" ہیں۔ (مترجم)

[1] تفسیر صافی آیہ مذکورہ کے ذیل میں۔

(۱۶۴) قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِىْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَىْءٍ ۚ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى ۚ ثُمَّ إِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

# ترجمہ

(۱۶۴) (اے ہمارے رسولؐ!) کہہ دو کہ کیا مَیں اللہ کے علاوہ کوئی اور پروردگار مان لوں جبکہ وہ تمام چیزوں کا پروردگار ہے اور کوئی شخص عمل بجا نہیں لاتا ہے سوائے اس کے کہ جو کچھ کرتا ہے اپنے لیے کرتا ہے، اور کوئی گنہگار دوسرے کے گناہ اپنے ذمہ نہیں لے گا۔ اس کے بعد تمہاری واپسی تمہارے پروردگار کی جانب ہے پس وہ تمہیں اس چیز کی خبر دے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔

# تفسیر

اس سورہ میں توحید اور شرک سے مقابلہ کرنے کے بارے میں جو پے در پے تاکیدیں اور طرح طرح کے استدلال بیان کیے گئے ہیں وہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

اس آیت میں ایک اور طریقے سے مشرکوں کے استدلال پر ضرب لگائی گئی ہے، فرماتا ہے، ان سے کہو اور ان سے دریافت کرو کہ آیا یہ مناسب ہے کہ خدائے یگانہ کے علاوہ کسی اور کو اپنا پروردگار مانوں جبکہ وہ تمام چیزوں کا مالک اور پروردگار ہے اور اس کا حکم و فرمان اس جہان کے ذرہ ذرہ پر کار فرما ہے (قل اغیر اللہ ابغی ربا وھو رب کل شیئ)۔

اس کے بعد ان مشرکوں کو جواب دیتا ہے جن میں سے کچھ لوگ آنحضرت کے پاس آئے تھے اور انہوں نے یہ کہا :

- اتبعوا علینا وزرک ان کان خطا :

- اے محمدؐ! آپ ہماری پیروی کریں اگر یہ غلط بھی ہو تب بھی آپ کا گناہ ہم اپنی گردن پر لیتے ہیں۔

اللہ فرماتا ہے کہ اے نبی ان سے کہہ دو :۔

کوئی شخص سوائے اپنے کسی کے لیے کوئی عمل بجا نہیں لاتا اور نہ کوئی گنہگار دوسرے کے گناہ کا بار اپنے دوش پر اٹھاتا ہے ( ولا تکسب کل نفس الا علیھا ولا تزر وازرۃ وزر اخرٰی )۔

اور آخرکار تم سب خدا کی طرف لوٹو گے ، وہ تمہیں اس چیز کے بارے میں مطلع کرے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے ( ثم الی ربکم مرجعکم فینبئکم بما کنتم فیہ تختلفون )۔

## (۲) دو اہم نکات

دوسروں کے گناہ اپنے کندھے لینا :۔ ۱۔ ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ آیت مذکورہ بالا میں جو دو مسلم الثبوت اور منطقی قانون بیان کیے گئے ہیں ، جو تمام مذہبوں کے نزدیک بھی طے شدہ ہیں ( یعنی کوئی شخص سوائے اپنے کسی کے لیے کار آخرت نہیں کرتا اور کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بار اپنے کاندھے پر نہیں اٹھاتا ) یہ دونوں اصول قرآن کریم کی بعض دیگر آیات اور بعض روایات سے مطابقت نہیں رکھتے ۔ مثلاً سورہ نحل کی آیت ۲۵ میں ہے :۔

لِيَحْمِلُوٓا۟ أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ ٱلَّذِينَ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ

وہ لوگ بروز قیامت اپنے گناہوں کے بھاری بوجھ کو اپنے کاندھے پر اٹھائیں گے ، اسی طرح ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے جنہیں انہوں نے اپنے جہل سے گمراہ کیا ۔

اگر یہ صحیح ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا بار گناہ نہیں اٹھائے گا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ گمراہ کرنے والے ان لوگوں کا بار گناہ اٹھائیں گے جنہیں انہوں نے گمراہ کیا ہے ۔

اس کے علاوہ احادیث ۔ سنت حسنہ ۔ و ۔ سنت سیئہ ۔ بھی آیت زیر بحث سے مطابقت نہیں رکھتیں کیونکہ شیعہ سنی دونوں طریقوں سے بعض روایات وارد ہوئی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا :۔

اگر کسی شخص نے اچھی سنت قائم کی اسے ان تمام لوگوں کا اجر دیا جائے گا جو اس پر چلیں گے ( بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے ثواب میں سے کچھ کم کیا جائے ) ، اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی سنت جاری کی اس کے نام ان لوگوں کا گناہ لکھا جائے گا جو اس پر عمل کریں گے ( بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے گناہوں میں سے کچھ کم کیا جائے گا )۔

روایت کا متن یہ ہے:۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آ ۔ وسلم، من سن سنۃ حسنۃ کان لہ اجر من عمل بھا من غیر ان ینقص من اجورھم شی و من سن سنۃ سیئۃ کان علیہ وزر من عمل بھا من غیر ان ینقص من اوزارھم شیئ ۔

لیکن اس شبہ کا جواب واضح ہے، کیونکہ آیہ مورد بحث کہتی ہے کہ بغیر کسی وجہ کے اور بغیر اس کے کہ دونوں گناہوں میں آپس میں کوئی ربط ہو ایک شخص کا گناہ دوسرے شخص کے ذمہ نہیں لگایا جائے گا، لیکن وہ آیات و روایات جن کی طرف اشارہ کیا گیا ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی انسان دوسرے انسان کے عمل نیک یا عمل بد کی داغ بیل ڈالے گا، یا یوں کہنا چاہیئے کہ دوسرے کے عمل میں۔ سببی۔ طور سے شریک ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس عمل کے نتائج خوب و بد میں بھی شریک ہے کیونکہ وہ عمل اس کا عمل متصور ہوگا، کیونکہ اس نے اس عمل کی بنیاد رکھی ہے ۔

**۲۔ کیا دوسروں کے اعمال نیک ہمارے لیے مفید ہوسکتے ہیں؟:۔** دوسرا خیال آیہ مورد بحث سے یہ آسکتا ہے کہ یہ آیت کہتی ہے کہ ہر شخص کا عمل صرف اس کے لیے فائدہ بخش ہوگا، اس بنا پر وہ کار ہائے خیر جو کسی کی نیابت میں کیے جاتے ہیں یا اموات کے لیے جو ثواب ہدیہ کیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات زندہ شخص کے لیے بھی ثواب کا ہدیہ کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ دوسرے شخص کے لیے مفید ہو، حالانکہ کثیر روایات میں شیعہ اور سنی دونوں طریقوں سے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آئمہ طاہرین علیہم السلام سے وارد ہوا ہے کہ اس طرح کے اعمال مفید و سود مند ہوتے ہیں، نہ صرف اولاد کا عمل والدین کیلئے بلکہ دوسروں کے لیے بھی فائدہ بخش ہیں ۔

علاوہ بریں، ہمیں معلوم ہے کہ پاداش عمل کا تعلق ان اثرات سے ہے جو کسی کار خیر کے کرنے کی وجہ سے اس شخص کی روح و جان پر مرتب ہوتے ہیں، جو اس کی معنوی ترقی میں مؤثر ہوتے ہیں، اس کے برخلاف وہ شخص جس نے کوئی عمل خیر انجام نہیں دیا، حتیٰ کہ اس کے ابتدائی امر میں بھی شریک نہیں ہوا، کیسے ممکن ہے کہ وہ یہ روحانی و معنوی اثرات حاصل کرسکے؟

بعض لوگ یہ اعتراض بڑی آب و تاب سے بیان کرتے ہیں۔ نہ صرف عام افراد بلکہ مؤلفین اور مفسرین بھی اس اعتراض سے متاثر نظر آتے ہیں جیسے تفسیر۔ المنار۔ لکھنے والے جس کے نتیجے میں بہت سی مسلم الثبوت احادیث انہوں نے نذر طاق نسیاں کردی ہیں۔ لیکن اگر دو نکتوں کی طرف توجہ کی جائے تو ایسے اعتراضات کا جواب مل جاتا ہے، اور وہ یہ ہیں:۔

یہ صحیح ہے کہ ہر شخص کا عمل نیک اس کی معنوی ترقی کا سبب بنتا ہے، اور اس کا فلسفہ، نتیجہ اور اثر واقعی ہوگا وہ اس کے کرنے والے کی طرف عائد ہوگا، جیسا کہ ورزشی حرکات۔ یا تعلیم و تربیت کا نتیجہ۔ قوت اور اخلاقی نشو و نما کی صورت میں اس کے جسم اور روح پر ہوتا ہے ۔

لیکن جس وقت کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے لیے کوئی نیک کام بجا لاتا ہے ۔ وہ یقیناً کسی ایسی خصوصیت یا نیک صفت کی وجہ سے ہوتا ہے جو اس میں ہوتی ہے ، یا تو وہ ایک اچھا مربی تھا یا ایک اچھا شاگرد تھا یا وہ ایک باصفا دوست تھا یا وہ ایک باوفا ہمسایہ تھا یا وہ ایک خدمت کرنے والا عالم تھا اور یا ایک مومن حقیقی ۔ ہر صورت میں اس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی روشنی کا پہلو ضرور پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے دوسروں کی توجہ اس کی جانب مبذول ہوئی اور انہوں نے اس کے لیے اعمال خیر انجام دیئے ۔ اس بنا پر اس شخص نے اپنی اس خصوصیت ، نمایاں صفت اور اپنی زندگی کے اس درخشاں پہلو کا بدلہ پایا ہے اور اس طرح سے بالعموم دوسرے افراد کا عمل خیر اس کے لیے بھی اس کے کسی عمل خیر یا نیت نیک کے نتیجے میں واقع ہوا ہے ۔ جو فی الحقیقت خود اس کے عمل کا ایک پر تو ہے ۔

خداوند عالم اپنے بندوں کو جو پاداش دیتا ہے وہ دو طرح کی ہوتی ہے :

ایک وہ پاداش جو ان کے روحانی ارتقاء اور ان کی اخلاقی شائستگی کے مطابق ہوتی ہے ۔ یعنی ان کے اعمال نیک کی وجہ سے ان کی روح و جان اس بلندی پر پہنچ جاتی ہے کہ انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ بہتر و بالا جہانوں میں زندگی بسر کریں اور اپنے ان پروں کے ذریعے جو انہوں نے اپنے نیک عقیدے اور نیک اعمال کے ذریعے حاصل کیے ہیں ، آسمان سعادت کی بلندیوں میں پرواز کریں ۔ یہ بات طے ہے کہ اس طرح کے آثار و نتائج اسی عمل کے بجا لانے والے کے ساتھ مخصوص و معین ہیں اور یہ اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں کسی دوسرے کو بخش دیا جائے ۔

لیکن چونکہ ہر عمل نیک فرمان خدا کی اطاعت کے نتیجے میں واقع ہوتا ہے اور اطاعت کرنے والا شخص اپنی اطاعت کے مقابلے میں جزا کا مستحق ہوتا ہے لہذا اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی اس جزا اور انعام کو اپنی رضامندی سے کسی دوسرے کو بخش دے ۔

اس کی ایک مثال بالکل اس طرح سے متصور ہو سکتی ہے مثلاً ایک استاد کسی اہم اور تعمیری شعبۂ تعلیم میں کسی یونیورسٹی میں درس دیتا ہے ، بلاشبہ وہ اپنی اس تدریس کے نتیجے میں دو طرح کے فائدے حاصل کرتا ہے ۔ ایک تو یہ کہ وہ روزانہ تدریس کرنے کی وجہ سے اپنے فن میں کامل سے کامل تر ہوتا جاتا ہے ۔ دوسرے یہ کہ وہ اس یونیورسٹی سے تنخواہ بھی پاتا ہے پہلا فائدہ وہ یقیناً کسی دوسرے کو نہیں دے سکتا کیونکہ وہ اسی کی ذات سے مخصوص ہے ۔ لیکن دوسرا فائدہ وہ جسے چاہے بخش دے اسے یقیناً اس بات کا اختیار ہے ۔

کسی عمل کا ثواب بھی کسی مردہ یا زندہ شخص کو ہدیہ کرنا اسی طرح سے ہے ۔ اس طرح ہر طرح کا شک و شبہ جو اس قسم کی احادیث کے بارے میں ہے دور ہو جاتا ہے ۔

تاہم اس بات کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ اس طرح کے ثواب جو بعض افراد کو دیئے جاتے ہیں ان میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ یہ ان کی کامل سعادت کا سبب بن سکیں ۔ بلکہ ان کا اثر تھوڑا ہوتا ہے کیونکہ نجات انسانی کا اصلی سبب خود اس کا ایمان و عمل ہے ۔

(۱۶۵) وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ڮ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

## ترجمہ

(۱۶۵) وہ (خدا) وہی ہے جس نے تمہیں زمین پر جانشین (اور اپنا نمائندہ) بنایا اور بعض افراد کو دوسرے افراد پر مرتبوں کی رُو سے برتری عطا کی، تاکہ تمہیں ان چیزوں سے جو تمہارے اختیار میں دی ہیں، آزمائے۔ یقیناً تمہارا پروردگار بہت تیز حساب کرنے والا، بخشنے والا اور مہربان ہے (جو لوگ اپنے امتحان میں ناکامیاب ہوں گے ان کا حساب، کتاب جلد کرے گا اور جن لوگوں نے راہ حق پر قدم اٹھایا ہے ان کے حق میں مہربان ہوگا)۔

## تفسیر

اس آیہ کریمہ میں جو سورۂ انعام کی آخری آیت ہے مقام انسانی کی اہمیت اور جہانِ ہستی میں اس کی حیثیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تاکہ ان گزشتہ بحثوں کی تکمیل ہو جائے جن میں توحید کے ستونوں کو استوار کیا گیا ہے اور مسلک شرک و بت پرستی سے مقابلہ کیا گیا ہے، یعنی انسان بہ حیثیت اشرف المخلوقات اپنی حقیقی قدر و قیمت پہچان لے تاکہ پتھر، لکڑی اور دیگر طرح طرح کے بتوں کے سامنے اپنی پیشانی نہ جھکائے اور ان کا بندہ نہ بنے بلکہ ان کا امیر بنے اور ان پر حکومت کرے۔

لہٰذا اس آیت کے پہلے جملے میں فرماتا ہے: وہ خدا وہ ہے جس نے تمہیں زمین پر جانشین (اور اپنا

نمائندہ) بنایا ہے (وھو الذی جعلکم خلآئف الارض) [1]

وہ انسان، جو روئے زمین پر خدا کا نمائندہ ہے[2]، جس کے ہاتھ میں اس کرۂ زمین کی تمام قوتیں اور خزانے سونپ دیئے گئے ہیں اور خدا کی طرف سے تمام موجودات پر اس کی حکومت کا فرمان صادر ہوا ہے، اس کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے کو اتنا گرا دے کہ جمادات سے بھی پست ہو جائے اور انہیں سجدہ کرنے لگے۔

اس کے بعد خدا اس امر کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ روحانی اور جسمانی لحاظ سے انسانوں کی صلاحیتیں مختلف ہیں اور یہ کہ اس اختلاف کی کیا مصلحت ہے، فرماتا ہے: تم میں سے بعض کو بعض پر برتری دی تاکہ ان قدرتی عنایتوں اور سہولتوں کی وجہ سے جو اس نے تمہیں عطا کی ہیں وہ تمہیں آزمائے (ورفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فی ما آتاکم)۔

اس آیت کے آخر میں یہ کہہ کر کہ ہر انسان کو خوش قسمتی اور بدبختی کے راستے کے انتخاب میں اختیار دیا گیا ہے، ان آزمائشوں کا نتیجہ اس طرح بیان فرمایا ہے: تمہارا پروردگار ان لوگوں کے لیے جو ان آزمائشوں سے

---

[1] جیسا کہ راغب اصفہانی نے اپنی کتاب "مفردات" میں لکھا ہے کہ "خلائف" "خلیفہ" کی جمع ہے اور "خلفاء" "خلیف" کی جمع ہے اور دونوں کے معنی نمائندہ اور جانشین کے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "خلیفہ" میں "ۃ" ہے وہ مبالغہ کے لیے ہے بعض دیگر اہل لغت نے "خلائف" کو "خلیفہ" اور "خلیف" دونوں کی جمع مانا ہے۔

[2] یہاں پر لفظ "خلائف" کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ ایک قول تو وہی ہے جو اوپر متن میں گزرا ہے یعنی اللہ نے عام انسانوں کو زمین پر اپنا نمائندہ (خلیفہ) بنایا ہے۔ لیکن فقیر حقیر میں یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ "خلیفۃ اللہ" غیر معصوم کیسے ہو سکتا ہے؟ حضرت آدم کے لیے فرمایا۔ "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" حضرت داؤد کے لیے فرمایا گیا۔ "یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض" اسی طرح سارے انبیاء اللہ کے خلیفہ تھے اور معصوم تھے۔ اگر عام بشر کو اللہ کا خلیفہ مان لیا جائے تو نبی اور غیر نبی میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ پھر اگر تمام بشر سب کے سب خلیفہ ہو جائیں تو ان کی حکومت کس پر ہوگی؟ کیا حیوانوں، درختوں اور پتھروں پر؟ حالانکہ یہ چیزیں انسان کی کما حقہ مطیع نہیں ہیں۔

دوسرا قول (جو قواعد تحقیق سے مطابقت رکھتا ہے) یہ ہے کہ "خلائف الارض" سے مراد یہ ہے کہ ہر آئندہ انسان پچھلے انسان کا، اور ہر آنے والی قوم گزشتہ قوم کی خلیفہ ہے، کیونکہ "خلف" کے اصلی معنی "پیچھے" کے ہیں۔ علامہ طبرسیؒ اپنی مشہور تفسیر "مجمع البیان" میں اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں،

"معناہ ان اھل کل عصر یخلف اھل العصر الذی قبلہ کلما مضی قرن خلفھم قرن یجری ذلک علی النظام والاتساق حتی تقوم الساعۃ وھذا لا یکون الا من عالم مدبر:

یعنی ہر عصر کے لوگ گزشتہ اہل عصر کے پیچھے آتے ہیں، جب ایک صدی گزر جاتی ہے دوسری صدی آ جاتی ہے، یہ عمل بڑی خوش اسلوبی سے منظم طریقے سے جاری و ساری ہے اور ایسا نہیں ہو سکتا الا یہ کہ اس نظام کے پس پردہ ایک عالم اور مدبر (انتظام کرنے والی) ہستی موجود ہو۔

نیز ایسا ہی تفسیر صافی میں بھی ہے۔ (مترجم)

سیاہ رو اور ناکام نکلیں گے سریع العقاب (جلدی سزا دینے والا) ہے اور ان لوگوں کے لیے جو اپنی غلطیوں کی اصلاح میں لگے رہتے ہیں، بخشنے والا اور مہربان ہے (ان ربک سریع العقاب وانہ لغفور رحیم)۔

## انسانوں میں فرق — اور عدالت کے تقاضے

اس میں کوئی شک و شبہ کی بات نہیں کہ انسانوں کے درمیان کچھ ایسے درجاتی اختلاف بھی موجود ہیں جو انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں کیونکہ انسانوں نے دوسرے انسانوں پر ستم روا رکھا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ بے حساب ثروت کے مالک ہیں جبکہ کچھ لوگ خاک نشین ہیں، کچھ لوگ ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے جاہل اور بے علم رہ گئے ہیں، جبکہ دوسرے لوگ ذرائع ہونے کی وجہ سے علوم کے آخری درجوں پر فائز ہیں۔ اسی طرح ایک طبقہ وہ ہے جو خوراک کی کمی کے باعث اور حفظانِ صحت کے لوازم نہ ہونے کی وجہ سے علیل و بیمار نظر آتا ہے، جبکہ اس کے برخلاف ایک طبقہ وہ ہے جس کے پاس ہر طرح کے وسائل موجود ہیں اس لیے وہ تندرستی اور سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔

اس طرح کے فرق، دولت و فقر، علم و جہل، تندرستی اور بیماری زیادہ تر استعمار و استحصال، دوسروں کو غلام بنانے اور آشکار و پنہاں ظلم کی پیداوار ہیں۔

یہ بات مسلّم ہے کہ اس طرح کے اختلافات کو خدا کے ذمہ نہیں ٹھہرایا جا سکتا، نہ اس بات کی کوئی دلیل ہے کہ اس طرح کے اختلافات کو جائز ٹھہرا کر ان کی مخالفت نہ کی جائے۔

لیکن اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانوں کے درمیان جتنا بھی اصولِ عدالت کی مراعات کی جائے پھر بھی سب انسان آپس میں برابر نہیں ہو سکتے، کیونکہ استعداد، ہوش و ذہانت اور ذوق و سلیقہ کی رو سے فرق باقی رہے گا یہاں تک کہ کم از کم وہ اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے یکساں نہ ہوں گے۔

لہٰذا سوال یہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے فطری اختلافات عدالتِ الٰہی کے خلاف ہیں؟ یا اس کے برخلاف حقیقی عدالت (یعنی ہر چیز کو اس کی جگہ رکھنے) کا تقاضا یہی ہے کہ تمام انسان برابر نہ ہوں؟

اگر انسانی معاشرے کے تمام افراد بالکل یکساں اور برابر ہوں، جیسے کپڑے یا برتن جو ایک کارخانے سے بن کر نکلتے ہیں اور یکساں ہوتے ہیں اسی طرح تمام انسان بھی ایک شکل کے، ایک استعداد کے، بالکل مساوی ہوتے تو انسانی معاشرہ بالکل مردہ اور روح سے خالی ہو کر رہ جاتا۔ اس میں کسی طرح کی حرکت ہوتی اور نہ ترقی کی راہوں پر پیش قدمی نظر آتی۔

ایک پودے کی طرف نظر کیجئے، جس کی جڑیں تو مضبوط اور سخت ہوتی ہیں مگر اس کا تنا لطیف ہوتا ہے لیکن ٹہنیوں کی نسبت سخت ہوتا ہے، پھر اس کے بعد پتے، پھول، شگوفے بالترتیب لطیف سے لطیف تر ہوتے چلے جاتے ہیں، بات یہ ہے کہ ان سب نے اپنے باہمی تعاون اور اجتماع سے ایک خوبصورت پودے کو جنم دیا ہے ان میں سے ہر ایک کے خلیے اپنے فرائض کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف اور مصروفِ عمل ہیں۔

بالکل یہی حال دنیائے انسانیت میں نظر آتا ہے۔ افرادِ انسانی بھی باہم مل کر ایک عظیم الشان اور بار آور درخت کی مانند ہیں جس میں ہر چھتے بلکہ ہر فرد کا اس درخت کو تشکیل دینے میں ایک خاص مقام ہے جو اس کی ساخت کے مطابق ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے کہا ہے کہ یہ اختلافات تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں جیسا کہ سابقاً بھی ہم نے کہا کہ خدائی منصوبوں میں جہاں بھی لفظ "آزمائش" استعمال ہوا ہے اس کے معنی "ترتیب و پرورش" کے ہیں اور اس طرح اس شخص کا جواب مل جاتا ہے جو مذکورہ آیت سے کوئی غلط نتیجہ اخذ کرنا چاہے۔

## زمین پر انسانی خلافت

ایک اور قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے کئی بار انسان کو زمین پر بطور اپنے "خلیفہ" اور "نمائندہ" کے تعارف کروایا۔ اس تعبیر کے ذریعے جہاں ضمنی طور پر مقام کو واضح کرنا مقصود ہے وہاں اس حقیقت کا بھی اظہار مقصود ہے کہ اموال و ثروتیں، استعدادیں اور وہ تمام انعامات قدرتیلے جو خدا نے انسان کو دیئے ہیں ان سب کا مالک اصلی خدا ہے اور انسان ان سب پر اللہ کی طرف سے صرف نمائندہ، مجاز اور اجازت یافتہ ہے اور یہ بات بدیہی و بالکل واضح ہے کہ کوئی نمائندہ اپنے تصرفات میں مستقل نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ اس کے تمام تصرفات مالکِ اصلی کی اجازت کے دائرے اور حدود میں ہونا چاہئیں۔

یہیں سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مثلاً مسئلہ مالکیتِ اشیاء میں اسلام نے "کیپٹل ازم (سرمایہ داری)" اور "کمیونزم" دونوں راستوں سے دوری اختیار کی ہے کیونکہ اوّل الذکر نے مالکیت کو فرد کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے جبکہ دوسرے نے تمام مالکیت کو اجتماع کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے لیکن اسلام یہ کہتا ہے کہ مالکیت نہ تو کسی فرد کی ہے اور نہ اجتماع کی۔ بلکہ فی الحقیقت ہر چیز کا مالک اصلی خدا ہے۔

تمام انسان اس کے نمائندے اور وکیل ہیں اور اسی دلیل کی بناء پر اسلام انسان کی آمدنی اور خرچ دونوں کے طریقوں اور کیفیات میں نظارت و نگہبانی کا فرض ادا کرتا ہے اور دونوں کے لیے اس نے حدود و شرائط مقرر کر دی ہیں جن کی بناء پر اقتصادِ اسلامی کو اس نے بطور ایک خاص نظام کے تمام دیگر مکاتبِ فکر سے الگ کر کے نمایاں کر دیا ہے۔

ادارہ امامیہ قرأت کالج

# سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۳)
کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا ہے
تسلی کر لی ہے کہ متن میں کوئی اعرابی
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (شعلان الفاضل)

مدرس / مہتمم

امامیہ قرأت کالج

اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

# اشاریے سے پہلے

زیرِ نظر اشاریہ تفسیر نمونہ کے قارئین اور محققین کی سہولت کے لیے خود مصباح القرآن ٹرسٹ نے مرتب کروایا ہے۔

یاد رہے کہ فارسی کی اصل اشاعتوں میں اشاریہ موجود نہیں ہے۔ اس طرح مصباح القرآن ٹرسٹ کو اس سلسلے میں پہل کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہو رہا ہے۔

ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ دیگر جلدوں کی اشاعتوں میں بھی اشاریہ شامل کرکے انہیں مفید تر بنایا جائے۔

اشاریوں کی عام روش سے ہٹ کر زیرِ نظر اشاریہ میں تفسیر میں موجود قرآنی لغت کے زیادہ دِقت طلب الفاظ کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ جن کتابوں سے مؤلفِ محترم نے استفادہ کیا ہے ان کی تفصیلی فہرست بھی پیش کر دی گئی ہے۔

عالمِ پیری میں یہ کٹھن اور بزرگانہ کام محترم سید شکیل حسین موسوی نے انجام دیا ہے۔ خُدا تعالیٰ اُن کی توفیقات میں اضافہ کرے اور انہیں خدمتِ اسلام اور قرآن کے لیے طولِ عُمر سے نوازے۔

آپ کی آراء اور تنقید اس سلسلے کو بہتر اور مؤثر بنانے کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

انچارج
شعبۂ تصیح وترتیب
مصباح القرآن ٹرسٹ

۲ صفر المظفر ۱۴۱۰ھ

# اشاریہ

## تفسیر نمونہ ـــــــــ جلد ۳

ترتیب و تزئین ــــــ سید شکیل حسین موسوی
ــــــ سید محمد حسین زیدی البارہوی

مضامین:

# اصول وعقائد

## توحید



## عدل

## علم خدا :



## خالق ارض و سماء



## نبوت



## امامت



## قیامت

## معجزہ



# احکام

## نماز



## حج

## حرام گوشت، جانور اور دیگر محرمات



## امر بالمعروف و نہی عن المنکر



## ازدواج



## ایفائے عہد



## ذبیحہ

## قسم اور کفارہ



## نماز



## وصیت



# اخلاقیات

## (اخلاقِ حسنہ)

## انفاق فی سبیل اللہ



## ایفائے عہد



## تقویٰ



## (اخلاقِ سیئہ)

## حسد



## ظلم

## قتل



## کفر و نفاق



## اقوام سابقہ

### یہود و عیسائی (مشترکہ)



## یہودی

## عیسائی

## مشرکین

# شخصیات

## حضرت آدم علیہ السلام



## حضرت ابراہیم علیہ السلام



## ابنِ ابی ماریہ



## ابوالاحوص



## ابوجہل لع

## عتبہ ابن ربیعہ



## عثمانؓ بن مظعون



## حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ



## حضرت امام علی بن الحسین علیہما السلام



## حضرت علیؑ بن موسیٰؑ (امام ہشتم)



## عمارؓ ابن یاسرؓ



## عکاشہ

## عمارہ ابنِ ولید اور عمرو بن عاص



## عوج



## حضرت عیسیٰؑ ابنِ مریمؑ



## فنحاس بن آذورا



## کالب بن یوفنا



## گلیڈسٹون



## حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ختم الرسل

## امام محمد باقر علیہ السلام



## مرتضیٰ علم الہدیٰ



## معاویہ بن وہب و ہشام



## حضرت موسیٰ علیہ السلام



## امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

# کتبِ آسمانی



## تورات



## قرآن مجید



# کتبِ تفسیر و تاریخ و سیر

## لغاتِ قرآن

(ا)

## متفرق موضوعات

### آخری کارِ رسالت



### اذان



### اعمال



### اکمالِ دین



### امن و امان



### اندھی تقلید



### انسانی رشتے

## اولاد کا قتل



## بُت



## پاک و ناپاک



## توبہ



## توفیقِ خداوندی



## توکل و تقویٰ



## جزاء کے مختلف درجات



## حضرت جعفرؑ ابن ابی طالبؑ حبشہ میں



## حرمتِ شراب و جواء

## دینِ حق کو کھیل بنانے والے



## زمین پر انسانی خلافت



## سرکشی کرنے والے



## شرحِ صدر کیا ہے



## سزائیں



## شکار



## شہادتِ اکبر

## شیطانی وسوسے



## صراطِ مستقیم



## طبقاتی تفاوت



## طبقاتی تقسیم کے خلاف جنگ



## ظلم

## موت و حیات



## مومنین



## نعمات بخشنے والے کو پہچانیے



## نعماتِ خداوندی



## نفاق پھیلانے والے



## نور و ظلمت

## وسیلہ



## ولایت



## ہدایت



# مقامات

## ایلہ



## تیہ



## حبشہ



## حجر اسماعیلؑ



## سرزمینِ مقدس یا بیت المقدس



## شعب ابی طالب



## کعبہ



## مکہ

# مطبوعات مصباح القرآن ٹرسٹ

تفسیر نمونہ 15 جلدی فی جلد -/350

تفسیر نمونہ 10 جلدی مکمل سیٹ -/4000

انتخاب نمونہ 5 جلدی مکمل سیٹ -/2000

پیام قرآن جلد نمبر 1 تا 7 فی جلد -/350

میزان الحکمت جلد نمبر 1 تا 8 $\frac{20 \times 30}{8}$ فی جلد -/500

میزان الحکمت جلد نمبر 1 تا 8 $\frac{23 \times 36}{16}$ فی جلد -/250

قرآن مجید مترجم فرمان علی صاحب (مرحوم) 4 مختلف اقسام میں

تفسیر فصل الخطاب 3 جلد مکمل سیٹ -/1500

اسوہ الرسولؐ 3 جلد مکمل سیٹ -/1500

قرآن مجید ذیشان حیدر جوادیؒ 4 مختلف اقسام